یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹی

6

دار النوادر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہائے ہند

فقہائے ہند

تیرھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۰۳۰۰ ۸۸۹۸۶۳۹

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ

نام کتاب:	ــــــــ	فقہائے ہند
مصنف:	ــــــــ	محمد اسحاق بھٹی
اہتمام:	ــــــــ	محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بہ اشتراک دارالنوادر
مطبع:	ــــــــ	شفیق پریس
حروف خوانی:	ــــــــ	محمد سعید بھٹی
کمپوزنگ:	ــــــــ	محمود فرید
صفحات:	ــــــــ	۲۲۶
سرورق:	ــــــــ	ضیاء الرحمٰن
جلد ساز:	ــــــــ	بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 37320318، 37239884
ای میل: Kitabsarey@hotmail.com

نعمانی کتب خانہ
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

ترتیب

مقدمہ	۹
اکبر شاہ ثانی	۹
تحریک جہاد	۱۰
شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ	۱۲
بنگال کی فرائضی تحریک	۱۳
نثار علی عرف تیتو میر	۱۴
بہادر شاہ ظفر	۱۴
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے اسباب و وجود	۱۵
جہاد کا فتویٰ اور اس کے لائق احترام مفتی	۱۶
جنگ آزادی میں علما کا حصہ	۱۹
نوابوں اور تعلقہ داروں کی شرکت	۲۰
جنگ آزادی اور وہابی	۲۴
بخت خاں کا مخلصانہ کردار	۲۴
بہادر شاہ کی حوالگی	۲۶
گرفتاری	۲۶
بخت خاں	۲۶
شہزادوں کی گرفتاری اور قتل	۲۷
شاہی خاندان کے افراد کا قتل، پھانسی اور قید	۲۸
دہلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت	۲۹
مسلمانوں کی بربادی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی	۳۰
بہادر شاہ کا مقدمہ اور فیصلہ	۳۲
جلاوطنی	۳۴
وفات	۳۵
قبر	۳۵
بہادر شاہ ظفر۔ ولادت سے وفات تک	۳۷
سلطنت مغلیہ کا آغاز اور انجام	۳۸
ا	
۱۔ مولانا آدم مدراسی	۴۱
۲۔ سید آل احمد سہسوانی	۴۱
۳۔ سید آل حسن موہانی	۴۲
۴۔ شیخ ابراہیم باعکظہ سورتی	۴۲
۵۔ شیخ ابوتراب جعفری پھلواروی	۴۳
۶۔ مولانا ابوالحسن فرنگی محل	۴۳
۷۔ مولانا ابوالحیات پھلواروی	۴۳
۸۔ شیخ ابوسعید مجددی دہلوی	۴۴
۹۔ حکیم ابوعلی امروہوی	۴۵
۱۰۔ سید ابوالقاسم تستری نواب میر عالم خاں	۴۵
۱۱۔ مفتی احسان علی پھلواروی	۴۹

١٢۔ مولانا احسان غنی دلموی	٤٩
١٣۔ شیخ احمد سندیلوی	٥٠
١٤۔ شیخ احمد گجراتی	٥٠
١٥۔ شیخ احمد بھنھائی اصفہانی	٥٠
١٦۔ شیخ احمد رام پوری	٥١
١٧۔ شیخ احمد کشمیری	٥٢
١٨۔ شیخ احمد کشمیری	٥٢
١٩۔ مفتی احمد فرنگی	٥٣
٢٠۔ سید احمد حسن عرشی قنوجی	٥٣
٢١۔ مولانا احمد سعید مجددی دہلوی	٥٧
٢٢۔ مولانا احمد علی سہارن پوری	٥٩
٢٣۔ سید احمد علی محمد آبادی	٦٤
٢٤۔ مولانا احمد علی چڑیا کوٹی	٦٥
٢٥۔ مولانا احمد گل بھوپالی	٦٦
٢٦۔ حافظ احمد الدین بگوی	٦٧
٢٧۔ شیخ احمد اللہ انامی	٦٨
٢٨۔ مولانا ارادت حسین صدیقی عظیم آبادی	٦٩
٢٩۔ مولانا اسلم کاشمیری	٧٠
٣٠۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی	٧١
٣١۔ شیخ امام الدین امروہوی	٧٢
٣٢۔ سیدہ امۃ الغفور دہلوی	٧٣
٣٣۔ سید امیر حسن حسینی سہسوانی	٧٣
٣٤۔ مفتی امیر حیدر بلگرامی	٧٨
٣٥۔ مفتی انور علی آروی	٧٩
٣٦۔ سید اولاد حسن قنوجی	٨٠
ب	
٣٧۔ حافظ بارک اللہ لکھوی	٨٥
آباواجداد	٨٦
قدیم وطن	٨٦
لاہور میں قیام	٨٦
فیروز پور میں سکونت	٨٧
فیروز پور سے نقل مکانی	٨٧
حافظ بارک اللہ کی ولادت	٨٧
حصول تعلیم	٨٨
شاہ غلام علی کی خدمت میں	٨٨
کھیتی باڑی	٨٩
تلامذہ	٨٩
تدین وتقویٰ اور حق گوئی کی ایک مثال	٩٠
ایک اور واقعہ	٩٢
سید جعفر علی سے ملاقات	٩٢
انواع بارک اللہ	٩٣
فارسی حواشی	٩٤
حواشی کا اردو ترجمہ	٩٦
تاریخ مدوث میں تذکرہ	٩٧
وفات	٩٧
اولاد واحفاد	٩٧
٣٨۔ مولانا باقر مدراسی	٩٨
٣٩۔ مولانا برہان الدین دیوی	١٠١
٤٠۔ قاضی بشیر الدین قنوجی	١٠٣
ت	
٤١۔ مولانا تراب علی لکھنوی	١٠٧

ش

۴۲۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی	۱۰۹
شاہ ولی اللہ کے حلقۂ درس میں	۱۱۰
شیخ محمد عابد سنامی اور مرزا مظہر کے حلقۂ طریقت میں	۱۱۰
شاگردی اور تدریس	۱۱۰
علم الہدیٰ اور بیہقیٔ وقت	۱۱۳
کثرتِ مطالعہ	۱۱۳
مرشد کے دل پر مرید کی ہیبت	۱۱۳
اوصافِ گوناگوں	۱۱۵
شانِ اجتہاد	۱۱۵
تصانیف	۱۱۶
استاد، مرشد اور معاصرین کا ہدیۂ عقیدت و تعظیم	۱۱۸
فتنۂ معاصرت سے پاک لوگ	۱۱۹
مسائل میں نقطۂ نظر	۱۲۰
وصیت	۱۲۴
وفات	۱۲۵
قاضی فضل اللہ	۱۲۵
اولاد	۱۲۵

ج

۴۳۔ مولانا جان محمد لاہوری	۱۲۶
۴۴۔ سید جعفر علی نقوی	۱۲۸
۴۵۔ سید جلال الدین احمد بنارسی	۱۳۴
۴۶۔ منشی جمال الدین صدیقی دہلوی	۱۳۵
۴۷۔ مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی	۱۳۹
۴۸۔ قاضی جمال الدین کشمیری	۱۴۰

ح

۴۹۔ مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی	۱۴۰
۵۰۔ مولانا حبیب البوری	۱۴۱
۵۱۔ مرزا حسن علی صغیر لکھنوی	۱۴۲
۵۲۔ سید حسین حسینی نصیر آبادی	۱۴۳
۵۳۔ سید حسین احمد حسینی ملیح آبادی	۱۴۴
۵۴۔ سید حیات حسینی دہلوی	۱۴۶
۵۵۔ مولانا حیدر انصاری لکھنوی	۱۴۶
۵۶۔ سید حیدر علی ٹونکی	۱۴۷
۵۷۔ مولانا حیدر علی فیض آبادی	۱۴۹

خ

۵۸۔ مولانا خادم احمد لکھنوی	۱۵۰
۵۹۔ مولانا خرم علی بلہوری	۱۵۲
۶۰۔ مفتی خلیل الدین کاکوروی	۱۵۴
۶۱۔ قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری	۱۵۵
۶۲۔ مولانا خیر الدین زبیری سورتی	۱۵۶

د

۶۳۔ سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی	۱۵۸

ذ

۶۴۔ مولانا ذوالفقار علی دیوی	۱۶۰
۶۵۔ قاضی ذوالفقار علی حیدر آبادی	۱۶۱

ر

۶۶۔ مولانا رشید الدین دہلوی	۱۶۱
۶۷۔ مولانا رضا علی خاں بریلوی	۱۶۳
۶۸۔ مفتی رضی الدین کاکوروی	۱۶۴
۶۹۔ شیخ رفیع الدین فاروقی مراد آبادی	۱۶۵

◆	۷۰۔ شاہ رفیع الدین دہلوی	۱۶۶
◆	۷۱۔ شیخ روف احمد رام پوری	۱۷۰
◆	۷۲۔ مفتی ریاض الدین کاکوروی	۱۷۱
◆	ز	
◆	۷۳۔ قاضی زین العابدین انصاری یمانی	۱۷۲
◆	س	
◆	۷۴۔ مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری	۱۷۳
◆	۷۵۔ مولانا سراج احمد رام پوری	۱۷۹
◆	۷۶۔ سید سراج احمد حسنی نقوی سہسوانی	۱۸۰
◆	۷۷۔ قاضی سراج الدین موہانی	۱۸۶
◆	۷۸۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی	۱۸۷
◆	۷۹۔ سید سعید الدین بریلوی	۱۹۰
◆	۸۰۔ مولانا سلام اللہ محدث دہلوی رام پوری	۱۹۰
◆	۸۱۔ مولانا سلامت اللہ کان پوری	۱۹۱
◆	۸۲۔ مفتی سلطان احمد عثمانی بریلوی	۱۹۳
◆	۸۳۔ مولانا ثناء الدین عثمانی بدایونی	۱۹۴
◆	ش	
◆	۸۴۔ مولانا شجاع الدین علوی حیدر آبادی	۱۹۵
◆	۸۵۔ مولانا شرف الدین ہاشمی پھلواروی	۱۹۶
◆	۸۶۔ مفتی شرف الدین رام پوری	۱۹۶
◆	۸۷۔ مولانا شمس الدین حیدر آبادی	۱۹۸
◆	۸۸۔ مولانا شیر محمد افغانی دہلوی	۱۹۸
◆	ص	
◆	۸۹۔ سید صادق نقوی لکھنوی	۱۹۹
◆	۹۰۔ مولانا صالح سورتی	۲۰۰
◆	۹۱۔ قاضی صبغت اللہ مدراسی	۲۰۰
◆	۹۲۔ مفتی صدر الدین دہلوی	۲۰۲
◆	۹۳۔ سید صفدر کشمیری	۲۱۹
◆	ط	
◆	۹۴۔ مولانا طیب کشمیری	۲۱۹
◆	ظ	
◆	۹۵۔ مولانا ظفر احمد لکھنوی	۲۲۰
◆	۹۶۔ مولانا ظہور الحق فرنگی محلی	۲۲۰
◆	۹۷۔ مولانا ظہور الحق پھلواروی	۲۲۱
◆	۹۸۔ مولانا ظہور علی انصاری لکھنوی	۲۲۱
◆	۹۹۔ مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی	۲۲۲
◆	۱۰۰۔ سید ظہور محمد کالپوی	۲۲۳
◆	مراجع ومصادر	۲۲۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

فقہائے ہند جلد پنجم کے حصہ دوم کے مقدمے میں مغل حکمران عالم شاہ ثانی کے تذکرے پر بات ختم ہوئی تھی۔ یہ برائے نام بادشاہ تھا جو ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ/۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء کو تخت حکومت پر بیٹھا اور ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوا۔ اب صرف دو مغل حکمران ہندوستان کے افق سیاست پر باقی ہیں۔ ایک اکبر شاہ ثانی اور دوسرا بہادر شاہ ظفر۔ یہ محض نام کے بادشاہ تھے، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ آئندہ سطور میں ان کے بارے میں مختصر واقعات درج کیے جاتے ہیں:

اکبر شاہ ثانی:

اس کا پورا نام ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی ہے۔ عالم شاہ ثانی کا بیٹا تھا۔ شب چہار شنبہ ۷ رمضان ۱۱۷۳ھ/ ۱۹ نومبر ۱۷۵۹ء) کو پیدا ہوا۔ ماں کا نام مبارک محل تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اڑتالیس برس کی عمر میں ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ دور آخر میں اس کے باپ عالم شاہ ثانی کی حکومت شہر دہلی تک محدود تھی۔ لیکن بیٹے کا حلقہ حکمرانی اس سے بھی سمٹ گیا تھا اور فقط قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تک اس کا اقتدار باقی رہ گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس وظیفہ خوار بادشاہ کو جو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، وہ بہت کم تھا۔ وظیفے میں اضافے کی درخواست کی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ قلعہ معلیٰ میں بادشاہ کلی اختیارات رکھتا تھا۔ اس میں انگریزی حکومت مداخلت نہیں کرتی تھی۔ شہر کے جرائم پیشہ لوگ قلعے میں جمع رہتے تھے۔ وہ گھروں سے مال چرا کر وہاں لے جاتے اور دھڑلے سے فروخت کرتے، بادشاہ کوئی باز پرس نہ کرتا۔ اس کے شاہانہ اخراجات پورا ہونے کا یہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔ وہ ایک بے بس اور ناکارہ بادشاہ تھا اور اس کے زمانے میں انگریزوں کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

اکبر شاہ ثانی کا ایک بیٹا مرزا جہاں گیر تھا، جس نے تر نگ میں آ کر انگریز ریزیڈنٹ مسٹر آرچی بولڈسٹین

پر گولی چلا دی تھی۔ اتفاق سے ریزیڈنٹ تو بچ گیا' مگر شہزادہ اس جرم میں پکڑا گیا اور الہ آباد میں قید کر دیا گیا۔ وہیں اس نے انتقال کیا اور اس کی نعش کو دہلی لا کر خواجہ نظام الدین اولیا کے قریب دفن کیا گیا۔

۱۸۰۹ء میں بادشاہ کی ذات خاص اور خاندان کا وظیفہ بڑھا کر انگریزوں نے ایک لاکھ روپے کر دیا' جس سے اس نے شہر کی فصیل اور بعض عمارتوں کی مرمت کرائی۔

اس بادشاہ نے بتیس سال حکومت کی اور اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۲۸ جمادی الاخری ۱۲۵۳ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو وفات پائی۔ اپنے باپ شاہ عالم ثانی کے پہلو میں دفن ہوا۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی شہر کو بہت سے جلیل القدر علما کے گہوارے کی حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' شاہ عبدالقادر دہلوی' شاہ رفیع الدین دہلوی' حضرت سید احمد شہید بریلوی' مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور بہت سے اہل علم اور اصحاب فضل و کمال اس کے عہد میں موجود تھے۔

امیر المجاہدین سید شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تحریک جہاد اسی بادشاہ کے عہد میں شروع ہوئی اور پھر اسی کے عہد میں ان حضرات نے درجہ شہادت پایا۔ اس تحریک کے بعد انگریزوں کے خلاف ملک میں یکے بعد دیگرے کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔

اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ ظفر جلوہ آرائے تخت دہلی ہوا' جو آخری مغل بادشاہ تھا۔ لیکن اس کا تذکرہ کرنے سے پہلے سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے' کیوں کہ اس تحریک کی ابتدا اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہوئی تھی۔

تحریک جہاد:

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے تکلیف اور اذیت کا زمانہ تھا۔ مذہبی' دینی' سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔ جو لوگ مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ابتری سے بہت زیادہ متاثر اور پریشان ہوئے' ان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی' مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے رفقائے کرام کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ پاک باز لوگ اجتماعی طور سے میدان عمل میں نکلے اور پورے ملک میں پھیل گئے۔ انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا' ملک کے دیہات اور قصبات و بلاد میں گئے' لوگوں کی خاص قسم کی تربیت کی اور منظم طریقے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی ایک باقاعدہ تحریک تھی' جس کے بڑے بڑے دو مقاصد تھے۔

ایک مقصد یہ تھا کہ مسلمان بدعات کو ترک کر دیں' ہندوانہ رسوم و رواج سے جو باہمی اختلاط کی وجہ سے ان میں گھر کر چکی تھیں' کنارہ کش ہو جائیں' امور شرک سے دست بردار ہو جائیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کریں۔ نماز روزے کی پابندی کریں اور عقیدہ و عمل میں ہم آہنگی اور

یکسانی پیدا کریں۔ کتاب وسنت کے احکام کو مشعل راہ بنائیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

دوسرا مقصد اس ملک سے انگریزی اثر ورسوخ کو ختم کرنا اور اس کے لیے باقاعدہ جہاد کرنا تھا۔

یہ دونوں مقاصد نہایت اہم اور بنیادی تھے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے پوری جدوجہد کی اور برصغیر میں ایک تہلکہ بپا کر دیا۔

یہ اس ملک میں احیائے دین کی پہلی باقاعدہ تحریک تھی' جس کا اساسی نقطہ نظر خالص کتاب وسنت کی ترویج واشاعت تھا اور جس کے ذریعے مسلمانوں کو دعوت جہاد دے کر غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں نے ملک کو خیر باد کہا اور آرام وآسائش کی زندگی ترک کر کے اپنے آپ کو بے پناہ تکلیفوں اور مصیبتوں کے حوالے کیا۔ خوشی اور مسرت کے ساتھ جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر' ان نفوس قدسیہ نے یہاں سے کوچ کیا اور سرحد پار کے علاقے کو جو انگریزوں کی دست رس اور غیر مسلموں کی عمل داری سے باہر تھا' اپنا مرکز قرار دے لیا۔

پہلا قافلہ جو پانچ اور چھ سو کے درمیان غازیوں پر مشتمل تھا' ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) کو امیر المجاہدین سید احمد شہید کی قیادت میں روانہ ہوا۔ ان کے پاس کل پانچ ہزار روپے کی رقم تھی' جسے زاد راہ کہنا چاہیے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کی وجہ سے گزرنا مشکل تھا' لہٰذا یہ لوگ راجستھان سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے وہاں سے قندھار اور پھر کابل گئے۔ کابل سے روانہ ہو کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے اور آزاد قبائل کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد برصغیر کے مختلف مقامات سے بہ کثرت مجاہدین وہاں پہنچنا شروع ہو گئے۔

مجاہدین کے اس مختصر سے قافلے نے جیسے ہی آزاد مرکز میں پڑاؤ ڈالا' سکھوں کی فوج مقابلے کو نکل آئی اور لڑائی کا چیلنج دیا۔ یہ ہنگامی حالات تھے۔ چنانچہ نظم وضبط قائم رکھنے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی' اس لیے ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی۔ سید احمد شہید اس حکومت کے امیر مقرر ہوئے۔ سید صاحب کے ہندوستانی رفقا کے علاوہ مقامی علاقے کے پٹھانوں نے بھی سید صاحب کی بیعت کی اور ان کی قیادت میں شریک جہاد ہونے کا اعلان کیا۔

سید صاحب کے رفقائے کرام کی اکثریت علمائے دین پر مشتمل تھی اور سلسلہ جہاد کی زمام قیادت انھی کے ہاتھ میں تھی۔ علما میں مولانا اسماعیل دہلوی' مولانا عبدالحی بڑھانوی' مولانا کرامت علی جون پوری' مولانا سید اولاد حسن قنوجی' مولانا ولایت علی عظیم آبادی' مولانا سید محمد علی رام پوری' غرض بہت سے اہل علم اور اصحاب فضل اس جماعت میں شامل تھے' جو محض اعلاء کلمۃ اللہ اور ملک سے انگریز کے اثر واقتدار کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اترے تھے۔ لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سکھ ان کے مقابلے میں نکل آئے اور ان سے مسلسل کئی

شدید جنگیں ہوئیں۔ آخری مقابلہ بالاکوٹ کے میدان میں ہوا، جس میں ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل دہلوی اور بہت سے حضرات مرتبہ شہادت کو پہنچے۔

بہر کیف مقابلہ کسی سے ہو، سکھوں سے ہو یا انگریزوں سے۔ اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں فریق مسلمانوں کے دشمن تھے اور دونوں کا مطمحِ نظر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ معرکہ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین نے ہمیشہ انگریز کی مخالفت کی اور متعدد تحریکیں اس کے خلاف چلائیں۔ آزادی کی ان تحریکوں کی تفصیل ان شاء اللہ اس کتاب کی اگلی جلد میں بیان کی جائے گی۔

مجاہدین کی یہ تحریک ایک منظّم اور باقاعدہ تحریک تھی، جس نے پورے سو سال (۱۹۴۷) تک انگریزی حکومت کو پریشان کیے رکھا اور بالآخر اس کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ:

تحریک مجاہدین کی بنیاد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا وہ فتویٰ تھا، جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری فرمایا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم رؤساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری است، و مراد از اجراء احکام کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و باج و عشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فیصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نکنند نہ کردہ باشند، لیکن اصل اصول ایں چیز ہا نزد ایشاں ہباء وہدر ست۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمائند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح نمی تو اند آمد و برائے منفعت خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی تو انند شد و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد ست۔ آرے در چپ و راست مثل حیدر آباد، لکھنو و رام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند، بسبب مصالحت و اطاعت مالکان آن [1]۔

یعنی یہاں رؤسائے نصاریٰ (عیسائی حکام) کا حکم بے جھجک و بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج و باج، عشر و مال گزاری، اموال تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے معاملات، مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزاؤں میں یہ لوگ خود ہی حاکم اور مختار مطلق ہیں۔ بے شک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور آزادی کی بنیاد ہے، وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو

[1] فتاویٰ عزیزیہ ج ۱ ص ۱۷

مسمار کر دیتے ہیں‘ عوام کی شہری آزادیاں ختم ہو چکی ہیں‘ یہاں تک کہ کوئی مسلمان یا غیر مسلم ان کی اجازت و اطمینان کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آ سکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی جو اجازت ہے وہ بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص اور ممتاز و نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتے تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد‘ لکھنؤ‘ رام پور میں چونکہ وہاں کے فرماں رواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے‘ براہ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

شاہ عبدالعزیز نے اس فتوے کے علاوہ ایک اور فتویٰ بھی جاری کیا تھا‘ جس میں دلائل سے ثابت فرمایا ہے کہ ہندوستان اب دارالحرب ہو گیا ہے [1]۔

شاہ صاحب کے یہ دونوں فتوے اپنے مندرجات و مشمولات میں صاف اور واضح ہیں۔ ان کی رو سے بلاشبہ اس زمانے میں ہندوستان دارالحرب تھا اور اس کی آزادی و حریت کے لیے انگریزی اقتدار سے جہاد ناگزیر تھا‘ چنانچہ سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے انگریزوں سے جہاد کا آغاز کیا اور پھر سو سال تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز اور صورت میں جاری رہا۔ تا آں کہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار ختم ہو گیا اور برصغیر پاک و ہند کو آزادی کی نعمت میسر آئی۔

بنگال کی فرائضی تحریک:

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے چند سال پیشتر بنگال میں ’’فرائضی‘‘ کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی مولانا شریعت اللہ تھے‘ جو ضلع فرید پور کے موضع بہادر پور کے رہنے والے تھے اور اٹھارہ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہ بیس سال مکہ معظّمہ میں مقیم رہے اور شیخ طاہر مکی شافعی سے استفادہ کیا۔ ۱۸۰۲ء میں وہ ہندوستان آئے اور ۱۸۰۴ء میں فرائضی جماعت کے نام سے بنگال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہوئے اور رسوم و بدعات کی بیخ کنی کی تحریک شروع کی۔ مولانا شریعت اللہ نامور عالم دین اور سرگرم شخص تھے۔ ان کی تحریک کو بھی باقی تحریکوں کی طرح وہابیت کا نام دیا گیا۔ کاشت کاروں اور مزارعوں میں انھوں نے بالخصوص بہت کام کیا۔ وہ پیر اور مرید کے بجائے استاد اور شاگرد کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الارض للہ ان کا نعرہ تھا‘ یعنی زمین اللہ کی ہے۔ اور جو شخص اس میں کام کرتا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ مولانا شریعت اللہ نے ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حاجی محسن میاں نے فرائضی تحریک کی قیادت سنبھالی۔ بنگال کے عام مسلمان ان کو پیار سے دودھو میاں کے نام سے پکارتے تھے۔ باپ کی طرح یہ بھی سرگرم اور فعال کارکن

[1] فتاویٰ عزیزیہ ج اص ۱۰۵

تھے۔ فرائضی تحریک کے مقاصد میں انگریزوں کو بنگال سے نکالنا بھی شامل تھا۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور انگریزوں کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

نثار علی عرف تیتو میر:

جس زمانے میں سید احمد شہید بریلوی آزاد قبائل میں مصروف جنگ و جہاد تھے' اسی زمانے میں بنگال میں ایک شخص نثار علی نمایاں ہو کر ابھرا' جو تیتو میر کے عرف سے معروف تھا۔ یہ شخص کاشت کار تھا اور ایک زمیندار کے گھر اس کی شادی ہوئی تھی۔ سید احمد بریلوی کا عقیدت مند تھا۔ تیتو میر کاشت کاروں کا حامی تھا اور ہزاروں کاشت کار اس کے ساتھ تھے' جو ہندو زمینداروں کے جور و ستم سے تنگ آ چکے تھے۔

اسی زمانے (۱۸۳۱ء) میں موضع پورنا کے ایک زمیندار کشن رائے سے لوگ متعارف ہوئے۔ اس نے یہ عجیب و غریب ستم ڈھایا کہ اپنے ہر مسلمان کاشت کار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا' ڈھائی روپے کا محصول لگا دیا اور اس میں مزید اشتعال اس طرح پیدا کیا کہ اس محصول کو وہ داڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا۔ اپنے گاؤں میں تو اس نے یہ ٹیکس بغیر کسی جھگڑے کے وصول کر لیا' لیکن جب اس کے کارندے قریب کے گاؤں موضع سرفراز پور پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف تیتو میر اپنے معتقدین کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے کشن رائے کے کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد فریقین میں سخت لڑائی ہوئی اور خوں ریزی تک نوبت پہنچی۔ بالآخر کچھ عرصے کے بعد تیتو میر مارا گیا اور اس کی جمعیت منتشر ہو گئی۔ بنگال کی یہ دونوں تحریکیں انگریزوں اور ہندو زمینداروں کے خلاف تھیں۔

بہادر شاہ ظفر:

اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ بہادر شاہ ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۲۵ اکتوبر ۱۷۷۵ء) کو پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر چونسٹھ اور پینسٹھ سال کے درمیان تھی۔ یہ تیموری نسل کا آخری بادشاہ تھا۔ ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۳ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو اس نے جو تاج شاہی سر پر رکھا' وہ درحقیقت اس کی محکومی کا پیغام اور سلطنت مغلیہ کے اختتام کا اعلان تھا۔

بہادر شاہ ذاتی طور پر بہت اچھا بادشاہ تھا۔ پڑھا لکھا اور معقول و متوازن آدمی تھا۔ اس نے اپنے دادا شاہ عالم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ شاہ عالم کے مکحول البصر اور نابینا ہونے کا حادثہ اس کے سامنے پیش آیا۔ یہ مرہٹوں' سکھوں' جاٹوں اور روہیلوں کی عداوت اور چیرہ دستی سے باخبر تھا۔ اس کے دادا نے انگریزوں کی ماتحتی اور سرپرستی قبول کر لی تھی۔ اس کے باپ اکبر شاہ ثانی نے بھی انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اور یہ بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے' جو صرف نام کے بادشاہ تھے' کسی معاملے میں انھیں کوئی اختیار

حاصل نہ تھا۔ ان کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ سال گرہ اور نوروز وغیرہ کے موقعے پر گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کو جو نذر پیش کی جاتی تھی، وہ ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برا نے حکماً بند کر دی تھی اور بادشاہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ سکّے پر فرمائے دہلی کا نام نقش ہوتا تھا، وہ اس سے قبل ۱۸۳۵ء میں بند ہو چکا تھا۔ گورنر جنرل کی مہر میں ''فدوی خاص بادشاہ'' کے الفاظ کندہ تھے، وہ مہر سے خارج کیے گئے۔ ہندوستان کے رؤسا و امرا کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ ان کی مہروں میں بادشاہ کی عزت و تکریم سے متعلق اس قسم کے جو الفاظ درج ہیں، وہ نکال دیے جائیں۔

بہرکیف بہادر شاہ ظفر ایک بے بس بادشاہ تھا اور اس کی زندگی مرقع عبرت تھی۔ اس کی داستان مظلومیت بہت طویل اور دردناک ہے۔ اس کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی جس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ جدوجہد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد انگریزی حکومت نے ''غدر'' کے نام سے موسوم کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے اسباب و وجوہ:

موقع کی مناسبت سے یہاں اس بارے میں چند باتیں بیان کی جاتی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اسباب و وجوہ کیا تھے اور اہل ہند اس خطرناک اور بڑے اقدام پر کیوں مجبور ہوئے؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز میرٹھ سے ہوا۔ ۱۱مئی کی صبح کو میرٹھ کی دیسی فوج دہلی پہنچی اور بہادر شاہ، مغل شہزادوں اور لال قلعہ کے ارباب اختیار کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر سے انگریز کو نکالنے کے لیے میدان جنگ میں اتریں۔ بہت جلد اس کے اثرات تمام ملک میں پھیل گئے اور اس کی ہمہ گیری و وسعت پذیری نے جہاں ہندوستانی فوج پر بے پناہ اثر ڈالا، وہاں علماء، عوام، نواب اور جاگیردار بھی حالات کی رفتار سے مجبور ہو گئے کہ شمشیر بکف ہو کر میدان مبارزہ میں نکلیں۔ چنانچہ چند ہی روز میں ہر طبقہ و خیال کے لوگ آمادۂ پیکار ہو گئے اور سب نے ملک کو انگریز کے وجود سے پاک کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بے شک ان سب کی تکلیفیں مختلف تھیں اور مصائب و مشکلات جداگانہ تھے لیکن واقعات کے دھارے نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ انگریز کے خلاف سب متفق اللسان اور متحد الخیال تھے۔

دیسی فوج کو مثلاً یہ شکوہ تھا کہ انگریزی فوج کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور یہ ان تمام مراعات سے محروم تھے جو انگریزی فوج کو حاصل تھیں۔ حالانکہ اطاعت شعاری، وفاداری اور دشمن سے معرکہ آرائی میں دیسی فوج ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی اور اس کا اعلیٰ انگریزی افسروں کو بھی اعتراف تھا۔ علاوہ ازیں کسی اونچے اور ذمہ دارانہ عہدے پر کوئی ہندوستانی فائز نہیں تھا۔ ہر جگہ انگریز چھائے ہوئے تھے، جب کہ بے شمار ہندوستانی فوجی نہایت قابل تھے۔ ان کی فوجی خدمات بہت پرانی تھیں اور ان کا سابقہ ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ مگر

انگریزی حکومت اور انگریز اعلیٰ حاکم ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور انھیں بلند مناصب پر متعین کرنا انھیں منظور نہیں تھا۔ پھر چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے کا جبری حکم ان کے لیے مزید باعث اہانت تھا۔

علمائے کرام اور مذہبی و دینی عناصر انگریزی عمل داری سے اس لیے نالاں تھے کہ انگریز براہ راست مذہب میں دخیل ہونے لگا تھا۔ پادریوں کا ایک جال ملک میں بچھا دیا گیا تھا جس کا مقصد اہل ہند کو وسیع پیمانے پر عیسائی بنانا تھا' تاکہ اس ملک میں عیسائی حکومت کے خلاف کوئی شورش بپا نہ ہو سکے' اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ملک کی بہت بڑی آبادی حلقہ بگوش عیسائیت ہو جاتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے یہاں بڑے بڑے اور معروف پادری بھیجے گئے جنھوں نے اپنے مذہب کی پوری بے باکی اور جرأت سے تبلیغ کی۔ بالخصوص اسلام پر ایسے شدید حملے کیے اور اتنی سخت نکتہ چینی کی کہ کوئی خود دار اور دین دار آدمی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

نوابوں اور جاگیرداروں پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی تھی کہ ان کی ریاستیں چھینی جا رہی تھیں اور جاگیروں پر قبضہ کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض کو اتنے قلیل اور محدود وظیفے دیے گئے کہ ان کا معمولی گزارا تک مشکل ہو گیا۔ یہ اپنی جگہ بااختیار اور ریاستوں کے مالک تھے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال کسی طرح ان کے لیے موجب اطمینان اور باعث سکون نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک خاموش تھے اور خاموش رہے جب تک حالات سازگار نہیں تھے' جوں ہی حالات نے پلٹا کھایا اور انگریزی حکومت اور اس کی پالیسی کے خلاف ایک عام حرکت پیدا ہوئی' یہ ہاتھ میں تلوار پکڑ کر میدان میں آ گئے۔

برصغیر کے مسلمان بالخصوص انگریز سے عناد رکھتے تھے۔ کیونکہ انگریز نے براہ راست مسلمانوں ہی سے حکومت چھینی تھی اور مسلمان ہی اس کی تیغ ستم کا اولین ہدف تھے۔ اس سے قبل انگریز کے ہاتھوں سراج الدولہ کے بے رحمانہ قتل اور سلطان ٹیپو کی شہادت کا حادثہ ہائلہ بھی نوک شمشیر سے تاریخ ہند کے صفحات میں نقش ہو چکا تھا' اور اب دلی کے لال قلعے میں تیمور کا وارث انگریز کی مکارانہ اور جابرانہ حکمت علی سے مجبور و بے بس ہوا بیٹھا تھا۔ اقتدار و اختیار کی باگ ڈور مغلوں کے قبضے سے نکل کر کمپنی بہادر کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی اور مسلمان اپنی آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ اس شدید ضرب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہیں کیا۔ ان کی حمیت بیدار ہوئی' غیرت نے جوش مارا اور اپنے اہل وطن کے اشتراک سے انگریز کے جبر و قہر سے پنجہ آزمائی شروع کر دی۔

غرض ایک عمومی بے چینی اور ہمہ گیر اضطراب تھا جس نے ملک کے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں کو جھنجھوڑا اور ان کو انگریزی حکومت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

جہاد کا فتویٰ اور اس کے لائق احترام مفتی:

ملک کے عوام و خواص کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علما نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور

انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ جاری کیا' جس میں جہاد کو فرض ٹھہرایا گیا۔ یہ فتویٰ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کے بعد جاری ہوا' جب کہ جنرل بخت خاں دہلی پہنچا۔ اس نے دہلی آنے کے فوراً بعد وہاں کے علمائے کرام کو جامع مسجد میں جمع کیا اور جہاد کا فتویٰ مرتب کرایا۔ یہ فتویٰ اس زمانے کے اخبارات ''ظفر الاخبار'' اور ''صادق الاخبار'' میں شائع ہوا۔ اس فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

''استفسا: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب انگریز جو دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں' اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور وہ لوگ جو شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں' ان کو بھی جہاد کرنا چاہیے یا نہیں؟ بیان کریں' اللہ آپ کو اجر دے گا۔''

''جواب: درصورت مرقوم فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے' اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے' چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے، بسبب کثرت اجتماع افواج کے' اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے' تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا' اور اسی طرح اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو جائے گا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور غارت اور قتل کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا' بشرط ان کی طاقت کے''

اس فتوے پر چونتیس (۳۴) علمائے کرام کے دستخط ہیں' جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) مولانا نور جمال (۲) مولانا محمد (۳) مولوی عبدالکریم (۴) مولانا سکندر علی (۵) مولانا سید نذیر حسین دہلوی (۶) مولانا رحمت اللہ (۷) مفتی صدر الدین آزردہ (۸) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۹) مولانا محمد ضیاء الدین (۱۰) مولانا عبدالقادر لدھیانوی (۱۱) مولانا شاہ احمد سعید مجددی (۱۲) مولانا محمد منیر خاں (۱۳) مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (۱۴) مولانا محمد علی (۱۵) مولانا فرید الدین (۱۶) مولانا محمد سرفراز علی (۱۷) سید محبوب علی جعفری (۱۸) مولانا ابو حامد محمد حامی الدین (۱۹) سید احمد علی (۲۰) مولوی الٰہی بخش (۲۱) مولانا محمد کریم اللہ (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) مولوی محمد مصطفٰے خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی (۲۴) مولوی محمد انصار علی (۲۵) مولانا حفیظ اللہ خاں (۲۶) مولانا محمد نور الحق (۲۷) مولوی محمد ہاشم (۲۸) مولوی حیدر علی (۲۹) مولانا سیف الرحمٰن لدھیانوی (۳۰) سید محمد (۳۱) مولوی محمد امداد علی (۳۲) سید عبدالحمید (۳۳) مفتی محمد رحمت علی خاں (۳۴) قاضی محمد علی حسین [1]۔

یہی علمائے کرام تھے' جنھوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ ان کے علاوہ اور کسی کے دستخط نہیں تھے۔

[1] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات) ص ۴۰۵' ۴۰۶

عبدالشاہد خاں شروانی نے ''باغی ہندوستان'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دہلی کی جامع مسجد میں علما کے سامنے یہ فتویٰ مولانا فضل حق خیر آبادی نے پیش کیا تھا اور مختلف علما نے اس پر دستخط کیے۔ الفاظ یہ ہیں:

علامہ (فضل حق) سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، نے دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی ❶۔

اس سے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ علامہ فضل حق اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے دہلی پہنچے ❷۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری اپنی تصنیف ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' میں عبدالشاہد خاں شروانی کی اس ''روایت'' کو ''گھڑی'' ہوئی روایت قرار دیتے ہیں ❸ وہ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے یہ حکایت معلوم نہیں کہاں سے وضع کی ہے۔ جہاد کے فتوے پر مولانا فضل حق خیر آبادی، قاضی فیض اللہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اور سید مبارک شاہ رام پوری میں سے کسی کے دستخط بھی نہیں ہیں۔ مولوی فضل حق خیر آبادی تو وسط اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے تھے۔ اس وقت یہ فتویٰ مشتہر ہو چکا تھا، لہٰذا ان کے دستخط کا سوال ہی پیدا ہوتا ❹۔

بہر حال جہاد کے فتوے پر صرف ان چونتیس علما کے دستخط ثبت تھے، جن کے اسمائے گرامی پہلے گزر چکے ہیں۔

جب جنرل بخت خاں اور اس کے ساتھی وارد دہلی ہوئے تو یہ شہر وہابی مجاہدین کا مرکز قرار پا گیا اور وہابی وہاں جمع ہونے لگے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا سرگرم کارکن اور امام المجاہدین اس کا معاون ہوا ❺۔

---

❶ باغی ہندوستان ص ۱۴۱

❷ ایضاً ص ۱۴۰

❸ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۳

❹ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۴

❺ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۸

جنگ آزادی میں علما کا حصہ:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علمائے کرام نے بھر پور حصہ لیا اور استخلاص وطن کے لیے میدان عمل میں نکلے۔ ان علمائے کرام میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جنھوں نے فتویٰ جہاد مرتب فرمایا اور اس پر دستخط کیے۔ وہ بھی ہیں جن کا شمار مرتبین فتویٰ کے تلامذہ و معتقدین میں ہوتا ہے اور وہ بھی ہیں جو ان کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ علما کی اس وسیع فہرست میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی' مولانا لیاقت علی الہ آبادی' مولانا رحمت اللہ کیرانوی' مولانا عبدالجلیل علی گڑھی' مولانا محمد قاسم نانوتوی' مفتی عنایت احمد کاکوروی' مفتی مظہر کریم دریابادی اور مولوی ایوب خاں کیفی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

ان علمائے کرام میں سے بعض حضرات نے درجہ شہادت پایا' بعض کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور بعض کو کالے پانی بھیجا گیا۔ بعض ہجرت کر کے حجاز مقدس چلے گئے۔ یہ اسلام کے شیدائی' آزادی وحریت کے پروانے اور دین کے سچے جاں نثار تھے۔ ملک وملت کے لیے انھوں نے جو مساعی جمیلہ انجام دیں وہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے سینے میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان میں سے ہر عالم کے حالات اس کتاب میں اصل مقام پر بیان ہوں گے' البتہ چند بزرگوں کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

مولانا لیاقت علی: ضلع الہ آباد (یوپی) کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ اپنے مریدوں کو ہمیشہ جہاد کی تلقین و ترغیب فرماتے۔ انگریزوں کے خلاف انھوں نے مختلف اشتہارات شائع کیے جو فوج اور عوام میں بہت بڑی تعداد میں تقسیم کیے گئے۔ ان اشتہارات کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف لوگوں میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ نہایت دلیر اور جری بزرگ تھے۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور انڈیمان بھیج دیے گئے۔ وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدارسی: اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک اور بہت منتظم و قابل شخص تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں ان کی خدمات ہمیشہ نمایاں رہیں۔ ان کی بے پناہ سرگرمیوں کا بڑے بڑے انگریزوں نے اعتراف کیا اور انھیں خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے تھے اور ایک عرصے سے انگریز کے خلاف فضا ہموار کر رہے تھے۔ فوج میں ان کی خفیہ کوششوں کا سلسلہ جاری تھا اور یہ اہم ذمے داری انھوں نے متعدد معتبر افراد کے سپرد کر رکھی تھی۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ احمد اللہ شاہ مدراسی انگریزوں کے خلاف جگہ جگہ وعظ کہتے اور ان کے اقتدار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں کوشاں رہتے۔ کہیں اپنے اصلی لباس اور وضع وہیئت میں پہنچے اور کہیں فقیروں کے بھیس میں گئے۔ ہر جگہ انگریز کی مخالفت کی۔ اس مرد مجاہد کو شاہ جہان پور سے شمال مشرق میں اٹھارہ میل دور راجا پوائیں جگن ناتھ کے بھائی نے گولی مار کر اس وقت شہید کر دیا تھا' جب وہ ہاتھی پر سوار تھے اور اس کی دعوت پر پوائیں گئے تھے۔ اس دغاباز راجا نے

خود ہی انھیں اپنے ہاں بلایا تھا۔ اس میں انگریز کے خلاف جنگ کرنے کی جرأت تو نہ تھی، البتہ اس شجاع و جری مجاہد کو ختم کر دیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی: کیرانہ ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ نیک نفس اور متدین بزرگ تھے۔ انگریزوں سے ان کو عداوت تھی۔ عیسائی لٹریچر پر بہت عبور تھا۔ بڑے بڑے نامور پادری ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان کا فیصلہ کن مناظرہ مشہور پادری فنڈر سے رجب ۱۲۷۲ھ (مارچ ۱۸۵۶ء) کو آگرے میں ہوا، جس میں پادری مذکور نے شکست کھائی اور اس شکست سے وہ اتنا بددل ہوا کہ اس کے بعد اسے ہندوستان میں رہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور انگلستان چلا گیا۔

اضطراب میرٹھ کے بعد بغاوت کے آثار مظفر نگر پہنچے تو گرد و پیش کے لوگوں نے مولانا کو اپنا سالار مقرر کر لیا اور انگریز کے خلاف داد شجاعت دی۔ انگریز کامیاب ہوئے تو مولانا کی تلاش شروع ہوئی۔ نہ ملے تو گرفتاری کا اشتہار دیا گیا۔ سراغ لگانے اور گرفتار کرانے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا۔ لیکن مولانا ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ہجرت سے کافی عرصہ بعد ۳۰ جنوری ۱۸۶۴ء کو انگریزی حکومت نے ان کی جائداد ضبط کر لی تھی۔

نوابوں اور تعلقہ داروں کی شرکت:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علمائے دین اور فوجیوں کے علاوہ نوابوں، تعلقہ داروں، راجوں اور عام اصحاب اثر و رسوخ نے بھی شرکت کی اور آزادیٔ وطن کے لیے آمادۂ پیکار ہوئے۔ ان حضرات میں مسلمان بھی شامل ہیں اور مرہٹے بھی، اور ان کے مشترکہ عمل و سعی کی داستان بہت طویل ہے۔ یاد رہے اس سے قبل مرہٹے ہمیشہ مغل حکومت کے مخالف رہے تھے، لیکن اب وہ مغلوں کے حامی اور ان کے دشمنوں کے حریف تھے۔ ان مختلف باہمت لوگوں میں شہزادہ فیروز شاہ، تانتیا ٹوپے، نواب علی بہادر، نواب تفضّل حسین، خان بہادر خاں، ڈھونڈو پنت نانا، عظیم اللہ خاں، رانی لکشمی بائی (جھانسی)، راجا کنور سنگھ اور نواب محمود خاں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر الفاظ میں یہاں ان کا تعارف کرا دیا جائے۔

۱۔ شہزادہ فیروز شاہ: مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مذہبی امور کی طرف اس کا زیادہ رجحان تھا۔ اوراد و وظائف سے بہت شغف تھا۔ ۱۸۵۶ء میں وہ حج کے لیے گیا۔ واپس آیا تو ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع تھا۔ شہزادے نے بھی اس میں حصہ لیا اور مختلف معرکوں میں مجاہدین کے ساتھ داد شجاعت دیتا رہا۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، تانتیا ٹوپے، نانا راؤ اور ان کے رفقا کی معیت میں مصروف جنگ رہا۔ تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد اس کے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں۔

ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ایران اور روس ہوتا ہوا حجاز پہنچ گیا تھا۔ وہاں مکہ معظمہ میں مولانا

رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، مولانا محمد یعقوب دہلوی، شاہ محمد اسحاق دہلوی اور مولانا محمد مظہر مجددی وغیرہ نے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کی غرض سے ایک جماعت قائم کی تھی، شہزادہ فیروز شاہ بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔

ایک روایت کے مطابق اپریل ۱۸۶۸ء میں جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ کے ساتھ باج کٹہ (علاقہ بونیر سرحد آزاد) میں مقیم ہوا۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں شہزادہ مذکور زندہ تھا۔ غرض شہزادہ فیروز شاہ مرد مجاہد اور راسخ عزم وارادے کا مالک تھا۔ لیکن وہ جنگ آزادی کے بعد کدھر گیا اس کا یقینی علم نہ ہو سکا۔

۲۔ تانتیا ٹوپے: ایک بہادر مرہٹہ جرنیل تھا۔ اس کا اصلی وطن تو علاقہ ناسک کے ضلع پٹورہ میں ایک گاؤں تھا، لیکن کان پور کے متصل بھٹور میں ڈھونڈو پنت نانا کے پاس مقیم تھا اور نانا کا مصاحب و ندیم تھا۔ اس بہادر جرنیل نے متعدد مقامات میں انگریز کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، لکشمی بائی رانی جھانسی اور نانا کے ہم رکاب ہو کر شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے اور ہر میدان میں انگریزی فوج کو زک پہنچائی۔ رانی جھانسی کے مارے جانے کے بعد وہ بہت سے مقامات میں گھومتا رہا اور انگریزی حکومت گرفتاری کے لیے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس اثنا میں گوالیار کے ایک ماتحت رئیس مان سنگھ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ مان سنگھ کی مہاراجا گوالیار سے چپقلش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ مہاراجا کے خلاف لڑائی کرنا چاہتا تھا اور جنگل میں چھپا بیٹھا تھا۔ تانتیا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور دونوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ جب انگریزی حکومت کو اس صورت حال کا علم ہوا تو اس نے مان سنگھ سے گفتگو کی اور مہاراجا گوالیار سے اس کی صلح کرانے کا وعدہ کیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ تانتیا کو گرفتار کرا دے گا۔ چنانچہ ۷/اپریل ۱۸۵۹ء کو نصف رات کے وقت مان سنگھ نے دھوکے سے تانتیا کو گرفتار کرا دیا۔ انگریزی حکومت کا جو دستہ اسے گرفتار کرنے آیا، مان سنگھ اس کے ساتھ تھا۔ یہ دستہ تانتیا کو گرفتار کر کے ۸/اپریل کی صبح کو فوجی کیمپ میں لے گیا۔ مان سنگھ کو اس ''خدمت'' کے صلے میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔ اسی جاگیر میں انگریزوں کی فوجی عدالت میں تانتیا پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸/اپریل ۱۸۵۹ء کو سپری کے مقام پر اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت جنرل تانتیا کی عمر پینتالیس برس کی تھی۔

۳۔ نواب علی بہادر: یو پی کی ایک ریاست باندہ کا نواب تھا۔ جب کان پور میں انگریزوں کے خلاف ہنگامہ ہوا تو کچھ فوجی اس کے پاس آئے اور انگریزوں کی مخالفت میں لوگوں کو مشتعل کیا۔ خود علی بہادر کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، شرافت نفس کی بنا پر ابتدا میں تو ان کے ساتھ جانے سے یہ پس و پیش کرتا رہا لیکن بعد کو باقاعدہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں کود پڑا۔ جب انگریزی فوج باندہ پہنچی تو یہ کالپی چلا گیا۔ وہاں تانتیا ٹوپے اور رانی جھانسی کی معیت میں انگریز سے معرکہ آرا ہوا۔ شکست کے بعد روپوش ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء

میں جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریا نے اعلانِ معافی جاری کیا تو نواب علی بہادر نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ لیکن انگریزوں نے اس کو معافی دینے کے بجائے اس کی ریاست چھین لی اور اسے اندور میں نظر بند کر دیا۔ تین سو روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں نواب علی بہادر نے اندور ہی میں وفات پائی۔

۴۔ خان بہادر خاں: خاندانی طور پر ریاست کا مالک تھا۔ لیکن اب ریاست ختم ہو چکی تھی اور بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھا۔ ۱۸۵۷ میں پنشن پا رہا تھا اور عمر ستر سال کی تھی۔ روہیل کھنڈ کا علاقہ کسی زمانے میں اس کے خاندان کے زیرنگیں رہ چکا تھا' اس لیے وہاں کے باشندے اس کی بہت تکریم کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے شعلے جب ہر جانب بھڑک اٹھے تو بریلی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اور جنرل بخت خاں کی کوشش سے اس علاقے کے انتظامات اس بوڑھے نواب کے سپرد کر دیے گئے۔ اس کبرسنی میں بھی یہ نہایت منتظم' بہادر اور پرجوش تھا۔ پورے علاقے کے نظم ونسق کو اس نے مستحکم کر لیا تھا۔ اس کی فوج میں ایک ایسا جیش بھی تھا جس کے سب افراد نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ میدان جنگ میں ڈٹے رہیں گے تاوقتیکہ خود مر جائیں یا دشمن کو مار ڈالیں۔ یہ سب بوڑھے فوجی تھے لیکن بڑے وجیہ اور بارعب تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید ہو چکی تھیں۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں جن پر قرآن کی آیتیں نقش تھیں۔ وہ دشمن پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حملہ کرتے تھے۔ ان کے گھوڑے بہت تیز رو تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ انگریزی فوج کے مددگار پنجابی سکھوں پر ایسا شدید حملہ کیا کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔

خان بہادر خاں جواں مردی سے لڑا اور دشمن کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۹ء میں کوہستان نیپال کی ایک لڑائی میں اتفاق سے گھوڑے پر سے گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ کمشنر لکھنؤ کے سامنے پیش کیا گیا تو زمین پر بیٹھ گیا۔ کرسی پیش کی گئی تو کہا' ہمیشہ کرسی پر بیٹھے' اب قیدی ہیں تو قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے۔ کمشنر لکھنؤ نے بزور کرسی پر بٹھایا۔ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھانسی دینے کے لیے اسے لکھنؤ سے بریلی لایا گیا۔ منقول ہے کہ جب اسے پھانسی دینے لگے تو کہا گیا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو کر لو۔ جواب دیا' کوئی وصیت نہیں' اور یہ شعر پڑھا:

بہ جرم کلمہ حق می کشند غوغائیست
زمرگ زند گیم می شود تماشائیست

پھانسی کے بعد نعش وارثوں کے حوالے کرنے کے بجائے بریلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں دفن کر دی گئی۔

خان بہادر کی مہر پر الحکم للہ والملک للہ کے الفاظ کندہ تھے۔

۵۔ عظیم اللہ خاں: ایک باتدبیر اور صاحب الرائے شخص تھا۔ کان پور کا رہنے والا تھا۔ انگریز کی مخالفت اس کا وظیفۂ حیات تھا۔ ڈھونڈو پنت (نانا راؤ) کا معتمد علیہ اور مشیر تھا۔ اس کی وکالت کے سلسلے میں انگلستان بھی گیا تھا۔ انگریز سے دشمنی کی آگ اس کے سینے میں ہمیشہ مشتعل رہی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے

خلاف ترکوں نے قسطنطنیہ میں جو محاذ جنگ قائم کر رکھا تھا' اس نے وہ بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا اور یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ ہندوستان میں ہم بھی انگریز کو شکست دے سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران کئی محاذوں پر لڑا اور انگریزی فوج کو ہزیمت سے دو چار کیا۔ لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی رہا۔ تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد نیپال چلا گیا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں وہیں انتقال کیا۔

۶۔ ڈھونڈو پنت نانا: ایک دلیر اور ہمت ور مرہٹہ تھا۔ ریاست کا مالک تھا جسے انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور کان پور سے متصل بٹھور میں سکونت پذیر تھا۔ ریاست کی واپسی کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شرکت کی اور انگریزوں سے لڑا۔ عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپے اس کے خاص مشیر و مصاحب تھے۔ جنگ کے متعدد محاذ قائم کیے' کہیں شکست کھائی اور کہیں فتح یاب ہوا۔ آخر میں حضرت محل کے پاس لکھنؤ گیا۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی بھی وہیں تھے۔ حضرت محل نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور بہت احترام سے جگہ دی۔ تسخیر لکھنؤ کے بعد نیپال چلا گیا تھا اور فقیرانہ اور درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

۷۔ کنور سنگھ: صوبہ بہار کے ضلع جگدیش پور کا راجپوت رئیس تھا۔ انگریزوں نے اس پر مالیے کے بعض مقدمات دائر کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں اس کی عمر اسی (۸۰) سال کی تھی۔ آزادیٔ وطن کی خاطر اس بوڑھے بہادر نے تلوار ہاتھ میں لی اور تادم مرگ اسے سنبھالے رکھا۔ با تدبیر اور فہیم شخص تھا۔ انگریز جرنیل اس کی جنگی تدبیروں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک دفعہ اپنی فوج کے ساتھ دریائے گنگا عبور کر رہا تھا کہ انگریزی فوجیں آ پہنچیں اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک گولی اس کی کلائی پر لگی۔ زخم بہت شدید تھا' لیکن میدان جنگ میں علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ جب گنگا پار کر چکا تو زخمی کلائی پر زور سے تلوار ماری اور اسے کاٹ ڈالا۔ کلائی کو دریائے گنگا میں پھینکتے ہوئے گنگا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ماتا! اپنے سپوت کی اس آخری قربانی کو شرف قبول عطا کر۔"

اسی حالت میں تین روز تک لڑتا رہا اور آرہ کے معرکے میں فتح یاب ہوا۔ لیکن کلائی کے زخم کی تکلیف نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ تین روز بعد میدان جنگ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بہر کیف ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت عوامی اور ملک گیر تھی۔ اس میں سکھوں کے سوا سب نے حصہ لیا۔ سکھ نہ صرف خاموش اور الگ رہے' بلکہ ناکامی کے بعد انگریز کے ساتھ مل کر انھوں نے قتل و غارت کی انتہا کر دی۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں کے سربراہوں نے جن میں پٹیالہ' نابھہ' جیند اور فرید کوٹ کے سکھ رئیس شامل تھے' دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

بعد کو ہندوؤں نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ تنہا مسلمان میدان میں رہ گئے تھے اور پھر یہی انگریز کا نشانہ ستم بنے۔ ہندو آخر میں چونکہ انگریزی حکومت کے معاون ہو گئے تھے' اس لیے فتح دہلی کے بعد جب لوگوں کو دوبارہ ان کے گھروں میں بسانے کا مسئلہ پیش آیا تو پہلے ہندوؤں کو جگہ دی گئی۔ مسلمانوں کی باری بہت بعد میں آئی۔

جنگ آزادی اور وہابی:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن علمائے دین نے حصہ لیا' ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق ''وہابیوں'' سے تھا اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے ان کا گہرا رشتہ تھا۔ جنرل بخت خاں اور اس کے ساتھی بھی ''وہابیت'' سے منسلک تھے۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں:

دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں وغوث محمد خاں ومولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا' اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا ❶۔

اسی طرح مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں تحریر کرتے ہیں کہ بہادر شاہ کے مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

''اس ہنگامے میں ''وہابیوں'' نے بھی نمایاں حصہ لیا اور نہ صرف ٹونک سے بلکہ ہر جگہ سے آئے۔ بخت خاں خود وہابی تھا۔ اس کے علاوہ محمد شفیع رسالدار' مولوی امام خاں رسالدار' سرفراز علی جسے بخت خاں نے غازیوں کا سالار بنایا' انھوں نے فتویٰ بھی چھاپا کہ مسلمان مذہبی جنگ کے لیے میدان میں آجائیں۔ جے پور' بھوپال' ہانسی' حصار وغیرہ سے بھی وہابی آئے ❷۔

دوسری جگہ یہ لفظ بھی ہیں کہ ''بخت خاں کی آمد پر بہت سے وہابی شامل ہوئے ❸۔''

انگریز نے لفظ وہابی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اسے باغی کے مترادف قرار دیا۔ یعنی جو لوگ انگریزی اقتدار کی مخالفت کرتے تھے' انھیں وہابی کے نام سے موسوم کیا اور بغاوت اور وہابیت انگریز کی ڈکشنری میں ایک ہی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو بھی وہابی کہا گیا اور جن لوگوں پر اس کے بعد بغاوت کے مقدمات دائر کیے گئے اور پھر انھیں پھانسی دیا گیا یا کالے پانی بھیجا گیا' انھیں بھی وہابی قرار دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے مقدمات بغاوت کی مناسب تفصیلات ان شاء اللہ اس کتاب کی اگلی جلد کے مقدمے میں بیان کی جائیں گی۔

بخت خاں کا مخلصانہ کردار:

اس دور کے فوجی افسروں میں جنرل بخت خاں سراپا خلوص افسر تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء میں ماہ جون کے آخر

❶ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات) ص ۴۰۸

❷ ۱۸۵۷ء ص ۲۰۵

❸ ایضاً ص ۱۲۳

میں دہلی پہنچا۔ ایک باقاعدہ اور منظم فوج اس کے ساتھ تھی' جس کو وہ چھ مہینے کی پیشگی تنخواہ ادا کر چکا تھا۔ اس کی فوج ہر قسم کے جنگی ساز و سامان سے لیس تھی۔ اچھی خاصی رقم بھی اس نے سرکاری خزانے میں جمع کرا دی تھی۔ ذاتی طور پر وہ بہت قابل' منتظم اور جنگ جو تھا۔ جرأت اور شجاعت کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے اور ہر نوع کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا۔ لیکن اس کے ورود دہلی سے پہلے ہی مغل شہزادے انتظامی امور پر قابض ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے بے شک اختیارات بخت خاں کو تفویض کر دیے تھے' لیکن شہزادے اسے برداشت کرنے کو تیار نہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا شخص دہلی کی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے۔ وہ قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کرتے اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی انتظام صحیح نہ ہو سکا اور حالات لمحہ بہ لمحہ خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ بادشاہ بیاسی سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا اور یاس و نا امیدی نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ شہزادے نااہل تھے اور کوئی اہم قدم اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ جو لوگ صلاحیت کے جوہر سے آراستہ تھے' ان کو آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا' یعنی انگریزوں کی پوزیشن مضبوط ہوتی گئی اور ان کے قدم جمتے گئے۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دوپہر کے بعد ان کی فوج لال قلعے میں پہنچ گئی اور سپہ سالار روسن نے دیوان خاص کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ انگریزوں کے لیے یہ نہایت خوشی کا موقع تھا۔ انھوں نے دیوان خاص میں شراب کی بوتلیں کھولیں اور ملکہ وکٹوریا کا جام صحت نوش کیا ـــــــ یہاں یہ یاد رہے کہ دہلی کا لال قلعہ ۱۶۴۸ء کو تعمیر ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء میں اس کی تکمیل پر دو سو نو سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس اثنا میں اس کے پر ہیبت در و دیوار نے پہلی مرتبہ ایک اجنبی حکمران کا جام صحت تجویز ہونے کی صدا سنی۔

۱۹ ستمبر کو شہر کے اکثر حصے پر انگریز قابض ہو گئے تھے اور قلعے پر گولیاں برس رہی تھیں۔ بادشاہ اپنے آپ کو سخت خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا' اس لیے وہ قلعے کی سکونت ترک کر کے باہر آ گیا تھا۔ سپہ سالار بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ انگریزوں نے اگر دہلی کو فتح کر لیا ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے ہندوستان کی سرزمین کھلی پڑی ہے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیے' ہم جان کی بازی لگا دیں گے اور پامردی سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے۔ جنگی نقطۂ نظر سے شہروں کو لڑائی کے لیے موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ دہلی شہر تو موقع و محل کے لحاظ سے بالخصوص لڑائی کے لیے مناسب نہیں۔ شہر نشیب میں ہے اور انگریزی فوج پہاڑی پر اونچی جگہ مورچے سنبھالے ہوئے ہے۔ اب تک ہم نے انگریزی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا ہے۔ بخت خاں نے بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ آپ نے مرزا مغل بہادر کو سپہ سالار بنا دیا تھا' جسے فنون حرب کا کوئی تجربہ نہیں۔ باہر سے رسد لانا بھی آسان نہ تھا۔ ان حالات میں اگر ہم دہلی سے باہر چلے جائیں گے تو کامیابی کی بہت امید ہے۔

بادشاہ نے بخت خاں کی یہ باتیں غور سے سنیں اور متاثر بھی ہوا' لیکن فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کہا کہ آج تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں' کل وہاں آ کر ملو۔ پھر مستقبل کے لیے کوئی آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

بہادر شاہ کی حوالگی:

بادشاہ اب چھیانوے (۹۶) افراد کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کی چہیتی بیگم زینت محل بھی ساتھ تھی۔ مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دے۔ مرزا الٰہی بخش انگریزوں کا تنخواہ دار تھا اور اس کی ایک بیٹی بہادر شاہ ظفر کے دوسرے ولی عہد فخر الدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کے نکاح میں تھی۔ منشی رجب علی کو ارسطو جاہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہ شخص جگراؤں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کا باشندہ تھا اور انگریزوں کا ایجنٹ اور مخبر تھا۔ ان دونوں نے بیگم زینت محل سے اس طرح باتیں کیں کہ وہ ان کے فریب میں آ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر بادشاہ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دے تو وہ ضرور اس کو معاف کر دیں گے۔ بھولا بادشاہ ان کے سامنے جھک گیا اور ان کو اپنے بہی خواہ اور محسن سمجھنے لگا۔

بادشاہ نہایت پریشانی میں تھا۔ ۱۹ ستمبر کی رات کو قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گیا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو بخت خاں وہاں پہنچا اور اس سے گفتگو کی۔ لیکن اس اثنا میں زینت محل، رجب علی اور الٰہی بخش اس کو باغی فوج سے علیحدگی اختیار کرنے اور خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینے پر آمادہ کر چکے تھے۔ بخت خاں سے بات ہوئی تو اسے انتہائی تکلیف پہنچی۔ ایک مرتبہ تو بخت خاں نے غصے میں آ کر تلوار میان سے نکال لی اور مرزا الٰہی بخش کو قتل کرنے پر اتر آیا۔ لیکن بادشاہ نے اسے روکا اور کہا کہ "آپ کی رائے درست ہے۔ انگریزوں سے لڑنا چاہیے، لیکن میں یہ نہیں کر سکتا۔ میرے جسم کی توانائی جواب دے چکی ہے۔ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ ہر صورت میں جہاد جاری رکھیں، تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے[1]۔

گرفتاری:

بہر حال تیمور کے وارث بہادر شاہ ظفر نے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے اور میجر ہوڈسن نے اس کو گرفتار کیا۔ بادشاہ نے صرف اپنی بیگم زینت محل، شہزادہ جوان بخت (جو زینت محل کے بطن سے تھا) اور خود اپنی جان کی امان طلب کی، جو دے دی گئی۔ باقی بیٹوں، پوتوں اور خاندان کے دیگر شہزادوں اور افراد کی جان بخشی کا وعدہ نہیں لیا۔ بادشاہ کے اس طرزِ عمل کو بہر حال تعجب انگیز اور افسوس ناک قرار دیا جائے گا۔

بخت خاں:

اب دہلی فتح ہو چکی تھی۔ بادشاہ انگریزوں کی حراست میں تھا۔ باشندگانِ شہر کے قتل و غارت کا سلسلہ شروع

---

[1] ۱۸۵۷ء بحوالہ میلی سن ج ۴ ص ۵۴

ہو گیا تھا اور بخت خاں نہایت افسوس کے ساتھ دہلی سے نکل گیا تھا۔ وہ ایک بہادر اور مخلص جرنیل تھا‘ جو حسرت و ملال کے ساتھ دہلی سے رخصت ہوا۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد پہنچا۔ اوائل نومبر میں وارد لکھنؤ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ فروری ۱۸۵۸ء تک وہیں رہا۔ اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کی بیوی اور برجیس قدر کی والدہ حضرت محل نے جو لکھنؤ میں انگریزوں سے برسر پیکار تھی‘ بخت خاں کے ساتھ نہایت احترام کا برتاؤ کیا اور اسے تسلی دی۔ لکھنؤ اور اس کے نواح کی بعض جنگوں میں اس کی شرکت کا پتا چلتا ہے۔ جب وہ لکھنؤ پہنچا تو دہلی اور فرخ آباد کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ تھے تین سو عورتیں بھی اس کے قافلے میں شامل تھیں۔ پانچ ہزار فوجی اس کے ہم رکاب تھے۔

جب لکھنؤ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو بخت خاں کے غم و افسوس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب وہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی معیت میں شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا۔ پھر مختلف مقامات سے ہوتا ہوا نیپال میں داخل ہوا۔ باقی زندگی وہیں بسر کی‘ لیکن کس حالت میں بسر کی اور کب وفات پائی؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔ جب انگریزوں نے ملک فتح کر لیا اور ہنگامہ ختم ہو گیا تو اس کی بہت تلاش کی گئی‘ لیکن نہ وہ کہیں ملا‘ نہ کسی سے اس کے متعلق کچھ سنا گیا۔ وہ کسی لڑائی میں مارا بھی نہیں گیا۔

شہزادوں کی گرفتاری اور قتل:

بادشاہ کے زیر حراست آ جانے کے بعد منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کی اطلاع اور مخبری پر میجر ہوڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کے دو بیٹوں‘ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان‘ اور ایک پوتے ابوبکر مرزا کو گرفتار کیا۔ خضر سلطان بہت اچھا شاعر بھی تھا اور غالب کا شاگرد تھا۔ غالب نے ایک غزل میں اس کے متعلق کہا ہے:

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شہزادوں کے ساتھ ان کے متعلقین و متوسلین بھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو مقبرہ ہمایوں میں چھپے بیٹھے تھے اور جنھیں رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کی مخبری پر گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے وقت رجب علی اور الٰہی بخش انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ یہ بہت بڑے غدار تھے‘ جنھوں نے دہلی میں انگریزی فوج کا ساتھ دیا اور بادشاہ کی گرفتاری‘ شہزادوں کے قتل اور بے شمار لوگوں کی موت کا باعث بنے۔ غداری میں یہ کسی صورت میں بھی بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق سے کم نہیں ہیں‘ جنھوں نے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے مقابلے میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان دونوں حکمرانوں کو دھوکے سے قتل کرایا۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ جب انگریزی فوج میجر ہوڈسن کی قیادت میں شہزادوں کو گرفتار کرنے آئی تو شہزادوں نے اپنے رفقا سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ رفقا نے جواب دیا‘ تیموری خاندان کے لوگوں کی روایت یہ ہے کہ وہ خود بخود قید نہیں ہوتے اور کسی طاقت سے خوف زدہ ہو کر پیچھے قدم نہیں

ہٹاتے۔ وہ تلوار اٹھا کر میدان میں اترتے اور دشمن سے معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی تیمور کے خون کی لاج رکھنی چاہیے اور بہادروں کی طرح میدان محاربہ میں نکلنا چاہیے۔ مرنا ہی ہے تو پھر جرأت مند لوگوں کی طرح کیوں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ مریں۔

افسوس ہے شہزادوں نے اپنے مخلص اور جاں نثار ساتھیوں کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ ان پر بزدلی چھا گئی تھی اور غیرت وحمیت کی دولت سے وہ تہی دامن ہو چکے تھے' یا پھر مرزا الٰہی بخش اور رجب علی نے ان کو تحفظ وصیانت کے فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور انھیں یقین دلا دیا تھا کہ انگریز معاف کر دیں گے اور ہر صورت میں ان کی جان بخشی ہو جائے گی۔ حالانکہ حالات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ عفو و درگزر کی ہرگز کوئی گنجائش نہ تھی۔ بلکہ ہوڈسن خود بیان کرتا ہے کہ دو گھنٹے کی لفظی نزاع اور امید وبیم کی اضطراب انگیز حالت کے بعد شہزادے مقبرہ ہمایوں سے نمودار ہوئے اور پوچھا ''کیا ہماری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہو''؟ میں نے جواب دیا ''قطعاً نہیں۔'' اور انھیں پہرے کی حفاظت میں شہر کی جانب روانہ کر دیا۔

بہر حال شہزادوں نے ہتھیار ڈال دیے اور سائبان والی بیل گاڑی میں وہ ہمایوں کے مقبرے سے باہر نکلے۔ میجر ہوڈسن نے ان کو انگریزی فوج کے گھیرے میں لے لیا۔ انگریز کی بارگاہ سے ان کی جان بخشی کی درخواست مسترد ہو چکی تھی۔ شہزادوں کی گاڑی مقبرے سے باہر نکلی اور شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ ہوڈسن گھوڑے پر سوار تھا اور ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ایک بڑا ہجوم بھی ساتھ تھا جو شہزادوں کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ انگریز کے مخالف اور شہزادوں کے حامی تھے' لیکن بے بس اور مجبور تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی تھوڑا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ہوڈسن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا' وہ بہت بپھرا اور غصے میں تھا۔ گھوڑا دوڑا کر بیل گاڑی کے قریب پہنچا۔ شہزادوں کو گاڑی سے نیچے اترنے اور اوپر کا لباس اتارنے کا حکم دیا۔ اب شہزادے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے تند و تلخ لہجے میں' اپنے سواروں سے مخاطب ہو کر کہا' تاکہ ہجوم بھی سن لے۔

''یہ قیدی وہی قصاب ہیں جنھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا۔ حکومت انھیں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی ہے۔''

ہوڈسن کے یہ الفاظ انتہائی سخت لہجے میں فضا میں گونجے اور خاموشی چھا گئی۔ اس نے فوراً اپنے ایک سوار سے قرابین لی اور یکے بعد دیگرے بے دست و پا تینوں شہزادوں کو گولی سے اڑا دیا۔ مجمعے کے اداس اور مجبور لبوں پر اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور دہشت زدہ مسلمان خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

شاہی خاندان کے افراد کا قتل' پھانسی اور قید:

دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں شاہی خاندان کا جو فرد ملا' انگریزوں نے اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس میں بوڑھوں' بچوں اور جوانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ چھوٹے بڑے جو شہزادے گرفتار

کیے گئے' ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے' جن میں لنگڑے' بیمار' بوڑھے سب شامل تھے اور سب کو پھانسی دی گئی۔ تمام شہزادوں سے بڑی عمر کا شہزادہ قیصر تھا' جو شاہ عالم ثانی کا بیٹا اور اکبر شاہ ثانی کا بھائی تھا' اسے بھی پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھر اکبر شاہ ثانی کا پوتا مرزا محمود شاہ وجع المفاصل کا مریض تھا اور چلنے پھرنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتا تھا' اس کو بھی تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وجع المفاصل کی بیماری کی وجہ سے اس کا جسم گٹھڑی بنا ہوا تھا اور پھانسی کی حالت میں گولا سا معلوم ہوتا تھا۔

نواب احمد قلی خاں کبیر السن اور ضعیف آدمی تھا۔ زینت محل کا باپ اور بہادر شاہ کا خسر تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی اولاد سے تھا۔ انگریزی فوج فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئی تو یہ بھاگ گیا' لیکن جھجر میں پکڑا گیا۔ بے چارہ بوڑھا آدمی قید کی اذیتیں برداشت نہ کر سکا اور قید خانے ہی میں وفات پا گیا۔

ولیم مور اس زمانے میں انگریزوں کے محکمہ مخابرت کا سربراہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس نے اپنے محکمے کی دستاویزات دو جلدوں میں مرتب کی تھیں ان میں شہزادوں کی اذیت اور قید و بند کے بارے میں بعض تاریخ وار معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مختصر الفاظ میں اس کا بیان یہ ہے:

۱۔ ۱۳- اکتوبر ۱۸۵۷ء: بہادر شاہ کے بیٹوں مرزا مینڈھو اور مرزا بختاور شاہ پر مقدمہ چلایا گیا۔

۲۔ ۱۳- اکتوبر ۱۸۵۷ء: مرزا مینڈھو اور مرزا بختاور کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

۳۔ ۱۴- اکتوبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ کے تینوں بیٹوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ دو مجرم قرار پائے اور انھیں گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ تیسرے کے خلاف مقدمہ جاری ہے۔

۴۔ ۱۸- اکتوبر ۱۸۵۷ء: چوبیس شہزادوں کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ ان میں دو بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ دو سالے۔ باقی بھتیجے' بھانجے وغیرہ۔

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی' ان کی حالت انتہائی دردناک اور اذیت انگیز تھی۔ عام قاعدے کے مطابق ان سے مشقت لی جاتی تھی' لیکن وہ جیل کی مشقت نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے چکی پسوائی جاتی تھی۔ نہ پیس سکتے تو کوڑے مارے جاتے۔ اس حالت میں شاہی خاندان کے کتنے ہی افراد چند روز میں موت کا لقمہ بن گئے۔

دہلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت:

۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی کو نشانۂ ستم بنایا اور پھر اس میں لوٹ مار' قتل و غارت' آتش زنی اور پکڑ دھکڑ کا جو سلسلہ شروع کیا' اس کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور قلم کی زبان سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ فتح دہلی کے بعد انھوں نے باشندگان شہر پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص جو مظالم ڈھائے اس کی تفصیل کا اظہار انتہائی الم انگیز اور زہرہ گداز ہے۔ کئی مہینے آتش ستم مشتعل رہی جس میں مسلمانوں کا سرمایۂ جان و مال اور متاع عزت و آبرو خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر ہوتے رہے۔ دہلی برصغیر کا وہ شہر ہے جسے سیکڑوں سال تک دینوی جاہ

وجلال کی شان دار بہاریں دیکھنے کے مواقع بھی میسر آئے اور آتش وخون کے خوف ناک طوفانوں میں غوطہ زنی بھی کرنا پڑی۔ بہت سے بے رحم فاتحین نے اس کے باشندوں سے انتہائی وحشت ناک سلوک روا رکھا اور اس کے درودیوار پر جوروہشت کے ہیبت ناک نقوش ثبت کیے۔ لیکن انگریزوں نے اس بلدۂ مظلوم کے ساتھ جو کچھ کیا' وہ ایسا خوں چکاں مرقع تھا کہ دہلی کے چرخ نیل گوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ محلوں کے محلے بے آباد کر دیے گئے۔ مکان جلا دیے گئے یا منہدم کر دیے گئے۔ اصحاب عزوجاہ کو شہر سے نکال دیا گیا اور وہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے علما وصلحا اور شعرا و فضلا کو یا تو جیلوں میں ڈال دیا گیا' یا قتل کر دیا گیا اور یا پھر شہر بدر کر دیا گیا۔ مستورات کی حالت نہایت تکلیف دہ تھی۔ جن خواتین نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا' انھیں بے پردگی کی حالت میں پیادہ پا چلنا پڑا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ ٹانگیں سوج گئیں۔ صحرا نوردی اور ایسی مسافت جس کی منزل کا کوئی علم نہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ کہاں جانا اور کہاں رکنا ہے۔ عصمت وعفت کی حفاظت بہت بڑا مسئلہ تھا' اس کے لیے بے شمار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ پھر ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ بہت سی جانیں اس کی نذر ہو گئیں۔ متعدد عورتیں اس لیے کنوؤں میں کود پڑیں کہ دربدر کی خاک چھاننے سے مر جانا ہی بہتر ہے۔ کئی سال بعد جب کنوئیں صاف کیے گئے تو بہت سے کنوؤں سے عورتوں کی لاشیں نکلیں۔ دور دور تک ہر طرف پناہ گیروں کے قافلے ہی قافلے نظر آتے تھے' جوان جانی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ کوئی خاندان کسی گاؤں میں چلا گیا۔ کسی نے کسی شہر میں جا کر پناہ لی۔ کوئی جنگل میں جا بیٹھا۔ کسی نے کھنڈر میں گھس کر جان بچائی۔ کسی نے گڑھے میں ڈیرا جما لیا اور کوئی دور دراز مقام میں جا بسا۔ بہرحال ایک افراتفری کا عالم تھا اور انتہائی اذیت ناک حالات تھے۔ دہلی میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ پورا شہر' شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔ انگریزی فوج کے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کسی سمت سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چاروں طرف اتنی انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں کہ انھیں کھا کھا کر کتے اور گدھ بھی اکتا گئے تھے۔

مسلمانوں کی بربادی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی:

اس ہنگامے میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا' ان کی بربادی کے بہت سے اسباب تھے۔ بے شمار لوگ مارے گئے' ان کے گھروں کو لوٹا گیا' مال واسباب تباہ ہوا' غربت اور جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کیں' جاگیریں ضبط ہوئیں' ریاستیں چھنیں' پنشنیں ختم ہوئیں' جائدادیں لٹیں اور معزز لوگ ذلت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کا نقصان یا تو کئی علاقوں میں ہوا ہی نہیں یا ہوا تو بہت کم۔ پھر ایک عرصے کے بعد جب دہلی آباد ہونے لگی اور بے گھر لوگ واپس آئے تو مسلمانوں کے جو مکان ضبط ہو کر نیلام ہوئے تھے' وہ ہندوؤں کے قبضے میں چلے گئے۔ ان کوچوں کہ مسلمانوں سے بہت پہلے آباد کیا گیا تھا' اس لیے مسلمانوں

کا وہ مال جو انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا، نیلام ہونے لگا تو ہندوؤں نے خرید لیا اور نہایت سستے داموں خریدا۔ بہت سی حویلیاں ہندوؤں کی ملکیت قرار پائیں، مثلاً کلاں محل، نواب جھجر کی حویلی، مرزا خجستہ بخت کی حویلی، شیش محل، نواب منصور خاں کی حویلیاں، ان میں سے ایک ایک عمارت ایک ایک محلے کے برابر تھی۔ یہ سب نیلامی میں ہندوؤں نے خرید لیں اور وہ ان پر قابض ہو گئے۔

پھر کاروبار کی بھی سب سے پہلے ہندوؤں کو اجازت دی گئی اور انھوں نے ضرورت مندوں سے خوب پیسے کمائے۔ مسلمانوں کو بعد میں کاروبار کی اجازت ملی۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہی مال جو مسلمانوں کا تھا اور ہندوؤں نے نیلامی میں لیا تھا، اب یہی مال ہندو دکان دار ضرورت مند مسلمانوں کو بیچنے لگے اور اس میں انھوں نے بے حد نفع کمایا۔ مسلمانوں کا جو مال انگریزی سپاہیوں نے لوٹا تھا، وہ بھی مسلمان خریدنے لگے۔ یعنی اس طرح انہی کا لوٹا ہوا مال، انہی کو دوبارہ قیمتاً خریدنا پڑا، اور اس حالت میں خریدنا پڑا کہ جب ان میں کوئی مالی سکت نہ رہی تھی اور غربت وافلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جنون انتقام یہاں تک بڑھ گیا کہ مذہبی مقامات کے تقدس کا بھی کوئی خیال نہیں رکھا۔ دہلی کی کئی مسجدیں یا تو ڈھا دی گئیں یا سکھوں کو دے دی گئیں یا گھوڑوں کے اصطبل میں بدل دی گئیں یا فوج کی بارکیں بنا دی گئیں۔ مثلاً جامع مسجد سکھوں کی بارک بنی اور اس کی انتہائی توہین کی گئی۔ پانچ سال بعد ۲۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو یہ مسجد واگزار ہوئی اور مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ دس آدمیوں کی ایک کمیٹی مسجد کے انتظام وانصرام کے لیے بنا دی گئی۔ زینت المساجد کو گوروں کا مسکن بنا دیا گیا۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد، شیعہ حضرات کی سب سے بڑی مسجد تھی، اس میں گدھے باندھے گئے۔ ایک بڑی مسجد سکھوں کے گوردوارے کے قریب تھی، یہ مسجد مہاراجا جیند کو دے دی گئی اور مہاراجا نے اس کو گوردوارے میں شامل کر لیا۔ اکبر آبادی مسجد، دہلی کی مشہور مسجد تھی اور یہ وہی مسجد تھی جس میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی مدت تک قرآن وحدیث درس دیتے رہے تھے۔ اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ اورنگ آبادی مسجد بھی دہلی کی خوب صورت اور بڑی مسجدوں میں سے تھی، اس کے امام مولوی عبدالخالق تھے جو شمس العلما مولوی نذیر احمد کے خسر تھے۔ شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی نے پہلے پہل اسی مسجد میں سلسلۂ درس شروع کیا تھا، یہ مسجد بھی انگریزوں نے منہدم کرا دی۔ اس مسجد کے انہدام کے بعد حضرت میاں صاحب پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے تھے۔ قلعے کے اندر ایک مسجد، چوٹی مسجد کہلاتی تھی، انگریزوں نے جوش غضب میں اس مسجد کو بھی ڈھا دیا۔ غرض بہت سی مشہور اور بڑی بڑی مسجدیں انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بنیں۔ اندازہ کیجیے جن لوگوں نے مسجدوں اور مکانوں کو برداشت نہیں کیا، وہ مسلمانوں کا وجود کیوں کر برداشت کر سکتے تھے۔

دہلی صدیوں سے علما اور فضلا کا مرکز تھا اور علم وکمال کی ایک تاریخ اس سے وابستہ تھی۔ اس میں مختلف اہل علم کے بہت بڑے بڑے کتب خانے تھے، جو نادر ونایاب کتابوں پر مشتمل تھے۔ صرف مفتی صدر الدین

آزردہ کا کتب خانہ تین لاکھ روپے کا تھا۔ باقی کتب خانوں کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔ پھر ایک شاہی کتب خانہ تھا' جو صدیوں سے قائم تھا۔ یہ سب کتب خانے یا تو جلا دیے گئے' یا ضائع کر دیے گئے یا لوٹ لیے گئے یا پھر انھیں اٹھا کر لندن بھیج دیا گیا۔ اب وہ انڈیا آفس لائبریری کی زینت ہیں۔

ان تمام امور کی تفصیلات دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جو انتہائی دردانگیز اور افسوس ناک ہیں۔ بلکہ ان تفصیلات کا ایک ایک پہلو غم واندوہ کا ایک سیلاب اپنے اندر لیے ہوئے ہے' ہم اس کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

بہادر شاہ کا مقدمہ اور فیصلہ:

بادشاہ بہادر شاہ ظفر ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعے سے ہمایوں کے مقبرے میں گیا۔ ۱۱ مئی کو بغاوت کا آغاز ہوا اور آزاد حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح دہلی میں یہ حکومت چار مہینے آٹھ دن رہی۔ اس کے تمام کاغذات' بادشاہ کے فرمان' عرض داشتیں' دستخطی احکام' شہزادوں' سرکاری اہل کاروں' امیروں اور رئیسوں کے نام جو فرامین جاری ہوئے یا اس اثنا میں جو درخواستیں اور عرض داشتیں بادشاہ کے حضور پیش ہوئیں اور بادشاہ نے ان پر جو احکام جاری فرمائے' لال قلعے سے نکلتے وقت وہ سب وہیں رہ گئے۔ پھر یہ بادشاہ اور اس کے عمال و حکام کے خلاف استعمال ہوئے۔ یہ یقینی اور قطعی شہادتیں تھیں' جن میں کسی نوع کا شک یا اشتباہ نہیں تھا۔ بادشاہ کو چاہیے تھا کہ وہ نکلتے وقت انھیں ضائع کر دیتا۔ لیکن جلدی میں ایسا نہ ہو سکا اور بادشاہ ان کاغذات کی وجہ سے مقدمہ ہار گیا۔

بادشاہ باختلاف روایات ۲۱ یا ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو گرفتار ہوا تھا' لیکن اس کے خلاف مقدمے کا آغاز ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اس اثنا میں بادشاہ انگریزوں کی قید میں رہا اور وہ لال قلعہ جو کئی پشتوں سے اس کا مسکن تھا' اب اس کے لیے قید خانہ تھا۔ پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس کی ہدایات کے مطابق جنرل پنی (penny) نے ایک فوجی کمیشن بادشاہ کے مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا' جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ لفٹیننٹ کرنل ڈاز (Dawes) صدر

۲۔ میجر پلمر (Palmer) ممبر

۳۔ میجر ریڈمنڈ (Redmond) ممبر

۴۔ میجر سائرس (Sawyers) ممبر

۵۔ کپتان راڈنی (Rothney) ممبر

مسٹر جیمز مرفی (JAMES MURPHY) کو ترجمان مقرر کیا گیا اور میجر ہریٹ (HARRIAT) کو ڈپٹی جج ایڈووکیٹ بنایا گیا۔

مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ کو شروع ہوا' اور فوجی کمیشن کے اجلاس دیوان خاص میں ہونے لگے۔ یہ وہی دیوان خاص ہے' جس میں بادشاہ کے اذن کے سوا کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا تھا' اور جو وہاں جاتا' وہ بھی عجز و نیاز کا پیکر بن کر جاتا۔ لیکن آج خود بادشاہ کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی' اور اگر داخل بھی ہوا تو فوج کے پہرے میں اور ایک قیدی اور ملزم کی حیثیت سے! کوئی وقت تھا کہ خاندان مغلیہ کے حکمرانوں کی عظمت و برتری کے حضور کابل سے راس کماری تک عقیدت و احترام کی گردنیں جھکی رہتی تھیں۔ آج اس کی تذلیل و تحقیر کا آخری منظر بھی لوگوں کے سامنے تھا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ کو ابتدائی رسمی کارروائی کے بعد جج ایڈووکیٹ جنرل نے کمیشن کے سامنے استغاثہ پیش کیا' جس میں بادشاہ پر چار الزامات عائد کیے گئے' جو مختصر الفاظ میں یہ تھے۔

۱۔ بہادر شاہ ظفر نے برطانیہ کی حکومت ہند کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء تک محمد بخت خاں صوبے دار توپ خانہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد کمیشن یافتہ افسروں اور سپاہیوں کو بغاوت اور سرکشی پر اکسایا' اس میں امداد دی اور حصہ لیا۔

۲۔ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو جو برطانوی حکومت کی رعایا تھا' دہلی میں اور ممالک غربی و شمالی کے غیر معلوم باشندوں کو حکومت سے بغاوت اور جنگ آزمائی پر آمادہ کیا' اس میں امداد دی اور حصہ لیا۔ حالانکہ وہ سب لوگ برطانوی رعایا تھے۔

۳۔ بہادر شاہ نے برطانوی حکومت ہند کی رعایا ہونے کے باوجود ۱۱ مئی یا اس کے قریب اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ اور حکمران ہونے کا اعلان کیا اور دہلی پر دھوکے سے قبضہ کر لیا۔ انگریزی حکومت کی بربادی کے لیے جو سازشیں کی گئیں ان میں شریک رہا اور حکومت سے جنگ کی۔

۴۔ بہادشاہ ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء کو لال قلعے کی حدود میں' یورپی نسل کے انچاس افراد کو' جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے' بے دردی سے قتل کر دینے کا موجب بنا اور اس فعل میں معاون رہا۔ قاتلوں کو ملازمتیں' ترقیاں اور اعزازات دیے یا ان سے اس کے وعدے کیے۔ نیز مختلف دیسی حکمرانوں کے نام عیسائیوں اور انگریزوں کو قتل کر دینے کے احکام صادر کیے۔ یہ سب امور ایکٹ نمبر ۱۶ مصدرہ ۱۸۵۷ء کی رو سے جرم ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میرٹھ کی سپاہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو دہلی پہنچی تھی اور بادشاہ ۲۲ ستمبر کو گرفتار ہوا' اور اسی وقت انگریزی حکومت کی حراست میں لے لیا گیا' لیکن اس پر جو الزامات عائد کیے گئے' ان میں بادشاہ کے جرائم کی ابتداء ۱۰ مئی سے کی گئی اور پھر یکم اکتوبر کو اس کا آخری دن قرار دیا گیا۔ یعنی "جرائم" کے ارتکاب میں دس گیارہ دن کا اضافہ کیا گیا۔

بہر حال مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء سے شروع ہوا اور ۹ مارچ تک جاری رہا۔ کل اکیس پیشیاں ہوئیں۔ ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو فیصلہ سنا دیا گیا۔

ان الزامات کی تصدیق میں بہادر شاہ کے خلاف شہادتیں بھی ہوئیں اور تحریریں بھی پیش کی گئیں۔ لیکن بہادر شاہ نے ان الزامات کی جو اس کے خلاف عائد کیے گئے‘ تردید کی۔ بالآخر ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت میں طویل تقریر کی‘ جس میں الزامات کو ثابت شدہ قرار دیا۔ کمیشن نے تھوڑی دیر میں یہ فیصلہ سنایا:

”عدالت اس شہادت کے مطابق جو اس کے سامنے ہے‘ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ سابق شاہ دہلی کے خلاف جو الزامات لگائے گئے‘ وہ سب کلی اور جزوی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔“

میرٹھ ڈویژن کے کمان آفیسر میجر جنرل پنی (penny) نے جو فوجی کمیشن تشکیل دینے کا ذمے دار تھا‘ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو کمیشن کا فیصلہ منظور کر لیا اور اس کی تصدیق کر دی۔

جلا وطنی:

انگریزوں سے بہادر شاہ کی جان بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا‘ اس لیے سزائے موت نہیں دی گئی۔ گوروں کے سنگین پہرے میں بہادر شاہ اور اس کے رفقا کو کلکتے بھیجا گیا۔ قیدیوں کا یہ قافلہ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ (۶ نومبر ۱۸۵۸ء) کو دہلی سے روانہ ہوا۔ یہ قافلہ جن افراد پر مشتمل تھا‘ ان کی تعداد سولہ تھی اور وہ حسب ذیل افراد تھے۔

(۱) نواب زینت محل: بہادر شاہ کی بیوی

(۲) بیگم تاج محل: بہادر شاہ کی بیوی

(۳) خیرن بائی۔

(۴) ظہورن بائی۔

(۵) شہزادہ جواں بخت بن بہادر شاہ۔

(۶) مرزا عباس بن بہادر شاہ

(۷) مرزا قیصر شکوہ موسوم بہ غلام قنبر بن سلیمان شکوہ۔

(۸) نواب شاہ بادی: بیوی شہزادہ جواں بخت

(۹) شہزادہ جواں بخت کی ساس۔

(۱۰) شہزادہ جواں بخت کے سالے۔

(۱۱) بہادر شاہ کے فرزند مرزا عبداللہ کی بیگم (خیرن بائی کے بطن سے)

(۱۲) احمد بیگ آب دار۔

(۱۳) باسط علی

ان کے علاوہ کچھ ملازم بھی تھے۔ کل سولہ افراد پر یہ قافلہ مشتمل تھا۔ چھ سو گورے پہرے دار تھے اور

توپ خانہ ساتھ تھا تاکہ کوئی خطرہ پیش آئے تو مقابلہ کیا جا سکے۔ جب بادشاہ ڈولی میں سوار ہو کر گوروں کے پہرے میں دہلی سے روانہ ہوا تو ان لوگوں کے گھر میں ماتم بپا تھا' جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی زمین سے اب تک گزر اوقات کر رہے تھے۔

بادشاہ کی سواری کلکتے پہنچی تو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو جہاز میں سوار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ مرزا غالب کے ایک مکتوب میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہ کے ساتھی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہیں گئے تھے' بلکہ انھیں قیدی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء کے ختم ہونے سے قبل ہی مظلومین کا یہ کارواں رنگون پہنچ گیا تھا۔ جہاز سے اتار کر فوراً ہی ان لوگوں کو صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے جایا گیا' جو گھڑ دوڑ کے پرانے میدان کے قریب تھا۔ جس سڑک پر یہ بنگلہ واقعہ تھا' آج کل اسے ''وائل روڈ'' کہتے ہیں ❶۔

بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ تھا اور انگریزی حکومت کی طرف سے صرف چھ سو روپے ماہوار ان قیدیوں کو خرچ کے لیے ملتے تھے۔ بہادر شاہ نے اس رقم میں اضافے کی کوئی درخواست نہیں دی اور اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ اس حالت میں انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز کرے۔ اس کی بیوی زینت محل کے پاس کچھ زیورات موجود تھے' انھیں فروخت کر کے یہ لوگ گزر بسر کرتے رہے۔ بہادر شاہ نے زمانہ اسیری میں کچھ نظمیں بھی کہیں' جو بہت درد ناک تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب خود بادشاہ کا وجود ایک الم ناک مرثیہ اور درد انگیز نوحہ بن کر رہ گیا تھا۔

وفات:

رنگون میں بہادر شاہ نے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ لیکن وہاں کے حکام اور عام باشندے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ شہزادے اکثر گاڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے جاتے مگر بادشاہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا زیادہ وقت اللہ کی یاد اور تسبیح و استغفار میں گزرتا۔ اس نے ۱۳ جمادی الاولی ۱۲۷۹ھ (۷ نومبر ۱۸۶۲ء) کو انتقال کیا اور قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے نجات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

منقول ہے کہ موت کے وقت بہادر شاہ ظفر کے پاس زینت محل' جواں بخت' اس کی بیوی اور ایک کم عمر بچی کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ وفات کے بعد حکام رنگون کو اطلاع دی گئی اور دفن کی اجازت طلب کی۔ لیکن کچھ پتا نہیں کہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے اس آخری وارث کی تجہیز و تکفین کس طرح ہوئی اور جنازے میں کن لوگوں نے شرکت کی۔ البتہ اس کو اسی بنگلے کے احاطے میں' جہاں وہ قید تھا' سپرد خاک کر دیا گیا۔

قبر:

بادشاہ کی قبر کچی تھی۔ اس کے قریب بیری کا ایک درخت تھا۔ اسی درخت کو بالآخر قبر کا نشان سمجھا

❶ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۱۳۲' ۱۳۳

گیا۔ بہادر شاہ کی بیوی زینت محل نے اس سے کوئی چوبیس سال بعد ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو وفات پائی۔ اسے بھی شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شہزادہ جواں بخت ماں سے دو سال پہلے مولمین (جنوبی برما) میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی قبر کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

بہادر شاہ کے بعد زینت محل کچھ مدت اسی بنگلے میں رہی۔ اسے برطانوی حکومت کی طرف سے پانچ سو روپے ماہوار ملتے تھے اور پانچ سو شہزادہ جواں بخت کے لیے مقرر تھے۔ پھر اسے دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جس احاطے میں بہادر شاہ اور زینت محل کی قبریں تھیں، وہ ایک یورپین کو ٹھیکے پر دے دیا گیا، جس کا نام ڈاسن تھا اور ڈاسن بینک کمپنی سے اس کا تعلق تھا۔ ڈاسن کے اس مکان میں آنے سے پہلے بعض لوگ فاتحہ خوانی کے لیے قبر پر جاتے تھے اور خادم چراغ بھی جلا آتے تھے، لیکن جب ڈاسن آیا تو اس نے آمد و رفت کا راستہ بند کر دیا۔ قبر کے ایک طرف اس نے ٹینس کھیلنے کا میدان بنا لیا، دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا چکر۔۔۔! چند روز میں قبر کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک شخص جس کا نام عبدالسلام تھا، قبر کی ٹوہ لگاتا ہوا اس جگہ پہنچا اور بیری کے درخت سے جو وہاں موجود تھا، قبر کا سراغ لگایا۔ اس نے اخباروں میں مضمون لکھے اور حکومت برما سے خط و کتابت کی تو اس جگہ پر ایک کتبہ لگایا گیا کہ دہلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں فوت ہوا اور اس مقام کے قریب اسے دفن کیا گیا۔ بعد کو زینت محل کی قبر پر بھی تاریخ وفات کی تختی نصب کر دی گئی۔ پھر دونوں قبروں کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا گیا۔ ارد گرد لوہے کا کٹہرہ ہے اور اوپر ٹین کا سائبان۔ بہادر شاہ کا پوتا سکندر بخت وہاں مجاور بن کر بیٹھ گیا[1]۔

بہادر شاہ ظفر نے غریب الوطنی میں وفات پائی اور ایک قیدی کی حیثیت سے مرا۔ اس کی قبر بھی بادشاہوں کی قبروں سے الگ اور بہت دور ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۵۲ء میں ایک معزز شہزادے خدا بخش نے قلعے میں مشاعرہ شروع کیا تھا اور حضور (بہادر شاہ ظفر) سے بھی غزل کا وعدہ لے لیا تھا۔ دوسرے شعرا کے علاوہ ذوق مرحوم بھی شہزادے کے اصرار پر اس میں شریک ہوئے۔ حضور بالا بالا آئے اور پس پردہ بیٹھے۔ ایک خواص نے حضور کی غزل سنائی۔ آزاد فرماتے ہیں، ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا۔ وہ شعر یہ ہے:

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو
ہم بے کسوں کو گور غریباں پسند ہے

آزاد کہتے ہیں، یہ غزل بہادر شاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی، لیکن جب یہ شعر مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپکتا ہے۔

---

[1] بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۱۳۴، ۱۳۵

بہادر شاہ مر گیا۔ اس نے کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا۔ وہ برائے نام بادشاہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ مغلوں کی ایک تاریخ وابستہ تھی۔ وہ مظلومیت کی حالت میں گرفتار ہوا۔ اس کو ذلیل کیا گیا۔ قید میں ڈالا گیا۔ ملک بدر کیا گیا مگر لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہیں۔ اس کو سب نے ستم زدہ قرار دیا اور لائق احترام گردانا۔ اس کی یاد لوگوں کے دل میں رہی اور روح وجگر میں اضطراب و بے چینی پیدا کرنے کا موجب بنی۔

مولانا غلام رسول مہر' مولانا راشد الخیری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۲ء میں مغرب کی نماز (دلی کی) شاہی مسجد کے اندر ادا ہوئی۔ اس میں نواب سعید احمد خاں' حکیم عبدالمجید خاں' شہزادہ سلیمان جاہ وغیرہ شریک تھے۔ بہادر شاہ کی وفات پر بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی تو سب کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے [1]۔

دوسری عالم گیر جنگ عظیم (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء) کے زمانے میں سبھاش چندر بوس نے ہندوستان کی آزادی کے لیے برما سے آزاد ہند فوج تیار کی تھی۔ جب اسے ہندوستان کی طرف کوچ کا حکم دیا تو اس ضمن میں ایک رسم بہادر شاہ کے مزار پر بھی ادا کی گئی' جس میں سبھاش چندر بوس نے حلف اٹھایا تھا کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں گے تو اے مغلوں کی آخری یادگار! اے غریب الوطن بادشاہ دہلی!! ہم تیری میت کو خاک غربت سے نکال کر وطن محبوب کی سرزمین میں سلائیں گے تاکہ تیری روح مظلوم آسودگی سے ہم کنار ہو [2]۔

بہر حال برصغیر کے ہر شخص نے بہادر شاہ کو ہمیشہ یاد رکھا اور عزت و احترام سے اس کا نام لیا۔ وہ پڑھا لکھا' بہت اچھا شاعر' عبادت گزار' ہمدرد خلائق اور عمدہ خصال بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں بہت سے علما وفقہا دہلی میں اور اس کے گردونواح میں موجود تھے۔ وہ ان سب کی تکریم کرتا اور سب اس کا احترام بجالاتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر ولادت سے وفات تک:

بہادر شاہ ظفر کی ولادت سے وفات تک کی مختلف تاریخوں پر ایک نظر اور ڈال لیجیے۔

۲۵/ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو پیدا ہوا۔

۲۸/ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تاج شاہی سر پر رکھا۔

۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی شروع ہوئی' جس کو انگریزوں نے ''غدر'' قرار دیا۔

۲۲/ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہوا۔

۲۷/ جنوری ۱۸۵۸ء کو اس کے خلاف دہلی کے لال قلعے میں فوجی عدالت میں بغاوت کا مقدمہ شروع ہوا۔

۹/ مارچ ۱۸۵۸ء کو اس کے خلاف فیصلہ سنایا گیا۔

۲۰/ اپریل ۱۸۵۸ء کو فوجی عدالت کے فیصلے کی برطانوی حکومت ہند نے توثیق کی۔

---

[1] ۱۸۵۷ء ص ۲۱۳

[2] ایضاً

۶ رنومبر ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ اور اس کے ساتھی قیدیوں کا قافلہ دہلی سے کلکتے کو روانہ ہوا۔
۱۸۵۸ء کے اختتام سے پہلے ہی یہ قافلہ کلکتے سے جہاز کے ذریعے رنگون پہنچا۔
۷ رنومبر ۱۸۶۲ء کو بہادر شاہ نے رنگون میں وفات پائی۔

سلطنت مغلیہ کا آغاز اور انجام:

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے آغاز اور انجام کی تفصیل جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی تھی، فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں اور زیر نظر جلد میں مناسب الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے مقابلہ کر کے اس ملک کو فتح کیا اور آخری بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تھا، جس سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں انگریزوں نے یہ ملک چھینا۔ اس طرح قمری حساب سے تین سو اکتالیس برس اور شمسی حساب سے تین سو اکتیس برس مغلوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ سوری خاندان کا پندرہ سالہ (۹۴۷ھ تا ۹۶۲ھ/۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء) عہد حکومت بھی اس میں شامل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں یہ بہت طویل عرصہ ہے جس میں ایک ہی خاندان برسر اقتدار رہا۔ اس اثنا میں کل انیس مغل بادشاہ تخت ہند پر متمکن ہوئے، جن میں بعض کا عہد حکومت بہت طویل اور شان دار تھا۔ بعض کا بہت مختصر اور نہایت عبرت ناک۔!

ان بادشاہوں سے متعلق ضروری واقعات ''فقہائے ہند'' کے معزز قارئین کے علم و مطالعہ میں آچکے ہیں۔ یہاں ترتیب زمانی سے ان کے نام دوبارہ درج کیے جاتے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) بابر (۲) ہمایوں (۳) اکبر (۴) جہاں گیر (۵) شاہ جہان (۶) اورنگ زیب عالم گیر (۷) شاہ عالم بہادر شاہ اول (۸) جہاں دار شاہ (۹) فرخ سیر (۱۰) رفیع الدرجات (۱۱) رفیع الدولہ (۱۲) نیکو سیر۔ اس نے چند روز حکومت کی۔ (۱۳) ابراہیم۔ صرف ایک مہینا آٹھ دن حکومت کی۔ (۱۴) محمد شاہ رنگیلا (۱۵) احمد شاہ (۱۶) عالم گیر ثانی (۱۷) عالم شاہ ثانی (۱۸) اکبر شاہ ثانی (۱۹) بہادر شاہ ظفر۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۱۱۸ھ۔ ۱۷۰۷ء) تک یہ حکومت نہایت مضبوط اور مستحکم رہی۔ اس کے بعد اس پر زوال طاری ہو گیا اور ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی۔ لیکن اس ملک پر مغلوں کا اس قدر رعب اور اثر تھا کہ مرتے مرتے بھی ڈیڑھ سو سال ان کی حکومت قائم رہی۔ بلکہ آخر میں تو پورے ملک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھیں۔ مرہٹے جو مغل سلطنت کے ہمیشہ حریف اور مخالف رہے، اس کے زبردست حامی اور معاون ہو گئے تھے۔ یہ تمام باتیں اس کتاب کی پہلی جلدوں میں معرض بیان میں آچکی ہیں۔ اس کے بعد سلسلۂ فقہائے ہند کی نویں جلد شروع ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

فقہائے ہند کی یہ جلد اب سے تیس برس پہلے مئی ۱۹۸۲ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے معرضِ اشاعت آئی تھی۔ اس وقت لتھو کی چھپائی کا رواج تھا۔ اب ادارہ دارالنوادر کے ارباب انتظام نے بہترین انداز میں شائع کی ہے۔ کتاب کے متعدد مقامات پر تغیر وتبدل بھی کیا گیا ہے۔

بندہ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور
یکم جنوری ۲۰۱۲ء
۶ر صفر ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیرھویں صدی ہجری

الف

ا۔ مولانا آدم مدراسی

مولانا آدم بن ابو آدم مدراسی اپنے زمانے کے شیخ، عالم وفقیہ اور متقی وصالح بزرگ تھے۔ علوم حدیث وفقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ''الزواجر'' ❶ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مدراس اور اس کے گردونواح کے لوگ ان سے مستفید ہوئے۔ اس عالم دین نے ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ/ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو وفات پائی ❷۔

۲۔ سید آل احمد سہسوانی

سید آل احمد بن نظر محمد بن ابو محمد حسینی نقوی سہسوانی نیک سیرت علما میں سے تھے۔ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ بچپن ہی سے اپنے والد گرامی سید نظر محمد سہسوانی سے منسلک رہے اور ان سے حصول علم کیا۔ تصوف وطریقت میں بھی ان سے فیض یاب ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی مسند مشیخیت پر متمکن ہوئے۔ نامور فقیہ تھے۔ وحدت الوجود کے قائل اور ابن عربی سے متاثر تھے۔ چنانچہ ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح سپرد قلم کی، جسے ''البیان المرصوص فی شرح الفصوص'' کے نام سے موسوم کیا۔ ان کے علم وفضل اور تدین و تقویٰ کی بنا پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کی بہت تکریم کرتے تھے۔ ایک دفعہ دہلی گئے اور شاہ صاحب کے ہاں پہنچے تو انھوں نے اپنی مسند چھوڑ دی اور اصرار کر کے اس پر بٹھایا۔ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو شاہ صاحب کچھ دور تک ساتھ گئے۔ مراد آباد، رام پور، بریلی، سنبھل اور پیلی بھیت وغیرہ شہروں میں ان کے بہت سے ارادت مند تھے جو حاضر خدمت ہوتے اور استفادہ کرتے۔

سید آل احمد سہسوانی نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا ❸۔

---

❶ الزواجر، شیخ ابن حجر مکی کی تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔ تذکیر وترہیب کے سلسلے کی یہ بہترین کتاب ہے۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ا

❸ حیات العلما ص ۲۲ تا ۲۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲، ۳

۳۔ سید آل حسن موہانی

سید آل حسن بن غلام سعید بن وجیہ الدین حسینی رضوی موہانی' تیرھویں ہجری کے فحول علمائے برصغیر میں سے تھے۔ ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۸ء میں ہندوستان کے شہر موہان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنو میں پائی۔ مولانا جعفر علی کسمنڈوی (کسمنڈ' نواح لکھنو میں اس زمانے میں ایک قریہ تھا) اور دیگر علمائے عصر سے استفادہ کیا۔ پھر الہ آباد چلے گئے اور انگریزی حکومت کے اصحاب منصب سے تقرب پیدا کیا اور جہاں آباد کوڑہ کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ایک مدت تک وہاں مقیم رہے بعد ازاں "بندکی" میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں کافی عرصے تک خدمت قضا انجام دیتے رہے۔ اسی اثنا میں ان کے بعض دوست نما حریفوں نے ان پر رشوت کا الزام لگایا، جس کے نتیجے میں عہدۂ قضا سے معزول کر دیے گئے۔ چودہ سال اسی طرح گذر گئے۔ پھر سر سید احمد خاں نے ان کو دہلی بلا لیا۔ کئی سال دہلی میں قیام رہا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مراد آباد چلے گئے۔ مراد آباد سے حیدرآباد پہنچے تو وہاں کے منصب قضا پر مامور ہوئے۔ خاصا عرصہ اس منصب پر متعین رہے۔ کبرسنی کو پہنچے تو واپس اپنے شہر "موہان" آ گئے اور وہیں وفات پائی۔

سید آل حسن موہانی اپنے عہد کے عالم' مناظر اور متکلم تھے۔ فقہ اور اصول فقہ میں درک رکھتے تھے' لیکن علم حدیث سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا اچھا خاصا ذوق تھا اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ عیسائیوں سے ان کی بحثیں رہتی تھیں۔ چنانچہ رد عیسائیت میں "استفسار" اور استبشار" کے نام سے دو مبسوط اور مدلل کتابیں تصنیف کیں' جو مناظرہ و خلافیات کے نقطہ نظر سے اہم کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مسائل میں مناظرانہ انداز کے اور بھی متعدد رسالے تحریر کیے۔

اس عالم وفقیہ نے ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ/ ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو پچاسی سال کی عمر پا کر موہان میں وفات پائی❶۔

۴۔ شیخ ابراہیم باعکظہ سورتی

شیخ ابراہیم بن عبدالاحد سورتی' عالم کبیر اور فاضل اجل تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ قبیلہ "باعکظہ" سے تعلق رکھتے تھے۔ ولادت اور نشوونما سورت میں ہوئی۔ اپنے والد بزرگ وار قاضی عبدالاحد سورتی (متوفی ۱۷ جمادی الاخری ۱۲۲۵ھ/ ۲۰ جولائی ۱۸۱۰ء اور دیگر علمائے وقت سے تحصیل علم کی۔ پھر بمبئی کی جامع مسجد میں خطابت اور وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ بمبئی کے ممتاز علما میں سے تھے اور علما کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔ تفسیر' حدیث اور فقہ میں دست رس رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب "تحفۃ الاخوان" ہے جو فقہ شافعی سے متعلق ہے۔ ایک کتاب کا نام "نعم الانتباہ" ہے۔ ۲۷ رجب ۱۲۸۲ھ/ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو وفات پائی❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳'۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۲۔ اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶۱

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵

۵- شیخ ابوتراب جعفری پھلواروی

شیخ ابوتراب بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری، مرد پارسا اور فقہ و تصوف کے ممتاز عالم تھے۔ ۲۷ شوال ۱۱۹۲ھ/ ۱۸ نومبر ۱۷۷۸ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے اور مولانا احمدی بن وحید الحق پھلواروی (متوفی غرہ شعبان ۱۲۵۲ھ/ نومبر ۱۸۳۶ء) سے کسب علم کیا اور اپنے والد مولانا نعمت اللہ پھلواروی (متوفی ۲۹ شعبان ۱۲۴۷ھ/ ۱۲ فروری ۱۸۳۲ء) سے طریقت و تصوف کا درس لیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند درس و افاضہ آراستہ کی اور خلق کثیر کو راہ حق کی تعلیم دی۔

شیخ ابوتراب جعفری نے ۸۷ برس عمر پائی اور ۷ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ/ ۷ جنوری ۱۸۵۴ء کو اپنے وطن پھلواری میں انتقال کیا۔ اپنے والد کے جوار میں آسودہ لحد ہیں ❶۔

۶- مولانا ابوالحسن فرنگی محلی

مولانا ابوالحسن بن عبدالجامع بن عبدالنافع بن بحرالعلوم عبدالعلی بن نظام الدین بن قطب الدین انصاری فرنگی محلی، درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کی اولاد سے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ وہیں شیخ عبدالحکیم لکھنوی (متوفی ۲۴ صفر ۱۲۸۶ھ/ ۵ جون ۱۹۶۹ء) اور دیگر علما سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ شیخ عبدالوالی لکھنوی (متوفی ۲۲ شعبان ۱۲۷۹ھ/ ۱۲ فروری ۱۸۶۳ء) سے اخذ طریقت کیا۔ پھر خود درس و افادہ میں مصروف ہوئے اور مدت دراز تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ فرنگی محل لکھنؤ کے فقہائے حنفیہ میں بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ حیوانات کی حلت و حرمت کے موضوع پر "تمیز الکلام فی بیان الحلال والحرام" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ/ ۳ مئی ۱۸۶۶ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے ❷۔

۷- مولانا ابوالحیات پھلواروی

مولانا ابوالحیات بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی شیخ ابوتراب پھلواروی کے بھائی تھے۔ فقہ اور تصوف کے نامور عالم تھے۔ غرہ ذی قعدہ ۱۱۹۵ھ/ نومبر ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوئے اور مولانا احمدی بن وحید الحق پھلواروی سے تحصیل کی۔ اپنے والد گرامی مولانا نعمت اللہ پھلواروی سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ علوم ظاہری و باطنی سے فارغ ہوئے تو خود درس و افادہ کی طرح ڈالی اور بہت سے لوگوں کو نعمت علم سے آراستہ کیا۔ ۲۶ رمضان ۱۲۷۶ھ/ ۱۷۔ اپریل ۱۸۶۰ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹، ۱۰ بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین

❷ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱

❸ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۳ بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین۔

۸۔ شیخ ابوسعید مجددی دہلوی

برصغیر کے جلیل القدر علما اور رفیع المرتبت فقہا میں شیخ ابوسعید مجددی دہلوی کا نام نامی قابل ذکر ہے۔

ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:

ابوسعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن محمد معصوم بن حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی۔!

شیخ ابوسعید کا خاندان علم وطریقت اور فضیلت وکمال کے اعتبار سے ہندوستان کا مشہور ترین خاندان ہے۔کئی پشتوں تک اس کو گہوارۂ علم کی حیثیت حاصل رہی۔اس خاندان میں جن نامور شخصیتوں نے جنم لیا' ان میں صاحب ترجمہ شیخ ابوسعید بھی شامل ہیں۔

شیخ ابوسعید حدیث وفقہ میں اپنے عصر کے یگانہ روزگار عالم تھے۔۲ ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ کو رام پور میں پیدا ہوئے۔صغرسنی میں قرآن مجید حفظ کیا اور تجوید سیکھی۔ بعدازاں مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۵ شعبان ۱۲۶۸ھ/ ۲۵ مئی ۱۸۵۲ء) سے درسی کتابیں پڑھیں۔بعض کتابوں کی تکمیل شاہ رفیع الدین دہلوی (متوفی ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۹ اگست ۱۸۱۸ء) سے کی' جن میں قاضی مبارک کی شرح سلم اور صحیح مسلم شامل ہیں۔ پھر اپنے خالو شیخ سراج احمد رام پوری (متوفی ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۸۱۵ء) سے حدیث کی سند حاصل کی۔اس کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۷ شوال ۱۲۳۹ھ/ ۵ جون ۱۸۲۴ء) سے سندواجازۂ عام کا شرف حاصل کیا۔بعض دیگر علمائے عصر سے بھی مستفید ہوئے اور سند حدیث لی۔تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے لیے شاہ غلام علی سے بیعت کی اور ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسند دعوت وارشاد بچھائی۔ ہزاروں بندگان خدا ان سے فیض یاب ہوئے۔ حج وزیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔مکہ مکرمہ گئے تو ان کی شہرت علمی سن کر شافعی اور حنفی علما نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا اور خندہ پیشانی سے ملے۔ان کی تصانیف میں ایک کتاب "ہدایۃ الطالبین" ہے اور فارسی میں ہے۔اس کا اردو ترجمہ مولانا نور احمد نے کیا۔مع ترجمہ کے یہ کتاب ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں امرت سر میں شائع ہوئی۔

شاہ ابوسعید کے علم وفضل کے بارے میں مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

جامع بود میان علوم ظاہری وباطنی وفقہ وحدیث وتفسیر۔

(علوم ظاہری وباطنی کے ماہر اور تفسیر' حدیث وفقہ کے جامع تھے۔)

قرآن مجید کے حافظ تھے اور آواز نہایت مئوثر اور پُرکشش تھی۔سرسید لکھتے ہیں:

علم قرات میں یکتائے روزگار تھے۔کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرات سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔

اتباع سنت کا خاص طور سے اہتمام کرتے۔ لوگوں کو بھی یہی تلقین فرماتے۔ نورانی شکل تھے۔ طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔ متحمل مزاج اور نرم دل تھے۔ اللہ نے حسن اخلاق کی دولت سے خوب نوازا تھا۔ ہر شخص سے متواضع ہو کر ملتے۔ وقت کا زیادہ حصہ دینی علوم کی تعلیم و تدریس میں صرف کرتے۔ اس سے فارغ ہوتے تو تلاوت قرآن میں مصروف ہو جاتے۔ شاہ غلام علی کی وفات کے بعد نو یا دس سال ان کے سجادۂ علمی پر متمکن رہے اور ہمیشہ لوگوں کو اتباع سنت کی تلقین فرماتے رہے۔

آخر عمر میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹونک کے مقام پر پہنچے تو عید الفطر کے روز ۱۲۴۹ھ/۱۱ فروری ۱۸۳۴ء کو وہیں انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ میں امیر ٹونک نواب وزیر الدولہ اور بہت سے امرائے مملکت اور شہریوں نے شرکت کی۔ جنازے کی نماز ٹونک کے قاضی مولانا خلیل الرحمن رام پوری نے پڑھائی۔

شیخ ابو سعید کے ایک صاحب زادے شاہ عبدالغنی مجددی (متوفی محرم ۱۲۹۶ھ/ جنوری ۱۸۷۹ء) تھے جو برصغیر کے مشہور فاضل اور علامہ عصر تھے۔ وفات کے وقت وہ ان کے پاس موجود تھے۔ وہ والد کی میت ٹونک سے دہلی لے گئے اور وہاں انھیں شاہ غلام علی اور مرزا مظہر جان جاناں کے پہلو میں دفن کیا گیا❶۔

۹۔ حکیم ابو علی امروہوی

حکیم ابو علی بن غلام علی امروہوی شیعہ تھے۔ ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ایک شیعہ عالم سید محمد عبادت امروہوی سے حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ طب کی کتابیں رضی الدین امروہوی (متوفی ماہ رمضان ۱۲۳۳ھ/ جولائی ۱۸۱۸ء) سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پچیس سال تک ''باندہ'' شہر میں درس دیتے رہے۔ چند کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ھادی المخالفین فی الرد علی تحفۃ المسلمین، حجیۃ الایمان، کشف الرین فی اثبات العزاء علی الحسین، تعلیقات علی طب اکبر اور فوائد الحسینیہ شامل ہیں۔ آخری دو کتابیں علم طب سے متعلق ہے۔

حکیم ابو علی امروہوی نے ۲۱ صفر ۱۲۷۲ھ/ ۲ نومبر ۱۸۵۵ء کو رحلت کی❷۔

۱۰۔ سید ابو القاسم تستری نواب میر عالم خاں

سید ابو القاسم بن رضی حسینی الجزائری تستری، نواب میر عالم خاں کے لقب سے ملقب تھے اور ارکان سیاست و حکومت میں سے تھے۔ مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے والد سید رضی تستری جو ممتاز شیعہ عالم تھے، حیدر آباد

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱، ۴۷۲۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۳۹۳، ۳۹۴۔ آثار الصنادید ص ۲۱۳، ۲۱۴۔ خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۷۰۱ تا ۷۰۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۳، ۱۴۔ تاریخی مقالات ص ۲۱۸ تا ۲۲۰

❷ تکملۂ نجوم السماء۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۔

(دکن) آئے اور ارباب حکومت سے تقرب پیدا کیا۔ مختلف خدمات کے صلے میں حیدر آباد کے قریب ''پٹن چرو'' کے مقام میں حکومت حیدر آباد کی طرف سے ان کو جاگیریں عطا کی گئیں، جن سے اس زمانے میں ان کو تین ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔

سید رضی تستری کے دو بیٹے تھے۔ ان میں ایک ابوالقاسم تھے جنھوں نے اپنے علم و فراست کی بنا پر حیدر آباد کی سیاست و امارت میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ابوالقاسم کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی۔ تربیت اور نشوونما بھی وہیں پائی۔ ان کے والد سید رضی فاضل آدمی تھے۔ بیٹے نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور علوم عربیہ کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ لغت، تاریخ اور معقولات میں بھی ماہر ہوئے اور اپنے اقران و معاصرین میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ تکمیل علم کے بعد ایوان حکومت سے وابستگی اختیار کی اور والی ریاست سے قرب پیدا کیا۔

اس زمانے میں سلطنت حیدر آباد کا حکمران نظام علی خاں آصف جاہ تھا، جس نے ۱۷۶۲ء سے ۱۸۰۳ء تک کم و بیش بیالیس سال حکومت کی اور (۷۱) برس عمر پا کر انتقال کیا۔ ریاست کا وزیر اعظم ارسطو جاہ تھا۔

تاریخ ہند میں اس عہد کو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے عہد زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ مغلوں کی مرکزی حکومت دم توڑ رہی تھی اور ملک میں کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ انگریز کو اسی زمانے میں یہاں قدم جمانے اور حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ حیدر آباد کے پڑوس میں میسور کی سلطنت خداداد بھی اسی زمانے میں معرض قیام میں آئی جس کا بانی حیدر علی تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان اس کا حکمران ہوا۔ یہ باپ بیٹا دونوں انگریزوں کے خلاف تھے، لیکن حیدر آباد کے ارباب سلطنت ٹیپو کے مخالف اور انگریزوں کے حامی تھے ❶۔

سید ابوالقاسم تستری نے جو حیدر آباد کی سرکار میں اچھے منصب پر فائز تھے، ہر موقعے پر انگریز کی حمایت کی۔ چنانچہ ٹیپو کے خلاف انگریزوں نے جو آخری جنگ لڑی اور اس کے غدار ساتھیوں سے ساز باز کر کے بے خبری میں اس پر حملہ کیا تو حیدر آباد کی فوج بھی اس میں انگریزوں کی معاون تھی اور اس کی کمان یہی سید ابوالقاسم میر عالم خاں کر رہے تھے۔ یہ ٹیپو کو اپنا حریف اور شدید دشمن قرار دیتے تھے۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد جب مال غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا تو میر عالم خاں نے بھی حیدر آباد کی فوج کے لیے حصہ طلب کیا، لیکن جنرل ہارس نے ان کو یہ جواب دیا کہ جس قلعے میں ٹیپو محصور تھا، وہ انگریزی فوج نے فتح کیا ہے۔ حیدر آباد کی فوج کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جا سکتا ❷۔

اس ضمن میں تاریخ نظام علی خاں میں مرقوم ہے کہ وزیر اعظم ارسطو جاہ اور میر عالم نے لارڈ ولزلی سے

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد سات۔

❷ تاریخ سلطنت خداداد، ص ۳۳۶۔

جنرل ہارس کے اس رویے کی شکایت کی۔ لیکن جب انگریز تمام مال غنیمت تقسیم کر چکے اور باقی کچھ نہ رہا تو سلطان کے ان کثیر التعداد شیروں پر نظر پڑی جو محل میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جنگ کی ہلاکت آفرینیوں کے باعث ان کی حفاظت و پرداخت کی ذمے داری کوئی شخص قبول کرنے کو تیار نہ تھا اور وہ کئی روز کی بھوک پیاس سے بے تاب ہو کر وحشت ناک صورت حال سے دوچار تھے۔ لارڈ ولزلی اس مشکل میں پھنسا ہوا تھا کہ اس ''مال غنیمت'' کو کس کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ میر عالم سپہ سالار افواج حیدر آباد سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو ان تمام شیروں کو لے جا سکتا ہے' مگر میر عالم نے ان کو قبول کرنے سے اظہار معذرت کیا۔ اس کے بعد سلطان کے ان محبوب شیروں کو گولی کا نشان بنا دیا گیا❶۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد حیدر آباد کے حکمران اور وزیر اعظم ارسطو جاہ اور میر عالم نے اس کے بیٹوں کی بھی مخالفت کی۔ چنانچہ جب سلطنت خداداد کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے اور مختلف فریق اس میں سے اپنے حصے کے لیے انگریز کے حضور کاسۂ گدائی پیش کر رہے تھے تو یہ سوال سامنے آیا کہ ٹیپو کے بیٹوں کا مستقبل کیا ہو؟ اور ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے؟ اس کے لیے جو کمیشن مقرر کیا گیا' اس میں انگریزوں نے مشورے کے لیے ریاست حیدر آباد کی طرف سے میر عالم خاں کو منتخب کیا۔ میر عالم خاں کا موقف یہ تھا کہ نظام علی خاں والیٔ حیدر آباد اس جنگ میں انگریزوں کا حلیف ہے اور ٹیپو کے بیٹوں کو میسور کا تخت سلطنت دینے کے خلاف ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے کمیشن کے سامنے حیدر آباد کے وزیر اعظم ارسطو جاہ کا ایک خط پیش کیا' جس میں ارسطو جاہ نے میر عالم کو مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے تھے۔

''ٹیپو سلطان کے فرزندوں اور پسماندگان نے انگریزی کمپنی کے ذریعے جو یہ استدعا کی ہے کہ ان کی پرورش اور اخراجات کے لیے انھیں نصف حصہ ملک اور نصف خزانہ ملنا چاہیے' صحیح نہیں۔ تم کیوں یہ نہیں کہتے کہ قلعہ ہم نے فتح کیا ہے اور ٹیپو کے بیٹے اور پسماندگان اسیران جنگ میں سے ہیں۔ ان کو صرف اتنا ہی دینا چاہیے جو قوت لا یموت ہو' اور جس سے ان کا معمولی گزارا ہو سکے❷۔''

پھر اسی خط میں ارسطو جاہ نے کمیشن کو خطاب کرتے ہوئے لکھا:

''ہمیں یقین ہے کہ ٹیپو سلطان کے بیٹوں اور پسماندگان کو اسی قدر دیا جائے گا' جس قدر کہ سرکار حیدر آباد چاہتی ہے اور جس کا اظہار میر عالم نے کر دیا ہے۔ نصف ملک ان کو ہرگز نہ دیا جائے❸۔''

کمیشن نے اپنے دلائل پیش کرنے اور حیدر آباد کی رائے سے مطلع ہونے کے بعد اس سلسلے میں سلطان کے امرا و وزرا سے بھی رائے لی تو میر غلام علی لنگڑے نے اس فارسی محاورے میں جواب دیا:

---

❶ تاریخ سلطنت خداداد ص ۳۳۶' ۳۳۷۔

❷ سوانح میر عالم ص ۸۹۔

❸ ایضاً۔

''دفعِ راکشتن و بچہ اش رانگاہداشتن کار خردمنداں نیست''

یعنی سانپ کو مار دینا اور اس کے بچے کی حفاظت کرنا عقل مندوں کا کام نہیں۔

سلطنت میسور کے مستقبل سے متعلق تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کمیشن نے سلطان ٹیپو کے بیٹوں کو تخت سے محروم کر دیا اور لارڈ ولزلی سے سفارش کی کہ اگر یہ سلطنت اس کے سابق حکمران ہندو خاندان کو تفویض کر دی جائے تو یہ فیصلہ عین مصلحت وقت کے مطابق ہوگا۔ اس سے وہ سب خدشات رفع ہو جائیں گے جن کا شہزادوں کو تخت دینے کی بنا پر پیدا ہو جانے کا کسی وقت بھی امکان ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے طرز عمل انسانیت اور فیاضی کا بھی یہی تقاضا ہے۔

یہ فیصلہ پڑھنے کے بعد ولزلی نے سلطنت خداداد کو درج ذیل طریقے سے تقسیم کر دیا:

۱۔ تمام اضلاع کرناٹک، پائیں گھاٹ اور ساحلی علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا گیا۔

۲۔ ضلع انت پور، کڑپہ کرنول اور بلاری نظام حیدر آباد کو دیے گئے۔

۳۔ تنگ بھدرا سے شمال تک کا سارا علاقہ اس شرط پر مرہٹوں کے لیے محفوظ رکھا گیا کہ وہ آئندہ انگریزوں کی پالیسی پر عمل کریں گے۔

۴۔ ملک کا باقی حصہ (جو بعد میں ریاست میسور کے نام سے موسوم ہوا) میسور کے قدیم ہندو خاندان راجگان کے حوالے کیا گیا۔

۵۔ سرنگاپٹم کا جزیرہ انگریزوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔

۶۔ طے کیا کہ سالانہ خراج سات لاکھ پگوڈا (سکہ رائج الوقت) ادا کیے جائیں۔

۷۔ ریاست کے نظم ونسق کی نگرانی کے لیے ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد ۱۸ جون ۱۷۹۹ء کو سلطان ٹیپو مرحوم کے بارہ بیٹوں، ایک بیٹی اور خاندان کے تمام افراد کو انگریزوں نے جبراً میسور سے نکال کر ویلور بھیج دیا۔ ان کے اخراجات کے لیے دو لاکھ چوبیس ہزار پگوڈا سالانہ رقم مقرر کی گئی، جو اس زمانے میں سات لاکھ بیس ہزار روپے کے برابر تھی ___ ٹیپو کے خاندان کا کوئی فرد اپنی سابق سلطنت میں باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ پھر ۱۸۰۷ء میں اس خاندان کو ویلور سے نکال کر کلکتے منتقل کر دیا گیا۔

سلطنت خداداد کی تقسیم وغیرہ کے مراحل طے کرنے کے لیے ایک عہد نامہ لکھا گیا، جس پر نظام حیدر آباد نے ۱۳ جون ۱۷۹۹ء کو اور لارڈ ولزلی نے ۲۶ جون ۱۷۹۹ء کو دستخط کیے۔

سلطان ٹیپو کے خاندان اور شہزادوں کو رخصت کرنے کے بعد ۳۰ جون ۱۷۹۹ء کو نئے راجا کو میسور کے تخت حکومت پر بٹھا دیا گیا۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جنرل ہارس اور حیدر آباد کی طرف سے یہی سید ابوالقاسم میر عالم اعزاز کے ساتھ نئے راجا کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر لائے اور تخت حکومت پر بٹھایا۔

ان تمام امور سے فارغ ہو کر سید ابوالقاسم میر عالم واپس حیدر آباد آئے تو ان کی طرف سے وزیر اعظم ارسطو جاہ کی آنکھیں بدل چکی تھیں اور اس کے دل میں ان کے بارے میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ اس کو

الگ کر کے خود حیدر آباد کے منصب وزارت پر متمکن ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ریاست کی خدمت اور ٹیپو کے خلاف تلوار اٹھانے کا صلہ انھیں یہ ملا کہ اپنے عہدے سے معزول کر دیے گئے اور گھر جا کر بیٹھ گئے۔ ایک عرصے تک یہی صورت حال رہی۔ پھر جب ارسطو جاہ اور والی حیدر آباد نظام علی خاں وفات پا گئے اور ۱۸۰۳ء میں نظام علی خاں کا بیٹا سکندر جاہ حیدر آباد کا والی بنا تو انگریزوں کی سفارش سے سید ابوالقاسم میر عالم کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

چونکہ سید ابوالقاسم انگریزوں کے حامی اور بہی خواہ تھے، اس لیے انگریز ان سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ یہ اقتدار میں رہیں۔ سکندر جاہ ان کو وزیر اعظم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کے باشندے جن میں عوام و خواص سب شامل تھے، ان کو عہدۂ وزارت تفویض کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس سلسلے میں ان کے خلاف ہنگامے بھی ہوئے اور یہ ہنگامے اتنے شدید اور ہمہ گیر تھے کہ انھیں ریزیڈنسی میں پناہ لینا پڑی۔ لیکن اس وقت کا انگریز ریذیڈنٹ ان کا حامی تھا اور وہ ہر صورت میں ان کو وزیر اعظم بنانا چاہتا تھا، لہٰذا سکندر جاہ کو مجبوراً ابوالقاسم میر عالم کے بعض بڑے بڑے مخالفوں کو کاروبار حکومت سے الگ کر کے انھیں وزیر اعظم مقرر کرنا پڑا۔

بہر حال سید ابوالقاسم تستری میر عالم خاں اپنے دور کے ممتاز شیعہ عالم اور فقیہ تھے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں حیدر آباد جن سیاسی حالات و کوائف سے دو چار تھا، اس میں ان کی مساعی کا ذکر تاریخ دکن میں خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے خود بھی حدیقۃ العالم کے نام سے دکن کی تاریخ دو جلدوں میں قلم بند کی ہے۔

۱۱۔ مفتی احسان علی پھلواروی

مفتی احسان علی بن امان علی پھلواروی، فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ مولانا احمدی بن وحید الحق جعفری پھلواروی کے شاگرد تھے۔ خاصی مدت ان کی خدمت میں رہے اور تحصیل علم کی۔ فراغت کے بعد خود مسند درس بچھائی اور افتا کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت سے اہل علم نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۵ رمضان ۱۲۶۷ھ/۱۴ جولائی ۱۸۵۱ء کو فوت ہوئے ❶۔

۱۲۔ مولانا احسان غنی دلموی

مولانا احسان غنی بن جعفر دلموی، حنفی المسلک فقیہ تھے۔ مضافات لکھنؤ میں موضع ''دلمو'' کے باشندے تھے۔ عالم باعمل اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ اپنے علاقے اور زمانے کے نامور مفتی تھے۔ ہر وقت درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں آنا جانا نہ تھا۔ ماہ رجب ۱۲۸۱ھ/دسمبر ۱۸۶۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰ بحوالہ تاریخ الکملا۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱

۱۳۔ شیخ احمد سندیلوی

شیخ احمد بن عبداللہ حسینی سندیلوی، احمد بخش کے نام سے معروف تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مولد ومنشا سندیلہ ہے جو صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ اپنے والد ماجد شیخ عبداللہ سندیلوی، شیخ اعزالدین سندیلوی (متوفی ۱۸ صفر ۱۲۵۶ھ/ ۲۱ اپریل ۱۸۴۰ء) اور شیخ حیدر علی صدیقی سندیلوی (متوفی ۶ رجب ۱۲۲۵ھ/ ۱۷ اگست ۱۸۱۰ء) سے اخذ علم کیا۔ طریقت وتصوف کا درس اپنے والد مکرم شیخ عبداللہ سندیلوی سے لیا جو اپنے وقت اور علاقے کے شیخ طریقت تھے۔ پھر ان کی مسند مشیخت پر بیٹھے۔ کچھ وقت طالبان علم کو درس بھی دیتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے یہ عالم وفقیہ سندیلہ میں مدفون ہیں ❶۔

۱۴۔ شیخ احمد گجراتی

شیخ احمد بن محمد گجراتی سورتی، اہل علم وفضل بزرگ تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ممتاز تھے۔ ولادت ونشوونما سورت میں ہوئی۔ اپنے زمانے کے نامور عالم سید محمد ہادی سورتی سے تحصیل علم کی اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر درس وتدریس کا منصب سنبھالا اور علما وطلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۷ فروری ۱۸۴۰ء کو وفات پائی ❷۔

۱۵۔ شیخ احمد بھنھانی اصفہانی

شیخ احمد بن محمد باقر بھنھانی اصفہانی اپنے دور کے مشہور شیعہ عالم تھے۔ محرم ۱۱۹۱ھ میں کرمان شاہ میں پیدا ہوئے اور بہت سے اہل علم سے استفادہ کیا۔ اپنے والدِ گرامی شیخ محمد باقر سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر نجف گئے، وہاں کے متعدد شیعہ فضلا سے اخذِ علم کیا۔ نجف سے مسقط روانہ ہوئے۔ پھر ۱۲۲۳ھ میں ہندوستان آئے اور حیدر آباد (دکن) میں قیام کیا۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں سید ابوالقاسم تستری حکومت کے اچھے منب پر فائز تھے اور نامور شیعہ عالم تھے۔ شیخ احمد بھنھانی انہی کے ہاں مقیم ہوئے۔ حیدر آباد سے فیض آباد چلے گئے اور پھر نواب سعادت علی خاں (متوفی ماہِ رجب ۱۲۲۹ھ) کے عہد میں لکھنؤ کا عزم کیا۔

لکھنؤ کے نواب اور حکمران چونکہ شیعہ تھے اس لیے بہت سے شیعہ اہل علم نے اس عہد میں لکھنؤ کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ شیخ احمد بھنھانی نے فیض آباد اور لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں کئی کتابیں تصنیف کیں، اس سے پہلے بھی وہ کچھ کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ المحمودیہ حاشیۃ الصمدیہ: یہ کتاب انھوں نے صرف پندرہ سال کی عمر میں تصنیف کی۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۷

❷ حدیقۃ احمدیہ ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۲

۲۔ نور الانوار: یہ کتاب بسم اللہ الرحمٰن کی تفسیر ہے۔
۳۔ الدرر الغرویہ فی اصول الاحکام الالھیہ۔
۴۔ شرح المختصر النافع الیٰ مبحث الغسل۔
۵۔ قوت لایموت: یہ ایک رسالہ ہے جو نماز اور روزے کے احکام سے متعلق ہے۔
۶۔ مخزن القوت: یہ قوت لایموت کی شرح ہے، جو قیامِ فیض آباد کے زمانے میں سپرد قلم کی۔
۷۔ تحفۃ المحبین فی فضائل الائمۃ الطاھرین: یہ کتاب بھی فیض آباد میں تصنیف کی۔
۸۔ اثبات الخلافہ: یہ ایک رسال ہے جس میں مصنف نے اس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے کہ حضرت علی خلیفہ بلافصل تھے۔ یہ رسالہ بھی فیض آباد میں لکھا۔
۹۔ نیک و بدایام: یہ تاریخ کی کتاب ہے جو فیض آباد میں تصنیف کی۔
۱۰۔ تحفۃ الاخوان: یہ بھی تاریخ سے متعلق ہے اور حیدر آباد میں تصنیف کی۔
۱۱۔ عقدالجواھر الحسان: یہ بھی حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں تصنیف کی۔
۱۲۔ تنبیہ الغالین: یہ کتاب لکھنؤ میں تحریر کی گئی۔
۱۳۔ کشف الدین والمین عن حکم صلاۃ الجمعۃ والعیدین۔
۱۴۔ مرآۃ الاحوال۔
۱۵۔ کشف الشبہ عن حکم المتعہ۔

شیخ احمد بھنھانی اصفہانی نے ان کتب و رسائل کے علاوہ بھی بعض رسالے تصنیف کیے ❶۔

۱۶۔ شیخ احمد رام پوری

شیخ احمد بن محمد سعید افغانی رام پوری، فقہ و اصول کے مشہور افاضل میں سے تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ خلق کثیر نے ان سے کسب علم کیا۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب کا نام ”متفرقات احمدیہ“ ہے جو عربی زبان میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ یہ دراصل ان کے فتوے ہیں، جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب میں لکھے۔ یہ مجموعہ ان کی فقاہت اور مسائل میں انہماک کی نشان دہی کرتا اور فقہ میں ان کی وسعت نظر کا پتا دیتا ہے۔

شیخ احمد رام پوری نے فارسی زبان میں شرح تہذیب المنطق بھی لکھی۔ علاوہ ازیں طب کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی۔ وراثت کے بارے میں بھی ایک کتاب قلم بند کی۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے اس ہندی فقیہ نے رام پور (یوپی) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

---

❶ نجوم السماء۔
❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵

۱۷۔ شیخ احمد کشمیری

شیخ احمد بن مصطفیٰ رفیقی کشمیری کی کنیت ابوالطیب تھی۔ فقہ و اصول کے نامور فاضل تھے۔ علم حدیث میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا۔ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد محترم شیخ مصطفیٰ رفیقی کشمیری (متوفی ۱۴ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ/ ۲۹ مارچ ۱۸۷۷ء) سے علم حاصل کیا۔ ان کے نانا شیخ عبداللہ کشمیری اور ماموں شیخ نورالہدیٰ یسوی کشمیری بھی دیار کشمیر کے جلیل القدر علما میں سے تھے' ان سے بھی اخذ علم کیا۔ یہاں تک کہ حدیث' فقہ' سیرت اور تصوف و شعر وغیرہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ پھر خود مسند تدریس پر بیٹھے اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے روحانی اور علمی فیض حاصل کیا۔ سلوک و طریقت میں بھی درک رکھتے تھے اور پارسا بزرگ کی حیثیت سے معروف تھے[1]۔

۱۸۔ شیخ احمد کشمیری

کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں جن علما و فقہا نے شہرت دوام حاصل کی اور تاریخ علم و فضل کے اوراق پر ہمیشہ کے لیے اپنا نام ثبت کر گئے ان میں شیخ احمد بن نعیم بن مقیم کشمیری کا نام قابل ذکر ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے اس صاحب کمال فقیہ کا مولد و منشا سری نگر ہے۔ سن شعور کو پہنچے تو قاضی جمال الدین کشمیری (متوفی ۲۶ شعبان ۱۲۴۳ھ/ ۱۳ مارچ ۱۸۲۸ء) سے حصول علم کیا۔ دل میں قرات و تجوید کا شوق ابھرا تو قاری عباداللہ کی خدمت میں گئے اور ان سے اس فن کی تکمیل کی۔ پھر طریقت و سلوک کا جذبہ بیدار ہوا تو اپنے ہم وطن شیخ محمد اکبر کشمیری (متوفی ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء) سے منسلک ہوئے۔ مدت دراز تک ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں خود مسند دعوت و ارشاد پر متمکن ہوئے اور بلاد کشمیر میں اللہ نے ان کو قبول عام اور ہمہ گیر شہرت سے نوازا۔

شریعت حقہ کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں نہایت متصلب و متشدد تھے۔ اہل بدعت اور اصحاب اہوا و شرک کو سختی سے ہدف تنقید ٹھہراتے۔ دین کا معاملہ آتا تو کسی کی پروا نہ کرتے اور ناروا رسوم و رواج کی شدت سے تردید فرماتے۔ تجوید و سلوک کے موضوع سے متعلق چند رسائل بھی تحریر کیے۔

وادی کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۷ رجب ۱۲۷۸ھ/ ۱۸ مارچ ۱۸۷۸ء کو اس جہان فانی سے رخت سفر باندھا اور جنت الفردوس کی راہ لی[2]۔

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۵

[2] تاریخ کشمیر ص۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۸

۱۹۔ مفتی احمد فرنگی محلی

نواح لکھنؤ میں سہالی کے ارباب علم کا خاندان جس نے بعد میں فرنگی محل کا قالب اختیار کیا' فضل و کمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس خاندان کا ہر فرد آسمان علم کا روشن ستارہ تھا۔ اس کے ایک فرد مفتی احمد بن یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن قطب الدین انصاری سہالوی تھے جو لکھنؤ کے فرنگی محل میں اقامت گزین تھے' لہٰذا فرنگی محلی لکھنوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کی کنیت ابوالرحم تھی۔ ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں علم و فضل کی گود میں تربیت پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد مکرم شیخ محمد یعقوب فرنگی محلی (متوفی ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۵۴ء) سے تحصیل کی۔ مگر فراغت اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالقدوس فرنگی محلی لکھنوی کے حلقۂ درس سے حاصل کی۔ کتب فقہ سے بالخصوص مزادلت رکھتے تھے اور اس موضوع کی جزئیات پر عبور حاصل تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے ان کی فقہی شہرت سے متاثر ہو کر قضا و افتا کا منصب ان کے سپرد کر دیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ قضا و افتا کے فرائض بڑی دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ نواب موصوف ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ وہ ان کے کام سے ہمیشہ خوش رہا[1]۔

۲۰۔ سید احمد حسن عرشی قنوجی

سید احمد حسن قنوجی' نواب سید صدیق حسن خان کے برادر کبیر تھے اور ان سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ حسینی بخاری سید تھے۔ مسلک اہل حدیث کے عالم تھے۔ ۱۹ شعبان ۱۲۴۶ھ (۲ فروری ۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ کچھ بڑے ہوئے تو تکمیل تعلیم کے لیے کان پور' فرخ آباد' بریلی اور علی گڑھ کے مدارس میں حاضری دی اور وہاں کے جید علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ علی گڑھ میں شاہ عبدالجلیل کا غلغلۂ درس بلند تھا' اس میں شامل ہوئے۔ یہ وہی شاہ عبدالجلیل علی گڑھی ہیں جو حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے تلمیذ رشید اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں ۷ محرم ۱۲۷۳ھ کو جام شہادت نوش کیا۔

شاہ عبدالجلیل کے علاوہ سید احمد حسن قنوجی نے شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی سے سند حدیث حاصل کی۔

سید احمد حسن قنوجی مروجہ علوم عربیہ میں کامل اور حدیث و فقہ میں یگانہ تھے۔ ذکاوت و فطانت میں مشہور' قوت حفظ میں منفرد' ذہانت میں بے مثل اور جودت طبع میں اپنے معاصرین سے فائق تر تھے۔ علوم معقول و منقول میں مرتبہ کمال حاصل تھا۔ حدیث و سنت کے شیدائی اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر سختی سے پابند

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۳۷۔ احوال علمائے فرنگی محل ص ۱۶۔ آثار الاول من علمائے فرنگی محل ص ۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹

تھے۔تقلید شخصی کے خلاف اوراس پر تنقید کرتے تھے' چنانچہ ابتدائے عہد ہی میں رد تقلید میں ایک کتاب تصنیف کی' جس کا نام ''شہاب ثاقب'' رکھا۔اس میں حدیث وفقہ کی روشنی میں تقلید کی تردید کی ہے اوراس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نامور فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے۔چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں' لیکن ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

بہت بہادر اور جری تھے۔مجاہدانہ طبیعت کے مالک اور فنون سپاہ گری میں ماہر تھے۔

احمد حسن قنوجی عربی' فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے' اور عرشی تخلص کرتے تھے۔تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔فارسی اور اردو میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن حاصل تھا۔ایک شعر میں خود فرماتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہل جہاں میرے سخن سے
ہوں زلہ ربا غالب اعجاز رقم کا

ذیل میں ان کے چند عربی' فارسی اور اردو کے اشعار درج کیے جاتے ہیں:

نسیم الصبا و فی سحیر امطیبا
فقلت لہ اهلاً و سهلاً و مرحبا
کانك انفاس المسیح بعینها
فاحییت صبا لم ینل قط مطلبا
فدیتك یا نعم الصبا خیر مقدم
فکل حمام حین اقبلت رحبا
تحاکی لك الاغصان بالوجدراقصاً
تضاهی لك الاطبار بالسجع مطربا
تنفخ فی الاشجار روحا تمیلها
فیالك ماازهاك ضغا واعجیا
اهل جئت من تلك الربی برسالة
فان الصبا نعم الرسول لمن صبا

اب فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یارب چہ کنم جوہر شمشیر زباں را
کز معرکہ پر داختہ دیدیم جہاں را
عرشی صفت اندازہ شناسی بہ بیاں نیست

ناساز کنم زمزمہ مرغ جناں را
ہرموج پیانے کہ مرو دریائے ولم خاست
تاساحل لب آمدہ برتافت عناں را
خون گشتہ ام اسالب من نالہ سرانیست
چوں لالہ بدل سوختم آہنگ فغاں را
گرمی عشق سوخت حاصل ما
آتشی شیشہ است یا دل ما
نتواند کشید تیغ نظر
چہ قدر نازک است قاتل ما

اب اردو کلام ملاحظہ ہو:

مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہائے پیہم کی
رہے نہ کوئی ستم عذرامتحان کے لیے

شعلہ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے۔
یوں تو پتھر کے بھی سینہ میں شرر ہوتا ہے

کیا اک بات میں جامہ سے باہر
شب وصل اس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر
خدائی یوں تو برحق ہے خدا کی

سحر جو میں نے کہا قصور شب کا معاف
تو ہنس کے بولے کہ چل دور ہو ہوا سو ہوا

اب تو ہم شائستۂ آغوش دلبر ہوگئے۔
ناتوانی میں جو گل کھائے مشجر ہو گئے
جب سے ہم وابستۂ زلف معنبر ہوگئے۔

آہ کے شعلے شرار عود مجمر ہو گئے۔
عشق سے چمکا ستارہ ہر بت بے مہر کا
آتش خورشید سے یہ سنگ جوہر ہو گئے
غش ہوئے پوشاک پر اس غیرت یوسف کی ہم
دیکھ کر خورشید پر شبنم کو ششدر ہو گئے
عرض کی میں نے جو وہ اصلاح بنوانے لگے
اب رقیب روسیہ حجام اکثر ہو گئے
دل کو آئینہ بنایا ہم نے عشق یار سے
ہم بھی اب شایان اورنگ سکندر ہو گئے

اک عمر سے ہے در پے تکلیف رسائی
مدت سے یہ پھرتا ہے مرے خون کا پیاسا
اک قطرہ سودا ہے مری آنکھ کی پتلی
افسردگی پنجہ غم سے ہے یہ نقشا
دریا میں اگر ہو مرے اشکوں کی حرارت
پیدا ہو حبابوں کی طرح موج سے شعلا
نیساں مرے مانند اگر گرم بکا ہو
ہو جائے گہر سینہ کے اندر کا پھپھولا
اس درجہ میں اب فکر و تردد میں گھلا ہوں
اک نقطۂ وہمی ہے مرا جسم سراپا
ہر شکل سے تحصیل مطالب میں نظر کی
لیکن کبھی حاصل نہ ہوا کوئی نتیجا
بہتر نہیں تصریح پریشانی خاطر
کہتے ہیں کہ تصریح سے ابلغ ہے کنایا
کر ختم سخن عرشی دلخستہ دعا پر
ہے جملہ مطالب کے لیے انسب و اولیٰ

سید احمد حسن عرشی نے دو تین مرتبہ حج بیت اللہ کا ارادہ کیا لیکن اس زمانے میں پورے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے جاری تھے' اس لیے ہر باران کی والدہ ماجدہ یہ کہہ کر روکتی رہیں کہ تھوڑے دن ٹھہر جاؤ' یہ

ہنگامے ختم ہوں گے تو سب اکٹھے حج کو جائیں گے۔ کچھ دن تو وہ رکے رہے بالآخر غلبۂ شوق نے زیادہ شورش بپا کی تو تنہا ہی قنوج سے حج کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑودہ (گجرات ہندوستان) پہنچے اور مولانا غلام حسنین بن مولانا رستم علی قنوجی کے مکان پر اترے۔ وہیں تپ اسہالی میں مبتلا ہو کر سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ ان کی وفات کا سانحہ جمعۃ المبارک کے روز ۹ جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ (۲۳ نومبر ۱۸۶۰ء) کو پیش آیا۔ وہیں دفن ہوئے۔

اس ذہین و فطین عالم و فقیہ نے صرف تیس سال سات مہینے بیس دن عمر پائی۔ یعنی عین عالم جوانی میں فوت ہوئے۔

مولانا غلام حسنین قنوجی نے اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع بذریعہ خط نواب صدیق حسن خاں کو دی۔

سید احمد حسن قنوجی کی وفات کی تاریخ مولانا محمد عباس رفعت نے اس قطعے میں کہی:

عرشی عالی گہر احمد حسن
در طفیل مصطفیٰ مغفور باد
رخت بربست از جہاں سوئے بہشت
زیر طوبیٰ ہم نشین حور باد
گفت رفعت از پئے تاریخ او
باامام المتقین محشور باد

۱۲۷۷ھ

سید احمد حسن عرشی قنوجی متعدد اعتبارات سے اپنے علاقے اور عصر کی ممتاز شخصیت تھے [1]۔

۲۱۔ مولانا احمد سعید مجددی دہلوی

مولانا احمد سعید مجددی دہلوی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اکابر مشائخ اور جید علمائے برصغیر میں ہوتا ہے۔ مولانا ابوسعید مجددی دہلوی کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ غرہ ربیع الثانی ۱۲۱۷ھ/ جولائی ۱۸۰۲ء میں بمقام رام پور پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی شیخ ابوسعید مجددی دہلوی اور مولانا سراج احمد رام پوری سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتب درسیہ کی تکمیل مفتی شرف الدین رام پوری سے کی۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا۔ وہاں کچھ کتابیں شیخ محمد اشرف لکھنوی سے اور کچھ مولانا نور الحق لکھنوی کے حلقہ درس میں مکمل کیں۔

لکھنؤ سے دہلی کا قصد کیا' وہاں مولانا فضل امام خیر آبادی اور مولانا رشید الدین دہلوی کے درس میں شرکت کی اور ان سے استفادہ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں بہت سے اصحاب کمال کے تدریس کے حلقے قائم

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۵' ۹۳۶۔ التاج المکلل ص ۲۹۴' ۲۹۵۔ اتحاف النبلاء ص ۲۲۲ تا ۲۳۰۔ مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والا جاہی ج ۱ ص ۹۷ تا ۱۱۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲ تا ۲۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۷۴ تا ۲۷۶

تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندان گرامی، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز مصروف درس وافادہ تھے۔ مولانا احمد سعید طلب علم کے لیے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ کبھی تحقیق مسائل کے لیے اور کبھی سماع درس کے لیے۔! ان سے کسی نہ کسی انداز میں کافی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے تو صحاح ستہ، حصن حصین، دلائل الخیرات اور قول الجمیل وغیرہ کا باقاعدہ شرف اجازہ بھی حاصل کیا۔

اس اثنا میں شیخ غلام علی کے باب تصوف وطریقت پر دستک دی اور ان سے رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، احیاء علوم الدین، نفحات الانس، رشحات عین الحیات، مثنوی مولانا روم اور مکتوبات مجدد الف ثانی کا درس لیا اور ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔

شیخ غلام علی ان پر بہت شفقت فرماتے اور ان سے نہایت لطف وکرم سے پیش آتے تھے۔ شیخ غلام علی کا رویہ مولانا احمد سعید سے بالکل وہی تھا جو باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ وہ انھیں تحصیل علم کی تلقین کرتے۔ قول و عمل میں ہم آہنگی اختیار کرنے کا درس دیتے اور ہمت وقوت اور جذبہ صادقہ کے ساتھ تقویٰ وصالحیت کی راہ پر گامزن رہنے کی تاکید فرماتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا احمد سعید مجددی معرفت وادراک کے مرتبہ بلند پر فائز ہوئے، تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز ہندی علما وفقہا کی صف میں انھیں نمایاں جگہ عطا ہوئی اور اپنے نامور والد مولانا ابوسعید مجددی دہلوی کی وفات کے بعد ان کی مسند مشیخت کو رونق بخشی۔ شیخ غلام علی سے اس عالی مرتبت عالم نے جو فیض حاصل کیا تھا، اس کی لوگوں کو خوب تلقین کی۔

مولانا ممدوح کو اللہ نے بے حد تکریم سے نوازا۔ عوام وخواص میں حسن قبول عطا فرمایا اور حصول علم و فیض کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جب وہ ۵۷ سال کی عمر کو پہنچے تو ان کا سلسلہ رشد و ہدایت دور دور تک پھیل گیا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب رمضان ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں ہندوستان ایک زبردست ہنگامے سے دو چار ہوا۔ دہلی کا شہر جو فضل وکمال کا مرکز تھا، انقلاب وتغیر کی انتہائی خوف ناک لہروں کی زد میں آ گیا اور تمام اقطار ہند میں جگہ جگہ بلوے ہونے لگے، خون ریزی، غصب ونہب، لوٹ کھسوٹ اور ہلاکت آفرینی کی کوئی حد نہ رہی۔ یوں تو پورے ملک کو ہلاکت آفرین ہنگاموں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، لیکن شہر دہلی بالخصوص ان کی گرفت میں تھا۔ پھر انگریزوں نے اس پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد جو ظلم وستم کیا، اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ قتل وغارت، لوٹ مار تخریب کاری اور پھانسیاں، غرض یہ نہایت اذیت ناک اور الم انگیز دور تھا اور بڑے بڑے لوگوں کے دل دہل گئے تھے۔

لیکن اس تمام مدت میں مولانا احمد سعید مجددی کامل اطمینان سے اپنی خانقاہ میں بیٹھے رہے۔ نہ دل میں گھبراہٹ پیدا ہوئی، نہ کسی قسم کے اضطراب کا اظہار ہوا، نہ چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے گئے۔ پوری دل جمعی اور سکون کے ساتھ رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہ وہ عالم دین تھے، جن کو تفسیر، حدیث اور فقہ میں درجۂ کمال حاصل تھا اور اسی کی روشنی میں مسائل شرعیہ کی وضاحت کرتے اور فتوے جاری فرماتے تھے۔

مولانا ممدوح وقتی اور ہنگامی سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا محور صرف خدمت دین اور اشاعت اسلام تھا۔ سیاست سے ملوث ہونے کی صورت میں خدمت دین میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ملک گیر ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنے آپ کو صرف اشاعت علم اور تبلیغ دین کے لیے وقف کیے رکھا۔ یہ ان کے نزدیک کام کا ایک خاص دائرہ تھا، جس سے وہ قدم باہر نکالنے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے ان پر الزام عائد کیا کہ انھوں نے انگریزوں کو حدود ہندوستان سے باہر نکال دینے کا فتویٰ جاری کیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی حکومت حالات پر قابو پانے کے بعد مولانا احمد سعید مجددی اور ان کے اہل وعیال کو گرفتار کرنے اور پھر انھیں سخت ترین سزا دینے کی تدبیریں سوچنے لگی، مگر بعد میں حالات میں کچھ تبدیلی آئی تو معاملہ ختم کر دیا گیا اور مولانا ممدوح اپنے اہل وعیال سمیت حجاز مقدس چلے گئے۔

وہ آخر محرم ۱۲۷۴ھ/ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور نو مہینے کے بعد شوال ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔

مولانا احمد سعید مجددی اپنے دور میں برصغیر کے ممتاز عالم، نامور فقیہ اور معروف مدرس تھے۔ سلوک و طریقت میں بھی کامل تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں "الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ"، "تصحیح المسائل فی رد علی مائۃ مسائل اور الانہار الاربعہ شامل ہیں۔

تذکرہ کاملان رام پور میں مرقوم ہے کہ مولانا احمد سید مجددی نے ایک کتاب اہل حدیث کے رد میں لکھی تھی، جس کا نام "حق المبین فی الرد الوھابیین" ہے۔

مولانا ممدوح نے منگل کے دن نماز ظہر کے بعد ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۰ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مرقد کے قریب دفن کیے گئے [1]۔

۲۲۔ مولانا احمد علی سہارن پوری

یوپی کے شہر سہارن پور کی خاک مردم خیز سے تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن حضرات علما نے جنم لیا اور فضل وکمال میں شہرت دوام حاصل کی ان میں مولانا احمد علی سہارن پوری کا نام نامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ وہ انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سن ولادت تقریباً ۱۲۲۵ھ (۱۸۰۸ء) ہے۔

[1] واقعات دار الحکومت دہلی ج ۳ ص ۳۹۴، ۳۹۵۔ آثار الصنادید ص ۲۱۵۔ تذکرہ اولیائے دہلی ص ۱۴۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۹، ۴۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰ تا ۴۲۔ تذکرہ کاملان رام پور ص ۳۰۔ تاریخی مقالات ص ۲۲۰ تا ۲۲۲

مولانا احمد علی کی ابتدائی عمر کھیل کود اور کبوتر بازی وغیرہ میں گزری۔ پڑھنے لکھنے کی طرف مطلق توجہ نہ تھی۔ ایک روز مولانا سعادت علی فقیہ سہارن پوری نے جن کا سہارن پور میں معرکہ درس جاری تھا' ایک شخص کے ذریعے ان سے چند الفاظ کے معانی پوچھے اور ایک مسئلہ دریافت کرایا۔ احمد علی اس وقت سولہ سترہ سال کے تھے اور کبوتر اڑانے میں مشغول تھے۔ سائل ان کے گھر آیا۔ آکر آواز دی اور مولانا سعادت علی فقیہ کی ہدایت کے مطابق سوالات کیے۔ احمد علی کوئی جواب نہ دے سکے' کیوں کہ انھیں کسی چیز کا علم ہی نہیں تھا۔ اس پر سائل نے کہا۔ تم ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہو' لیکن علم سے محروم اور کبوتر بازی میں مشغول ہو۔ یہ بات تمھیں زیب نہیں دیتی۔ اس سے ان کے دل پر چوٹ لگی' سب مشغلے چھوڑ دیے۔ گھر سے نکلے اور میرٹھ جا پہنچے۔ وہاں اٹھارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ میرٹھ سے سہارن پور آئے۔ وہاں چند کتابیں مولانا سعادت علی فقیہ سے پڑھیں۔ صحیح بخاری کا اکثر حصہ مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارن پوری سے پڑھا۔ سہارن پور سے کاندھلہ گئے اور مفتی الٰہی بخش سے استفادہ کرنے لگے۔ مفتی صاحب ممدوح کی وفات کے بعد کاندھلہ سے دہلی کا عزم کیا۔ وہاں مولانا مملوک علی (متوفی ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/۱۲ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ طویل عرصے تک وہاں قیام رہا اور مولانا مملوک علی سے خوب استفادہ کیا۔ قیام دہلی کے زمانے میں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی (مہاجر مکی) بھی وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حاجی صاحب موصوف نے اس دور میں مولانا احمد علی سے گلستاں پڑھنی شروع کی تھی۔

اس کے بعد مولانا مملوک علی اور مولانا احمد علی ۲۶ رجب ۱۲۵۹ھ (۲۴ اگست ۱۸۴۳ء) کو دہلی سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے اور یکم ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (۲۳ نومبر ۱۸۴۳ء) کو مکہ معظمہ پہنچے اور حج کی سعادت حاصل کی۔

اس سے کچھ عرصہ پیشتر دیار ہند کے ممتاز و نامور محدث حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (متوفی ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ/ ۲۱ جولائی ۱۸۴۶ء) جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور تلمیذ تھے' اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی (متوفی ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ/ ۱۳۔ اپریل ۱۸۶۶ء) کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں اقامت گزین ہو گئے تھے اور وہاں جا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا احمد علی نے شاہ محمد اسحاق کے حلقہ درس میں شمولیت کی۔ وہاں مولانا احمد علی کا معمول یہ تھا کہ فجر سے ظہر تک حدیث کی قلمی کتابیں نقل کرتے اور ظہر کے بعد شاہ محمد اسحاق کی مجلس درس میں حاضر ہوتے۔ اس طرح ان سے صحاح ستہ کی تکمیل کی اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔

مکہ مکرمہ سے واپس آئے تو دہلی میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا اور حدیث کی قلمی کتابوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف ہو گئے۔ ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے مطبع احمدی کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ صحیح بخاری' جامع ترمذی اور مشکوٰۃ کی تصحیح کی اور ان کے حواشی لکھے۔ صحیح مسلم کی بھی تصحیح کی اور اسے پہلی مرتبہ شرح نووی کے ساتھ شائع کیا۔ سنن ابی داؤد کے کئی نسخے سامنے رکھ کر صحیح نسخہ تیار کیا' جسے ان کے ایک شاگرد خاص

مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔

مولانا احمد علی سہارن پوری کا بہت بڑا علمی کارنامہ صحیح بخاری کی تصحیح اور اس کا حاشیہ ہے۔ یہ خدمت انھوں نے نہایت محنت اور کاوش سے انجام دی۔ متعدد علمائے کرام سے اس میں مدد لی اور دس سال سے زیادہ عرصہ اس میں صرف کیا۔ اس کی طباعت کا آغاز ۱۸ جمادی الاخری ۱۲۶۴ھ (۲۳ مئی ۱۸۴۸ء) کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید عبدالغفور کے مطبع سید الاخبار میں ہوا۔ اس پریس میں صرف ایک سو چوراسی صفحات چھپے تھے کہ مولانا نے طباعت کا کام اپنے مطبع احمدی میں منتقل کر لیا۔ پھر اس سے آگے کے صفحات سے دونوں جلدیں مطبع احمدی سے شائع ہوئیں۔ جلد اول کی طباعت ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ (۱۵ مئی ۱۸۵۱ء) کو مکمل ہوئی اور جلد دوم ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں تکمیل کو پہنچی ❶ اس ایڈیشن کے کل تین سو پچیس نسخے شائع ہوئے اور فی نسخہ بارہ روپے خرچ آئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی مطبع احمدی میں ملازم تھے اور تصحیح کا کام کرتے تھے۔ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ مولانا احمد علی نے مولانا محمد قاسم سے لکھوایا۔

اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع عبدالغفور دہلی سے محرم ۱۲۷۲ھ/ ستمبر ۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ اس طباعت کے بعد بھی مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلی طباعت میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کی تصحیح کی اور بعض مقامات پر حواشی میں کچھ اضافہ کیا۔ اہم اضافہ رجال کے انساب اور کنیتوں میں ہوا۔ اس نسخے کی طباعت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں شروع ہوئی اور ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں تکمیل کو پہنچی۔

صحیح بخاری کی اشاعت اول کے خاتمۃ الطبع میں مولانا ممدوح نے صحیح مسلم کی طباعت کا کام شروع کرنے کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے اس کی طباعت جلد مکمل ہو گئی ہو' لیکن یہ ایڈیشن تھوڑے عرصے میں نایاب ہو گیا تھا۔ اس ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد صحیح مسلم کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد حسین فقیر اور شیخ ظفر علی کے اہتمام میں مطبع افضل المطابع شاہدرہ دہلی سے شائع ہوا۔

مولانا ممدوح نے جامع ترمذی کی تصحیح بھی کی اور اس پر حاشیہ لکھا۔ مولانا کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ترمذی کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹) میں مطبع العلوم دہلی سے اشرف علی واسطی کے اہتمام میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن رمضان ۱۲۸۲ھ (جنوری ۱۸۶۶ء) کو مولانا کے اپنے پریس مطبع احمدی دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا' اور ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) میں تکمیل کو پہنچا۔

---

❶ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ برصغیر میں کتب حدیث سب سے پہلے مولانا احمد علی سہارن پوری نے طبع کرائیں' اس سے قبل ان دیار میں کتب حدیث کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات درست نہیں۔ برصغیر میں کتب حدیث میں سے سب سے پہلی کتاب مطبع سلطانی قلعہ معلٰی دہلی سے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں سنن نسائی شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں موطا امام محمد شائع ہوا۔ پھر ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں کلکتے سے صحیح مسلم شائع ہوئی۔

حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ پر بھی انھوں نے حاشیہ لکھا اور بڑی محنت سے اپنے پریس مطبع احمدی دہلی میں چھاپا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ مشکوۃ کی پوری خدمت نہیں ہو سکی۔

مشکوۃ کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ دوسرا ایڈیشن مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن مفت تقسیم کرنے کے لیے شائع کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی جلد کے سرورق اور صفحہ اول پر جلی قلم سے ''الوقف للہ الکریم'' اور دوسری جلد کے متعدد صفحات پر الوقف چھپا ہوا ہے۔

کتب حدیث کی تصحیح اور حواشی کے علاوہ مولانا کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ بھی ہے، جو بہت سے علمی اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

ان کی ایک مستقل تصنیف بھی ہے جس کا نام "الدلیل القوی علی ترك قراۃ المقتدی" ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے جو مولوی محمد شاہ لدھیانوی کے اصرار پر لکھی گئی۔ اس میں امام کے پیچھے مقتدی کے سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں علمائے احناف کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شعبان ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۴ء) میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی۔ بعض احباب کے اصرار سے خود مصنف علام نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ ترجمہ اسی نام سے رجب ۱۲۹۵ھ (جولائی ۱۸۷۸ء) میں مطبع رحیمی واقع سرائے نواب علی محمد خاں سے شائع ہوا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (رمضان ۱۲۷۳ھ) تک مولانا احمد علی دہلی میں اقامت گزیں رہے۔ قیام دہلی کے دوران انھوں نے بہت سی اہم کتابوں کی تصحیح کی اور انھیں اپنے پریس (مطبع احمدی) سے شائع کیا۔ کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

جنگ آزادی میں جب دہلی پر آفت ٹوٹی اور مطبع احمدی لٹ گیا تو مولانا اپنے وطن سہارن پور آگئے اور گھر میں طلبا کو درس حدیث دینے لگے۔ دو برس سہارن پور میں قیام رہا۔ اس کے بعد میرٹھ جا کر شیخ الٰہی بخش کے ہاں ملازم ہو گئے۔

شیخ الٰہی بخش اور شیخ عبدالکریم دو حقیقی بھائی تھے اور شیخ مدار بخش کے بیٹے تھے۔ موضع اربن ضلع الہ آباد (یوپی) کے ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ مدار بخش الہ آباد کی سکونت ترک کر کے میرٹھ آگئے تھے اور یہاں تجارت اور ٹھیکے داری شروع کر دی تھی، جس میں بہت ترقی ہوئی۔ پشاور سے کلکتے تک تمام چھاؤنیوں میں ضروری سامان پہنچانے کا ٹھیکہ شیخ الٰہی بخش اور شیخ عبدالکریم کے پاس تھا۔ کلکتہ اور اس کے اطراف کی چھاؤنیوں میں سامان بھجوانے کی ذمہ داری اور اس نواح میں شیخ الٰہی بخش کے کاروبار کی نگرانی مولانا احمد علی کے سپرد ہوئی۔ اس ملازمت سے انھیں پانچ سو روپے ماہانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں دس سال سے زیادہ عرصے تک کلکتے میں قیام رہا۔ شیخ الٰہی بخش کی اجازت سے نماز فجر سے لے کر نو بجے تک مولانا موصوف

مسجد خیر الدین میں طلبا کو حدیث کا درس دیتے تھے۔ درس حدیث کا سلسلہ انھوں نے ہر جگہ جاری رکھا۔

کلکتے میں قیام اور ملازمت کے دس بارہ سال بعد مولانا احمد علی اور شیخ عبدالکریم حج کے لیے گئے۔ اس زمانے میں حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے۔ وہ مولانا کی اس ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ملازمت ترک کر کے تمام وقت درس حدیث میں صرف کریں۔ چنانچہ مولانا موصوف اور شیخ عبدالکریم کی ملاقات حاجی امداد اللہ صاحب سے ہوئی تو انھوں نے صاف لفظوں میں مولانا سے ملازمت چھوڑ دینے اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقف کر دینے کی تلقین فرمائی۔ یہ بھی کہا کہ آپ میرے استاد ہیں۔ دہلی میں مولانا مملوک علی نے میرا گلستان کا سبق آپ کے سپرد کیا تھا۔ مولانا احمد علی نے حاجی صاحب کی بات توجہ سے سنی اور فرمایا کہ آپ حرم شریف میں میرے لیے دعا فرمائیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں مولانا احمد علی ملازمت چھوڑ کر کلکتے سے سہارن پور آ گئے اور گھر میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے کثیر تعداد میں اہل علم مستفید ہوئے اور حلقہ درس روز بروز بڑھتا گیا۔ اس سے آٹھ سال قبل رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) کو سہارن پور میں ایک مدرسہ قائم ہو چکا تھا۔ یہ وہی مدرسہ ہے جس کے منصب اہتمام و تدریس پر مولانا سعادت علی فقیہ فائز تھے اور جس کو ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں مولانا احمد علی نے مدرسہ مظاہر علوم کے نام سے موسوم کیا اور آج تک دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم کو شروع ہی سے مولانا احمد علی کا تعاون حاصل تھا۔ وہ اس کے تمام معاملات سے واقف اور اس کی تدریسی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ نقد روپے کی صورت میں اس کی امداد بھی کرتے تھے جو ایک سو روپے سے تین سو روپے سالانہ تک ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں بھی دیتے اور وظائف اور طعام وغیرہ کی شکل میں بھی طلبا کی معاونت کرتے تھے۔

مولانا موصوف ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں کلکتے سے سہارن پور آئے۔ ایک سال تو گھر پر ہی درس دیتے رہے۔ لیکن ۱۲۹۲ھ سے باقاعدہ مدرسے میں سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ مدرسے کے طلبا اور ارکان انتظامیہ اس سے نہایت خوش ہوئے اور ان کی تشریف آوری سے طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں مدرسہ مظاہر علوم میں جو پڑھائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صحیح مسلم دو دفعہ پڑھائی گئی، سنن ابوداؤد کا بھی تکرار ہوا۔ صحیح بخاری ایک بار مکمل کر کے گیارہ پارے مزید پڑھے گئے۔ جامع ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام محمد، جامع صغیر، ترجمہ قرآن مجید، تفسیر جلالین وغیرہ کی تدریس مکمل ہوئی۔ شمائل ترمذی اور مقدمہ ترمذی کی تکمیل ہوئی۔ احیاء علوم الدین کا ایک ربع پڑھا گیا، درمختار صفحہ ۳۱۲ تک اور شرح ملا صفحہ ۳۲ تک پڑھی گئیں۔ قدوری پوری پڑھی گئی [1]۔

مدرسہ مظاہر علوم کے پہلے مدرس و مہتمم مولانا سعادت علی فقیہ کی وفات (۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) کے بعد سے منصب اہتمام خالی تھا۔ مولانا احمد علی کے سہارن پور تشریف لانے کے بعد مدرسے کے جلسہ عام میں اتفاق

[1] الفرقان لکھنؤ بابت اگست ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۳۶ بحوالہ روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء، ص ۵۔

رائے سے یہ منصب ان کے سپرد کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند سے بھی مولانا احمد علی کو تعلق رہا۔ دارالعلوم دیوبند کے دور آغاز کے بہت سے ارکان اور اساتذہ ان سے نسبت شاگردی رکھتے تھے۔ دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت کا سنگ بنیاد بھی انہی کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ دارالعلوم کی ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی ❶۔

برصغیر کے علمائے احناف میں مولانا احمد علی سہارن پوری فاضل اجل، متقی و پارسا اور فقیہ ذی مرتبت تھے۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ منکسر اور متواضع تھے۔ امامت و خطابت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدمت حدیث کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ خاموشی کے ساتھ مسجد میں جاتے اور باجماعت نماز پڑھ کر واپس گھر آ جاتے۔ اپنی موجودگی کا کسی کو کبھی احساس نہیں کرایا۔ گھر کے کام خود انجام دیتے۔ کسی کو تکلیف دینا اور اپنی ذات کے لیے کچھ کہنا ان کی عادت نہ تھی۔ بازار سے خود سودا خرید کر لاتے۔ کوئی شاگرد یا دوسرا آدمی کام کے لیے اپنی خدمات پیش بھی کرتا تو اس کو تکلیف دینا پسند نہ فرماتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے حلقہ درس کو بڑی وسعت دی اور متعدد جید علمائے کرام ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔ ان کے نامور تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں اور یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے علم و فضل اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر خاص شہرت اور امتیاز کے مالک ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شبلی نعمانی اور حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی۔

ارض برصغیر کے یہ عالم و فقیہ اور محدث شہیر ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء کے شروع میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض سے ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۷ اپریل ۱۸۸۰) کو شنبہ کے روز سہارن پور میں انتقال ہوا۔ بہتر سال عمر پائی ❷۔

۲۳۔ سید احمد علی محمد آبادی

سرزمین برصغیر میں علم و ادراک کی جو شمع روشن ہوئی اور فضل و عرفان کے میدان میں ارتقاو تقدم کی جو

❶ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۲۵ بحوالہ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۲ھ ص ۱۰

❷ اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ص ۴۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۳۔ حیات شبلی ص ۸۴ تا ۸۷۔ سیرت یعقوب و مملوک ص ۳۶، ۳۷۔ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۲۵

منزلیں طے ہوئیں، اس میں اہل حدیث، حنفی اور شیعہ سب شریک ہیں اور ہر جماعت کے اصحاب کمال نے اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس ملک میں جن حضرات نے خدمت علم میں نام پیدا کیا، ان میں مشہور شیعہ عالم سید احمد علی بن عنایت حید حسینی محمد آبادی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کی ولادت رمضان المبارک ١٢٠٦ھ/مئی ١٧٩٢ء کو موضع محمد آباد گوہنہ میں ہوئی جو ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے اور کسی زمانے میں علم وعلما کے مسکن کی حیثیت سے مشہور تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے شہر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ بعد ازاں فیض آباد گئے، وہاں کے اہل علم سے اکتساب فیض کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی (متوفی ١٢٥٦ھ/١٨٤٠ء) سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اس کے بعد سید دلدار علی نصیر آبادی (متوفی ١٩ رجب ١٢٣٥ھ/٢ رمئی ١٨٢٠ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے دور کے مجتہد شیعہ تھے۔ عرصے تک ان کے حلقہ درس میں شامل رہے اور ان سے حدیث وفقہ اور اصول کی کتابوں کی تکمیل کی، یہاں تک کہ سید دلدار علی کے تلامذہ میں سب سے فوقیت لے گئے اور اپنے اقران ومعاصرین میں بلند مرتبے کے حامل قرار پائے۔ تمام ہم درس حضرات سے زیادہ صاحب علم، زیادہ ذہین اور زیادہ ذی مرتبت تھے۔

سید احمد علی محمد آبادی نے بعض کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں الرد علی الاخبارية، ترجمة الاثنی عشریته الصلوتیه۔ (از عاملی) ایک رسالہ اس موضوع پر ہے کہ نماز میں اس شخص کی امامت جائز ہے جس کے فسق کا لوگوں کو علم ہو۔ ایک رسالہ فی جواز المسح علی الخفین ہے۔ ایک مسح علی الجبیرہ کے بارے میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ اور بھی چند کتب ورسائل کے مصنف تھے۔

برصغیر کے اس شیعہ عالم نے ١٢٩٥ھ/١٨٧٨ء میں وفات پائی [1]۔

٢٤۔ مولانا احمد علی چڑیاکوٹی

اعظم گڑھ کے نواح میں ایک قصبہ چڑیا کوٹ ہے، جو زمانہ قدیم سے اہل علم کی قیام گاہ رہا ہے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے بھی اس کا نام تحریر کیا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس قصبے میں جن اصحاب کمال نے جنم لیا اور بزم علما میں نام پیدا کیا، ان میں مولانا احمد علی چڑیاکوٹی قابل ذکر ہیں۔ مولانا ممدوح کے والد کا نام غلام حسین اور دادا کا نام سعد اللہ تھا۔ نسباً عباسی تھے۔ علمائے احناف میں بالخصوص بڑی شہرت پائی۔ یوں تو تمام علوم مروجہ اور فنون متداولہ کے حامل تھے، لیکن خاص طور پر فقہ، اصول فقہ اور کتب درسیہ میں مہارت رکھتے تھے۔

مولانا موصوف کی ولادت ١٢٠٠ھ (١٧٨٥ء) میں چڑیا کوٹ میں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کی طرف توجہ کی۔ صرف ونحو وغیرہ کی کتابیں حافظ غلام علی چڑیاکوٹی (متوفی ١٢٤٨ھ/١٨٣٢ء) سے پڑھیں، جو چڑیا کوٹ میں ان علوم کے ماہرین میں سے تھے۔ پھر مزید تحصیل کے لیے رخت سفر باندھا اور مشاہیر علمائے

---

[1] نجوم السماء۔ تذکرۃ العلماء۔ نزہۃ الخواطر ج ٧ ص ٤٣، ٤٤

ہند کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں مولانا غلام جیلانی رام پوری (متوفی ٢٧ ذی الحجہ ١٢٣٤ھ/ ١٧ اکتوبر ١٨١٩ء) اور مولانا حیدر علی ٹونکی رام پوری (متوفی ١٢٧٣ھ/ ١٨٥٧ء) شامل ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ارض ہند کے اصحاب فضل اور ارباب کمال میں سے تھے۔ ان کا حلقہ درس وسیع اور سلسلہ تلمذ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

مولانا احمد علی چڑیا کوٹی نے علمائے اعلام کی کثیر جماعت سے استفادہ کیا اور اللہ نے تمام علوم وفنون کا دروازہ ان کے لیے کھول دیا۔ اذکار و اشغال اور تصوف وطریقت کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو حافظ شاہ ابواسحاق بھیروی (متوفی ١٢٣٤ھ/ ١٨١٩ء) کے آستانہ سلوک پر موضع بھیرہ گئے، جو اعمال اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ہے اور چڑیا کوٹ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گاؤں اس عہد میں علم وفضل کے لیے مشہور تھا۔

تیس سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے وطن چڑیا کوٹ واپس آئے۔ اس وقت وہ تمام فنون درسیہ سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ بعد ازاں اپنے عزیزوں میں شادی کی اور پھر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بات کی وضاحت وتبیین اور مشکل مسائل کو آسان الفاظ میں بیان کرنے اور طلبا کے ذہن نشین کرانے کا انھیں ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے کے علما و مدرسین اور طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ان کی زندگی درس وافادہ میں گزری، تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ بعض احباب و متعلقین کے اصرار پر کچھ لکھا بھی تو اس کے بعض حصے ناتمام رہے۔ انوار احمدیہ کے نام سے منطق کے ایک رسالے قال اقول کا حاشیہ تحریر کیا۔ سلم العلوم کی شرح سپرد قلم کی، لیکن تکمیل کی منزل کو نہ پہنچ سکی۔ علم مناظرہ میں نور النواظر کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے۔ علم صرف اور علم نحو کے سلسلے میں بھی کچھ رسالے قلم بند کیے۔ اسی طرح عربی اور اردو میں مختلف موضوعات سے متعلق بعض چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کیے۔

ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں برصغیر کے بعض مشہور علما شامل ہیں۔ مثلاً مولانا نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی (متوفی ١٢٩٩ھ/ ١٨٨٢ء) مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی (متوفی غرہ شوال ١٣٢٠ھ/ جنوری ١٩٠٣ء) اور مولانا نجم الدین چڑیا کوٹی (متوفی ١٣٠٧ھ/ ١٨٩٠ء) وغیرہ۔ مولانا احمد علی چڑیا کوٹی نے بہتر (٧٢) سال عمر پائی اور ٢٤ ذی الحجہ ١٢٧٢ھ/ ٢٥ اگست ١٨٥٦ء) کو اس دار فانی سے کوچ کیا اور جنت الفردوس کی راہ لی [1]۔

٢٥۔ مولانا احمد گل بھوپالی

بھوپال دیار ہند کا مردم آفرین شہر ہے۔ اس میں بے شمار اصحاب فضل عالم وجود میں آئے اور ان کی

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ١٩، ٢٠۔ نزہۃ الخواطر ج ٧ ص ٤٤، ٤٥

علمی تگ و تاز سے پورا برصغیر متاثر و مستفید ہوا۔ ان حضرات میں مولانا احمد گل ہیں' جو اونچے درجے کے فقیہ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ممتاز علما میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عرصے تک بھوپال کی مسند افتا پر فائز رہے۔ اسی شہر میں انتقال ہوا۔ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں انھیں نائب مفتی بھوپال لکھا ہے [1]۔

۲۶۔ حافظ احمد الدین بگوی

برصغیر کے قدیم خاندانوں میں جو شرافت و نجابت میں ممتاز اور علم و فضل میں یگانہ تھے' صوبہ پنجاب کے ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں ''بگہ'' کا ایک خاندان بھی شامل تھا۔ ان خاندانوں کی پرانی روایات اب ختم ہو گئی ہیں۔ تذکرہ و رجال کی کتابوں میں صرف ان کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ اپنے دور کے یہ عظیم لوگ تھے جن کو تاریخ نے یاد رکھا اور اپنے سینے میں جگہ دی۔

تیرھویں صدی ہجری میں موضع بگہ کے حافظ احمد الدین نے جو ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے' ایک نامور عالم' محدث اور فقیہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے ایک بھائی اور تھے' جن کا نام حافظ غلام محی الدین تھا۔ والد حافظ نور حیات' داد حافظ محمد شفا اور پردادا حافظ نور محمد تھے۔ یعنی کئی پشتوں سے اس خاندان کے بزرگ قرآن اور دیگر علوم معقول و منقول سے شغف و تعلق میں مشہور تھے۔

حافظ احمد الدین نے بیان و معانی میں مطول اور فقہ میں شرح وقایہ تک کتابیں اپنے بڑے بھائی غلام محی الدین سے پڑھیں۔ بعد ازاں انہی ہی کی معیت میں دہلی گئے اور چودہ سال وہاں قیام رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب دہلی میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی (حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور خلیفہ) سرگرم تدریس تھے۔ حافظ احمد الدین نے ان کے حلقہ درس میں شرکت کی اور خوب استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ علوم قرآن' حدیث و فقہ اور دیگر مروجہ فنون میں کامل گردانے گئے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند و اجازہ حاصل کر کے واپس وطن تشریف لائے اور مسند درس بچھائی۔ بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے اور اپنے علاقے میں تبلیغ اسلام اور اشاعت علم کا موثر ترین ذریعہ بنے۔

دونوں بھائی ___ حافظ احمد الدین اور غلام محی الدین ___ جلیل القدر علما میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ایک بھائی چھ مہینے لاہور میں رہتا اور ایک اپنے گاؤں بگہ میں درس و افتا کی خدمت انجام دیتا۔ پھر دوسرا لاہور آجاتا اور لاہور والا بگہ چلا جاتا۔ اس طرح لاہور شہر اور علاقہ بگہ میں درس و تدریس اور افتا و تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

حافظ احمد الدین بے حد متقی عالم دین تھے۔ بلند اخلاق اور طلبا پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم بیمار پڑ جاتا تو اس کے لیے خود دوا تیار کرتے اور اس کو استعمال کراتے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶

حافظ احمد الدین بگوی اور ان کے برادر بزرگ مولانا غلام محی الدین بگوی نے علم دین کی خوب اشاعت کی اور درس و تدریس کے ذریعے لوگوں کو بہت فیض پہنچایا۔ جن حضرات نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا‘ ان میں صوبہ پنجاب کے متعدد مشاہیر علما و مشائخ شامل ہیں۔

حافظ صاحب ممدوح نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں‘ لیکن درس و افتا میں زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے ان پر نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ احمدیہ حاشیہ شرح ملا جامی

۲۔ حاشیہ خیالی

۳۔ حاشیہ مطول

۴۔ ضیاء الصرف شرح صرف میر

۵۔ دلیل المشرکین: یہ کتاب عربی میں ہے۔ ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ جو خود مؤلف کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے‘ جناب عبدالحمید سواتی (ناظم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) کے پاس محفوظ ہے۔ عبدالحمید صاحب نے اس کا اصل متن مع اردو ترجمہ ''ایضاح المومنین'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں مصنف نے شرک کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں اور کتاب و سنت اور اقوال سلف کے حوالے سے اس کی تردید کی ہے۔ کتاب اپنے موضوع میں قابل مطالعہ ہے۔

۶۔ مسئلہ غنا سے متعلق بھی ان کی ایک کتاب ہے جس کا ذکر ''دلیل المشرکین'' میں کیا ہے۔

حافظ احمد الدین بگوی عربی کے شاعر بھی تھے۔

انھوں نے بھیرہ کی جامع مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ مسجد اب تک بگہ کے اس اہل علم خاندان کے وعظ و ارشاد کا مرکز ہے۔ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۳ شوال ۱۲۸۶ھ/ ۱۶ جون ۱۸۷۰ء کو موضع بھیرہ میں وفات پائی۔ اور وہاں کی جامع مسجد کے قریب دفن کیے گئے[1]۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ اپنے بھائی مولانا غلام محی الدین سے تیرہ سال چھوٹے تھے اور ان سے تیرہ سال ہی بعد فوت ہوئے۔ غلام محی الدین کی تاریخ وفات ۲۹ یا ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ/ ۲۱ یا ۲۲ جون ۱۸۵۷ء ہے۔

۲۷۔ شیخ احمد اللہ انامی

شیخ احمد اللہ بن دلیل اللہ بن خیر اللہ بن عبدالکریم صدیقی انامی‘ حدیث و فقہ کے عالم اور پارسا بزرگ تھے۔ موضع انام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔

[1] حافظ احمد الدین بگوی کے حالات کے لیے دیکھیے حدائق الحنفیہ ص ۴۸۶‘ ۴۸۷ نیز ص ۴۷۶ تا ۴۷۸ بھی دیکھیے۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۔ تذکرہ علمائے پنجاب ج ا ص ۸۷ تا ۸۹

یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (مہاجر مکی) کا سلسلہ درس جاری تھا۔ شیخ احمد اللہ انامی نے دہلی جا کر اس میں شرکت کی' دیگر علمائے کرام سے بھی اکتساب علم کیا۔ حصول علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور اس عصر کے مشہور علما نے ان سے استفادہ کیا' جن میں مولانا سخاوت علی جون پوری (متوفی ۶ شوال ۱۲۶۴ھ/ ۵۔ ستمبر ۱۸۴۸ء) اور مولانا کرامت علی جون پوری (متوفی ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء) ایسے اکابر شامل ہیں۔

شیخ احمد اللہ انامی نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ اس رسالے کا نام انھوں نے مائۃ مسائل فی تحصیل الفضائل بالادلۃ الشرعیۃ وترک الامور المنھیۃ رکھا۔ یہ رسالہ ان ایک سو مختلف فقہی اور دینی مسائل پر مشتمل ہے جو شیخ احمد اللہ نے اپنے استاذ محترم شاہ محمد اسحاق دہلوی کی تحریروں سے نقل کیے تھے۔ شیخ ممدوح کے سال وفات کا تو علم نہیں ہو سکا' البتہ اس رسالے کا سن تالیف ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۳۰ء ہے [1]۔

۲۸۔ مولانا ارادت حسین صدیقی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) ہندوستان کے صوبہ بہار کا وہ شہر ہے جس میں متعدد ایسے خاندان آباد تھے جو فضل و کمال' تدریس و تصنیف اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان حضرات کی بے مثال قربانیوں کی داستان تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ ان بزرگان عالی مقام میں سے ایک بزرگ مولانا ارادت حسین عظیم آبادی تھے جو وہاں کے صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: ارادت حسین بن اولیا علی بن رضی الدین بن رفیع الدین بن روح الدین صدیقی۔

مولانا ارادت حسین صدیقی نے اپنے شہر عظیم آباد (پٹنہ) کے ان دو عظیم القدر علمائے دین سے تحصیل کی' جو فضیلت علمی کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے مرتبہ عالی پر فائز ہوئے۔ ان میں ایک بزرگ کا اسم گرامی مولانا احمد اللہ [2] اور دوسرے کا مولانا ولایت علی [3] ہے۔ سند حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ طب کی کتابیں اپنے چچا حکیم احمد علی سے پڑھیں اور حدیث و فقہ' فرائض و میراث' حساب و ریاضی، طب اور دیگر علوم

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۷' ۴۸

[2] مولانا احمد اللہ عظیم آبادی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے' بہت بڑے عالم اور مشہور فاضل تھے۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ رہے اور ان کی جماعت مجاہدین میں شامل ہوئے۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور بعض دیگر حضرات سے علم حاصل کیا۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کر کے جزائر انڈیمان (کالے پانی) بھیج دیا تھا۔ وہیں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء) کو وفات پائی۔

[3] مولانا ولایت علی عظیم آبادی ۱۲۰۵ھ (۹۱۔۱۷۹۰ء) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کی ایک درس گاہ میں علم حاصل کر رہے تھے کہ سید احمد شہید بریلویؒ سے ملاقات ہوئی اور پھر انھی کے ہو رہے۔ نامور عالم تھے۔ سرحد پار گئے' انگریزی حکومت سے جہاد کیا۔ مجاہدین کی قیادت کی اور سرحد پار کے مرکز مجاہدین میں ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو فوت ہوئے۔

متداولہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔

مولانا ارادت حسین نہایت متواضع' متدین' پاک باز اور منکسر المزاج تھے۔لباس اور اکل وشرب میں بہت محتاط اور میانہ رو تھے۔۱۲۷۲ھ میں حج کی سعادت حاصل کی۔ پھر واپس آکر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ بعد ازاں ۱۲۸۱ھ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ تیرہ سال بعد غرہ جمادی الاخری ۱۲۹۴ھ/ جون ۱۸۷۷ء میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔وفات کے وقت چھپن سال کی عمر تھی۔

۲۹۔مولانا اسلم کشمیری

وادیٔ کشمیر علم وفضل سے ہمیشہ سرسبز وشاداب رہی ہے۔تیرھویں صدی ہجری میں جن فضلائے کرام نے وہاں جنم لیا ان میں مولانا اسلم بن یحییٰ بن معین الحق رفیقی کشمیری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ان کی کنیت ابوابراہیم تھی اور اپنے زمانے کے محقق عالم' دقیق النظر فاضل' صاحب فتویٰ فقیہ اور متعدد کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ان کے والد مولانا یحییٰ اور دادا مولانا معین الحق کا شمار بھی دیار کشمیر کے ارباب علم وتحقیق میں ہوتا تھا۔

مولانا اسلم کشمیری ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۳۹ھ/ ۳۰۔اگست ۱۷۲۷ء کو پیدا ہوئے۔قرآن مجید تجوید کے ساتھ اپنے دادا مولانا معین الحق سے پڑھا اور علوم مروّجہ کی تحصیل اپنے والد گرامی مولانا یحییٰ سے کی۔ان سے تفسیر' حدیث' فقہ' اصول' لغت' کلام اور صرف ونحو کی تمام مروجہ کتابیں پڑھیں۔تصوف وسلوک سے بھی لگاؤ تھا۔ یہ منزلیں بھی باپ کی رہنمائی میں طے کیں۔مولانا یحییٰ کشمیری کا باقاعدہ سلسلہ درس جاری تھا۔لائق بیٹے نے کئی مرتبہ صحاح ستہ کی قرأت میں ان کے شاگردوں کے ساتھ شمولیت کی۔ باپ کو چونکہ کتب حدیث سے خاص تعلق تھا' اس لیے بیٹا بھی ان سے متاثر ہوا' اور حدیث کی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

تکمیل تعلیم کے بعد اس دور کے حکمران کی درخواست پر منصب افتا پر فائز ہوئے اور بیس سال اس عہدہ جلیلہ پر متمکن رہے۔اس اثنا میں بے شمار فتوے جاری کیے اور مفتی کی حیثیت سے مرجع خواص وعوام ہوئے۔

تصنیف وتالیف میں بھی مہارت رکھتے تھے' چنانچہ فقہ وتصوف وغیرہ کے سلسلے میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔متعدد کتابوں پر تعلیقات وحواشی لکھے' جن میں الجامع الصغیر' تفسیر جلالین' الاشتباہ والنظائر' حسامی اور قصیدہ بردہ کے حواشی قابل ذکر ہیں۔

تمام مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا' جو بڑا وسیع تھا۔ان کے شاگردوں میں کشمیر اور بیرون کشمیر کے بہت سے ممتاز اہل علم شامل ہیں' جن میں شیخ عبدالوہاب' مولانا ابوالمکارم' ملا محب اللہ' ملا قوام الدین' ملا عبداللہ' مفتی ہدایت اللہ' شیخ عبدالنبی' شیخ عطاء اللہ' شیخ صدیق اور شیخ ابوالطیب احمد ایسے جلیل القدر اصحاب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مولانا اسلم کشمیری علم وفضل کے ساتھ تواضع' انکسار اور حسن خلق میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔نہایت

نرم مزاج اور عمدہ خصائل تھے۔

دیار کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے ۲۷ محرم ۱۲۱۲ھ/ ۲۱ راگست ۱۷۹۷ء کو تہتر سال کی عمر پا کر سفر آخرت اختیار کیا❶۔

۳۰۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

برصغیر پاک وہند کے جن قصبات و بلاد نے علوم ومعرفت میں شہرت حاصل کی، ان میں صوبہ یو پی کا ایک مقام "کاندھلہ" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے صدیقی خاندان میں گزشتہ صدی میں متعدد علما وفقہا عالم وجود میں آئے اور شمع علم کو روشن رکھنے کا باعث بنے۔ ان میں ایک ذی مرتبت عالم مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی تھے، جو جلیل القدر عالم اور صاحب فضل وکمال تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام فخر الدین رازی کی وساطت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

مفتی الٰہی بخش بن شیخ الاسلام بن قطب الدین بن عبدالقادر صدیقی ۱۱۶۲ھ کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ضلع مظفر نگر کا معروف قصبہ ہے۔ اپنے نانا شیخ محمد کاندھلوی کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ شیخ محمد کاندھلوی جید عالم تھے، انھوں نے اپنے نواسے کی بہترین طریقے سے تربیت کی۔ ابتدائی درسی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقہ درس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ کافی عرصہ وہاں رہے، شاہ صاحب موصوف کی بیعت کا شرف بھی حاصل کیا۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے والد گرامی اور جد محترم علم طب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ مفتی صاحب ممدوح بھی اس علم سے بہرہ ور ہوئے اور طب کی کتابیں والد اور دادا سے پڑھیں۔ ان کے علم اور قابلیت کی شہرت سن کر نواب ضابطہ خاں نے انھیں طلب کیا اور محکمہ افتا پر مامور فرمایا۔ خاصا عرصہ اس منصب پر متعین رہے۔ نواب ضابطہ خاں کی وفات کے بعد مفتی صاحب بھوپال چلے گئے اور وہاں کے منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ کئی سال وہاں مقیم رہے اور نہایت عمدگی سے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بھوپال سے اپنے وطن کاندھلہ تشریف لے گئے اور اپنے برادر مکرم حاجی کمال الدین کاندھلوی سے اخذ فیض کیا اور اذکار واشغال میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت سید احمد شہید بریلوی سے رابطہ پیدا ہوا تو ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ "ملہمات احمدیہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں سید احمد شہید بریلوی کے اذکار واشغال کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی مدح وتوصیف کی گئی ہے۔

مفتی الٰہی بخش نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں ایک کتاب کا نام "جوامع الکلم" ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے متعلق ہے۔ ایک کتاب "شمیم الحبیب فی ذکر خصائل الحبیب" ہے۔ یہ کتاب رسول

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۱، ۴۶۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۵

اللہ ﷺ کے احکام وفرامین پر مشتمل ہے اور اس میں سنن نبوی کا ذکر ہے۔ یہ کتاب ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۵ء میں بھوپال کے زمانہ قیام میں تصنیف کی۔ ایک رسالہ ''شرح حضرات الخمس'' اور ایک تکملہ مثنوی معنی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء میں تصنیف کی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی رسائل وکتب ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

بہر حال مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی اپنے دور کے مفتی' فقیہ اور مصنف تھے۔ انھوں نے ۱۵ جمادی الاخری ۱۲۴۵ھ/ ۱۱ دسمبر ۱۸۲۹ء کو تریاسی (۸۳) سال کی عمر میں کاندھلہ میں وفات پائی ❶۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ایک چھوٹے بھائی مولانا امام الدین صدیقی کاندھلوی تھے۔ وہ بھی بہت ذکی اور فہیم تھے' انھوں نے ابتدائی درسی کتابیں بڑے بھائی مفتی الٰہی بخش صدیقی سے پڑھیں۔ پھر دہلی گئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے۔ علوم حکمیہ میں بالخصوص اپنے دور کے فاضل بزرگ تھے۔ حکمت وفلسفے کی بعض کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ عالم شباب ہی میں وفات پا گئے تھے ❷۔

۱۳۱۔ شیخ امام الدین امروہوی

شیخ امام الدین بن علی احمد بن زین الدین حسینی امروہوی اپنے عصر کے معروف عالم وفقیہ تھے۔ ان کی ولادت امروہہ میں ہوئی۔ ابتدا میں مذہباً شیعہ تھے۔ امروہہ کے ایک عالم شیخ صیف اللہ امروہوی وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ امام الدین ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اس عالم دین سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کی صحبت وتلمذ سے شیعہ مذہب ترک کر کے مذہب اہل سنت اختیار کر لیا۔ بعد ازاں امروہہ سے دہلی چلے گئے اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ ان سے باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ شاہ غلام علی سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر امروہہ واپس آئے اور مسند ارشاد سنبھالی۔

بے حد متقی بزرگ تھے۔ متوکل علی اللہ اور قناعت شعار تھے۔ دین داری کا یہ حال تھا کہ نماز فجر سے لے کر اشراق تک ذکر ومراقبے میں مشغول رہتے۔ بعد ازاں طلبا کو تفسیر' حدیث اور کتب فقہ کا درس دیتے۔ پھر نماز ظہر کے بعد سے عصر تک مختلف درسی کتابوں کا درس دیتے۔ نماز عصر کے بعد لوگوں کو وظائف واوراد بتاتے۔ اس اثنا میں حاضرین کو ضروری دینی مسائل سے بھی آگاہ کرتے۔

شیخ امام الدین چند کتابوں کے مصنف بھی تھے' جن میں ایک کتاب کشف الغطا ہے۔ ایک کا نام ردالربا ہے۔ علاوہ ازیں تجوید وقرات کے سلسلے میں بھی چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کیے۔

شیخ امام الدین امروہوی نے ۶ ذی قعدہ ۱۲۵۶ھ/ ۳۰ جنوری ۱۸۴۱ء کو تریسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ۷ص ۷۰ '۷۱

❷ ایضاً ص ۷۶

❸ نزہۃ الخواطر ۷ص ۷۴'۷۵

۳۲۔ سیدہ امتہ الغفور دہلوی

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کی جن خواتین نے فضل وکمال میں شہرت پائی اور میدان علم میں بلند مرتبہ حاصل کیا، ان میں شاہ محمد اسحاق دہلوی (متوفی ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ/۲۱ جولائی ۱۸۴۶ء) کی دختر نیک اختر سیدہ امتہ الغفور کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ اپنے والد مکرم کی شاگرد تھیں۔ ان سے حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں اور طویل عرصے تک ان سے استفادہ کرتی رہیں۔ نہایت عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ علوم میں ید طولیٰ رکھتی تھیں اور حدیث وفقہ کے مسائل مجتہدانہ انداز میں بیان کرتی تھیں۔

ان کی شادی مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ/۲۳۔ فروری ۱۸۲۸ء) کے صاحب زادہ گرامی قدر مفتی عبدالقیوم بڑھانوی (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) سے ہوئی تھی۔ مفتی عبدالقیوم بڑھانوی اپنے عصر کے کبار علما میں سے تھے۔ شیخ وامام اور محدث تھے۔ والیہ بھوپال کی درخواست پر بھوپال میں مقیم ہوئے، اس نے ان کی قابلیت وعلمیت کی بنا پر انھیں ریاست بھوپال کے منصب افتا پر متعین کیا اور نہایت عزت وتکریم سے پیش آئیں۔ بھوپال میں ان کو جاگیریں بھی عطا کر دی تھیں تاکہ وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوں۔

سیدہ امتہ الغفور اور مفتی عبدالقیوم دونوں میاں بیوی علم وفضل میں ممتاز تھے، لیکن بیوی کی نظر مسائل فقہ کی جزئیات پر اتنی عمیق اور ہمہ گیر تھی کہ شوہر کسی شرعی مسئلے کو سلجھانے میں دقت محسوس کرتے اور حدیث وفقہ کی روشنی میں آگے قدم نہ بڑھا سکتے تو بیوی سے استفسار کرتے۔ وہ مشکل سے مشکل بات کی آسانی سے وضاحت کرنے اور کتاب وسنت کے دلائل سے مسئلہ زیر بحث کی عقدہ کشائی کرنے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔

سیدامتہ الغفور کی تاریخ ولادت ووفات کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تیرھویں صدی ہجری کی ماہر حدیث وفقہ خاتون تھیں۔

۳۳۔ سید امیر حسن حسینی سہسوانی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے جن بلاد وقصبات اور دیہات میں زمانہ قدیم سے علم کی نہریں بہتی رہیں اور معرفت وادراک کے چشمے ابلتے رہے، ان میں ایک شہر کا نام ''سہسوان'' ہے، جو بدایوں سے پچیس میل بجانب غرب واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو عرصہ دراز تک علما ومشائخ کا مرکز اور صلحا وفقہا کا مسکن رہا ہے۔ اس میں تیرھویں صدی ہجری میں جن نادر روزگار شخصیتوں نے جنم لیا اور فضیلت وکمال میں شہرت پائی ان میں امام المتکلمین حضرت علامہ سید امیر حسن حسینی سہسوانی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نامی سرفہرست ہے۔ مولانا ممدوح کی ولادت ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء کے لگ بھگ ہوئی۔ عمر کا ابتدائی حصہ تحصیل علم کے شوق سے خالی رہا۔ عالم شباب میں جب ازدواجی ذمے داریاں بھی سر پر آ پڑی تھیں، غیرت نفس نے جوش مارا اور طلب علم کے لیے کمربستہ

ہوئے۔ وطن سے نکلے اور علی گڑھ کی راہ لی جہاں مولانا عبدالجلیل (شہید ۱۸۵۷ء) سرگرم تعلیم و تدریس تھے۔ ان سے استفادہ کیا۔ وہاں سے فرخ آباد گئے اور قاضی بشیر الدین قنوجی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) کے سلسلہ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ پھر لکھنؤ کا قصد کیا اور حضرت مولانا ابوالبرکات تراب علی فرنگی محلی (متوفی ۱۲ صفر ۱۲۸۱/ ۱۷/ جولائی ۱۸۶۴ء) سے فنون عقلیہ و حکمیہ کی تکمیل کی۔ وہاں تشنگی علم کم نہ ہوئی تو دہلی جا کر مفتی صدر الدین دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ پھر استاذ کل حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ/ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کے حلقہ درس میں شمولیت کی اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ مولانا شاہ عبدالغنی محدث مجددی (متوفی ۶ محرم ۱۲۹۶ھ/ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۷۸ء) اور امام شوکانی (متوفی جمادی الاخری ۱۲۵۰ھ/ اکتوبر ۱۸۳۴ء) کے تلمیذ رشید مولانا عبدالحق بنارسی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) کی خدمت میں بھی گئے۔ ان تینوں حضرات سے کتب صحاح اور بعض دیگر کتابیں سماعاً و قراءۃً پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔

زمانہ قدیم میں علمائے عظام کا یہ شیوہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممتاز و مشہور علما سے کسب علم اور حصول سند کی کوشش کرتے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی نے بھی اپنے عصر کے متعدد نامور حضرات سے تحصیل کی اور سند لی، تاکہ ہر حلقہ علم کے اکابر سے تعلق و قرب اور استفادے کے مواقع میسر آ سکیں۔

سید ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے ذکاوت و فطانت، قوت حفظ، سرعت فہم اور ضبط سے خوب نوازا تھا اور وہ کم سے کم وقت میں دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بات کو سمجھ لینے کی پوری استعداد رکھتے تھے، اس لیے چند ہی سالوں میں ان کا شمار متبحر اور وسیع النظر علما کی جماعت میں ہونے لگا اور تھوڑے عرصے میں شہرت و ناموری کی بہت سی منزلیں طے کر لیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن واپس آئے تو دیکھا کہ جو شہر کسی زمانے میں دولت علم و عرفان سے مالا مال اور علما و فضلا کا گہوارہ تھا، اپنی رونق علم ختم کر چکا ہے اور جو روایات اس سے وابستہ تھیں، اس کے فقط نشانات رہ گئے ہیں، باقی تمام سلسلہ معدوم ہو گیا ہے۔ پرانے اہل علم یا تو سفر آخرت اختیار کر گئے ہیں یا سہسوان کی سکونت ترک کر کے دیگر علاقوں اور شہروں میں جا بسے ہیں، یعنی پرانی بساط یکسر الٹ گئی ہے۔

اب انھوں نے از سر نو حالات کا جائزہ لیا اور شمع علم کو جو بجھ چکی تھی دوبارہ روشن کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ اللہ پر توکل کر کے وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور لوگوں کو تدین و تقویٰ اختیار کرنے اور طلب علم کے لیے کمربستہ ہونے کی تلقین کی۔ ان کی پرخلوص تقریروں اور اثر آفرین مواعظ کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کے نرم و متوازن طرز کلام کی وجہ سے انھوں نے راہ راست اختیار کر لی۔ اب سہسوان اور اس کے گردونواح میں علم کے چرچے ہونے لگے اور ہر معاملے میں پابندیٔ شرع کا التزام کیا جانے لگا۔ یہ تگ و تاز کئی سال جاری رہی، حتیٰ کہ شہر اور علاقے کی فضا بالکل بدل گئی۔

اسی اثنا میں بعض رؤسائے دہلی کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں کئی سال دعوت وارشاد اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ بے شمار لوگ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے اور متعدد طلبائے علم نے ان سے اخذ علم کیا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔

قیام دہلی کے زمانے میں ان کا شہرہ علم دور دور تک پہنچ گیا تھا اور لوگ ان کے اسلوب تدریس اور انداز وعظ وتبلیغ سے بے حد متاثر تھے۔ میرٹھ کے لوگوں کو ان کی صدائے حق کی اثر آفرینیوں کا پتا چلا تو اپنے ہاں لے جانے پر مصر ہوئے۔ اس کے لیے میرٹھ کے ایک رئیس شیخ الٰہی بخش مرحوم پیش پیش تھے۔ ان کے مخلصانہ اصرار سے مجبور ہو کر سید صاحب موصوف دہلی سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا دینی اور اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ اس کا سنگ بنیاد بھی خود رکھا اور اس کے اہتمام ونگرانی کے فرائض بھی خود ہی انجام دینے لگے۔ میرٹھ کا یہ مدرسہ ان کی وجہ سے بہت مشہور ہوا' اور دور دراز مقامات سے طلبا اس میں آنے اور ان سے مستفید ہونے لگے۔ ان کے وطن سہسوان کے متعدد طلبائے علم جن میں خاندان سادات اور ان کے قرابت دار بھی شامل تھے' ان کے ساتھ میرٹھ چلے گئے تھے۔ ان حضرات نے ان سے خوب استفادہ کیا اور اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ میرٹھ میں ان سے استفادہ کرنے والوں میں بہت سے اکابر علمائے کرام میں خود ان کے فرزند گرامی مولانا سید امیر احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء) بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سید عبدالباری سہسوانی (متوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) مولانا سید سبط احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) مولانا سید محمد نذیر سہسوانی (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) مولانا محمد تراب علی مرشد آبادی اور قاضی محمد احتشام الدین مراد آبادی وغیرہ حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

سید امیر حسن طویل عرصے تک میرٹھ میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں کتاب وسنت کی خوب نشر واشاعت کی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ آخری دور میں مدرسہ میرٹھ کا انتظام اپنے بعض لائق تلامذہ کے سپرد کر دیا تھا' اور خود اس ذمے داری سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میرٹھ میں کم اور علی گڑھ میں زیادہ قیام رہتا تھا۔

بعد ازاں پھر سہسوان میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ وہاں قرآن وحدیث کا درس دیتے' بحث ومناظرے میں حصہ لیتے' لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے' طلبا کو مخالفین سے مباحثوں کے لیے تیار کرتے اور احسن طریقے سے تبلیغ اسلام کی تربیت دیتے۔ وہاں کی مسجد غلام علی شاہ میں روزانہ درس ہوتا اور کثیر تعداد میں طلبا وعلما اور دیگر حضرات اس میں شریک ہوتے۔ نماز جمعہ میں بہت کثرت سے لوگ آتے' اور سید صاحب ممدوح نہایت حسن وخوبی سے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کو منہیات سے روکتے اور معروف کی تلقین کرتے۔

مختلف مذاہب ومسالک کی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے میں ماہر تھے۔ کتب شیعہ کا بھی خوب مطالعہ تھا اور صحابہ کرام کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کی تردید مضبوط دلائل سے کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں دربار اودھ کی سرپرستی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کونشانہ طعن بنایا جانے لگا اور برسر عام تبرّیٰ بازی ہونے لگی تو حیدر آباد (دکن) کی ریاست کے ارباب اختیار نے اس اہم مسئلے کو موضوع توجہ ٹھہرایا' اور علمی و تحقیقی رنگ میں ان کی تردید کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے مولانا حیدر علی فیض آبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) کی خدمات حاصل کی گئیں' جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور جلیل القدر عالم تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور ضعف و کمزوری نے انھیں گھیر لیا تھا۔ لیکن خدمت دین کی غرض سے یہ ذمے داری اس شرط پر قبول فرمائی کہ ان کو کوئی صاحب بصیرت اور وسیع النظر عالم بہ طور معاون دیا جائے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ معاون سید امیر حسن سہوانی ہونے چاہئیں' جن کا کثرت مطالعہ اور وسعت فکر و نظر میں کوئی حریف نہیں ہے۔ چنانچہ سید صاحب ممدوح سے رابطہ قائم کیا گیا اور کہا گیا کہ ابتدا میں اس خدمت کے لیے انھیں چار سو روپے مہینہ دیے جائیں گے اور جلد ہی اسے بڑھا کر ایک ہزار روپے مہینہ کر دیا جائے گا۔ سب احباب اور اعزہ و اقارب نے سید صاحب سے حیدر آباد تشریف لے جانے کی درخواست کی اور اس کام کو تمام کاموں سے زیادہ اہم اور بنیادی قرار دیا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا' میں اپنے اوقات درس و وعظ کو مباحثات و مشاجرات میں صرف کرنا اور امرا و حکام کا تقرب اختیار کر کے اپنے آپ کو عیش و تنعم کا خوگر نہیں بنانا چاہتا۔ ایک عالم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں کہ وہ سلاطین و حکام کی مجلس اختیار کرے' ان سے قرب و ربط رکھے اور علم کو مال و دولت کے لیے ضائع کرے۔

سید امیر حسن سہوانی مسلکاً اہل حدیث تھے' کسی خاص امام کی تقلید کے قائل نہیں تھے' براہ راست کتاب و سنت کی اتباع کرتے اور اسی کو بنیاد عمل قرار دیتے تھے۔ مروجہ علوم پر ماہرانہ نظر رکھتے اور مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ و اصول اور دیگر علوم و فنون پر دست رس تھی۔ اللہ نے ان کو قوت فہم اور بصیرت و دانش کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی سعی و کوشش سے سہوان اور ان کے اطراف میں علم حدیث کی اشاعت ہوئی اور لوگوں میں عمل بالحدیث کا جذبہ ابھرا۔ مولانا محمد بشیر سہوانی (متوفی ۲۹ جمادی الاولی ۱۳۲۶ھ/ ۲۹ جون ۱۹۰۸ء) نے جو خطۂ ہند کے مشہور عالم دین تھے' انہی کے فیض صحبت سے مسلک اہل حدیث اختیار کیا تھا۔

تصنیف و تالیف سے بھی سید صاحب ممدوح کو دلچسپی تھی۔ رد بدعات اور حمایت سنت میں کئی رسالے لکھے اور قرآن مجید' حدیث رسول اور کتب فقہ کے دلائل سے اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا۔ ایک رسالہ شیعہ کے رد میں لکھا اور ایک رسالہ اثبات حق کے نام سے تحریر کیا۔ طبیعیات شفا پر تعلیقات سپرد قلم کیں۔

ان کی تصنیفات کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی معروف تصنیف معیار الحق شائع ہوئی تو اس کے جواب میں مولانا ارشاد حسین رام پوری (متوفی ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء) نے انتصار الحق کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ انتصار الحق کے رد میں حضرت میاں صاحب کے تلامذہ نے چار کتابیں لکھیں۔ ایک براہین اثنا عشر' دوسری تلخیص الانظار فی ما بنی علیہ الانتصار' تیسری اختیار الحق اور چوتھی بحر زخار ــــ ان میں سے اول الذکر تصنیف یعنی ''براہین اثنا عشر'' سید امیر حسن سہوانی کی تصنیف ہے۔

براہین اثنا عشر کے معرض تصنیف میں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ جس دن مولانا ارشاد حسین رام پوری کی کتاب انتصار الحق چھپ کر آئی، اسی دن سید امیر حسن سہسوانی نے اس کا مطالعہ کیا۔ اس میں حضرت میاں صاحب کے موقف کا مصنف نے بارہ دلائل سے رد کیا تھا اور لکھا تھا کہ جو شخص ان بارہ دلیلوں کا جواب دے گا، سمجھا جائے گا کہ اس نے ان کی پوری کتاب کی تردید کر دی ___ مصنف انتصار الحق کے نزدیک وہ دلائل اس قدر مستحکم اور مضبوط تھے کہ ان کا توڑ اور جواب محال تھا۔ لیکن سید امیر حسن نے اس کتاب کی اشاعت کے دوسرے ہی دن ''براہین اثنا عشر'' کے نام سے اس کا جواب لکھ کر شائع کرا دیا۔ اس کا ایک نسخہ چودھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) کی خدمت میں بھی ارسال کیا۔ حضرت ممدوح نے یہ رسالہ پڑھا تو سید صاحب کو حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:

از محمد عبدالحی: بہ مولوی صاحب مکرم معظم مجمع بحرین المعقول والمنقول، منبع نہریں الفروع والاصول مولوی سید امیر حسن صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ لطف شمامہ مورخہ ۲۰ ماہ رواں بہ ورود خود ممتاز ساختہ و براہین اثنا عشر رسیدہ۔ اغلاط اسامی کتب ومؤلفین در انتصار لاتعداد ہستند، شاید بہ نظر اختصار بر چند کفایت شدہ❶۔

یعنی ماہ رواں کی ۲۰ تاریخ کو مکتوب گرامی ملا، اور باعث افتخار ہوا۔ براہین اثنا عشر وصول پائی۔ انتصار الحق میں کتابوں اور مصنفین کے ناموں کی لاتعداد غلطیاں موجود ہیں۔ آپ نے شاید اختصار کے پیش نظر چند ہی غلطیوں کے ذکر کو کافی سمجھا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی جو خود بھی برصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل تھے، مولانا سید امیر حسن سہسوانی کو نہایت احترام کے ساتھ مخاطب فرماتے ہیں اور ان کو مجمع بحرین، جامع معقول ومنقول اور منبع فروع واصول قرار دیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب ممدوح اپنے دور کے بہت بڑے فاضل اور محقق تھے، اور برصغیر پاک وہند کے اکابر علما ان کو حد درجہ لائق تعظیم وتکریم گردانتے تھے۔

سید امیر حسن کامیاب مناظر بھی تھے اور فن مناظرہ کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے بھی (جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا) مناظرے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دونوں علمائے عصر کے درمیان مسئلہ وجوب زیارت پر مباحثہ ہوا، اور اس ضمن میں دونوں طرف سے کئی رسالے شائع ہوئے۔

سید صاحب کے بہت بڑے حریف عیسائی پادری تھے جو اس زمانے میں انگریزی حکومت کے ایما اور تعاون سے ہندوستان میں عیسائیت کی ترویج واشاعت کر رہے تھے۔ انگلستان سے بھی کئی مشہور پادری برصغیر میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور تبلیغ عیسائیت میں سرگرم تھے۔ ان میں ایک پادری ہاسکن تھا جو انگلستان کا باشندہ تھا اور بدایوں میں مقیم تھا۔ دوسرا پادری اسکاٹ تھا۔ یہ بھی انگریز تھا اور انگلستان کا رہنے والا تھا۔ یہ

❶ الحیات بعد المماۃ ص ۵۹۲

پادری بریلی میں اقامت پذیر تھے۔ ان دونوں پادریوں کو اپنے دور کے بہت بڑے مناظر اور محقق سمجھا جاتا تھا۔ ان کا اصل مقابلہ مسلمانوں سے تھا اور اسلام پر یہ لوگ مسلسل حملے کر رہے تھے۔ سید امیر حسن سہوانی سے کئی مرتبہ ان کے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور ہر مرتبہ سید صاحب کے مقابلے میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سید صاحب کی وسعت نظر اور مذاہب کے بارے میں ان کی تحقیق سے یہ دونوں پادری بہت متاثر تھے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ ان کی حاضر جوابی اور قوت استدلال کے بھی معترف تھے۔ ان کی زندہ دلی اور فراغ حوصلگی کے بھی مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملاقات کے لیے وہ سہوان آتے' ان سے باتیں کرتے اور ان کی مجالس وعظ میں شریک ہوتے۔

پادری اسکاٹ ولایت میں تھا کہ اسے سید صاحب ممدوح کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس نے نہایت افسوس کا اظہار کیا اور انگلستان کے ایک اخبار میں ان کے بارے میں مضمون لکھا' جس میں ان کے اسلوب بحث اور نہج استدلال کی تعریف کی اور ہندوستان کے علما میں ان کو بے مثل اور منفرد حیثیت کے عالم قرار دیا۔

عمر کے آخری حصے میں سید صاحب موصوف تمام علائق سے منقطع ہو کر ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ علی گڑھ میں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ وہیں دو شنبہ کے روز ۱۱ صفر ۱۲۹۱ھ/ ۳۰ مارچ ۱۸۷۴ء کو معمولی ناسازئ طبع سے انتقال کیا۔ ۶۸ سال عمر پائی ❶۔

مولانا سید امیر حسن سہوانی کے صاحب زادے مولانا سید امیر احمد سہوانی تھے' جو باپ کی طرح بہت ذہین اور علم و فضل میں یگانہ تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے بھی سند و اجازہ کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۹ء میں رحلت فرمائی۔

۳۴۔ مفتی امیر حیدر بلگرامی

بلگرام ہندوستان کا وہ شہر ہے جس نے بے پناہ علمی شہرت حاصل کی اور اس میں بے شمار اصحاب کمال عالم ظہور میں آئے۔ یہ دیار ہند کا ایک مردم آفرین مقام ہے اور تاریخی لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل۔ ! سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء) کا مولد و مسکن ہے اور آزاد بلگرامی وہ شخص ہیں' جنھوں نے عربی اور فارسی میں بہت علمی کام کیا اور بالخصوص اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان اور فارسی کتاب مآثر الکرام کے ذریعے برصغیر کی علمی و دینی شخصیتوں کو آنے والی نسلوں سے متعارف کرایا۔ تذکرہ و رجال کے موضوع سے متعلق ان کی یہ وہ خدمت ہے' جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مفتی امیر حیدر بلگرامی انہی سید غلام علی آزاد بلگرامی کے پوتے ہیں۔ ان کے والد کا نام سید نور الحسن تھا

---

❶ حالات کے لیے ملاحظہ ہو حیات العلماص ۶۴ تا ۶۹۔ الحیات بعد المماۃ ص ۵۹۲' ۶۹۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۷۹' ۸۰۔ تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۲۳۹ تا ۲۴۱۔ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۵۹۔

جو عین عالم جوانی میں باپ کی زندگی ہی میں ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء کو بلگرام کے تالاب میں ڈوب کر وفات پا گئے تھے۔ باپ کے لیے یہ نہایت غم انگیز حادثہ تھا' جوان بیٹے کی وفات پر آزاد نے دردناک مرثیہ کہا' جس کا ایک شعر یہ ہے:

قیامت برسرایں بوستاں رفت
کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

آزاد کا یہی ایک بیٹا تھا۔ اس کی وفات کے بعد ان کی تمام سرگرمیاں معطل ہو گئی تھیں اور سیر و سیاحت کے سلسلے ختم ہو گئے تھے۔

امیر حیدر ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۵ھ/۲۵ جنوری ۱۷۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ تین سال کو پہنچے تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا اس زمانے میں علاقہ دکن کے شہر اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ امیر حیدر نے مروجہ درسی کتابیں سید محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) سے پڑھیں اور کچھ عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ بعد ازاں اپنے جد محترم سید غلام علی آزاد بلگرامی کے پاس اورنگ آباد چلے گئے۔ آزاد نے لائق پوتے کی خوب تربیت کی اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے سید نورالہدیٰ اورنگ آبادی (متوفی رمضان المبارک ۱۲۱۰ھ/مارچ ۱۷۹۶ء) کے حلقہ درس میں داخل کرایا۔ علم طب حکیم عبدالسلام برہان پوری (متوفی ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) سے پڑھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد عازم کلکتہ ہوئے اور اپنی قابلیت اور فقہ میں عبور کی بنا پر وہاں کی مسند افتا پر فائز کیے گئے۔ سولہ سال منصب قضا پر مامور رہے۔ اس کی بعد وطن جانے کے شوق نے بے تاب کیا اور بلگرام کو روانہ ہوئے۔ لیکن جب مرشد آباد پہنچے تو ہاتھ میں ایک ایسی پھنسی نکلی' جو نہایت تکلیف دہ تھی۔ اس کی وجہ سے انتہائی کرب میں مبتلا ہوئے اور وہیں وفات پا گئے۔

امیر حیدر بلگرامی اپنے دور کے مفتی' عالم اور فقیہ تھے۔ عربی میں چند کتابیں بھی تصنیف کیں' جن میں دو رسالے علم صرف اور علم نحو سے متعلق ہیں۔

امیر حیدر بلگرامی نے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کو مرشد آباد میں انتقال کیا❶۔

۳۵۔ مفتی انور علی آروی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک شہر ''آرہ'' ہے' جس کو بہت عرصے تک علما و صلحا کے گہوارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں آرہ میں جو علمائے کرام پیدا ہوئے اور علم کے مختلف میدانوں میں شہرت پائی' ان میں مفتی انور علی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ مفتی انور علی کا شمار اپنے علاقے کے علمائے مشاہیر میں ہوتا تھا۔ متداول درسی کتابیں اپنے بڑے بھائیوں کرامت علی اور احمد علی سے پڑھیں۔ پھر عازم کلکتہ ہوئے

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۸۱۔

اور قاضی عباس علی (متوفی ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۲۰ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۸۰۵ء) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے باقی کتب درسیہ پڑھیں۔ قاضی عباس علی کلکتہ اور اس کے مشرقی شہروں کے قاضی القضاۃ تھے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مفتی انور علی آروی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اونچے درجے کے ہندی علما میں ہونے لگا اور اپنے دور کے شیخ و فاضل اور فقیہ گردانے گئے۔ ان کی قابلیت کی بنا پر انھیں منصب افتا پر فائز کیا گیا، جس پر وہ عرصے تک فائز رہے۔ پھر ان کو قاضی کا عہدہ عطا کیا گیا۔ قضا کے سلسلے میں انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں اور ہر لحاظ سے عزت و احترام کے مستحق قرار پائے۔

وہ دو اہم مناصب ــــ منصب افتا اور منصب قضا ــــ پر مامور رہے۔ یہ دونوں انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ منصب ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے درس و افادۂ طلبا کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ باقاعدہ فرائض تدریس انجام دیتے اور طلبائے علم کو پڑھاتے رہے۔ اس طرح بہ یک وقت تین عظیم الشان خدمات میں مصروف رہے اور ان میں سے ہر خدمت اپنی جگہ بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل تھی۔ بہ طور مدرس اور معلم انھوں نے بہت کام کیا اور متعدد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

مفتی انور علی آروی نے ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۴ نومبر ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۳۶۔ سید اولاد حسن قنوجی

علمائے قنوج میں مولانا سید اولاد حسن بخاری قنوجی عالم اجل اور فاضل ذی مرتبت تھے۔ نواب سید صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال کے والد مکرم تھے۔ مولد و منشا قنوج اور سن ولادت ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۶ء ہے۔ والد کا نام سید اولاد علی تھا، جو دربار حیدر آباد کی طرف سے قلعہ گول کنڈہ کے منصب قلعہ داری پر فائز تھے۔ ریاست کی طرف سے پانچ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ انور جنگ بہادر کے لقب سے ملقب تھے اور ایک ہزار سوار و پیادہ کے سالار تھے۔ سلسلہ نسب عالی ہے جو حضرت جعفر صادق کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس خاندان کے نسب نامے میں سید اولاد حسن سے اوپر تیسرے نمبر پر ایک بزرگ سید عزیز اللہ کا نام آتا ہے۔ عزیز اللہ شیعہ ہو گئے تھے۔ ان سے پہلے خاندان کے تمام حضرات کا تعلق اہل سنت سے تھا۔ سید عزیز اللہ کے بیٹے سید لطف اللہ اور سید لطف اللہ کے فرزند سید اولاد علی تھے۔ یہ تینوں حضرات مسلک شیعیت سے منسلک تھے۔ ان کے قبول شیعیت کی وجہ رؤسائے لکھنؤ اور امرائے حیدر آباد سے ربط و صحبت تھی۔ چونکہ وہ شیعہ تھے، اس لیے ان سے متاثر ہو کر یہ بھی شیعہ ہو گئے۔ لیکن سید اولاد علی کے فرزند گرامی سید اولاد حسن نے شیعیت ترک کر کے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا تھا۔ پھر علم و مطالعہ میں وسعت ہوئی تو زمرۂ اہل حدیث میں شامل ہو گئے۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۸۷، ۸۸ بحوالہ قسطاس البلاغہ۔

سید اولاد حسن نے حصول علم کا آغاز مولانا عبدالباسط صدیقی قنوجی (متوفی ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) سے کیا۔ اور ابتدائی عمر ہی میں شیعیت سے تائب ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے سید نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

چوں ایشاں بہ سن آ گاہی رسیدند اوائل کتب رسمیہ بہ حلقہ درس استاذ الفضلا افضل الکملا بقیۃ السلف، خیر الخلف مولوی عبدالباسط بن مولوی رستم علی بن ملا علی اصغر قنوجی رحمہم اللہ تعالیٰ اکتساب نمودند و قباحت و شناعت مذہب تشیع دریافتہ سالک مسلک اہل سنت و جماعت گردیدند ❶۔

یعنی سید اولاد حسن جب عمر شعور کو پہنچے تو ابتدائی مروجہ کتابیں مولانا عبدالباسط قنوجی کے حلقہ درس میں پڑھیں اور شیعہ مذہب ترک کر کے مسلک اہل سنت اختیار کیا۔

اس کے بعد لکھنؤ گئے۔ وہاں مولانا نور الحق انصاری لکھنوی (متوفی ۲۳/ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ/ ۸ دسمبر ۱۸۲۲ء) کے حلقہ درس میں شرکت کی اور کتب درسیہ کی تکمیل فرمائی۔ لکھنؤ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ مرزا حسن علی ہاشمی لکھنوی (متوفی ۲۴ صفر ۱۲۵۵ھ/ ۹ مئی ۱۸۳۹ء) سے بھی تحصیل کی، جو اپنے دور کے نامور شافعی المسلک محدث تھے۔ اس اثنا میں مولانا محمد نور سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔

۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں دہلی کا عزم کیا اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے مستفید ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالقادر دہلوی سے بھی فیض یاب ہوئے۔ ان تینوں اساطین فضل و کمال کے تلمذ و صحبت کا یہ اثر ہوا کہ عقیدہ و عمل میں مزید تصلب آ گیا اور شیعیت کے تمام اثرات نہ صرف زائل ہو گئے بلکہ شیعہ کے خلاف بعض رسالے تحریر کیے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

در ردّ ایں طائفہ رسائل نوشتند و عمائر بسیار از جنس امام بارہ جات و منصب ہائے تعزیہ و جز آں بخاک برابر کنانیدند، و در بدل آں بعمران مساجد و مدارس پرداختند ❷۔

یعنی اس جماعت (شیعہ) کے رد میں رسالے لکھے اور امام باڑوں کو منہدم اور نشانات تعزیہ وغیرہ کو مٹا کر زمین بوس کر دیا، اور ان کے بجائے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرائے۔

تکمیل علم کے بعد اپنے وطن قنوج تشریف لے گئے اور دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی کی دعوت جہاد کا غلغلہ پورے برصغیر میں بلند تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت سے سرفراز ہوئے۔ پھر ان کی قیادت میں قافلہ مجاہدین کے ساتھ، جن میں مولانا اسماعیل دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی جیسے متعدد اکابر رجال شریک تھے، سرحد پار گئے اور انگریزی حکومت کے خلاف بعض جنگوں میں شرکت کی۔ اس عہد میں کابل، قندھار اور لاہور کا سفر بھی کیا۔ ان کا شمار بسلسلۂ جہاد سید صاحب کے ساتھ جانے والے السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔

❶ اتحاف النبلاء، ص ۲۳۵

❷ التقصار جیود الاحرار، ص ۱۲۷

سرحد پار سے قنوج واپس آئے اور لوگوں کو دعوت جہاد دی۔ اس خدمت کے لیے خود سید احمد بریلوی نے ان کو واپس بھیجا اور اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ یہاں آکر ملک کے مختلف علاقوں سے مجاہدین کے لیے سامان جہاد ارسال کیا اور ہزاروں اہل اسلام نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ اپنے علاقے اور حلقہ تعلقات میں نہایت سرگرمی سے لوگوں کو جہاد میں دعوت شرکت دیتے اور تمام مساعی کی اطلاع باقاعدہ سید صاحب کو سرحد پار بھیجتے۔ سید صاحب نے ان کو خطوط بھی لکھے، جن میں ایک خط ۱۵ ذوالحجہ ۱۲۴۲ھ کو پنجتار کے مقام سے ارسال فرمایا۔ اس خط میں سید صاحب نے ان کو ''سیادت مآب نقابت انتساب سید اولاد حسن سلمہ اللہ تعالیٰ'' کے پُرعظمت الفاظ سے خطاب کیا ہے اور ان کی تبلیغ واشاعت دینی اور تگ وتاز مجاہدانہ کی بہت تعریف کی ہے۔

حضرت سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد سید اولاد حسن کو نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی جانب سے ملازمت اختیار کرنے کی درخواست کی گئی، لیکن چونکہ اس کی بعض باتیں خلاف شرح تھیں، اس لیے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ حکام فرخ آباد کی طرف سے منصب افتاد قضا قبول کرنے کی دعوت دی گئی، اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے تو مولانا ولی اللہ فرخ آبادی کو اس منصب پر متعین کیا گیا۔

حیدر آباد (دکن) کے دربار میں ان کے والد سید اولاد علی انور جنگ بہادر عرصے تک ملازم رہے تھے اور ان کی خطیر رقم ریاست کے خزانے میں جمع تھی۔ سید اولاد علی کی وفات کے بعد ریاست کے والی نے سید اولاد حسن کو باضابطہ فرمان بھیجا کہ یہ رقم آکر لے جائیں، مگر انھوں نے باپ کی رقم لینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ یہ اندوختہ ان کے زمانہ شیعیت کا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی انگریزی حکومت کے ملازموں کی دعوت قبول کر لیتے تھے، لیکن سید اولاد حسن قنوجی اسے مال مشتبہ سمجھتے اور اس سے منع فرماتے تھے۔ مولانا عبدالحی تو ان کے نقطہ نظر کو مان لیتے، لیکن مولانا اسماعیل شہید جواب دیتے کہ ''آخر یہ لوگ کام ہی کر کے تو پیسے لیتے ہیں۔''

سید اولاد حسن نے اپنی زندگی خدمت حدیث وسنت کے لیے وقف کر دی تھی۔ بہت مؤثر وعظ کہتے اور بدعات کی قرآن وحدیث کی روشنی میں تردید کرتے۔ ان کے علاقے اور شہر کے لوگ ان کی بے حد تکریم کرتے اور شرعی معاملات میں انہی کے فتوے اور تحقیق کو لائق اعتنا ٹھہراتے۔

وہ چھوٹی بڑی سترہ کتابوں کے مصنف تھے، جو عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہیں، اور خالص دینی اور فقہی نوعیت کی ہیں۔ ان میں تیرہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) الاختصاص ببیان الحدود و القصاص: یہ کتاب عربی میں ہے۔

(۲) تقویة الیقین برد المشرکین: فارسی میں ہے۔

(۳) نور العرفاء من مواة الصفا: فقہی مسائل سے متعلق ہے اور فارسی میں ہے۔

(۴) راہ جنت: یہ چالیس احادیث کی شرح ہے اور فارسی نظم میں ہے۔

(۵) رسالہ در معنی کلمہ توحید: فارسی میں۔

(۶) فتوٰی فی رد تعزیہ: فارسی میں۔

(۷) رسالہ دربیان ما اھل لغیر اللہ: میاں جی یار علی کے رد میں ہے۔

(۸) اردو ترجمہ حبل المتین بقول المستبین فی حقوق الخلق اجمعین۔

(۹) رسالہ دربیان آداب وعظ: فارسی میں

(۱۰) رسالہ دربیان بیعت و انواع و حقائق آں: فارسی میں۔

(۱۱) ھدایت المومنین: دررد تعزیہ۔

(۱۲) راہ سنت منظوم: اردو

(۱۳) رسالہ درمنع افروختن و چراغاں برقبور: یہ بھی اردو میں ہے اور اس میں شریعت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ قبروں پر چراغاں کرنا جائز نہیں۔

نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں کہ ان کے کتب خانے میں بہت سی ضخیم قلمی کتابیں ان کے ہاتھ کی کتابت شدہ موجود ہیں، جن میں تفسیر فتح العزیز کی تین جلدیں، مجالس الابرار ایک جلد، طریقہ محمدیہ ایک جلد، تحفہ اثنا عشریہ، نورالانوار اور تقبیح الشعرا شامل ہیں ❶۔

سید اولاد حسن خاں کا مرتبہ علمی اس قدر بلند تھا کہ اس دور کے تمام علما و فضلا اور اقران و معاصرین ان کی تعظیم کرتے اور ان کی مجلس میں حاضر ہونے کو سعادت سمجھتے تھے۔ نہایت صابر و شاکر، قانع و بے نیاز، عابد و زاہد، ذکی و فطین، سریع الادراک، حاضر جواب، مہمان نواز، مستجاب الدعوات، متبع سنت، پرہیزگار، سلفی العقیدہ اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ غرض تمام اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔

سید صاحب ممدوح شاعر بھی تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مسلکاً اہل حدیث تھے اور براہ راست کتاب و سنت سے تمسک کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی منظوم کتاب ''راہ سنت'' سے ان کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اب کسی کا فعل ہو یا قول ہو
چاہیے سنت سے اس کو تول لو
مولوی فاضل ہو یا استاد و پیر
یا ولی یا شیخ یا شاہ و فقیر

❶ اتحاف النبلا ص ۲۴۶۔ سید اولاد حسن کی کتابیں ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب صدیق حسن خاں کے پاس رہیں، پھر وہ بھی وفات پا گئے تو ان کا کتب خانہ جو بہت ہی اہم اور شاندار کتابوں پر مشتمل ہے، ندوۃ العلما لکھنو میں منتقل ہو گیا۔ اب یہ کتب خانہ وہیں ہے۔

زندہ ہو' مردہ ہو یا نزدیک و دور
ہو ولایت یا کرامت کا ظہور
ہو رسالہ یا کہ ہو کوئی کتاب
مجتہد ہو یا فقیہ لاجواب
گر اسے برحسب سنت پایئے
بے خطر اس کو عمل میں لایئے
گر نہ ہو سنت سے اس کو اتفاق
چھوڑ دے اس کو ہے کردار شقاق
ہے خطا کی پیروی کرنا خطا
یہ اجازت کب ہوئی ہم کو رواً
ہر طرح تبعیت اور تقلید عام
غیر پیغمبر کی ہے جائے کلام
مذہب ارباب سنت کر یقیں
جز نبی معصوم عالم میں' نہیں
مجتہد کے حق میں ہے یخطی یصیب
ہے خطا جائز ولی سے اے حبیب
جو خطا تقلید میں ہوتی معاف
کس لیے پڑتا بھلا پھر اختلاف
کہتے ہیں اکثر گروہ معتقد
ہے خطا سے پاک قول مجتہد
دشمن تحقیق ان کی بات ہے
جز نبی معصوم کس کی ذات ہے
علم ہیں رکھتے بہت عالم مگر
کس لیے نزدیک ارباب خبر
راہ پر کچھ اور کچھ بے راہ ہیں
اگرچہ اہل علم ہیں آگاہ ہیں
اچھے اچھے ہیں خطا میں آ پڑے
مذہب باطل میں عالم ہیں بڑے

الغرض یہ وہم ہیں سب درخیال
ہے بجائے خود یہ دعویٰ محال
جان و دل سے چاہیے کرنا قبول
لطف قال اللہ اور قال الرسول
سن چکے تم حسن ارشاد نبی
چاہیے سنت کی اب تو پیروی

سید اولاد حسن قنوجی جلیل القدر عالم، محدث وفقیہ اور مجاہد و جنگ جو تھے۔ برصغیر کے اونچے مرتبے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، اور دونوں عالم و فاضل۔ ایک مولانا سید احمد حسن عرشی، اور دوسرے نواب سید صدیق حسن خاں۔!

سید اولاد حسن قنوجی نے صرف تینتالیس سال عمر پائی اور سید احمد بریلوی کی شہادت کے سات سال بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ء) کو قنوج میں انتقال کیا۔ ان کی وفات کے وقت نواب صدیق حسن خان کی عمر صرف پانچ برس تھی اور احمد حسن سات سال کے تھے ❶۔

—— ب ——

۳۷۔ حافظ بارک اللہ لکھوی

برصغیر پاک و ہند کے شرفا و نجبا میں متحدہ پنجاب کا لکھوی خاندان صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ فضیلت علمی، تدین وتقویٰ، تصوف و سلوک، زہد و عبادت، تصنیف و تالیف، بیعت و ارشاد اور درس و تدریس میں کوئی اس خاندان کے اصحاب علم کا حریف نہیں۔ پھر جس جذبۂ خلوص اور شوق ولگن کے ساتھ اس کے ارباب کمال نے جو بوقلموں خدمات انجام دیں، اس میں بھی کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انکسار و تواضع، للّٰہیت اور خوف خدا ہمیشہ ان حضرات عالی مرتبت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یوں تو ان کی تگ و تاز علمی کا دائرہ برصغیر پاک و ہند کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا ہے، لیکن بالخصوص پنجاب میں ان کے اثر و نفوذ کا یہ حال ہے کہ اس خطے کے اکثر اہل علم بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی خاندان کے خرمن کمال کے خوشہ چیں ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کو اس خانوادۂ فضل و کمال کے رکن رکین کی حیثیت حاصل تھی۔

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے اتحاف النبلاء ص ۲۳۵ تا ۲۳۸۔ مآثر صدیقی ج ۱ ص ۵۳ تا ۷۴۔ التاج المکلل ص ۲۹۳، ۲۹۴۔ جماعت مجاہدین ص ۲۶۱ تا ۲۶۳۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۶۹ تا ۲۷۴۔

آباواجداد:

حافظ بارک اللہ کے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ احمد اور جد امجد کا نام نامی حافظ محمد امین تھا۔ سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے امام محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ خاندانی اعتبار سے علوی تھے اور درمیان کے تمام حضرات اپنے اپنے دور میں قبلہ گاہ تشنگان فیض تھے۔ مخلوق خدا کی اصلاح اور روحانی نفع رسانی ان کا اصل کام تھا۔

قدیم وطن:

حافظ بارک اللہ کے جد نامدار حافظ محمد امین ضلع قصور کے موضع ڈھنگ شاہ کے رہنے والے تھے۔ یہ ان کا قدیم وطن تھا اور عرصے سے یہاں آباد تھے۔ حافظ محمد امین کے دادا کا نام ابوداؤد تھا' جو عوام میں ''ڈھنگ شاہ'' کے عرف سے معروف ہوئے۔ یہ گاؤں ان کی ملکیت تھا اور انہی کے نام سے اس کا نام ڈھنگ شاہ پڑا۔ بعدازاں تغیر و انقلاب کی ایسی بے رحم لہریں اٹھیں کہ اس نواح میں سکھ راج قائم ہو گیا اور یہ علاقہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ابوداؤد کی وفات اسی گاؤں میں ہوئی۔ وہ انتہائی نیک اور پارسا بزرگ تھے اور قرب و جوار کے لوگ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ وفات کے بعد ان کی قبر پر عرس کی محفلیں جمنے لگیں اور کئی قسم کی بدعات کا ارتکاب ہونے لگا۔ ان کے پوتے حافظ محمد امین نے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کی اور اصلاح احوال کے لیے میدان میں نکلے' لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر اپنے آبائی وطن (ڈھنگ شاہ) کی سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

لاہور میں قیام:

حافظ محمد امین کے دو بیٹے تھے۔ ایک حافظ احمد اور دوسرے حافظ نور محمد! دونوں کو ساتھ لیا اور لاہور چلے آئے۔ انھیں تعلیم دلائی اور بہتر طریقے سے ان کی تربیت کا اہتمام کیا۔ بیٹوں کی تکمیل تعلیم تک وہ لاہور میں مقیم رہے۔ یہ عرصہ کئی سال پر محیط ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ پر دو ڈھائی سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے' لیکن بالخصوص لاہور اور اس کے اطراف میں مثلاً اضلاع لاہور' ساہیوال اور قصور کے قصبات و دیہات میں اب بھی اس خاندان کے اہل علم کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان مقامات کے لوگ ان سے تعلق عقیدت و ارادت رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ سات آٹھ نسلوں سے بہ دستور چلا آ رہا ہے۔ ایک تو یہ اس خاندان کی نیکی کا نتیجہ

ہے۔ دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ بات پیوست ہو چکی ہے کہ وہ اسی خاندان کے اکابر کی تبلیغ سے رشد و ہدایت کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔

فیروز پور میں سکونت:

جب حافظ محمد امین کے بیٹے تعلیم سے فارغ ہو گئے تو حافظ صاحب نے لاہور کی سکونت ترک کر کے فیروز پور کا قصد کیا اور وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ فیروز پور اور اس کے اطراف و جوانب میں ان باپ بیٹوں نے اسلام کی خوب اشاعت کی۔ قریہ قریہ گھومے۔ لوگوں کو اتباع سنت کی تلقین کی۔ توحید کا درس دیا اور مسائل دین سے آگاہ اور احکام شرع سے باخبر کیا۔ اس نواح میں ان کی تبلیغی سرگرمیاں بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور کثیر تعداد میں لوگ ان کے اخلاص اور زہد و اتقا کی وجہ سے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ حافظ محمد امین نے فیروز پور میں وفات پائی اور دہلی دروازے کے اندر بڑے بازار میں ''نوگزے'' کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔

فیروز پور سے نقل مکانی:

حافظ محمد امین کی وفات کے بعد دونوں بیٹوں ___ حافظ احمد اور حافظ نور محمد ___ نے فیروز پور کی سکونت ترک کر دی۔ حافظ نور محمد نے تو فیروز پور سے متصل ایک گاؤں ''بارے کے'' میں اقامت اختیار کر لی اور حافظ احمد نے فیروز پور سے بہ جانب مغرب چودہ میل دور موضع ''لکھوکے'' کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا۔ دونوں بھائی علم و فضل اور تقویٰ و صالحیت کے زیور سے آراستہ تھے۔ اپنے اپنے علاقوں میں دونوں دعوت و ارشاد اور اصلاح و تبلیغ میں سرگرم ہوئے' اور بہت جلد لوگوں کا مرکز عقیدت بن گئے۔ ان کی تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں تصوف و سلوک اور معرفت و ادراک کی دنیا میں ''لکھوکے'' کے چھوٹے سے گاؤں نے شہرت دوام حاصل کی۔

حافظ بارک اللہ کی ولادت:

موضع ''لکھوکے'' کے قریب ایک گاؤں ''طور'' تھا۔ وہاں کے رئیس نے اپنی بیٹی حافظ احمد کے عقد میں دے دی تھی' جس کے بطن سے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں حافظ بارک اللہ پیدا ہوئے۔ یہ نہایت پرہیزگار خاتون تھیں۔ اپنے اس بیٹے کو ہمیشہ باوضو ہو کر دودھ پلاتی تھیں۔ حافظ بارک اللہ کے والد حافظ احمد بھی بہت متقی بزرگ تھے اور اپنے عہد اور علاقے کے جید عالم تھے۔ نانا بھی صاحب علم اور صاحب دل تھے' جنھوں نے رئیس اور امیر آدمی ہونے کے باوجود اپنی بیٹی ایک اجنبی شخص کے نکاح میں محض اس کے علم و اتقا کی بنا پر دے دی تھی۔ یعنی حافظ بارک اللہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے صاحب فضل و مجد تھے۔

حصول تعلیم:

حافظ بارک اللہ نے خیر و صالحیت کے ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور تقویٰ و پاکیزگی کی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی، اور بلند بخت باپ حافظ احمد کا سلسلۂ درس و اصلاح قائم تھا، بڑے ہوئے تو والد گرامی سے قرآن مجید حفظ کیا، عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں مہارت حاصل کی۔

شاہ غلام علی کی خدمت میں:

حافظ بارک اللہ کا وہ عہد ہے جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی شوکت حکمرانی دم توڑ رہی تھی اور غلامی کے سائے لحہ بہ لحہ بڑھتے جا رہے تھے، لیکن اس شر میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ اس میں یہاں علم و فضل کی بے پناہ اشاعت و ترویج ہوئی اور تقویٰ وللٰہیت کے وہ مظاہر سامنے آئے جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ جلیل القدر علما پیدا ہوئے اور صوفیا واتقیا کی کثیر جماعت عالم وجود میں آئی۔ ان میں ایک رفیع القدر بزرگ شیخ غلام علی دہلوی تھے۔ شیخ ممدوح ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے قصبہ بٹالہ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۶/ اکتوبر ۱۸۲۴ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ انھیں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی ارادت و خلافت کا شرف حاصل تھا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار اور زہد و عبادت میں یکتائے عصر تھے۔ دہلی میں ان کی خانقاہ اصحاب تصوف اور ارباب علم کا مرجع تھی۔ نہایت متبع سنت اور حامی شریعت تھے۔ ہندوستان اور افغانستان کا تو ذکر ہی کیا کہ یہاں کے کثیر تعداد میں لوگ حصول فیض کے لیے ان کے پاس آتے تھے، ترکی، شام، مصر، بغداد، چین اور حبش کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور خانقاہ میں قیام کو سعادت ابدی سمجھتے تھے [1]۔

حافظ بارک اللہ بھی چونکہ پشت ہا پشت سے خانوادۂ تصوف و سلوک سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے بھی دہلی کے لیے رخت سفر باندھا اور شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے فیض حاصل کیا اور طریقت کی منزلیں طے کیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس زمانے میں دہلی گئے، کتنا عرصہ وہاں رہے اور کب مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دہلی کو اس عہد میں علما و فضلا کے گہوارے اور صوفیا و اتقیا کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اور تشنگان علوم ظاہری و باطنی دہلی کا قصد کرتے تھے کہ وہیں کے چشمہ ہائے فیض سے ان کی تشنگی دور ہوتی تھی۔

حضرت شاہ غلام علی کی بارگاہ کمال سے اس دور کے بہت سے اعاظم رجال نے استفاضہ کیا اور مراتب

[1] آثار الصنادید ص ۲۰۹

بلند پر پہنچے۔ ان حضرات میں شیخ ابوسعید مجددی دہلوی (متوفی یکم شوال ۱۲۵۰ھ/ ۳۱ جنوری ۱۸۳۵ء) ان کے فرزند دلبند شیخ احمد سعید مجددی (متوفی ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ/ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۰ء) حضرت شیخ عبدالغنی مجددی (۶ محرم ۱۲۹۶ھ/ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۸ء) شیخ محمد آفاق دہلوی (متوفی ۷ محرم ۱۲۵۱ھ/ ۵ مئی ۱۸۳۵ء) اور حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی (متوفی ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء) رحمہم اللہ شامل ہیں۔

دہلی میں اس زمانے میں علما کا جمگھٹا تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' شاہ عبدالقادر دہلوی' شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی رحمہم اللہ عنہم موجود تھے اور ان حضرات کے درس و تدریس کے مضبوط حلقے قائم تھے۔ ان کے علاوہ مولانا رشید الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) مولانا محمد اسماعیل شہید (شہادت ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) سید احمد شہید (شہادت ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ/ ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء) مولانا مملوک علی (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۷ / اکتوبر ۱۸۵۱ء) اور بہت سے دیگر علما و مشائخ اس دور میں دہلی میں قیام فرما تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ حافظ بارک اللہ کی ان حضرات میں سے بعض بزرگوں سے صحبتیں رہی ہوں گی اور وہ دہلی کے علما و صوفیا سے مستفید ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ تذکرہ و رجال کی کتابوں میں اس کی وضاحت مذکور نہیں' لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دہلی جا کر صرف حضرت شیخ غلام علی علوی ہی سے استفاضہ نہیں کیا ہوگا' دوسرے اکابر دہلی کی خدمت میں بھی حاضری دی ہوگی۔

کھیتی باڑی:

حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عہد کے ولی کامل اور بہ درجہ غایت عابد و زاہد تھے۔ ہر معاملے میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ مشتبہ اور مشکوک چیزوں کے قریب تک نہ جاتے اور رزق حلال کی تلاش میں رہتے۔ ان کے والد گرامی حافظ احمد کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی کسب معاش میں نہایت محتاط تھے اور کھیتی باڑی کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ حافظ بارک اللہ نے بھی یہی سلسلہ شروع رکھا۔ وہ درس و تدریس کے لیے بھی وقت دیتے' دعوت و ارشاد اور تصوف و سلوک کا فریضہ بھی انجام دیتے' دیہات میں جا کر لوگوں کو اتباع سنت کی تلقین بھی فرماتے۔ اور اس بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنے ہاتھ سے کمائی کر کے روزی حاصل کرتے۔ کسی پر بوجھ بننا یا کسی سے کچھ توقع رکھنا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔ اس کمائی سے اللہ نے ان کو بہت وسعت اور فراخی عطا فرمائی تھی۔

تلامذہ:

حافظ بارک اللہ کے تلامذہ کی تفصیل کا پتا نہیں چلتا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ ضلع فیروز پور اور اس سے دور دراز

علاقے کے لوگوں پر لکھوی خاندان کے اکابر کا گہرا اثر تھا اور وہ ہر مسئلہ شرعی میں ان ہی سے رجوع کرتے تھے‘ اس لیے یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں کہ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی اور وہ اپنے اپنے علاقوں میں مصروف درس وافادہ تھے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ حافظ صاحب ممدوح کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت حافظ محمد لکھوی اور دوسرے مولوی محمد صالح۔ ! دونوں نے باپ سے علم حاصل کیا اور انہی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ مولوی محمد صالح کے حالات نہیں ملتے‘ لیکن حافظ محمد لکھوی کے علم وادراک اور تصنیف وتالیف کی معرکہ آرائیاں سب کے سامنے ہیں۔ حافظ محمد لکھوی‘ حافظ بارک اللہ کو جامع الاصول والفروع قرار دیتے ہیں اور ان کا شمار اپنے عہد کے فقہائے ذی احترام اور علمائے عالی مرتبت میں کرتے ہیں____ حافظ محمد کو حصول علم کا جو بہت زیادہ شوق پیدا ہوا‘ اور برصغیر کے مختلف مراکز علم میں جا کر اس دور کے رفیع المرتبت اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تو اس میں لازماً باپ کی فراوانئ علم کا اثر کارفرما تھا۔

صالحیت وتقویٰ اور حق گوئی کی ایک مثال:

جہاں ان کا علم فضل اور زہد وورع میں بہت اونچا مقام تھا، وہاں وہ کلمہ حق کہنے میں بھی جری تھے۔ اللہ اور رسول کے احکام کی تبلیغ واشاعت میں وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں کوئی مصلحت ان کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا اور مختلف دیہات وقصبات سے آ کر لوگ ان سے استفادہ واستفاضہ کرتے تھے۔ ان کا گاؤں ”لکھوکے“ اس زمانے میں ریاست ممدوٹ کے ماتحت اور اس سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔

حافظ بارک اللہ کی حق گوئی اور غیرت دینی سے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے‘ جو ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۳۰ء میں پیش آیا۔ اس وقت ان کی عمر چوالیس پنتیالیس برس کی تھی۔ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور مندرجہ ذیل ہے: (یہ واقعہ ان سطور کے راقم کو عرصہ ہوا‘ حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی مرحوم نے بھی سنایا تھا)

ایک دن حافظ بارک اللہ مسجد میں طلبا کو درس دے رہے تھے کہ والئ ممدوٹ نواب قطب الدین خاں اپنے چند مصاحبوں اور وزیروں کے ساتھ ملاقات کو آیا ❶۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس نے کنگن پہن رکھے ہیں۔ حافظ صاحب کا خادم علی محمد قریب ہی بیٹھا تھا‘ اس نے عرض کیا۔ ”سونے کے کنگن ہیں ❷۔“ یہ سن کر نواب کے ہاتھ جھٹک دیے اور سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”ہم درویش لوگ ہیں

---

❶ مولا بخش کشتہ مرحوم نے اپنی کتاب ”پنجابی شاعراں وا تذکرہ“ (ص ۱۵۷) میں نواب جمال الدین خاں لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اس زمانے کے نواب ممدوٹ کا نام قطب الدین خاں تھا۔ دیکھیے منظورۃ السعداء ورق ۱۳۴ ب

❷ کشتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ بینائی ختم ہوگئی تھی‘ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ٹٹول کر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ درست نہیں۔ حافظ صاحب اس وقت چوالیس پینتالیس سال کے جوان تھے اور بینائی ٹھیک تھی۔

اور امور دنیا سے منقطع ہو کر مسجد میں بیٹھے ہیں۔ بے دین لوگ یہاں بھی ہمیں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسی چیزیں پہن کر آ گئے ہیں جو مردوں کے لیے شریعت نے حرام ٹھہرائی ہیں۔'' یہ لفظ کہے اور نواب کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے مسجد کے اندر چلے گئے۔

نواب نے اس طرز عمل اور اسلوب کلام کو گستاخی پر محمول کیا اور اس کا پندار حکمرانی مسجد کے ایک درویش کے کلمہ حق کو برداشت نہ کر سکا۔ حکم ہوا ''اس کو فوراً حدود ریاست سے باہر نکال دیا جائے۔'' لوگوں نے نواب کو سمجھانے کی کوشش کی اور جلاوطنی کا یہ سخت حکم واپس لینے پر آمادہ کرنا چاہا' مگر وہ نہ مانا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور حافظ بارک اللہ اہل وعیال اور طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر دریائے ستلج کے کنارے آئے جو قریب ہی بہتا تھا اور کشتی میں سوار ہو کر ریاست بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ حجاز مقدس جانے کا تھا۔

موجودہ جغرافیائی حساب کے مطابق وہ ہیڈ سلیمان کے قریب ''حاصل ساڈو'' کے مقام پر اترے' لیکن ان کی روانگی کے بعد یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ بلا ظاہری اسباب و آثار اور موسم کے' دریائے ستلج میں شدید طغیانی آ گئی' جس سے نواب ممدوٹ کے باغ' محلات اور شاہی قلعے کو سخت نقصان پہنچا۔ نواب اس صورت حال سے انتہائی پریشان ہوا' اور مصاحبوں سے اس ناگہانی آفت کے بارے میں بات کی۔ جواب ملا ''یہ سب حافظ بارک اللہ کو جلاوطن کر دینے کا نتیجہ ہے۔ وہ بہت متقی اور پرہیز گار بزرگ ہیں' انھوں نے ایک صحیح بات کہی تھی' جس سے ناراض ہو کر انھیں ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ اگر انھیں واپس نہ لایا گیا تو مزید طغیانی اور تباہی کا خطرہ ہے۔''

نواب قطب الدین خاں پر یہ سن کر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور اسی وقت اپنے ماموں کی قیادت میں چند گھڑ سواروں کو حافظ صاحب کے پیچھے دوڑایا۔ نواب بہاول پور کے پاس بھی چند معززین کو بھیجا کہ وہ حافظ بارک اللہ کو جو ان کے علاقے میں جا بیٹھے ہیں مہربانی کر کے واپس بھیج دے۔ حافظ صاحب واپس تشریف لائے تو طغیانی رکی اور دریا کا پانی پہلی سطح پر آ گیا۔

نواب نے حافظ صاحب سے معافی مانگی اور ''لکھوکے'' کا گاؤں بہ طور جاگیر ان کو پیش کیا۔ لیکن حافظ صاحب نے یہ کہہ کر گاؤں لینے سے انکار کر دیا کہ ایک تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ہم ایسی زمین نہیں لینا چاہتے' جس کا لگان اور معاملہ و آبیانہ وغیرہ ہم حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوں۔ اس کے بعد نواب نے ان کو وہ زمین واپس کر دی جو ان کے والد حافظ احمد صاحب کے وقت سے انھیں عطا کی گئی تھی اور ان کو ریاست بدر کر دینے کے بعد بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھی۔ اس زمین کا لگان پہلے سے معاف تھا۔ اس لیے اس کو ''معافی کی زمین'' کہا جاتا تھا۔ یہ زمین تقسیم ملک تک حافظ بارک اللہ کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس واقعہ سے پہلے ریاست کا صدر مقام ممدوٹ تھا۔ لیکن اس کے بعد نواب قطب الدین خاں نے جلال آباد کو صدر مقام بنا لیا تھا اور تقسیم ہند تک جلال آباد ہی ریاست کا صدر مقام رہا۔

نیز شاہی محلات کے جو حصے دریا کی طغیانی سے منہدم ہو گئے تھے' آزادیٔ وطن تک اسی حالت میں تھے۔

ایک اور واقعہ:

حافظ بارک اللہ کے موضع حاصل ساڈو میں قیام کے زمانے کا یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے ان کو بتایا کہ اس جنگل میں کسی ایسی بدروح کا اثر ہے جوان مال مویشیوں کو ہلاک کر دیتی ہے جو اس کی حد میں چلے جاتے ہیں' لہٰذا آپ اپنے اونٹ وغیرہ وہاں نہ جانے دیں۔ حافظ صاحب نے جواب دیا' اللہ نگہبان ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے' اس کے سوا نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے' نہ فائدہ۔!

لیکن اس کے چند روز بعد معلوم ہوا کہ ان کا اونٹ اسی جگہ چلا گیا تھا' جس جگہ کے بارے میں لوگوں نے بتایا تھا کہ وہاں کسی بدروح کا اثر اور ٹھکانا ہے' اور وہ اونٹ وہاں جاتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حافظ صاحب وہاں پہنچے اور بعض آیات قرآنی پڑھ کر اونٹ پر پھونکیں تو وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر چاروں طرف پھونک ماری اور فرمایا اب بے شک کوئی جانور اس جنگل میں کہیں گھومے پھرے' اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ اس کے بعد انھیں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں پہنچی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حافظ صاحب وہاں کتنا عرصہ رہے؟ اس کا پتا نہیں چلتا۔

سید جعفر علی سے ملاقات:

یہی وہ مقام ہے' جہاں امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی جماعت کے ایک مجاہد سید جعفر علی نقوی کی' جہاد کے لیے سرحد پار جاتے ہوئے ان سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا ذکر سید جعفر علی نقوی نے اپنی کتاب منظورۃ السعدا میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ودرآن ایام میاں بارک اللہ بزرگے بودند کہ از خان مذکور نا خوشنود شدہ از عمل او بیروں رفتہ بودند' از ایشاں ملاقات نمودم، تلطف بسیار نمودند و مریدانِ شاں محبت بسیار نمودند ❶۔

یعنی ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ ❷ سے ملاقات ہوئی' جو (نواب قطب الدین) خان مذکور سے ناخوش تھے۔ اور ریاست بدر کر دیے گئے تھے۔ وہ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آئے' ان کے مرید بھی

---

❶ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء ورق ۶۳۴ ب۔

❷ کتاب کا جو قلمی نسخہ میرے پیش نگاہ ہے، اس میں ''تبارک اللہ'' مرقوم ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ''منظورۃ السعدا'' کئی مرتبہ نقل ہوئی اور مختلف حضرات نے اس کو نقل کیا۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں بھی پہنچی ساڑھے چھ سو ورق اور تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب نقل در نقل ہوتی رہی' اور اس طرح کسی نقل نویس نے ''بارک اللہ'' کو ''تبارک اللہ'' بنا دیا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے میں الفاظ کی اور بھی متعدد غلطیاں ہیں' بعض مقامات کے نام بھی صحیح نہیں لکھے گئے ہیں۔ قلمی کتابوں میں غلطیاں بہر حال ہوتی ہیں۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔

بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

یہاں چار باتیں لائق تذکرہ ہیں:

۱۔ حافظ بارک اللہ خلاف شرع بات برداشت نہ کرتے تھے اگرچہ اس کا نتیجہ جلاوطنی کی صورت میں نکلتا ہو۔

۲۔ وہ بلند اخلاق، مشفق اور متقی بزرگ تھے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ سید جعفر علی نقوی جیسے عالم و فاضل اور متدین و صالح بزرگ بھی ان سے اثر پذیر ہوئے، انھیں یاد رکھا اور اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا، ورنہ اثنائے راہ میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں، کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ وہی شخص یاد رہتا ہے جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو اور جس کے عمل و فعل نے دل پر کوئی خاص نقش قائم کر دیا ہو۔ سید جعفر علی کی ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۱ء میں ان سے ملاقات ہوئی اور کتاب انھوں نے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں لکھی، یعنی ملاقات سے ستائیس سال بعد! اتنے طویل عرصے کے بعد وہی شخص اس طرح یاد رہتا ہے کہ اس کا باقاعدہ کتاب میں ذکر کیا جائے، جو بہت بڑی شخصیت کا مالک اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہو۔

۳۔ وہ اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالم دین تھے، جن کا ایک خاص حلقہ اثر و ارادت تھا۔

۴۔ ان کے عقیدت مند اور مرید اچھی خاصی تعداد میں تھے، جو ان کے گاؤں "لکھوکے" سے دور دراز علاقوں میں بھی موجود تھے۔ مریدوں کی ذہنی اور روحانی تربیت وہ احسن طریقے سے کرتے تھے، جس کی بنا پر وہ ملنے والوں سے شفقت و تلطف سے پیش آتے تھے۔

انواع بارک اللہ:

حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عصر میں پنجاب کے سربرآوردہ فقہا اور مشاہیر علما و مشائخ میں سے تھے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ پنجابی کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔

"انواع بارک اللہ" ان کی مشہور تصنیف ہے جو پنجابی نظم میں ہے اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ مسائل انھوں نے فقہ حنفی کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ اس کتاب سے صاف پتا چلتا ہے کہ فقہ پر ان کی عمیق اور وسیع نظر تھی۔ یہ کتاب پنجاب میں عرصہ دراز تک متداول و مقبول رہی۔ لوگ اس کا ذکر حوالے کے طور پر کرتے تھے۔

انواع بارک اللہ کا نام "نصاب الفقہ" بھی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں تصنیف کی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اس کے مشمولات و مندرجات فقہ حنفی سے ہم آہنگ ہیں۔ مصنف کی وسعت مطالعہ کا اس سے پتا چلتا ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں، ردالمختار، درالمختار، طحاوی، شامی، فتاویٰ عالم گیری، فتاویٰ مظہری، تفسیر مظہری، ہدایہ، کنز الدقائق وغیرہ تمام ذخیرہ فقہ ان کے سامنے ہے اور مسائل میں جابجا ان کے حوالے درج ہیں۔ تفسیر اور حدیث کی کتابیں بھی ان کے پیش نگاہ ہیں۔

فارسی حواشی:

اس وقت ۱۸۹۱ء کی شائع شدہ ''انواع بارک اللہ'' زیر نظر ہے ❶۔ اس کے حواشی حافظ بارک اللہ کے فرزند رشید حافظ محمد لکھوی نے تحریر کیے ہیں' جو فارسی زبان میں ہیں۔ کتاب کے بعض مقامات پر حافظ محمد نے اپنے والد محترم کی اجازت سے اضافے بھی کیے ہیں اور کچھ حصے حذف بھی کیے ہیں۔

پیش نگاہ نسخہ شیخ الٰہی بخش تاجر کتب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے مطبع وکٹوریہ پریس (لاہور) کا شائع شدہ ہے۔ شیخ الٰہی بخش مذکور نے دو سو روپے ادا کر کے حضرت حافظ محمد لکھوی سے اس کے حقوق طباعت حاصل کیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بڑی فقہی اہمیت حاصل تھی' جس کے حقوق طبع تقریباً ایک سو تیس سال قبل دو سو روپے میں حاصل کیے گئے' جب کہ روپے کی قیمت آج کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ تھی۔

انواع بارک اللہ کے حواشی کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بعد حمد پروردگار وصلوٰۃ وسلام برسید الابرار وآل او واصحابش اطہار' می گوید بندہ گنہگار امیدوار مغفرت وعفو آفریدگار محمد بن مخدومی وافتخاری عمدۃ الاتقیا' زبدۃ الاصفیا' صفوۃ الفقہاء مولوی محمد بارک اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ وعفی عنہ ایں کتابیست معتبر در علم فروع فقہ بروایت ثقات از کتب معتبرات مؤلفہ جناب مولائی ومخدومی ووالدی واستاذی موصوف واکثر ابواب ایں کتاب شعر ایں احقر است بحکم حضور پرنور وبعضے اشعار آنحضرت مرحوم اند کہ در بعضے از انہا بہ اجازت حضور قدرے محو واثبات رفتہ بود۔ پس ایں احقر دریں اوان بتوفیق الٰہی ارادہ انطباع ایں کتاب کردہ بحواشی مزین خواہد نمود' پس ہر کہ ازیں کتاب فائدہ گیرد امید کہ ضعیف را بہ دعائے خیر یاد فرماید' والسلام ❷۔

حمد وثنا کے بعد بندہ گنہگار امیدوار مغفرت محمد بن مولوی محمد بارک اللہ عرض کناں ہے کہ میرے والد مکرم نے جو اتقیا واصفیا اور ممتاز فقہا میں سے ہیں' جن کی ذات گرامی باعث افتخار ہے اور جو میرے مخدوم اور استاذ محترم ہیں' فروع ومسائل فقہ پر مشتمل ایک مستند کتاب تصنیف کی ہے' جس میں تمام مواد فقہی' ثقہ راویوں اور معتبر ترین کتابوں کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر ابواب کے اشعار میرے ہیں جو میں نے حضرت والد مکرم کے حکم سے لکھے ہیں۔ بعض اشعار خود انہی کے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں ان کی اجازت سے حک واضافہ کیا گیا ہے۔ اب کہ میں اس کتاب کو توفیق الٰہی سے طبع کرانے لگا ہوں تو اس کو حواشی سے مزین کرنے کا عزم کیا۔ جو شخص اس کا مطالعہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے وہ مجھ ضعیف کو دعائے خیر میں یاد رکھے۔ والسلام۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عصر کے عالم وفاضل' متقی وپارسا اور نامور

---

❶ مولا بخش کشتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ انواع بارک اللہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں شائع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہوگئی تھی۔ کشتہ مرحوم کی یہ بات صحیح نہیں۔ ''انواع بارک اللہ'' مصنف کی وفات کے چودہ پندرہ برس بعد ان کے بیٹے حافظ محمد لکھوی نے شائع کرائی۔

❷ انواع بارک اللہ ص ۲ حاشیہ نمبر ۱

فقیہ تھے۔ ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی ان کے شاگرد تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ حافظ بارک اللہ کے زمانے میں "لکھوکے" میں دینی مدرسہ قائم تھا' جس میں حافظ صاحب ممدوح طلبا و مریدین کی علمی اور روحانی تربیت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسی مدرسے میں حضرت حافظ محمد لکھوی نے ان کے حضور زانوے تلمذ تہہ کیا اور بعض کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم تو لازماً انہی سے حاصل کی۔ فقہ کا جو گہرا ذوق ان میں پیدا ہوا' وہ انہی کے فیض تلمذ و شرف صحبت کا نتیجہ ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انواع بارک اللہ کی تصنیف کے زمانے میں حافظ محمد لکھوی کے فقہی افکار میں تبدیلی آ چکی تھی اور وہ مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہو گئے تھے۔

انواع بارک اللہ کے آخری صفحے کے حاشیے کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اس کی کتابت میاں شاہ محمد سوار (سکنہ کیلیاں والا ضلع گوجرانوالہ) نے اور تصحیح کتابت (پروف خوانی) بادشاہی مسجد لاہور کے امام مولوی یار محمد نے کی۔ حاشیے کے الفاظ یہ ہیں:

ہزاراں ہزار شکر و حمد مر منعم حقیقی را کہ امور حسنہ بتوفیق او بہ اتمام بر رسید و کارہائے دشوار بتدبیر او آسان می شوذ و درود نا محدود ہادی راہ قدیم و بانی شرائع شرع مستقیم را کہ امت او بہ شفاعت او بہ اعلی علیین می رسذ و طفیل او از مخارف و مہابت دارین می رہذ' و علی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین الی یوم الدین۔۔ اما بعد مشتاقان علوم دینیہ و مفتیان حنفیہ را مژدہ باد کہ دریں زمان سعادت اقران کتابے عجیب العجائب و تحفہ غریب الغرائب بزبان پنجابی درفقہ حنفی مسمی بہ نصاب الفقہ معروف بہ انواع مولوی محمد بارک اللہ مرحوم باصلاح و تصحیح مکررہ و محشی نادرہ تتمہ وافرہ از کتب معتبرہ بعرق ریزی و جاں فشانی حافظ محمد بن بارک اللہ بہ تصحیح مولوی محمد یار صاحب لاہوری امام مسجد بادشاہی عفی عنہ بہ کتابت و سعی میاں محمد شاہ سوار سکنہ موضع حضرت کیلیاں والا بہ اختتام رسیذ و روشن باد کہ دفتر عبادات از کتاب الطہارۃ و کتاب الصیام منقول از فتاویٰ عالم گیری است الا نادراً از دیگر کتب معتبرہ اتفاق افتاذ پس نقل کتاب درانجا مسطور گشت' و در کتاب البج تا آخر معاملات از درالمختار و ردالمختار و طحاوی و کنزالدقائق و بعض شروح آں منقول گشت الا نادراً کہ از عالم گیری یا شرح وقایہ نوشتہ شدہ' و نام منقول عنہ درانجا مسطور گشتہ۔ التماس: امید از ناظرین آں کہ اگر برخطائے اطلاع یابند بہ قلم اصلاح پیرایند و از عیب جوئی و نکتہ گیری احتراز نمایند' و بہ دعائے خیر ایں عاجز رایاد فرمایند۔ جزاہم اللہ تعالیٰ فی الدارین خیراً' ان الاصلاح الا ما استطعت و ما توفیقی الا باللہ وعلیہ توکلت و الیہ انیب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب' تمام شد۔ مصنف ھذا الکتب۔ مولوی محمد سلمہ اللہ ربہ [1]۔

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور تعریف ہے کہ جس کی توفیق سے نیک کام اور مشکل امور آسان ہو جاتے ہیں' اور رسول اللہ ﷺ پر لاتعداد درود ہو۔! اس کے بعد گزارش ہے کہ علوم دینیہ کے شائقین اور حنفی

[1] انواع بارک اللہ ص ۴۱۹۔ حاشیہ

مسلک کے مفتیوں کے لیے خوش خبری ہو کہ ان کی خدمت میں نہایت عمدہ اور نادر کتاب پنجابی زبان میں جو فقہ حنفی سے متعلق ہے نصاب الفقہ معروف بہ انواع مولوی محمد بارک اللہ اصلاح وتصحیح اور تحشیہ کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ حافظ محمد بن بارک اللہ نے نہایت عرق ریزی اور جاں فشانی سے کتب معتبرہ کی مدد سے اس کے حواشی تحریر کیے۔ کتابت کی تصحیح بادشاہی مسجد لاہور کے امام مولوی یار محمد نے کی۔ موضع حضرت کیلیاں والا کے میاں شاہ محمد سوار نے اس کی کتابت کی۔ دفتر عبادات کے مسائل جو کتاب الطہارۃ اور کتاب الصیام پر مشتمل ہیں' فتاویٰ عالم گیری سے منقول ہیں۔ البتہ ان مسائل کا کچھ حصہ دوسری معتبر کتابوں سے بھی لیا گیا ہے' جن کے نام وہاں لکھ دیے گئے ہیں۔ کتاب الحج اور آخر معاملات تک کے مسائل درالمختار' ردالمختار' طحاوی' کنز الدقایق اور ان کی بعض شروح سے ماخوذ ہیں' لیکن کچھ حصہ فتاویٰ عالم گیری یا شرح وقایہ سے اخذ کیا گیا ہے' جن کے نام وہاں مسطور ہیں۔ ناظرین کتاب سے التماس ہے کہ اگر وہ کسی غلطی سے مطلع ہوں تو قلم سے اصلاح کر دیں' عیب جوئی اور نکتہ چینی سے احتراز فرمائیں اور مجھ عاجز کو دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

انواع بارک اللہ کا پیش نگاہ نسخہ ۴۲۴ صفحات پر مشتمل اور ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے۔

حواشی کا اردو ترجمہ:

انواع بارک اللہ کے ان فارسی حواشی کا اردو ترجمہ مولانا محمد عبدالحق موضع لکھن' ہری پور (ہزارہ) نے کیا۔ ترجمہ اچھا ہے۔ زبان اور اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد عبدالحق ممدوح فقہیات پر عبور رکھتے ہیں۔

حواشی کے اردو ترجمے والی ''انواع بارک اللہ'' شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے مطبع اسلامیہ لاہور سے شائع کی۔ صفحات ۴۲۴ ہیں۔ کتاب کے آخر میں ناشر نے لکھا ہے کہ ترجمہ انھوں نے خود کرایا ہے اور اس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی ہے۔ ترجمے کے پیش نگاہ نسخے کا سال طباعت ۱۳۴۵ھ ہے۔

حواشی کے مترجم نے آخر کتاب میں ''گزارش مترجم'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بخدمت جمیع ناظرین واضح ہو کہ مصنف رحمہ اللہ نے حاشیہ بزبان فارسی اضافہ کر کے اپنی کتاب کو مزین کیا تھا' جس سے سوائے قابل اشخاص کے عوام اردو دان حضرات کو فائدے سے محرومی تھی۔ اس کی ضرورت کو شیخ الٰہی بخش ومحمد جلال الدین تاجران کتب لاہور' کشمیری بازار نے محسوس کر کے عاجز احقر کو یہ کام بہ طریق عجالہ سپرد کیا' جسے اپنی کم بضاعتی کے باوجود حتی الامکان بامحاورہ ترجمہ وصحیح ادائے مطلب کی سعی کر کے اللہ تعالیٰ کی توفیق رفیق سے ختم کو پہنچایا۔ اس میں اگر کوئی صاحب کسی قسم کی لغزش پائیں تو اصلاح فرما کر دامن کرم وعفو سے ظل مرحمت ڈالتے ہوئے حقیر مترجم محمد عبدالحق بن مولوی محمد الیاس مرحوم موضع لکھن ہری پور ہزاروی اور اس کے

والدین کو دعائے خیر سے یاد فرما کر عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں❶۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ”انواع بارک اللہ“ کے مصنف اس زمانے میں حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلک اہل حدیث اختیار فرما لیا تھا۔ اسی زمانے میں ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی نے ”انواع محمدی“ لکھی۔ جس کے مسائل قرآن و حدیث کے مطابق ہیں۔

تاریخ ممدوٹ میں تذکرہ:

حافظ بارک اللہ لکھوی، ان کے فرزند گرامی حافظ محمد اور ان کے گاؤں لکھوکے کا تذکرہ ”تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ“ میں بھی ہے اور لکھا ہے۔ ”یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں، اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ دیہ ہذا (لکھوکے) میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب (حافظ محمد بارک اللہ) کے باعث چرچا علم بہے (بہت) اچھا رہتا ہے۔ بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علم عربی بھی تحصیل کرتے ہیں اور ان کو سرکار (ممدوٹ) کی طرف سے دو چاہ معافی ملے ہوئے ہیں۔ گاؤں کچا ہے، مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کمبوہ ارائیں ساکن فیروز پور تھانیدار ضلع نے تعمیر کرائی ہے❷۔

وفات:

حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی نے ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں انتقال کیا اور اپنے گاؤں لکھوکے (ضلع فیروز پور، مشرقی پنجاب) میں مدفون ہوئے۔ انھوں نے ایک سو دس برس عمر پائی اور اپنی حیات مستعار میں بے شمار علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

اولاد و احفاد:

حافظ بارک اللہ کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے۔ حافظ محمد لکھوی، حکیم محمد شریف، مولوی محمد سلیم اور مولوی محمد صالح، ان میں سے حافظ محمد لکھوی ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۸ء) کو پیدا ہوئے۔ وہ بہت بڑے عالم و فاضل اور مصنف تھے، خطہ پنجاب میں انھوں نے بے پناہ دینی و تصنیفی خدمات انجام دیں۔ مفسر قرآن، ممتاز محدث اور نامور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۱۳ر صفر ۱۳۱۱ء (۲۷ر اگست ۱۸۹۳ء) کو بمقام لکھوکے وفات پائی❸۔

---

❶ انواع بارک اللہ، حاشیہ اردو ص ۴۱۹

❷ تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ ص ۸

❸ حضرت حافظ بارک اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مضمون ”حافظ محمد لکھوی“ روزنامہ ”امروز“ (لاہور) ۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء و ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ”احوال الآخرت“ (مطبوعہ زیر اہتمام مولانا معین الدین لکھوی اوکاڑہ) آخر میں مولانا محمد دوح کا مضمون۔ پنجابی ادب دی کہانی۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ۔

حضرت حافظ محمد لکھوی کی نرینہ اولاد چھ بیٹے تھے، ان میں سے ایک بیٹے حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی تھے۔ جو حضرت عبداللہ غزنوی کے مرید اور نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ اپنے عہد کے شیخ اور جلیل القدر عالم تھے۔ حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے۔ اپنے والد مکرم کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ۱۳۱۲ھ میں مدینہ منورہ میں بحالت سجدہ وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

پنجاب کے اس رفیع المرتبت خاندان کے علمائے کرام نے بے پناہ علمی و تصنیفی اور تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دیں جس کا سلسلہ تقریباً دو سو سال قبل ہندوستان میں شروع ہوا' اور اب پاکستان کے مختلف مقامات میں جاری ہے۔ دینی مدارس میں بھی اور سکول و کالج اور یونیورسٹی میں بھی۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے بزرگ علوم و فنون کے مختلف گوشوں میں قبلہ گاہ علماء و طلباء تھے' اور ہیں۔

۳۸۔ مولانا باقر مدراسی

سرزمین مدراس کے علمائے مشاہیر میں مولانا باقر بن مرتضی مدراسی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ مسلکاً شافعی تھے اور اپنے عصر کے شیخ ' فاضل اور علامہ تھے۔ خاندان نوائط سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء کو ویلور میں پیدا ہوئے جو اعمال مدراس میں واقع ہے۔ ذہین و فطین اور سریع الادراک تھے۔ ابتدائی کتابیں اپنے عم محترم سید ابوالحسن ویلوری سے پڑھیں۔ پھر ترچنا پلی کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں ایک عالم دین شیخ ولی اللہ کا حلقہ درس جاری تھا' اس میں شامل ہو گئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد اخذ علم کا باقاعدہ سلسلہ ترک کر دیا اور مطالعہ کتب میں مشغول ہو گئے۔

مولانا باقر مدراسی تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم اور فقیہ تھے۔ تفسیر' حدیث، علم کلام' فقہ' اصول فقہ اور دیگر علوم میں ماہرانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ بیس سال سے بھی کم عمر میں فتویٰ نویسی اور تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ عالم جوانی ہی میں وہ ان تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے' جو ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے عالم دین میں پائی جاتی ہیں۔ کثیر المطالعہ اور انتہائی زیرک تھے۔ قوت ادراک اور فہم و فراست میں اس دور کا کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بیس سال سے بھی کم عمر میں اہل علم کی بڑی بڑی مجالس میں جانے اور اصحاب فکر کی محافل میں شریک ہونے لگے تھے۔ بے جھجک ہو کر بات کرنا اور مناظروں اور مباحثوں میں حصہ لینا ان کا شیوہ تھا۔ دلائل کے اعتبار سے ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی اور اس طرح اعتماد کے ساتھ بات کرتے کہ بڑے بڑے عالم ان کا سامنا نہ کر پاتے۔ ان کے طریق استدلال' نہج کلام اور کثرت مطالعہ سے لوگ متحیر اور متعجب ہوتے۔

بیس سال کے ہوئے تو ان کی شہرت قابلیت حکمرانوں کے ایوانوں میں جا پہنچی' اور مدراس کے امیر

نواب محمد علی خاں نے ان کو اپنے دربار میں تحریر وانشا پر مامور کیا۔ دوسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ عرصے تک یہ ذمے داری ان کے سپرد رہی۔ پھر نواب مذکور نے ان کو اپنے بچوں کا معلم اور اتالیق بنا دیا۔ اب ان کے جوہر نکھرے اور نواب پر ان کی گوناگوں صلاحیتوں کا راز کھلا۔ چند ہی روز بعد انھیں جاگیریں عطا کیں جن کی چار ہزار دوسو روپے سالانہ آمدنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اپنے خاص ندیموں اور مشیروں میں شریک کرلیا۔

مولانا باقر مدراسی برصغیر کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے نواحی مدراس میں علوم دینیہ کو عربی سے اردو میں منتقل کیا۔ ان سے قبل اس نواح میں کسی نے یہ اہم کام نہیں کیا تھا۔ ان کو علم کلام' عقائد' لغت اور صرف ونحو میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ علم فقہ اور اصول فقہ مستحضر تھے۔ معرفت تفسیر وحدیث میں یگانہ تھے۔ باقی علوم مروجہ سے کامل آگاہی حاصل تھی۔ منقول ومعقول میں اس طرح تطابق پیدا کرتے کہ لوگ ان کی فضیلت علم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ انھوں نے عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کتابیں لکھیں اور ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کی عربی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ تنویر البصر والبصیر فی الصلوۃ علی النبی البشیر والنذیر۔
۲۔ نفائس النکات فی ارساله علیه السلام الی جمیع المکونات۔
۳۔ القول المبین فی ذراری المشرکین۔
۴۔ الدرالنفیس فی شرح قول محمد بن ادریس۔
۵۔ النفحة العنبریه فی مدح خیر البریه۔
۶۔ العشرة الکامله۔ یہ عربی کے دس قصیدے ہیں جو سبعہ معلقہ کے انداز پر ہیں۔
۷۔ مقامات: یہ کتاب مقامات حریری کے اسلوب پر ہے۔
۸۔ الشمامة الکافوریه فی وصف المعاهدالویلوریه۔
۹۔ الخطفة العقابیه للفارة المسکینه۔
۱۰۔ المقامة الترشنافیه-----۔ المقامة الارکاتیه۔
۱۱۔ المقامة الحیدآبادیه۔
۱۲۔ شمائم الشمائل فی نظام الرسائل۔
۱۳۔ ان عربی کتابوں کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی مدح میں ایک دیوان شعری ہے۔
۱۴۔ غزل اور مختلف اصناف شعر میں ایک اور دیوان بھی ہے۔

فارسی زبان میں ان کی کتابیں یہ ہیں۔

۱۵۔ چہار صد ایراد بر کلام آزاد: یہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے کلام پر چار سو اعتراضات ہیں۔

۱۶۔ السعادة السرمديه فی وجوب المحبة المحمديه۔

۱۷۔ كشف الغطاء عن اشراط يوم الجزاء۔

۱۸۔ شرح دیباچہ مثنوی معنوی۔

۱۹۔ شرح غزل اول دیوان حافظ۔

۲۰۔ مثنوی معنوی کے دوابیات کی شرح جو دو رسالوں پر مشتمل ہے۔

۲۱۔ بیان دل نہاد۔

۲۲۔ اتحاف السالك فی شرح كلما خطر ببالك۔

۲۳۔ ايقاظ الغافلين۔

۲۴۔ ارشاد الجاهلين۔

۲۵۔ نغمہ بیدل نواز۔

۲۶۔ سحر الحلال فی ذكر الهلال۔

۲۷۔ جلاء البصائر فی نقض دلائل المناظر۔

۲۸۔ الاعلان بالا ذان عند تغول الغيلان۔

۲۹۔ الاستعاذة بالله الواحد القها رعند سماع نهق الحمار۔

۳۰۔ تبيين الانصاف و توهين الاعتساف فيما ثبت من اخبار الشيعة من الاختلاف۔

۳۱۔ رد الكذب على الكاذب المنكر۔

۳۲۔ كمال العدل والا نصاف الدال على العدول عن الاعتساف۔

۳۳۔ النقول البديعه فی اقسام الشيعه۔

۳۴۔ دلائل الاثنى عشريه فی رد بعض هفوات الاماميه۔

۳۵۔ الحجة المنيع في الزام الشيعه۔

۳۶۔ الرباعيات البديعه فی مناقب الشيعه۔

۳۷۔ شرح حديث انتم اعلم۔

۳۸۔ عين الانصاف۔

۳۹۔ كمال الانصاف۔

۴۰۔ معذرت نامۂ شیعہ کے بارے میں بعض رسائل۔

۴۱۔ فارسی دیوان جو بہت سے اشعار پر مشتمل ہے۔

اردو کتابیں یہ ہیں:

۴۲: ہشت بہشت

۴۳: ریاض الجنان

۴۴: تحفۃ الحباب فی مناقب الاصحاب۔

۴۵: فرائد۔

۴۶: محبوب القلوب۔

۴۷: تحفۃ النساء۔

۴۸: روضۃ السلام۔

۴۹: گلزار عشق۔

۵۰: افسانہ رضوان شاہ۔

۵۱: افسانہ روح افزا۔

۵۲: صبح نوبہار عشق۔

۵۳: ندرت عشق۔

۵۴: عرفات عشق

۵۵: حیرت عشق۔

۵۶: حسرت عشق۔

۵۷: روپ سنگار۔

۵۸: اردو دیوان شعری۔

بہرحال مولانا باقر مدراسی نے عربی' فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور نظم ونثر میں خوب کام کیا۔

خطہ مدراس کے اس عالم اجل اور فقیہ نام دار نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ/ ۷۔ مارچ ۱۸۰۶ء کو انتقال کیا۔ کل باسٹھ سال عمر پائی❶۔

۳۹۔ مولانا برہان الدین دیوی

مولانا برہان الدین بن سرفراز علی اعظمی دیوی' تیرھویں صدی ہجری میں برصغیر کے معروف محدث وفقیہ تھے۔ مفتی عبدالسلام دیوی کی نسل سے تھے۔ یوپی کے موضع دیوہ میں جن علما وصلحائے اسلام کی نشر واشاعت میں

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹۱ تا ۹۲ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

بھر پور حصہ لیا ان میں مولانا برہان الدین کو تذکرہ نویسوں نے بہت اہمیت دی ہے۔ دیوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے چچا مولانا ذوالفقار علی دیوی سے حصول علم کیا جو فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ بعدازاں ان کی معیت میں رائے بریلی گئے اور طویل عرصے تک سید محمد عدل نقشبندی کے زاویے میں مقیم رہے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور تذکیر و موعظت میں مشغول ہوئے۔ تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ ہزاروں لوگوں کو بدعات و محدثات سے روکا اور تقویٰ و تدین کی راہ پر لگایا۔

مولانا برہان الدین دیوی نے جو کتابیں تصنیف کیں' ان سے پتا چلتا ہے کہ مسائل فقہی پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ اپنے دور کے ممتاز و کبار علما میں سے تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- محاکمہ: اس رسالے کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ/ ۲۱۔ ستمبر ۱۸۲۴ء کو سہ شنبہ کے روز علمائے دہلی کے درمیان بعض مختلف فیہ مسائل سے متعلق مباحثہ ہوا۔ ایک فریق کے سرگروہ حامی سنت مولانا رشید الدین خان دہلوی تھے اور دوسرے کے قائد ماحی بدعت مولانا عبدالحی بڑھانوی۔ جب مباحثہ ختم ہوا تو دونوں کی تحریر و تقریر مولانا برہان الدین دہلوی کے سامنے آئی۔ انھوں نے اس پر بطور محاکمہ ایک رسالہ لکھا' جو "محاکمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

۲- تحقیق الاوزان: یہ کتاب زکوۃ اور صدقہ کے اوزان کے بارے میں ہے۔ ۱۲۴۷ھ میں تصنیف کی۔

۳- احکام عید الفطر: اس میں عید الفطر کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب احمد آباد نارہ کے بعض علما و صلحا کی درخواست پر ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں تحریر فرمائی۔

۴- احکام عید الاضحیٰ: عید الاضحیٰ کے احکام و مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی صلحائے احمد آباد کی درخواست پر ۱۲۵۰ھ میں لکھی گئی۔

۵- احکام النکاح: یہ رسالہ نکاح کے مسائل و احکام پر محیط ہے۔

۶- تحقیق الاشارۃ بالسبابۃ فی الصلوۃ: تشہد میں رفع سبابۃ کے بارے میں ہے۔

۷- تحقیق النذور والذبائح: نذر و نیاز اور ذبیحہ کے متعلق۔

۸- تحقیق ربا: سودی لین دین کے بارے میں۔

۹- مواریث: احکام وراثت وغیرہ کے ذکر میں۔

۱۰- کفارہ میت: میت کے کفارہ سے متعلق ہے۔

۱۱- شرح وقایہ کے مبحث طہر متخلل پر حاشیہ۔

۱۲- حاشیہ شرح تہذیب: یہ حاشیہ رائے بریلی کے سید محمد عدل کے بعض اقربا کے لیے تحریر کیا۔

مولانا برہان الدین دیوی اپنے دور کے نامور اور پارسا علما میں سے تھے (1)۔

---

(1) نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹۷'۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۳۱'۳۲

۴۰- قاضی بشیر الدین قنوجی

علمائے قنوج میں سے جو حضرات برصغیر کے آسمان علم وعرفان پر نمایاں ہو کر ابھرے' ان میں قاضی بشیر الدین عثمانی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ والد کا نام نامی کریم الدین عثمانی تھا' جو اپنے عصر کے عالم مانے جاتے تھے۔

قاضی بشیر الدین قنوجی ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء میں قنوج میں پیدا ہوئے اور رائے بریلی میں نشوونما پائی۔ قرآن حکیم بریلی کی جامع مسجد کے امام حافظ احمد علی سے پڑھا۔ صرف ونحو اور منطق کی چند ابتدائی کتابوں کے لیے مولانا تفضل حسین بریلوی کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا۔ عروض' بیان وبدیع' حساب وفرائض اور فقہ کے بعض رسائل کی تکمیل اپنے والد سے کی۔ کچھ کتابیں جن میں میر زاہد' بحرالعلوم کی شرح سلم' شرح حمد اللہ' نیز تشریح الافلاک اور تحریر اقلیدس وغیرہ شامل ہیں' مولانا محمد حسن بریلوی کے حلقۂ درس میں مکمل کیں۔ شرح تہذیب اور شرح چغمینی کی تکمیل مولانا محمد علی سے کی۔ مختصر المعانی' توضیح' تلویح' ہدایہ' تفسیر بیضاوی کی تحصیل کے لیے شیخ اللہ داد رام پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مطول' مقامات حریری' سبعہ معلقہ' متنبی' حماسہ' مولانا اوحد الدین بلگرامی سے پڑھیں۔ باقی کتب درسیہ کی تکمیل مولانا قدرت اللہ لکھنوی سے کی۔ حدیث مولانا رحیم الدین بخاری کے درس میں پڑھی جو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا تہور علی حسینی نگینوی سے بھی حصول علم کیا' جنھیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

اس طرح قاضی بشیر الدین قنوجی نے اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے تحصیل علم کی اور بائیس سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فارغ ہو گئے۔ پھر درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور اس میدان میں کامیاب رہے۔ عرصے تک ٹونک میں مسند درس بچھائے رکھی۔ مراد آباد' دہلی' علی گڑھ اور کان پور میں بھی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ جن حضرات نے ان سے علم حاصل کیا' ان کا شمار برصغیر کے جلیل القدر علما میں ہوتا ہے۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی' سید امیر علی ملیح آبادی' سید امیر حسن سہسوانی' مولانا وحید الزمان لکھنوی' مولانا علیم الدین شاہ جہان پوری اور سید امداد علی اکبر آبادی ایسے اکابر رجال ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

قاضی صاحب ممدوح کی یہ خوش بختی ہے کہ ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں وہ علمائے عظام شامل ہیں جو آگے چل کر حدیث رسول اللہ ﷺ کے شارح' مفسر قرآن' محدث' فقیہ' مصنف ومترجم اور مدرس ومعلم ہوئے اور اس کے نتیجے میں اللہ نے چار دانگ عالم میں ان کو شہرت وناموری عطا فرمائی۔ آج ان کے زر

کارناموں پر برصغیر کے اہل علم کو بجا طور پر فخر ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں قاضی صاحب کو ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ قرآن' حدیث' فقہ اور دیگر علوم پر چونکہ عبور حاصل تھا' لہٰذا بھوپال میں انھیں قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا اور انھوں نے حسن وخوبی سے اس منصب جلیلہ کے تقاضوں کو پورا کیا۔

قاضی بشیر الدین قنوجی متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱- کشف المبهم ما فی المسلم: یہ کتاب مسلم الثبوت کی شرح ہے۔

۲- حل ابیات مطول: اس میں بیان و بدیع کی مشہور درسی کتاب مطول کے اشعار کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔

۳- حاشیہ میر زاہد شرح المواقف۔

۴- موطا امام مالک کے بعض اہم حصوں کی شرح۔

۵- تخریج احادیث شرح العقائد-

۶- صرف ونحو کی بعض درسی کتابوں کے مشکل مقامات کا حل۔

۷- تفهیم المسائل-

۸ صواعق الالهیه-

۹- غاية الكلام فی ابطال عمل المولدو القیام-

۱۰- احسن المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال-

۱۱- بصارة العینین فی منع تقبیل الا بها مین-

ان کتابوں کے علاوہ مختلف مسائل سے متعلق بعض اور کتابیں اور رسالے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

برصغیر کے اس عالم نے ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۹ء میں باسٹھ سال عمر پا کر بھوپال میں رحلت کی [1]۔

قاضی بشیر الدین قنوجی کا یہ وہ تذکرہ ہے جو سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے اپنی عربی تصنیف نزہۃ الخواطر میں کیا ہے اور حوالہ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی کی کتاب ''تذکرۃ النبلاء'' کا دیا ہے۔ مولانا ڈیانوی برصغیر پاک و ہند کے ممتاز عالم دین کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ قاضی صاحب ممدوح کے شاگرد اور ابوداؤد کی شرح عون المعبود کے مصنف شہیر ہیں۔ تذکرۃ النبلاء ان کی قلمی کتاب ہے' جس کا ایک نسخہ نزہۃ الخواطر کے فاضل

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۰۰' ۱۰۱ بحوالہ تذکرۃ النبلاء

مصنف کے پاس موجود تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب وہ نسخہ ان کے فرزند گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کتاب خانے (رائے بریلی) میں محفوظ ہے۔ رجال کے سلسلے کی یہ معتبر ترین کتاب ہے۔ نزہتہ الخواطر کی بعض جلدوں کے متعدد مقامات میں اس کے حوالے دیے گئے ہیں۔

''تراجم علمائے حدیث ہند'' میں مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے بھی قاضی بشیر الدین قنوجی کا ترجمہ تحریر کیا ہے' جس کے بعض حصے نزہتہ الخواطر سے بہت مختلف ہیں۔ انھوں نے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ لکھتے ہیں:

''قاضی بشیر الدین محدث قنوجی کے والد کا نام مولوی نور الدین ہے ❶۔ سن ولادت ۱۲۳۴ھ مگر سن ارتحال ۱۲۷۳ھ ہے ❷۔ دو سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے ❸۔ والدہ ہی نے پرورش کی۔ ان ہی نے بغدادی قاعدہ شروع کرایا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو مرحومہ نے اپنے والد کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق کے سپرد کر دیا' جنھوں نے مروجات فارسی پڑھائیں اور میزان الصرف (خود قلم بند کر کے) پڑھائی۔ گھر میں ناداری کا تغلب تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ والدہ سے اجازت لے کر دہلی کا قصد فرمایا۔ نوعمری' پیادہ پا مسافت' علی گڑھ پہنچے تھے کہ پیروں میں ورم آ گیا اور ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ علی گڑھ میں ایک درویش محمد شاہ رہتے تھے۔ انھوں نے دیکھ کر نام دریافت کیا' والد کا نام پوچھا اور سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا' تمھارے والد مولوی نور الدین ❹ تو میرے پیر بھائی تھے۔ میرے ساتھ مکان پر چلو۔ اس کے دو ایک روز بعد شاہ عبدالجلیل شہید (۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) کے سپرد کر دیا۔ اس وقت شاہ صاحب کا درس جامع مسجد میں ہوتا تھا اور مسجد کی امامت بھی انہی کو تفویض تھی۔ یہاں شرح جامی اور قطبی پڑھ کر شاہ صاحب کی اجازت سے دہلی کا عزم کیا۔ دہلی پہنچ کر حکیم نیاز احمد سہسوانی مرحوم سے (جو مولانا محمد بشیر سہسوانی کے حقیقی چچا تھے) اتفاق سے کالی مسجد میں ملاقات ہو گئی۔ حکیم صاحب کا ذاتی دواخانہ دہلی میں تھا۔ انھوں نے آپ کو دس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور اپنے صاحب زادے کے ساتھ کتب

---

❶ صاحب نزہتہ الخواطر نے جیسا کہ پہلے گزر چکا' قاضی بشیر الدین کے والد کا نام کریم الدین لکھا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے فرزند گرامی نواب علی حسن خاں نے بھی کریم الدین تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مآثر صدیقی جلد ۲ ص ۱۰۔

❷ ان کا سن ارتحال ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء نہیں ہے یا تو یہ کتابت کی غلطی ہے یا مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی سے سہو ہو گیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی وفات ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۹ء میں ہوئی' جیسا کہ ان کے عالی مرتبت تلمیذ مولانا شمس الحق ڈیانوی نے تذکرۃ النبلا میں رقم فرمایا ہے۔

❸ اس کے برعکس صاحب نزہتہ الخواطر' تذکرۃ النبلا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قاضی بشیر الدین قنوجی نے عروض و بیان و بدیع' حساب و فرائض اور فقہ کی بعض کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں' ہمارے نزدیک صاحب نزہتہ الخواطر کا بیان ہی صحیح ہے۔

❹ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا' والد کا نام نور الدین نہیں' کریم الدین ہے۔

معقول اور ادب و معانی میں ہم سبق کر دیا۔ قاضی صاحب اس تنخواہ میں سے صرف دو روپے ماہانہ پر اپنی بسر اوقات فرماتے اور بقیہ آٹھ روپے اپنی والدہ ماجدہ کو قنوج بھیج دیتے۔ جب علم و ادب وغیرہ کی تمام کتابیں ختم ہو گئیں اور حکیم صاحب نے آئندہ کا ارادہ دریافت کیا تو آپ نے علم حدیث کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ اس پر حکیم صاحب ہی نے مشکوۃ ' ابن ماجہ ' ترمذی ' نسائی اور موطا امام مالک خود پڑھا کر حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں سفارشی خط لکھ کر بھیجا۔ جس وقت قاضی صاحب خط لے کر حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب صحیح مسلم پڑھا رہے تھے۔ سبق ختم ہونے کے بعد رقعہ پیش کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا' صحیح مسلم تو ہو ہی رہی ہے' اس میں شامل ہو جاؤ۔ اس کے بعد صحیح بخاری میں سید نذیر حسین کے ہم سبق ہو کر سند و اجازہ سے ممتاز ہوئے۔

''تکمیل کے بعد حکیم صاحب کے پوتے حکیم بدر الحسن کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ اس دوران میں اپنی والدہ کو بھی قنوج سے دہلی بلا لیا' جن کا دہلی میں انتقال ہوا۔

''کچھ مدت بعد آگرہ تشریف لے گئے۔ پھر مولوی ڈپٹی امداد علی کے کہنے سے پچاس روپے ماہوار پر ان کے مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے مراد آباد چلے گئے۔ مراد آباد میں اس زمانے میں منشی اندرمن کا بہت شہرہ تھا جو آریہ اپدیشک (مبلغ) تھے اور تحریر و تقریر میں اسلامی احکام اور مسلمانوں کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ قاضی بشیر الدین قنوجی نے ان سے مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن آریہ مبلغ تاب مقابلہ نہ لا سکا۔ کچھ مدت بعد قاضی صاحب ممدوح مراد آباد سے پھر آگرہ چلے گئے۔''

اس سے آگے مولانا امام خاں نوشہری لکھتے ہیں:

''(غالباً) بزمانہ نواب والا جاہ صدیق حسن خاں بھوپال میں ورود ہوا' اور قاضی مقرر ہوئے [1]۔''

مولانا امام خاں نوشہروی کا یہ کہنا قرین صحت نہیں کہ مولانا بشیر الدین کا '' سن ارتحال ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء ہے۔''

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کا سن ارتحال ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ غالباً نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں '' قاضی قنوج مقرر ہوئے۔''

۱۲۷۳ھ میں تو خود نواب صاحب حصول ملازمت کے لیے سرگرداں تھے۔ ان کو وہ کیونکر قاضی بنا سکتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں ان کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال آنے اور منصب قضا پر فائز ہونے کی دعوت دی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۳۲۹ تا ۳۳۱۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مصنف '' تراجم علمائے حدیث ہند'' نے قاضی بشیر الدین قنوجی کے حالات میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا اور یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ حالات کہاں سے لیے ہیں۔

بہر حال قاضی بشیر الدین قنوجی اپنے دور کے بلند پایہ عالم، متکلم اور اصولی تھے۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں نواب وحید الزمان نے ان سے تفسیر وحدیث کا درس لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) تک بہ قید حیات تھے۔

قاضی صاحب ممدوح سنت رسول اللہ ﷺ کے شیدائی اور بدعت کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ یہ جو رواج ہو گیا ہے کہ حفاظ جب تراویح میں قرآن مجید ختم کرتے ہیں تو قل ھو اللہ احد تین مرتبہ پڑھتے ہیں، قرآن وحدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس لیے قاضی صاحب ممدوح ایسے موقعے پر حفاظ سے نہایت بے باکانہ طور پر فرما دیتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ اس ضمن میں نواب وحید الزمان، وحید اللغات (مادہ ثلث) میں لکھتے ہیں:

مولانا بشیر الدین قنوجی جو میرے شیخ تھے، حافظ سے یہ کہہ دیتے تھے کہ ختم (قرآن) کے وقت قل ھو اللہ احد کو بھی ایک ہی بار پڑھو، تین بار پڑھنے کو بدعت کہتے تھے ❶۔

ت

۴۱- مولانا تراب علی لکھنوی

مولانا تراب علی کا سلسلہ نسب یہ ہے: تراب علی بن شجاعت علی بن مفتی فقیہ الدین بن مفتی محمد دولت بن مفتی ابوالبرکات۔ یہ تمام حضرات اپنے وقت کے مشاہیر اصحاب علم میں سے تھے۔ ان کے جد امجد مفتی ابوالبرکات فقہ کی ایک کتاب جامع البرکات کے مصنف تھے۔ آگے چل کر ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ کے نامور صحابی حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

مولانا تراب علی ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور سید مخدوم حسینی لکھنوی، مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی، شیخ مظہر علی تاجر اور مفتی اسماعیل مراد آبادی وغیرہ سے اخذ علم کیا۔ اور منقول ومعقول کے جید علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور حجاز میں مفتی عبداللہ سراج المکی سے علم حدیث پڑھا۔ واپس آئے تو پھر درس وافادہ میں مشغول ہو گئے اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بے شمار حضرات علما نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا معین الدین کڑوی، قاضی انور علی مراد آبادی اور سید غنی نقی زید پوری شامل ہیں۔

---

❶ حیات وحید الزمان حاشیہ ص۱۹، ۲۰۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی قاضی بشیر الدین قنوجی کے بارے میں "حیات وحید الزمان" کے حوالے سے یہی الفاظ درج کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ۵۶۳۔

مولانا تراب علی لکھنوی نے قلم و قرطاس سے بھی رشتہ قائم رکھا۔ ان کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ درسی کتابوں پر بھی شروح و حواشی لکھے اور مسائل فقہ سے متعلق بھی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصانیف میں سے چالیس کتابوں کا علم ہو سکا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) شمس الضحٰی لازالۃ الدجی۔
(۲) التکملۃ العلی للواء الھدیٰ۔
(۳) القراضۃ الغالیہ۔
(۴) مصفاۃ الاذھان فی تحقیق السبحان۔
(۵) العشرۃ الکاملہ۔
(۶) التحقیقات البدیعۃ الشوکیہ فی توھین الھفوات السعدیہ۔
(۷) التحقیقات الزکیہ فی التوھمات السعدیہ۔
(۸) حاشیہ شرح ملا جامی۔ یہ حاشیہ نامکمل ہے۔
(۹) ازالۃ العضل عن اشعار المطول۔
(۱۰) الترشیح المجلی فی مسائل المرور امام المصلی۔
(۱۱) القول الصواب فی مسائل الخضاب۔
(۱۲) العجالۃ الدقیقہ فی مسائل العقیقہ۔
(۱۳) سبیل النجاح الیٰ تحصیل الفلاح۔
(۱۴) التعلیق المرضی علیٰ شرح القاضی۔
(۱۵) التعلیق الاحسن علیٰ شرح ملاحسن۔
(۱۶) حاشیہ شرح سلم ازحمد اللہ۔
(۱۷) شوکۃ الحواشی لازالۃ الغواشی۔
(۱۸) حاشیہ صدرا۔
(۱۹) لحیۃ الروایات فی اجوبۃ الواقعات۔ نامکمل
(۲۰) الھلالین علی الجلالین۔ تفسیر جلالین کی یہ ناتمام شرح ہے۔
(۲۱) شرح فارسی قصیدہ بردہ۔
(۲۲) شرح فارسی قیصدہ تنزانی۔
(۲۳) تحصیل النجرہ بآداب العمرہ۔
(۲۴) شرح فارسی تحصیل النجرہ۔

(۲۵) مسالك السداد فی مسائل الافراد۔

(۲۶) هداية الانام فی آداب الاحرام۔

(۲۷) تحصيل التخضع بآداب التمتع۔ ناتمام

(۲۸) الفوز المبين بآداب البلدالامين۔ ناتمام

(۲۹) فوائد القرب فی اداب الاكل والشرب۔

(۳۰) درك المآرب فی آداب اللحی و الشوارب۔

(۳۱) شرح شمس بازغه۔ ناتمام

(۳۲) التحقيقات الكماليه فی ابطال ارتدادات الكلاليه۔

(۳۳) العجالة المبكيه۔

(۳۴) سواء الطريق لابطال اقوال الزنديق۔

(۳۵) هداية النجد ين الیٰ مسائل العيدين۔

(۳۶) قرة العينين فی ابطال مسح الرجلين۔

(۳۷) رساله در فضائل حضرت ابوبكر صديق۔

(۳۸) رساله درفضائل حضرت عثمان۔

(۳۹) رساله معراجيه۔

(۴۰) منهية مصفاة الاذهان۔

مولانا تراب علی لکھنوی نے بھر پور علمی زندگی بسر کی اور لا تعداد لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۱۲ صفر ۱۲۸۱ھ/ ۱۷ جولائی ۱۸۴۶ء کو ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک مقام محمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

ــــ ث ــــ

۴۲- قاضی ثناء اللہ پانی پتی

برصغیر کے ان کبار علما میں جن کو علوم مروجہ کے تمام پہلوؤں پر عبور و تبحر حاصل تھا' تیرھویں صدی ہجری کے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی کا اسم گرامی زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔ وہ شیخ زماں' امام وقت' مجتہد عصر' مفسر قرآن' علامہ کبیر' محدث عمدہ خصائل' فقیہ باکمال' محقق عالی مرتبت اور صاحب تصوف وطریقت تھے۔ برصغیر کی مردم آفرین سرزمین نے جن راسخین فی العلم اور عالی فکر لوگوں کو جنم دیا' ان میں

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۳۶۳۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

قاضی ثناء اللہ کی ذات والا صفات صف اول میں شامل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے حلقہ درس میں:

قاضی ثناء اللہ کا مولد و منشا پانی پت ہے۔ ولادت ۱۱۴۵ھ اور ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۲ء کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے شہر کے اساتذہ سے مروجہ علوم اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا جو اس عہد میں مرکز ارباب فضل اور مرجع اصحاب کمال تھا اور جہاں حجتہ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث کا غلغلۂ درس بلند تھا۔ بہت سے اعاظم رجال نے شاہ صاحب کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کے لیے دہلی کو اپنا قبلہ گاہ قرار دے لیا تھا۔ قاضی ثناء اللہ نے بھی اسی شہر کے لیے رخت سفر باندھا اور شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث وفقہ کی تکمیل کی اور اٹھارہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ ونقلیہ پر حاوی ہو گئے۔

شیخ محمد عابد سنامی اور مرزا مظہر کے حلقہ طریقت میں:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ محمد عابد سنامی سے بیعت تصوف کی اور ان کے اثر صحبت سے روحانیت کے مرتبہ بلند کو پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی بیعت کا شرف حاصل کیا اور سلوک وطریقت میں طریقہ مجددیہ کے مقامات علیا تک رسائی حاصل کی۔ مرزا ممدوح ان پر انتہائی شفقت فرماتے اور بہ درجہ غایت محبت سے پیش آتے تھے۔

شاگردی اور تدریس:

قاضی ثناء اللہ کے حالات کے ضمن میں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قاضی ممدوح شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے یا شاہ عبدالعزیز کے؟ دوسرے یہ کہ کیا پانی پت میں ان کا سلسلہ تدریس قائم تھا؟

''تراجم علمائے حدیث ہند'' کے مصنف مولانا ابو یحیی امام خاں نوشہروی مرحوم نے ترجمہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ضمن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا ذکر شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں کی فہرست میں کیا ہے [1] اور خود قاضی صاحب ممدوح کے ترجمے میں ''معارف'' (اعظم گڑھ) کا ایک مضمون درج کر دیا ہے، جس میں مرقوم ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، بلکہ آپ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی صغرسنی ہی میں فارغ ہو کر آپ اپنے خاندانی منصب قضا پر

---

[1] دیکھیے تراجم علمائے حدیث ہند ص ۵۹۔

پانی پت میں ممتاز تھے۔ وہیں سلسلۂ درس بھی تھا۔ گو پانی پت میں قیام کی وجہ سے درس و تدریس نے پوری شہرت نہیں پائی ❶۔

اصل قصہ یہ ہے کہ "معارف" میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون بعنوان "ہندوستان میں علم حدیث" کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا' جس میں قاضی ثناء اللہ کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا شاگرد بتایا گیا تھا ❷۔ لیکن اس کے بعد مولانا محمد فاروق بہرائچی نے "سلسلہ عالیہ مجددیہ اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا' جس میں اس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ قاضی صاحب ممدوح شاہ عبدالعزیز کے شاگرد نہیں تھے' بلکہ ان کے والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے شاگرد تھے ❸۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب "تراجم علمائے حدیث ہند" نے اس سلسلے میں خود زیادہ تحقیق نہیں کی۔ "معارف" کے مضامین ہی کو کافی سمجھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی' شاہ عبدالعزیز کے شاگرد نہیں تھے' بلکہ ان کا شمار شاہ ولی اللہ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ قاضی صاحب ۱۱۴۵ اور ۱۱۴۷ھ/ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۲ء کے درمیان پیدا ہوئے جب کہ شاہ عبدالعزیز کا سن ولادت ۱۱۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء ہے۔ اس حساب سے قاضی صاحب ان سے تیرہ چودہ سال عمر میں بڑے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر منصب قضا پر بھی فائز ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا قاضی ثناء اللہ کا پانی پت میں باقاعدہ سلسلۂ درس جاری تھا؟ ہمارے خیال میں "معارف" کے فاضل مقالہ نگار مولانا محمد فاروق کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ قاضی ثناء اللہ کا "وہیں سلسلۂ درس بھی تھا' گو پانی پت میں قیام کی وجہ سے درس و تدریس نے پوری شہرت نہیں پائی ❹۔

واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور دور دراز دیہات میں بھی جن علمائے کرام نے مسند درس بچھائی' وہ مرجع تشنگان علم قرار پا گئے اور ان دیہات کو غیر معروف ہونے کے باوجود شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ جن حضرات نے ان دیہات کے اساتذہ سے استفادہ کیا' ان کے اسمائے گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے' لیکن قاضی ثناء اللہ کے تلامذہ کا چند ایک کے سوا کچھ پتا نہیں چلتا۔

یہ بات قرین صحت نہیں کہ ان کے سلسلۂ درس نے پانی پت کی وجہ سے شہرت نہیں پائی۔ قاضی صاحب کے زمانے میں پانی پت کوئی غیر معروف قریہ نہ تھا' بلکہ ایک اچھا خاصا شہر تھا' جہاں باقاعدہ محکمہ قضا قائم تھا اور متعدد بزرگان دین اور مشائخ کرام کا مسکن رہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ قاضی صاحب ممدوح زیادہ تر

---

❶ تراجم علمائے اہل حدیث ہند: ص ۲۰۷۔

❷ ملاحظہ ہو "معارف" (اعظم گڑھ) نومبر ۱۹۲۸ء ص ۳۴۶۔

❸ ملاحظہ ہو "معارف" (اعظم گڑھ) جون ۱۹۲۹ء ص ۴۴۴۔

❹ ایضاً۔

منصب قضا کی ذمہ داریوں میں مصروف رہے اور اسی کو مرکز توجہ ٹھہرائے رکھا کہ اس سے بہ طریق احسن عہد برآ ہوسکیں۔ مختلف مسائل فقہی کے حل وکشود کے سلسلے میں ان میں جو وسعت فکر اور ملکہ اجتہاد پیدا ہوا وہ ان کے منصب قضا ہی پر متمکن رہنے کا نتیجہ ہے۔

محکمہ قضا کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول رہے۔ تصنیف وتالیف کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے اور تحقیق وکاوش کا طالب ہے۔ ان دو بنیادی کاموں کے علاوہ کسی اور کام کے لیے زیادہ وقت نکالنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے ظاہر ہے قاضی ثناء اللہ کا سلسلۂ درس وتدریس محدود اور مقامی نوعیت کا تھا' جس کی طرف ان کے زمانے میں اور ان کے بعد اعتنا نہیں کیا گیا۔ اگر ان کا سلسلۂ درس دیگر علما کی طرح غیر محدود اور وسعت پذیر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان کی باقی خدمات کو تو شہرت وقبولیت حاصل ہو جاتی اور تدریسی سرگرمیاں پردہ خفا میں رہتیں۔ ان کا تعلق صرف پانی پت ہی سے نہ تھا اور وہ ایک خاص علاقے اور شہر کے عالم ہی نہ تھے' وہ ایک عہد اور دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ تھے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلمیذ رشید تھے' جن کے خود شاہ صاحب بھی مداح ہیں۔ اگر ان کی باقاعدہ مسند درس آراستہ ہوتی اور طلبا زیادہ تعداد میں ان سے استفادہ کرتے تو لازماً اس کا ذکر کتب رجال میں آتا اور ان کے تلامذہ فخر سے اس کی تشہیر کرتے۔ طلبا استاد کی شہرت کا ایک مستقل ذریعہ ہوتے ہیں اور جن حضرات سے اخذ علم وکسب فیض کرتے ہیں' ان کی طرف نسبت تلمذ کا اظہار مسرت کے ساتھ کرتے ہیں تاکہ ان کی سند عالی ہو۔ قاضی ثناء اللہ کے تلامذہ وفیض یافتگان کا اگر تذکرہ نہیں ہے تو اسے محض ان کی پانی پت کی سکونت قرار نہیں دیا جاسکتا' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے درس وتدریس پر تصنیف وتالیف' رشد وہدایت' وعظ ونصیحت' منصب قضا اور اصلاح خلائق کو ترجیح دی اور یہ ان کی عظیم الشان خدمت ہے۔ منصب قضا کی وجہ سے وہ صرف ایک ہی فقہی دائرے میں مقید نہیں رہے' بلکہ تمام مسالک فقہ پر ان کی نظر حاوی ہوگئی اور ذہن وفکر کی وسعت نے ان کو آسمان کی بلندیوں پر اچھال دیا۔

قاضی ثناء اللہ کا سلسلۂ درس محدود اور مقامی نوعیت کا تھا' جس میں پانی پت اور اس کے گردونواح کے طلبا استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے بڑے بیٹے مولانا احمد اللہ نے ان سے تحصیل کی۔ بعض اور طلبا بھی ان کے حلقہ شاگردی میں شامل تھے۔ صوبہ سرحد کے دو یا تین طلبا نے بھی ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔

قاضی صاحب موصوف کے حلقہ درس کے محدود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اتنے امیر عالم دین نہ تھے کہ طلبا کے مصارف برداشت کرسکتے۔ اپنے اندر استطاعت کفالت نہ تھی اور دوسروں سے مانگنا ان کی عادت میں داخل نہ تھا۔

ایک بڑی وجہ پانی پت میں وسیع پیمانے پر حلقہ درس قائم نہ ہونے کی یہ بھی تھی کہ عرصہ دراز تک یہ شہر کئی عظیم جنگوں کا میدان بنا رہا تھا۔ اس کے اطراف وجوانب کے دیہات تباہ ہوگئے تھے اور وہاں کے باشندے مختلف علاقوں میں منتقل ہوگئے تھے۔ اشیائے خوردونوش آسانی سے مہیا نہ ہوسکتی تھیں اور لوگ پریشان حال تھے۔ ان حالات میں طلبا بھی ادھر کا بہت کم رخ کرتے تھے۔

علم الہدیٰ اور بیہقی وقت:

نواب صدیق حسن خاں ان کی علو فکر، جودت طبع، قوت ادراک اور اتباع سنت کی بے حد تعریف کرتے اور انھیں ''زائد الوصف'' قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

بخدمت میرزا جان جاناں رسیدند و بزبان ایشاں ملقب بہ علم الہدی شدند۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایشاں را بیہقی وقت می گفتند ❶۔

(قاضی ثناء اللہ پانی پتی) میرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں پہنچے تو میرزا صاحب نے ان کو علم الہدیٰ کے عظیم لقب سے سرفراز کیا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کو بیہقی وقت کہہ کر پکارتے تھے۔)

جس شخص کو میرزا مظہر جان جاناں جیسا عالم اجل اور صاحب طریقت ''علم الہدیٰ'' کے خطاب سے نوازتا ہو، اور شاہ عبدالعزیز جیسے ''بیہقی وقت'' کے لقب سے سرفراز کرتے ہوں، غور فرمایئے وہ تدین واتقا کی کتنی اونچی منزلیں طے کر چکا ہوگا اور مسائل شرعیہ پر عبور واستحضار اور کثرت مطالعہ میں اس کا مرتبہ کتنا بلند ہوگا۔

کثرت مطالعہ:

ان کا راہوار علم بہت تیز تھا اور زمانہ طالب علمی میں بھی وہ ہر آن مصروف مطالعہ رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے، جس کا اظہار نواب صدیق حسن خاں نے ان کے شوق کتب بینی کے بارے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

در ایام تحصیل سہ دو پنجاہ کتب سوائے کتب تحصیلہ بہ مطالعہ خود آوردند ❷

زمانہ طالب علمی میں مروجہ کتب نصابی کے علاوہ انھوں نے تین سو پچاس کتابوں کا مطالعہ کیا۔

آج سے تقریباً تین سو سال قبل جب کہ کتابوں کی اشاعت وطباعت کی موجودہ سہولتوں میں سے کوئی سہولت بھی میسر نہ تھی، قلمی کتابیں ہی پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں، اس زمانے میں ساڑھے تین سو کتابوں کا مہیا کرنا اور پھر انھیں پڑھنا کتنا مشکل کام اور کٹھن مرحلہ تھا، اور کتابیں بھی وہ جو خالص علمی اور فنی نوعیت کی تھیں۔

مرشد کے دل پر مرید کی ہیبت:

میرزا مظہر جان جاناں اپنے فضل وکمال کے باوصف قاضی صاحب ممدوح کے صلاح وتقویٰ اور

---

❶ اتحاف النبلاء ص ۲۴۰۔

❷ اتحاف النبلاء ص ۲۴۰۔

پابندی شریعت کا واضح الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں اور مرید سے اس کی للّٰہیت کی بنا پر روحانی خوف اور ہیبت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

میرزا مظہری فرمود دردل فقیر مہابت ایشان می آید از روئے صلاح وتقویٰ و دیانت، روح مجسم اند، مروج شریعت، منور طریقت، ملکی صفات کہ ملائکہ تعظیم ایشاں می نمایند ❶۔

میرزا مظہر فرمایا کرتے تھے کہ ان کے صلاح وتقویٰ اور دیانت کے باعث اس فقیر کے دل پر ان کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ وہ پیکر خیر، شریعت اسلامی کی ترویج واشاعت کرنے اور نور طریقت پھیلانے والے ہیں۔ اس درجے فرشتہ صفت ہیں کہ فرشتے ان کی تعظیم بجالاتے ہیں۔

شیخ غلام علی شاہ علوی لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے کانوں سے میرزا مظہر جان جاناں سے سنا، وہ قاضی ثناء اللہ کو اپنے لیے ذریعہ مغفرت ٹھہراتے تھے:

می فرمودند اگر خدائے تعالیٰ بروز قیامت از بندہ پرسید کہ بہ درگاہ ما تحفہ چہ آوردی؟ عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را ❷۔

فرمایا کرتے اگر اللہ نے قیامت کے روز مجھ سے پوچھا کہ ہمارے دربار میں کیا تحفہ لائے ہو؟ تو عرض کروں گا، ثناء اللہ پانی پتی کو لایا ہوں ❸۔

---

❶ مقامات مظہری ص ۷۶

❷ مقامات مظہری ص ۷۶

❸ یہی الفاظ حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بارے میں کہے تھے۔ حضرت حافظ صاحب بہت بڑے اہل حدیث عالم اور استاد پنجاب تھے۔ بے شمار اکابر علما نے ان سے اخذ علم کیا۔ نابینا تھے، لیکن بصیرت وذہانت اور ذکاوت وفطانت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے تلامذہ کی کثیر جماعت میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے، جو چودھویں صدی ہجری کے جید عالم اور بوقلموں اوصاف سے موصوف تھے۔ ایک مرتبہ علما کے ایک اجتماع میں حضرت حافظ صاحب نے فرمایا، اگر اللہ نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ تم آنکھوں سے اندھے تھے، ہم نے تم کو عزت عطا فرمائی، علم سے نوازا، اور لاتعداد علما کو تمھارے حلقہ شاگردی میں داخل کیا، بتاؤ اس احسان عظیم کے بدلے ہمارے حضور کیا تحفہ لائے ہو؟ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا، ثناء اللہ امرتسری کو لے کر حاضر ہوا ہوں، امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت کے بدلے مستحق مغفرت سمجھا جاؤں گا۔!

مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی نے اپنے شاگرد مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے وہی الفاظ استعمال فرمائے جو مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے لیے استعمال فرمائے تھے۔ بلاشبہ یہ دونوں ثناء اللہ متحدہ پنجاب کے فحول علما سے تھے۔ ایک کا تعلق تیرہویں صدی ہجری سے تھا اور ایک کا چودھویں صدی ہجری سے! دونوں مفسر قرآن، محدث وفقیہ، کثیر التصانیف، وسیع النظر وسیع الفکر اور اشاعت دین میں سرگرم تھے۔

اوصاف گوناگوں:

قاضی ثناء اللہ کے بارے میں مرزا مظہر جان جاناں کا یہ قول بے شبہ صحیح ہے۔ وہ ہمہ گیر اوصاف کے حامل اور ہر گوشۂ علم میں کامل تھے۔ نواب صدیق حسن خاں رقم طراز ہیں:

مدت العمر در افاضہ کمالات ظاہر و باطن و اشاعت علوم و فصل خصومات و افتائے سوالات و حل معضلات مصروف بودند، در علم تفسیر و فقہ و کلام و تصوف ید طولیٰ داشتند ❶۔

(عمر بھر ظاہری و باطنی کمالات کی فیض رسانی، اشاعت علوم، فصل خصومات، فتووں کے جواب دینے اور مشکل مسائل کی عقدہ کشائی میں مصروف رہے۔ علم تفسیر، فقہ و کلام اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔)

فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی ثناء اللہ پانی پتی منصب قضا پر مامور ہوئے جو مدت مدید سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ اس نازک منصب کے وقار کو انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کی ذمہ داریوں کو بہترین طریق سے پورا کرتے رہے۔ اس باب میں اپنے ماتحت عملے کی پوری نگرانی کرتے۔ عدل و انصاف کے تقاضوں سے نہ خود غافل ہوتے نہ کسی کو غلط راہ اختیار کرنے دیتے۔ جس شخص کے پاس ان کی مہر رہتی تھی، ایک مرتبہ اس نے کسی سے کوئی چیز لے لی۔ ان کو اطلاع ہوئی تو اس کی سزا دی اور وہ چیز واپس کی ❷۔

تصنیف و تالیف اور بیان حقائق و معارف میں وہ شاہ ولی اللہ کے تمام تلامذہ سے فائق تر تھے۔ ان کی تصانیف میں اسی طرح مجتہدانہ شان نمایاں ہے، جس طرح ان کے استاد عالی قدر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں نمایاں ہے۔ ان کے مرشد مرزا مظہر جان جاناں بھی صفت اجتہاد سے متصف تھے۔

قاضی ثناء اللہ کی تصانیف میں تفسیر مظہری ضخامت اور تحقیق کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ عربی زبان میں قرآن مجید کی یہ مشہور تفسیر ہے۔ اس کا نام انھوں نے اپنے استاذ و مرشد مرزا مظہر جان جاناں کے نام پر رکھا۔ اس تفسیر کے بارے میں انھوں نے اپنے پیر بھائی مولانا نعیم اللہ بہرائچی کو خط لکھا جس میں اس کے حجم و ضخامت اور مندرجات و مشمولات کا ذکر کیا ہے۔ خط فارسی زبان میں ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے تفسیر مظہری اختتام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں مذاہب فقہا، شان نزول، ادلہ احکام، مسائل فقہ، مسائل کلام، مسائل تصوف، سیرت رسول ﷺ اور آپؐ کے مغازی، اختلاف قرات وغیرہ امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

شان اجتہاد:

میرزا مظہر جان جاناں ان کے علم و فضل اور تحقیق و تدقیق پر بے حد اعتماد فرماتے تھے اور ان کی فقہی

❶ اتحاف النبلاء ص ۲۴۱۔

❷ مقامات مظہری ص ۷۷۔

حیثیت اور اجتہادی شان کا اعتراف کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ مرزا ممدوح نے شاہ ولی اللہ صاحب سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت مقدسہ کے موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی۔ شاہ صاحب نے وہ رسالہ لکھ کر میرزا صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ لیکن وہ ان کے حسب دل خواہ نہ تھا' لہٰذا انھوں نے وہ رسالہ قاضی صاحب کو بھیج دیا' چند کتابیں اور بھی بھیجیں۔ ساتھ ہی خط لکھا کہ اپنے علم و مطالعہ کے مطابق سیرت طیبہ سے متعلق ایک کتاب لکھیں۔ قاضی صاحب نے تعمیل حکم کی اور چودہ کتابوں کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک رسالہ تحریر فرمایا' جس میں آنحضرت ﷺ کے افعال و اعمال فقہی ابواب قائم کر کے جمع فرمائے' اختلاف روایات میں تطبیق دی اور حسب موقع مذہب راجح کی ترجیح کے وجوہ مجتہدانہ انداز سے بیان کیے۔ یہ رسالہ طبع نہیں ہوا۔ اصل مسودہ قاضی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس کے شروع میں اخلاق نبوی ﷺ پر ایک رسالہ ہے ❶۔

مقامات مظہری کے مصنف شہیر شاہ غلام علی علوی' قاضی ثناء اللہ کا ذکر محبت اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ ان کے مرتبہ اجتہاد اور تبحر علمی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

در علوم عقلی و نقلی تبحر تام دارند' در فقہ و اصول بہ مرتبہ اجتہاد رسیدہ۔ کتابے مبسوط در علم فقہ با بیان ماخذ و دلائل مختار مجتہدان مذاہب اربعہ در ہر مسئلہ تالیف نمودہ اند' و ہر آنچہ نزد ایشاں اقویٰ ثابت شدہ آں را رسالہ جدا مسمی ''بہ ماخذ الاقویٰ'' تحریر فرمودہ۔ در اصول نیز ''مختارات'' خود نوشتہ اند ❷۔

(علوم نقلی و عقلی میں کامل تبحر رکھتے تھے۔ فقہ و اصول میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ علم فقہ میں ایک مبسوط و مفصل کتاب تصنیف کی' جس میں ہر مسئلہ ماخذ کے حوالوں اور مجتہدین مذاہب اربعہ کے مختار دلائل سے بیان کیا۔ کسی مسئلے میں ان کے نزدیک جس مذہب فقہی کی جو دلیل زیادہ قوی ہے' اسے ایک الگ رسالے ''ماخذ الاقویٰ'' میں تحریر کیا۔ اصول فقہ میں بھی ''مختارات'' کے نام سے کتاب لکھی۔)

تصانیف:

قاضی ثناء اللہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے' جو تفسیر' حدیث' فقہ اور زہد و عبادت وغیرہ کے موضوع کو محتوی تھیں۔ ان کی بعض تصانیف کا پتا نہیں چلتا' جن کا پتا چل سکا ہے' ان میں اہم کتابیں یہ ہیں:

تفسیر مظہری: یہ قرآن مجید کی عربی تفسیر ہے جو دس جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی۔ نہایت عمدہ تفسیر ہے۔ قاضی صاحب نے اسے اپنے مرشد میرزا مظہر جان جاناں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سے انھیں انتہائی محبت تھی۔

---

❶ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۲۹ء

❷ مقامات مظہری ص ۷۵۔

فتاویٰ مظہری: یہ قاضی صاحب کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ یہ وہ فتوے ہیں جو انھوں نے مختلف فقہی مسائل سے متعلق جاری کیے۔ یہ فتوے قاضی صاحب کے پوتے قاضی عبدالسلام بن دلیل اللہ کے مرتب کردہ ہیں اور مرزا مظہر جان جاناں کی طرف منسوب ہیں۔

رسالہ پنج روزی: یہ رسالہ اصول فقہ میں ہے۔

مختارات: یہ بھی اصول فقہ میں ہے۔

سیف المسلول: اس کتاب کا دوسرا نام شمشیر برہنہ ہے۔ ردشیعہ میں ہے۔ اپنے موضوع کی یہ مشہور کتاب ہے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ''تحفہ اثنا عشریہ'' سے پہلے کی تصنیف ہے۔

حرمت متعہ: یہ بھی ردشیعہ میں ہے۔ اس میں حرمت متعہ سے متعلق دلائل دیے گئے ہیں۔

مالا بدمنہ: فقہی ترتیب سے عقائد پر یہ عمدہ کتاب ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

ارشاد الطالبین: سلوک وطریقت کے بارے میں ہے۔ فارسی میں ہے۔ فقہی مسائل بھی اس میں بیان کیے گئے ہیں۔

تذکرۃ الموتیٰ والقبور: اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں احوال قبور کا بیان ہے اور بتایا ہے کہ قبر میں نیک آدمی کس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور غلط اعمال کے مرتکب شخص کو کس صورت حال میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

تذکرۃ المعاد: یہ کتاب قیامت اور آخرت کے احوال وکوائف پر محیط ہے۔

حقوق الاسلام: اس کا دوسرا نام حقیقۃ الاسلام ہے۔

رسالہ درحرمت غنا: اس میں غنا اور سرود کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ قوالی اور سماع کو بھی ناجائز اور خلاف شرع قرار دیا گیا ہے۔

رسالہ درعشر وخراج: اس میں عشر اور خراج کے احکام درج ہیں۔

رسالہ شہاب ثاقب: حدیث رسول اللہ ﷺ سے متعلق ایک مبسوط کتاب ہے جو دو جلدوں میں تصنیف کی۔

وصیت نامہ: اسی (۸۰) سال کی عمر کو پہنچ کر اپنے احباب واولاد کو وصیت کی کہ وفات کے بعد ان کی تجہیز وتکفین سنت کے مطابق کی جائے۔ قرض وغیرہ ادا کیا جائے اور ساتواں، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ خلاف شرع رسوم ہیں۔ یہ بالکل نہ کی جائیں۔

المقامۃ الرضیہ فی النصیحۃ والوصیہ: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے رسالہ ''وصیت نامہ'' کی شرح۔

مکتوبات: قاضی صاحب ممدوح کے یہ مکتوبات تصوف وسلوک اور مسائل فقہی سے متعلق ہیں اور

خالص علمی و تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ شیخ ابو خیر محمد ابن احمد فاروقی مراد آبادی نے "کلمات طیبات" میں قاضی ثناء اللہ کے آٹھ مکتوب نقل کیے ہیں' جو شاہ غلام علی علوی مجددی' قاضی کرانہ شیخ محمد اور شیخ نعیم اللہ بہرائچی کے نام ہیں۔ ایک مکتوب خاندان سادات میں سے ایک بزرگ کے نام ہے۔

استاذ' مرشد اور معاصرین کا ہدیہ عقیدت و تعظیم:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے اس شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ جس زمانے میں قاضی صاحب شاہ صاحب کے حلقہ درس میں شریک تھے' اس زمانے میں شاہ صاحب ان کے بارے میں ایک مکتوب میں مرزا مظہر جان جاناں کو لکھتے ہیں:

مولوی ثناء اللہ مصابیح و صحیحین استماع نمودند و مستعد کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ اند' ہمیں توجہ ہمت سامی است کہ آیتہ بہ ظہور رسد' و بعد ازاں احرام صحبت شریف بندند [1]۔

(مولوی ثناء اللہ مصابیح اور صحیحین پڑھ رہے ہیں۔ کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ کی تکمیل کے لیے میرے پاس ہیں۔ آپ کی توجہ خاص سے امید ہے کہ اللہ کی کوئی نشانی ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد آپ کی خدمت میں احرام باندھیں گے۔)

قاضی ثناء اللہ برصغیر کے وہ بزرگ تھے جن کے خاندان میں دس پشت سے علم متوارث چلا آ رہا تھا۔ اس فضیلت کے علاوہ ان کو اخلاق فاضلہ اور مکارم پسندیدہ سے بھی بہرہ وافر حاصل تھا۔ مولانا نعیم اللہ بہرائچی ان کے فضل و کمال اور معرفت وادراک کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بالجملہ ذات مستجمع کمالات حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی است' از آیات سبحانی و نوری است از انوار تجلیات ربانی و فاضل' عالم' درویش' عامل و مکمل فقیہ و متکلم و محدث و مفسر و حافظ کلام اللہ است' و موصوف باخلاق حمیدہ و مکارم پسندیدہ' و در امانت و دیانت و صلاح و تقویٰ و خوش خلقی و پاک طینتی' و انجاح مہمات خلائق و کمال کسر نفس بے نظیر و ہمیشہ بطاعت و عبادت و ریاضت و تدریس علوم ظاہر و باطن و مطالعہ و مباحثہ علوم دینی و تصانیف کتب مشغول۔ ازیں جا است کہ حضرت ایشاں (یعنی حضرت میرزا جان جاناں شہید رحمہ اللہ) می فرمودند کہ وجود کہ از اجتماع انوار کمالات ظاہری و باطنی وضیائے صبح صلاح و تقویٰ ایشاں دلم مستنیر نہایت می گردد' و می فرمودند کہ وجود ایشاں بہ اعتقاد فقیر عزیز ترین موجودات است' و از روئے تقویٰ و دیانت روح مجسم اند' مروج شریعت و منور طریقت و ملکی صفات اند' ملائکہ کرام تعظیم و تکریم ایشاں می کنند [2]۔

(حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی جامع کمالات ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کی ایک نشانی اور تجلیات ربانی

---

1. کلمات طیبات ص ۱۵۸' ۱۵۹

2. "معارف" (اعظم گڑھ) جون ۱۹۲۹ء بحوالہ بشارات مظہریہ

کے انوار میں سے نور ہدایت کی ہے۔ فاضل و عالم، درویش و عامل، فقیہ کامل، متکلم و محدث، مفسر اور حافظ قرآن ہیں۔ اخلاق حمیدہ سے موصوف اور مکارم پسندیدہ سے متصف ہیں۔ دیانت و امانت، صلاح و تقویٰ اور خوش خلقی و پاک طینتی سے بہرہ ور ہیں۔ خدمت خلق میں مشغول اور کسر نفسی میں بے مثال۔ ہمیشہ اطاعت الٰہی، عبادت و ریاضت، علوم ظاہری و باطنی کی تدریس، فنون دینی کے مطالعہ و مباحثہ اور تصنیف کتب میں منہمک رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید فرمایا کرتے تھے کہ ان کی ذات گرامی سے، جو مجموعہ کمالات ظاہری و باطنی، روشنی صبح صادق اور نشان صلاح و تقویٰ ہے، میرا دل انتہائی مستنیر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک ان کا وجود سب سے بہتر اور مغتنمات میں سے ہے۔ وہ پیکر تقویٰ و دیانت ہیں۔ شریعت کی ترویج و اشاعت اور طریقت و سلوک کی راہ کو روشن کرنے والے ہیں۔ فرشتہ صفت ہیں اور فرشتے ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔)

مولانا نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں:

بالجملہ ذات ایشاں با کمالات ظاہر و باطن موصوف است و اوقات بہ طاعت و عبادت معمور اند [1]۔

(ان کی ذات گرامی کمالات ظاہر و باطن سے موصوف ہے اور ان کے اوقات شب و روز اطاعت خداوندی اور عبادت الٰہی سے معمور ہیں۔)

فتنہ معاصرت سے پاک لوگ:

علم کی دنیا میں معاصرت کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ کم لوگ ہوں گے جو اپنے عصر اور زمانے کے اہل علم کو لائق اعتنا اور قابل ستائش گردانتے ہوں۔ ہر اہل علم اپنے آپ کو دوسرے اہل علم سے فائق تر سمجھتا ہے۔ اگر دو عالم ایک ہی فن سے تعلق رکھتے ہوں تو دونوں اپنی مدح و ثنا اور دوسرے کی تنقید و تنقیص میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس مہلک مرض میں قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقے مبتلا ہیں۔ بس کسی کے سامنے دوسرے کی ذرا بات چھیڑ کر دیکھیے، پتا چلے گا کہ بھرا پڑا تھا۔ ایسے ایسے انکشافات ہوں گے کہ سننے والا حیران ہو کر رہ جائے۔

لیکن اہل اللہ کی مجلس میں یہ بات نہیں ہے۔ مولانا نعیم اللہ بہرائچی جو قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے ہم عصر ہیں، ان کی بے حد تعریف کرتے اور ان کو علم و فضل اور تقویٰ و تدین میں بے نظیر قرار دیتے ہیں۔ ان کے مرشد مرزا مظہر جان جاناں بھی اپنے شاگرد اور مرید کی مدحت و ستائش میں رطب اللسان ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو نہ ان کے استاد ہیں نہ مرشد، ان کے وسعت علم و کثرت مطالعہ کی بنا پر انھیں ''بیہقی وقت'' کہہ کر پکارتے ہیں۔

ایک معاصرت باعث فتنہ و فساد ہے اور ایک سکون قلب اور اطمینان روح و ذہن کا سبب۔ اس کی

[1] مقامات مظہریہ ص ۷۷۔

اصل وجہ اخلاص اور تعلق باللہ ہے۔ جن لوگوں کے دل اخلاص سے خالی اور تعلق باللہ سے محروم ہیں' وہ نہ کسی کا احترام کرتے ہیں اور نہ کوئی ان کو خاطر میں لاتا ہے۔ جو حضرات اس نعمت عظمیٰ سے مالا مال ہیں' وہ سب کی عزت کرتے ہیں اور سب لوگ ان کی تعظیم بجالانے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کا شمار اس خوش بخت گروہ میں ہوتا ہے جو دوسروں کے احترام کو علم و کمال کا احترام اور دوسرے کی توہین کو علم و کمال کی توہین سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسائل میں نقطہ نظر:

قاضی ثناء اللہ کا دور ہندوستان میں فقہ و قیاس کے تغلب و استیلا کا دور تھا۔ ملک کے علما و فضلا کی اکثریت مسائل میں ایک خاص فقہی نقطہ نظر کو ترجیح دیتی تھی جسے فقہ حنفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب کا یہ حال تھا کہ جہاں فرمان پیغمبر واضح طور پر سامنے آ جاتا اور سنت نبوی (علیہ الف الف تحیہ وسلام) پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی' وہاں فقہی نقطہ نظر سے خود بھی دست کش ہو جاتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔ چنانچہ تفسیر مظہری میں وضاحت سے رقم طراز ہیں:

اذا صح عنداحد حدیث مرفوع من النبی ﷺ سالما عن المعارضة ولم یظهر له ناسخ و کان فتوی ابی حنیفة رحمه الله مثلاً خلافه وقد ذهب علی وفق الحدیث احد من الائمة الاربعة یجب علیه اتباع الحدیث الثابت ولا یمنعه الجمود علی مذهبه من ذلك کیلا یلزم اتخاذ بعضنا بعضاً اربابا من دو ن الله❶۔

(جب رسول اللہ ﷺ کی کوئی مرفوع اور تعارض و نسخ سے محفوظ حدیث مل جائے' اگرچہ امام ابوحنیفہ کا فتویٰ و قول اس کے خلاف ہی ہو' اور دوسرے ائمہ میں سے کسی ایک امام کا رجحان اس حدیث کے موافق ہو' تو ایسی صورت میں اپنے (تقلیدی) مذہب پر اڑے نہیں رہنا چاہیے' بلکہ حدیث کا اتباع واجب ہے' تاکہ قرآن کے اس ارشاد کے انطباق سے کہ بعض لوگوں نے بعض لوگوں کو رب قرار دے رکھا ہے' بچا جا سکے۔)

قاضی صاحب موصوف عورتوں کے قبروں پر جانے اور ان پر چراغ جلانے کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

روی الحاکم و صححه عن ابن عباس لعن الله زائرات القبور و المتخذین علیها المساجد و السرج❷۔

---

❶ تفسیر مظہری ج ۲ ص ۶۴

❷ تفسیر مظہری' ج ۲ ص ۶۵

(حاکم میں ایک حدیث ہے' جسے وہ صحیح قرار دیتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ نیز قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے والوں کو ملعون گردانا ہے۔)

سورہ یوسف کی آیت (نمبر ۵۵) قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ۔

(کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ مصر سے کہا' مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کردو) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفیہ دلیل علیٰ جواز طلب الولایۃ والقضاء ❶۔

(یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ولایت وقضا کا منصب طلب کیا جاسکتا ہے۔)

لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ یہ منصب نیکی کی ترویج و اشاعت اور برائی کو ختم کرنے کی نیت سے طلب کیا جائے۔

تفسیر مظہری عربی زبان میں نہایت مفصل تفسیر ہے' جس میں مختلف مباحث کے سلسلے میں فقہا و محدثین کے مسالک کی بہترین اسلوب اور اعتدال وتوازن سے وضاحت کی گئی ہے۔

قاضی ثناء اللہ بہ درجہ غایت متبع سنت عالم تھے۔ وہ ہر معاملے میں اتباع سنت کی تاکید کرتے اور امور بدعت سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ان کی کتاب ''ارشاد الطالبین'' تصوف وطریقت کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے جا بجا بدعات سے دامن کشاں رہنے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرتے اور خوب صورت انداز میں مسائل کی وضاحت فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولایت وتصوف اللہ کی وہ نعمت ہے جو انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو اعتقادات صحیحہ رکھتے ہوں' جن کی زندگی قرآن وحدیث و اجماع اہل سنت کے مطابق ہو' جن کی پہچان اعمال صالح ہو' جو ادائے فرائض و واجبات وسنن ومستحبات کا پورا اہتمام کرتے ہوں اور ترک محرمات ومکروہات و مشتبہات وبدعات جن کا شیوہ ہو ❷۔

لکھتے ہیں کہ اذان کہتے وقت اور اللہ کا ذکر کرتے وقت انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا کلمہ نہیں کہنا چاہیے جو حدیث میں نہ آیا ہو اور بعد کی اختراع ہو۔ فرماتے ہیں:

پس اگر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ گوید وباوے ضم کند علی ولی اللہ یا ابوبکر ولی اللہ تعزیز کردہ شود ❸۔

یعنی اگر کوئی شخص کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے اور اس کے ساتھ علی ولی اللہ یا ابوبکر ولی اللہ کے

---

❶ تفسیر مظہری ج ۵ ص ۱۴۱

❷ ارشاد الطالبین ص ۳

❸ ایضاً ص ۱۹۔

الفاظ ملا دے تو وہ قابل سزا ٹھہرے گا۔

تحریر فرماتے ہیں کہ کوئی ولی اور صوفی اور صاحب طریقت وسلوک معصوم نہیں ہے۔ معصوم صرف انبیا علیہم السلام ہیں۔

عصمت خاصہ انبیا است در اولیا گفتن کفر است ❶۔

(عصمت فقط نبیوں کا خاصہ ہے' اولیا کو معصوم قرار دینا کفر ہے۔)

اولیاء اللہ کی قبور پر گنبد تعمیر کرنے' ان پر چراغاں کرنے اور ان پر عرس منعقد کرنے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

قبور اولیا بلند کردن و گنبد برآں ساختن و عرس و امثال آں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است۔ بعضے ازاں حرام است و بعضے مکروہ۔ پیغمبر خدا بر شمع افروزان و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ و فرمودہ کہ قبر مرا عید و مسجد نہ کنید ❷۔

(اولیاء اللہ کی قبروں پر عمارت تعمیر کر کے انھیں بلند کرنا' ان پر گنبد بنانا' ان پر عرس وغیرہ کی محفلیں جمانا اور چراغاں کرنا سب بدعت ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں حرام ہیں اور بعض مکروہ۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر شمع جلانے اور ان پر سجدہ کرنے والوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید اور سجدہ گاہ نہ بناؤ۔)

قاضی صاحب ممدوح کی کتاب "مالا بدمنہ" فارسی میں ہے اور خالص فقہی نوعیت کی ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف مسائل کی وضاحت کی ہے۔ اس کی کتاب الصلوۃ میں نماز میں مسئلہ رفع الیدین کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وقت رفتن برکوع و سر برداشتن ازاں رفع یدین نزد ابی حنیفہ سنت نیست لیکن اکثر فقہا و محدثین اثبات آں کنند ❸۔

(رکوع کو جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک رفع یدین کرنا سنت نہیں ہے' لیکن اکثر فقہا و محدثین اس کو سنت قرار دیتے ہیں۔)

دوسری رکعت پوری کر کے تیسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت بعض حضرات رفع یدین کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے' اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

بعد ازاں تکبیر گویاں بسوئے رکعت سوم برخیزد و رفع یدین دریں وقت نزد اکثر علما سنت است' نہ نزد ابی حنیفہ و شافعی ❹۔

---

❶ ارشاد الطالبین ص ۱۹۔

❷ ارشاد الطالبین ص ۲۰۔

❸ مالا بدمنہ ص ۲۴۔

❹ مالا بدمنہ ص ۲۵۔

یعنی دوسری رکعت سے تیسری رکعت کے لیے اللہ اکبر کہتا ہوا اٹھے تو اس موقعے پر اکثر علما کے نزدیک رفع یدین سنت ہے' لیکن امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک سنت نہیں ہے۔

مالابدمنہ میں انھوں نے احتکار اور ذخیرہ اندوزی پر بھی بحث کی ہے اور اسے ناجائز ٹھہرایا ہے' کیونکہ معاشی اعتبار سے معاشرے کے لیے یہ سخت تکلیف دہ ہے۔ لکھتے ہیں:

احتکار یعنی بند کردن ونہ فروختن قوت آدمیاں و چہار پایگان در شہرے کہ برائے اہل آں مصر باشد' مکروہ است' ونزد امام ابی یوسف در ہر جنس کہ ضرر احتکار آں بعامہ باشد' احتکار آں ممنوع است' حاکم محتکر را امر کند کہ زیادہ از حاجت خود بہ فروشد' پس اگر نہ فروشد' حاکم بہ فروشد[1]۔

(ذخیرہ اندوزی کرنا اور انسانوں اور چار پایوں کی خوراک کو' جو اسی شہر کے باشندوں کے لیے ہے' فروخت نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ہر وہ جنس کہ جس کی ذخیرہ اندوزی عوام کے لیے تکلیف کا باعث ہو' ممنوع ہے۔ حاکم کو چاہیے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے کے نام حکم جاری کرے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ غلے کو فروخت کر دے' اگر وہ حاکم کے حکم کے باوجود فروخت نہ کرے تو حاکم اسے خود فروخت کرے۔)

اشیائے خوردونوش کے نرخ مقرر کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

پادشاہ و حاکم را نرخ کردن مکروہ است' مگر وقتیکہ بقالان در گرانی غلہ بسیار تعدی نمایند در آں صورت بہ مشورت دانایاں نرخ کند[2]۔

(پادشاہ اور حاکم کا چیزوں کے بھاؤ مقرر کرنا مکروہ ہے' لیکن جب غلہ فروش بے تحاشا مہنگائی کرنے لگیں تو اس صورت میں وہ اہل فکر و دانش کے مشورے سے بھاؤ مقرر کرے۔)

مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے قاضی صاحب ممدوح کی ایک تصنیف ''اصول فقہ'' کے حوالے سے ایک فارسی عبارت تحریر کی ہے' جس کا ترجمہ یہ ہے:

صدر اول میں عوام کو کوئی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی تو مسائل سے آگاہ اور باخبر لوگوں کے پاس جاتے' ان سے فتویٰ پوچھتے اور جو کچھ وہ بتاتے اس پر عمل کر لیتے۔ انھوں نے اپنے آپ پر یہ پابندی نہیں عائد کی تھی کہ فلاں فلاں حضرات ہی سے فتویٰ پوچھیں گے۔ ان کے علاوہ اور کسی سے نہیں پوچھیں گے' جس سے مناسب سمجھتے مسئلہ پوچھ لیتے[3]۔

---

[1] مالابدمنہ ص ۸۷

[2] مالابدمنہ ص ۸۷۔

[3] تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۲۱۵

وصیت:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسی (۸۰) سال کی عمر میں اپنی اولاد اور احباب کے لیے ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا اور تاکید کی کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ:

در تجہیز و تکفین و غسل و دفن رعایت سنت کنند و دو چادر زرائی کہ حضرت ایشاں شہید رضی اللہ عنہ عنایت فرمودہ بودند دراں تکفین نمایند، و عمامہ خلاف سنت است ضرور نیست، و نماز جنازہ بجماعت کثیر و امام صالح مثل حافظ محمد علی یا حکیم سکھوا، یا حافظ پیر محمد بجا آرند، و بعد تکبیر اولی سورہ فاتحہ ہم خوانند، و بعد مردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم و چہلم و ششماہی و برسی ہیچ نکنند کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ از سہ روز ماتم کردن جائز نہ داشتہ اند، حرام ساختہ اند، واز گریہ وزاری زناں رامنع بلیغ نمایند، در حالت حیات خود فقیر "ازیں چیزہا راضی نہ بود و با اختیار خود کردن نہ دادہ ❶۔

(میری) تجہیز و تکفین اور غسل و دفن میں طریقۂ سنت کو ملحوظ رکھیں، جو دو چادریں حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید نے عنایت فرمائیں تھیں، انہی میں دفن کریں۔ میت کے سر پر عمامہ باندھا خلاف سنت ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ نماز جنازہ میں کثرت سے لوگ شریک ہوں اور امام صالح جیسے حافظ محمد علی یا حکیم سکھوا یا حافظ پیر محمد جنازہ پڑھائیں۔ تکبیر اولیٰ کے بعد سورہ فاتحہ پڑھیں۔ دنیا کی جن رسموں کا رواج پڑ گیا ہے جیسے دسواں بیسواں چالیسواں ششماہی اور برسی، یہ میری وفات کے بعد بالکل نہ کریں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے زیادہ ماتم کرنے کو جائز نہیں ٹھہرایا، حرام قرار دیا ہے۔ عورتوں کو گریہ وزاری کرنے سے سختی کے ساتھ منع کریں۔ میں نے اپنی زندگی میں ان چیزوں کو کبھی پسند نہیں کیا اور جہاں تک میرا بس چلا، ان پر عمل نہیں ہونے دیا۔

قاضی صاحب ممدوح کو فقہ ائمہ اربعہ پر کامل تبحر حاصل تھا۔ کسی فقہ کی کوئی اہم چیز ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ وہ سب امور کو سامنے رکھ کر "احتیاط" پر عمل کرتے اور اسی کا لوگوں کو حکم دیتے۔

ان میں جو وسعت فکر و نظر اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے اور مختلف مسالک فقہ میں انھیں جو گہرائی اور عمق حاصل ہے، اس کی موٹی موٹی چار وجوہ ہیں:

اول: شاہ ولی اللہ دہلوی سے شرف تلمذ و صحبت

دوم: مرزا مظہر جان جاناں سے ارادت وعقیدت۔

سوم: کثرت مطالعہ اور حدیث وسنت سے شغف و محبت۔

چہارم: منصب قضا کی ذمہ داریاں۔ یہ منصب فہم و فراست کو جلا بخشتا، غور و فکر کے پیمانوں کو وسعت عطا کرتا اور قوت فیصلہ کی صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے۔

---

❶ کلمات طیبات ص ۱۵۴۔

وفات:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر غرۂ رجب ۱۲۲۵ھ/ اگست ۱۸۱۰ء کو پانی پت میں انتقال کیا❶۔

قاضی فضل اللہ:

قاضی فضل اللہ پانی پتی علوم مروجہ میں بہرۂ کامل رکھتے تھے۔ قاضی ثناء اللہ صاحب کے برادر کبیر تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے حلقہ طریقت سے منسلک اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ ور تھے۔ ہر آن ذکر و شغل میں مصروف اور متوجہ الی اللہ رہتے۔ اپنے برادر صغیر قاضی ثناء اللہ صاحب سے بہ درجہ غایت تعلق خاطر تھا۔ ان کی وفات کے بعد انتہائی اندوہ گین اور مغموم و محزون رہنے لگے تھے۔ فرمایا کرتے' میرے بھائی ثناء اللہ کی موت نے ہمیں حزن و ملال میں مبتلا کر دیا ہے۔

اولاد:

قاضی ثناء اللہ صاحب کے تین بیٹے تھے۔ قاضی احمد اللہ' قاضی صبغۃ اللہ اور قاضی دلیل اللہ! قاضی احمد اللہ نے علوم متداولہ اپنے والد ماجد اور دیگر علمائے عصر سے پڑھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے اصحاب ارادت میں سے تھے۔ اپنے عہد اور علاقے کے جید عالم اور نامور فقیہ تھے۔ نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ عالم جوانی ہی میں اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتے۔ معاملات دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قرآن مجید کے حافظ اور قرأت و تجوید کے ماہر تھے۔ کمالات ظاہری و باطنی کی دولت سے مالا مال تھے۔ علوم و فنون' للّٰہیت اور خشیت الٰہی میں اپنے والد کی مانند تھے۔ عین عالم جوانی میں ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء کو تیس برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت قاضی صاحب کو لائق بیٹے کی وفات سے نہایت صدمہ پہنچا' لیکن صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔

قاضی صبغۃ اللہ' قاضی ثناء اللہ کے فرزند دوم تھے۔ علم دین میں کامل تھے۔ حضرت مرزا جان جاناں کے حلقہ طریقت میں شامل تھے۔ یہ بھی عالم شباب میں سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

تیسرے بیٹے قاضی دلیل اللہ تھے' جو فقہ و اصول کے عالم اور علوم عقلیہ سے مناسبت رکھتے تھے۔ طریقت و سلوک میں مرزا مظہر جان جاناں سے فیض یافتہ تھے❷۔

❶ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حالات میں اوپر حوالے میں درج کی گئی کتابوں کے علاوہ یہ کتابیں بھی دیکھیے: تذکرہ علمائے ہند' ص ۳۸۔ خزینۃ الاصفیا' ج ۱ ص ۶۸۹۔ الیانع الجنی ص ۶۷۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۵' ۴۶۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱۲ تا ۱۱۴۔ حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۰۲ تا ۳۰۴ مظہر العلما' ص ۴۷' ۴۸۔ علم و عمل ج ۱ ص ۱۷۲' ۱۷۳۔

❷ قاضی صاحب کے بھائی اور بیٹوں کے لیے دیکھیے مقامات مظہری ص ۷۸' ۷۹۔

ج

۴۳-مولانا جان محمد لاہوری

برصغیر میں لاہور کو علم و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے علما میں جن بزرگوں نے تیرھویں صدی ہجری میں اپنے کمالات علمی کی وجہ سے شہرت پائی' ان میں مولانا جان محمد لاہوری کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ والد کا نام محمد غوث اور دادا کا ولی اللہ تھا۔ مولانا ممدوح ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا ابتدائی دور کن حالات میں گزرا' اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی؟ اخذ علم کے لیے کہاں کہاں کی خاک چھانی؟ کن بلاد و قصبات کا سفر کیا اور کس استاذ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ کن حضرات سے کسب فیض کے مواقع میسر آئے؟ یہ سب باتیں تاریخ کی تہوں میں دب گئی ہیں۔

سیالکوٹ کی سکونت ترک کر کے لاہور میں آ بسے تھے اور کشمیری بازار کی ایک مسجد (نور محمد ایمان والا) میں درس و خطابت میں مصروف ہو گئے تھے۔ بے حد مؤثر وعظ کہتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے مواعظ حسنہ سے متاثر ہو کر باقاعدہ صوم وصلوۃ کے پابند ہوئے۔ تاریخ لاہور کے مصنف رائے بہادر کنہیالال جو ان کے ہم عہد ہیں لکھتے ہیں:

واعظ شیریں بیان مولوی جان محمد لاہوری اپنے وعظ کی سحر بیانی سے قلوب و اذہان کو مسحور کر دیا کرتے تھے۔ آپ سکھوں کے عہد میں کشمیری بازار کی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں یہ ایک وسیع مسجد تھی' جس میں ہزاروں لوگ جمعے کا خطبہ سننے آتے تھے۔ ایک دفعہ جمعے کا وعظ سننے کے لیے مسجد کا متولی نور محمد ایمان والا بھی آیا۔ وعظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی دستار اور قیمتی کوٹ اتار کر مولوی صاحب کو پیش کیا اور نماز سے فارغ ہو کر ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی عظیم الشان حویلی میں لے گیا' اور اپنے اہل و عیال کو دوسرے مکان میں منتقل کر کے ساری حویلی مع ساز و سامان کے ان کے حوالے کر دی۔ مولوی جان محمد صاحب تاحین حیات اسی حویلی میں قیام پذیر رہے۔ بعد میں یہ حویلی ان کی اولاد کے نام منتقل ہو گئی[1]۔

مولانا جان محمد اپنے دور میں خطہ پنجاب کے مشہور مدرس اور ممتاز واعظ تھے۔ نامور فقیہ' جید عالم' معروف فاضل اور فروع و اصول پر حاوی تھے۔ صالح اور متقی بزرگ تھے۔ علوم وفنون کی نشر و اشاعت میں انھوں نے بہت خدمات انجام دیں۔ ان سے متعدد علما و فضلا نے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔ وہ عالم باعمل تھے۔ ہزاروں افراد نے ان کے فیض صحبت سے زہد و اتقا کی زندگی اختیار کی اور معصیت سے تائب ہوئے۔ جن

---

[1] تاریخ لاہور' ص ۴۷، ۱۸۹، ۱۹۰۔

حضرات نے ان سے استفادہ کیا' ان میں مولانا محمد عالم کھوڑوی' مولانا کرامت اللہ' مولانا غلام محمد ملتانی اور مولانا فخر الدین کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا جان محمد لاہوری جہاں بہت بڑے مبلغ و مدرس اور واعظ و مقرر تھے وہاں بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں' جن میں درج ذیل کتابوں کا ذکر کتب تذکرہ و رجال میں مرقوم ہے:

۱- زبدۃ التفاسیر والتذکیر: یہ کتاب وعظ و تذکیر کے سلسلے میں ایک اہم اور ضخیم کتاب ہے۔

۲- شرح قصیدہ بردہ: قصیدہ بردہ کی یہ ایک اچھی شرح ہے۔

۳- شرح قصیدہ امالی:

۴- رسالہ فی اثبات خلافت معاویہ: مولانا ممدوح شیعہ کے خلاف تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کتابیں تصنیف کیں' ان میں یہ رسالہ بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو صحیح ثابت کیا گیا ہے۔

۵- رسالہ در رد روافض: اس کا نام ''نور الابصار فی مناقب اصحاب'' ہے۔ فارسی میں ہے اور تردید شیعہ میں ہے۔ خلفائے راشدین کے حالات اس میں اچھے انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ذاکر حسین میں اور ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں محفوظ ہے۔

۶- معراج نامہ: اس میں واقعہ معراج بیان کیا گیا ہے۔

۷- رسالہ در عقائد: اس رسالے میں عقائد سے متعلق تفصیلات معرض تحریر میں لائی گئی ہیں۔

۸۔ رسالہ فی حرمتہ المتتن: اس رسالے میں تمباکو کی حرمت ثابت کی گئی ہے۔

۹۔ قواعد الاحکام فی شعائر الاسلام: حدائق الحنفیہ میں اس کا نام ''رسالہ عدم فرضیت جمعہ'' درج ہے اور صاحب نزہتہ الخواطر نے حدائق الحنفیہ کے حوالے سے اس کو ''رسالہ فی عدم فرضیۃ صلوۃ الجمعۃ فی ھذہ البلاد کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس میں مسلک احناف کے مطابق دیہات میں جمعے کی عدم فرضیت پر بحث کی ہے یا یہ ثابت کیا ہے کہ دور غلامی میں جمعے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے' حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں مصنف نے مختلف فقہی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو نماز جمعہ بہر حال قائم کرنی چاہیے' اس لیے کہ اس سے شعائر اسلامی قائم رہتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

مولانا جان محمد لاہوری نے ۷۵ سال عمر پائی' اور ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ (۵ نومبر ۱۸۵۱ء) کو اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھا۔ ''چراغ دین'' سے سال وفات نکلتا ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں ان کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام مولانا فیض محمد

تھا، جو علوم دینیہ کے ماہر تھے اور باپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ دوسرے مولانا محمد فضل تھے، جو باپ کے علمی جانشین ہوئے۔ علم طب میں بھی دست گاہ رکھتے تھے ❶۔

۴۴۔ سید جعفر علی نقوی

دیار ہند کے ان علمائے مشاہیر اور فقہائے عظام کی وسیع فہرست میں، جنھوں نے سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی زیر قیادت انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد میں سرگرمی سے حصہ لیا، مولانا سید جعفر علی نقوی کا اسم گرامی بھی مرقوم ہے۔ سید جعفر علی نقوی موضع "مجھوامیر" کے رہنے والے تھے، جو یوپی کے ضلع بستی میں نیپال کی ترائی میں واقع ہے۔ والد کا نام نامی سید قطب علی تھا۔

سید جعفر علی نقوی نے جن اساتذۂ کرام سے اخذ علم کیا، ان میں مولانا اسماعیل شہید کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اپنے دور کے جید علما میں گردانے گئے۔ مسند درس آراستہ کی اور تشنگان علوم کی کثیر جماعت کو مستفید فرمایا۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ جس زمانے میں برصغیر میں سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل دہلوی کی مساعی جہاد کا چرچا تھا، یہ حصول علم میں مشغول تھے۔ بعد میں تمام سرگرمیوں سے دست کش ہو کر جماعت مجاہدین میں شریک ہو گئے۔

سید جعفر علی کے والد سید قطب علی تھے جو اپنے علاقے کے اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ فضیلت علمی اور زہد وتقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ سید احمد بریلوی کے عقیدت مند تھے۔ سید صاحب حج سے واپس آئے تو سید قطب علی سترہ آدمیوں کو ساتھ لے کر رائے بریلی گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی سید حسن علی بھی ساتھ تھے۔ بڑے بیٹے سید جعفر علی ان دنوں لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے۔ سید صاحب نے ہجرت کا قصد فرمایا تو سید قطب علی بھی تیار ہو گئے لیکن ضعف اور کبرسنی کی وجہ سے سید صاحب نے ان کو روک دیا اور دعا کے لیے درخواست کی۔ سید صاحب سے اس درجے محبت وعقیدت تھی کہ ان کی شہادت کی اطلاع پا کر بہت روئے۔ ان کے بیٹے (صاحب ترجمہ) سید جعفر علی نقوی بھی شریک جہاد تھے۔ بار بار کہتے تھے، کاش! میرا بیٹا جعفر علی مر جاتا اور سید صاحب زندہ رہتے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ اس سرزمین میں سید صاحب کے ہاتھوں غلبہ اسلام دیکھنے کی آرزو تھی، وہ زندہ نہ رہے تو ہمیں بھی موت کا کوئی غم نہیں۔ سید جعفر علی نے یہ تمام واقعات اپنی کتاب منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء ❷ میں بیان کیے ہیں۔

---

❶ تاریخ لاہور، ص ۴۷۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۵، ۴۷۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۰۔ تذکرہ علمائے پنجاب، ج ۱ ص ۱۴۳ تا ۱۴۵

❷ سید جعفر علی نقوی کی یہ ایک قلمی کتاب ہے جو سید احمد شہید کے حالات اور بالاکوٹ کے میدان جہاد کے واقعات کے سلسلے میں مستند دستاویز ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب ۶۴۸ ورق پر محیط ہے۔

سید قطب علی نے ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) کے لگ بھگ وفات پائی۔ نہایت متبع سنت تھے۔ وفات سے پہلے اپنے متعلقین کو جو وصیتیں کیں' ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ہمیشہ توحید پر قائم رہو اور اتباع سنت میں کبھی مداہنت نہ کرو۔

۲۔ میرے بعد کسی بدعت کا ارتکاب نہ کیا جائے' ورنہ قیامت کے دن تم سے مواخذہ کروں گا۔

۳۔ میری موت پر نوحہ نہ کیا جائے۔ نہ سوم یا کوئی اور رسم کی جائے۔

سید جعفر علی اسی بلند بخت باپ کے سعادت مند بیٹے تھے۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں مجھوا میر ضلع بستی (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بھی استفادہ کیا❶۔ لکھنؤ جا کر علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ سید احمد بریلوی اپنے رفقا کی کثیر تعداد کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد پار گئے تو سید جعفر علی جذبہ جہاد نے بھی جوش مارا' اور انتیس رفقا کے ساتھ وطن سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے انھوں نے سید احمد بریلوی کو دیکھا تو نہیں تھا' البتہ ان کے بارے میں سنا بہت کچھ تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان سے سرحد پار کا سفر نہایت تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وطن سے دہلی پہنچے۔ وہاں حضرت شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب (دونوں بھائیوں) سے ملاقات ہوئی' انھوں نے مجاہدین کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں❷۔ کئی روز دہلی میں مقیم رہے اور مجاہدین کے لیے کچھ سامان لے کر اگلی منزل کو روانہ ہوئے۔ سونی پت اور پانی پت سے ہوتے ہوئے انبالہ پہنچے۔ ان کے ایک رفیق سفر کا نام منصور خاں تھا۔

انبالہ پہنچ کر وہاں کے ایک رئیس شمس الدین سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا مقصد اگلے سفر کے لیے محفوظ اور مناسب راستہ دریافت کرنا تھا۔ اس وقت شمس الدین شطرنج کھیل رہا تھا۔ سید جعفر علی کی ظاہری حالت دیکھ کر وہ سمجھا کہ کوئی ان پڑھ آدمی ہے۔ سید صاحب نے کہا ''شطرنج کھیلنا جائز نہیں۔'' شمس الدین نے جواب دیا۔ ''امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔'' سید صاحب نے فرمایا۔ ''چاروں ائمہ فقہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام شافعی پہلے جواز کے قائل تھے' پھر اس سے رجوع کر لیا تھا۔'' شمس الدین نے سوال کیا۔ ''تم حنفی ہو یا شافعی''؟

فرمایا۔ ''آپ کو اس سے کیا غرض' میں نے صحیح مسئلہ بیان کر دیا ہے۔'' شمس الدین خفگی سے کہا۔ ''میرے مکان سے نکل جاؤ۔'' کہا۔ ''بہت اچھا' نکل جاتا ہوں' میں نے آپ کی خیر خواہی سے ایک شرعی مسئلہ بتایا ہے❸۔''

اس کے بعد سید جعفر علی مکان سے باہر نکل گئے۔ دوسرے دن مسجد میں شمس الدین سے دوبارہ ملاقات

❶ نزہتہ الخواطر' ج ۷' ص ۱۱۹

❷ منظورۃ السعداء' ورق ۶۳۱

❸ ایضاً۔

ہوئی۔ ان کا رفیق سفر منصور خاں بھی موجود تھا جو بہت وجیہ اور بارعب آدمی تھا۔ اس نے شمس الدین سے مخاطب ہو کر کہا: ''سید جعفر علی سے بات کیجیے۔'' وہ ان کی طرف متوجہ ہوا' اپنے پہلے طرزِ عمل کی معافی مانگی۔ اگلے سفر کے لیے بات ہوئی تو کافی غور کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ پٹیالہ' مالیر کوٹلہ' جگراؤں اور ممدوٹ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے قافلے کے ساتھ اسی راستے پر گام فرسا ہوئے ❶۔

ممدوٹ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس کا والی اس زمانے میں نواب قطب الدین خاں تھا۔ یہاں پہنچے تو نواب کے بھائی شمس الدین خاں کی معرفت اس سے دریائے ستلج عبور کرنے میں مدد کی درخواست کی۔ تیسرے دن نواب سے ملاقات ہوئی' اس نے خود تو کوئی جواب نہیں دیا' خاموش رہا' البتہ بعض لوگوں نے بتایا کہ نواب کو سکھوں کی حکومت سے خطرہ ہے۔ آپ کی مدد کرے گا تو سکھ ناراض ہو جائیں گے اور اس کے لیے ایک مصیبت پیدا ہو جائے گی ❷۔

بہر حال نواب قطب الدین خاں والی ممدوٹ نے ان کی کوئی مدد نہیں کی' اور وہ بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک مقام ''حاصل ساڈو'' پڑا' جو موجودہ جغرافیائی حساب سے ہیڈ سلیمان کی کے قریب ہے۔ وہاں ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب' ہندوستان) کے موضع ''لکھوکے'' کے نامور فقیہ اور ممتاز عالم حافظ بارک اللہ لکھوی سے ملاقات ہوئی' جن کو نواب قطب الدین خان نے ریاست بدر کر دیا تھا' اور وہ ریاست بہاول پور کے موضع ''حاصل ساڈو'' میں جا بیٹھے تھے ❸۔

حافظ بارک اللہ کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ سید جعفر علی نقوی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں اور انھیں ایک مشفق بزرگ قرار دیتے ہیں۔

ممدوٹ سے چل کر سید جعفر علی بہاول پور پہنچے۔ وہاں مولانا عبدالحی بڑھانوی کے ایک شاگرد مولانا محمد کامل مقیم تھے' جن کو ریاست کی حکومت کی طرف سے ہندوستانی علما سے محض اس بنا پر ملاقات کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ حیات انبیا کے مسئلے میں وہ بہاول پور کے عام علما سے اختلاف رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ انبیا وصلحا یقیناً اللہ کے نزدیک زندہ ہیں' لیکن ان کے لیے حیات دنیا ثابت کرنا محال ہے۔ سید جعفر علی کی اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کے بیٹے مولانا محمد اکمل سے بھی ملاقات ہوئی ❹۔

یہ واقعات سید جعفر علی نقوی کی کتاب ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' میں مرقوم ہیں۔ اس کتاب میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بہاول پور کے ہر مقام میں گیارہویں اور دیگر بدعات کا دور دورہ تھا' لیکن

---

❶ منظورۃ السعدا: ۶۳۱۔

❷ منظورۃ السعدا' ورق ۶۳۳' ۶۳۴۔

❸ ایضاً ورق ۶۳۴ الف۔

❹ ایضاً ورق ۶۳۴ ب۔

پڑھے لکھے لوگ مولانا محمد کامل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ حالانکہ وہ ان چیزوں کے خلاف تھے ❶۔

بہاول پور میں اس زمانے میں شعائر اسلامی کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ بہاول پور سے آگے ''نور پور'' میں ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی' جس کی داڑھی مونچھیں ریاست کے وزیر نے اس لیے منڈوادی تھیں کہ وہ اتباع سنت پر زور دیتا تھا ❷۔

بہاول پور سے روانہ ہو کر مجاہدین کا یہ قافلہ تونسہ کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ان کی ملاقات شیخ خواجہ سلیمان تونسوی سے ہوئی۔ خواجہ صاحب سے آگے کے سفر کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے راستے کی مشکلات بیان کیں اور قرآن کی یہ آیت پڑھی: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ❸۔

سید جعفر علی فرماتے ہیں' میں نے ان سے کہا۔ میں اس آیت کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ یہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے متعلق ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے ❹۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کا انتیس افراد پر مشتمل یہ قافلہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا اور پر پیچ راستوں سے گزرتا ہوا' ۹ رمضان المبارک ۱۲۴۵ھ (۴ مارچ ۱۸۳۰ء) کو پنجتار پہنچا۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید اس وقت امب کے مقام میں قیام پذیر تھے۔ پنجتار سے چل کر یہ لوگ ستھانہ پہنچے۔ اس دن امیر المجاہدین بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ روزہ افطار کیا۔ مسجد میں گئے۔ مغرب کی نماز امیر المجاہدین سید احمد بریلوی کی اقتدا میں ادا کی اور پہلی مرتبہ ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

وہاں پہنچ کر جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہو گئے کہ اتنے طویل اور دشوار گزار سفر کا اصل اور بنیادی مقصد یہی تھا۔ سوا سال وہاں قیام رہا۔

---

❶ منظورۃ السعداء۔ ورق ۶۳۴ الف' ب

❷ ایضاً ورق ۶۳۴ ب

❸ یہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۵ ہے اور پوری آیت اس طرح ہے:
وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔
یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

خواجہ سلیمان تونسوی مرحوم نے خدا جانے یہ آیت سفر جہاد سے رک جانے کے سلسلے میں کیوں پڑھی' حالانکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں مال خرچ کرو' اس کے لیے کوشش کرو' اور جہاد کو چھوڑ کر گھر میں نہ بیٹھ رہو' ترک جہاد سے تم میں ضعف اور جبن آجائے گا' تم پر دشمن غلبہ پالیں گے اور یہ صورت حال تمھاری ہلاکت کا باعث بن جائے گی۔ یعنی جہاد کو چھوڑ دینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دینا ہے' نہ کہ جہاد میں جانا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۸' ۲۲۹)

❹ منظورۃ السعداء' ورق ۶۳۷ الف۔

۲۴ ذی قعد ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ کے مقام میں سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل دہلوی کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد مولانا ولی محمد پھلتی کو امیر المجاہدین بنایا گیا' اس لیے کہ جماعت مجاہدین میں اب انہی کو سب سے زیادہ معزز اور بزرگ مانا جاتا تھا۔ سید جعفر علی ان سے اجازت لے کر ۲۷ر ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۸ جون ۱۸۳۱ء) کو' واقعہ بالاکوٹ سے ایک مہینہ تین دن بعد وہاں سے واپس وطن روانہ ہوئے۔ مجاہدین میں سے چند اور احباب بھی ان کے ہمراہ تھے۔

مراجعت وطن کے وقت سید جعفر علی نے مولانا ولی محمد پھلتی کی اجازت سے سامان سفر میں ایک قلم دان' ایک قینچی' سید احمد شہید کے چند خطوط جن پر ان کے دستخط اور مہر ثبت تھیں اور مولانا اسماعیل شہید کی چند تحریریں شامل کر لی تھیں۔ یہ سب چیزیں راستے میں چوری ہو گئیں۔ تلاش بسیار اور کوشش کے باوجود ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہ ہو سکی ❶۔

واپسی پر وہ راولپنڈی' رہتاس' کھاریاں' لاہور' امرت سر' جالندھر' لدھیانہ اور پھلور سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اثنائے سفر میں جو واقعات پیش آئے' وہ انھوں نے اپنی کتاب منظورۃ السعداء میں بیان کیے ہیں۔ ان میں بعض واقعات بہ ظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں' لیکن درحقیقت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

کھاریاں ضلع گجرات (پنجاب) پہنچے تو بخار میں مبتلا ہو گئے اور بخار نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ سرسام ہو گیا۔ وہاں کے ایک رئیس نے نہایت توجہ اور اہتمام سے علاج کرایا۔ بہت خدمت کی اور صحت یاب ہو گئے ❷۔

رقم فرماتے ہیں کہ پنجاب کی سکھ حکومت میں مسلمان بہت زبوں حالی کا شکار تھے۔ اقامت کی طرح "بہ خفض صوت" (آہستہ آواز میں) اذان کہتے تھے۔ ان کی آزردگی اور خستگی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے کہ اس ملک سے جلد باہر لے جائے ❸۔

جالندھر کے دوران قیام کا یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ میں جس مسجد میں مقیم تھا' ایک رات عشا کے بعد وہاں سویا ہوا تھا کہ محسوس ہوا' کوئی آدمی میرے بدن کو چھو رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک شخص میرے پاؤں داب رہا ہے۔ میں اسے دیکھ کر متعجب ہوا' اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ روپے پیش کیے۔ میں نے پوچھا' "یہ کیوں؟" اس نے بتایا کہ "میں صنعت و حرفت کرتا ہوں۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ بیوی بچے نہیں ہیں' جو کچھ کماتا ہوں' اس میں سے خرچ کرنے کے بعد اچھی خاصی رقم بچ جاتی ہے۔ وہ رقم مسافروں پر صرف کر دیتا ہوں ❹۔"

---

❶ منظورۃ السعداء، ورق ۶۰۱ الف، ب۔

❷ منظورۃ السعداء، ورق ۶۰۴ ب۔

❸ ایضاً ورق ۶۰۵ الف۔

❹ منظورۃ السعداء، ورق ۶۰۵ ب۔

امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور پھلور کے بعض علاقوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں اذان بھی برملا کہی جاتی تھی اور گئو کشی بھی عام ہوتی تھی۔

لدھیانہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ جس مسجد میں قیام کیا، اس مسجد کا امام مجاہدین کو کافر قرار دیتا تھا۔ میری شکل وصورت اور وضع قطع دیکھ کر برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کو سید احمد شہید اور معرکہ بالاکوٹ کے بعض چشم دید واقعات بتائے۔ ایک شخص کا نام ملا شکور تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا ''نمک حرام ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ ہو کر ہمارا حق دلاؤ۔'' سید جعفر علی لکھتے ہیں: میں نے اس کو جواب دیا۔ ''ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے گئے تھے، کسی بادشاہ یا مدعی حکومت کے حق کے لیے نہیں گئے تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید کا کسی نے حق نہیں غصب کیا تھا۔'' ملا شکور نے کہا ''یہ تو بہت اونچا مرتبہ ہے، مگر حق دار کا حق دلانا بھی تو باعث اجر ہے[1]۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ لدھیانہ کے معززین ان سے بہت تعظیم سے پیش آنے لگے۔ ان کی باتیں سن کر لوگوں نے کہا۔ ''یہ تو عالم آدمی ہیں۔'' وہ احترام سے مصافحہ کرتے۔ اچھی جگہ بٹھاتے اور عمدہ کھانا کھلاتے۔ قسم قسم کے آم پیش کرتے۔ ان لوگوں نے سید جعفر علی کو سات دن وہاں ٹھہرائے رکھا اور بہت عزت و اکرام کا برتاؤ کیا[2]۔

لدھیانہ سے سید جعفر علی انبالہ، کرنال اور پانی پت ہوتے ہوئے دہلی پہنچے اور مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ سب نے جہاد کے واقعات اور میدان جنگ کے حالات پوچھے۔ سید احمد شہید، مولانا اسماعیل اور ان کے رفقا کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ اور پھر اپنے وطن ''مجھوامیر'' پہنچے[3]۔

جہاد بالاکوٹ سے واپسی کے بعد سید جعفر علی نقوی نے دو اہم خدمات انجام دیں۔

ایک یہ کہ اپنے گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر بمقام ''کرہی'' ایک دینی مدرسہ ''ہدایت المسلمین'' کے نام سے قائم کیا۔ اس مدرسے میں انھوں نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بے شمار علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ یہ مدرستہ اب تک قائم ہے اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر جاری ہے۔

دوسرے یہ کہ سید احمد شہید اور جماعت مجاہدین کے حالات میں ایک مفصل کتاب فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نام ''تاریخ احمدی ہے۔'' یہ کتاب مستند قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن افسوس ہے، ابھی تک چھپی نہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

[1] منظورۃ السعداء، ورق ۶۰۱ الف تا ۶۰۸ ب۔

[2] منظورۃ السعداء، ورق ۶۰۸ ب۔

[3] منظورۃ السعداء نیز دیکھیے جماعت مجاہدین ص ۱۹۳ تا ۲۱۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱۹

سید جعفر علی نقوی نے رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (دسمبر ۱۸۷۱ء) کو اپنے گاؤں (مجھوامیر) میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء ہے۔ اس حساب سے انھوں نے ستر (۷۰) برس عمر پائی۔

وفات سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک شان دار جگہ ہے جہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' سید احمد شہید بریلوی' شاہ اسماعیل شہید دہلوی اور کچھ دوسرے حضرات کرسیوں پر تشریف فرما ہیں۔ ایک کرسی خالی ہے۔ کسی نے پوچھا۔ "یہ کرسی کس کے لیے ہے"؟ جواب ملا' جعفر علی نقوی کے لیے"!

سید جعفر علی کی صرف ایک صاحب زادی تھیں' جن کا نام بی بی زینب تھا۔

۴۵- سید جلال الدین احمد بنارسی

سرزمین بنارس میں جن علمائے کرام نے تیرھویں صدی ہجری میں جنم لیا' ان میں مولانا سید جلال الدین احمد بنارسی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کا مختصر شجرہ نسب یہ ہے: جلال الدین بن عبدالاعلیٰ بن کریم اللہ بن ظہور محمد ہاشمی جعفری بنارسی۔!

مولانا ممدوح ۱۲۱۹ھ یا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۴ء یا ۱۸۰۶ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی مولانا عبدالاعلیٰ بنارسی (متوفی ۱۲۷۴ھ) مولانا احمد اللہ انامی بنارسی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی سے تحصیل علم کی۔ اس زمانے میں درس حدیث میں مولانا عبدالحق نیوتنی بنارسی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ/ ۲۷ جون ۱۸۶۰ء) کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا اور سند حدیث حاصل کی۔ پھر استاد حدیث سے اس درجے متاثر ہوئے کہ ترک تقلید اور نصوص کتاب و سنت پر عمل میں ان ہی کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ علوم متداولہ اور فنون متعارفہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ تھے۔ حامل حدیث اور متبع سنت نبوی ﷺ تھے۔ نہایت قانع اور متقی تھے۔ ان کی قوت حافظہ اس قدر تیز تھی کہ رمضان المبارک میں قرآن مجید کا ایک پارہ اسی دن یاد کر کے رات کو نماز تراویح میں سنا دیتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے خوب صورت الفاظ میں ان کے اوصاف بوقلموں کا ذکر کیا ہے۔

پہلے غازی پور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد غازی پور سے بنارس کالج میں فرائض تدریس ادا کرنے پر مامور ہوئے۔ عمر بھر وہیں رہے اور تمام زندگی شائقین کو مختلف علوم و فنون سے بہرہ ور کرتے رہے۔ بنارس کالج کے زمانۂ معلمی میں بہت سے انگریزوں نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ وائسرائے ہندان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتا تھا۔

نصوص کتاب و سنت پر خود بھی عمل پیرا تھے اور لوگوں کو بھی یہی تلقین فرماتے تھے۔ اسلوب تبلیغ انتہائی موثر اور دھیما تھا۔ تواضع' انکسار اور نرمی گفتار ان کے خاص اوصاف تھے۔ سختی اور شدت سے ہمیشہ گریزاں رہے۔

مولانا خرم علی بلہوری جب مسلک اہل حدیث سے وابستہ نہیں ہوئے تھے امام کے پیچھے نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی شدید مخالفت کرتے تھے' اس زمانے میں مولانا جلال الدین احمد بنارسی سے اس مسئلے پر ان کا مناظرہ بھی ہوا تھا' اور علمی حلقوں میں اس مناظرے کی بڑی شہرت ہوئی تھی۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ نہج تحریر مدلل اور زوردار تھا۔ ان کی چند تصنیفات یہ ہیں:

۱- فاتحۃ الصواب فی قراۃ فاتحۃ الکتاب: یہ کتاب فارسی میں ہے۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں تصنیف کی۔

۲- زبدۃ الالباب: یہ اردو زبان میں ''فاتحۃ الصواب فی قراۃ فاتحۃ الکتاب'' کا خلاصہ ہے۔

۳- زبدۃ القوانین: یہ کتاب صرف ونحو کے قواعد واصول سے متعلق ہے۔

۴- انبساط عبارۃ الکافیہ بالبیان الشافیہ: یہ علم نحو کی چوٹی کی کتاب ''کافیہ'' کی شرح ہے' افسوس ہے نا تمام رہی۔

۵- قواعد اردو: اردو زبان کے بعض قواعد کے بارے میں ہے' لیکن مکمل اسے بھی نہیں کر پائے۔

۶- ایک کتاب قواعد لغت سے متعلق ہے۔

۷- فرہنگ اخوان الصفا۔

مولانا سید جلال الدین احمد ہاشمی جعفری بنارسی نے اٹھاون سال عمر پائی اور ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے [1]۔

۴۶- منشی جمال الدین صدیقی دہلوی

منشی جمال الدین صدیقی تیرھویں صدی ہجری کے عالم وفاضل اور صاحب خیر وصلاح بزرگ تھے۔ والد کا نام وحید الدین' دادا کا محی الدین اور پڑدادا کا شیخ حسام الدین تھا۔ سلسلہ نسب فقیہ نامدار حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس خاندان کے تمام ارکان' اصحاب علم وفضیلت تھے۔

شیخ حسام الدین کے دادا شیخ جلال الدین تھے' جو اپنے عصر کے علمائے کرام میں خاص شہرت وناموری کے مالک تھے۔ وہ یوپی کے ضلع سہارن پور میں ...، مقام ''بوریہ'' میں اقامت پذیر تھے۔ وہاں سکھوں کا دست ستم دراز ہوا تو ترک وطن پر مجبور ہوئے اور دہلی سے بہ جانب شمال تیس میل کے فاصلے پر قصبہ ''کوتانہ'' میں بود وباش اختیار کر لی۔

کوتانہ ہی میں ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں منشی جمال الدین پیدا ہوئے' جنھوں نے فضل وعرفان کے ماحول میں پرورش پائی۔ سن بلوغت کو پہنچے تو حصول علم کی غرض سے دہلی کا قصد کیا۔ دہلی میں منشی جمال الدین کا ایک

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۰۔ تذکرہ مشائخ بنارس، ص ۶۶، ۶۷۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۴۵، ۳۴۶۔ اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۸۔

معزز گھرانے کی خاتون سے رابطہ پیدا ہو گیا' جو ان کی والدہ سے معرفت و شناسائی رکھتی تھیں۔ اس خاتون نے ان کا تیس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔

دہلی کو اس زمانے میں مہد فضل و کمال اور گہوارہ علم و عرفان کا درجہ حاصل تھا۔ علما کی کثیر جماعت اس شہر میں فروکش تھی اور ہر عالم بوقلموں اوصاف کا حامل تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی' شاہ عبدالقادر دہلوی' مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی' شیخ محمد یعقوب دہلوی' مولانا مملوک علی نانوتوی' شاہ غلام علی علوی' مولانا محمد آفاق نقشبندی' اور دیگر متعدد حضرات کا سلسلہ علم و فیض جاری تھا' وہ ان سب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی نہ کسی طریقے سے سب سے استفادہ کیا۔ ابتدا میں تحصیل علم کے لیے مولانا مملوک علی کے حلقہ تدریس میں شریک ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجالس وعظ وارشاد بھی شہر کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتی تھیں' ان میں بھی باقاعدہ شرکت کرتے اور شاہ صاحب سے مستفید ہوتے رہے۔

منشی ممدوح کا یہ عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے' وہاں مختلف لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ شطرنج کی محفلیں جمنے لگیں اور تعلیم و تعلم اور مجالس وعظ میں شرکت کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ اتفاق سے وہ خاتون جو تیس روپے ماہانہ ادا کرتی تھیں' انتقال کر گئیں اور پھر خود بھی بیمار پڑ گئے۔ یاران محفل نے جب ان کو مفلوک الحال اور علیل بلکہ قابل امداد دیکھا تو کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور یہ تنہا اور بے سہارا رہ گئے۔

ادھر شاہ عبدالعزیز کا یہ حال تھا کہ ان کو ہر مجلس وعظ میں دیکھتے اور ان کی باقاعدہ حاضری اور دلچسپی سے خوش ہوتے تھے' اور اسی وجہ سے ان سے بہت شناسا بلکہ مانوس ہو گئے تھے۔ اب دفعتہً ان کو غیر حاضر پایا تو پریشان ہوئے اور ان کی تلاش شروع ہوئی۔ خبر علالت سنی تو عیادت کے لیے گھر پر گئے' تسلی دی' دعا فرمائی اور ضروریات کے لیے پوچھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ شاہ صاحب کے اس بے پناہ ایثار اور دل جوئی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ شطرنج وغیرہ کا سلسلہ ختم کیا۔ از سر نو تحصیل علم میں مصروف ہوئے اور آئندہ کے لیے پابند سنت رہنے کا تہیہ کیا۔ اوپر جن علمائے عظام کا ذکر کیا گیا ہے' ان سے مستفیض ہوئے اور تکمیل تعلیم کی۔

منشی جمال الدین صدیقی کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا اور اس زمانے کی دہلی میں شعرا کی ایک بڑی جماعت موجود تھی' ان میں سے حکیم مومن خاں مومن (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) محمد ابراہیم ذوق (متوفی ۲۳ صفر ۱۲۷۱ھ/۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء) اور امام بخش صہبائی (شہید ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) سے ان کے مراسم پیدا ہوئے' اور ان کی بزم شعر و سخن میں شریک رہے۔ اس عہد کے دیگر شعرائے دہلی اور سخنوران لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی ان کو شرکت کے مواقع میسر آئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد تلاش معاش کے سلسلے میں اندور پہنچے' اور ریزیڈنٹ اندور کے دفتر میں

پندرہ یا بیس روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بھوپال کا ارادہ کیا جس کی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے شہرت تھی۔ اس وقت بھوپال کے منصب حکومت پر نواب سکندر بیگم فائز تھیں۔ بھوپال میں ایک نامور شخصیت مولوی اسلام اللہ خاں کی تھی، ان کے نام حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا سفارشی خط لیا۔ خط لے کر بھوپال آئے۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی۔ مولوی اسلام اللہ خاں کو خط پیش کیا تو انھوں نے اپنی ایک عرضی کے ساتھ ان کو نواب قدسیہ بیگم کے پاس بھیج دیا۔ قدسیہ بیگم نے ان کو غیر ملکی قرار دے کر ریاست میں کوئی ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔ مولوی اسلام اللہ خاں کی خدمت میں دوبارہ آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک دوسری عرض داشت کے ساتھ بھوپال کی رئیسہ معظّمہ نواب سکندر بیگم کے دربار میں بھیجا اور اپنی عرض داشت میں یہ فقرہ بھی لکھا کہ "جمال الدین ایک ایسی تلوار ہے جو بھوپال سے لندن تک کاٹ کرے گی۔" اس فقرے سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئیں اور ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ ابتدا میں وہ ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے تھے، لیکن اپنی حسن مساعی اور اعلیٰ اوصاف کی وجہ سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں لالہ خوشونت رائے کے انتقال کے بعد نائب اول کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے۔

منشی جمال الدین صدیقی نہایت دیانت دار، باہمت، صاحب عزم اور شریف الطبع آدمی تھے۔ بہت بڑے منتظم اور مدبر بھی تھے۔ بہ درجہ غایت نیک اور متقی تھے۔ ان کے اوصاف بوقلموں سے متاثر ہو کر ملکہ بھوپال سکندر بیگم نے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں ان سے نکاح ثانی کر لیا اور انھیں ریاست کا مدار المہام مقرر کیا۔ ریاست کے تمام اہم معاملات کو وہ طے کرنے کے مجاز تھے۔ خان بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور تمغہ طلائی عطا کیا گیا۔ روس اور ترکی کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے سلطان ترکی عبدالحمید خاں غازی کی خدمت میں کافی رقم ارسال کی تھی۔ اس بنا پر سلطان ممدوح نے ان کو تمغہ مجیدی درجہ سوم سے نوازا۔

اپنے زمانے اور علاقے کے ذی شان بزرگ تھے اور نامور علما میں گردانے جاتے تھے۔ متحمل مزاج، سخی و جواد، متواضع، کثیر العبادت، عارف و عابد اور صاحب صدق و خلوص تھے۔ یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور مسکینوں کی بے حد مالی مدد کرتے تھے۔ باجماعت نماز ادا کرتے اور زیادہ وقت مساجد میں مصروف عبادت رہتے۔ ان کے دروازے پر کوئی دربان اور حاجب نہ تھا۔ ہر شخص ہر وقت ان کے سامنے اپنی حاجت بیان کر سکتا تھا۔ بہت خوش شکل اور خوب سیرت تھے۔

ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اتنے بڑے اعزاز کے مالک ہونے کے باوجود طلبا کو باقاعدہ قرآن، حدیث اور کتب فقہ کا درس دیتے تھے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور کتاب و سنت کی نشر و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید خرید کر مستحقین میں تقسیم کرتے تا کہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں اور اس کے احکام و اوامر سے بہرہ مند ہوں۔ قرآن مجید کے فارسی اور ترکی تراجم و تفاسیر خطیر رقم خرچ کر کے شائع کرانے اور ترکستان اور افغانستان میں کثیر تعداد میں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا۔

شیخ علی بن احمد مہائمی (متوفی ۲۸ جمادی الاخری ۸۳۵/۲۔ اپریل ۱۴۳۲ء) کی تفسیر رحمانی چار جلدوں میں اپنے خرچ پر مصر سے شائع کرائی۔ ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ مع ان کی ایک دوسری تصنیف ازالہ الخفاء عن خلافتہ الخلفاء کے مطبع صدیقی بریلی سے طبع کرائی۔ علاوہ ازیں اپنے نفقہ خاص سے بہت سی اہم کتابیں قاہرہ میں چھپوائیں اور مستحقین علم میں تقسیم کیں۔

مدارالمہام منشی جمال الدین خان بہادر مصنف بھی تھے۔ ''کوکب دری'' کے نام سے قرآن مجید کا فرہنگ لکھا اور اس میں بڑی محنت کی۔ ان کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ بھوپال میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں اور بہت سے اسلامی و دینی مدرسے قائم کیے۔ ان میں جو خطیب' امام' مؤذن' اور مدرس مقرر کیے' ان کی تنخواہیں خود ادا کرتے اور طلبائے علم کو معقول وظیفے عنایت فرماتے۔ مسافروں کے لیے شہر میں سرائیں بنوائیں۔ تعلیم و تدریس میں خاص طور سے دلچسپی لیتے اور خود بھی طلبا کو مختلف علوم کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ ان کے عہد مدارالمہامی میں بھوپال کو ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی ریاست کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی' اور یہ سب ان کی اور ان کے بعد نواب سید صدیق حسن خاں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ ان آثار حسنہ کی جھلک اب تک خطہ بھوپال میں باقی ہے اور لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے جو خدمت دین' اشاعت اسلام اور عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا وظیفۂ حیات قرار دے لیتے ہیں۔

رمضان المبارک کا مہینا آتا تو ان کے خیرات و حسنات کا دروازہ اور کھل جاتا اور صدقات کی تقسیم اور افطاریوں کا سلسلہ وسیع تر ہو جاتا۔

مدارالمہام منشی جمال الدین صدیقی نے دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ پہلا حج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کیا۔ اس حج میں ان کی صاحب زادی ذکیہ بیگم (جو بعد میں حضرت نواب سید صدیق حسن خاں کے عقد میں آئیں) ان کے ساتھ تھیں۔ دوسرا حج ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں بھوپال کی رئیسہ معظمہ نواب سکندر بیگم صاحبہ کی معیت میں کیا۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دو صاحب زادیاں تھیں۔ ایک کا نام رجبی بیگم تھا اور دوسری کا ذکیہ بیگم۔ ذکیہ بیگم قضائے الٰہی سے بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کا نکاح ثانی انھوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ (۸/ مارچ ۱۸۶۱ء) میں نواب سید صدیق حسن خاں سے کر دیا تھا۔ نکاح حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد اور داماد مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) نے پڑھایا تھا۔

غرض منشی جمال الدین صدیقی اپنے عہد کے عالم و فاضل اور فقیہ عمدہ خصال تھے۔ ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۹۔ دسمبر ۱۸۸۱ء) کو شب کے گیارہ بجے فوت ہوئے۔ نماز جنازہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں نے پڑھائی اور کثیر جماعت نے اس میں شرکت کی۔ اس کے بعد بہت بڑی تعداد میں اور لوگ بھی آ گئے' تو دوسری مرتبہ شیخ

حسین عرب نے جنازہ پڑھایا۔ لیکن لوگوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی اور بار بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اس طرح گیارہ مرتبہ جنازہ پڑھا گیا۔ اللهم اغفرله وارحمه و عافه واعف عنه وادخله الجنة ❶۔

۴۷۔ مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی

برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ تین سو سال سے لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی کو علم و فضل کی دنیا میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ اور وعظ وارشاد میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ ان کی متنوع خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر میدان میں ان کی حیثیت علمی کا اہل علم نے اعتراف کیا ہے۔ ان علمائے عالی قدر میں ایک معروف عالم دین مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی شیخ علاؤالدین انصاری لکھنوی (متوفی ۱۰ شوال ۱۲۴۲ھ/ ۷۔ مئی ۱۸۲۷ء) اور جد امجد کا نام نامی مولانا انوارالحق انصاری (متوفی ۲۶ شعبان ۱۲۳۶ھ/ ۲۹۔ مئی ۱۸۲۱ء) تھا۔ یہ اور ان سے اوپر اس خاندان کے تمام ارکان اصحاب فضل و کمال تھے۔

مولانا ممدوح کا پایہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستانی فقہا و علمائے حنفیہ میں بہت اونچا ہے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے عم محترم مولانا نورالحق انصاری لکھنوی (متوفی ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ/ ۸/ دسمبر ۱۸۲۲ء) سے کسب علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدراس گئے اور وہاں کے مدرسہ والا جاہیہ میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔ اس سے قبل ان کے والد گرامی اس منصب پر متعین تھے اور ملک العلما کے خطاب سے سرفراز تھے۔

خلافیات فقہی سے متعلق مولانا جمال الدین انصاری کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا۔ اپنے عہد کے بہت بڑے مناظر اور بحاث تھے۔ مخالفوں کی شدید مخالفت کرتے اور اس میں کسی کی کوئی رعایت نہ برتتے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے بعض مقامات پر سخت تنقید کرتے اور اس میں اتنا آگے نکل جاتے کہ ان کی برملا تکفیر و تضلیل کرتے۔ جو شخص ''تقویۃ الایمان'' کی تحسین کرتا یا مولانا اسماعیل شہید کا دفاع کرتا اسے بھی کافر قرار دیتے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ اس زمانے میں ایک عالم کبیر اور محدث جلیل مولانا محمد علی رام پوری (متوفی ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء) مدراس میں قیام پذیر تھے اور ارشاد و موعظت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ بہت موثر وعظ کہتے تھے اور لوگ ان کے دلدادہ تھے۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کے عقیدت مند تھے اور ان سے اخذ طریقت کیا تھا۔ اپنے مواعظ میں وہ تقویۃ الایمان کے حوالے بھی دیتے تھے۔ حضرت مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی اس سلسلے میں ان کے اس درجہ شدید مخالف ہوئے کہ انھیں مدراس کی سکونت ترک کرنا پڑی۔

❶ حالات کے لیے دیکھیے مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والا جاہی، ج ۲ ص ۴۳ تا ۵۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۲۲، ۱۲۳۔ انتخاف النبلا، ص ۱۷۔

بہر حال مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی علم فقہ کے تمام گوشوں پر نظر رکھتے تھے اور مسائل فقہیہ کی تبیین وتوضیح میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔

انھوں نے ۸ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ/۴۔ نومبر ۱۸۵۹ء کو مدراس میں وفات پائی اور مقبرہ والا جاہیہ میں مدفون ہوئے ❶۔

۴۸- قاضی جمال الدین کشمیری

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے کشمیر میں قاضی جمال الدین کشمیری ایک نامور عالم تھے۔ وہ اپنے زمانے اور علاقے کے مشہور شیخ اور ممتاز فقیہ تھے۔ وادیٔ کشمیر کے معروف عالم وفقیہ مفتی قوام الدین کشمیری (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ/۹۔ فروری ۱۸۰۵ء) سے کسب علم کیا اور فقہ واصول کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ تصوف وطریقت کے لیے شیخ فضل اللہ نوری کے باب عالی پر دستک دی اور ان کے حلقہ سلوک میں شریک ہوئے۔ جب علوم ظاہری و باطنی میں مہارت پیدا ہوگئی اور خاص مرتبہ ومقام حاصل کر لیا تو مسند درس آراستہ کی اور خدمت علم میں مشغول ہو گئے۔

گزشتہ صدی میں کشمیر کے جن علما وفقہا نے فہم وفراست کے لحاظ سے شہرت حاصل کی ان میں قاضی جمال الدین کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ اس دور میں ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ ان سے خلق کثیر نے فیض پایا۔ بے شمار ارباب علم نے استفادہ کیا۔ کشمیر کے فقہائے کرام میں ان کا نام اور کام اعزاز واحترام کا نشان تھا۔ مختلف مسائل کے سلسلے میں ان کے فتوے سند مانے جاتے تھے۔

وہ شاعر بھی تھے۔ اور جمیل تخلص کرتے تھے۔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ اور شاعر وادیب نے ۲۷ شعبان ۱۲۴۳ء/۱۴؍ مارچ ۱۸۲۸ء کو وفات پائی ❷۔

ح

۴۹- مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی

علمائے فرنگی محل کی وسیع فہرست میں مولانا حبیب اللہ انصاری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:

حبیب اللہ بن محبّ اللہ بن احمد عبدالحق بن محمد سعید بن قطب الدین شہید سہالوی۔! یہ تمام لوگ ارباب کمال تھے اور اپنے اپنے دور میں ان کے درس وتدریس کے سلسلے جاری تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳۔ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۲۳، ۲۴۔

❷ تاریخ کشمیر حصہ سوم، ص ۹۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۴۔

مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے گھر فرنگی محل میں علم کی نہر جاری تھی' اس سے سیراب ہوئے اور علوم و فنون میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ انھوں نے اپنے دور کے چار فحول علمائے کرام سے تحصیل کی' اور حسن اتفاق سے یہ چاروں ان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشہور و ممتاز ہیں۔

ایک مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی سے۔ یہ ان کے بڑے بھائی تھے اور جلیل القدر عالم و مصنف تھے۔ ان کی وفات ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ/مئی ۱۸۱۰ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔

دوسرے مولانا ازہار الحق انصاری سے۔ یہ بھی جید عالم تھے' علوم حکمیہ میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

تیسرے مولانا احمد حسین انصاری فرنگی محلی سے۔ یہ بھی عالم و فاضل اور معروف مدرس و معلم تھے۔ ذہین اور سریع الا دراک تھے۔

چوتھے مولانا محمد حسن بن غلام مصطفیٰ انصاری فرنگی محلی سے یہ کثیر الدرس اور کثیر التصانیف عالم تھے۔ علمی دنیا میں ''ملاحسن'' کے عرف سے معروف ہیں۔ معقولات میں بالخصوص اپنے تمام اقران سے فائق تر تھے۔

مولانا حبیب اللہ انصاری کے چاروں استاد ان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور علوم و فنون میں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے فیض صحبت سے مولانا حبیب اللہ نے بڑا نام پایا اور برصغیر پاک و ہند کے فقہائے حنفیہ میں ممتاز گردانے گئے۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم متداولہ میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ لیکن انتظام جائداد اور امور خانہ داری کی وجہ سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع نہیں کر سکے اور اس طرف راغب ہونے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ دینوی کاروبار میں مشغول رہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

ان کے بیٹے مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی تھے' جو تیرھویں صدی ہجری کے بہت بڑے مدرس اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب ''اغصان الاربعۃ'' ہے' اس کتاب میں انھوں نے اپنے والد گرامی مولانا حبیب اللہ کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ فقہیات پر انھیں عبور حاصل تھا اور فقہی مسائل وضاحت و تفصیل سے بیان کرتے تھے' لیکن درس و تدریس سے انھیں دلچسپی نہ تھی اور طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوئی۔

مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر کے مطابق ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں تاریخ وفات ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ/۴ دسمبر ۱۸۱۱ء لکھی ہے ❶۔

۵۰- مولانا حبیب اللہ البوری

برصغیر کے فقہائے شافعیہ میں مولانا حبیب اللہ بن محمد درویش بن عبدالقادر قرشی شافعی البوری اونچے مرتبے کے عالم و فقیہ تھے۔ ان کے والد مولانا محمد درویش بھی جید عالم تھے۔ لائق بیٹے نے باپ سے فقہ و اصول

❶ تذکرہ علمائے ہند' ص ۴۶۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۲۸۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل' ص ۵۲' ۵۳۔ احوال علمائے فرنگی محل' ص ۲۸' ۲۹

کی کتابیں پڑھیں اور جلیل القدر عالم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ فرماں روائے دکن کو ان کی فراوانی علم کا پتا چلا تو انھیں دکن کے شہر ''ادھونی'' کی صدارت پیش کی گئی۔ طویل عرصے تک اس عہدے پر مامور رہے۔ پھر بسالت جنگ کے بیٹے داراجاہ کا تقرب حاصل ہو گیا۔

مولانا حبیب اللہ البوری صالح، ذکی اور فطین عالم تھے۔ خط نہایت عمدہ تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ان کتابوں کا علم ہو سکا ہے۔

۱۔ آئینہ توجیہ: یہ ''التنبیہ'' کی شرح ہے اور فقہ شافعی سے متعلق ہے۔ اپنے موضوع میں یہ پراز معلومات کتاب ہے اور فارسی میں ہے۔

۲۔ الشهاب المحرقه في رد على المهدويه: یہ کتاب فرقہ مہدویہ کے رد میں ہے اور تحقیق سے لکھی ہے۔ فارسی میں ہے۔

۳۔ رحمة الامة في اختلاف الائمه: فارسی زبان میں ہے۔

مولانا حبیب اللہ شافعی البوری نے ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء کو اپنے گاؤں ''البور'' میں وفات پائی، جو اعمال رائچور میں واقع ہے اور وہیں دفن ہوئے❶۔

۵۱۔ مرزا حسن علی صغیر لکھنوی

تیرھویں صدی ہجری میں لکھنؤ اور اس کے اطراف و جوانب میں علم حدیث کا فیض جس بزرگ نے عام کیا، وہ صاحب ترجمہ مرزا حسن علی صغیر ہاشمی لکھنوی ہیں۔ تدریس حدیث اور اشاعت سنت کی مناسبت سے لفظ ''محدث'' ان کے نام کا جز بن گیا ہے اور طبقہ علما میں وہ ''مرزا حسن علی صغیر محدث رحمہ اللہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ فرنگی محل جو عرصہ دراز سے اصحاب علم کا کعبۂ مقصود تھا، اس کے ارباب فضل بھی تحصیل حدیث و فقہ کے لیے مرزا حسن علی صغیر کی بارگاہ علم میں حاضری کو سعادت سمجھتے تھے، چنانچہ متعدد علمائے فرنگی محل نے ان سے استفادہ کیا اور تحصیل علم کی۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں ''مرزا حسن علی'' نام کے دو بزرگ اقامت فرما تھے اور دونوں علم و فضل میں یگانہ و منفرد تھے۔ ایک حسن علی صغیر اور دوسرے حسن علی کبیر۔! حسن علی صغیر لکھنؤ کے محلّہ یحییٰ گنج میں سکونت پذیر تھے اور حسن علی کبیر محلّہ محمود نگر میں۔!! یہاں مرزا حسن علی صغیر کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جو محلّہ یحییٰ گنج میں مقیم تھے۔

مرزا حسن علی صغیر لکھنوی کی ولادت و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدا میں ممتاز ماہر معقولات مولانا حمد اللہ سندیلوی کے فرزند گرامی مولانا حیدر علی سندیلوی سے اخذ علم کیا۔ بعد ازاں عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبدالقادر دہلوی کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۸۔

دہلوی سے بھی استفادہ کیا اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ علم حدیث سے انہی کے شرف صحبت سے تعلق پیدا ہوا، اور پھر اس میں روز بروز اعتنا بڑھتا گیا۔ ان کا شمار اپنے دور کے اصحاب فقہ و اصول اور ماہرین حدیث میں ہوتا تھا۔ پہلے حنفی المسلک تھے، لیکن جب علم حدیث اور اس کے متعلقات سے قلبی وابستگی پیدا ہوئی تو شافعی مسلک اختیار کر لیا، اور شافعی اس دور میں ''اہل حدیث'' کو کہا جاتا تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ یہ مغل ہیں، لیکن یہ خود اپنے آپ کو اولاد بنی ہاشم سے شمار کرتے تھے اور اپنا نام ''میرک جمال الدین حسن علی الہاشمی'' لکھتے تھے۔ ان کے والد کا پہلا نام ''مرزا بندہ علی بیگ تھا''، لیکن بعد میں اسے ''عبدالعلی'' سے بدل دیا گیا تھا۔

مرزا حسن علی کا تذکرہ کرتے ہوئے ''الیانع الجنی'' کے مصنف شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی لکھتے ہیں کہ وہ حدیث میں بحر زخار تھے اور باقی علوم میں بھی کامل دست رس رکھتے تھے اور مذہب شافعی کے مطابق فرائض عبادت انجام دیتے تھے۔

وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تحفة المشتاق فی نکاح والصداق۔

۲۔ برهان الخلاف۔

۳۔ رساله فی تحريم النجوم والرمل والجفر۔

ان کے علاوہ مختلف فقہی مسائل سے متعلق فتوؤں کا بہت بڑا ذخیرہ جو فارسی میں ہے اور متعدد رسائل ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مرزا حسن علی ہاشمی لکھنوی نے ہفتے کے روز ۲۶ صفر ۱۲۵۵ھ/ ۱۱ مئی ۱۸۳۹ء کو مرض استقا سے لکھنؤ میں سفر آخرت اختیار کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔

''تراجم علمائے حدیث ہند'' کے مصنف مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے سال وفات ۱۲۲۶ھ لکھا ہے، جو قرین صحت نہیں ❶۔

۵۲۔ سید حسین حسینی نصیر آبادی

سید حسین بن دلدار علی بن محمد معین حسینی نقوی نصیر آبادی ثم لکھنوی فاضل کبیر، شیخ عالی قدر اور علامہ وقت تھے۔ مشاہیر مجتہدین شیعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۱۱ھ/ ۱۷ ستمبر ۱۷۹۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو بعض کتابیں اپنے والد گرامی سید دلدار علی سے جو اپنے دور کے نامور شیعہ مجتہد تھے، پڑھیں اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل اپنے بڑے بھائی سید محمد سے کی۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ سترہ سال کی عمر میں

❶ قسطاس البلاغہ، ص۔ الیانع الجنی ص ۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷، ۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۳۶، ۱۳۷۔ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۵۲۰ تا ۵۲۲۔ ابجد العلوم ص ۹۱۷۔ علم و عمل، ج ۱ ص ۲۵۳۔

فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ پھر خود مسند تدریس آراستہ کی اور بہت سی اہم شخصیتوں نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا، جن میں مفتی عباس تستری، غنی نقی زید پوری، سید حسین مرعشی، مرزا احسن عظیم آبادی اور علی اظہر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بھانجے ہادی بن مہدی، ان کے فرزندان گرامی اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

سید حسین نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ کچھ اپنے والد سید دلدار علی کی زندگی میں اور کچھ ان کی وفات کے بعد۔! اجتہاد کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا۔ ایک رسالہ تقلید موتی اور ایک رسالہ نماز میں پہلی دو رکعتوں میں شک سے متعلق تحریر کیا۔ یہ رسائل والد کی زندگی میں تصنیف کیے۔

اس کے علاوہ والد کی وفات کے بعد ان کی یہ کتابیں ضبط تحریر میں آئیں:

۱- مناهج التدقيق و معارج التحقيق: یہ ایک مبسوط و مفصل کتاب ہے اور متعدد دقیق و انیق مسائل پر مشتمل ہے، لیکن نامکمل ہے۔

۲- الذخر الرائق: یہ مسائل فقہ میں ہے اور باب الطہارۃ تک ہے۔ یہ بھی نامکمل ہے۔

۳- رساله فی مسئلة اصالة الطهارة۔

۴- حاشيه على شرح الكبير: طباطبائی کی شرح الکبیر کی کتاب الصوم، کتاب الصدقہ و کتاب الھبہ پر حاشیہ۔

۵- روضة الاحكام: فارسی میں ہے اور طہارۃ، صلوۃ، صوم اور میراث کے ابواب چھپ چکے ہیں، تاہم کتاب نامکمل ہے۔

۶- مسئلہ میراث سے متعلق ایک مبسوط رسالہ۔

۷- رسالہ حسینیہ: صحت عقائد سے متعلق ہے اور شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی کی تردید میں ہے۔

۸- الحديقة السلطانيه۔

۹- الرسائل الايمانيه: فارسی میں ہے، اس کے مقصد اول میں توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد کا ذکر ہے۔ مقصد ثانی میں عبادات کا بیان ہے۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ اور بھی کئی رسالے اور بہت سے فتاوے ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

اس شیعہ عالم و فقیہ نے ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء میں وفات پائی [1]۔

۵۳- سید حسین احمد حسینی ملیح آبادی

سید حسین احمد بن علی احمد بن علی امجد حسینی ملیح آبادی تیرھویں ہجری کے مشاہیر علمائے ہند میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کے آبا و اجداد اصلاً سرہند (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ والد گرامی سید علی احمد سرہند سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور کچھ عرصہ بعد لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے ملیح آباد

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

میں اقامت اختیار کر لی تھی اور پھر اسی شہر کو اپنا مستقل وطن قرار دے لیا تھا۔ وہیں ۲۵ صفر ۱۲۰۱ھ/۱۷ دسمبر ۱۷۸۶ء کو صاحب ترجمہ سید حسین احمد کی ولادت ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کے کچھ مراحل طے کیے تو دل میں حصول علم کے شوق نے کروٹ لی اور وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ اس کا گردونواح اور دہلی مراکز علما وفضلا تھے اور ان کے درس و تدریس کے ہنگامے بپا تھے۔ سید حسین احمد نے ان مراکز علم و علما سے خوب استفادہ کیا اور علوم وفنون کے تمام گوشوں سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی مولانا نور الحق لکھنوی مرزا حسن علی محدث لکھنوی، سید مخدوم حسینی لکھنوی مولانا عبدالرحیم صفی پوری (کلکتہ) مولانا حیدر علی بن حمد اللہ سندیلوی اور حکیم محمد صادق فیض آبادی وغیرہ حضرات علما کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اکتساب علوم متداولہ کیا۔

پھر عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے درِ فضیلت پر دستک دی ان سے کتب حدیث پڑھیں اور سند و اجازہ سے مشرف ہوئے۔ شیخ عمر محدث مکی سے بھی حصول فیض کیا۔

جب فارغ التحصیل ہو چکے تو خود سلسلہ تدریس کا آغاز فرمایا اور بے شمار علما وطلبا نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل کی جن میں مولانا عبدالحلیم انصاری فرنگی محلی اور مولانا عبدالرزاق ایسے اعاظم رجال شامل ہیں۔

سید حسین احمد ملیح آبادی نہایت عبادت گزار متواضع اور حلیم الطبع عالم تھے۔ طلبائے علم کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ دعوت و ارشاد کا فریضہ بھی انجام دیتے اور نرمی و ملائمت سے لوگوں کو دین حق کی طرف بلاتے۔

تصنیف وتالیف سے زیادہ تعلق نہ تھا تاہم بعض عنوانات پر چند رسالے تصنیف کیے جو یہ ہیں:

۱۔ رسالہ جواز قرات فاتحہ خلف الامام: اس میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی وضاحت ہے۔

۲۔ رسالہ در اثبات بیعت مروجہ:

۳۔ بحث وجود سے متعلق شاہ رفیع الدین دہلوی کے رسالے کی شرح۔

۴۔ رسالہ در حلیہ نبی ﷺ۔

۵۔ تصوف کے بارے میں چند رسائل۔

چھوٹے چھوٹے یہ چند رسائل ان کی زندگی میں اہل علم کے حلقوں میں پہنچ گئے تھے اور بہت مقبول ہوئے تھے۔

جو لوگ ان کی خدمت میں آتے ان کے مکارم اخلاق کثرت علم اور تحقیق و تدقیق سے نہایت متاثر ہوتے۔ ان کا انداز کلام بہت دھیما اور پیارا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے نمونہ اسلاف تھے اور ان کے شب و روز خدمت دین میں بسر ہوتے تھے ــــــ ہندوستان کے اس رفیع المرتبت عالم وفقیہ نے ۴ رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ/۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء کو رحلت فرمائی اور ملیح آباد سے متصل موضع دودھیا میں اپنے والد ماجد کے جوار میں مدفون ہوئے [1]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۰ ۵۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۴۳۔ تراجم علمائے حدیث ہند ۵۱۳ ۵۱۴۔

۵۴-سید حیات حسینی دہلوی

سید حیات بن ابوالحیات حسینی دہلوی مسلکاً حنبلی تھے اور فقہ حنابلہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عابد وزاہد اور نرم مزاج عالم دین تھے۔ سر زمین ہند میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ دہلی میں سکونت پذیر تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں وطن سے نکلے اور حجاز مقدس جا پہنچے۔ پھر نجف' کربلا اور بغداد کا عزم کیا۔ ان مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد دہلی آئے اور عرصے تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ دہلی سے پھر حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا اور مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے اور اسی وجہ سے مدنی کی نسبت سے شہرت پائی۔

سید حیات حسینی اگرچہ حنبلی تھے لیکن چاروں ائمہ کرام کی فقہ پر عبور رکھتے تھے اور بغیر کسی تعصب اور مسلکی رو رعایت کے وہی بات کہتے جو ان کی میزان تحقیق میں پوری اترتی۔

انھوں نے فارسی میں ایک رسالہ تصنیف کیا جو ائمہ اربعہ کے مذاہب فقہ سے متعلق ہے۔ اس رسالے کی افادیت کے پیش نظر مدینہ منورہ کے بعض اہل علم کے کہنے پر انھوں نے اس کو عربی میں منتقل کیا۔ یہ رسالہ علمی اعتبار سے بہت مشہور ہوا اور پڑھے لکھے طبقے نے اس میں بڑی دلچسپی لی [1]۔

۵۵-مولانا حیدر انصاری لکھنوی

مولانا حیدر بن محمد مبین بن محب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی، فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ولادت اور نشو ونما لکھنؤ میں ہوئی اور اپنے والد مکرم مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ/ ۲۷۔ مئی ۱۸۱۰ء) سے اکتساب علم کیا۔ پھر خود سلسلہ تدریس کا آغاز فرمایا۔ اس زمانے میں والی اودھ نواب سعادت علی خاں کی طرف سے انھیں تین روپے روزانہ وظیفہ ملتا تھا تا کہ اطمینان قلب کے ساتھ اور معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر درس اور افادہ طلبا میں مشغول رہ سکیں۔ نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد امرائے مملکت نے ان کو مزید مرکز احترام ٹھہرایا اور بڑے بڑے وظائف اور صلات سے سرفراز کیا۔

مولانا حیدر انصاری مسلک اہل سنت سے وابستہ تھے اور اسی عقیدہ وعمل کے حامل تھے جو سلف سے منقول و مروی ہے' لیکن اودھ کا وزیر شیعہ تھا اور اس کے دل میں ان کے خلاف بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے مولانا کو ہدف ایذا بنانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا کو وزیر کے مذموم ارادے کا پتا چلا تو لکھنؤ سے نکلے اور کلکتے چلے گئے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا اور ۲ جمادی الاولی ۱۲۴۰ھ/ ۲۳۔ دسمبر ۱۸۲۴ء کو وارد مکہ ہوئے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر انھوں نے وہاں کے علمائے حدیث سے مستفید ہونے کا عزم کیا۔ وہاں سید یوسف

---

[1] نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۵۰۔

بن البطاح الاہدل یمانی اور شیخ عمر مکی کا غلغلہ درس حدیث بلند تھا' اس میں شمولیت کی اور ان حضرات سے صحیحین پڑھیں۔

حج میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا' لہٰذا مکہ مکرمہ سے جمادی الاخریٰ میں مدینہ منورہ پہنچے اور شیخ عبدالحفیظ العجیمی مکی اور علامہ محمد عابد سندھی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے سند حدیث حاصل کی۔ قوت حفظ و ادراک اس قدر تیز تھی کہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے' اثنائے سفر میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور پھر مسجد حرام میں نماز تراویح میں باقاعدہ سنانے کا شرف حاصل کیا۔ ماہ شعبان کے آخر میں مکہ مکرمہ آ گئے تھے۔

حج سے فارغ ہو کر ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ کو مکہ سے روانہ ہوئے اور غرہ محرم ۱۲۴۱ھ/ستمبر ۱۸۲۵ء میں' مراجعت وطن کے لیے جدہ سے کشتی میں سوار ہوئے۔ جدہ سے ابھی پانچ میل کا سفر طے کیا ہو گا کہ کشتی سمندر میں غرق ہو گئی' جس میں ان کے بیس رفقائے سفر بھی سمندر کی خوف ناک لہروں کی نذر ہو گئے اور بہت سی قیمتی کتابیں بھی ضائع ہو گئیں' لیکن خود محفوظ رہے۔ اس حادثے کی اطلاع امیر جدہ کو پہنچی تو اس نے ان کے لیے ایک کشتی کا انتظام کیا' جس کے ذریعے وہ انیس دن بعد بمبئی کے ساحل پر اترے۔ کشتی سے اترتے ہی ان کی ملاقات حیدر آباد (دکن) کے شمس الامرا سے ہوئی۔ وہ نہایت اکرام و اعزاز سے پیش آیا۔ اپنے ساتھ حیدر آباد لے گیا اور والیٔ حیدر آباد سے تقرب پیدا کرا دیا' جس سے ان کی مستقبل کی دنیا بالکل بدل گئی۔ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا اور ایک جاگیر عطا کی گئی' جس سے بارہ ہزار روپے نقد سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔

مولانا حیدر انصاری معقولات و منقولات میں مہارت رکھتے تھے اور کئی کتب و رسائل کے مصنف تھے۔ ایک رسالہ منطق سے متعلق لکھا۔ وظائف حیدریہ کے نام سے وظائف و اوراد کے بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ مختلف درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۳ محرم ۱۲۵۶ھ/۱۷ مارچ ۱۸۴۰ء کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی ❶۔

۵۶-سید حیدر علی ٹونکی

سید حیدر علی بن عنایت علی بن فضل علی حسینی بخاری دہلوی ثم ٹونکی' علمائے ربانی اور فضلائے اتقیا میں سے تھے۔ اپنے عہد کے عالم کبیر' شیخ وقت اور فقیہ بلند مرتبت تھے۔ ولادت و نشوونما دہلی میں ہوئی۔ صغر سنی ہی میں عازم رام پور ہوئے' وہاں سید غلام جیلانی اور شیخ عبدالرحمٰن کوہستانی سے علم نحو اور علوم عربیہ کی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دن شیخ رستم علی رام پوری کے حلقہ درس میں رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے اور مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی کی شاگردی اختیار کی۔ عرصے تک ان سے مصروف استفادہ رہے۔ لکھنؤ سے دہلی کی راہ لی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اور ان کے برادر کبیر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے اکتساب علم کیا۔ حکیم محمد شریف خاں

❶ احوال علمائے فرنگی محل' ص ۲۵' ۲۶۔ نزہتہ الخواطر' ج ۷' ص ۱۵۱' ۱۵۲۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۸۶۔

دہلوی (متوفی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) سے علم طب کی تحصیل کی۔ طریقت و سلوک کے لیے سید احمد شہید بریلوی سے رجوع کیا اور ان سے فیض یاب ہوئے۔

حیدر علی ٹونکی نہایت ذکی' ذہین اور سریع الادراک تھے۔ معرفت کتاب و سنت میں فائق تر' خلافیات میں ماہر اور علوم نقلیہ و عقلیہ میں بحر زخار تھے۔ اصل وطن چونکہ دہلی تھا' اس لیے دہلوی کی نسبت سے پکارے گئے۔ رام پور میں سید غلام جیلانی کی صاحب زادی سے شادی کر لی تھی اور کچھ مدت وہاں مقیم رہے تھے' لہٰذا رام پوری کہلائے۔ رام پور سے کلکتہ گئے۔ فرماں روائے رام پور نواب احمد علی خاں کے عہد آخر میں ٹونک پہنچے۔ اس نے ان کے ہاتھ پر نیابتاً بیعت جہاد کی تھی۔ ٹونک میں نواب وزیر الدولہ کی سرکار میں رسائی حاصل کی۔ نواب مذکور ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور کثرت علم و ادراک سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ان کو اپنے خاص ندیموں اور مصاحبوں میں شامل کیا' اور ریاست کے اہم امور کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی۔ عہدہ دیوانی جو ایک بڑا عہدہ ہے' اس پر مامور کیے گئے۔ یہ ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (مارچ ۱۸۴۴ء) کا واقعہ ہے۔ قیام ٹونک کی وجہ سے ٹونکی مشہور ہوئے۔ تمام سرکاری ذمے داریوں کے باوجود باقاعدہ طلبا کو درس دیتے اور مستفید فرماتے تھے۔

سید حیدر علی ٹونکی سے لاتعداد علما و طلبا نے استفادہ کیا اور ان کے علوم و فنون سے بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ان حضرات عالی قدر میں شیخ اوحد الدین بلگرامی' قاضی بزرگ علی مارہروی' قاضی عنایت رسول چریاکوٹی' قاضی ہدایت علی گیلانی' قاضی امام الدین ٹونکی' شیخ ابراہیم نگرنہسوی' شیخ احمد بن محمد شروانی اور بہت سے اصحاب علم شامل ہیں۔

نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی ابجد العلوم میں رقم فرماتے ہیں کہ مولانا سید حیدر علی ٹونکی قصیر القامت اور نحیف البدن تھے۔ فاضل جلیل اور ممتاز عالم تھے۔ علم طب سے بھی آشنا تھے اور طبابت بھی کرتے تھے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی پر مولانا فضل امام خیر آبادی نے جو اعتراضات وارد کیے' ان کا مدلل جواب دیا اور مولانا شہید کو اپنے موقف میں حق بجانب ٹھہرایا۔ ان کا شمار سید احمد شہید بریلوی کے خلفائے خاص میں ہوتا تھا۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے' جن میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

۱- صیانۃ الاناس عن وسوسۃ الخناس: یہ کتاب اردو میں ہے۔

۲- رسالہ اثبات رفع الیدین: اس میں ثابت کیا ہے کہ رفع الیدین نماز میں کرنی چاہیے۔ یہ رسالہ مولانا محبوب علی دہلوی کے رد میں تحریر کیا۔ فارسی میں ہے۔

اس علامہ عصر نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (۱۸ اگست ۱۸۵۶ء) کو ٹونک میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ نزہۃ الخواطر کی روایت کے مطابق وفات کے وقت ستر برس کی عمر تھی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۶ء بنتا ہے [1]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند' ص ۵۵۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۵۳' ۱۵۴۔ ابجد العلوم' ص ۹۱۷۔ الیانع الجنی ص ۷۷۔ حدیقہ راجستان' ٹونک' جماعت مجاہدین ص ۲۹۲۔ تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۴۸۸ تا ۴۹۴۔

۵۷- مولانا حیدر علی فیض آبادی

مولانا حیدر علی بن محمد حسن بن محمد ذاکر بن عبدالقادر دہلوی فیض آبادی، تیرھویں صدی ہجری کے کبار علما اور مایہ ناز متکلمین وفقہا میں سے تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ حصول علم کا آغاز اپنے وطن فیض آباد میں کیا اور مرزا فتح علی، سید نجف علی اور حکیم میر نواب کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے۔ فیض آباد کے یہ سب علما شیعہ تھے، لیکن حیدر علی کے لوح ذہن پر دور اول کے ان اساتذہ کرام کے مذہبی افکار و تصورات مرتسم نہیں ہوئے، وہ بہ دستور اپنے عقیدہ وعمل پر قائم رہے۔

فیض آباد سے دہلی گئے۔ وہاں مولانا رشید الدین، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز قبلہ گاہ علما وفضلا تھے، ان کے بابِ فضیلت پر دستک دی اور خوب استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے تو عرصے تک وابستگی اختیار کیے رکھی، اور ہر شعبہ علم سے متمتع ہوئے۔

دہلی سے لکھنؤ کا رخ کیا اور طویل مدت تک علمائے لکھنؤ سے علمی صحبتیں رہیں، بحث وجدال، مناظرہ و کلام، کثرت معلومات اور حدیث وفقہ کی جزئیات پر استحضار میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ کتب شیعہ پر گہری نظر تھی اور ان کے مشمولات ومندرجات کے ہر پہلو سے آگاہ تھے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے شیعہ علما ان کے مقابلے میں اترنے اور میدان مناظرہ میں ان کا سامنا کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس عالم اجل کے کثرت معلومات، زور استدلال اور قوت بیان کا ہر مخالف وموافق نے اعتراف کیا اور ذہنی وفکری صفائی کی ہر شخص نے کھلے الفاظ میں تحسین کی۔

یہ عالم ذی قدر لکھنؤ سے بھوپال کو روانہ ہوا، اور ایک مدت تک وہاں قیام رہا۔ پھر حیدر آباد کا عزم کیا۔ وہاں ان کی صلاحیتوں سے اثر پذیر ہو کر نواب مختار الملک نے محکمہ عدل وقضا کی ذمے داریاں ان کے سپرد کیں۔ پھر تمام عمر اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا شغل بھی جاری رہا۔

ان کی تصنیفات حجم وضخامت اور دلائل وبراہین کے اعتبار سے بڑی اہم ہیں اور مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- منتهى الكلام: یہ ایک مفصل ومدلل کتاب ہے۔

۲- ازالة الغين عن بصارة العين: تین جلدوں میں۔

۳- نضارة العينين عن شهادة الحسنين۔

۴- كاشف الهنام عن تدليس المجتهد القمقام۔

۵- الداهية الحاكم على من اخرج من اهل البيت فاطمه۔

۶- روبة الثعاليب و الغرابيب فى انشاء المكاتيب۔

۷- اثبات بيعت مرتضويه۔

۸- اثبات زوجية عمر بن الخطاب بسيد تنا كلثوم بنت على۔

۹- تکملہ فتح العزیز: کئی بڑی بڑی جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب نواب سکندر بیگم ملکہ بھوپال کے کہنے پر تصنیف کی۔

مولانا حیدر علی فیض آبادی نے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

خ

۵۸- مولانا خادم احمد لکھنوی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل میں مولانا خادم احمد بن محمد حیدر بن محمد مبین انصاری فرنگی محلی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے حنفیہ میں ان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ اپنے عم محترم مولانا محمد معین فرنگی محلی سے کسب علم کیا اور درجہ کمال پر پہنچے۔ پھر اپنے علمائے سلف کی طرح وعظ و تذکیر، درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں مشغول ہو گئے۔ ان کے وعظ موثر اور دلآویز ہوتے تھے۔ ان کے وجود سے فرنگی محل کی رونق قائم تھی اور اس سے جو گوناگوں روایات وابستہ ہیں، ان کی وجہ سے وہ زندہ و تاباں تھیں۔ اپنے والد گرامی مولانا محمد حیدر فرنگی محلی سے بیعت تھے۔

مولانا خادم احمد فرنگی محلی کے عہد میں ایک بہت ہی الم ناک واقعہ پیش آیا، جس کے بارے میں انھوں نے فتویٰ بھی جاری کیا۔ وہ واقعہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ ہندوؤں کے شہر اجودھیا میں ان کے مشہور مذہبی مقام "ہنومان گڑھی" میں ایک بہت بڑی مسجد تھی جو بہت عرصہ قبل تعمیر کی گئی تھی۔ ہندو اس سے خوش نہ تھے اور کہتے تھے کہ یہ مسجد ان کے مندر کی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دور آخر میں جب کہ وہ عالم نزع میں تھی، ہندوؤں نے اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کو مندر بنا لیا۔ اس سے مسلمانوں میں قدرتی طور پر اشتعال پیدا ہوا، اور ایک شخص شیخ غلام حسین مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ میدان میں نکلے اور ہندوؤں کے قبضے سے مسجد کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوئے۔ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ مسلح تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے شیخ غلام حسین اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا اور قرآن مجید اور اسلامی کتابوں کو جلا دیا۔ اس زمانے میں ایک جلیل القدر عالم مولانا امیر علی امیٹھوی تھے۔ ان کو اس المیے کا پتا چلا تو ان کی حمیت دینی جوش میں آئی۔ لکھنؤ پہنچے اور اودھ کے والیان حکومت اور لکھنؤ کے عوام و خواص کو غیرت دلائی اور کفار سے لڑائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اودھ کا حکمران واجد علی شاہ تھا جو عیاش اور منکرات و منہیات کا دل دادہ تھا۔ اس کا وزیر نقی علی شیعہ تھا اور دیوان ہندو تھا۔ سب افراد و حکام راشی اور احکام اسلام سے بے پروا تھے۔ جب خود حکمران غلط کردار ہو تو ظاہر ہے، ماتحت اسی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ انھوں نے مولانا امیر علی کو اس اقدام سے

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۵۴، ۱۵۵۔

روکا اور کہا کہ ہندوؤں کو کچھ نہ کہا جائے اور مسجد انہی کے قبضے میں رہنے دی جائے۔ ان عمال حکومت نے اس سے اگلا قدم یہ اٹھایا کہ بعض علما کی طرف رجوع کیا اور روپے پیسے کے ذریعے سے ان سے فتویٰ لیا کہ اس مسئلے میں ہندوؤں کے خلاف خروج جائز نہیں، اور مولانا امیر علی امیٹھوی کی تگ و دو خلاف اسلام ہے۔ فتویٰ دینے والے ان علما میں صاحب ترجمہ مولانا خادم احمد لکھنوی بھی شامل تھے۔

لیکن مولانا امیر علی امیٹھوی مرد مجاہد تھے۔ وہ اپنے رفقا کے ساتھ مسجد کی بازیابی کے لیے میدان جہاد میں نکلے۔ ادھر انگریزی فوج مقابلے کو آئی اور اودھ کی حکومت نے بھی اپنے سپاہی مولانا ممدوح کی مخالفت میں روانہ کیے۔ اس کے علاوہ ''علمائے کرام'' کے فتوے بھی تھے جو مولانا کے خلاف جاری کیے گئے تھے۔ مولانا ممدوح جب اپنے رفقا کی معیت میں اجودھیا پہنچے تو شاہی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور سب مجاہدین حق جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ حادثہ ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ/ ۷ نومبر ۱۸۵۵ء کو بدھ کے روز دوپہر کے وقت پیش آیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب معرکہ قتال گرم ہوا تو مولانا امیر علی امیٹھوی کے بعض ارادت مندوں نے ان سے عرض کیا کہ وہ اجازت دیں کہ انھیں کسی محفوظ مقام میں پہنچا دیا جائے تا کہ وہ دشمن کی زد سے بچ جائیں، ان کی زندگی بہت ضروری ہے، لیکن وہ نہیں مانے اور یہ مصرع پڑھا:

سر میدان کفن بردوش دارم

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا امیر علی امیٹھوی کے اس اقدام کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کے بعد، لیکن ان کی شہادت سے بھی پہلے مولانا خادم احمد فرنگی محلی پر کسی بیماری کا حملہ ہوا۔ صرف دو دن بیمار رہے اور ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ/ ۲۶۔ اگست ۱۸۵۵ء کو ظہر کے وقت طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

مولانا خادم احمد فرنگی محلی مصنف اور شارح بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱- التقریر المعقول فی بحث الحاصل والمحصول: یہ رسالہ علم نحو کی انتہائی کتاب کافیہ کی شرح جامی سے متعلق ہے۔

۲- در بیان دائرۂ ہندیہ متعلقہ شرح وقایہ۔

۳- رسالہ در بحث طہر متخلل: یہ خالص فقہی مسئلے کے بارے میں ہے۔

۴- وسیلۃ الشفا فی احوال الصحابہ۔

۵- زاد التقویٰ فی اداب الفتویٰ۔

۶- اعلام الھدیٰ فی تحریم المزامیر والغناء۔

۷- ہدایۃ الانام فی اثبات تقلید الائمۃ الکرام۔

۸- تعلیقات بر شرح جامی۔

۹- حاشیہ شرح وقایہ۔

۱۰- حاشیہ نور الانوار۔

۱۱- حاشیہ بر شرح سلم از ملا حسن۔

مولانا خادم احمد انصاری فرنگی محلی کا شمار اپنے عصر اور علاقے کے مشاہیر علما وفقہا میں ہوتا تھا❶۔

مولانا کا ذکر ہم نے بڑے احترام سے کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا شمار علمائے سو میں ہوتا ہے۔

۵۹- مولانا خرم علی بلہوری

مولانا خرم علی بلہوری اپنے عہد کے اصحاب صلاح وتقویٰ علما وفقہا میں سے تھے۔ مولد ومنشا بلہور ہے' جو صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے اور خاندان شاہ ولی اللہ کے ممتاز اساتذہ سے تحصیل کی۔ اخذ طریقت سید احمد شہید بریلوی سے کیا اور طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر باندہ گئے اور نواب ذوالفقار خاں بہادر رئیس باندہ سے وابستہ ہو گئے۔ نواب مذکور کے حکم سے حدیث وفقہ کی بعض ضخیم واہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا' جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

منقول ہے کہ جہاد کے لیے سید احمد شہید کے ساتھ سرحد گئے تھے' پھر وہاں سے واپس آ گئے تھے' اس لیے کہ سید صاحب نے ان کو دعوت وتبلیغ کے لیے مقرر فرما دیا تھا۔ موثر وعظ کہتے تھے اور احیائے سنت ورد بدعت میں بہت سرگرم تھے۔

جلیل القدر عالم' فہم حدیث میں یکتا اور مسائل فقہ کی وضاحت وتبیین میں سر آمد روزگار تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور حدیث وفقہ کی بعض اہم اور ضخیم کتابوں کے مترجم تھے' جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱- مشارق الانوار: یہ امام صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) کی نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ احادیث رسول اللہ ﷺ کا یہ ایک مستند ذخیرہ ہے' جسے فاضل مصنف نے فقہی ابواب پر مرتب کیا۔ کسی زمانے میں یہ کتاب باقاعدہ نصاب درس میں شامل تھی۔ مولانا خرم علی نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ کتاب پر مقدمہ بھی تحریر کیا جو قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ تحفۃ الاخیار کے نام سے ستمبر ۱۹۰۰ء (جمادی الاولی ۱۳۱۸ھ) میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا۔ غالباً یہ اس کی سب سے پہلی اشاعت تھی۔ اس کے بعد کئی دفعہ یہ ترجمہ طبع ہوا۔

۲- غایۃ الاوطار اردو ترجمہ در المختار: کتب فقہ میں ''در المختار'' حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہے جو مسائل فقہیہ کی جزئیات پر محتوی ہے۔ کتاب چار جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے اور احناف کی مستند ومعتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مولانا خرم علی نے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں نواب ذوالفقار خان بہادر کے حکم سے اس کا

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۵۵' ۱۵۶۔ تذکرہ احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۱۔ تذکرہ علمائے فرنگی محلی ص ۵۷۔ ۵۸

اردو ترجمہ شروع کیا۔ کافی حصے کا ترجمہ ہو چکا تھا کہ سر پر موت کا سایہ منڈلانے لگا' اور ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ باقی ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے کیا۔ علم فقہ کی یہ ایک بڑی خدمت ہے جو مولانا خرم علی نے کی۔ یہ چاروں جلدیں ۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور کان پور اور لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

۳۔ شفاء العلیل اردو ترجمہ القول الجمیل: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف میں القول الجمیل' تصوف وطریقت' اس کے سلاسل' آداب موعظت وتذکیر اور اپنے بعض خاندانی اعمال مجربہ کے بارے میں ایک عمدہ تصنیف ہے۔ مولانا خرم علی نے شفاء العلیل کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا جو مطبع مجیدی کان پور سے ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔

۴۔ خدا کی قدرت: مولانا ممدوح شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار کا یہ ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ اس میں مسائل کتاب وسنت کو بہترین طریقے سے نظم کیا ہے۔ بہت عرصہ پیشتر یہ مجموعہ اشعار مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد (دکن) میں شائع ہوا تھا۔

۵۔ نصیحۃ المسلمین: یہ رسالہ اتباع توحید وسنت کے موضوع پر ہے۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ مولانا خرم علی نے یہ ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء میں تحریر فرمایا تھا۔ متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے۔ مکتبہ سلفیہ لاہور نے اسے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔

۶۔ رسالہ فاتحہ خلف الامام: یہ اس دور کی تصنیف ہے' جب وہ مسلک حنفی سے وابستہ تھے۔ اس میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی مخالفت کی ہے۔ بعد میں مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا اور مولانا اسماعیل شہید سے وابستہ ہو گئے تھے۔

۷۔ جہادیہ: یہ ایک نظم ہے جو فضائل جہاد کے بیان میں ہے۔ سید احمد شہید کی فوج میں جنگ کے دوران یہ نظم پڑھی جاتی تھی۔ یہ نظم اپنی تصنیف ''سید احمد شہید'' میں ''جہادیہ'' کے عنوان سے مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے درج کی ہے [1]۔

۸۔ آداب الحرمین:

بہرکیف مولانا خرم علی بلہوری تیرھویں صدی ہجری کے نامور ہندی عالم وفقیہ اور فاضل تھے۔ تصوف وطریقت سے بھی بہرہ ور تھے۔ سید احمد شہید سے بیعت جہاد وسلوک لکھنؤ میں کی تھی۔ انداز کلام اثر آفرین اور دل کش تھا۔ اتباع سنت اور اطاعت رسول ﷺ میں رشک اقران تھے۔ مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ اس بے مثال عالم نے ایک روایت کے مطابق ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں سفر آخرت اختیار کیا [2]۔

---

[1] سید احمد شہید حصہ دوم ص ۲۵۸ تا ۲۶۰۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶، ۵۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۵۸' ۱۵۹۔ جماعت مجاہدین ص ۲۹۴۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۵۰۹ تا ۵۱۲۔

۶۰- مفتی خلیل الدین کاکوروی

علمائے کاکوری نے برصغیر پاک و ہند کی علمی و فقہی تاریخ میں بڑا نام پایا اور بہت شہرت حاصل کی۔ ان علمائے عظام اور فقہائے ذی شان نے مختلف اوقات اور مقامات میں افتا کی مسندیں بچھائیں' عدل وقضا کے مناصب کو زینت بخشی اور درس وتدریس کے غلغلے بلند کیے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مفتی خلیل الدین کاکوروی تھے' جن کے والد گرامی کا نام نجم الدین اور جد محترم کا حمید الدین کاکوروی تھا۔ دونوں اصحاب فضل و کمال اور علوم متداولہ میں معروف تھے۔ مولانا نجم الدین قاضی القضاۃ تھے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ/ ۴ر اپریل ۱۸۱۴ء کو فوت ہوئے اور مولانا حمید الدین کاکوروی نے غرہ ذیعقدہ ۱۲۱۵ھ/ اپریل ۱۸۰۱ء کو وفات پائی۔

مفتی خلیل الدین اسی خاندان عالی قدر کے گوہر شب چراغ تھے۔ علوم عقلی ونقلی میں یکتائے دہر تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے' اپنے والد مکرم قاضی نجم الدین اور مولانا روشن علی جون پوری کے حلقہ شاگردی میں شمولیت کا فخر حاصل کیا' علم وفضل میں اس درجے ترقی کی کہ اپنے تمام اقران سے سبقت لے گئے۔ کان پور کی مسند افتا پیش کی گئی اور عرصے تک اس پر متمکن رہے۔ پھر والی اودھ نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلا لیا اور رصد خانے کا اہتمام ان کے سپرد کیا' بلکہ رصد خانہ انہی کی تجویز و تحریک سے قائم کیا گیا تھا' اس لیے کہ یہ علوم ریاضی کے ماہر اور عالم تھے۔ نواب سعادت خاں کی وفات تک منتظم رصد خانہ رہے۔ پھر غازی الدین حیدر نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو انھیں سفارت کلکتہ پر مامور کر دیا اور وہ کلکتے چلے گئے۔ اس خدمت کے بدلے پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

مفتی خلیل الدین کاکوروی اپنے دور کے ممتاز مصنف اور مترجم بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی یادگار علمی ہیں۔

۱- ترجمہ باب التعزیرات درالمختار: درالمختار فقہ حنفی کی ضخیم کتاب ہے۔ مسٹر رنگٹن ممبر کونسل کی فرمائش پر' مفتی خلیل الدین نے اس کے باب التعزیرات کی فارسی میں شرح سپرد قلم کی۔

۲- مراۃ الاقالیم: فارسی میں ہے اور فن ہیئت کے قواعد پر مشتمل ہے۔

۳- جغرافیہ الطرق والشوارع: فارسی میں ہے اور اس میں مملکت اودھ کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔

۴- رسالہ طول البلد وغایۃ النہار: یہ بھی فارسی میں ہے۔

۵- رسالہ در تحقیق مرض ہیضہ: فارسی میں تصنیف کیا۔

۶- رسالہ در ابطال ظل مثلث۔

مفتی خلیل الدین نے اٹھتر برس کی عمر پا کر ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا❶۔

---

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۵۹' ۱۶۰۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۴۶ تا ۱۵۱۔ علم وعمل ج ۱' ص ۱۴۵' ۱۴۶۔ تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۵۱۳۔

٦١ - قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری

قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری کے والد ماجد کا اسم گرامی ملا عرفان تھا۔ ملا عرفان دراصل خراسان کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی نشو ونما ہوئی۔ ابتدا میں علمائے خراسان ہی سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد وارد ہند ہوئے۔ لکھنؤ پہنچے اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی سے استفادہ کیا۔ پھر رام پور چلے گئے تھے اس لیے ''ملا عرفان رام پوری'' کہلائے۔ جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری' انہی کے فرزند ارجمند تھے' جو اپنے عہد کے شیخ و فاضل اور عالم کبیر تھے۔ فقہ واصول کے نامور علما میں سے تھے۔

قاضی خلیل الرحمٰن کی ولادت رام پور میں ہوئی اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مولانا عرفان رام پوری' مفتی شرف الدین رام پوری اور ملا محمد حسن انصاری لکھنوی سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم ٹونک ہوئے اور نواب امیر خاں کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب عالی پر مامور کیے گئے۔ لیکن جب مولانا حیدر علی وارد ٹونک ہوئے تو بعض فقہی اور علمی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دونوں کے درمیان مناظرے اور مجادلے ہونے لگے۔ پھر قاضی صاحب ممدوح حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور وطن واپس آئے تو ریاست جاورہ میں اقامت اختیار کر لی۔ اس وقت امیر جاورہ غوث محمد خاں تھا' وہ نہایت عزت واکرام کے ساتھ پیش آیا اور ان کے مرتبے کے مطابق ملازمت عطا کی۔

قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری یوں تو تمام علوم متداولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے' لیکن ریاضی' علوم ادب' تاریخ اور طب میں بالخصوص دست رس حاصل تھی۔ مصنف اور شارح بھی تھے' مسطورہ تحت کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱- الدائر شرح علی منار الاصول۔
۲- تعلیقات علی حاشیۃ غلام یحیٰی
۳- تعلیقات رسالہ میر زاہد۔
۴- جواب الاشکال المسمیٰ بجذر الاصم۔

= مفتی خلیل الدین کا سال ولادت جیسا کہ متن میں تحریر کیا گیا۔ ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء ہے۔ ان کے والد قاضی نجم الدین کاکوروی نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں وفات پائی تھی اور بیٹے نے اپنے والد (قاضی نجم الدین) سے حصول علم کیا تھا' لیکن تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ (ص ۵۱۳) میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ مفتی خلیل الدین کاکوروی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو یا تو سہو ہو گیا ہے یا یہ کتابت کی غلطی ہے۔ باپ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں وفات پا جائے اور بیٹا ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہو اور پھر باپ سے علم بھی حاصل کرے' یہ کیوں کر ممکن ہے؟ یہ کتابت ہی کی غلطی ہو سکتی ہے۔

۵- حاشیہ علی شرح المواقف۔

۶- رسم الخیر۔

۷- رسم الخیرات۔ یہ دونوں رسالے (رسم الخیر و رسم الخیرات) رسم فاتحہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔

۸- مائتہ عامل: یہ کتاب اپنے بیٹے عبدالعزیز کے لیے تصنیف کی۔ اس کی مفصل شرح بھی لکھی۔

۹- منظومتہ فی العروض۔

۱۰- منظومہ فی جواب سوال ❶۔

۶۲- مولانا خیر الدین زبیری سورتی

ہندوستان کا علاقہ سورت ہمیشہ علما وفقہا اور فضلا و اتقیا کا مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین مردم خیز نے تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب کمال کو جنم دیا' ان میں مولانا خیر الدین زبیری سورتی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ والد کا نام نامی محمد زاہد اور دادا کا حسن محمد زبیری تھا۔ سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ کے عم محترم حضرت زبیر بن عبدالمطلب سے ملتا ہے' اسی لیے زبیری کہلائے۔ شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مولانا عبدالغفور اور شیخ محمد بن عبدالرزاق حسینی اچی ایسے ممتاز اساتذہ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا' اور نواں سورت میں اپنے دور کے محدث وفقیہ شمار کیے گئے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے مطابق بیعت طریقت شیخ نور اللہ سے کی۔ پھر ان کے شاگرد شیخ نصر اللہ سے مستفیض ہوئے۔ بعض ازاں حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ پہنچے تو شیخ محمد حیات سندھی کا سلسلہ درس حدیث جاری تھا' اس میں شرکت کی اور سند واجازہ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ اپنے وطن سورت واپس آئے تو خود مسند درس حدیث بچھائی اور پچاس سال یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ بعض کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں شواہد التجدید' ارشاد الطالبین اور تصوف وسلوک کے کچھ رسائل شامل ہیں۔

صاحب نزہتہ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے حدیقہ احمدیہ کے حوالے سے ان کے بعض رسائل سے ان کے چند اقوال بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

- ظاہر و باطن میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو' اور اس اتباع کو اپنے عمل میں ظاہر کرو۔
- جو بات صحیح احادیث اور فقہ کے مستند ذخیرے میں پاؤ' اس پر کسی دلیل کا مطالبہ نہ کرو۔ حدیث اور فقہ ہی اصل دلیل ہے۔
- جب صحیح حدیث سے بات ثابت ہو جائے تو شک وریب کے وہ کانٹے جو ذہن وفکر کی گہرائیوں میں

❶ تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۲۲' ۱۲۳۔ علم وعمل ج ا ص ۱۰۷۔ نزہتہ الخواطر' ج ۷ ص ۱۶۰' ۱۶۱۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۵۶۸۔

چھپے ہوئے ہیں، نکل جانے چاہئیں، اس لیے کہ تجلی ذات حق رسول اللہ ﷺ کی متابعت پر موقوف ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران:۳۱)

(اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔)

- لوگوں کے افعال و کردار کی نکیر نہ کرتے پھرو، اگر وہ مذموم و ناپسندیدہ ہیں تو ان کو زبان سے نصیحت کرو۔
- اقوال صوفیا کو ہدف اعتراض نہ ٹھہراؤ، اگر ان کے قول و فعل کو بہ ظاہر خلاف شرع پاؤ تو ان کی تاویل کرو۔ آئینہ قلب کو کدورت، خیانت اور دھوکے بازی کے گرد و غبار سے صاف رکھو۔ اس لیے کہ میدان تاویل بہت وسیع ہے۔ اگر شعور تاویل سے خود کو عاجز پاؤ تو سکوت سے کام لو۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ کو سامنے رکھو۔ حضرت موسیٰ پیغمبر تھے اور خضر کا عمل ان کے امور نبوت سے مختلف تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو نہیں سمجھ پائے تو ایک جاہل و ناواقف آدمی مراد عارف کو کیوں کر حیطۂ فہم میں لا سکتا ہے۔ نہ اسے قبول کرو، نہ اس سے انکار کرو، بس سکوت سے کام لو، بہتری سکوت ہی میں ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ شرائع سابقہ کو نہ مدار عمل ٹھہرایا جاتا ہے اور نہ ہدف انکار بنایا جاتا ہے۔
- اکابر صلحا کے نزدیک سب سے بڑی معصیت اعتراض ہے، کیوں کہ اعتراض فاعل حقیقی کی طرف لوٹتا ہے اور خیر و شر کا فاعل اللہ ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا۔ (الشمس:۸)

(پھر اس (انسان) کو برائی اور پرہیزگاری کی سمجھ دی۔)

نیز فرمایا:

اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ۔ (ہود:۱۲۳)

- سالک کو چاہیے کہ خیر اور شر کو مرکز توجہ ٹھہرائے بغیر، شہود حق میں مستغرق و منہمک رہے، جیسا کہ وہ عالم طفولیت میں تھا۔

نہایت درحقیقت بدایت کی طرف رجوع سے تعبیر ہے۔

- رزق اور دیگر معاملات میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اسی قدر دیتا ہے جس قدر کہ تمھارے مناسب حال اور مطابق مقام ہوتا ہے، جیسا کہ ماں باپ شفقت و مہربانی سے بچے کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے اور وہ اپنی مخلوق پر سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

مولانا خیر الدین زبیری سورتی بہت بڑے عالم و فقیہ اور سالک و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۰ رجب ۱۲۰۶ھ/۴ مارچ ۱۷۹۲ء کو شہر سورت میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے[1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۶۱، ۱۶۲ بحوالہ حدیقۃ احمدیہ۔

د

۶۳- سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی

سید دلدار علی حسینی نقوی' فاضل وقت اور علامہ و مجتہد تھے۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ والد کا نام سید محمد معین اور دادا کا سید عبدالہادی تھا۔ سید نجم الدین سبزواری کی نسل سے تھے۔ سلسلہ نسب جعفر بن علی نقی سے ملتا ہے۔ دیار ہند کے یہ پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے اپنے علم و فضل اور وسعت مطالعہ کی بنا پر اجتہاد کا دعویٰ کیا اور جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لیے قیام جماعت کی طرح ڈالی۔ ہندوستان کے یہ فقیہ اور اصولی تھے۔

سید دلدار علی حسینی نقوی کی ولادت ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء کے قریب یو پی کے شہر نصیر آباد میں ہوئی جو رائے بریلی سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ حصول علم کے لیے الہ آباد گئے' وہاں شیخ غلام حسین دکنی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور اکثر کتب درسیہ ان سے پڑھیں۔ پھر سندیلہ کا قصد کیا۔ ملا حمد اللہ سندیلوی کے فرزند مکرم مولانا حیدر علی سندیلوی کا سلسلہ درس جاری تھا' ان سے ملا حمد اللہ کی شرح تصدیقات سلم پڑھی اور بعض کتابوں کی تکمیل مولانا باب اللہ جون پوری سے کی۔

اس کے بعد ہندوستان سے باہر نکلے اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں عازم عراق ہوئے اور طف' نجف' کاظمین اور مشہد وغیرہ مقامات کی سیر کی۔ طوسی کی ''الاستبصار'' اور ''الفوائد الحارہ'' آقا باقر محمد البہبہانی سے پڑھیں۔ ''شرح المختصر النافع'' کا کچھ حصہ خود اس کے مصنف علی بن محمد علی طباطبائی سے پڑھا۔ حدیث کی بعض کتابوں کے لیے کربلا کے مقام میں مہدی بن ابوالقاسم شہرستانی کی شاگردی کی۔ جب نجف گئے تو ''الوافی'' اور ''معالم الاصول'' کے کچھ حصے مہدی بن مرتضیٰ طباطبائی سے پڑھے۔ بعد ازاں انھی کی معیت میں کاظمین' عسکرین اور سرمن رائی کا سفر کیا اور اس اثنا میں ان سے فیض کثیر حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۱۹۴ھ(۱۷۸۰ء) میں مشہد کا سفر کیا۔ وہاں مہدی بن ہدایت اللہ موسوی اصفہانی سے ملاقات ہوئی اور ان کی صحبت میں رہے' ان سے اخذ علم کیا اور اجازہ سے سرفراز ہوئے۔

اس کے بعد وارد ہند ہوئے اور کچھ عرصہ اپنے شہر نصیر آباد میں قیام رہا۔ پھر لکھنؤ آئے۔ اس زمانے میں سلطنت اودھ کا وزیر حسن رضا خاں تھا جو شیعہ تھا' اس سے تعلقات بڑھے تو اس نے ان کو اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا اور بلند مرتبے سے نوازا۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے۔

اس زمانے میں شیعہ امامیہ بلاد ہند کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے تھے۔ نہ مذہب شیعہ کی دعوت و تبلیغ کا کوئی انتظام تھا اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا' جہاں یہ اپنا اجتماع یا اجلاس منعقد کر سکیں۔ شیخ محمد علی کشمیری ایک مشہور شیعہ عالم تھے جو فیض آباد میں مقیم تھے' انھوں نے ملک بھر کے شیعہ امرا و حکام کو اس بات پر آمادہ کیا

کہ وہ شیعہ فرقے کے لوگوں کو جمعے اور عیدین کی نمازیں باجماعت پڑھنے کی ترغیب دیں۔ اسی اثنا میں شیخ علی اکبر چشتی جو مشہور صوفی اور مرد صالح تھے، لکھنؤ گئے، اودھ کا شیعہ وزیر حسن رضا خاں ان کا عقیدت مند تھا، وہ شیخ ممدوح سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے بعد حسن رضا ان سے ملا تو انھوں نے اقامت جماعت کی تاکید فرمائی اور شیعہ مذہب کی روشنی میں اس کے فضائل بیان کیے۔ اب وزیر مذکور کو شیعہ عالم شیخ محمد علی کشمیری کی وہ بات یاد آئی جو اقامت جماعت کے لیے کچھ عرصہ پیشتر ان سے ہوئی تھی، چنانچہ اس نے اس کی پابندی کا عہد کیا اور والی اودھ نواب آصف الدولہ سے گفتگو ہوئی تو وہ بھی اس پر راضی ہو گیا۔ اس کے بعد صاحب ترجمہ سید دلدار علی نقوی نے جو شیعہ کے مجتہد تھے، نواب آصف الدولہ کے حکم سے ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ/۱۲ مئی ۱۷۸۶ء میں باجماعت نماز ادا کرنا شروع کی۔

سید دلدار علی نقوی وہ شیعہ مجتہد تھے، جنھوں نے اپنے مذہب کے احقاق و اشاعت اور دوسرے مذہبوں ــــــ بالخصوص احناف اور صوفیا وغیرہ ــــــ کے ابطال و تردید کے لیے بے حد کوششیں کیں اور تبلیغ کے دائرے کو دور تک پھیلا دیا۔ اس کے نتیجے میں علاقہ اودھ میں اس مذہب کو بہت فروغ ہوا۔

سید ممدوح نے اپنی بعض تصانیف عراق بھیجیں اور اپنے شیوخ سے شرف اجازہ حاصل کیا، چنانچہ علامہ مہدی بن مرتضی طباطبائی نجفی، علی بن محمد علی طباطبائی کربلائی اور مہدی بن ابوالقاسم موسوی شہرستانی نے ان کو اجازہ سے مشرف کیا۔

سید موصوف بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ اساس الاصول: یہ کتاب ادلۂ اربعہ کے اثبات میں ہے۔

۲۔ ابطال الفوائد المدنیہ: میر محمد مومن استرآبادی کی کتاب کا رد ہے۔

۳۔ عماد الاسلام: یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد توحید کے، دوسری عدل کے، تیسری نبوت کے چوتھی، امامت کے اور پانچویں جلد معاد کے بارے میں ہے۔

۴۔ منتہی الافکار: اصول فقہ سے متعلق یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔

۵۔ شرح باب الزکوۃ: ملا مجلسی کی حدیقۃ المتقین کے باب الزکوۃ کی شرح۔

۶۔ شرح باب الصوم: یہ ملا مجلسی کی حدیقۃ المتقین کے باب الصوم کی شرح ہے۔ یہ شرح دو جلدوں میں ہے۔

۷۔ الشہاب الثاقب: مذہب صوفیا کے رد میں۔

۸۔ اسی موضوع پر ایک اور رسالہ۔

۹۔ المواعظ الحسینیہ

۱۰۔ صوارم الالٰہیات فی قطع شبہات عابدی العزی واللات: تحفہ اثنا عشریہ کے باب الالٰہیات کے رد میں

۱۱- حسام الاسلام: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے باب النبوات کے رد میں ہے۔

۱۲- احیاء السنۃ: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے باب المعاد کے رد میں ہے۔

۱۳- ذوالفقار: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے بارھویں باب کی تردید میں ہے' جس میں ولا اور مسئلہ براپر بحث کی ہے۔

۱۴- رسالہ فی اثبات الغیبۃ: اس میں صاحب العصر والزمان کے سلسلے میں تحفہ اثنا عشریہ کا رد کیا گیا ہے۔

۱۵- رسالۃ فی اثبات الجمعۃ والجماعۃ فی غیبۃ الامام۔

۱۶- رسالۃ الاسانید: یہ اپنے بیٹے سید محمد کے لیے تحریر کیا۔

۱۷- مسکن القوب: یہ ان کی آخری دور کی کتاب ہے جو اپنے بیٹے مہدی کی وفات کے بعد ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء میں تصنیف کی۔

۱۸- رسالہ فی مسائل الخراج: ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء میں لکھا۔

۱۹- رسالہ ذہبیہ: سونے اور چاندی کے برتنوں کے بارے میں ہے۔

۲۰- اشارۃ الاحزان: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق ہے۔

۲۱- حاشیۃ علی شرح ہدایت الحکمۃ از صدرالدین شیرازی: یہ اوائل عمر کی تصنیف ہے۔

سید دلدار علی نقوی نے ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ/ ۲۔ مئی ۱۸۲۰ء کو غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اسی شہر میں مقبرہ حسینیہ میں مدفون ہوئے [1]۔

ذ

۶۴- مولانا ذوالفقار علی دیوی

دیوہ' صوبہ یوپی کا ایک مشہور مقام ہے جو زمانہ قدیم سے علم و علما کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ سلوک و تصوف میں بھی اس کو ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہاں جن حضرات نے جنم لیا اور فضیلت و کمال میں شہرت پائی' ان میں مولانا ذوالفقار علی دیوی کا نام لائق تذکرہ ہے۔ یہ اپنے دور کے فاضل شخص تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: ذوالفقار علی بن محبوب علی بن محمد رفیع بن شیخ الاسلام بن عبدالباقی بن مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی۔

مولانا ذوالفقار علی دیوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ مولانا احمد حسین انصاری فرنگی محلی اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی سے حصول علم کیا اور فقہ و اصول کے بلند مرتبت علما میں گردانے گئے۔

رائے بریلی بھی گئے' وہاں شیخ محمد عدل نقشبندی بریلوی کا سلسلہ فیض جاری تھا' ان سے منسلک ہوئے اور

[1] نجوم السماص ۴۰۲۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ص ۱۶۶ تا ۱۶۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰' ۶۱۔ رود کوثر ص ۶۳۲ تا ۶۳۴

اخذ طریقت کیا۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور مستفیض ہوئے۔ رائے بریلی میں مسند درس بھی بچھائی اور اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔

رائے بریلی سے لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کے منصب عدل و قضا پر متمکن ہوئے۔ اس کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا' علاوہ ازیں کئی درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات لکھے ❶۔

۶۵- قاضی ذوالفقار علی حیدر آبادی

برصغیر میں ارض دکن کو تہذیب و ثقافت اور علم و عرفان کی کثرت اور ارتقا میں ہمیشہ درجہ امتیاز حاصل رہا۔ اس سرزمین کو جن بزرگان دین اور فقہائے ذی شان نے رونق بخشی ان میں قاضی ذوالفقار علی بن قاضی یوسف کا اسم گرامی شامل ہے۔ یہ دراصل شاہ جہان پور کے رہنے والے تھے' پھر حیدر آباد آ گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے علاقے کے نامور عالم و فقیہ تھے۔ پہلے ان کے والد (قاضی یوسف) حیدر آباد کے قاضی تھے۔ ان کی وفات کے بعد سکندر جاہ کے عہد ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں اس منصب پر انھیں فائز کیا گیا۔ پھر تا زندگی یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں فوت ہوئے ❷۔

۶۶- مولانا رشید الدین خاں دہلوی

مغل حکومت کے دور زوال یعنی تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسویں میں دارالحکومت دہلی کی علمی رونقیں زوروں پر تھیں اور متعدد علما و فضلا تبلیغ دین' اشاعت اسلام اور درس و تدریس میں مشغول تھے۔ بہت سے اہل کمال مختلف علاقوں کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آ بسے تھے اور پھر اسی شہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ ان حضرات میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے والد کا نام امین الدین' دادا کا وحید الدین اور پردادا کا عبدالسلام تھا۔ آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے اور وہاں سے نقل مکانی کر کے دہلی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

رشید الدین خاں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ کتب درسیہ مفتی علی کبیر بنارسی سے پڑھیں' لیکن زیادہ تر حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی خدمت میں رہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۱

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۱۔ بہ حوالہ تزک محبوبی۔

عبدالقادر دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور علوم مروجہ کے تمام گوشوں میں مہارت پیدا کی، یہاں تک کہ یکتائے روزگار اور یگانۂ دہر قرار پائے۔ علوم معقول ومنقول اور فروع واصول میں شیخ عصر اور فاضل دوراں تھے۔ دہلی کی زمام تدریس ان کے ہاتھ میں تھی۔ علاوہ ازیں عبادت گزار، حامی کتاب وسنت، قاطع بدعات ومحدثات، نامور محقق، خطیب ومقرر اور منجھے ہوئے مناظر تھے۔ فکر وخیال کی سلامتی اور عمل وکردار کی پختگی میں اپنی مثال آپ تھے۔

زیادہ عرصہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی خدمت میں رہے۔ شاہ صاحب ان پر انتہائی شفقت فرماتے اور ان کی تعلیم وتربیت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ذہن رسا پایا تھا، طبیعت میں اثر پذیری کا غلبہ تھا اور شاہ صاحب کی نظر التفات بھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علوم میں رشک اقران ہوئے، شیعیت کے موضوع سے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس سلسلے کی جزئیات پر عبور رکھتے تھے۔ مناظرہ ومجادلہ میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شیعہ کے خلاف بہت کچھ لکھا اور ان کے علما سے جو مناظرے اور مباحثے کیے، وہ مشہور ہیں۔

حکام وقت مولانا رشید الدین خاں کے علم وادراک اور تقویٰ وزہد سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عہدہ قضا قبول فرمالیں تاکہ عوام وخواص سب کو آسانی سے انصاف مہیا ہوتا رہے۔ لیکن انھوں نے یہ نازک اور اہم ذمے داری قبول کرنے سے گریز فرمایا اور اس منصب سے دور رہے۔ بالآخر جب اصرار زیادہ بڑھا اور ارکان حکومت نے کسی بڑے منصب پر متمکن ہونے پر زور دیا تو مدرسہ شاہ جہان کی مدرسی قبول فرمائی اور اس منصب کو تمام مناصب پر ترجیح دی۔ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی اور اس کا بڑا حصہ فقرا ومساکین اور غربا ومستحقین پر خرچ ہو جاتا تھا، خود تنگ دستی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن نہ کبھی کسی ایسے منصب کی خواہش کی جو زیادہ آمدنی کا باعث ہو اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ خدمت تدریس کا معاوضہ سو روپے سے بڑھایا جائے۔ جو ملتا تھا اسی پر کفایت کرتے تھے۔

مولانا رشید الدین خاں دہلوی اپنے عہد کے عظیم القدر مصنف ومؤلف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ الشوکة العمریه:

۲۔ الصولة الغضنفریه: یہ کتاب لکھنؤ کے شیعہ علما کے جواب میں نکاح متعہ کی بحث سے متعلق لکھی۔

۳۔ ایضاح لطافة المقال۔

۴۔ تفضیل الاصحاب۔

۵۔ اعانة الموحدین واهانة الملحدین: یہ کتاب کلکتے کے رام موہن رائے کے جواب میں لکھی، جس نے دین ہنود کو چھوڑ کر ''برہمو سماج'' کے نام سے ایک نیا دین ایجاد کیا تھا۔

۶- المکاتیب یہ مولانا رشید الدین خاں اور شیخ احمد عرب یمانی شروانی (مصنف نفحۃ الیمن) کے خطوط ❶ کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جو ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔

فارسی میں تو مہارت رکھتے ہی تھے، عربی بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ تمام وقت علوم دینیہ میں مشغولیت اور مباحثات علمی میں مصروفیت میں گزرتا۔ دہلی کے حلقہ اہل علم کی آبرو تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالقادر رام پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں: "تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی۔ ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے، مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے، نمائش کے زیادہ پابند تھے۔ ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے۔ جو کچھ کہتے دراز و طویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں ردوقدح کی گنجائش نہیں رہی۔"

آخر عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ تھا لیکن پورا نہ ہو سکا۔ ستر برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ بیماری اور ضعف کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء کو موت کی آغوش میں چلے گئے ❷۔

۶۷- مولانا رضا علی خاں بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر بانس بریلی میں جن علما و فقہا نے جنم لیا اور ناموری حاصل کی، ان میں مولانا رضا علی خاں بریلوی کا نام قابل ذکر ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: رضا علی بن کاظم علی بن اعظم شاہ بن محمد سعادت یار خاں افغانی۔ یہ دراصل بھڑیچ پٹھان تھے۔ بھڑیچ، پٹھانوں کا ایک گروہ ہے، جس کو روہیلہ کہتے ہیں۔

مولانا رضا علی خاں کے اسلاف میں سے بعض بزرگ ہندوستان آئے اور سلاطین دہلی سے تقرب پیدا کیا، اس کے نتیجے میں ان کے آباواجداد چھ ہزاری کے منصب سے سرفراز ہوئے اور بڑے بڑے عہدوں پر

---

❶ نفحۃ الیمن عربی ادب کی ایک مشہور ابتدائی کتاب ہے۔ برصغیر کے عربی مدارس میں عام طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے مصنف کا نام شیخ احمد یمنی شروانی ہے۔ وہ بارھویں صدی ہجری کے آخر یا تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں برصغیر آئے۔ یہاں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی لیکن زیادہ تر کلکتے میں مقیم رہے۔ عربی ادب میں مہارت رکھتے تھے۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ "نفحۃ الیمن" انھوں نے صدر مدرس مدرسہ کلکتہ لیمڈون کی فرمائش پر لکھی اور اتنی مقبول ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مدارس عربیہ دینیہ کے نصاب میں شامل ہوگئی۔ لکھنو کے فرماں رواں غازی الدین حیدر سے بھی ان کے مراسم تھے۔ اس کے کہنے سے "مناقب حیدریہ" لکھی۔ شیخ احمد یمانی شافعی المسلک فقیہ تھے۔

❷ ابجد العلوم ص ۹۱۷۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۱۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۳۔ الیانع الجنی ص ۷۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۷۹۔ تذکرہ اہل دہلی ص ۷۰ تا ۷۲۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۰۹، ۴۱۰۔ آثار الصنادید ص ۲۶۴، ۲۶۵۔ تاریخی مقالات ص ۲۴۷، ۲۴۸۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۱۹۱، ۱۹۲۔

ان کو متمکن کیا گیا۔ ان حضرات نے بانس بریلی کو اپنا مسکن قرار دیا۔

اس خاندان میں ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء کو مولانا رضا علی پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش پائی۔ اس زمانے میں رام پور کے ممتاز عالم قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری کا سلسلہ درس ٹونک میں جاری تھا۔ مولانا رضا علی نے ٹونک کا عزم کیا اور قاضی صاحب ممدوح کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ تیئس سال کی عمر میں اکتساب علوم عقلیہ ونقلیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ علوم متداولہ کی تمام کتابوں پر نظر تھی' بالخصوص علم فقہ میں عبور حاصل تھا۔ بہت اچھے واعظ تھے اور موثر وعظ کہتے تھے۔ لینت کلام' سبقت سلام' زہد وقناعت' حلم وتواضع اور مکارم اخلاق میں ممتاز تھے۔ بعض امور میں اپنے اماثل و اقران سے فائق تر تھے۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی برصغیر کے مشہور عالم مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے جد امجد تھے۔ مولانا احمد رضا خاں کے والد ماجد کا اسم گرامی نقی علی خاں تھا۔

مولانا رضا علی خاں نے ۲ جمادی الاولی ۱۲۸۲ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۸۶۵ء کو وفات پائی ❶۔

۶۸- مفتی رضی الدین کاکوروی

دیار ہند کے شہر کاکوری کو عرصہ دراز تک علما وفقہا اور فضلا وزعما کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے کئی علمائے کرام قضا وافتا کے مناصب جلیلہ پر فائز رہے ہیں اور خاص طور پر مغل بادشاہوں نے ان کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے امرا ووزرا کے ہاں بھی ان کو اعزاز واکرام حاصل رہا ہے۔

علمائے کاکوری میں مفتی رضی الدین کاکوروی نے تیرھویں صدی ہجری میں بڑی شہرت پائی۔ یہ اپنے علاقے کے شیخ وفاضل اور اونچے مرتبے کے عالم وفقیہ تھے۔ والد کا نام قاضی علیم الدین اور دادا کا قاضی نجم الدین تھا۔ کاکوری اور اس کے اطراف وجوانب میں ان اصحاب فضل کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور فقہائے ملک میں ان کا علمی وفقہی مرتبہ بہت بلند تھا۔

مفتی رضی الدین کی ولادت ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء کاکوری میں ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ ان کے والد قاضی علیم الدین کاکوروی اپنے زمانے کے مفتی وقاضی تھے' لائق بیٹے نے ان سے کسب علم کیا۔ مزید تحصیل کے لیے اس دور کے جلیل القدر فاضل شیخ فضل اللہ عثمانی نیوتنی کی شاگردی اختیار کی جو اس عہد کے محدث وفقیہ اور ان کے دادا قاضی نجم الدین کاکوروی کے تلمیذ تھے۔ بعد ازاں حدیث کی کتابیں اپنے والد کے عم محترم شیخ امین الدین محدث سے پڑھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دہلی میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کی مسند تدریس آراستہ تھی اور ملک وبیرون

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۹۔

ملک سے گروہ در گروہ اصحاب علم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ علم حدیث کی تعلیم میں برصغیر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور ہر طرف ان کے فضل وکمال کا شہرہ تھا۔ مفتی رضی الدین کاکوروی نے ان کے آستانۂ فیض پر حاضری دی اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔

جب تحصیل علم سے فارغ ہو چکے اور سند واجازہ سے بہرور ہو گئے تو دہلی کا منصب افتا ان کے سپرد کیا گیا۔ یہ ایک بہت ہی ذمہ دارانہ منصب اور عظیم عہدہ تھا' جس پر اسی شخص کو مامور ومتعین کیا جاتا تھا جو تمام علوم متداولہ بالخصوص قرآن وحدیث اور فقہ میں ماہر ہوتا تھا۔ مفتی رضی الدین کو اسی بنا پر دارالحکومت دہلی کا یہ اعزاز بخشا گیا کہ وہ ہر اعتبار سے اس کے اہل تھے۔ ایک مدت تک وہ دہلی میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد ملک کے مختلف بلاد وامصار میں گئے اور لوگوں کو خوب مستفید ومستفیض فرمایا۔

مفتی صاحب ممدوح نے ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ/ ۷ نومبر ۱۸۵۸ء کو کاکوری میں وفات پائی ❶۔

۶۹۔ شیخ رفیع الدین فاروقی مرادآبادی

شیخ رفیع الدین مرادآبادی کا سلسلہ نسب یہ ہے: رفیع الدین بن فرید الدین بن عظمت اللہ بن عصمت اللہ بن قاضی عبدالقادر فاروقی لکھنوی ثم مرادآبادی۔ اپنے عصر کے عالم کبیر اور مشہور فاضل تھے۔

۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۲ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر کے اساتذہ سے کسب علم کیا۔ اس زمانے میں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا غلغلہ درس بلند تھا' رفیع الدین نے دہلی کے لیے رخت سفر باندھا اور حضرت شاہ صاحب کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی ان کی علمی صحبتیں رہیں' جن میں بہت سے دقیق واہم مسائل زیر بحث آتے تھے۔ اس کے بعد اپنے وطن مرادآباد تشریف لے گئے' وہیں درس وافادے کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء میں ارادہ حج کے لیے گھر سے نکلے۔ سورت پہنچے تو شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد عالی مرتبت شیخ خیر الدین سورتی (متوفی ۱۰ رجب ۱۲۰۶ھ/ ۴ مارچ ۱۷۹۲ء) کا معرکہ درس وتدریس جاری تھا' اس میں شرکت کی۔ ان سے صحیح بخاری پڑھی اور سند واجازہ سے مفتخر ہوئے۔

شیخ خیر الدین سورتی سے استفادے کے بعد کشتی پر سوار ہوئے اور شیخ ولی اللہ برہان پوری (متوفی ۱۱ جمادی الاولی ۱۲۰۷ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۵۹۲ء) کی معیت میں سفر حجاز پر روانہ ہوئے۔ حج وزیارت کی سعادت حاصل کی' متعدد مشائخ وعلما سے ملے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء کو واپس ہندوستان آئے اور حالات حرمین اور سفر حجاز کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی۔

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۸۰ بحوالہ مجمع العلماء۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی تھے' جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱- قصر الامال بذكر الحال و المال۔
۲- سلو الكئيب بذكر الحبيب۔
۳- شرح الاربعين النوويه۔
۴- كنز الحساب۔
۵- تذكرة المشائخ۔
۶- تذكرة الملوك۔
۷- تاريخ الافاغنه۔
۸- كتاب الاذكار۔
۹- ترجمه عين العلم۔
۱۰- شرح غنية الطالبين۔
۱۱- الافادات العزيز يه: اس میں انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وہ تحریریں جمع کی ہیں' جو انھوں نے تفسیر کے سلسلے میں ان کو لکھ کر بھیجیں۔ یہ کتاب بہت سے عمدہ تفسیری فوائد پر مشتمل ہے۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے ۸۹ سال عمر پا کر ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۲۳ء کو مراد آباد میں مرض استسقا سے انتقال کیا❶۔

۷۰- شاہ رفیع الدین دہلوی

ہندوستان میں قرآن و حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی جو خدمت خاندان ولی اللہی نے کی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارھویں صدی ہجری میں خطہ ہند کے جلیل القدر محدث اور رفیع المرتبت مصنف تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹے عطا فرمائے اور چاروں اپنے زمانے کے بے نظیر عالم تھے۔ ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں:

۱- سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ وفات ۷ شوال ۱۲۳۹ھ/ ۵ جون ۱۸۲۴ء۔

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۶ (۱۵ ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ/ ۲۷ مارچ ۱۸۰۴ء مرقوم ہے)۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۸۲ (۲۵ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ/ ۱۱ فروری ۱۸۰۹ء لکھا ہے)۔ اتحاف النبلاص ۲۵۱ (میں ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۴ء مرقوم ہے)۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳ (۱۵ ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ/ ۲۷ مارچ ۱۸۰۴ء ہے)

۲۔ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی۔ وفات ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۱۹۔ اگست ۱۸۱۸ء۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی۔ وفات ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ/ ۲۷ مئی ۱۸۱۵ء۔

۴۔ حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی وفات ۱۲۲۷ھ/ ۱۸۱۲ء۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چار فرزندان گرامی میں سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز اور سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی ہیں' لیکن وفات سب سے پہلے چھوٹے یعنی شاہ عبدالغنی نے پائی۔ اس کے بعد ان سے بڑے شاہ عبدالقادر نے' پھر ان سے بڑے شاہ رفیع الدین نے اور سب کے بعد سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز نے اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

شاہ رفیع الدین دہلوی' مترجم قرآن' محدث دوراں' فقیہ زماں اور عدیم المثال متکلم و اصولی تھے۔ فرید العصر اور نادر الدہر عالم تھے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہ سے حصول علم کیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ اخذ طریقت شیخ محمد عاشق پھلتی سے کیا۔ بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ پھر مسند درس و افتا کو زینت بخشی۔ علوم دینیہ اور فنون عقلیہ میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ادب و شاعری میں بھی مرجع ارباب استعداد تھے۔

شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد درس و تدریس کے فرائض ان کے فرزند کبیر شاہ عبدالعزیز انجام دیتے تھے۔ افتا کی ذمے داریاں بھی انہی کے سپرد تھیں۔ لیکن جب شاہ عبدالعزیز کبر سنی کو پہنچ گئے اور نابینا ہو گئے' جسمانی طور سے کمزور اور کثرت امراض میں مبتلا ہو گئے تو یہ تمام اہم ذمے داریاں شاہ رفیع الدین کی طرف منتقل ہو گئیں۔ ان باکمال حضرات میں سے بھی جو شاہ عبدالعزیز سے سند فضیلت حاصل کر چکے تھے' متعدد لوگ شاہ رفیع الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے تبحر علمی سے استفادہ کیا اور سند و اجازہ کی سعادت حاصل کی۔

شاہ رفیع الدین ہر شعبہ فن میں ماہر اور ہر گوشہ علم میں کامل تھے۔ حفظ و اتقان کی نعمت سے مالا مال تھے اور تمام صلاحیتوں سے اللہ نے انھیں نوازا تھا۔ اتقا و پرہیز گاری' متانت و سنجیدگی' عدل و راست بازی' انصاف شعاری' عجز و انکسار اور حلم و بردباری وغیرہ تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے۔ حرص و آز سے بے زار اور دنیا کے طمع و لالچ سے نفور تھے۔

انھوں نے اپنے اوقات شب و روز کو چند حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور جو حصہ وقت جس کام کے لیے خاص تھا' اس میں وہی کام کرتے تھے۔ درس و تدریس' تصنیف و تالیف' فتووں کے جواب' وظائف و اوراد' عبادت' گھر کے ضروری کام کاج' یہ ان کے اہم مشاغل تھے اور ہر ایک کے لیے وقت متعین تھا۔

وہ عربی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ شیخ بو علی سینا چوتھی صدی ہجری کا مشہور فاضل اور فن طب کا موجد و ماہر گزرا ہے' اس نے عربی میں ایک پرزور قصیدہ نفس اور ماہیت و حقیقت نفس کے بارے میں لکھا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا نہایت عمدہ جواب پیرایۂ نظم میں دیا تھا۔ شاہ رفیع الدین نے اس کو مخمس کیا۔ اسی طرح رسول

اللہ ﷺ کے معراج کے بارے میں انھوں نے ایک خوب صورت قصیدہ کہا۔

شاہ رفیع الدین صاحب متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے، جن میں سے ہر ایک کو اپنے موضوع میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں چند تصانیف یہ ہیں:

۱- رسالہ در عروض

۲- دمغ الباطل

۳- اسرار المحبۃ

۴- رسالہ در اثبات شق قمر

۵- رسالہ در مقدمہ علم

۶- رسالہ در تاریخ

۷- رسالہ در آثار قیامت

۸- رسالہ در تحقیق الوان

۹- رسالہ فی عقد الانامل

۱۰- کتاب تکمیل الصناعۃ

۱۱- رسالہ در حجاب

۱۲- رسالہ در برہان تمانع

۱۳- رسالہ در علم منطق

۱۴- رسالہ فی امور عامہ

۱۵- حاشیہ علی میر زاہد

شاہ صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کا اردو میں لفظی ترجمہ کیا، جو آج بھی اسی طرح مقبول و متداول ہے، جیسا کہ پہلے تھا۔

انھوں نے اس زمانے میں ترجمہ کیا جب کہ اس کی کوئی مثال سامنے نہیں تھی اور اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی۔ نہ اس کے قواعد مرتب ہوئے تھے اور نہ واضح اصول متعین ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا ہر لحاظ سے انتہائی مشکل تھا۔ یہ مشکل کام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسان کر دیا۔ یہ ایک عظیم صدقہ جاریہ ہے، جس سے بے شمار لوگ مستفید ہوئے اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

شاہ صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ فن ریاضی کے ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ شاہ رفیع الدین تمام علوم میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن علم ریاضی میں ان کو بالخصوص ید طولیٰ حاصل ہے۔

شاہ رفیع الدین نے اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۹۔ اگست ۱۸۱۸ء کو دہلی میں وفات پائی۔ شاہ عبدالعزیز ان پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ ان کے علم و فضل اور تحقیق و کاوش پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کبرسنی کو پہنچ گئے اور نابینا ہو گئے تو اپنی جگہ انہی کو مقرر فرمایا اور درس و افتا کی ذمے داریاں انہی کے سپرد کر دیں۔ لیکن ان کے لیے انتہائی حزن و ملال کی بات تھی کہ وہ بھی ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے۔

جب شاہ رفیع الدین کا جنازہ اٹھا تو شاہ عبدالعزیز نے باوجود کمزور اور نابینا ہونے کے جنازے کو ہاتھ لگانے اور کندھا دینے کی کوشش کی۔ یہ منظر بڑا دردناک تھا❶۔

شاہ رفیع الدین کے چار بیٹے تھے۔ شاہ محمد موسیٰ' محمد عیسیٰ، محمد مخصوص اللہ اور حسن جان۔ شاہ محمد موسیٰ کی شادی اپنے عم محترم شاہ عبدالعزیز کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔

شاہ رفیع الدین کے یہ چاروں بیٹے اگرچہ اصحاب فضل و کمال تھے' لیکن شاہ محمد مخصوص اللہ اپنے علم و فضل اور نیکی و تقویٰ میں خاص طور پر مشہور تھے۔ تمام علوم شاہ عبدالعزیز سے پڑھے اور بہت جلد اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ طویل عرصے تک طلبا کی تعلیم و تدریس میں بھی مشغول رہے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' عقاید و کلام اور اصول وغیرہ علوم میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر علم میں ماہر تھے۔ عابد و زاہد تھے اور طبیعت قانع پائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آخر عمر میں سررشتہ تدریس سے الگ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اپنے آپ کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

مولانا امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں کہ زاہد و عابد شب زندہ دار تھے۔ تدریس و تعلیم کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ان کے شاگردوں کی جماعت میں سرسید احمد خاں بھی شامل ہیں۔ عامل آمین و رفع الیدین تھے' سرسید بھی ان کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس سنت نبوی پر عمل پیرا رہے۔

منقول ہے کہ مغلیہ خاندان کی شہزادیاں حویلی میں تشریف لانے کی زحمت دیتیں اور پرتکلف کھانوں کے خوان خدمت عالی میں پیش ہوتے' آپ ان پر دعا پڑھتے اور مساکین کو بانٹ دیتے۔ طلبائے علم اعتراض کرتے تو فرماتے میں اس کھانے کو متوفی کی ملکیت میں دے دیتا ہوں۔ پھر اعتراض ہوتا تو فرماتے ''میاں اس بہانے سے مساکین کو کھانا مل جاتا ہے۔''

ان کے مدرسے میں بھی انواع و اقسام کے کھانوں کے خوان آتے' لیکن سب چیزیں غربا و مساکین

---

❶ شاہ رفیع الدین کے حالات کے لیے دیکھیے: آثار الصنادید ص ۲۶۶ تا ۲۶۸۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۱۵۹ تا ۱۶۱۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۸۔ ابجد العلوم ص ۹۱۵۔ الیانع الجنی ص ۷۵، ۷۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۶۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۴۸' ۲۴۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۹' ۴۷۰۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۸۲ تا ۱۸۶۔ یادگار دہلی ص ۱۰۳۔ تاریخی مقالات ص ۲۴۵' ۲۴۶۔ رود کوثر ص ۵۹۶۔ حیات ولی ص ۶۲۸، ۶۳۴۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۶۵' ۶۶۔

کو بانٹ دی جاتیں۔

شاہ محمد مخصوص اللہ نے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ ان کی ایک صاحب زادی تھیں' ان کا نام امتہ الغفار تھا' صحاح ستہ پڑھی ہوئی تھیں اور عابدہ وزاہد خاتون تھیں ❶۔

۱۷- شیخ رؤف احمد رام پوری

شیخ رؤف احمد بن شعور احمد بن محمد شرف بن رضی الدین فاروقی رام پوری' حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ فاضل اور متقی بزرگ تھے۔ اپنے دور کے مفسر ومحدث اور فقیہ تھے۔ شاہ ابوسعید دہلوی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ مولد ومنشا رام پور ہے۔ مفتی شرف الدین رام پوری سے حصول علم کیا۔ بعد ازاں عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ ان سے خوب استفادہ کیا۔ اخذ طریقت شیخ درگاہی اور اس کے بعد شاہ غلام علی سے کیا۔ عرصے تک منصب مشیخت پر فائز اور مسند دعوت وارشاد پر متمکن رہے۔ بے شمار حضرات نے ان سے فیض پایا اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالا۔

بعد ازاں بھوپال گئے اور وہاں اقامت گزیں ہوئے۔ قیام بھوپال کے زمانے میں انھوں نے اسلام کی بہت خدمت کی اور لوگوں کو صراط مستقیم پر گام زن رہنے کی تلقین فرماتے رہے۔

اچھے شاعر تھے اور رافت تخلص کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

شیخ رؤف احمد فاروقی' مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:

۱- تفسیر رؤفی: یہ دو جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر ہے اور اردو زبان میں ہے۔
۲- درالمعارف: اس نام سے انھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات جمع کیے تھے۔
۳- رسالہ دراذ کار واشغال: وظائف واوراد اوراذ کار واشغال کے سلسلے میں یہ ایک رسالہ ہے۔
۴- ارکان اسلام: یہ کتاب اردو میں ہے۔
۵- مثنوی یوسف زلیخا: یہ بھی اردو میں ہے۔
۶- معراج نامہ: اردو نثر میں ہے۔
۷- سلوک العارفین: یہ فارسی میں ہے۔
۸- شراب رحیق: فارسی میں ہے۔
۹- جواہر علویہ: یہ کتاب بھی فارسی میں ہے۔
۱۰- مثنوی اسرار رغیب:

❶ آثار الصنادید ص ۲۶۸۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۹۔ حیات ولی ص ۶۳۴' ۶۳۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۱۳ تا ۱۱۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳۔ تاریخی مقالات ص ۲۴۸۔

۱۱- مرتب الوصول:

۱۲- رسالہ صادقہ مصدوقہ:

۱۳- دیوان رافت: یہ اردو اور فارسی میں ان کا مجموعہ کلام ہے۔

اس عالم وفقیہ نے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں وفات پائی۔

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (صفحہ ٦٧) میں لکھا ہے کہ انھوں نے تفسیر رؤفی کی تصنیف کا آغاز ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں کیا اور اختتام ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوا۔ بھوپال سے حج کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء کو جہاز میں وفات پا گئے۔

ظاہر ہے، رحمان علی کے درج کردہ یہ سنین صحیح نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شیخ رؤف احمد رام پوری ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ/ ۵۔ نومبر ۱۷۸٦ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام رحمان بخش ہے۔ علوم عقلیہ کی تحصیل کے بعد شیخ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بارہ سال ان سے منسلک رہے۔ پھر شاہ غلام علی کی خدمت میں دہلی گئے اور سلوک وتصوف میں اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں تفسیر رؤفی تصنیف کی اور اس سے ایک سال بعد ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں وفات پا گئے۔ عبدالغفور نے مندرجہ ذیل قطعے میں تاریخ کہی:

رافت آں قبلہ ارباب کمال — از جہاں رفت بسوئے جنت
بہر تاریخ رحیلش نساخ — شدہ رقم قدوہ جنت رافت ❶

۷۲- مفتی ریاض الدین کاکوروی

فقہائے کاکوری میں مفتی ریاض الدین بن قاضی علیم الدین بن قاضی نجم الدین کاکوروی قابل ذکر ہیں۔ اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے، اور تقویٰ وصلاح کے اوصاف سے متصف تھے۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے والد قاضی علیم الدین اور شیخ فضل اللہ عثمانی نیوتنی سے اکتساب علم کیا۔ فن حدیث اور اس کے متعلقات کے حصول پر بالخصوص عنان توجہ مرتکز فرمائی اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی، مرزا حسن علی لکھنوی، مولانا نور الحسن کاندھلوی اور اپنے عم مکرم شیخ حمید الدین کاکوروی سے علوم حدیث کی تکمیل کی اور سند واجازہ حاصل کیا۔ اخذ طریقت بھی شیخ حمید الدین کاکوروی سے کیا۔

جب علوم وفنون سے فارغ ہو چکے اور تصوف وطریقت سے بہرہ اندوز ہو گئے تو خود درس وافادے کا

---

❶ شیخ رؤف احمد مجددی رام پوری کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے:

تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۳۴ تا ۱۴۷۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۲، ۴۷۳۔ نزہتہ الخواطر، ج ۷ ص ۱۸۸۔ انتخاب یادگار ص ۱۴۳ تا ۱۴۵۔ خزینتہ الاصفیا ج ۱ ص ۷۰۳، ۷۰۴۔ تذکرہ اولیائے ہندو پاکستان ص ۴٦۸۔ تذکرہ گلشن بے خار ص ۸۵، ۸۴۔ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ٦٦، ٦٧۔

سلسلہ شروع کیا اور عرصہ دراز تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار علما و طلبا نے فیض حاصل کیا۔

قوی الحفظ تھے۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ علوم و فنون کے سب پہلوؤں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ اپنے اقران و معاصرین میں احترام کے مالک تھے۔

اس زمانے میں رام پور کا حکمران نواب کلب علی خاں تھا۔ اس کو ان کی خصوصیات گوناگوں کا علم ہوا تو رام پور تشریف لانے کی زحمت دی اور ریاست کا منصب افتا پیش کیا۔ یہ اس عہد کا ایک عظیم منصب تھا' جس پر اسی شخص کو متعین کیا جاتا تھا' جو تفسیر' حدیث اور فقہ وغیرہ علوم کا ماہر ہوتا تھا۔ اس منصب جلیلہ پر وہ کافی عرصہ فائز رہے۔

اس کے بعد حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں کے قیام پر تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ غرہ صفر ۱۲۹۵ھ/فروری ۱۸۷۸ء کو حیدر آباد میں انتقال کر گئے ❶۔

ز

۷۳- قاضی زین العابدین انصاری یمانی

قاضی زین العابدین کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: زین العابدین بن محسن بن محمد بن مہدی بن محمد بن ابوبکر انصاری خزرجی سعدی یمانی۔! اپنے عہد کے عالم کبیر اور شیخ تھے۔ ارض ہند کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ملک یمن کے ایک مقام "حدیدہ" میں پیدا ہوئے' نشوونما بھی وہیں پائی۔ قاضی زین العابدین کے دو بھائی ___ شیخ حسین اور شیخ محمد ___ جید علمائے وقت میں سے تھے۔ قاضی صاحب ممدوح نے ان سے کسب علم کیا۔ بعد ازاں "مراوعہ" گئے' وہاں سید حسن بن عبدالباری اہدل کا غلغلہ درس بلند تھا' اس میں شریک ہوئے۔ عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہے اور بہت سے علوم کی تحصیل کی۔ علم فقہ اور علم نحو میں بالخصوص ممتاز قرار پائے۔ کثیر المطالعہ عالم تھے اور شب و روز ان کا یہی مشغلہ تھا۔ کثرت مطالعہ اور علوم میں انتہائی رغبت و تعلق کی بنا پر ہر شعبہ فن پر حاوی ہو گئے تھے۔

اس زمانے میں ریاست بھوپال کے مدار المہام منشی جمال الدین صدیقی دہلوی تھے' جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور متقی تھے۔ جب وہ حج بیت اللہ کے لیے گئے تو "حدیدہ" پہنچے۔ قاضی زین العابدین سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت صرف انیس سال کے نوجوان تھے' لیکن نہایت ذہین اور صاحب علم و مطالعہ تھے۔ مدار المہام موصوف ان کی صلاحیت سے متاثر ہو کر انھیں اپنے ساتھ بھوپال لے آئے اور اپنے ایک عزیز ___ خیر الدین ___ کی بیٹی کا عقدان سے کر دیا' اور بھوپال کے نائب قاضی کا منصب عطا کیا۔ ایک مدت تک وہ اس منصب پر متمکن

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۱۸۸' ۱۸۹ بہ حوالہ مجمع العلما

رہے۔ پھر انھیں بھوپال کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد سید صدیق حسن خاں بھی بھوپال تشریف لے آئے اور دونوں کے درمیان ذہنی موافقت پیدا ہو گئی۔ سید صدیق حسن خاں نے قاضی زین العابدین سے صحاح ستہ پڑھی اور قاضی زین العابدین نے ان سے فارسی ادبیات وانشا کی کتابیں پڑھیں۔

بعد ازاں سید صدیق حسن خاں نے بھوپال میں سکونت اختیار کر لی اور قاضی زین العابدین یمانی نے بھی اسی شہر کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا۔ قاضی صاحب ممدوح کے خاندان کے مختلف افراد نے ہندوستان میں بہت علمی کام کیا۔ علامہ خلیل عرب بھی جو ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں اقامت اختیار کر لی تھی، اسی خاندان کے رکن رکین تھے۔ ہندوستان کے شہر بھوپال میں اب بھی اس خاندان کے علمی آثار موجود ہیں۔

بہر حال قاضی زین العابدین یمانی تیرھویں صدی ہجری کے محدث وفقیہ اور عالم کبیر تھے۔ نحو، لغت، انشا اور دیگر علوم وفنون میں دست رس رکھتے تھے۔ شرح المناسک اور مختلف فقہی مسائل سے متعلق فتاوے کا ایک ضخیم ومستند مجموعہ ان کی تصنیفی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور عنوانات پر بھی انھوں نے رسائل تحریر کیے۔ ۲ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ کو بھوپال میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

س

۴۷۔ مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری

جون پور، ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے۔ ۱۳۹۴ھ سے لے کر ۱۴۷۶ء تک تقریباً نوے سال ''شرقی سلطنت'' کے نام سے یہاں ایک مستقل حکومت قائم رہی، جس کا دارالسلطنت جون پور تھا۔ اس دور کے ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں میں یہ ایک مضبوط سلطنت تھی۔ اس کے سلاطین جہاں سیاسی قوت و استحکام اور فکر وعمل میں مشہور تھے، وہاں علم دوستی اور قدر دانی، علما میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔

جون پور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس شہر اور اس کے دیہات وقصبات میں بے شمار صوفیا و اتقیا اور فضلا وصلحا پیدا ہوئے اور ان میں سے ہر ایک اپنے علم وکمال کی بنا پر نامور ہوا۔ مرکز اصحاب علم اور محور ارباب فضل ہونے کی بنا پر اس شہر نے ''شیراز ہند'' کا لقب پایا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر بجا طور پر اس لقب کا مستحق تھا۔ جون پور کی زرخیز ومردم آفرین مٹی سے جو حضرات نمایاں ہو کر ابھرے اور مرتبہ فضیلت کو پہنچے، ان کے اسمائے گرامی سلسلہ فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں مرقوم ہیں اور ان کے علمی، تصنیفی اور تدریسی کارنامے مناسب تفصیل کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۹۰، ۱۹۱۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن بزرگان دین اور ارباب ہم نے جون پور میں جنم لیا اور پھر پورے برصغیر کو اپنے فضائل گوناگوں سے نوازا' ان میں حضرت مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ والد کا نام نامی رعایت علیؒ دادا کا درویش علی اور پڑدادا کا نذر علی تھا۔ سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں مولانا سخاوت علی جون پوری برصغیر کے محدث عالی مقام اور فقیہ ذی شان تھے۔

مولانا سخاوت علی فاروقی ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء کو جون پور سے گیارہ میل بہ جانب جنوب قصبہ ''منڈیاہوں'' میں پیدا ہوئے۔ مختصرات مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں۔ متوسطات کی تحصیل مولانا احمد اللہ انامی (تلمیذ شاہ محمد اسحاق دہلوی) سے کی۔ بعض کتابوں کی تکمیل مولانا احمد علی چریاکوٹی کے حلقہ درس میں کی' مطولات اور انتہائی درسی کتابوں کے لیے جن میں حدیث وفقہ کی امہات الکتب شامل ہیں' مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ ان دونوں بزرگوں سے سند واجازہ سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ بیعت تصوف حضرت سید احمد شہید بریلوی کے دست حق پرست پر کی اور عرصے تک ان سے انسلاک اختیار کیے رکھا۔ ان تمام اساتذہ اور اصحاب کمال سے استفاضہ کے بعد اپنے عصر میں عالم و محدث اور فقیہ و مفتی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ نیز ورع وتقویٰ اور عبادت و زہد میں یگانہ روزگار ہوئے۔ صائب الفکر' اور نہایت متحمل مزاج تھے۔ بے مقصد گفتگو اور ناروابات سے ہمیشہ محترز رہے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور معمولی باتوں میں اپنے رفقا سے اظہار اختلاف کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔

تحصیل علم کے بعد اپنے وطن جون پور واپس آئے اور درس و افادۂ طلبا کے لیے کمر ہمت باندھی۔ وہاں کی جامع مسجد پر' جو سلاطین شرقیہ کی تعمیر کردہ ہے اور جس کو شاہی مسجد کہا جاتا تھا' ان دنوں شیعہ حضرات نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مولانا نے کوشش کر کے دوبارہ اس پر اہل سنت کا قبضہ بحال کیا۔ جمعہ و جماعت کا اہتمام کیا اور شعائر دین کی ترویج و اشاعت کے لیے فضا ہموار کی۔ اس مسجد میں ''مدرسہ قرآنیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا' جس میں بے شمار لوگوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور جون پور شہر اور اس علاقے میں اس مدرسے کی وجہ سے حفظ قرآن کا شوق پیدا ہوا۔ ''تاریخ شیراز ہند جون پور'' میں اس مدرسے کے بارے میں لکھا ہے۔

''جامع مسجد جون پور میں مدرسہ قرآنیہ بہ امداد اکابر شہر قائم فرمایا اور حافظ امام الدین لاہوری کو اس مدرسے کا مدرس مقرر کیا۔ اس وقت تک وہ مدرسہ قائم ہے اور اس سے فیض تعلیم جاری ہے۔ طلبا ہر سال حفظ قرآن کر کے نکلتے ہیں [1]۔''

''تاریخ شیراز ہند جون پور'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا سخاوت علی کا جاری کردہ حفظ قرآن کا یہ مدرسہ جو ''مدرسہ قرآنیہ'' کے نام سے موسوم ہے' آج سے تقریباً پچاس برس

[1] تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۵۶-۵۷۔

قبل ۱۹۶۳ء تک جون پور میں جاری تھا۔ امید واثق ہے، اب بھی ۲۰۱۲ء میں جاری ہوگا۔ یعنی یہ مدرسہ کم وبیش ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ اس کے بانی مولانا سخاوت علی کا یہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے، جس کا اجر وثواب انھیں بارگاہ ایزدی سے برابر مل رہا ہے اور ملتا رہے گا۔

جون پور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ ریاست باندہ کے حکمران نواب ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر باندہ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں درس و افتا کا سلسلہ جاری فرمایا۔ صرف دو سال وہاں قیام رہا۔ ان کی والدہ ماجدہ جون پور میں مقیم تھیں اور پیرانہ سالی کے ساتھ ساتھ کمزور بھی ہوگئی تھیں۔ ان کی وجہ سے وطن واپس آ گئے اور طویل عرصے تک جون پور میں درس و تدریس اور افتا میں مشغول رہے۔ درس و تدریس اور افتا وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ فقط لوجہ اللہ یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ طلبائے علم کا تکفل بھی فرماتے تھے۔ نہایت فیاض تھے اور صحیح معنوں میں اسم بامسمی۔

جون پور اور اس کے اطراف و جوانب میں ان کی وجہ سے علم کا چرچا ہوا۔ دور گزشتہ کے علمائے جون پور جن اوصاف سے متصف تھے، وہ سب اوصاف مولانا سخاوت علی کی ذات میں جمع تھے۔ خلق و مروت اور ایثار و قربانی میں بے مثل تھے۔ ان کی وجہ سے پورب میں علم کی آبرو قائم تھی اور ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ فقر و درویشی ان کا امتیاز تھا۔ جہاں معقولات و منقولات میں ماہر تھے، وہاں بہت اچھے طبیب بھی تھے اور بہترین نباض و قیافہ شناس بھی۔

۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جون پوری کے ساتھ ارض حجاز کا قصد کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے بہرور ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے اور پہلے کی طرح درس و افادے میں مشغول ہو گئے۔

مولانا ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انتہائی متقی اور پرہیز گار عالم تھے۔ اوقات نماز کا خاص طور سے اہتمام فرماتے اور اول وقت باجماعت نماز ادا کرتے۔ عصر کی نماز ایک مثل پر اور نماز فجر طویل قرات کے ساتھ غلس میں پڑھتے۔ فتویٰ نہایت احتیاط سے دیتے اور اقوال فقہا میں سے جس قول کی تائید قرآن و حدیث سے ملتی، اسی کے مطابق فتویٰ تحریر فرماتے۔ دلائل و براہین سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے۔

بہت اچھے واعظ اور مبلغ تھے۔ تذکیر و تلقین کا اسلوب میٹھا اور پیارا تھا۔ رد بدعات اور تبلیغ کتاب و سنت میں کوشاں رہتے۔ اشاعت حق ان کا شیوہ اور ترویج دین ان کا پیشہ تھا۔ اونچے مرتبے کے مصنف تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

۱۔ القویم فی احادیث النبی الکریم: یہ کتاب صدیقی پریس بنارس میں شائع ہوئی۔

۲۔ رسالہ تقویٰ: رد بدعات میں ہے۔

۳۔ رسلہ اسلم: علم منطق میں ہے۔

۴- عقائد نامہ: عقائد سے متعلق یہ رسالہ اردو میں ہے۔

۵- رسالہ کلمات کفر: اس میں بتایا گیا ہے کہ کلمات کفر یہ کیا ہیں۔

۶- رسالہ اسرار: فقر و درویشی سے متعلق ہے۔

۷- عرض نیک: شیعہ کے ساتھ ایک مناظرہ۔

۸- رسالہ عرفان الاوقات: یہ رسالہ نماز پنجگانہ کے صحیح اوقات سے متعلق ہے۔

۹- رسالہ فی الہیئۃ: علم ہیئت کے بارے میں ایک رسالہ

۱۰- جوابات سوالات تسعہ: یہ مولانا محمد مچھلی شہری کے نو علمی و فقہی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ ان جوابات میں حدیث قلتین اور ماء کثیر پر عمدہ اور لطیف بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف علام نے اس مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے کہ صحیح تقلید کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

تقلید صحیح اینست کہ اتباع کند قول امام را در جائے کہ نص صریح صحیح غیر منسوخ از رسول مقبول ﷺ نہ یا بدوعین اتباع ہمیں است کہ وقت یافتہ شدن قبول رسول مقبول ﷺ قول کسے را نہ شنود ہمیں است مذہب امام اعظم رحمہ اللہ و مذہب جمیع ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین [1]۔

(تقلید صحیح یہ ہے کہ اس مقام پر کسی امام کی پیروی کرے جہاں رسول مقبول ﷺ سے کوئی نص صریح صحیح غیر منسوخ نہ پائے' اور عین اتباع یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قول پائے جانے کے وقت کسی کی بات نہ سنے' یہی مذہب امام اعظم اور تمام ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔)

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے فقہی مسائل سے متعلق کئی رسالے تحریر کیے اور بہت سے فتوے جاری فرمائے۔

مولانا سخاوت علی جون پوری سے کثیر التعداد علما نے استفادہ کیا اور بے شمار لوگ ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔ یوپی کے مشرقی اضلاع اور بہار کے اصحاب علم نے بالخصوص ان کی شاگردی اختیار کی۔ ان میں مولانا کرامت علی جون پوری' سید خواجہ احمد نصیر آبادی' مولانا محمد شریف جون پوری' مولانا محمد مچھلی شہری' مولانا رجب علی جون پوری' مولانا غلام محمد جگدیش پوری' مولانا محمد یعقوب دسنوی' سید مصطفیٰ شیر دسنوی' مولانا شجاعت علی بہاری' مولانا غلام جیلانی بازید پوری' مولانا محمد عمر غازی پوری' مولانا فیض اللہ موی اعظم گڑھی اور مولانا رحیم اللہ ضلع بستی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بہر حال مولانا سخاوت علی جون پوری' مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کے تلمیذ خاص اور فیض یافتہ تھے۔ پورب میں توحید و سنت کے سب سے بڑے داعی اور اپنے دور میں اسلامی علوم و فنون کے بہت بڑے مدرس تھے۔ جون پور میں مسند درس بچھا کر بیٹھے اور سیکڑوں علمائے دین پیدا کیے۔ پھر ان کو یوپی

[1] بحوالہ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۷۱-۳۔

اور بہار کے صوبوں میں اس طرح پھیلایا کہ انھوں نے اس نازک موقع پر اسلام کے دفاع اور اس کی نشر واشاعت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

مولانا سخاوت علی جون پوری اہل حدیث تھے اور آخر عمر میں ہندوستان سے مع اہل وعیال ہجرت کر کے مکہ معظّمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں ۶ شوال ۱۲۷۴ھ (۲۰ مئی ۱۸۵۸ء) کو وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے ❶۔

اولاد:

مولانا سخاوت علی جون پوری کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام مولانا محمد جون پوری' مولانا جنید' مولانا محمد شبلی فاروقی اور مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی تھے۔ محمد سب سے بڑے تھے۔ باپ سے تحصیل علم کی۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر اور زاہد ومتقی تھے۔ والد مکرم جب ہجرت کر کے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تو ان کی جگہ جون پور میں مسند درس سنبھالی اور وعظ ونصیحت میں مشغول ہوئے۔ نہایت صالح اور فاضل بزرگ تھے۔ درود شریف کثرت سے پڑھتے۔ عین عالم جوانی میں ۲ شوال ۱۲۷۴ھ/ ۱۶۔ مئی ۱۸۵۸ء کو جون پور میں فوت ہوئے۔

مولانا جنید بھی صاحب علم وفضل تھے' انھوں نے بھی عین عالم شباب میں انتقال کیا۔

مولانا محمد شبلی فاروقی ۱۰ شعبان ۱۲۶۳ھ/ ۲۴۔ جولائی ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد انتقال کر گئے۔ تعلیم وتربیت کا اہتمام نانا نے کیا جن کا اسم گرامی ضیاء الدین تھا۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر بعض اساتذہ سے فارسی اور عربی کی ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں مولانا محمد یوسف فرنگی محلی سے انتہائی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ کتب حدیث کے لیے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ارشد تلامذہ میں گردانے گئے۔ نامور عالم مولانا محمد حسین بٹالوی بھی اس زمانے میں حضرت میاں صاحب کے حلقہ درس میں شامل تھے اور مولانا محمد شبلی کے ہم درس تھے۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۷۰ء میں حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ تمام مروجہ علوم وفنون میں یگانہ تھے۔ ذکاوت وفطانت میں بھی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ علم نحو میں ''وسیلۃ النحو'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اپنے علاقے میں اوقاف کی مساجد کے متولی تھے۔

مولانا سخاوت علی کے چوتھے بیٹے مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی تھے۔ باپ نے ۶ شوال ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور بیٹے نے ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۴ھ کو اس عالم آب وگل میں قدم رکھا۔ یعنی باپ کی وفات کے وقت صرف چار مہینے کے بچے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ماں کے ساتھ جون پور آئے۔ اولاً قرآن مجید حفظ کیا' پھر مختلف جید اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ یوں تو تمام علوم میں دست رس حاصل تھی' لیکن فنون

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۶۹، ۷۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۵۶، ۷۵۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲، ۱۹۳۔ جماعت مجاہدین ص ۲۹۴، ۲۹۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۷۰ تا ۳۷۳۔

عقلیہ میں زیادہ ماہر تھے۔ زہد اور پرہیز گاری میں بے نظیر تھے۔ عمر بھر درس و تدریس اور پند و نصائح میں مشغول رہے۔ باپ کے جاری کردہ ''مدرسہ قرآنیہ'' کے انتظام و اہتمام میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ ہندوستان کے مشہور عالم مولانا حافظ محمد شیث مرحوم جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات تھے' انہی کے فرزند رشید تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا سخاوت علی کے پوتے اور مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی جون پوری کے بیٹے' مولانا ابوبکر محمد شیث جون پوری کا تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کر دیا جائے۔

مولانا ابوبکر محمد شیث نے ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ اس کے بعد مدرسہ احمدیہ آرہ کا رخ کیا جہاں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کا غلغلہ درس بلند تھا' ان سے تمام علوم کی تحصیل کی۔ پھر وطن آ کر اپنے خاندانی مدرسے کا اہتمام ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جا کر ہدایت و ارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

سید سلیمان ندوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں نے علما میں ایسا شریف' ایسا نیک باطن' ایسا دور اندیش' ایسا فیاض' ایسا سادہ مزاج' اس پر ایسا مستقل مزاج' خوش اخلاق' شیریں گفتار' باغ و بہار' ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا۔ ایسا ہی متقی و پرہیز گار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع الاخلاق ___ وہ مذہبی تھے اور سخت مذہبی' لیکن وہ بھی ان کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے' جیسے دین داروں میں' اور یہ ان کے حسن اخلاق کی بڑی کرامت تھی ❶۔

سید صاحب مرحوم ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس وہ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں ناظم دینیات رہے۔ اس عرصے میں کئی انقلاب آئے مگر وہ اپنی جگہ پر تھے۔ ساتھ ہی ان کے جبہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ کوٹ پینٹ اور ہیٹ والے ان کے آگے جھک جھک جاتے تھے۔ مگر اس میل جول اور نرمی و نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ غرض وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں بلکہ نئی تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ انھوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا۔ ان کا فضل و کمال کسی خاص علم و فن میں محدود نہ تھا' یہاں تک کہ حدیث و فقہ و تفسیر سے آگے بڑھ کر شعر و شاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی۔ ان کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان کی اس گہرائی کا یقین نہ آتا تھا' اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا' اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین ❷۔

---

❶ یادِ رفتگاں ص ۲۳۵

❷ یادِ رفتگاں ص ۲۳۵' ۲۳۶

ان کے مرض اور اس کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب رقم طراز ہیں:

وہ (مولانا ابوبکر محمد شیث) آکلہ (کینسر) کے مرض میں، جس سے ایک طرف کا پورا رخسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہوگیا تھا، دوڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے اور اس پوری مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منہ سے نہیں نکلی۔ کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحے کے لیے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ دیکھنے والے ان کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر و استقلال کی نصیحت کرتے تھے ❶۔

مولانا محمد شیث جون پوری نے ۲۳ شعبان ۱۳۵۹ھ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۰ء) کو اپنے وطن جون پور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے متعلق سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

آہ کہ فضل و کمال کا یہ پیکر، حسن اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا، دین داری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاک ساری کا یہ سراپا، صبر و استقلال کا یہ مجسمہ، ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشا دیکھ کر دنیائے رنگ و بو سے مٹ گیا۔

مرحوم کی یادگار چند اولادیں اور چند کتابیں ہیں، مگر ان سب سے بڑھ کر ان کی یادگار ان کے حسن اخلاق کی یاد ہے۔ مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہے، مگر اس یاد کا مزار ان کے دوستوں کے دل ہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو　　　در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست ❷

۷۵- مولانا سراج احمد رام پوری

رام پور کے تیرھویں صدی ہجری کے علمائے مشاہیر اور فقہائے کبار میں مولانا سراج احمد رام پوری کا نام نامی لائق ذکر ہے۔ والد کا اسم گرامی مولانا محمد مرشد تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے اور فاروقی النسل تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے معروف اصحاب صلاح و تقویٰ میں ہوتا تھا۔

مولانا سراج احمد فاروقی کی ولادت ۱۷ شعبان ۱۱۷۶ھ/۳ مارچ ۱۷۶۳ء کو سرہند میں ہوئی اور اپنے والد عالی قدر کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل بھی انہی سے کی، یہاں تک کہ علوم حدیث و فقہ میں ممتاز مرتبے کو پہنچے۔

بالخصوص حدیث اور اس سے متعلقہ علوم سے شغف و تعلق کا یہ عالم تھا کہ بعض امہات کتب حدیث کی شروح لکھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

---

❶ یادرفتگان ص ۲۳۶۔

❷ یادرفتگان ص ۲۳۷۔ نیز دیکھیے تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۸۲۔۷۸۴۔

۱- شرح صحیح مسلم: یہ شرح فارسی زبان میں ہے۔
۲- شرح جامع ترمذی: یہ بھی فارسی میں ہے۔
۳- شرح سنن ابن ماجہ: یہ شرح بھی فارسی زبان میں ہے۔
۴- سیر المرشدین فی انساب المجددین۔
۵- کحل العین فی رویۃ النیرین۔
۶- برہان التاویل فی شرح الاکلیل۔
۷- رسالہ در حرمت غنا۔
۸- ترجمہ البدور السافرہ۔

صحاح ستہ میں سے صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ کی فارسی شرحیں اور دیگر تصانیف اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور مصنف علام کی معرفت حدیث وفقہ کا بین ثبوت !۔

مولانا سراج احمد فاروقی رام پوری نے جمعرات کے روز ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ/۱۵ نومبر ۱۸۱۵ء کو لکھنؤ میں وفات پائی، وہاں سے ان کی میت کو رام پور لایا گیا اور والد ماجد کے پہلو میں دفن کیا گیا[1]۔

۶۷-سید سراج احمد حسینی نقوی سہسوانی

سید سراج احمد حسینی نقوی سہسوانی جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے، سید آل احمد حسینی سہسوانی کے بیٹے تھے۔ یہ چار بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید اولاد احمد، ان سے چھوٹے صاحب ترجمہ سید سراج احمد۔ ان سے چھوٹے سید نیاز احمد شہید اور سب سے چھوٹے سید نذیر احمد۔ !مضمون کا ربط قائم رکھنے اور خاندانی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اختصار کے ساتھ یہاں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، البتہ سید سراج احمد کا ترجمہ قدرے تفصیل کا متقاضی ہے۔

سید آل احمد حسینی سہسوانی ایک ذی علم اور صاحب تصوف وسلوک خاندان کے فرد تھے۔ متعدد اوصاف کے حامل اور متقی و پرہیز گار تھے۔ علمی وجاہت سے مالا مال اور مجموعہ کمالات تھے۔ دہلی گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی انتہائی احترام واعزاز سے پیش آئے، مسند خالی کر دی اور اصرار سے اس پر بٹھایا۔ ان کے عقیدت مند بریلی، رام پور، مراد آباد، سنبھل اور پیلی بھیت وغیرہ دور دراز بلاد وقصبات میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۸۰ برس عمر پا کر ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

ان کے بیٹوں میں سب سے بڑے سید اولاد احمد تھے، جو ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۴ بحوالہ ہدیہ احمدی۔

سہسوان میں نشوونما پائی' حصول علم کی غرض سے رام پور اور لکھنؤ وغیرہ گئے اور مفتی شرف الدین رام پوری' مولانا تراب علی لکھنوی اور مفتی محمد اسماعیل لکھنوی لندنی ❶ ایسے اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور نہایت ذہین عالم تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ عرصے تک مصروف درس وافادہ رہے۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔

دوسرے بیٹے سید سراج احمد تھے' جن کا تذکرہ آئندہ سطور میں کیا جارہا ہے۔

تیسرے سید نیاز احمد شہید تھے۔ یہ ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ کی تکمیل لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی میں چند سال خدمت درس انجام دیتے رہے۔ زیور صلاح وسعادت سے آراستہ اور حلیہ زہد وتقویٰ سے پیراستہ تھے۔ فن حدیث اور فقہ سے خاص مناسبت تھی۔ فنون سپہ گری' تیراندازی اور شمشیر زنی وشہسواری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بعض بزرگان دین کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت میں شریک ہوئے۔ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) کو اپنے وطن سہسوان میں شربت شہادت نوش فرمایا۔ اس وقت انتالیس (۳۹) سال کی عمر تھی۔

ان کے بیٹے سید غفور احمد تھے' جو فن ریاضی میں بالخصوص ماہر تھے۔ ریاست بھوپال میں بلقیس گنج کے مقام پر تحصیل دار رہے۔ صرف سینتیس (۳۷) برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

سید آل احمد سہسوانی کے چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے حکیم سید نذیر احمد سہسوانی تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء میں ہوئی۔ والد مرحوم کی وفات کے وقت سولہ سال کی عمر تھی اور حصول علم میں مشغول تھے۔ بعض کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھیں۔ مولانا احمد حسن مراد آبادی' مولانا فیض الحسن سہارن پوری' مولانا

---

❶ تذکرہ ورجال کی کتابوں میں مفتی محمد اسماعیل لندنی کا نام بار بار آتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصر الفاظ میں ان کا تعارف کرادیا جائے۔ مفتی اسماعیل اصلاً مراد آباد کے باشندے تھے' اس لیے مراد آبادی مشہور ہوئے۔ والد کا نام مفتی وجیہ الدین مراد آبادی تھا۔ اسماعیل عالم طفولیت میں لکھنو کے محکمہ عدل وقضا پر مامور ہوئے' ذہین اور صاحب فہم آدمی تھے۔ اودھ کے حکمران نصیر الدین حیدر نے ان کو اپنے ملک کا سفیر مقرر کرکے لندن بھیج دیا۔ طویل مدت تک وہاں رہے' لہذا لندنی کی نسبت سے شہرت پائی۔ وہیں ایک یورپین عورت سے شادی کرلی تھی۔ لندن میں عرصہ دراز تک مقیم رہنے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام سے متعلق عقیدے میں خلل پیدا ہوگیا۔ کتابوں میں مرقوم ہے کہ لندن سے ہندوستان کو واپسی کے وقت عدن پہنچے تو ان کی یورپین بیوی نے حجاز مقدس جانے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن یہ نہیں مانے اور کہا' میں پتھر کی ان دیواروں پر یقین نہیں رکھتا۔ فنون حکمیہ اور ادبیات عربیہ میں عبور رکھتے تھے۔ ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں فوت ہوئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کو جو منکر حج بیت اللہ ہے مسلمان کہا جاسکتا ہے؟

فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ علم طب کی بھی باقاعدہ تحصیل کی۔ چھیاسٹھ برس عمر پا کر ربیع الاول ۱۳۰۹ھ/ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو بعارضہ استسقا' اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو رخصت ہوئے۔

آیئے اب چند ساعتیں سید آل احمد سہوانی کے دوسرے فرزند گرامی سید سراج احمد حسینی سہوانی کی صحبت بابرکت میں گزارنے کی سعادت حاصل کریں۔

سید سراج احمد اپنے بڑے بھائی سید اولاد احمد سے تین یا ساڑھے تین سال چھوٹے تھے۔ طلب علم کے لیے دونوں مراد آباد گئے' وہاں سے رام پور پہنچے اور اکثر کتب درسیہ جو فقہ و اصول اور ادب و منطق وغیرہ پر مشتمل ہیں' مفتی شرف الدین رام پوری کے حلقہ درس میں پڑھیں۔ پھر لکھنؤ گئے' وہاں مولانا تراب علی لکھنوی اور مولانا مفتی محمد اسماعیل مراد آبادی لندنی سے تمام درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ دونوں بھائی طبع غواص رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ہر فن کے اصول و فروع پر حاوی ہو گئے۔ سید اولاد احمد کو حکومت اودھ کی طرف سے سلطان پور کا تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ چند روز بعد عدالت دیوانی و منصفی کے حاکم اعلیٰ بنائے گئے۔ نہایت قابلیت سے یہ فرائض انجام دیے اور بہترین فیصلے کیے۔ اس کے بعد ملازمت سے استعفا دے کر وطن واپس آ گئے تھے اور یک سوئی کے ساتھ عبادت الٰہی اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے تھے۔

لیکن سید سراج احمد مزید حصول علم کی غرض سے لکھنؤ سے دہلی چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا سلسلہ درس زوروں پر تھا' اس میں شامل ہو گئے اور حضرت ممدوح سے صحاح ستہ قراءتاً و سماعاً پڑھی اور سند و اجازہ سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جامع ترمذی مکرر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کو سنائی اور سند حاصل کی۔ شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی' حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور سید سراج احمد سے رابطہ خلت و مودت پہلے سے مستحکم تھا۔

سید سراج احمد نہایت ذہین تھے' ان کی سرعت فہم اور فطانت طبع کے سلسلے میں متعدد روایات مشہور ہیں' جن میں ایک یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں یہ دونوں بھائی۔ سید اولاد احمد اور سید سراج احمد ـــــ ایک ہی استاد کے درس میں شامل تھے۔ کسی صاحب نے سید سراج احمد سے بغرض امتحان ایک صیغہ پوچھا' انھوں نے بتا دیا۔ پھر دریافت کیا کہ یہ کس باب سے ہے؟ اس کے جواب میں وہ کچھ متامل ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی دوسری طرف بیٹھے استاد کے پاؤں داب رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں سن تو رہے تھے لیکن دیکھ نہیں سکتے تھے۔ استاد بھی سب باتیں سن رہے تھے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو جواب میں متامل پا کر استاد کے پاؤں دابتے ہوئے زور سے ہاتھ مارا' جس کی آواز ان کے کان تک پہنچی' یہ ایک کنایۃً لطیفہ تھا۔ اس سے ذہن رسا نے فوراً سائل کا جواب پا لیا اور کہا یہ صیغہ باب ضرب یضرب سے ہے۔ حضرت استاد جو سب باتیں سن رہے تھے' اس کنایہ سے نہایت خوش ہوئے اور دونوں بھائیوں کی ذکاوت طبع اور جودت ذہن کی تحسین فرمائی۔

سید سراج احمد ذہانت و فطانت کے ساتھ جسارت و حق گوئی میں بھی بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ اودھ

کے وزیر سلطنت کے دربار میں تشریف فرماتھے۔ ارکان و امرائے حکومت کے علاوہ علما و مجتہدین شیعہ بھی موجود تھے۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ شیعہ سنی نزاع اولاً تو ختم ہونا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اس میں کمی ضرور ہونی چاہیے۔ اس اثنا میں ایک شیعہ مجتہد نے فرمایا کہ اصحاب ثلاثہ کی نسبت شیعہ حضرات جو مطاعن و الزامات بیان کرتے ہیں، کلیتہً ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی عمارت بے بنیاد بلند نہیں ہوتی۔ وہ واقعات جو ان سے متعلق مشہور ہیں، اگر سب کے سب صحیح نہیں ہیں، تو کچھ نہ کچھ لازماً صحیح ہوں گے۔ سب کا غلط ہونا ممکن نہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اتنی باتیں ہرگز نہیں بناتے۔ بقول شاعر:

تانبا شد چیز کے مردم نگوید چیز ہا

شیعہ مجتہد کی یہ تقریر سب کو پسند آئی اور امرائے دربار اور حضار مجلس نے اس کی خوب تحسین کی، خود وزیر سلطنت نے مجتہد صاحب کو دل کھول کر داد دی اور فرمایا کوئی بات ضرور ہے، جس نے اتنی شہرت حاصل کی ہے۔ سید سراج احمد سہسوانی بھی شریک مجلس تھے۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا، کھڑے ہوئے اور کہا کہ مجتہد صاحب کا اگر یہ فرمان صحیح ہے اور اگر اس کو قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے کہ خواہ مخواہ کوئی چیز مشہور نہیں ہوتی، اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور کارفرما ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرکین نے اللہ کے جو ہزاروں شریک و سہیم مقرر کر رکھے ہیں، ان سب کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کی کچھ اصل تو (العیاذ باللہ) ضرور ہے۔

بقول شاعر: تانبا شد چیز کے مردم نگوید چیز ہا

یہود و نصاریٰ نے اللہ وحدہ لاشریک کے بیٹے بیٹیاں ثابت کیے۔ یہ اگر نہیں تو (معاذ اللہ) بھانجے بھتیجے تو ضرور ہوں گے، ہر ایک سے انکار ممکن نہیں، بقول شاعر

تانبا شد چیز کے مردم نگوید چیز ہا

رسول اللہ ﷺ کو مخالفوں نے ساحر اور کاہن کہا۔ اگر یہ صحیح نہیں تو (نعوذ باللہ) شعبدہ باز تو ضرور ہوں گے۔ بقول شاعر:

تانبا شد چیز کے مردم نگوید چیز ہا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خارجیوں نے ایسی ایسی باتیں کہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ یہ سب اگر صحیح نہیں تو (نعوذ باللہ) کچھ تو صحیح ہوں گی۔ بقول شاعر:

تانبا شد چیز کے مردم نگو ید چیزہا۔

سید صاحب ممدوح کی اس تقریر سے محفل میں سناٹا چھا گیا اور سب خاموش ہو گئے۔ اودھ کے وزیر سلطنت علی نقی خاں بہادر نے ان کو بالخصوص داد دی اور ان کی فصاحت و بلاغت، زور کلام، حاضر جوابی اور قوت استدلال کی تعریف کی۔ اس کو ماننا پڑا کہ شیعہ مجتہد کا یہ نقطہ نظر صحیح نہیں کہ خواہ مخواہ کوئی چیز مشہور نہیں ہو جاتی، اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوتی ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی علوم حکمیہ کے بہت بڑے فاضل اور زبردست منطقی تھے۔ سید سراج احمد کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے تو ان سے ملاقاتیں ہوئیں اور علم منطق کے بارے میں ہلکی پھلکی بحثیں بھی ہوئیں، جس کے نتیجے میں مولانا خیر آبادی نے ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کی بہت تعریف فرمائی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا سید سراج احمد سہوانی کے درمیان بعض مسائل میں شدید اختلاف تھا اور دونوں کے نقطہ ہائے نظر الگ الگ تھے۔ مثلاً مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی چند اہم مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف آرا رکھتے تھے، ان میں سید سراج احمد، مولانا شہید کو حق بہ جانب قرار دیتے تھے۔ پھر ان کی شہادت کے بعد مولانا سید حیدر علی ٹونکی اور مولانا خیر آبادی کے درمیان جو تحریری مباحثے ہوئے، اور مولانا ٹونکی نے پرزور دلائل سے مولانا شہید کا دفاع کیا، اس میں بھی وہ مولانا ٹونکی کی تائید کرتے اور ان کے افکار کو مبنی بر صحت ٹھہراتے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے اختلاف آرا کے سلسلے میں صاحب ''حیات العلما'' نے ایک دلچسپ لطیفہ بیان کیا ہے، جس کا تعلق سید سراج احمد کی حاضر جوابی اور رسائی ذہن سے ہے۔

''مولانا خیر آبادی نے ایک جلسے میں فرمایا کہ مولانا اسماعیل جس چیز کو حلال کہیں، اس کو میں حرام اور جس کو وہ حرام کہیں، اس کو میں حلال ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ (سید سراج احمد) اس موقعے پر تشریف فرما تھے۔ فرمایا کہ مولانا اسماعیل صاحب نے ماں بیٹی کو حرام اور زوجہ کو حلال فرمایا ہے، آپ ایسے موقعے پر کیا کیجیے گا[1]۔

جدل و کلام میں سید صاحب ممدوح کو مہارت حاصل تھی اور میدان بحث و مناظرہ میں وہ ہمیشہ غالب و فاتح رہے۔ مولانا فضل رسول بدایونی کا شمار ان حضرات علما میں ہوتا ہے جو مولانا اسماعیل شہید سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا شہید کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کی تردید ''احقاق الحق'' کے نام سے لکھ کر شائع کی۔ اس زمانے میں سید سراج احمد لکھنؤ میں تھے، ان کی نظر سے یہ کتاب گزری تو بعض حضرات کی فرمائش پر ایک ہی نشست میں اس کا جواب لکھ دیا، اس کا نام ''سراج الایمان'' رکھا اور بیت السلطنت لکھنؤ میں اسے طبع کرایا۔

سلطنت اودھ کے بعض ارکان و امرا کے اصرار پر سید صاحب ممدوح سلک ملازمت میں منسلک ہوئے تو انھیں اعمال لکھنؤ میں موضع کاکوری میں تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ پانچ چھ سال اس منصب پر مامور رہے اور نہایت دیانت و قابلیت کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ مقدمات کو سمجھنے، قانونی پیچیدگیوں کو حل کرنے اور اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اصابت رائے اور فہم و فراست میں عدیم المثال تھے۔ جب کوئی فقہی نوعیت کا مقدمہ پیش ہوتا اور اس میں ائمہ فقہ کی آرا مختلف ہوتیں تو اس کی نہایت عمدہ توجیہ فرماتے اور جو رائے کتاب و سنت کے موافق یا اس سے قریب تر ہوتی، اس کو ترجیح دیتے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔

[1] حیات العلما ص ۴۹۔

سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور لاینحل امور کی عقدہ کشائی میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ جب سلطنت اودھ اور انگریزی حکومت کے درمیان عہد نامے کی تجدید کا مسئلہ سامنے آیا اور حدود ملک کے تعین اور بعض علاقوں کے الحاق سے متعلق فریقین میں اختلاف پیدا ہوا' تو اودھ کے وزیر سلطنت نے سید سراج احمد کو نائب وکیل سلطنت مقرر کیا اور یہ عہدہ و منصب صرف انہی کے لیے قائم کیا گیا تھا' اس سے پہلے یہ عہدہ نہیں تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے ارباب بست و کشاد سے گفتگو شروع کی اور چند روز کی باہمی بات چیت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ یہ نزاعی صورت حال ختم ہوئی بلکہ یہ پیچیدہ اور نازک ترین مسئلہ اس طرح حل ہو گیا کہ دونوں فریق مطمئن ہو گئے۔ حکومت اودھ کی پریشانی رفع ہو گئی اور کچھ زائد حصہ ملک بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس حسنِ کارگزاری کے صلے میں ان کو خلعت اور پالکی کے اعزاز سے ممتاز کیا گیا اور ترقیٔ منصب کے مسئلے پر غور رہا۔

لیکن زمانہ تحصیل داری میں انھوں نے عوام پر حکام کے مظالم اور سوئے انتظام سے حکومت کو بار بار مطلع کیا تھا اور جدید نظام کے نفاذ اور نئی اصلاحات کی طرف کئی مرتبہ توجہ دلائی تھی' جس پر کوئی عمل نہیں ہوا تھا' بلکہ بدنظمی اور ابتری میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس سے بددل اور مایوس ہو کر وہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں ملازمت کی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ کاکوری کے رئیس مفتی محمد عباس نے جو ان کا بہت احترام کرتے تھے اور جنھوں نے اپنا مکان اور دیوان خانہ سکونت کے لیے ان کے سپرد کر دیا تھا' اصرار کیا کہ وہ کاکوری میں مقیم رہیں۔ ان کے علاوہ کاکوری کے عام باشندے بھی ان کے قیام کاکوری پر مصر ہوئے' جس کی وجہ سے انھیں وہیں رکنا پڑا۔ بعد ازاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے اور پورے ملک میں آتش فساد بھڑک اٹھی۔ پھر جب امن بحال ہوا تو ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں وطن (سہسوان) تشریف لائے۔

سہسوان میں ان دنوں ایک انگریز عہدہ ججی پر فائز تھا' وہ سید صاحب کے علم و قابلیت سے واقف تھا' اس نے ان کو وکالت کرنے کا مشورہ دیا اور سند وکالت بھی عطا کی۔ تقریباً دو سال یہ مشغلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں انھوں نے ایوان عدل و انصاف میں عوام کی بہت مدد اور خدمت کی۔ دیانت داری سے مقدمہ پیش کرتے اور لوگوں کو سچ بولنے اور صداقت پر قائم رہنے کی تلقین فرماتے۔ مدعی' مدعا علیہ اور عدالت کے لیے کتاب و سنت اور کتب فقہ میں جو اصول و احکام مقرر ہیں' ان کی دل نشین انداز میں وضاحت کرتے۔ جھوٹا اور خلاف حقیقت کوئی مقدمہ نہ لیتے۔ اس وجہ سے عدالت' طبقہ وکلا اور عوام میں ان کو بہت احترام حاصل تھا اور ان کی بات کی قدر کی جاتی تھی۔

دو سال وکالت کی۔ اس کے بعد یہ پیشہ ترک کر دیا اور عزلت گزینی اختیار کر لی۔ تھوڑی سی آبائی و موروثی جائداد تھی' اس کو اور معمولی سی تجارت کو رزق حلال کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ زیادہ وقت عبادت' وعظ و تذکیر اور درس و تدریس میں صرف ہوتا۔ موثر اور دل نشین وعظ کہتے۔ شرک و بدعت کا رد اور توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت ان

کا اصل موضوع تھا۔

ارض ہند کے اس جلیل القدر عالم نے ۱۹ شوال ۱۲۷۹ھ/ ۹۔ اپریل ۱۸۶۳ء کو سینتالیس' اڑتالیس برس کی عمر پا کر اپنے وطن سہسوان میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی اور اپنے جد امجد اور والد گرامی قدر کے پہلو میں دفن ہوئے ❶۔

سید سراج احمد سہسوانی کے دو بیٹے تھے' جو علم و فضل میں یگانہ تھے۔ ایک کا اسم گرامی مولانا سید عبدالباری سہسوانی اور دوسرے کا مولانا سید عبدالباقی سہسوانی ہے۔ اول الذکر ۱۲۶۶ھ کو پیدا اور ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء کو فوت ہوئے۔ ثانی الذکر کا سال ولادت ۱۲۷۳ھ اور سال وفات ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ کئی اور کتابوں میں بیان ہو گی۔

۷۷۔ قاضی سراج الدین موہانی

قاضی سراج الدین موہانی تیرھویں صدی ہجری کے مشہور عالم تھے۔ مولد و منشا یو پی کا شہر موہان ہے۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ گئے اور وہاں کے اساتذہ کرام سے اکتساب علم کیا۔ پھر مرشد آباد کے لیے رخت سفر باندھا اور عرصے تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ مرشد آباد سے عازم کلکتہ ہوئے اور اپنے علم و فضل اور قابلیت و صلاحیت کی بنا پر وہاں کے منصب قضا پر متعین کیے گئے۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر جب ان کے جوہر مزید چمکے اور فضیلت و کمال کے مختلف گوشے نکھر کر سامنے آئے تو ہندوستان کا منصب قضاء اکبر ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اس منصب کی ذمے داریوں کو انھوں نے خوب نبھایا اور اس کی نزاکتوں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔

طبعاً نہایت متین' متحمل مزاج اور متواضع و منکسر تھے۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرتے اور اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود چھوٹے بڑے سب سے خوش اسلوبی سے پیش آتے۔

ان کا بہت بڑا کمال یہ تھا کہ عدل و قضا میں انتہائی مصروف ہونے کے باوجود مطالعہ کتب جاری رکھتے اور طلبا کو مختلف علوم کا درس بھی ضرور دیتے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ مسائل فقہ سے متعلق کئی رسالے تحریر کیے۔ اپنے اوقات شب و روز کو مختلف کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا اور کسی کام کی انجام دہی میں حرج نہیں واقع ہوتا تھا۔

عبدالقادر رام پوری اپنی کتاب ''روز نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ قاضی سراج احمد موہانی فاضل بزرگ تھے۔ طبیب بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ قلیل العمل تھے۔ ان کا مسلکی و مذہبی عقیدہ لوگوں کی نگاہوں سے مستور تھا لیکن ان کے مزاج میں اس قدر نرمی اور طبیعت میں اس درجہ لچک تھی کہ اہل سنت انھیں سنی کہتے اور شیعہ انھیں شیعہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

❶ حیات العلما ص ۴۳ تا ۵۲۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۴' ۱۹۵۔

مذہبم عشق است ومن واقف زادیاں نیستم ہندو نصرانی و گبرو مسلماں نیستم

ان کے اس نقطۂ نظر اور مسلکی نرمی کو قرین صحت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ رواداری نہیں، احساس کم تری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فقہی اختلاف کے اظہار میں سختی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اپنی مسلکی رائے سے اتفاق نہ کرنے والوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ خود اپنی کوئی رائے نہ ہو اور جیسا آدمی دیکھو اسی کے مطابق ہو جاؤ۔ اس طرز عمل کو رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یہ اپنے مذہب و مسلک پر عدم یقین کا اظہار ہے۔

قاضی سراج احمد موہانی نے ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں وفات پائی [1]۔

۷۸۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی

مفتی سعد اللہ بن نظام الدین مراد آبادی مسلکاً حنفی تھے۔ دیگر علوم کے علاوہ نحو و لغت کے بالخصوص نامور عالم تھے۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی نے تعلیم و تربیت دینا شروع کی تو کسی بات پر بھاوج سے ناراض ہو کر گھر سے نکلے اور مفقود الخبر ہو گئے۔ اوائل عمر ہی میں رام پور پہنچے اور وہاں کے علما و معلمین سے مختصرات اور درس نظامیہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر نجیب آباد گئے، وہاں مولانا عبدالرحمٰن کوہستانی سے شرح جامی وغیرہ کتابوں کا درس لیا۔ اس کے علاوہ علم نحو اور علم صرف کی بعض اور کتابوں کی تحصیل بھی ان سے کی۔ جب ان علوم میں مکمل استعداد پیدا ہو گئی تو دہلی کا رخ کیا۔ وہاں علوم مروجہ کی بعض کتابیں مولانا شیر محمد قندھاری اور مولانا محمد حیات پنجابی سے اور اکثر کتابیں مفتی صدر الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔

اب وہ چوبیس برس کے جوان رعنا تھے۔ اور ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء کا آغاز ہو گیا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تقریباً تمام کتابیں مکمل کر چکے تھے، لیکن علم کی پیاس کب بجھتی ہے، اس کی تو یہ کیفیت ہے کہ ہر جرعہ علم جو حلق سے نیچے اترتا ہے، مزید تشنگی کا باعث بنتا ہے۔ سعد اللہ جو مزید طلب علم کے لیے بے تاب ہوئے تو دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنؤ جا پہنچے۔ لکھنؤ کو اس زمانے میں مرکز علما و فضلا کی حیثیت حاصل تھی اور مولانا محمد اشرف لکھنوی، مولانا محمد اسماعیل مراد آبادی لندنی، مرزا حسن علی محدث اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی کی درس و تدریس کی مسندیں آراستہ تھیں اور ان میں سے ہر شخص اپنے وقت اور موضوع کا فاضل تھا۔ سعد اللہ فیض کے ان تمام سرچشموں سے سیراب ہوئے اور سب سے استفادہ کیا۔ ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ پہنچ کر ہی گھر میں اپنا پتا دیا، ورنہ اس سے پہلے کسی عزیز کو معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔

جب فارغ التحصیل ہو چکے تو شادی کی اور پھر لکھنؤ کے مدرسہ شاہی کی مسند تدریس کو زینت بخشی۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ پھر تصنیف و تالیف کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور "تاج اللغات" ترجمہ قاموس کی بعض جلدیں مکمل کیں۔ جب فضیلت و کمال کا شہرہ عام ہو گیا تو انھیں کوتوالی میں منصب افتا پر متعین کیا گیا۔ یہ ایک اہم فقہی منصب تھا جس پر یہ پورے انتیس برس مامور رہے۔

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۹۶، ۱۹۷۔

۱۲۶۱ھ میں سفر حج پر روانہ ہوئے اور شیخ حرم شیخ جمال حنفی سے سند حدیث حاصل کی۔ حج بیت اللہ کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور لکھنؤ میں تین سال منصب افتا پر متعین رہے۔

جب نواب واجد علی شاہ کو اودھ کی حکومت سے معزول کر دیا گیا تو رام پور کے حکمران نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر جوان کا شاگرد تھا' رام پور تشریف لے گئے۔ وہاں کی مسند افتا ان کے سپرد کی گئی۔ اور پھر عمر بھر یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ رام پور میں محکمہ قضا اور مرافعہ وغیرہ کی ذمے داریاں بھی ان کے سپرد تھیں۔

مفتی سعد اللہ مراد آبادی اپنے دور کے عالم' مصنف اور فقیہ تھے۔ لیکن "تذکرہ علمائے ہند" کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ خشک مزاج تھے اور چھوٹے کو کم ہی قابل اعتنا گردانتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

مسود اوراق در ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء بمقام لکھنؤ کہ جہت طلب علم دراں جا وارد بوُ صاحب ترجمہ را دید خشک مزاج یافت و با اصاغر کم توجہ می نمود ❶۔

یعنی راقم الحروف (رحمان علی) نے ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں جب کہ وہ حصول علم کی غرض سے لکھنؤ میں مقیم تھا' صاحب ترجمہ (مفتی سعد اللہ) کو وہاں دیکھا' خشک مزاج تھے اور چھوٹوں کو کم ہی لائق توجہ ٹھہراتے تھے۔

مفتی سعد اللہ مراد آبادی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ القول المانوس فی صفات القاموس۔
۲۔ نور الایضاح فی اغلاط الصراح۔
۳۔ نوادر الاصول فی شرح الفصول: علم صرف سے متعلق۔
۴۔ القول الفصل فی تحقیق ہمزۃ الوصل: علم صرف میں ہے۔
۵۔ مفید الطلاب فی خاصیات الابواب: یہ کتاب علم صرف میں ہے۔
۶۔ غایۃ البیان فی تحقیق السبحان
۷۔ میزان الافکار فی شرح معیار الاشعار۔
۸۔ محصل العروض۔
۹۔ رسالۃ التشبیہ والاستعارہ: یہ علم بیان میں ہے۔
۱۰۔ دو رسالے در تحقیق "ال" تعریف
۱۱۔ شرح خطبہ قطبی۔
۱۲۔ شرح علیٰ ضابطۃ التہذیب۔
۱۳۔ حاشیہ علیٰ شرح سلم از حمد اللہ سندیلوی۔
۱۴۔ حاشیہ علیٰ شرح چغمینی۔

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۴۔

۱۵۔ رسالہ فی القوس والقزح۔

۱۶۔ رسالتہ فی تحقیق علم الواجب تعالیٰ۔

۱۷۔ رسالہ سبع عرض شعیرہ موسومہ مفید البصیرہ۔

۱۸۔ شرح چغمینی۔

۱۹۔ رسالہ فی التناسخ۔

۲۰۔ رسالہ فی الطہر المتخلل۔

۲۱۔ تاج اللغات ترجمہ قاموس اللغات (چند جلدیں)

۲۲۔ ترجمہ فقہ اکبر۔

۲۳۔ وصیت نامہ امام ابوحنیفہ۔

۲۴۔ ترجمہ حقیقۃ الاسلام۔

۲۵۔ ہدایۃ النور فیما یتعلق بالاظفار والشعور۔

۲۶۔ زاد السبیل الیٰ دار الخلیل: علم فقہ میں۔

۲۷۔ حواشی مالابد منہ: علم فقہ میں

۲۸۔ میزان الافکار شرح معیاد الاشعار۔

۲۹۔ قصیدہ لامیہ۔

۳۰۔ عقود الاجیاد فی مجہول اختبار والانقاد۔

۳۱۔ نوادر البیان فی علم القرآن۔

بعض معاملات میں وہ عام علما سے مختلف رائے رکھتے تھے اور دلائل سے اپنے صحت موقف کی وضاحت کرتے تھے۔ شیخ امیر علی امیٹھوی شہید نے ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء کو اجودھیا میں ہنومان گڑھی کی مسجد پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ہندوؤں سے جہاد کا اعلان کیا تو مفتی سعد اللہ مراد آبادی نے اس کی مخالفت کی اور ان کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔

اسی طرح جب ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (مصنف ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“) کی تحریک پر خان بہادر عبد اللطیف (رئیس کلکتہ و سیکریٹری اسلامی مجلس مذاکرہ کلکتہ) نے جہاد اور دار الحرب کے مسئلے کے متعلق مفتی صاحب موصوف سے فتویٰ طلب کیا تو اس وقت بھی مفتی صاحب نے حسب سابق انگریزوں کے حق میں مفصل فتویٰ تحریر فرمایا۔

مفتی سعد اللہ مراد آبادی شاعر بھی تھے اور آشفتہ تخلص کرتے تھے۔

ہندوستان کے اس حنفی عالم و فقیہ اور مفتی نے ۱۴ رمضان ۱۲۹۴ھ/۲۲ ستمبر ۱۸۷۷ء کو وفات پائی [1]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۴، ۷۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸، ۴۸۹۔ تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۵۱ تا ۱۵۴۔ ابجد العلوم ص ۹۲۵، ۹۲۶۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۸ تا ۲۰۰۔ مظہر العلما ص ۸۲، ۸۳۔ حدیقہ شہدا ص ۴۳، ۴۴۔ اسلامی مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ سال ہشتم ص ۱۳، ۳۳، ۴۰۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۲۱۴ تا ۲۱۶۔

۷۹۔ سید سعید الدین بریلوی

برصغیر کے علمائے مشاہیر میں ایک بزرگ سید سعید الدین حسنی بریلوی تھے۔ والد کا اسم گرامی سید غلام جیلانی تھا اور حضرت سید علم اللہ حسنی کی اولاد سے تھے۔ رائے بریلی میں زاویہ سید علم اللہ میں پیدا ہوئے اور علوم مروجہ کی ابتدائی کتابیں اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ وہاں حکیم حیات لکھنوی اور دیگر علمائے کرام سے تحصیل کی' اور اپنے دور کے جید اصحاب علم میں گردانے گئے۔

حصول علوم متداولہ سے فارغ ہوئے تو حیدر آباد کا قصد کیا اور عرصے تک اس نواح میں فروکش رہے۔ بعد ازاں وطن واپس آئے تو کلکتے چلے گئے۔ وہاں ان کی خدمات راجہ رام موہن رائے نے حاصل کر لیں۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا' لیکن جب راجہ رام موہن رائے دہلی آیا تو انھیں بھی ساتھ لیتا آیا۔ اس اثنا میں دو سال مغل حکمران اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد پھر عازم کلکتہ ہوئے اور وہاں انگریزی زبان سیکھی۔ اس مرتبہ انھیں بعض اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور اٹھارہ سال مظفر پور قیام رہا۔ پھر حکومت کے مناصب عالیہ سے علیحدہ ہو گئے۔

سید سعید الدین حسنی بریلوی اپنے عہد اور علاقہ اودھ کے ممتاز عالم وفقیہ' متقی' متدین' صداقت شعار اور پیکر سخا تھے۔ حسن معاملت میں مشہور تھے۔ ریا و سمعہ' فخر و غرور اور کبر و تعلی سے سخت متنفر تھے۔ سعادت و صلاحیت کے ان تمام اوصاف سے موصوف تھے جو ان کے آبا و اجداد میں پائے جاتے تھے۔ محنت' جفاکشی اور صبر و ضبط کا خوب صورت نمونہ تھے۔ شیریں بیان اور صادق القول تھے۔ اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کے نشیب و فراز پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔

رائے بریلی کا یہ نامور عالم وفقیہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ/ ۱۶ جون ۱۸۷۶ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوا❶۔

۸۰۔ مولانا سلام اللہ محدث دہلوی رام پوری

مولانا سلام اللہ بن شیخ الاسلام بن حافظ فخر الدین دہلوی' حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان فضل و کمال اور رفعت علمی میں ممتاز چلا آ رہا تھا۔ اس کے اصحاب علم کی شہرت فقط ہندوستان تک محدود نہیں رہی' دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی تھی اور پڑھے لکھے لوگ ان سے حصول علم پر فخر کرتے تھے۔ مولانا سلام اللہ دہلوی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے نامور مفسر' ممتاز محدث اور صاحب نظر فقیہ تھے۔ علوم متعارفہ کی تحصیل اپنے والد ماجد شیخ الاسلام سے کی' جنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں شرح سپرد قلم کی' رسالہ طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام لکھا اور کشف الغطا

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۰۔

عما لزم للموتی عن الاحیاء تصنیف کی۔ سند حدیث والد مکرم سے حاصل کی۔

مولانا سلام اللہ کے جد امجد حافظ فخر الدین بھی عالم دین اور مصنف شہیر تھے، جن کے والد شیخ محب اللہ نے فارسی میں صحیح مسلم کی شرح منبع العلم کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ غیر مرتب تھی، حافظ فخر الدین نے باپ کی اس شرح کو مرتب کیا اور پھر انہی کے نام سے معروف ہوگئی۔ عین العلم کی شرح بھی حافظ فخر الدین نے مکمل کی اور حصن حصین کی شرح بھی تحریر فرمائی۔

مولانا سلام اللہ دہلوی نے اپنے اسلاف کرام سے فیض حاصل کیا جو علم و فضل میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ چونکہ اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے اور یہی بلدہ علم ان کا مولد و منشا تھا، اس لیے دہلوی کہلائے۔ پھر جب حصول علم سے فارغ ہو چکے تو رام پور کے حکمران نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں رام پور چلے گئے تھے، لہٰذا رام پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ رام پور میں انھوں نے خوب تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دیں اور لوگوں کو بے حد فیض پہنچایا۔ اسی بنا پر نواب رام پور نے ان کو انتہائی احترام کا مستحق ٹھہرایا اور انعامات و عطایا سے سرفراز کیا۔

مولانا سلام اللہ دہلوی نے مندرجہ ذیل شروح و تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱۔ الکمالین حاشیه علی جلالین: یہ قرآن مجید کی تفسیر جلالین پر حاشیہ ہے۔

۲۔ المحلی شرح مؤطا: یہ حدیث کی معروف کتاب موطا کی شرح ہے۔ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں تحریر کی۔

۴۔ خلاصۃ المناقب: اس میں اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ ترجمہ صحیح بخاری: فارسی زبان میں۔

۶۔ رسالہ اصول حدیث: یہ رسالہ عربی میں ہے اور اصول حدیث کے متعلق ہے۔

۷۔ رسالہ فی الاشارۃ بالسبابۃ عند التشہد فی الصلوٰۃ: اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ نماز میں حالت تشہد میں رفع سبابہ کرنا چاہیے۔

مولانا سلام اللہ دہلوی نے جمادی الاخریٰ ۱۲۲۹ھ/۱۴ مئی ۱۸۱۴ء اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں رحلت فرمائی ❶۔

۸۱۔ مولانا سلامت اللہ کان پوری

مولانا سلامت اللہ بن برکت اللہ صدیقی کان پوری برصغیر پاک و ہند میں تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز علما میں سے تھے۔ رئیس بدایوں تھے، تمام علوم میں دست رس تھی۔ اصلاً بدایوں کے رہنے والے تھے، ولادت و نشو و نما بدایوں ہی میں ہوئی۔ صرف و نحو کی کتابیں مولانا ابو المعالی بدایونی سے پڑھیں۔ فلسفہ و منطق

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۶، ۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸۔ تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۵۸، ۱۵۹۔ ابجد العلوم ص ۹۲۷۔ علم و عمل ج ۱ ص ۷۷، ۷۸۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۱ تا ۲۳۳۔

کے بعض رسائل کی تکمیل مولانا ولی اللہ بدایونی سے کی جو مولانا باب اللہ جون پوری کے تلمیذ تھے۔ اس کے بعد بریلی میں سید مجد الدین شاہ جہان پوری (عرف مولوی مدن) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے باقی کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ بعد ازاں دہلی گئے۔ وہاں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے برادر صغیر شاہ رفیع الدین دہلوی سے استفاضہ کیا۔ تفسیر وحدیث کی کتابیں ان سے قراءۃً وسماعۃً پڑھیں اور سند واجازہ سے مفتخر ہوئے۔ تصوف وطریقت کا درس سید آل احمد حسینی مارہروی سے لیا۔

تحصیل علم کے بعد لکھنؤ گئے اور درس وافادہ طلبا کا سلسلہ شروع کیا۔ مناظرہ ومباحثہ میں تیز تھے۔ کتب شیعہ پر عمیق نگاہ تھی اور ان کے اعتراضات وایرادات کا مدلل جواب دیتے تھے۔ شیعہ کے نامور اور مشہور مجتہد بھی مناظرے میں ان کا مقابلہ نہ کر پاتے اور جواب سے عاجز آجاتے۔ شیعہ علما ومجتہدین نے تنگ آکر ان کی شدید مخالفت شروع کر دی اور پھر حکومت اودھ نے انھیں لکھنؤ سے نکال دیا اور یہ کان پور چلے گئے۔ کان پور شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے کان پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔

مولانا سلامت اللہ نسباً صدیقی، مولداً بدایونی، مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ ہندوستان کے ممتاز فضلا اور معروف فقہا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام اور تصوف وغیرہ تمام علوم میں ماہرانہ نظر تھی۔ جامع المنقول والمعقول تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے اور کشفی تخلص تھا۔ فارسی میں ان کا مجموعہ اشعار بھی ہے جو ''دیوان کشفی'' کے نام سے شائع ہوا۔

تصوف وسلوک اور فقہ وغیرہ میں متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تحفۃ الاحباب: یہ کتاب شیعہ کی تردید اور اہل سنت کی تائید میں ہے۔
۲۔ معرکۃ الارا: اس کا موضوع بھی رد شیعیت ہے۔
۳۔ برق خاطف: یہ کتاب اہل سنت اور شیعہ کے درمیان مناظرے کے سلسلے میں ہے۔
۴۔ تحریر الشہادتیں شرح سر الشہادتین: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں ہے۔
۵۔ خدا کی رحمت: یہ دو کتابیں ہیں، ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ یہ دونوں میلاد سے متعلق ہیں۔
۶۔ رسالہ شہاب ثاقب در سقوط کواکب:
۷۔ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام۔
۸۔ حقائق احمدیہ: علم حقائق کے بارے میں ہے۔
۹۔ بحر التوحید: اولیاء اللہ کی شطحیات کے بیان میں۔
۱۰۔ اسرار العاشقین: اس میں عربی وفارسی اقوال واشعار کو صوفیا کے طریق پر محمول کیا گیا ہے۔

۱۱۔ رسالہ کشفیہ: یہ ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو بعض لوگ حافظ شیرازی کی ان اصطلاحات پر وارد کرتے ہیں، جو انھوں نے اشعار میں استعمال کی ہیں۔

۱۲۔ محی الدین ابن عربی کے ایک رسالے کا ترجمہ جو لطائف موسومہ معائنات صوفیا کے بیان میں ہے۔

۱۳۔ رسالہ نفحات حالات۔

۱۴۔ رقعات کشفی۔

۱۵۔ شرح مثنوی گل کشتی۔

۱۶۔ رسالہ الوان در بیان جواز وعدم جواز الوان۔

۱۷۔ رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین۔

۱۸۔ مجموعہ فتاوی

۱۹۔ مجموعہ کلام۔

۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء کو انھوں نے کان پور میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، اسی میں درس و تدریس کا معرکہ گرم رہتا تھا اور اسی مسجد میں لوگوں سے ملتے اور فقہی نوعیت کے فتوے تحریر کرتے تھے۔ بے شمار علما و طلبا کو اس مسجد میں تعلیم دی۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' کے مصنف مولوی رحمان علی بھی کچھ عرصہ ان سے مصروف استفادہ رہے۔

۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں شرکت کے لیے لوگوں کو تیار کیا اور اس میں سرگرم عمل رہے تھے۔ کان پور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد مولانا سلامت اللہ کان پوری ریاست کدورہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں بعض دیگر حضرات بھی پناہ گزیں تھے، جن میں ایک عالم دین مولانا عبدالحق کان پوری تھے جو وہاں کے سر برآوردہ حضرات میں سے تھے۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد مولانا سلامت اللہ دوبارہ کان پور آ گئے تھے۔

اس عالم و فقیہ اور مصنف نے ہفتے کے روز ۳۰ رجب ۱۲۸۱ھ/ ۲۹ دسمبر ۱۸۶۴ء کو کان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

۸۲۔ مفتی سلطان حسن عثمانی بریلوی

مفتی سلطان حسن بن احمد حسن عثمانی بریلوی، اپنے دور کے فاضل شخص تھے۔ مولد و منشا بریلی ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے جو اپنے عہد کے مشاہیر علمائے ہند میں سے تھے، حصول علم کیا۔ دیگر علمائے وقت

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۷۷ تا ۸۰۔ الیانع الجنی ص ۹۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ قاموس المشاہیر ج ۱ ص ۲۹۶ ج ۲ ص ۱۵۳۔ ابجد العلوم ص ۹۱۸۔ مظہر العلماء ص ۸۴، ۸۵۔ شمع انجمن ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ تذکرۃ الواصلین ص ۲۰، ۲۶۲۔

سے بھی مستفید ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے لیے ترقی کے دروازے کھل گئے اور ایوان حکومت میں خوب قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے مسند افتا کو زینت بخشی۔ پھر بہ تدریج مناصب عالیہ پر فائز ہوتے گئے، یہاں تک کہ گورکھ پور شہر کے عہدہ صدارت پر مامور ہوئے۔ عدل و قضا کی نازک ذمے داریاں بھی ان کے سپرد ہوئیں اور یہ عالم کبیر دیانت و امانت کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوا۔ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ ہر کام صدق و وفا کے ساتھ انجام دیا۔

ان امور مہمہ کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی بہ دستور جاری رکھا۔ ان میں سے ہر کام اپنی جگہ اہم اور کامل توجہ کا محتاج ہے، لیکن دیار ہند کے یہ فاضل اس طریقے سے ان سب امور میں مشغول رہے کہ کوئی کام دوسرے کام کی انجام دہی میں رکاوٹ نہیں بنا۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا جو انتہائی محنت اور کامل توجہ کا متقاضی ہے۔ ان کی ایک تصنیف غایۃ التقریب فی ضابطۃ التھذیب ہے، جس میں مفتی سعد اللہ مراد آبادی، شیخ عبدالحلیم لکھنوی اور دیگر علما پر تعاقب اور بعض مسائل حکمیہ میں ان کے نقطہ فکر سے اظہار اختلاف کیا گیا ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی پر بعض حضرات نے جو اعتراض کیے ہیں، چند رسائل میں ان کا دفاع کیا ہے۔

بریلی کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں وفات پائی ❶۔

۸۳۔ مولانا سناء الدین عثمانی بدایونی

مولانا سناء الدین بن محمد شفیع بن عبدالحمید عثمانی بدایونی، فقہ و اصول کے علمائے ماہرین میں سے تھے۔ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں ولادت ہوئی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو مولانا فضل امام خیر آبادی اور دیگر علمائے عصر سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی مستفیض ہوئے اور ان سے علوم تفسیر و حدیث کی تحصیل کی اور تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے ہند میں گردانے گئے۔ علوم مروجہ سے فراغت کے بعد اپنے شہر بدایوں میں خود مسند تدریس بچھائی اور بے شمار تشنگان علوم کو فیض پہنچایا۔

کئی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ مثلاً علم نحو کی بعض درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں۔ لغت کی کتاب قاموس پر حاشیہ لکھا۔ عربی میں متعدد تالیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔

بدایوں کے اس عالم و فقیہ نے ماہ محرم ۱۲۷۸ھ/ جولائی ۱۸۶۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۳۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۴۔

___ ش ___

۸۴۔ مولانا شجاع الدین علوی حیدر آبادی

مولانا شجاع الدین علوی حیدر آبادی کے والد کا نام کریم اللہ اور دادا کا قاضی محمد دائم تھا۔ ہندوستان کے ممتاز علما میں سے تھے۔ شیخ صالح تھے۔ ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا مولانا غلام محی الدین برہان پوری سے بعض درسی کتابیں پڑھیں اور بعض کے لیے دیگر علمائے عصر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نانا کی وفات کے بعد ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء میں حجاز مقدس گئے اور سعادت حج حاصل کی۔ حج سے واپس آئے تو حیدر آباد کا عزم کیا' وہاں مولانا عزت یار خاں حیدر آبادی فروکش تھے' ان سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ پھر قندھار روانہ ہوئے جو اعمالِ ناندیڑ میں ایک گاؤں تھا۔ وہاں شیخ رفیع الدین قندھاری دکنی کا سلسلہ سلوک و طریقت جاری تھا' ان سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر حیدر آباد کو مراجعت کی اور وہاں درس و تدریس کی مسند آراستہ فرمائی۔

مولانا شجاع الدین علوی برہان پوری نے درس و تدریس کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتب و رسائل شامل ہیں:

۱۔ کشف الخلاصہ: اس میں حنفی فقہ سے متعلق مسائل بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۲۶ھ میں تصنیف فرمائی۔

۲۔ جوہر النظام: یہ بھی مسائل فقہ پر مشتمل ہے اور عربی نظم میں ہے۔

۳۔ رسالہ فی القراءۃ۔

۴۔ رسالہ فی بحث رویۃ اللہ عزوجل۔

۵۔ رسالہ فی فضل الجماعۃ۔

۶۔ رسالہ فی الجبر و القدر۔

۷۔ رسالہ فی بحث سماع۔

علاوہ ازیں سلوک و تصوف کے موضوع پر بھی بعض رسائل تصنیف کیے۔ کچھ مکتوبات' خطبے اور عربی و فارسی قصائد بھی ان کی یادگار ہیں۔

مولانا شجاع الدین ممدوح نے جمعہ کے روز ۴ محرم ۱۲۶۵ھ/ ۳۰ نومبر ۱۸۴۸ء کو حیدر آباد میں وفات پائی❶۔

● نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۵' ۲۰۶ بحوالہ تاریخ برہان پور۔

۸۵۔ مولانا شرف الدین ہاشمی پھلواروی

ہندوستان کے شہر پھلواری میں بے شمار علما وفقہا اور صوفیا و اولیاء پیدا ہوئے۔ ان بزرگان عالی قدر میں مولانا شرف الدین پھلواروی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا نام ہادی اور دادا کا احمدی تھا۔ نسلاً ہاشمی جعفری تھے۔ اپنے زمانے کے فاضل بزرگ تھے۔ فقہ اور تصوف میں کامل تھے۔

مولانا شرف الدین پھلواروی ۵ رجب ۱۲۳۵ھ/ ۱۸ اپریل ۱۸۲۰ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے۔ شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے ماموں محمد حسین سے جو شیخ احمدی کے تلمیذ تھے، حصول علم کیا اور ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

انھوں نے تہذیب المنطق کی بسیط و مفصل شرح سپرد قلم کی۔ بہت سے لوگوں کو مستفید فرمایا، فقہی فتوے لکھے اور درس و تدریس کے ذریعے خدمت دین انجام دی۔ پھلواری میں، جسے کئی سو سال سے علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے، مولانا شرف الدین کی خدمات نوع بنوع کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

اس عالم دین نے ۵۴ برس عمر پائی اور ۳ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ/ یکم فروری ۱۸۷۳ء کو انتقال کیا[1]۔

۸۶۔ مفتی شرف الدین رام پوری

مفتی شرف الدین رام پوری ہندوستان کے عالم کبیر اور رام پور کی مسند تدریس و افتا پر فائز تھے۔ اس نواح میں فقہ و اصول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ پورے علاقے میں ان کی تحقیق و کاوش کی دھوم تھی۔ فتوے کے لیے لوگ انھی سے رجوع کرتے۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، جن حضرات علما نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا ابوسعید دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد علی رام پوری، مولانا محمد حسن بریلوی، مولانا عبدالقادر رام پوری اور خلق کثیر شامل ہے۔ انھوں نے رام پور میں جو تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں ان میں اس علاقے اور عہد کا کوئی عالم و مدرس اور مفتی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

مفتی شرف الدین اصلاً پنجاب کے رہنے والے تھے۔ رام پور گئے تو نواب احمد علی خاں کے عہد حکمرانی میں ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا گیا۔ ان کی خدمات علمی کی بنا پر بعض گاؤں ان کو بطور معافی عطا کیے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے رام پور کی سیاست میں حصہ لیا تو اس سے ان کی تذلیل ہوئی اور معتوب قرار پائے۔ بعض اہل علم نے ان پر سخت الفاظ میں تنقید کی اور ان کے فکری رجحانات کی شدید مخالفت کی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اپنے دور کے نامور عالم اور ممتاز فاضل تھے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ "علوم فلسفہ و منطق میں بہت مشہور تھے۔

[1] نزہۃ الخواطرج ۷ ص ۲۰۷

۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں جب وہ کلکتے سے رام پور جا رہے تھے تو راستے میں فتح پور ہسوہ کے مقام پر اپنے داماد محمد سعید کی قبر پر جو سید راجی کی درگاہ میں تھی' فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لائے۔ اس اثنا میں میرے بڑے بھائی حکیم احسان علی کے مکان پر بھی آئے۔ میں اس زمانے میں کم عمر تھا' لیکن ان کا حلیہ اب تک میرے ذہن میں مرتسم ہے۔ میانہ قد' سیاہ رنگ' سفید ریش' کمزور جسم اور ضعیف القویٰ۔''

سید نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں مفتی صاحب ممدوح کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر تنقید کرتے ہوئے انھیں ''شرأفي الدين'' لکھا ہے۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' کے اردو مترجم ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ''اس ریمارک میں نواب صدیق حسن خاں کا عدم تقلید کا جذبہ کارفرما ہے۔'' ڈاکٹر صاحب ممدوح کا نواب صاحب کے بارے میں یہ محض سوئے ظن ہے۔ انھوں نے مفتی صاحب کو ''شرأفي الدين'' اس لیے لکھا ہے کہ انھوں نے اتنا بڑا عالم ہونے کے باوجود بعض بدعات و محدثات کی تائید کی اور ان کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس میں ''عدم تقلید کا جذبہ'' ہرگز ''کارفرما'' نہیں ہے۔ نواب صاحب نے ابجد العلوم' تقصار' اتحاف النبلا اور التاج المکلل وغیرہ متعدد کتابوں میں ہندی اور غیر ہندی علما و زعما اور محدثین و فقہا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں' ان میں اصحاب تقلید کی تعداد' غیر مقلدین سے کہیں زیادہ ہے' اگر نواب صاحب میں ''عدم تقلید کا جذبہ کارفرما'' ہوتا تو ہر جگہ اصحاب تقلید کا ذکر کسی اور انداز سے کیا جاتا۔ لیکن انھوں نے ایک دیانت دار تذکرہ نگار کی حیثیت سے یہ فرض انجام دیا ہے اور اہل حق کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔

بہرکیف مفتی شرف الدین رام پوری پر انھوں نے جو تنقید کی ہے' اس میں ''عدم تقلید کا جذبہ کارفرما'' نہیں بلکہ مفتی صاحب کی بدعات و محدثات ہیں' اور بدعات و محدثات کی تنہا نواب صدیق حسن خاں ہی تردید نہیں کرتے' مقلدین بھی اس کی سخت تردید کرتے ہیں۔

بے شک ہر صاحب قلم کسی خاص فکر و عقیدے کا حامل ہوتا ہے' لیکن ہر صاحب قلم ہر شخص کا ذکر اپنے ہی فکر و عقیدے کی روشنی میں نہیں کرتا۔ وہ حقائق و واقعات کی روشنی میں قلم کو حرکت دیتا ہے۔ اس لیے کسی صاحب قلم کی نیت کو زیر بحث لانے سے پہلے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بالخصوص نواب صدیق حسن خاں جیسے مصنف کے بارے میں گفتگو کرتے وقت تو انتہائی غور و فکر سے کام لینا چاہیے' جنھوں نے بلا امتیاز مذہب و مسلک ہزاروں ارباب فضل و کمال سے اہل تحقیق کو روشناس کرایا' اور ان کی تحریر مستقل حوالہ قرار پا گئی۔ ہم بہت سے موجودہ مقلدین کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تحریروں میں غیر مقلدین کا نام لینا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔

مفتی شرف الدین رام پوری مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سراج المیزان: علم منطق میں ہے۔

۲۔ شرح سلم الی لایسحد ولا یتصور۔

۳۔ فقہی فتوے۔

۴۔ ایک رسالہ جس میں ثابت کیا ہے کہ قارض کے لیے مقروض سے منافع لینا جائز ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی متعدد رسالے ان کی تصانیف ہیں۔

مفتی شرف الدین موصوف نے ۵ شعبان ۱۲۶۸ھ/ ۲۵ مئی ۱۸۵۲ء کو وفات پائی ❶۔

۸۷۔ مولانا شمس الدین حیدر آبادی

مولانا شمس الدین بن امیر الدین بن رحمت اللہ دہلوی حیدر آبادی' معقول و منقول میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۲۱۴ھ/ ۱۷۹۹ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء کو علاقہ برار کے شہر ایلچ پور میں ولادت ہوئی اور عالم طفولیت ہی میں اپنے والد امیر الدین کے ساتھ حیدر آباد آئے۔ وہاں قرآن مجید حفظ کیا اور مختلف علمائے عظام سے تحصیل علم کی۔ بعد ازاں خود معرکہ آرائے تدریس ہوئے اور بہت سے علما وطلبا کو فیض پہنچایا۔ علم فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں یگانۂ روزگار تھے۔

مولانا شمس الدین نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں' جن میں مندرجہ ذیل تصانیف شامل ہیں:

۱۔ طریق الفیض

۲۔ شمس النحو

۳۔ شمس التصریف

۴۔ شرح کلمۃ الحق

۵۔ خزانۃ الامثال

۶۔ جدول در تحقیق نصف النہار

۷۔ علم بلاغت کے بارے میں ایک رسالہ

۸۔ مجموعہ اشعار فارسی و اردو

مولانا شمس الدین حیدر آبادی نے ۱۴ رجب ۱۲۸۳ھ/ ۲۲ نومبر ۱۸۶۶ء کو حیدر آباد میں رحلت پائی ❷۔

۸۸۔ مولانا شیر محمد افغانی دہلوی

عالم باعمل اور فاضل اجل مولانا شیر محمد افغانی دہلوی گوناگوں اوصاف کے مالک تھے۔ اصلاً افغانستان کے باشندے تھے۔ تحصیل علم کے لیے وارد ہند ہوئے اور ملک کے جید اساتذہ سے فیض حاصل

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۴' ۸۵۔ تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۷۰' ۱۷۱۔ ابجد العلوم ص ۹۲۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۷' ۲۰۸۔ علم و عمل ج ۱ ص ۸۰ تا ۸۲۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۲ بحوالہ تزک محبوبی۔

کرتے اور مختلف بلاد وامصار کی خاک چھانتے ہوئے دہلی آئے اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے اور علوم حدیث وفقہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی ان کے ہم درس تھے جو قناعت وتوکل کا پیکر حسین تھے۔

مولانا شیر محمد افغانی دہلی میں اپنے زمانہ طالب علمی میں حکیم غلام حسن کے مکان پر سکونت پذیر تھے۔ اس شہر کو انھوں نے اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ انہماک وتوجہ سے حصول علم میں مشغول رہتے تھے۔

جب علوم ظاہری سے فارغ ہو چکے تو معرفت وتصوف کو مرکز التفات ٹھہرایا اور حضرت شاہ غلام علی علوی کی خدمت میں پہنچے جو مرجع اصحاب زہد واتقا تھے اور جن کے سلوک وعرفان کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا' ان سے مولانا شیر محمد افغانی نے خوب فیض پایا۔

علوم ظاہری وباطنی سے فراغت کے بعد خود مسند درس بچھائی اور افادہ طلبا کو مقصد زندگی قرار دیا۔ اس اثنا میں بے شمار لوگوں نے ان سے تحصیل علم کی۔

مولانا شیر محمد افغانی ذکی' بہت ذہین تھے۔ ساتھ ہی بے حد قانع' متوکل علی اللہ اور عابد وزاہد تھے۔ طلبا کو شوق اور دلچسپی سے تعلیم دیتے تھے۔

دور آخر میں ہندوستان کے حالات سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر ارادہ ہجرت اور ادائے حج بیت اللہ کے لیے دہلی سے نکلے اور حجاز مقدس کو روانہ ہوئے۔ لیکن اثنائے راہ میں ۲۹ صفر ۱۲۵۷ھ/۲۳ اپریل ۱۸۴۱ء کو بیت اللہ پہنچنے کے بجائے دربار خداوندی میں پہنچ گئے ❶۔

ص

۸۹۔ سید صادق نقوی لکھنوی

دیار ہند کے شیعہ علما وفقہا میں سید صادق نقوی نصیر آبادی لکھنوی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ سید محمد نقوی کے بیٹے اور سید دلدار علی نقوی کے پوتے تھے۔ ولادت اور نشو ونما لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد سید محمد نقوی' اپنے بھائیوں اور دیگر علمائے وقت سے تحصیل علم کی۔

اس خاندان کے تمام افراد اصحاب علم تھے۔ ان حضرات نے اپنے مذہب کی جو تدریسی وتصنیفی خدمت انجام دی' وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خود صاحب ترجمہ سید صادق نقوی مدرس اور مصنف تھے۔ ان کی تصانیف کو شیعہ مطبوعات میں خاص وقعت حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

---

❶ آثار الصنادید ص ۲۹۳۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۵۔

۱۔ تایید المسلمین فی اثبات نبوۃ خاتم النبیین والرد علی المسیحیین۔

۲۔ قاطع الاذناب۔

۳۔ قامع النصاب بفص فصل الخطاب فی توجیہ الجواب۔

اس کے علاوہ بھی متعدد کتب و رسائل ان کی یادگار ہیں۔

سید صادق نقوی عین عالم شباب میں ۴ رجب ۱۲۵۸ھ/ ۱۱۔ اگست ۱۸۴۲ء کو اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو رخصت ہوئے ❶۔

۹۰۔ مولانا صالح سورتی

مولانا صالح بن خیر الدین بن محمد زاہد ہاشمی سورتی، تیرھویں صدی ہجری میں علاقہ گجرات میں شہر سورت کے شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ دونوں علوم میں یکساں عبور تھا۔ مولد و منشا سورت ہے۔ ان کے والد گرامی مولانا خیر الدین سورتی بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ لائق بیٹے نے انھی سے علم حاصل کیا اور طویل عرصے تک ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سورت کے منصب قضا پر متمکن ہوئے اور تمام عمر یہ خدمت انجام دی۔ محکمہ افتا بہت اہم اور نازک محکمہ ہے۔ دور گزشتہ میں یہ محکمہ اسی شخص کو تفویض کیا جاتا تھا جو مسائل فقہ پر گہری نظر رکھتا اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ مولانا صالح کو اللہ نے اس مرتبہ بلند سے خوب نوازا تھا اور وہ ان نزاکتوں کو جو اس ضمن میں پیش آتی ہیں، کما حقہ سمجھتے تھے۔

سورت کے اس عالم حدیث و فقہ نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۳۴ھ/ ۷ ستمبر ۱۸۱۹ء کو انتقال کیا ❷۔

۹۱۔ قاضی صبغت اللہ مدراسی

قاضی صبغت اللہ ۵ محرم ۱۲۱۱ھ/ ۱۱ جولائی ۱۷۹۶ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اس کے بعد علوم مروجہ کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔ اس زمانے میں بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی مدراس میں فروکش تھے، قاضی صبغت اللہ نے جو طلب علم کے بالکل ابتدائی دور میں تھے، بحر العلوم سے تبرکاً میزان الصرف کے دو یا تین سبق پڑھے۔ یعنی ان کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد مختلف اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا، جن میں مولانا جعفر حسین مدراسی، مولانا علاؤ الدین لکھنوی، سید علی بن عبد اللہ حموی اور خود ان کے والد ماجد مولانا محمد غوث کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات علما سے تمام کتب درسیہ

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۷، ۲۱۸۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۸۔

پڑھیں اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ سید عبدالغفار نقشبندی سے اخذ طریقت لیا۔

قاضی صبغت اللہ مسلکاً شافعی تھے اور تحقیق و تدقیق کے اونچے درجے پر فائز تھے۔ قابلیت وصلاحیت اور حدیث وفقہ میں عبور کی بنا پر ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں انھیں ناگور کا منصب صدارت تفویض ہوا۔ اس کے ایک سال بعد مسند افتا عطا کی گئی اور ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں عہد قضا سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں سعادت حج بیت اللہ حاصل کی۔

جب مدراس کی اسلامی حکومت ختم ہوگئی اور اس علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انگریزی حکومت نے قاضی صاحب ممدوح کی معاش کا انتظام کر دیا اور وہ اپنے گھر کے گوشہ تنہائی میں بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے اپنے آپ کو درس وافادہ طلبا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ تشنگان علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ کامل توجہ اور انہماک سے ان کو درس دیتے۔ اس طرح بے شمار علما وطلبا نے ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

قاضی صبغت اللہ مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں:

۱۔ ھدایۃ السالک الیٰ موطا امام مالک۔
۲۔ نور العینین فی مناقب الحسنین
۳۔ الاربعین فی معجزات سید المرسلین۔
۴۔ رشق السہام الیٰ من ضعف کل مسکر حرام۔
۵۔ ازالۃ القتمۃ فی اختلاف الامتہ۔
۶۔ عمدۃ الرائض فی فن الفرائض
۷۔ المطالع البدریہ فی شرح الکواکب الدریہ۔
۸۔ مناھج الرشاد شرح زواجر الارشاد
۹۔ ذیل علی القول المسدد فی الذب عن مسند الامام احمد۔
۱۰۔ فہرس احادیث معجم الصغیر۔
۱۱۔ تعلیقات علیٰ حاشیہ شرح المواقف۔
۱۲۔ تعلیقات علیٰ صحیح مسلم۔
۱۳۔ تعلیقات علی المنتقی ابن الجارود۔
۱۴۔ تعلیقات سنن الترمذی۔
۱۵۔ تعلیقات شمائل الترمذی۔

ان تصنیفات وتعلیقات اور حواشی کے علاوہ قاضی صبغت اللہ مدراسی سے اور بھی متعدد کتب ورسائل

یادگار ہیں۔

قاضی صبغت اللہ مدراسی اپنے دور میں ہندوستان کے جید علما اور جلیل القدر فقہا میں سے تھے۔ دوشنبہ کے روز ۲۵ محرم ۱۲۸۰ھ/۱۲ جولائی ۱۸۶۳ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے ❶۔

۹۲۔ مفتی صدر الدین دہلوی

صدر الصدور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی برصغیر کے معروف علما میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا لطف اللہ تھا اور اصلاً کشمیر کے رہنے والے تھے' اس لیے لطف اللہ کشمیری کہلاتے تھے۔ کسی زمانے میں ان کے آبا و اجداد دہلی چلے آئے تھے اور پھر اسی بلدہ علم کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ صدر الدین اسی خانوادہ فضل و صلاح کے فرد فرید تھے' جو ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی میں مشاہیر اصحاب کمال اور ممتاز ارباب علم کی درس و تدریس کی محفلیں آراستہ تھیں اور دور دراز سے تشنگان علوم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے اور ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ مولانا صدر الدین نے بھی ان سے جی بھر کر استفادہ کیا۔ مولانا فضل امام خیر آبادی سے علوم حکمیہ و منطق کی کتابیں پڑھیں' شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے فقہ و اصول اور دیگر علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقہ درس میں بھی شامل رہے اور ان سے سند حدیث حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علم و فضل کی دنیا میں ممتاز و نامور ہوئے اور مسند درس و تدریس کو زینت بخشی۔ دہلی کے صدر الصدور مقرر کیے گئے اور قبلہ گاہِ اصحاب فضیلت قرار پائے۔

اس عہد میں ہندوستان کی مغل حکومت دم توڑ رہی تھی' اگرچہ بادشاہ تخت ہند پر متمکن تھے' مگر برائے نام۔ دراصل کاروبار حکومت اور ملک کے سیاسی نظم و نسق کی باگ ڈور کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھی' اور مولانا صدر الدین کو اس میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ وہ کمپنی کی طرف سے مفتی وقت تھے۔ صدر الصدور کے منصب بلند پر فائز تھے اور عدل و انصاف کا محکمہ ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

علوم میں عبور و استحضار:

مفتی صاحب ہر فن میں کامل اور ہر گوشہ علم میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ قرآن و حدیث کا کوئی پہلو زیر بحث آتا تو اس نہج سے اس کی وضاحت کرتے کہ معلوم ہوتا اس پر انھیں عبور حاصل ہے' اس کے سوا کسی فن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ یہی ان کا مرکز تحقیق اور ہدف فکر ہے۔ اگر فقہ و اصول سے متعلق زبان کو حرکت دیتے تو اس اسلوب سے اس کے نکات بیان فرماتے اور مسائل کی اس طرح صراحت کرتے کہ سننے والے حیران ہو ہو

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۹' ۲۲۰ بحوالہ تاریخ احمدی۔

جاتے۔ اگر فلسفہ ومنطق کے بارے میں گفتگو ہوتی تو اس کے باریک و نازک پہلوؤں کی زلف گرہ گیر کو اس انداز سے سلجھاتے کہ حاضرین مجلس ان کی وسعت مطالعہ سے نہایت متعجب ہوتے۔ اگر سلسلہ کلام کا رخ شعر و سخن کی طرف مڑ جاتا تو اس میں بھی ان کی رائے حتمی اور قطعی قرار پاتی۔

بہر حال وہ یگانہ روزگار عالم اور نادرہ عصر فاضل تھے۔ ہر علمی معاملے میں ان کے نقطہ نظر کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ جو بات کرتے' دلائل کی روشنی میں کرتے' پختگی' قطعیت اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل کی بھرمار ان کا طرہ امتیاز تھا۔ اپنے دور میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ مرجع خلائق تھے۔

تذکرہ نگاروں کا نذرانہ عقیدت:

نواب صدیق حسن خاں نہایت احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اتحاف النبلا میں ان سے متعلق جو الفاظ تحریر کیے ہیں' ان میں سے بعض الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں بہادر دہلوی حنفی، اپنے عہد کے نامور فقیہ اور دہلی کے دور آخر کے ممتاز فضلا میں سے تھے۔ بالخصوص معقولات کی درس و تدریس میں بڑی شہرت واہمیت رکھتے تھے۔ ہندوستان اور دار السلطنت دہلی میں ان کا فتویٰ جاری تھا اور وہ منصب افتا پر متمکن تھے۔ مدارس کے امتحانات اور حکومت کے دیوانی مقدمات کی صدارت ایسے اہم مناصب ان کے سپرد تھے۔ تفسیر و حدیث' فقہ و اصول' صرف ونحو' منطق و فلسفہ' ریاضی وحساب' معانی و بیان اور ادب و انشا میں انھیں درک حاصل تھا اور ان تمام علوم کا باقاعدہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ دہلی میں صاحب وجاہت وحشمت تھے۔ بجز بادشاہ دہلی کے ہر حلقے کے لوگ ان کے مکان پر آتے اور اپنی حاجات وضروریات ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ شہر دہلی اور اس کے گردونواح کے امرا و حکام' علما و زعما' اعیان و اکابر' رؤسا و فضلا' غرض ہر طبقے کے لوگوں کی ان کے ہاں آمد و رفت تھی۔ اہل دنیا دینوی معاملات میں اور اہل دین دینی امور میں ان سے مشورہ کرتے۔ شعراء اصلاح شعر کے لیے اور انشا پرداز اپنی تحریریں درست کرانے کے لیے حاضر خدمت ہوتے۔ مشاعروں میں شرکت فرماتے اور داد پاتے۔ قوت حافظہ بہت تیز تھی متانت' سنجیدگی' مروت' حسن اخلاق اور رفعت کردار میں اپنی مثال آپ تھے۔ اونچے مرتبے کے مدرس اور مقرر تھے۔ فصاحت بیان اور بلاغت کلام میں مشہور تھے [1]۔

سر سید نے آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور آغاز گفتگو میں یہ شعر درج فرمایا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

اس کے بعد لکھتے ہیں:

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ

---

[1] اتحاف النبلاء' ص ۲۶۰

سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس زبدہ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصا محالات سے اور کمالات کا مرتبہ متعسرات سے ہے۔ جس وقت قلم چاہتا بھی ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے' جو کہ ہر صفت قابلیت اول لکھنے کی اور ہر مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے۔ مدت تک یہی عقدہ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کون سی صفت سے اور کون سی مدح سے ابتدا کرے۔

مجلس تمام گشت و بپا یاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

بے شائبہ تکلف و بے آمیزش مبالغہ' ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو' اب سوا اس گروہ علمائے روزگار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں ❶۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

مفتی صدر الدین اپنے کمالات علمی کی بنا پر فائق الاقران تھے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور کے عہدے پر متمکن اور مفتی دہلی کے منصب سے سر بلند تھے۔ مروت و احسان میں بے مثل تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کے پہلو میں مدرسہ دار البقا میں طلبا کو درس دیتے اور ان میں سے اکثر کو طعام و لباس عطا فرماتے تھے۔ کثیر الدرس عالم تھے اور دور دراز سے بے شمار علما و طلبا حصول علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ❷۔

نزہۃ الخواطر میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں:

مفتی صاحب نادرہ دہر عالم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور درس و افادہ طلبا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کے عقب میں مدرسہ دار البقا کے پندرہ طلبائے علم کو اپنی گرہ سے وظیفہ دیتے تھے۔ ان سے نہایت مروت کا برتاؤ کرتے' ان کے کھانے پینے کی کفالت فرماتے' ان کی دل جوئی کرتے' ان کی مجلس میں بیٹھتے اور انھیں متعدد علوم کا درس دیتے ❸۔

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

مفتی صاحب کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کی جامع مسجد کو انگریزوں کے قبضے سے نکالا۔ رقم فرماتے ہیں:

جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضے میں آ گئی تھی۔ یہ مقدس عمارت تقریباً دو سال تک فوجی استعمال میں

---

❶ آثار الصنادید ص ۲۵۳

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳

❸ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۱۔

رہی۔ مسلمانان دہلی فریضہ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب دہلی میں امن جمی ہوگئی تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہم نوائی میں مسجد کی واگزاشت کی سعی کی۔ آپ کے شرکا میں شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کی اور مسلمان اکابر شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب اور مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے ❶۔

مولوی فقیر محمد جہلمی حدائق الحنفیہ میں رقم کرتے ہیں:

مفتی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور دہلوی، تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشا، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آباواجداد آپ کے کشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ فقہ و حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں، اور فنون عقلیہ کو مولوی فضل امام والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا، اور شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آپ بڑے صاحب وجاہت و ریاست اور اپنے زمانے میں یگانہ روزگار اور نادرہ عصر تھے۔ ریاست درس و تدریس خصوصاً افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی کی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان و اکابر اور علما و فضلا خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلبا تو واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورت معاملات اور منشی لوگ بغرض اصلاح انشا اور شعرا واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوت حافظہ و حسن تحریر و متانت تقریر اور فصاحت بیان اور بلاغت معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا ❷۔

شاہ عبدالعزیز کا ایک سفارشی خط

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کے استاد تھے اور بلند مرتبت استاد کے نزدیک شاگرد رشید کے علم و فضل کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مولانا صدر الدین کے اسلاف بھی ارباب فضیلت میں سے تھے اور ان کے جد امجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلمیذ تھے۔ اس کا پتا اس واقعہ سے چلتا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں مولانا صدر الدین دہلوی طلب معاش کے سلسلے میں عازم کلکتہ ہوئے۔ ان کا مقصد وہاں کے ایک مدرسے میں ملازمت اختیار کرنا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے مدرسے کے مہتمم کے نام جنھیں مولوی امین اللہ کہا جاتا تھا، مولانا صدر الدین کو ایک سفارشی خط لکھ کر دیا، اس کا خلاصہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلا میں درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط جس پر شاہ صاحب کی مہر اور ان کے دستخط ثبت ہیں،

---

❶ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۳۰۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱۔

انھوں نے دیکھا ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب مولوی امین اللہ کو لکھتے ہیں:

مولوی صدر الدین صاحب دہلی کے فضلائے نام دار میں سے ہیں۔ عربی کے اکثر علوم عقلی و نقلی میں، جن میں ادب، اصول، فقہ، کلام شامل ہیں اور فنون فارسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ تحقیق مسائل کے لیے اکثر مجھ ہی سے مراجعت کرتے ہیں اور میرے شاگرد ہیں۔ علاوہ ازیں مجھ سے تعلق ارادت بھی رکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ تعلقات و مراسم کا یہ سلسلہ ان کے آبا و اجداد سے جاری ہے۔ ان کے دادا معروف و مستند فضلا میں سے تھے اور والد ماجد (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے مخلص ترین احباب و تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اب یہ بعض معاملات کے لیے عازم کلکتہ ہوئے ہیں اور آپ سے ملاقات کریں گے۔ جہاں تک ممکن ہو، ہر لحاظ سے ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا برتاؤ کریں اور ان سے پورا تعاون فرمائیں۔ والسلام ❶

مدرسہ دار البقا کا انتظام و انصرام:

مغل بادشاہ شاہ جہان نے دہلی میں جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے دائیں بائیں روحانی اور جسمانی امراض کے علاج کے ادارے بھی قائم کیے۔ یعنی ایک طرف مدرسہ دار البقا اور دوسری جانب شفاخانہ دار الشفا تعمیر کرایا۔ مدرسہ دار البقا میں مختلف اوقات میں بے شمار جید اساتذہ نے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے اور لا تعداد طلبا اس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں مدرسہ دار البقا کے منتظم و منصرم مولانا مفتی صدر الدین تھے اور یہ مدرسہ ہر اعتبار سے کامیاب تھا۔ استفادہ کرنے والوں کا ایک ہجوم اس میں رہتا تھا اور مفتی صاحب ممدوح خود درس دیتے تھے۔ متعدد طلبا کی کفالت بھی خود ہی کرتے تھے اور ان کے اخراجات کی ذمے داری انھی کے سپرد تھی۔

تلامذہ:

مفتی صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی متعدد اہم شخصیتوں نے ان سے علم حاصل کیا۔ آگے چل کر جن میں سے ہر شخص نے ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لی اور فضل و کمال میں بے حد شہرت حاصل کی۔ ان میں نواب صدیق حسن خاں، سر سید احمد خاں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی، مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولانا ذوالفقار علی دیو بندی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولوی فقیر محمد جہلمی اور نواب یوسف خاں والی رام پور قابل ذکر ہیں اور یہ مفتی صاحب ممدوح کے وہ شاگرد ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور دیگر ذرائع سے ملک و ملت کی انتہائی خدمت کی اور اسی وجہ سے ان کو ہند اور بیرون ہند میں بدرجہ غایت احترام و اکرام کے مستحق گردانا گیا۔

---

❶ اتحاف النبلاء ص ۲۶۱۔

نواب صدیق حسن خاں سے تعلق خاطر اور سند:

نواب صدیق حسن خاں ان کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ علم وفضل کے لحاظ سے بھی اور حسن اخلاق کے اعتبار سے بھی نہایت بلند مرتبے کے حامل تھے۔ نواب صاحب تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہے، اس اثنا میں انھوں نے ان سے بہت استفادہ کیا اور ہر جہت سے ان کو اونچے درجے پر پایا۔ وہ ان سے انتہائی تلطف ومہربانی کا سلوک روا رکھتے اور انھیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی' شیخ نظام الدین اور دیگر بزرگان دہلی کے مزارات ومقابر پر لے جاتے۔ ان کی معیت میں انھوں نے شہر کے علما ومشائخ اور فضلا وصلحا کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کیا' شعرائے نام دار سے ملاقاتیں کیں اور ان کی مجالس میں شریک ہوئے اور بہت سی اہم شخصیتوں کو دیکھا❶۔

نواب صدیق حسن خاں نے ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء میں ان سے سند فراغ حاصل کی' جس میں مندرجہ ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔

مولوی سید صدیق حسن صاحب ذہن سلیم وقوت حافظہ وفہم درست ومناسبت تمام باکتاب ومطالعہ صحیح واستعداد تام دارند۔ جملہ کتب معقول رسمیہ از منطق وحکمت واز علم دین اکثر از بخاری وچیزی از تفسیر بیضاوی و فقہ واصول وعقائد وکلام وعربیت از فقیر اکتساب نمودند ومستعدانہ فہیدہ خواندند' وباجود آں بسعادت ورشد و صلاح ونیک نہادی وصفائے طینت وغربت واہلیت وشرم وحیا در اقران وااماثل خود ممتاز اند❷۔

یعنی مولوی سید صدیق حسن صاحب ذہن کی سلامتی' قوت حافظہ اور اصابت فہم کے اوصاف سے متصف ہیں۔ کتابوں کے ساتھ پوری مناسبت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ مطالعہ صحیح اور استعداد فکر کے جوہر سے آراستہ ہیں۔ معقول کی تمام مروجہ کتابیں جو منطق وفلسفہ پر مشتمل ہیں' مجھ سے پڑھیں۔ علم دینی میں سے صحیح بخاری کے اکثر حصے' تفسیر بیضاوی کے بعض حصے اور فقہ واصول' عقائد وکلام اور علوم عربیہ کی تحصیل کی اور خوب سمجھ کر پڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خیر وسعادت اور رشد وصلاح کی دولت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ نیک طبیعت اور صاف طینت ہیں۔ اہلیت وصلاحیت اور شرم وحیا میں اپنے تمام اقران وااماثل سے ممتاز ہیں۔

عزت واکرام:

مفتی صاحب ممدوح انگریزی حکومت میں نہایت عزت واکرام کے مالک تھے۔ صدر الصدور اور مفتی کے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جنرل آکٹرلونی جب راجپوتانہ کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس کے ہمراہ رہے۔ آکٹرلونی

❶ اتحاف النبلا ص ۲۶۱۔

❷ اتحاف النبلا ص ۲۶۲۔

ان پر بہت اعتماد کرتا تھا اور ان کی عقل و دانش کا مداح تھا۔ اس زمانے میں ان کو چار سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور باشندگان دہلی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ طلبا کو گھر پر درس دیتے۔ مدرسہ دارالبقا کو جو عرصے سے بند تھا از سر نو جاری کیا۔ طلبا کے جملہ مصارف کے خود ہی کفیل تھے۔

فتویٰ جہاد:

۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) میں ہندوستان کے طول و عرض میں حصول آزادی کا ہنگامہ بلند ہوا۔ یہ نہایت نازک موقع تھا، جس میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا اور مال و جان کی قربانی پیش کی، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی بالخصوص بہت بڑی تعداد انگریزوں کے خلاف میدان محاربہ میں نکل آئی تھی اور اجنبی اقتدار کے مقابلے میں صف آرا ہوگئی تھی۔ علمائے ہند نے اس کو جہاد قرار دیا اور چونتیس مشہور و ممتاز علما نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے، جن میں صدر الصدور مولانا مفتی صدر الدین دہلوی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ان کے مکان اور مدرسے میں ہر وقت مجاہدین کا جمگھٹا رہتا تھا اور اس اہم مسئلے کے تمام پہلو زیر بحث آتے تھے۔ لیکن جب یہ تحریک جہاد ناکام ہوگئی اور ملک پر انگریزوں نے مکمل قبضہ کر لیا تو انگریزوں کی مخالفت میں جو لوگ گرفتار ہوئے اور مستحق سزا ٹھہرے ان میں مفتی صدر الدین کا نام بھی شامل تھا۔

مصائب و آلام:

۱۸۵۷ء کے بعد مفتی صاحب کو شدید زخم چشم پہنچا۔ ملازمت بھی ختم ہوئی، اور تیس سال کی مدت ملازمت میں جو کچھ کمایا تھا وہ بھی بہ حق سرکار ضبط ہوا اور منقولہ و غیر منقولہ تمام جائداد چھین لی گئی، بلکہ فتویٰ جہاد پر دستخط کے سلسلے میں چند مہینے نظر بند بھی رہے۔ کتب خانہ جو مختلف علوم و فنون کی بہت سی قیمتی اور نایاب کتابوں پر مشتمل تھا اور تین لاکھ روپے کی مالیت کا تھا، انگریزوں کے قبضے میں آیا اور پھر نیلام ہوا۔ مفتی صاحب کو سب سے زیادہ افسوس اس کتب خانے کا تھا۔

جب حالات کچھ اعتدال پر آئے تو جائداد کی واپسی کے سلسلے میں مفتی صاحب لاہور تشریف لائے۔ اس زمانے میں پنجاب کا چیف کمشنر لارڈ جان لارنس تھا۔ وہ دہلی رہ چکا تھا اور مفتی صاحب ممدوح سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ لاہور آنے کا مقصد جائداد کی واپسی کے بارے میں جان لارنس سے گفتگو کرنا اور اس سے مدد لینا تھا۔ لیکن جائداد منقولہ نیلام ہو چکی تھی، لہٰذا اس کی واپسی ممکن نہ تھی۔ البتہ غیر منقولہ جائداد جو انگریزی حکومت نے ضبط کر لی تھی، واگزار ہوگئی۔

لاہور سے دہلی واپس گئے تو کچھ عرصہ بستی نظام الدین اولیا میں رہے۔ اس کے بعد اپنی حویلی میں تشریف لے گئے۔ اب تمام علائق دینوی سے منقطع ہو کر وظائف و عبادات اور علوم دینیہ کی تدریس کو اپنا وظیفہ

حیات قرار دے لیا تھا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ مدار معاش مکان کا کرایہ تھا۔

۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں جب وہ بستی نظام الدین میں اقامت گزیں تھے' حدائق الحنفیہ کے مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی ان کی خدمت میں گئے تھے اور تیرہ مہینے ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے مفتی صاحب سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی بعض کتابیں پڑھیں اور ان سے استفادہ کیا۔ یہ مفتی صاحب کے بڑھاپے کا دور تھا اور وہ بہتر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ مگر ذوق شعروسخن پورے شباب پر تھا۔ عربی' فارسی اور اردو میں خوب صورت شعر کہتے تھے ❶۔

حج بیت اللہ اور کتب دینیہ کی خواہش:

شوال ۱۲۷۶ھ میں اپنے تلمیذ رشید نواب صدیق حسن خاں کو ایک مکتوب ارسال کیا' جس میں لکھتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے' ابھی تک سانس کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے اور زندہ ہوں۔ اس کی رضا پر راضی اور جس طرح گزر رہی ہے' اس پر خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی اطاعت کا خواہاں اور اس کے احکام پر عمل کا متمنی ہوں۔ ہر حال میں صابر وشاکر ہوں۔ جادہ صواب اور طریق مستقیم پر چلنے کی التجا کرتا ہوں۔ نواہی سے اجتناب اور معروف کے مطابق زندگی بسر ہو تو اس سے بہتر کوئی شی نہیں۔ دل میں دو چیزوں کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ ایک حج بیت اللہ کی کہ اللہ اس کی توفیق عطا فرمائے' دوسرے کتب دینیہ' یعنی تفسیر اور حدیث کی کہ یہی علم نافع ہے اور اسی میں احکام دین پوشیدہ ہیں۔ باقی سب لغو اور فضول چیزیں ہیں۔ اوقات خاصہ میں میرے لیے حسن خاتمہ اور انجام خیر کی دعا کرتے رہیے ❷۔

اس زمانے میں حج بیت اللہ نہایت مشکل تھا۔ ہزاروں میں کسی ایک خوش قسمت کو یہ سعادت نصیب ہوتی تھی۔ راستے بہت تکلیف دہ اور سفر انتہائی صبر آزما۔ بری اور بحری دونوں ذرائع سفر مشکلات وموانع سے پر تھے۔ موجودہ زمانے کا طریق سفر اس سے قطعی مختلف ہے۔ ہوائی جہاز سے انسان تین چار گھنٹے میں ارض حجاز پر جا اترتا ہے۔ سمندری جہاز سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں مسافت طے ہو جاتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افسوس ہے گوناگوں مشکلات آڑے آئیں اور مفتی صاحب سخت تمنا کے باوجود حج نہیں کر سکے۔

شعروشاعری:

مفتی صاحب عربی' فارسی اور اردو کے شاعر تھے اور آزردہ تخلص کرتے تھے۔ یعنی مفتی صدر الدین آزردہ۔ مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں: فرط عشق اور ولولہ محبت سے ہمیشہ آزردہ خاطر' افسردہ طبع' دیدہ گریاں اور

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲۔

❷ اتحاف النبلاء ص ۲۶۱۔

سینہ بریاں رہتے تھے۔ شعر پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز' لحن حزیں اور صوت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کہ کیا انشا و شعر تھا یا ایجاد سحر۔ غالب' حسرتی' مومن اور دیگر شعرائے دہلی سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے' سب لوگ آپ کو لائق احترام گردانتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے[1]۔

اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرزا غالب اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں مفتی صاحب کا ذکر نہایت تعریف کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے لیے انتہائی عزت کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اٹھاتا ہوں۔ حسن اتفاق سے اصلاح خمسہ کے وقت دوست غم گسار' یار وفا شعار' علامہ روز گار' ختم العلماء' المتجرین مولوی صدر الدین خاں صاحب بہادر صدر الصدور سابق دہلی المتخلص بہ آزردہ دام بقاءہ وزاد علاءہ مجھ سے ملنے کو غم خانہ پر تشریف لائے ہوئے' موجود تھے۔ خمسہ کو دیکھ کر پسند فرمایا[2]۔

ذیل میں مفتی صاحب کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ پہلے عربی شعر ملاحظہ ہوں:

وكنا كغضى بانة قد تالفا
علىٰ دوحة حتى استطالا واينعا
يغنيهما صدح الحمام مرجعا
ويسقيهما كاس السحائب مترعا
سليمين من خطب الزمان اذاسطا
خليين من قول الحسرواذا سعا
ففارقني من غير ذنب جنية
والقى بقلبي حرقة و توجعا
عفاالله عنه ماجناه فانني
حفظت له العهد القديم وضيعا

فارسی شاعری میں مفتی صاحب ایسا بلند مقام رکھتے تھے کہ صہبائی نے اس سے متاثر ہو کر کہا تھا:

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲۔ نیز دیکھیے اتحاف النبلاء ص ۲۶۲۔

[2] اردوئے معلیٰ حصہ اول جلد اول ص ۴۲۵۔

ذیل میں ان کے چند فارسی شعر پڑھیے۔

خواہم دم دعا بدعا نا گریستن
شد بسکہ بے اثر بدعا ہا گریستن
سوز دلم نمود دو بالا گریستن
ایں درد را نکشتہ مداوا گریستن
دل قطرہ قطرہ خوں شدہ از چشم برچکید
تاراج داد مشغلہ ما گریستن
اے دل بیا کہ خاک کنم ابرو برق را
از تو نجوں تپیدن و از ما گریستن
آزردہ خیز کا مدہ طرفے و طالبا
از تو قصیدہ خوانم و زینہا گریستن

اب اردو کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

نالوں سے کب مرے تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگماں نہیں
کیا رشک دیکھ کر مجھے رنگ خزاں نہیں
جانے ہے دل فلک کا مری سچ کہانیاں
ان ناتوانیوں کو پہنچتی تواں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیر مغاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں
بے وقت آئی دَیر میں کیا شورشیں کریں
ہم پیر دَیر میکدہ بھی نوجواں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف ترکہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں
تھا غرق میں تصور آتش سے آب میں
کیا جانو جو اثر ہے دم شعلہ تاب میں
یہ وہ ہے برق آگ لگادے نقاب میں
قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے
ناخن ہمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں
مے اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
انوار فکر سے نہ ہوا کچھ بھی انکشاف
جتنا پڑھے ہم اور پڑے جا حجاب میں
یہ عمر اور عشق، ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

حسن کی شان سے ہے یہ رہے مستور نہیں
ورنہ ہوتا کبھو یوں جلوہ سرطور نہیں
چارہ اب کیا ہو جو ہو نشتر و مرہم یکساں
کون سا داغ ہے سینے میں جو ناسور نہیں
محتسب کو کیا بے کار تری آنکھوں نے
ایک میخانہ بھی اس دور میں معمور نہیں
دامن اس کا تو بھلا دور ہے، ہاں دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں
میں ہوں اور گوشہ یثرب یہ تمنا ہے اب
خواہش سلطنت قیصر و فغفور نہیں
مدد اے پر تو لطفِ نبوی کوئی عمل
شمع تنہائی ظلمت کدۂ گور نہیں
ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیرے
سلسلہ یہ متناہی ہے وہ محصور نہیں

ترک روئے جوش آزردہ محالات سے ہے
یوں خدا کی تو خدائی سے ہے کچھ دور نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی' بلا تھی' قیامت تھی' جاں نہیں

کامل اس فرقہ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

مکھڑا وہ غضب' زلف سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جیے کوئی شب ایسی ' سحر ایسی

انصاف دوست عالم:

مفتی صدر الدین آزردہ معتدل مزاج اور انصاف دوست عالم تھے۔ خواہ مخواہ جھگڑتے رہنا اور دوسروں پر کفر کے فتوے لگانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ مولانا اسماعیل شہید سے اختلاف کے باوجود ان کی بہت تعریف کرتے۔ نواب صدیق حسن خاں رقم فرماتے ہیں۔

باوجود تعصب مذہب انصاف دوست بود' بارہا از زبانش ثنا و صفت مولانا محمد اسماعیل شہید و مولوی اسحاق دہلوی نزیل مکہ مکرمہ شنیدہ شدہ[1]۔

یعنی اپنے مذہب (حنفیت) میں تعصب کی حد تک متشدد ہونے کے باوصف انصاف دوست اور روادار تھے۔ بارہا ان کی زبان مبارک سے مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی کے بارے میں صفت وثنا کے کلمات سنے گئے۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۲۶۰

کثرت علم اور فراوانی فضل و کمال کی وجہ سے علما و طلبا ان کی طرف رجوع کرنے میں فخر محسوس کرتے اور ان سے سند و اجازہ کو بہت بڑا اعزاز قرار دیتے تھے۔ بعض لوگ مختلف بلاد و امصار کے نامور اساتذہ سے علوم مروجہ اور فنون متداولہ کی باقاعدہ تحصیل کر کے بھی ان کی خدمت میں آتے اور ان سے چند اسباق یا کوئی چھوٹی سی کتاب پڑھ کر ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرتے ❶۔

تصنیفات:

مفتی صاحب ممدوح کا زیادہ وقت اور عمر کا اکثر حصہ درس و تدریس اور افتا نویسی وغیرہ کے اہم کام میں گزرا۔ تصنیف و تالیف کا بہت کم موقع ملا۔ تاہم کچھ کتابیں ان سے یادگار ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ منتهى المقال في شرح حديث لا تشد الرحال: اس میں انھوں نے امام ابن حزم، امام ابن تیمیہ اور ان دیگر محدثین و فقہا کا رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد کی رو سے قبور انبیا و اولیا کی زیارت کو جانا جائز نہیں۔

۲۔ الدر المنضود فی حکم امراة المفقود: اس میں بتایا گیا ہے کہ جس عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو، وہ کتنا عرصہ انتظار کرے۔

۳۔ بہت سے فقہی فتوے جو انھوں نے مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے۔

۴۔ تذکرہ آزردہ: کچھ عرصہ پہلے تک "تذکرہ آزردہ" کے وجود سے متعلق شبہ کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ اس کا کوئی نسخہ سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن اب اس میں شبہے کی گنجائش نہیں رہی، اس لیے کہ آزردہ کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ میں دست یاب ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بیان ہے کہ "مفتی صدرالدین آزردہ کے اس تذکرے کا واحد نسخہ آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ردیف نون پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں انشا کا ترجمہ ان کے عالم دیوانگی ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۳۳ھ کے مابین داخل کیا گیا ہے۔ غالباً یہی اس کا زمانہ تالیف ہے۔ اس کا ایک عکس ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ) کے پاس ہے۔ دوسرا عکس جو ہلکے مٹیالے رنگ کے کاغذ پر ہے اور اصل مخطوطے کے سائز پر تیار کیا گیا ہے، اکبر علی خاں (رام پور) کے پاس ہے ❷۔

مفتی صاحب کے فقہی نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی تحقیق میں گفتگو کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تیرھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے جلیل القدر عالم اور عظیم فقیہ تھے۔ انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ فتویٰ نویسی، درس و تدریس اور شعر و شاعری میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اللہ نے ان کو جن متنوع خوبیوں سے نوازا تھا، وہ کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔

❶ اتحاف النبلاء ص ۲۶۲

❷ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۲۵۰، ۲۵۱

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط:

مئی جون ۱۹۲۱ء کے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں مفتی صاحب ممدوح کا ایک خط شائع ہوا ہے، جو انھوں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط اردو میں ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔ اس خط سے ان کے بہت سے کوائف کا پتا چلتا ہے۔ خط کے اندراج سے پہلے ان کا مختصر سا تعارف کرایا گیا ہے، جو یہ ہے:

مفتی صاحب موصوف غدر کے پس وپیش زمانے میں دلی کے سر برآوردہ علما میں سے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ شعر وسخن کے لحاظ سے غالب کے ہم نشینوں اور حریفوں میں تھے۔ دلی میں اونچے درجے کے طلبا کو بے مزد واجرت علمائے سلف کے طریقے پر درس دیتے تھے۔ منصب کے لحاظ سے انگریزوں کی طرف سے دلی کے صدر الصدور تھے۔ اس وقت تک عام مسلمان اور خصوصاً علما انگریزوں کی نوکری کو حرام اور کم از کم تقوے کے خلاف جانتے تھے، جس کی شہادت اس زمانے کے بزرگوں کے خطوط میں بکثرت ملتی ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے اس منصب کی آمدنی سے اپنی ذاتی جائداد بہت پیدا کر لی تھی، لیکن غدر کے طوفان میں ان پر بھی انگریزوں نے بے وفائی کا الزام قائم کیا، اور ان کی جائداد ضبطی میں آگئی، اور منصب صدارت سے بھی الگ کر دیے گئے۔

ذیل کا خط اسی زمانے کا ہے۔ اس خط سے مفتی صاحب کے اندرونی خیالات کا پتا لگے گا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ دہلی کی تباہی پر ان کا دل کیسا کڑھتا تھا۔ اس عہد میں خط وکتابت کی زبان فارسی تھی مگر غالب کی جرات آموزی نے دوسرے ادیبان ہند کو بھی اس کی ہمت دلا دی تھی کہ وہ بے تکلف اور رواں اردو میں اظہار مطلب کریں، چنانچہ اس خط سے معلوم ہوگا کہ غالب کے علاوہ اوران کے معاصر انشا پردازوں کی طرز تحریر بھی کیسی بے تکلف، سادہ اور رواں تھی۔

یہ خط ہم کو مفتی صاحب کے شاگرد رشید نواب صدیق حسن خان مرحوم کی ایک ناتمام قلمی ''تاریخ قنوج'' میں دست یاب ہوا ہے، جو اب ان کے خلف الصدق صفی الدولہ نواب علی حسن خان کے پاس ہے۔ (خط مندرجہ ذیل ہے۔)

''شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اوس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا، مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتوئی دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلباءِ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا کاغذ کا دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کا پڑھانا اور اطراف وجوانب کے سوالات شرعی کا لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا، مجالس شادی اور غمی اور اعراس میں جانا، شعر وشاعری کی صحبت کو

گرم رکھنا' باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا' الفتون ❶ کو ساتھ لے جانا اور اون کی دعوت کا اہتمام کرنا' یہ اشغال ایسے تھے کہ رات دن اسی میں غلطان پیچان تھا اور جان کو ایک دم آرام نہ تھا۔ نہ کھانے کی حلاوت' نہ سونے کا مزہ' نہ طاعت کا لطف' نماز پنج گانہ بھی حسب عادت ادا نہ ہوتی تھی۔ وجوہ فیصلہ لکھتے لکھتے ظہر کا وقت اکثر آ جاتا تو وجوہ ڈگری وڈسمس کے عین نماز میں وسوسہ انداز ہوتے۔ تنخواہ اور آمدنی رجسٹری کی جب آتی تو ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی۔ اگرچہ لوگوں کو میرے ہونے سے اس کام پر نفع تھا مگر میری ذات کو کچھ فائدہ اور تمتع دنیا کا نہ تھا' اور آخرت کا حال یہ ہے کہ یہ نوکری یعنی فصل خصومات موافق قوانین انگریزی کے اور یہ فتویٰ نویسی برعایت قواعد شرع ہو ہرگز جائز نہ تھی' گو دباؤ سے ہمارے علم و وجاہت کے کوئی بول نہ سکتا تھا اور استکراہ ہمیشہ اس سے رہا مگر کبھی چھوڑا نہیں۔ اس چالیس برس کی نوکری میں ہزار ہا کو جتایا اور ہزار ہا کو ہرایا' سیکڑوں بسوہ داریاں ہمارے حکم سے نیلام ہوئیں' صد ہا آدمیوں کے قتل کا فتویٰ دیا اور صد ہا قید ہوئے' سوائے اس کے اور گناہ بہتیرے ہیں جن کو میں جانتا ہوں' اور جو علم الٰہی میں ہیں' اس کا کچھ حساب نہیں۔ ساری عمر صرف افعال بہیمی و حیوانی ہوئی اور اگر انسان ہوئے تو شیطان ہوئے۔ اسی کی مغفرت پر بھروسہ ہے' والا مواخذہ ہو تو کچھ ٹھکانا نہیں۔ حقوق اللہ وہ اپنے فضل عمیم سے بخشے گا' حقوق العباد بھی اس کے کرم سے بخشے جائیں۔ اللهم مغفرتك او سع من ذنوبي ورحمتك ارجى عندي من عملي۔ جب حال یہ ہے تو کیسا انعام و احسان اس کا ہے کہ ایسے گرفتار علائق کو ان بلیات سے ایسا الگ کر دیا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں' اور اگر اسی حال میں موت آ جاتی تو نفس اسی آفات میں مبتلا رہتا جیسا کہ كما تعيشون تموتون كما تموتون تحشرون ۔ اور کس وقت میں علیحدہ کیا کہ جب عمر ستر کو پہنچی اور پھر نجات کس مصیبت سے دی کہ کوئی مصیبت دنیا کی اس سے بڑھ کر نہ تھی' اور رزق کا ڈھنگ ایسا پیدا کر دیا کہ اس کی حلت میں کچھ شبہ نہیں۔ املاک متروکہ پدری اس میں کم تھیں اور اکثر زرخرید اسی مال مشتبہ سے تھی' وہ بالکل مشروع ہوگئی اور پھر سرکار سے مجدداً عطا ہوئی خواہ وہ آدھی ہو یا ساری ہو واسطے معاش کے کافی ہے' خير الذكر الخفي و خير الرزق ما يخفي۔ اور نہ وہ کتابیں رہیں جن کا پڑھنا پڑھانا محض لغو و لاطائل تھا۔ کلام اللہ و منتخب احادیث بخاری و مسلم و حصن حصین و حزب الاعظم اور ادعیہ ماثورہ کہ ہر وقت اور ہر جگہ بہم پہونچتے ہیں' اگر بعد فراغ حوائج انسانی اور ادائے نماز پنج گانہ کے کل اوقات اس کی تلاوت اور ذکر انہی میں صرف ہوں اور یہی شعار اور یہی دثار ہو تو کیا خوش طالعی اور کیسی خوش نصیبی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں حاصل ہیں۔ ایسی آسودگی اور فارغ البالی کہ یک ذرہ بھی لگاؤ دنیا اور اہل دنیا سے نہ رہا' مجھ جیسے آلودہ علائق دنیا کو کہاں میسر تھی اور پھر اس وقت میں کوئی دنیا کی حسرت باقی نہیں رہی' اور آفتاب عمر قریب غروب ہے اور اب تلک حواس قائم اور عقل درست اور تندرستی

❶ یہ خاص دلی کا لفظ ہے جس کے معنی ''بیکار لوگوں'' کے ہیں۔

ہے۔ توبہ وانابت واستغفار وطاعت وعبادت پروردگار کی اب تک باقی ہے، اگر یہ بقیہ انفاس اسی میں گزر جاویں اور خاتمہ ایمان پر ہو تو نعمت دو جہانی حاصل ہے۔ امید احباب باصفا اور عزیزان بے ریا سے یہ ہے کہ یہی دعا میرے حق میں کریں۔ بعض حمقاء اہل دنیا سے جب میرے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ ابھی پھر وہ ہی حکم حاصل ہو اور وہی اوج موج اور وہی ڈنکا بجے یا بعضے سفہا یہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہی حکم رانی ہو جاوے، پھر اختیار ہے چند روز بعد چھوڑ دینے کا، تو میں بہت ہنستا ہوں ان کی خفت پر۔ کوئی حسن عاقبت کی دعا نہیں کرتا۔

اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا و عذاب الاخرۃ۔ اللھم اقم لنا من الیقین ماتھون علینا مصائب الدنیا۔ اللھم کمارزقتنی مما احب فاجعله قوۃ لی فیما تحب۔

خداوندا! ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر، اور ہم کو دنیا کی ذلت اور عذاب آخرت سے نجات دے۔ خداوندا! ہم کو ایسا یقین دے جس سے مصائب دینوی آسان ہو جائیں۔ خداوندا! جس طرح تو نے مجھ کو محبوب چیزیں عطا فرمائی ہیں اسی طرح اوس کو اون کاموں کے لیے ایک قوت بنا جو تجھ کو محبوب ہیں۔

عمل بر آن کما حقہ نشود آن وقت از دست رفت

اللھم وماذویت عنی مما احب فاجعله فراغاً لی فیما تحب۔

خداوندا! تو نے میری جن محبوب چیزوں کو مجھ سے دور کر دیا ہے ان کی جگہ وہ چیزیں عطا کر جن کو تو محبوب رکھتا ہے۔

حالا وقت آنست کہ امیدوار استجابت آن باشم

قال تعالیٰ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۔ (القصص:۵۸)

''اور کتنے گاؤں جن کی زندگی فخر وغرور کی زندگی بن گئی تھی، ہم نے ان کو برباد کر دیا، پس ان کے یہ مکانات ہیں جن میں ان کے بعد بہت کم سکونت اختیار کی گئی، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔''

یہ حال ہوا دہلی کا اور اہل دہلی کا:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔ (النحل:۱۱۲)

''اور خدا نے ایک گاؤں کی یہ مثل بیان کی ہے، جو نہایت پرامن تھا، اور جس میں ہر طرف

سے رزق بہ افراط آتا تھا' لیکن جب اس نے کفران نعمت کیا تو خدا نے اس کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا' یہ ان اعمال کے عوض میں تھا جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے ❶۔"

مفتی صاحب کا مکان اور ان کا حلیہ:

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں مفتی صاحب کے مکان کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے اور ان کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک بیٹا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی چھپن سال کی تھی۔ گداز جسم' سانولا رنگ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں' بھری ہوئی داڑھی' بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک برکا انگرکھا' سفید پاجامہ' سفید کرتا اور سفید ہی عمامہ تھا ❷۔

وفات:

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور تمام علمی و تدریسی سرگرمیاں معطل ہو گئی تھیں۔ ایک یا دو سال اس مرض میں گرفتار رہے اور اسی حالت میں پنج شنبہ کے روز ۲۴ ربیع الاول ۱۲۵۵ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۷۲ء) کو اس جہان فانی سے عالم آخرت کے لیے رخت سفر باندھا۔ اکاسی (۸۱) سال عمر پائی۔ اولاد سے محروم تھے ❸۔

❶ منقول از "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ مئی جون ۱۹۲۱ء ص ۴۴۶ تا ۴۵۰۔

❷ علمائے ہند کا شان دار ماضی ج ۴ ص ۲۲۳ (حاشیہ) بحوالہ "دلی کی آخری شمع"

❸ مفتی صدر الدین آزردہ کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: آثار الصنادید ص ۲۵۲ تا ۲۶۳۔ الیانع الجنی ص ۷۷۔ ابجد العلوم ص ۹۱۷۔ گلشن بے خار ص ۱۰، ۱۱۔ اتحاف النبلاء ص ۲۶۰ تا ۲۶۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱ تا ۴۸۴۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۳ تا ۹۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۰، ۲۲۱۔ تذکرۂ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۲۴۷ تا ۲۴۹۔ علمائے ہند کا شان دار ماضی ج ۴ ص ۲۱۹ تا ۲۳۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۹۵۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۷۴، ۲۷۵۔ گل رعنا ص ۳۲۷، ۳۲۸۔ (حاشیہ) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۲۵۰، ۲۵۱۔

۹۳۔ سید صفدر کشمیری

سید صفدر بن صالح حسینی رضوی کشمیری، شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ شیعہ مسلک کے تھے اور مشاہیر علمائے شیعہ میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا وادیٔ کشمیر ہے۔ مولانا محمد مقیم کشمیری کے شاگرد تھے۔ طویل مدت تک ان سے منسلک اور وابستہ رہے۔ فقہ و کلام اور نجوم و جفر وغیرہ علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ کبر سنی کے دور میں فرخ آباد گئے، بعد کو لکھنؤ کا عزم کیا اور لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ کم گو اور کم خور تھے۔ "مجموع" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تین جلدوں میں ہے اور مختلف فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ اسلوب کلام موثر اور میٹھا تھا۔ تحریر میں بھی پختہ تھے۔ اور بہتر انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی کتاب "مجموع" اس کا ثبوت ہے۔

سید صفدر کشمیری نے جمعرات کے دن ۱۷ رجب ۱۲۵۵ھ / ۲۶ ستمبر ۱۸۳۹ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا[1]۔

ـــــ ط ـــــ

۹۴۔ مولانا طیب کشمیری

مولانا طیب بن احمد بن مصطفیٰ رفیقی کشمیری، دیار کشمیر کے فضلا و فقہا میں سے تھے۔ ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں ولادت ہوئی۔ قرآن مجید مولانا خیر الدین کشمیری سے پڑھا، کتب درسیہ اپنے والد محترم، چچا اور چچا کے بیٹوں سے پڑھیں۔ اس خاندان کے سب لوگ علم میں یگانۂ روزگار تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی انھیں بہرہ وافر حاصل تھا۔

مولانا طیب رفیقی نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق علم کے تمام شعبوں میں دست رس حاصل کی اور نام پایا۔ پارسا اور صاحب تقویٰ عالم تھے۔ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔

مطالعہ کتب ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ ہمیشہ حدیث و فقہ کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ درس و افادہ طلبا کا سلسلہ بھی تھا اور زیادہ وقت اسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور علم کے ہر میدان میں شہرت پائی۔ کشمیر کے اس محدث و فقیہ کی نظر بہت وسیع تھی اور علم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے۔ پیر کے روز ۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ / ۱۹۔ اگست ۱۸۵۰ء کو رحلت فرمائی[2]۔

---

[1] نجوم السماء ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۳۔

[2] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۹۔

ظ

۹۵۔ مولانا ظفر احمد لکھنوی

مولانا ظفر احمد ولد قدرت علی انصاری لکھنوی کی ولادت اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد مکرم مولانا قدرت علی لکھنوی اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھے۔

جو علمی و فقہی خدمات انھوں نے انجام دیں' ان کی وجہ سے اپنے علاقے اور معاصرین میں اعزاز کے مستحق گردانے گئے۔ فقہی نوعیت کی فتویٰ نویسی میں خصوصیت سے مشہور تھے۔ ان کے والد بھی عالم و فاضل بزرگ تھے اور فقہ میں درک رکھتے تھے۔ لائق بیٹا بھی ان سے بہت متاثر ہوا۔ باپ کے نقش قدم پر چلا اور زمانے میں نام پایا۔

جس خاندان سے یہ تعلق رکھتے تھے' اس کے تمام افراد کئی پشت سے اصحاب علم چلے آ رہے تھے۔ اللہ نے اولاد کو بھی اپنے اسلاف کی خوبیوں سے نوازا اور علم و فضل کی دولت بے پایاں سے سرفراز کیا۔

مولانا ظفر احمد انصاری لکھنوی نے ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں انتقال کیا❶۔

۹۶۔ مولانا ظہور الحق فرنگی محلی

خانوادہ فرنگی محل کے جن علما و فقہا نے شہرت و ناموری حاصل کی' ان میں مولانا ظہور الحق انصاری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ والد کا نام مولانا ازہار الحق انصاری لکھنوی تھا' جو علم و فضل میں ممتاز تھے۔

مولانا ظہور الحق انصاری لکھنوی کا شمار صالح اور متقی علما میں ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد محترم مولانا ازہار الحق سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ بحر العلوم مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی جو برصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ تھے' ان کے نانا تھے' ان سے بھی اکتساب علم کیا اور علما و فقہا کی جماعت میں درجہ امتیاز کو پہنچے۔

اخذ علم کے بعد طلب معاش اور حصول رزق کے لیے کلکتہ' مدراس اور حیدر آباد کے طویل سفر کیے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے' حتیٰ کہ جو قرض ان کے ذمے تھا' وہ بھی ادا نہ ہوا اور لمبی چوڑی پر مشقت مسافت کے باوجود مقروض ہی رہے۔ سخی' جواد' کریم النفس اور عمدہ خصال عالم تھے۔ اپنی عزت نفس کو ہر قیمت پر محفوظ رکھتے تھے۔ دین کو کبھی دنیا کی چوکھٹ پر نہیں جھکایا۔ خود دار اور بلند ہمت فقیہ تھے۔ تفسیر' حدیث اور فقہ کی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۵۔

کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ ان علوم شرعی کے مقابلے میں یونانی علوم منطق و فلسفہ وغیرہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

تیرھویں صدی ہجری کے یہ عالم وفقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر مطمئن تھے۔ توکل اور قناعت ان کا شیوہ تھا۔ جید عالم تھے اور مسجد میں وقت گزرتا تھا❶۔

۹۷۔ مولانا ظہور الحق پھلواروی

مولانا ظہور الحق بن نور الحق بن عبدالحق بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی' اپنے زمانے کے برگزیدہ عالم دین اور اونچے مرتبے کے شیخ تھے۔ برصغیر کے فقہائے حنفیہ میں عزت و تکریم کے مالک تھے۔ ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے اور مولانا جمال الدین ڈھروی سے کسب علم کیا۔ پھر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں دہلی گئے اور ان سے علم حدیث کی سند لی۔ ان کے والد گرامی مولانا نور الحق پھلواروی بھی اپنے عہد کے شیخ اور عالم تھے' ان سے اخذ طریقت کیا اور عرصے تک ان کے فیض صحبت میں رہے۔

یہ خاندان اصلاً پھلواری کا رہنے والا تھا اور اس کے اکابر وہیں اقامت گزین تھے' لیکن ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں مولانا ظہور الحق اپنے والد گرامی کو ساتھ لے کر پھلواری سے عظیم آباد (پٹنہ) منتقل ہو گئے تھے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

مولانا ظہور الحق پھلواروی کثیر الدرس عالم تھے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ فقہ اور سلوک کے موضوع سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس نامور عالم نے ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۳۴ھ/ ۶ ستمبر ۱۸۱۹ء کو عظیم آباد میں انتقال کیا اور ان کی میت پھلواری منتقل کی گئی❷۔

۹۸۔ مولانا ظہور علی انصاری لکھنوی

مولانا ظہور علی بن حیدر انصاری لکھنوی' فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد مولانا حیدر اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی اور دیگر علمائے عصر کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔ عالم جوانی میں قرآن مجید حفظ کیا اور طویل عرصے تک لکھنؤ میں درس و تدریس کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

ان کے والد مولانا حیدر لکھنوی حیدر آباد میں مقیم تھے۔ ان کی وفات کے بعد لائق بیٹے نے حیدر آباد کا عزم کیا اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر آباد کی سرکار میں مولانا حیدر کو اعزاز و اکرام کی نگاہ سے دیکھا

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۹۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۷۹٬ ۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۶۔ احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۵٬ ۳۶۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۶ بحوالہ شجرہ شیخ بدر الدین

جاتا تھا‘ مولانا ظہور علی بھی ان تمام صلات و جوائز کے مستحق قرار پائے‘ جن سے باپ بہرہ مند تھے۔

مولانا ظہور علی انصاری مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں:

۱۔ تفسیر قرآن کریم۔

۲۔ الطریقۃ الوسطی فی سماع الموتی۔

۳۔ معراجیہ۔

۴۔ شرح علی خطبۃ شرح السلم۔

اس عالم وفقیہ نے سلخ رمضان ۱۲۷۵ھ/ اپریل ۱۸۵۹ء کو حیدر آباد میں انتقال کیا❶۔

۹۹۔ مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی

مفتی ظہور اللہ بن مولانا محمد ولی بن مفتی غلام مصطفیٰ انصاری فرنگی محلی‘ اپنے عصر کے معروف عالم تھے۔ یوں تو تمام علوم مروجہ پر عبور تھا‘ لیکن علم فقہ میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مولانا محمد ولی اور عم محترم ملاحسن سے تحصیل علم کی اور جلیل القدر علما میں شمار ہوئے۔ اس زمانے میں نواب سعادت علی خاں علاقہ اودھ کا حکمران تھا‘ ان کی شہرت علمی اس کے کانوں میں پہنچی تو عہدۂ افتا پیش کیا‘ جو اس وقت ایک عظیم عہدہ تھا اور اسی عالم کو تفویض کیا جاتا تھا جو دیگر علوم کے علاوہ علم فقہ میں بھی درک رکھتا ہو۔ کچھ عرصہ اس عہدے پر متعین رہے‘ پھر بعض وجوہ کی بنا پر جن کا تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا‘ اس عہدے سے معزول کر دیے گئے۔ معزولی کے بعد نواب سعادت علی خاں کے نائب حکیم مہدی علی خاں کی رفاقت میں رہے اور اس کی سفارش سے نواب مذکور کی سرکار سے بیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ سعادت علی خاں کی وفات کے بعد زمام حکومت اس کے بیٹے غازی الدین حیدر نے ہاتھ میں لی تو مفتی ممدوح کو پھر اسی عہدے پر مامور کر دیا گیا۔

مفتی ظہور اللہ انصاری درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے اور حکومت اودھ کی طرف سے منصب افتا کی ذمے داریاں بھی ان کے سپرد تھیں۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا‘ جن میں مولانا فضل رسول بدایونی‘ مولانا شاہ احمد سعید دہلوی‘ مفتی سعد اللہ مراد آبادی‘ مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی‘ مولانا حیدر علی فیض آبادی‘ مولانا مسیح الدین کاکوروی‘ مولانا عبدالمجید بدایونی‘ مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی اور مولانا ثابت علی بھکوی الہ آبادی ایسے بہت سے اکابر فضلا شامل ہیں۔

مفتی صاحب بہت اچھے مصنف اور شارح بھی تھے۔ متعدد درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں‘ جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ حاشیہ میر زاہد

۲۔ حاشیہ میر زاہد ملا جلال

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۶‘ ۲۲۷۔

۳۔ حاشیہ میر زاہد شرح المواقف

۴۔ حاشیہ الدوحۃ المیادہ فی الصورۃ والمادہ ___ از جون پوری

مفتی ظہور اللہ نے درس و تدریس، حواشی و تعلیقات اور افتا میں بڑی شہرت پائی۔ علما و طلبا میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں فوت ہوئے ❶۔

۱۰۰۔ سید ظہور محمد کالپوی

سید ظہور محمد بن خیرات علی بن حسین علی حسینی ترمذی کالپوی، علمائے ربانی میں سے تھے اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء کو کالپی میں پیدا ہوئے اور مختصرات اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم لکھنؤ ہوئے۔ وہاں مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی اور مولانا حیدر انصاری فرنگی محلی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور کتب درسیہ پڑھیں۔

اس زمانے میں مرزا حسن علی شافعی لکھنوی کا شہرۂ علمی دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ اپنے عہد کے ممتاز محدث اور فقیہ تھے۔ سید ظہور محمد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے نور الانوار، ہدایۃ الفقہ، شرح نخبۃ الفکر، اصول حدیث سے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ایک رسالہ، موطا امام مالک، بلوغ المرام، صحیح مسلم کا کچھ حصہ، صحیح بخاری کا کچھ حصہ اور حصن حصین کا درس لیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ مرزا حسن علی نے ۲۷ شعبان ۱۲۴۸ھ/ ۱۹ جنوری ۱۸۳۳ء کو باندہ میں ان کو ان کتابوں کی سند و اجازہ سے شرف بخشا۔

اس کے بعد دہلی گئے، وہاں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا معرکہ درس حدیث جاری تھا، اس میں شرکت کی اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہوئے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ۷ شوال ۱۲۳۹ھ/ ۵ جون ۱۸۲۴ء کو اور شاہ غلام علی دہلوی نے ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ/ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۲۴ء کو وفات پائی۔ ان دونوں حضرات کی وفات پر سید ظہور محمد کالپوی دہلی میں تھے۔

سید ظہور محمد کالپوی نے ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء کو سفر حجاز اختیار کیا اور حج و زیارت سے متمتع ہوئے۔ چودہ مہینے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ اس زمانے میں وہاں مولانا محمد عابد سندھی (متوفی ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ/ ۹ مئی ۱۸۴۱ء) درس دیتے تھے، ان کی خدمت میں گئے اور ان سے صحیحین کا درس لیا۔

سید ظہور محمد کالپوی تیرھویں صدی ہجری کے جید عالم، نامور فقیہ، بلند مرتبہ شیخ اور معزز و محترم بزرگ تھے۔ ۲۷ شعبان ۱۲۸۸ھ/ ۱۱ نومبر ۱۸۷۱ء کو راہی ملک بقا ہوئے ❷۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۹، ۱۰۰۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۴۷ تا ۷۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۷، ۲۲۸۔ احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۶، ۳۷۔

❷ تقصار جیود الاحرار ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۸۔

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقی، بھوپال۔ ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء۔

۲۔ البقاء المن بالقاء المحن: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء۔

۳۔ ۱۸۵۷ء: میاں محمد شفیع۔ مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۵۷ء۔

۴۔ ۱۸۵۷ء: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل' لاہور۔ ۱۹۵۷ء۔

۵۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ: عبداللطیف۔ ترتیب وترجمہ: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء۔

۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل' لاہور۔ ۱۹۵۷ء۔

۷۔ آثار الاول من علماء فرنگی محل: عبدالباری فرنگی محلی، مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۸۔ آثار الصنادید: سرسید احمد خاں۔ ترتیب وحواشی: ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔ ۱۹۶۶ء۔

۹۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۱۰۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء۔

۱۱۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری: ڈاکٹر فرمان فتح پوری مجلس ترقی ادب' لاہور۔ ۱۹۷۲ء۔

۱۲۔ اردوئے معلی: مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ تدوین وحواشی: سید مرتضی حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب' لاہور۔ ۱۹۶۹ء۔

۱۳۔ اسلامی مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ سال ہشتم: مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۸۷۰ء۔

۱۴۔ انوار العارفین: محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع صدیقی، بریلی۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء۔

۱۵۔ انواع بارک اللہ: حافظ بارک اللہ لکھوی۔ مطبع وکٹوریہ پریس' لاہور۔ ۱۸۹۱ء۔

۱۶۔ امداد المشتاق: (حالات ومکتوبات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی۔ تھانہ بھون۔ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۹ء۔

۱۷۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما انتظام اللہ شہابی۔ طبع دہلی۔ ۱۹۴۶ء۔

۱۸۔ باغی ہندوستان: عبدالشاہد خاں شروانی۔ مکتبہ قادریہ' لاہور ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء۔

۱۹۔ برکات الاولیا: امام الدین گلشن آبادی۔ افضل المطابع، دہلی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء۔

۲۰۔ بزم تیموریہ: صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۹ء۔

۲۱۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی: (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) عبداللہ ملک۔ مجلس ترقی ادب' لاہور۔ ۱۹۶۷ء۔

۲۲۔ بہادر شاہ ظفر اوران کا عہد: رئیس احمد جعفری۔ کتاب منزل' لاہور۔

۲۳۔ بوستان اخیار: سعید احمد مارہروی۔ طبع آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء۔

۲۴۔ پنجابی ادب دی کہانی: عبدالغفور قریشی، طبع لاہور۔

۲۵۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ: مولا بخش کشتہ۔ پاکستان پرنٹنگ پریس' لاہور ۱۹۶۰ء۔

۲۶۔ التاج المکلل۔ نواب صدیق حسن خاں۔ طبع ثانی، ناشر شرف الدین واولادہ، بمبئی۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء۔

۲۷۔ تاریخ اودھ: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔۱۹۱۹ء
۲۸۔ تاریخ اولیائے دہلی: احمد سعید دہلوی۔ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔۱۹۵۴ء
۲۹۔ تاریخ برہان پور: خلیل الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء۔
۳۰۔ تاریخ پرگنہ بکتسر و ممدوٹ: سید نثار علی۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور ۱۸۷۳ء۔
۳۱۔ تاریخ شاہ جہان پور: محمد صبیح الدین شاہ جہان پوری۔ نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۳۲ء۔
۳۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال احمد شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور ۱۹۶۳ء۔
۳۳۔ تاریخ لاہور: کھنیا لال۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۷۶ء۔
۳۴۔ تاریخ مشائخ چشت: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔۱۹۵۳ء۔
۳۵۔ تاریخی مقالات: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۶ء۔
۳۶۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء۔
۳۷۔ تجلی نور المعروف تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع جون پور۔۱۸۸۹ء۔
۳۸۔ تحفہ کشمیر: منشی گنیش لال دہلوی۔ مطبع کوہ نور، لاہور۔۱۸۵۳ء۔
۳۹۔ تحقیقات چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی، لاہور۔۱۹۶۴ء۔
۴۰۔ تذکرۃ الشعراء: امیر دولت شاہ۔ مطبع مجیدی، کان پور۔۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء۔
۴۱۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ آزاد پریس، پٹنہ۔
۴۲۔ تذکرہ صوفیائے بنگال: اعجاز الحق قدوسی۔ مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔۱۹۶۵ء۔
۴۳۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ: مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی۔ جامعہ اسلامیہ، بنارس۔
۴۴۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار اسٹیم پریس، لاہور۔۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء۔
۴۵۔ تذکرہ علمائے پنجاب: اختر راہی۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۱ء۔
۴۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: محمد عنایت اللہ۔ طبع لکھنؤ۔۱۹۱۴ء۔
۴۷۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔۱۹۱۴ء۔
۴۸۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ ترجمہ و حواشی: ڈاکٹر محمد ایوب قادری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء۔
۴۹۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع، لکھنؤ۔۱۹۲۷ء۔
۵۰۔ تراجم علمائے حدیث ہند: ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ جید برقی پریس، دہلی ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء۔
۵۱۔ تفسیر ابن کثیر: حافظ ابن کثیر طبع لاہور۔۱۹۷۲ء۔
۵۲۔ تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ اشاعت العلوم، دہلی۔
۵۳۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں مطبوعہ بھوپال۔۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔
۵۴۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ طبع دمشق۔۱۹۵۸ء۔
۵۵۔ جماعت مجاہدین: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔۱۹۵۵ء۔
۵۶۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: (واقعات و شخصیات) ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ پاک اکیڈیمی حیدر آباد، کراچی ۱۹۷۶ء۔

۵۷۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔
۵۸۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۷ء۔
۵۹۔ حیات شبلی: سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء۔
۶۰۔ حیات العلما: سید عبدالباقی سہوانی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء۔
۶۱۔ حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء۔
۶۲۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی موسوم بہ ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔
۶۳۔ رود کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۵ء۔
۶۴۔ روضۃ الابرار: محمد الدین۔ سراج المطابع، جہلم ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء۔
۶۵۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۴ء۔
۶۶۔ سیر المتاخرین: غلام حسین طباطبائی نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء۔
۶۷۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی لکھنوی ۱۹۲۱ء۔
۶۸۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی: مولانا محمد میاں۔ مکتبہ محمودیہ لاہور ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء۔
۶۹۔ علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی): مرتبہ محمد ایوب قادری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء۔
۷۰۔ فتاویٰ عزیزی: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ ترتیب مولانا محمد احسن نانوتوی مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء۔
۷۱۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا عبدالحی لکھنوی طبع مصر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء۔
۷۲۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: مولوی ذوالفقار احمد۔ مفید عام پریس آگرہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء۔
۷۳۔ کلمات طیبات: ابوالخیر بن احمد مرادآبادی۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء۔
۷۴۔ گل رعنا: سید عبدالحلیم حسنی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۶۴ء۔
۷۵۔ مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والا جاہی: سید محمد علی حسن خاں۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۴ء۔
۷۶۔ مالابدمنہ: قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ مطبع محمدی۔
۷۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: طفیل احمد منگلوری۔ طبع لاہور۔
۷۸۔ معارف (ماہنامہ) اعظم گڑھ۔
۷۹۔ معمولات مظہریہ: مولانا نعیم اللہ علوی بہرائچی۔ مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء۔
۸۰۔ مفید المفتی: مولانا عبدالاول جون پوری، مکتبہ غوثیہ ملتان ۱۴۰۱ء/۱۹۸۱ء۔
۸۱۔ مقامات مظہری: شاہ غلام علی مجددی۔ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء۔
۸۲۔ مکمل تاریخ کشمیر: (حصہ سوم) محمد الدین فوق۔ طبع لاہور ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء
۸۳۔ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء: (قلمی) سید جعفر علی نقوی۔ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔
۸۴۔ نزہۃ الخواطر (جلد ہفتم۔): سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء۔
۸۵۔ واقعات دارالحکومت دہلی: بشیر الدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس آگرہ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء۔
۸۶۔ الیانع الجنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہٹی۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء۔

فقہائے ہند

تیرھویں صدی ہجری

حصہ دوم

۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ

نام کتاب: ______ فتنۂ ہند

مصنف: ______ محمد اسحاق بھٹی

اہتمام: ______ محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

باشتراک دار النوادر

مطبع: ______ شفیق پریس

حروف خوانی: ______ محمد سعید بھٹی

کمپوزنگ: ______ محمود فرید

صفحات: ______ ۱۸۹

سرورق: ______ ضیاء الرحمٰن

جلد ساز: ______ بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون:32212991-32629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318، 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

ترتیب

- **مقدمہ** ۲۳۳
- تبلیغ اسلام اور دعوتِ جہاد ۲۳۳
- پہلی مخبری ۲۳۴
- مولوی محمد جعفر کی تلاشی اور گرفتاری ۲۳۶
- مزید گرفتاریاں ۲۳۶
- پہلا مقدمۂ بغاوت۔ انبالہ ۲۳۸
- فیصلہ ۲۳۹
- کالے پانی کو روانگی ۲۴۰
- عظیم آباد کا پہلا مقدمۂ بغاوت ۲۴۰
- جائداد کی ضبطی اور نیلامی ۲۴۱
- عورتوں اور بچوں کی حالت زار ۲۴۲
- مالدہ کا مقدمۂ بغاوت ۲۴۴
- راج محل کا مقدمۂ بغاوت ۲۴۵
- عظیم آباد کا دوسرا مقدمۂ بغاوت ۲۴۶
- کالا پانی ۲۴۷
- مولانا احمد اللہ ۲۴۹
- مولانا یحییٰ علی ۲۵۰
- مولانا عبدالرحیم ۲۵۳
- مولانا محمد جعفر تھانیسری ۲۵۵
- میاں عبدالغفار ۲۵۸
- مولوی امیر الدین ۲۵۸
- مولوی تبارک علی ۲۵۸
- میاں مسعود گل ۲۵۸
- ابراہیم منڈل ۲۵۸
- حکومت ہند کا اعلان ۲۵۹
- لارڈ میو کا قتل ۲۵۹
- وائسرائے کا قاتل ۲۶۲
- قتل کا ردعمل وہابی قیدیوں پر ۲۶۳
- چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں؟ ۲۶۴
- **ع**
- ۱۔ سید عالم علی حسینی نگینوی ۲۶۵
- ۲۔ قاضی عباس علی کلکتوی ۲۶۷
- ۳۔ قاضی عبدالاحد سورتی ۲۶۸
- ۴۔ مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی ۲۶۸
- ۵۔ مولانا عبدالباسط قنوجی ۲۷۰
- ۶۔ مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھی ۲۷۱
- ۷۔ مولانا عبدالحق بنارسی ۲۷۳
- ۸۔ مولانا عبدالحکیم لکھنوی ۲۷۶
- ۹۔ مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی ۲۷۷
- ۱۰۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی ۲۷۹
- ۱۱۔ مولانا عبدالرحیم رام پوری ۲۸۴
- ۱۲۔ سید عبدالسلام حسینی ہسوی ۲۸۵

♦ ۱۳۔ قاضی عبدالسلام عباسی بدایونی	۲۸۷
♦ ۱۴۔ سید عبدالشکور بریلوی	۲۸۸
♦ ۱۵۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	۲۸۹
♦ تلامذۂ کرام	۲۸۹
♦ مختلف زبانوں پر عبور	۲۹۰
♦ قرآن اور حدیث سے شغف وتعلق	۲۹۱
♦ قوتِ حافظہ	۲۹۲
♦ انداز خطابت وتقریر	۲۹۲
♦ طلباء سے شفقت	۲۹۳
♦ عادات واطوار	۲۹۴
♦ حاضر جوابی	۲۹۴
♦ انگریزوں کے خلاف فتویٰ	۲۹۶
♦ اذیت ومصیبت	۲۹۸
♦ تصنیفات	۲۹۸
♦ شعر وشاعری	۳۰۱
♦ مرض اور وفات	۳۰۲
♦ حلیہ	۳۰۲
♦ اولاد	۳۰۳
♦ ۱۶۔ مولانا عبدالعزیز قریشی پرہیاروی	۳۰۳
♦ ۱۷۔ مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی	۳۰۸
♦ ۱۸۔ مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی	۳۰۹
♦ ولادت اور تعلیم وتربیت	۳۱۰
♦ ذہانت وفطانت	۳۱۰
♦ مسند تدریس اور لکھنؤ کی ترکِ سکونت	۳۱۱
♦ شاہ جہان پور میں قیام	۳۱۲
♦ رام پور کا عزم	۳۱۲
♦ قصبہ بوہار	۳۱۳
♦ مدراس کا عزم اور والہانہ استقبال	۳۱۴
♦ عادات وخصائص	۳۱۵
♦ تصنیفات اور حواشی وتعلیقات	۳۱۵
♦ وفات	۳۱۷
♦ ۱۹۔ شاہ عبدالغنی دہلوی	۳۱۷
♦ ۲۰۔ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی	۳۱۸
♦ ۲۱۔ مولانا عبدالقادر رام پوری	۳۲۲
♦ ۲۲۔ قاضی عبدالقادر کنتوری	۳۲۳
♦ ۲۳۔ شاہ عبدالقادر دہلوی	۳۲۵
♦ حصولِ علم	۳۲۵
♦ مسجد اکبرآبادی	۳۲۵
♦ تلامذۂ کرام	۳۲۶
♦ رعب وجلال	۳۲۶
♦ ترجمۂ قرآن	۳۲۷
♦ خواجہ میر درد کی شاگردی	۳۲۷
♦ ترجمے کی خصوصیات	۳۲۹
♦ وفات	۳۳۰
♦ ۲۴۔ مفتی عبدالقیوم صدیقی بڑھانوی	۳۳۱
♦ ۲۵۔ مولانا عبداللہ مدراسی	۳۳۳
♦ ۲۶۔ مولانا عبداللہ مدراسی	۳۳۴
♦ ۲۷۔ مولانا عبداللہ الٰہ آبادی	۳۳۵
♦ ۲۸۔ سید عبداللہ غزنوی	۳۳۷
♦ نام ونسب	۳۳۷
♦ خاندان	۳۳۷
♦ قریہ صاحب زادگان	۳۳۸
♦ حصولِ علم	۳۳۹
♦ فیضانِ عام	۳۴۱

- ♦ جذبۂ احیائے سنت ۳۴۱
- ♦ علمائے سوا اور امیر کابل کی ایذا رسانی ۳۴۲
- ♦ جلا وطنی اور حصولِ علم حدیث ۳۴۴
- ♦ مراجعت وطن اور مزید اذیتیں ۳۴۴
- ♦ پھر جلا وطنی ۳۴۵
- ♦ مصائب کی انتہا اور مولانا کی استقامت ۳۴۵
- ♦ جلا وطنی اور ظالم حکام کا انجام ۳۴۸
- ♦ کابل سے روانگی اور امرتسر میں ورود ۳۴۸
- ♦ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں ۳۴۹
- ♦ ایک سچا خواب ۳۵۲
- ♦ ایک اور سچا خواب ۳۵۳
- ♦ شیرازہ بکھر گیا ۳۵۴
- ♦ تذکرہ نگاروں کا خراجِ عقیدت ۳۵۵
- ♦ تلامذہ اور اصحابِ ارادت ۳۶۲
- ♦ مولانا عبدالرحمٰن لکھوی ۳۶۲
- ♦ خاندانِ غزنویہ اور لکھویہ کے روابط ۳۶۴
- ♦ راقم عاجز کے بزرگوں کی حاضری ۳۶۶
- ♦ مولانا محمد حسین بٹالوی ۳۶۷
- ♦ مولانا غلام رسول ۳۶۷
- ♦ مولوی غلام قادر ۳۶۹
- ♦ قید خانے کی سختی اور پشاور کو روانگی ۳۷۰
- ♦ امرتسر میں پہلی دفعہ آمد اور قیام ۳۷۱
- ♦ موضع خیرالدین میں مدت قیام ۳۷۴
- ♦ امرتسر میں مستقل سکونت ۳۷۵
- ♦ افغانی اصحابِ عقیدت کی آمد و رفت ۳۷۶
- ♦ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصانیف سے شغف ۳۷۶
- ♦ قبولیت دعا ۳۷۷
- ♦ تلاوتِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ ۳۷۷
- ♦ سخاوت و جودت ۳۷۸
- ♦ عفو و درگزر ۳۷۸
- ♦ وفات ۳۷۹
- ♦ اولاد ۳۸۰
- ♦ بھائی اور والدہ ۳۸۰
- ♦ بیٹوں کی اولاد ۳۸۱
- ♦ علمائے غزنویہ کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات ۳۸۲
- ♦ مولانا عبداللہ غزنوی کے سوانح حیات ۳۸۵
- ♦ تعلقات کا پیمانہ ۳۸۶
- ♦ فتاویٰ غزنویہ ۳۸۷
- ♦ حافظ محمود امرتسری ۳۸۸
- ♦ ۲۹۔ سید عبداللطیف حسینی ویلوری ۳۸۸
- ♦ ۳۰۔ سید عبدالمغنی پھلواروی ۳۹۰
- ♦ ۳۱۔ مفتی عبدالواجد خیرآبادی ۳۹۰
- ♦ ۳۲۔ مفتی عبدالواحد فرنگی محلی لکھنوی ۳۹۱
- ♦ ۳۳۔ مولانا عبدالوہاب مدراسی ۳۹۱
- ♦ ۳۴۔ قاضی علی احمد گوپاموی ۳۹۳
- ♦ ۳۵۔ سید علی اعظم پھلواروی ۳۹۵
- ♦ ۳۶۔ سید علی حبیب ہاشمی پھلواروی ۳۹۵
- ♦ ۳۷۔ سید علی سجاد جعفری پھلواروی ۳۹۷
- ♦ ۳۸۔ سید علی کبیرالہ آبادی ۳۹۸

♦	۳۹۔ مفتی علی کبیر مچھلی شہری	۳۹۹
♦	۴۰۔ مولانا علی محمد مچھلی شہری	۴۰۰
♦	۴۱۔ مفتی علیم الدین کاکوروی	۴۰۱
♦	۴۲۔ سید علیم اللہ جالندھری	۴۰۲
♦	۴۳۔ مولانا عماد الدین رفیقی کشمیری	۴۰۳
♦	۴۴۔ مولانا عمر رام پوری	۴۰۴
♦	۴۵۔ مولانا عمران رام پوری	۴۰۵
♦	۴۶۔ مفتی عنایت اللہ کاکوروی	۴۰۵
♦	۴۷۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی	۴۰۸
♦	مراجع ومصادر	۴۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

فقہائے ہند کی جلد ششم حصہ دوم کے مقدمے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر ہوا تھا اور بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف اہل ہند کی یہ پہلی بغاوت تھی جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ نیز وضاحت کی گئی تھی کہ اس میں ملک کے کس کس طبقے کے لوگوں نے حصہ لیا اور کن اسباب و وجوہ کی بنا پر لیا۔ یہ بھی عرض کیا تھا کہ بغاوت پر قابو پا لینے کے بعد انگریزی حکومت نے اس ملک کے باشندوں پر انتہائی مظالم ڈھائے' مسلمانوں کو بالخصوص ہدف ستم ٹھہرایا۔ مغل حکومت ختم ہوگئی اور اس کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوا' انگریزی عدالت میں اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا' اسے جلاوطنی کی سزا ملی اور اس نے بے کسی اور غربت کے عالم میں رنگون میں وفات پائی ــــــ برصغیر کی تاریخ حکمرانی کا ایک بہت بڑا باب یہاں آ کر ختم ہوگیا۔

اس کے بعد ایک اور دور شروع ہوتا ہے' جسے انتہائی سنگین اور دردناک دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دور میں دو فریق ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف انگریزی حکومت ہے جو تمام سیاسی اختیارات کی مالک اور ظلم و ستم کے ہر چھوٹے بڑے ہتھیار سے مسلح ہے۔ دوسری طرف اہل حق کی جماعت ہے جو بظاہر بہت کم تعداد پر مشتمل ہے۔ ان کے پاس نہ دینوی جاہ و جلال ہے' نہ مادی شان و شکوہ! ان کا تمام تر سرمایہ کلمہ حق ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت کے نزدیک ان کا یہ بہت بڑا جرم تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں یہ گرفتار ہوئے' اسی کے نتیجے میں انھیں شدید جسمانی سزائیں دی گئیں اور اسی بنا پر انھیں کالے پانی بھیجا گیا۔ اس اجمال کی مناسب تفصیل یا اس متن کی ضروری تشریح آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے:۔

تبلیغ اسلام اور دعوت جہاد:

برصغیر کے مختلف حصوں میں تبلیغ اسلام اور دعوت جہاد کا جو سلسلہ سید احمد شہید کے زمانے سے جاری تھا' حادثہ بالاکوٹ (۶ رمئی ۱۸۳۱ء) کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی۔

پھر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں واقعات کی رفتار میں کچھ اور تغیر رونما ہوا۔ اس سے چند سال پیشتر پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم تھی اور قدرتی بات ہے کہ مجاہدین کی اولین ٹکر انھی سے ہوئی۔ پھر سکھوں کی جگہ انگریزی تسلط نے لی تو ان کا مقابلہ براہ راست انگریزوں سے ہوا۔ سکھ اور انگریز دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے اور مجاہدین یکے بعد دیگرے دونوں سے متصادم ہوئے۔ سکھوں سے تصادم کا دور عارضی تھا' لیکن انگریزوں سے سو سال سے زیادہ عرصہ ۱۹۴۷ء (یعنی قیام پاکستان) تک جنگ جاری رہی ___ سرحد پار کے مجاہدین تو باقاعدہ میدان محاربہ میں انگریزوں سے برسر پیکار تھے' لیکن بہت سے لوگ برصغیر کے مختلف علاقوں سے انھیں نقد روپے بھیجتے تھے اور اس روپے سے وہ اسلحہ وغیرہ خریدتے اور انگریزی حکومت کے خلاف اسے استعمال کرتے تھے ___ روپیہ اکٹھا کرنا اور پھر اسے مجاہدین کے مرکز میں بھیجنا' سخت مشکل کام تھا جو انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اس کے جو مراکز قائم تھے' ان میں بہت بڑا اور اہم مرکز عظیم آباد کا محلہ صادق پور تھا۔ عظیم آباد اس زمانے میں "پٹنہ" کا نام تھا جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ اس کا محلّہ "صادق پور" جلیل القدر علما کا مرکز تھا' جن میں مولانا ولایت علی' مولانا عنایت علی' مولانا احمد اللہ' مولانا یحییٰ علی' مولانا فیاض علی' مولانا عبدالرحیم' حکیم عبدالحمید' مولانا عبداللہ اور حافظ عبدالمجید وغیرہ بہت سے نامور حضرات شامل ہیں۔ ان سب کا تعلق جماعت مجاہدین سے تھا۔ اس تعلق کی بنا پر انگریزی حکومت نے انھیں شدید اذیتوں اور سخت مصیبتوں میں مبتلا کیا اور ایسی ایسی سزائیں دیں کہ جن کے تصور ہی سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

پہلی مخبری:

ہوتی مردان کا ایک شخص غزن خاں جو ضلع کرنال کے محکمہ پولیس میں سارجنٹ کے عہدے پر فائز تھا' مئی ۱۸۶۳ء کی بات ہے کہ اس کو جرنیلی سڑک پر گشت کے دوران ضلع کرنال کے ایک مقام پر چار آدمی پیدل جاتے ہوئے ملے۔ ان کی وضع قطع درویشوں کی سی تھی اور رنگ سانولے تھے۔ غزن خاں نے انھیں بنگالی سمجھ کر روکا اور پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اسے شبہ تھا کہ یہ لوگ مجاہدین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شبہے کی وجہ یہ تھی کہ ہوتی مردان اور مجاہدین کے مرکز میں اس وضع قطع اور شکل وصورت کے لوگ اس نے دیکھے تھے۔ ان آدمیوں نے غزن خاں کو بتایا کہ وہ ملکا (سرحد) سے آئے ہیں اور منشی محمد جعفر کے پاس تھانیسر جا رہے ہیں' اس سے مل کر آگے نکل جائیں گے اور مہینے دو مہینے بعد واپس آئیں گے۔ انھوں نے غزن خاں سے کہا تم بھی نوکری چھوڑ کر ہمارے ساتھ ملکا چلو' وہاں بہت بڑی جنگ ہونے والی ہے۔

غزن خاں نے یہ باتیں سنیں تو انھیں گرفتار کر کے پانی پت کے تھانے میں لے گیا' اور ایک رپورٹ تیار کی' جس میں لکھا کہ یہ لوگ حکومت کے دشمن ہیں۔ انھوں نے بہت کہا کہ ہمیں چھوڑ دیا جائے' لیکن غزن خاں نے انھیں نہ چھوڑا۔ وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو عدم ثبوت کی بنا پر انھیں رہا کر دیا گیا۔ ان کا

مقدمہ مسٹر سٹیفن ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ اس نے ۱۸ مئی ۱۸۶۳ء کو حکم لکھا کہ ''چھان بین کے بعد واضح ہوا کہ یہ چار آدمی معمولی مسافر ہیں' لہٰذا انھیں رہا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے ❶۔

ان کی رہائی کو غزن خاں نے اپنی پیشہ وارانہ توہین سمجھا اور اسے سخت ذہنی کوفت ہوئی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس نے مسلمانان برصغیر کے اس اصلاحی اور دینی نظام کو انگریزی حکومت کی خوش نودی کے لیے برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے فیروز کو جو سرحد کے ایک مقام حمزہ خاں میں مقیم تھا' خط لکھا کہ تم ملکا جاؤ۔ وہاں ایک اخوندزادہ عبداللہ اقامت گزیں ہے' اس کی مسجد میں جا کر ٹھہرو اور اس کے ذریعے مکمل معلومات حاصل کرو کہ جماعت مجاہدین کو ہندوستان کے کس کس علاقے اور کن کن لوگوں کے ذریعے مالی امداد ملتی ہے۔ باپ کی ہدایت کے مطابق فیروز وہاں پہنچا۔ دس دن اس علاقے میں مقیم رہا۔ مختلف مقامات پر گیا' مجاہدین کے ٹھکانوں اور ان کی سرگرمیوں کا پتا چلایا اور پورے کوائف حاصل کر کے واپس اپنے وطن حمزہ خاں آیا اور اپنے باپ غزن خاں کو تمام تفصیلات تحریر کر کے بھیجیں۔ اس نے باپ کو یہ بھی بتایا کہ محمد جعفر تھانیسری مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتا ہے اور انھیں رائفلیں وغیرہ بھی بھیجتا ہے۔ اور پھر اس کے بھیجے ہوئے مال اور اسلحہ کو مجاہدین' انگریزوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ فیروز نے یہ بھی لکھا کہ مجاہدین فخریہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی ان کے دوست ہیں۔ اس سلسلے میں وہ محمد جعفری تھانیسر کا نام بھی لیتے ہیں۔ اسے وہ خلیفہ کہتے ہیں اور اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا وہ کوئی بہت بڑا نواب ہے ❷۔

اس طرح غزن خاں اور اس کے بیٹے فیروز کی رپورٹ سے پہلی مرتبہ سرکاری سطح پر مجاہدین کی اس تنظیم کا راز فاش ہوا' اور یہ پہلی مخبری تھی جو ان باپ بیٹے نے ان سراپا خلوص لوگوں کی کی۔

اب یہ رپورٹ آگے چلی۔ سوار پولیس کے افسر کپتان موزلی نے یہ رپورٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجی اور ضلع انبالہ کے سپریٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو اس کی مزید تحقیقات کا حکم ملا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری اپنی کتاب ''کالا پانی'' میں لکھتے ہیں:

''غزن خاں نے ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۰ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء) کو کسی ذریعے سے میرے حال سے واقف ہو کر اپنی دینوی بھلائی کا موقع جان کر ایک لمبی چوڑی کیفیت خیر خواہانہ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ سرحد پر ہو رہی ہے' ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے ❸۔''

---

❶ سرگزشت مجاہدین ص ۳۷۷ (حاشیہ)

❷ سرگزشت مجاہدین' ص ۳۷۸۔

❸ کالا پانی' ص ۴۶۔

مولوی محمد جعفر کی تلاشی اور گرفتاری:

جب غزن خاں ڈپٹی کمشنر کرنال کو یہ رپورٹ دے کر اس کے بنگلے سے باہر نکلا تو اسی وقت مولوی محمد جعفر کے ایک دوست کو اس کا پتا چل گیا۔ اس نے اپنے ایک ملازم قادا کو' جو مولوی صاحب کا ہمسایہ اور خیر خواہ تھا' بطور افسوس ساری بات بتائی۔ قادا اسی وقت کرنال سے تھانیسر آیا تا کہ مولوی صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دے اور یہ بتا دے کہ ان کی مخبری ہو چکی ہے اور تلاشی کا خطرہ ہے۔ لیکن جس وقت وہ تھانیسر پہنچا' رات ہو چکی تھی اور مولوی صاحب کے گھر کے دروازے بند تھے' لہٰذا اس وقت اس نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور خیال کیا کہ صبح کو بتا دیا جائے گا۔ لیکن وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہو۔ اسی وقت کپتان پارسنز پولیس کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مولوی صاحب کے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ یعنی قادا نے جس غرض کے لیے سفر کی تکلیف اٹھائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔

مولوی محمد جعفر کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا اور تلاشی لی گئی۔ مولوی صاحب کے خطوط' مجاہدین سے متعلق کاغذات اور ضروری چیزیں جو پولیس کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں' قبضے میں کر لیں۔ لیکن مولوی صاحب کو گرفتار نہیں کیا' کیونکہ ان کے وارنٹ گرفتاری نہیں تھے۔ مجاہدین کے بارے میں بعض لوگوں کو ہدایات دینے اور دیگر امور کی تکمیل کے لیے مولوی صاحب تھانیسر سے نکلے اور پانی پت پہنچے۔ وہاں سے دہلی اور پھر علی گڑھ گئے۔ اب ان کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ پولیس سراغ لگاتی ہوئی ان کے پیچھے پہنچی اور انھیں علی گڑھ سے گرفتار کر لیا گیا۔

مزید گرفتاریاں:

پولیس نے جب مولوی صاحب کے خطوط اور کاغذات کو سامنے رکھا تو تفتیش کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ بہت سی نئی چیزیں اس کے علم میں آئیں اور مجاہدین کے متعدد نئے معاونین کا پتا چلا۔ معاونین میں ہندوستان کے شہر پٹنہ کے بڑے بڑے علما بھی شامل تھے۔ ان سب کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور پھر انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتار شدہ لوگوں کو انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں پیش کیا گیا اور پھر ان پر مقدمہ چلا ____ یہ مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ شیخ محمد شفیع ٹھیکیدار: یہ کاروباری آدمی تھے جو مختلف چھاؤنیوں میں فوج کو گوشت فراہم کرتے تھے۔ جائداد پچاس لاکھ کے قریب تھی۔ ''شفاعت علی'' کے نام سے مجاہدین کی امداد کرتے تھے۔ ان کے والد شیخ محمد تقی تھے جو سید احمد شہید کے مرید تھے۔

۲۔ مولوی محمد جعفر: تھانیسر (ضلع انبالہ) کے رہنے والے تھے اور وہاں کے نمبردار تھے۔ والد کا نام میاں جیون

تھا۔ ذات ارائیں۔ مقدمے کے وقت عمر پچیس سال تھی۔ مجاہدین کے معاونین کی فہرست میں ان کا نام "پیرو خاں" تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھی انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے چند رفقا کو لے کر دہلی گئے تھے۔ لیکن جب پتا چلا کہ انگریزوں نے ہنگامے کو دبا دیا ہے تو واپس آ گئے تھے۔

۳۔ مولانا یحییٰ علی جعفری عظیم آبادی: عظیم آباد (پٹنہ) کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ جب مقدمہ شروع ہوا' ان کی عمر بیالیس سال تھی۔ خدام مجاہدین میں "محی الدین" کے نام سے موسوم تھے۔ ۲۶ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵ مارچ ۱۸۶۴ء) کو انھیں گرفتار کر کے ریل گاڑی کے ذریعے انبالے بھیجا گیا۔

۴۔ مولانا عبدالرحیم: عظیم آباد (پٹنہ) کے صاحب ثروت خاندان کے فرد اور وہاں کے رئیس تھے۔ مولانا فرحت حسین کے بیٹے اور مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے بھتیجے تھے۔ آغاز مقدمہ کے وقت اٹھائیس برس عمر تھی۔

۵۔ میاں عبدالغفار: مقدمے کی کارروائی میں انھیں مولانا عبدالرحیم کا ملازم بتایا گیا ہے۔ نیکی' حسن عمل' اور حمیت دینی کی وجہ سے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ عمر پچیس سال تھی۔

۶۔ الٰہی بخش: والد کا نام کریم بخش تھا۔ مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے مختار تھے۔ خود بھی کاروبار کرتے تھے۔ عمر بیالیس سال تھی۔ پانچ سال جیل میں رہے۔

۷۔ عبدالکریم انبالوی: شیخ محمد شفیع کے مختار تھے اور شیخ صاحب کی بھانجی سے ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ عمر پینتیس برس تھی۔ تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے۔

۸۔ قاضی میاں جان: موضع کمر کلی (ضلع پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ مجاہدین کے نہایت مخلص کارکن تھے۔ عمر ساٹھ برس تھی۔ انبالہ جیل میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کا بیان ہے کہ باغیانہ خط و کتابت کا سب سے بڑا حصہ انہی کے گھر سے دست یاب ہوا۔

۹۔ حسینی ابن میگو: عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے۔ عمر پینتیس سال تھی۔

۱۰۔ حسینی بن محمد بخش: تھانیسر کے رہنے والے تھے۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے عہد امارت میں مجاہدین کے ساتھ شریک جہاد رہے۔ پھر جماعتی امور میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کے معاون بنا دیے گئے۔ مقدمہ شروع ہوا تو عمر پچیس برس تھی۔ سات سال جیل میں رہے۔

۱۱۔ عبدالغفور: والد کا نام شاہ علی خاں تھا۔ ضلع شاہ آباد (صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ہزاری باغ کے باشندے تھے۔ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر کے ہاں مقیم تھے۔ عمر پچیس سال تھی۔ دس سال جیل کاٹ کر رہا ہوئے۔

یہ سب اپنے وقت کے معزز اور خوش حال لوگ تھے' لیکن گرفتاری کے بعد ان کو انتہائی الم ناک

سزائیں دی گئیں۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا، ہتھکڑیاں اور لوہے کے طوق پہنائے گئے۔ اس قسم کی روٹیاں کھانے کو دی گئیں جن میں چوتھا حصہ ریت اور مٹی شامل تھی ــــ ان میں سے بعض کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو بالخصوص مبتلائے اذیت کیا گیا، کئی کئی گھنٹے مسلسل انھیں زدوکوب کیا جاتا ــــ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مجھ پر جو سختی کی گئی، اس کے پیش نظر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ رمضان کے کچھ روزے میرے ذمے باقی تھے۔ کوئی چیز کھائے پیے بغیر میں نے روزے رکھنا شروع کر دیے۔ دوسرے دن مار پیٹ کے بعد مجھے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں لے جایا گیا اور چاپلوسی سے کہا کہ سب کچھ بتا دو، تمھیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیا جائے گا، بہت بڑا عہدہ بھی دیا جائے گا، میں نے انکار کیا تو پھر مار پیٹ شروع ہو گئی۔ صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک مسلسل بارہ گھنٹے زدوکوب جاری رہی۔ افطاری کا وقت ہوا تو میں نے بنگلے کے درخت سے پتے توڑ کر روزہ کھولا۔

یہ تمام تفصیلات انھوں نے اپنی کتاب ''کالا پانی'' میں تحریر کی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر صابر و شاکر تھے، کتنے بلند حوصلہ اور اپنے مقصد سے کس درجہ محبت رکھتے تھے۔

۱۔ پہلا مقدمہ بغاوت۔ انبالہ:

یہ مقدمہ چونکہ انبالے میں شروع ہوا تھا، اس لیے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اسے انبالہ کیس یا مقدمہ انبالہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ پہلا مقدمہ بغاوت تھا۔ مقدمے کی ابتدائی کارروائی ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں شروع ہوئی، جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت، گواہوں کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی۔ اور تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمہ جاری ہوا۔

ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوئے تو دوران مقدمہ میں نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز کی اجازت طلب کی تو نہ ملی۔ پھر معمول یہ رہا کہ جوں ہی نماز کا وقت ہوتا، ملزم تیمّم کر کے اور بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں ہوئی، تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو حوالات میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اب ماحول قدرے سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے، اس لیے مصیبتوں اور اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ان دنوں مولوی محمد جعفر اکثر یہ شعر پڑھتے تھے۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ بابیگانگاں در بوستاں

مولانا یحییٰ علی تکلیفوں اور اذیتوں کے ان دنوں میں عام طور پر یہ عربی کی رباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِماً عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ
وَذَالِكَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَشَاءَ یُبَارِكُ عَلٰی اَوْصَالِ شَلْوٍ مُمَزَّعٍ

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا' اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے۔ وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی پیدا کردے۔

فیصلہ:

ہم یہاں اس مقدمے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ اس موقعے پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ بعض ملزموں نے بڑی بڑی فیسیں دے کر انگریز وکیلوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ لیکن عدالت نے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو حسب ذیل فیصلہ سنایا:

۱- شیخ محمد شفیع:۔ سزائے موت' جائداد ضبط' لاش جیل کے قبرستان میں دفن کی جائے۔
۲- مولانا محمد یحییٰ علی:۔ یہی سزا۔
۳- مولانا جعفر تھانیسری:۔ سزائے موت' جائداد ضبط۔
۴- مولانا عبدالرحیم:۔ حبس دوام بعبور دریائے شور' جائداد ضبط
۵- قاضی میاں جان: یہی سزا۔
۶- میاں عبدالغفار:۔ حبس دوام بعبور دریائے شور' جائداد ضبط
۷- منشی عبدالکریم: یہی سزا
۸- الٰہی بخش: ایضاً
۹- عبدالغفور:۔ ایضاً
۱۰- حسینی عظیم آبادی:۔ ایضاً
۱۱- حسینی تھانیسری:۔ ایضاً

سزا سننے کے بعد ملزموں کے انگریز وکیلوں نے جوڈیشنل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل دائر کی' جس کے نتیجے میں سزاؤں میں کچھ تخفیف ہوئی اور پہلے تین ملزموں کی سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا۔ جن تین بزرگوں کو پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوئی' اس کی اطلاع انھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ملی۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا' شیخ محمد شفیع' مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر (تینوں) کو پھانسی کی سزا سنائی گئی

تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سزا سن کر شیخ صاحب تو بہت مغموم ہوئے‘ البتہ دوسرے دونوں بزرگ انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولانا محمد جعفر سے اس خوشی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ شہادت کی امید پر خوش ہیں‘ جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے‘ تم اس کو کیا جانو ❶۔

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کر دی گئی کہ ملزم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور ان کو خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ زیادہ تلخ اور تکلیف دہ سزا ہوگی۔ شیخ محمد شفیع کی سزا صرف جائداد کی ضبطی تک محدود رکھی گئی۔ جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے حبس دوام کی سزا دی گئی‘ ان کے سر اور داڑھی مونچھ مونڈ دیے گئے۔ مولانا یحییٰ علی داڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اٹھائے پھرتے اور کہتے:

افسوس نہ کر۔ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی ❷۔

کالے پانی کو روانگی:

ان گیارہ ملزموں میں سے چار ملزموں‘ مولانا یحییٰ علی‘ میاں عبدالغفار‘ مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مولانا عبدالرحیم کو کالا پانی بھیجا گیا۔ پہلے تین بزرگوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ‘ پھلور‘ جالندھر اور امرتسر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹڑی پہنچایا گیا۔ کوٹڑی سے کراچی اور کراچی سے بادبانی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے۔ ۸ دسمبر کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس دن کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو پورٹ بلئیر (جزیرہ انڈمان) میں اترے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم کو انبالہ جیل سے نکالا گیا۔ وہ بیمار تھے۔ لاہور پہنچے تو ایک سال آٹھ مہینے لاہور سنٹرل جیل میں رہے۔ اس کے بعد ملتان‘ کوٹڑی‘ کراچی اور بمبئی کے راستے کالا پانی پہنچے۔ ان کا یہ سفر نہایت اذیت ناک تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ خود بیمار تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جس جہاز میں یہ سوار تھے‘ اس کے تمام مسافر مختلف امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سمندر میں طوفان آ گیا‘ جس کے باعث جہاز تئیس (۲۳) دن کے بجائے ایک مہینا اکیس دن میں پورٹ بلئیر پہنچا۔

۲۔ عظیم آباد کا پہلا مقدمہ بغاوت:

مولانا یحییٰ علی وغیرہ کے مقدمے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد‘ جو دراصل پہلا مقدمہ بغاوت تھا‘

❶ کالا پانی‘ ص ۶۸

❷ کالا پانی ص ۷۳

عظیم آباد (پٹنہ) میں مولانا احمد اللہ پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ ترتیب کے اعتبار سے دوسرا مقدمہ بغاوت تھا۔لیکن عظیم آباد (پٹنہ) کے دو مقدموں میں سے پہلا تھا۔

مولانا احمد اللہ اپنے علم و فضل' زہد و عبادت اور فہم و تدبر کی بنا پر عظیم آباد اور اس کے گردو نواح میں نہایت اعزاز و احترام کے مالک تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی تھے۔ اپنے علاقے کے رئیس اور امیر آدمی تھے۔ مولوی الٰہی بخش جعفری کے فرزند تھے۔۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ والد نے احمد بخش نام رکھا تھا' سید احمد شہید سے وابستگی ہوئی تو انھوں نے احمد اللہ نام رکھا اور پھر اسی نام سے شہرت پائی۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر اساتذہ سے علوم دینی حاصل کیے۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تقریباً تین مہینے سرکٹ ہاؤس میں نظر بند رہے۔

عظیم آباد کے اس پورے خاندان کو حکومت انگریزی نے مبتلائے مصیبت کر دیا تھا اور سب حضرات پر جھوٹے مقدمات قائم کر دیے گئے تھے۔ مولانا احمد اللہ کے فرزند دلبند حکیم عبدالحمید نے ''شہر آشوب'' کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی تھی' جس میں اس تمام ابتلا کی تفصیل بیان کی تھی۔ اس مثنوی میں مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی کی اس سزا کا ذکر بھی دردناک انداز میں کیا ہے' جو ایک سال پہلے انبالہ میں دی گئی تھی۔

۲۹ رمضان ۱۲۸۱ھ (۲۷ فروری ۱۸۶۵ء) کو مولانا احمد اللہ کے لیے سزا کا حکم جاری کیا گیا۔ پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ مولانا کو پھانسی کے حکم سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سزا سن کر اسی طرح خوش و خرم تھے' جس طرح کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی تھے۔

جائداد کی ضبطی اور نیلامی:

جائداد کی ضبطی اور حبس دوام کی سزا سے ان حضرات کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس قسم کی سب تکلیفیں ذاتی طور پر یہ حضرات نہایت صبر و تحمل سے برداشت کر سکتے تھے' اصل تکلیف اہل و عیال کی تھی' جو جائداد ضبط ہو جانے کی وجہ سے بے گھر ہو گئے تھے اور سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ ان کے پاس نہ رہی تھی' گزر اوقات کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی منقولہ جائداد کی نیلامی کا مسئلہ سامنے آیا تو عظیم آباد (پٹنہ) کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر بولی نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم انگریزوں نے جوش انتقام میں لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں فروخت کر دی۔ نیلامی سے تقریباً ستتر (۷۷) سال بعد ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں صوبہ بہار میں کانگرس کی وزارت بنی تو ۱۹۳۹ء میں حاجی پور کے دیہاتی حلقے کے رکن اسمبلی مسٹر بدرالحسن نے بہار اسمبلی میں ان کی

جائدادوں کی قیمت اور نیلامی کے بارے میں سوال اٹھایا۔ کرشن بلبھ سہائے نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا' اس کا خلاصہ یہ ہے:

جائداد غیر منقولہ:

		پائی	آنہ	روپیہ
ا۔	مولانا عبدالرحیم:	۰	۰	۱۲۸۶۶
۲۔	مولانا یحییٰ علی:	۰	۴	۲۰۶۰
۳۔	مولانا احمد اللہ:	۰	۴	۵۸۷۷۶
		۰	۸	۷۳۷۰۲

جائداد منقولہ:

		پائی	آنہ	روپیہ
ا۔	مولانا عبدالرحیم:	۱۰	۷	۱۲۳۲
۲۔	مولانا یحییٰ علی:	۰	۰	۶۵۴
۳۔	مولانا احمد اللہ:	۹	۱۲	۲۵۱۷
	کل میزان	۷	۴	۴۴۰۳

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے۔ کہ جائداد منقولہ میں ان تینوں حضرات کی کتابیں' فرنیچر' یکے' گھوڑے' پالکیاں' زیور وغیرہ بیش قیمت چیزیں شامل تھیں' جو نہایت ہی تھوڑی رقم میں نیلام ہوئیں۔

اس کے بعد ان کے مکانات منہدم کرا دیے گئے اور ان کے محلے صادق پور کا احاطہ عظیم آباد (پٹنہ) کی میونسپل کمیٹی کو دے دیا گیا۔ اس میں وہ جگہ بھی شامل تھی جسے ''قافلہ'' کہا جاتا تھا اور اسے ''قافلہ'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہاں مجاہدین اور اس جماعت کے کارکن قیام کرتے تھے۔ اس تمام جگہ پر پٹنہ میونسپل کمیٹی کی عمارت تعمیر ہوئی۔

عورتوں اور بچوں کی حالت زار:

مولانا احمد اللہ کے اہل وعیال کو عید کے دن ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ تمام عورتیں اور بچے انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ نہ رہنے کے لیے مکان اور نہ استعمال کے لیے کوئی سامان ایک خوش

حال گھرانا بے حد بے چارگی اور بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔ مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید نے جو بہت اچھے عالم اور شاعر تھے ''مثنوی شہر آشوب'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار ''سرگزشت مجاہدین'' میں مولانا غلام رسول مہر نے درج کیے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

چوں شب عید را سحر کردند ۔۔۔ ہمہ را از مکاں بدر کردند

ضبط و تاراج جملہ مال و متاع ۔۔۔ نقد و جنس و ہمہ اثاث و زراع

بہر مابود آہ جرم سخت ۔۔۔ بردن سوز نے زجملہ رخت

من نہ تنہا کہ ہمرہم تن ہا ۔۔۔ بچگان و زنان و شیون ہا

احمد اللہ بود مجرم شاہ ۔۔۔ طفلکِ بے گناہ راچہ گناہ

مایہ عیش ساز ماتم شد ۔۔۔ عید ماغرہ محرم شد

زندہ بودم و لیک مردہ صفت ۔۔۔ ضَاقَتِ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

اب ترتیب وار ان اشعار کا ترجمہ پڑھیے:

جب عید کی رات ختم ہوئی اور ہمارے اہل وعیال نے صبح کی تو سب کو مکان سے نکال دیا گیا۔

تمام مال ومتاع ضبط اور برباد ہوا۔ نقدی' غلہ' سامان اور زراعت ہر شے ختم ہوگئی۔

ہمارے لیے آہ کرنا بھی سخت جرم تھا اور تمام سامان میں سے سوئی تک اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔

میں اکیلا نہ تھا' میرے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ بچے' عورتیں' اور ان کی آہ وفریاد تھی۔

حکومت کا مجرم تو احمد اللہ تھا' بے گناہ بال بچوں کا کیا قصور تھا۔

ہماری زندگی کا سرمایہ موت کا سامان بن گیا ــــــ ہماری عید محرم کا چاند ہوگئی۔

میں زندہ تھا' لیکن مردوں کی سی حالت میں۔ میرے لیے زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی۔

حکیم عبدالحمید طبابت کرتے تھے اور ان کا اچھا خاصا دواخانہ تھا۔ وہ بھی حکومت نے ضبط کرلیا۔ یعنی گزربسر کے لیے کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ رہنے دی' کتابیں اور کپڑے وغیرہ کوئی شے ان کے قبضے میں نہ تھی۔ کتابوں کی ضبطی سے انھیں بالخصوص بہت تکلیف پہنچی فرماتے ہیں۔

کتب ملت مسلماناں ۔۔۔ رفت دردستِ حرف ناخواں

یعنی مسلمانوں کی دینی و مذہبی کتابیں ان پڑھ لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔

مولانا احمد اللہ کو کالے پانی لے جانے کے لیے کب عظیم آباد (پٹنہ) سے روانہ کیا گیا' اس کی صحیح تاریخ کا علم نہیں' ہوسکا۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مولانا یحییٰ علی' مولانا عبدالرحیم' مولانا محمد جعفر تھانیسری اور میاں عبدالغفار سے بہت پہلے ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو وہاں پہنچ گئے تھے۔

۴۔ مالدہ کا مقدمہ بغاوت:

ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں مجاہدین کے جو مراکز قائم تھے، ان میں ایک مرکز مالدہ تھا۔ یہ مرکز صوبہ بنگال میں تھا۔ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا مصنف ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۷۰ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہابیوں کی تحریک جہاد کا یہ مرکز ''تقریباً تیس سال'' پہلے قائم ہوا تھا ❶۔ اس حساب سے اس مرکز کی بنیاد ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پڑی۔ اس مرکز میں ضلع مالدہ کے علاوہ اس کے متصلہ اضلاع میں سے مرشد آباد اور راج شاہی کے بعض حصے بھی شامل تھے ___ اس کے بانی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی تھے جو مجاہدین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں جنوبی بنگال کے ضلع مالدہ میں گئے تو وہاں خدمت مجاہدین کے لیے حالات سازگار معلوم ہوئے اور اس ضلع کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔ شادی بھی وہیں کی اور مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے زمینداروں اور دیگر لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ہنٹر کے بقول وہ انتہائی پرجوش واعظ تھے اور بہت ہی مؤثر انداز میں لوگوں کو انگریز کے خلاف دعوت جہاد دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں نوجوان ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ وہ لوگوں سے باقاعدہ رقمیں وصول کر کے عظیم آباد (پٹنہ) کے مرکز میں بھیجتے تاکہ یہ رقمیں سرحد کے مجاہدین کو پہنچائی جائیں ❷۔

جو لوگ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی کے ماتحت بنگال کے مختلف مقامات سے رقمیں فراہم کرنے پر متعین تھے، ان میں سے ایک شخص رفیق منڈل تھے۔ کئی سال وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۳ء میں حکومت کو رفیق منڈل کے متعلق اعانت مجاہدین کا شبہ ہوا۔ ان کی تلاشی لی گئی تو کچھ ایسے خطوط برآمد ہوئے، جن سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کا تعلق مجاہدین سے ہے۔ چنانچہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ رہا ہوئے تو تمام جماعتی کاروبار جو وہ خود انجام دیتے تھے، اپنے بیٹے مولوی امیر الدین کے سپرد کر دیا۔

مولوی امیر الدین انتہائی سرگرم آدمی تھے اور ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ دریائے گنگا کے دونوں کناروں اور اس کے جزیروں میں آباد مسلمانوں اور اضلاع مالدہ، مرشد آباد اور راج شاہی میں وہ بے حد اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ان کے اخلاص اور قوت کار کی وجہ سے سب لوگ ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ___ مولوی امیر الدین نے جو لوگ جہاد کے لیے سرحد بھیجے ان کی صحیح تعداد بتانا تو مشکل ہے، البتہ ہنٹر کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی ایک سرحدی چوکی کے چار سو تیس آدمیوں میں سے کم و بیش دس فی صد وہابی مجاہد انہی کے بھیجے ہوئے تھے ❸۔

---

❶ ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۱۹

❷ ایضاً

❸ ہمارے ہندوستان مسلمان، ص ۱۲۲۔

بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں مجاہدین کے لیے بے حد تکریم کے جذبات پائے جاتے تھے۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل مولانا عنایت علی عظیم آبادی اس علاقے میں بہت کام کر چکے تھے اور لوگوں پر ان کی نیکی اور مخلصانہ کارکردگی کا بے پناہ اثر تھا۔

مولوی امیر الدین پر انگریزی حکومت کے خلاف سازش اور بغاوت کا مقدمہ ۱۸۷۰ء میں مالدہ میں قائم ہوا۔ انھیں ضبطیٔ جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں وہ کالا پانی پہنچے۔ دس گیارہ سال کی سختی اور جلاوطنی کے بعد ۱۸۸۳ء (۱۳۰۰ھ) میں کالا پانی سے رہا ہو کر واپس وطن آئے۔

یہ تیسرا مقدمہ تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور اعانت مجاہدین کے جرم میں وہابیوں کے خلاف قائم ہوا۔ انگریزوں کے نزدیک اسے ''مقدمہ بغاوت مالدہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۴۔ راج محل کا مقدمہ بغاوت:

مالدہ کے مقدمہ بغاوت کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ۱۸۷۰ء میں وہابیوں کے خلاف چوتھا مقدمہ بغاوت راج محل میں قائم کیا گیا۔ اس مقدمے کا اصل نشانہ ابراہیم منڈل تھے جو راج محل کے نواح میں ایک مقام اسلام پور کے رہنے والے تھے۔ راج محل صوبہ بہار کی بھاگل پور کمشنری میں واقع ہے۔

ابراہیم منڈل بہت باہمت اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے بزرگان دین سے ان کا تعلق تھا۔ جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ علاقہ سرحد میں نقد روپے بھی بھیجتے تھے اور جہاد کے لیے آدمی بھی روانہ کرتے تھے۔ ہنٹر نے اپنی تصنیف ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں جس انداز میں ان کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے لیے یہ بہت خطرناک آدمی تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں جب وہابی تحریک کے مرکزوں پر دھاوا بولا گیا تو ابراہیم منڈل ان لوگوں میں سے تھے، جن کو خاص طور پر مقدمہ سازش کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''ان کی سازش کا جال کسی بھی کمزور حکومت کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔''

ابراہیم منڈل کو اکتوبر ۱۸۷۰ء میں حبس دوام بعبور دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری جو ان دنوں خود جزائر انڈمان میں عمر قید کاٹ رہے تھے، اپنی کتاب ''کالا پانی'' میں تحریر کرتے ہیں:۔

''ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں پکڑا اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چارے کو کالا پانی روانہ کر دیا[1]۔

---

[1] کالا پانی، ص: ۱۲۱۔

۵۔ عظیم آباد کا دوسرا مقدمہ بغاوت:

عظیم آباد (پٹنہ) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کا پہلا مقدمہ ۱۸۶۵ء میں مولانا احمد اللہ کے خلاف دائر ہوا تھا۔ اس سے چھ سال بعد ۱۸۷۱ء میں دوسرا مقدمہ قائم ہوا۔ اس مقدمے میں سات ملزم تھے، جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) مولانا مبارک علی

(۲) مولانا تبارک علی

(۳) حاجی دین محمد

(۴) حاجی امین الدین

(۵) پیر محمد

(۶) حشمت داد خان

(۷) امیر خاں

ابتدائی سماعت انگریز مجسٹریٹ باربور کی عدالت میں یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی۔ ۲۷ مارچ کو فرد جرم عائد کر کے ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ یکم مئی ۱۸۷۱ء سے مقدمے کی سماعت مسٹر پرنسپ سیشن جج نے شروع کی۔ حکومت کی طرف سے الزام ثابت کرنے کے لیے ایک سو چھتیس گواہوں کی طویل فہرست عدالت کو دی گئی، لیکن ایک سو تیرہ آدمی پیش ہوئے۔ چھیالیس آدمیوں نے ملزموں کی طرف سے شہادت دی۔ درمیان میں کچھ دن سماعت ملتوی رہی۔ ۱۸۷۱ھ کے آخر میں مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔۔۔

یہ انیسویں صدی عیسوی اور تیرھویں صدی ہجری کا آخری بڑا مقدمہ سازش تھا جو ''بڑا وہابی مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

اس مقدمے کے ملزم مولانا مبارک علی کو مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد صادق پور کے مرکز مجاہدین کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ پہلے یہ ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوئے، اس کے بعد ۱۸۷۱ء کے مقدمے میں پکڑے گئے اور انھیں اس قدر مبتلائے اذیت کیا گیا کہ حالت قید ہی میں وفات پا گئے۔

مولانا تبارک علی مولانا مبارک علی کے بیٹے تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ۱۸۶۲ء کی جنگ میں جو سرحد میں امبیلا کے مقام پر مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی، یہ اس وقت کے امیر مجاہدین مولانا عبداللہ کے ساتھ شریک جہاد تھے اور مجاہدین کے ایک دستے کی کمان ان کے سپرد تھی۔ اس جرم میں انھیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں مولانا امیر الدین وغیرہ کے ساتھ کالے پانی پہنچے۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد رہا ہوئے۔ حاجی دین محمد اور پیر محمد کو کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا اور مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اسی طرح

حاجی امین الدین کو بھی بار بار پکڑا گیا اور متعدد مقدموں میں کئی دفعہ الجھایا گیا۔

اس مقدمے کے سات ملزموں میں سے حشمت داد خاں اور پیر محمد خاں کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ لہٰذا انھیں ۴ جولائی ۱۸۷۱ء کو رہا کر دیا گیا۔ باقی پانچ ملزموں کو حبس دوام بعبور دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا سنائی گئی، مگر ان میں سے مبارک علی تو ہندوستان ہی میں حالت قید میں وفات پا گئے اور امیر خاں جن کی عمر گرفتاری کے وقت پچھتر سال تھی، آٹھ نو سال جیل میں رہے اور ۱۸۷۸ء میں رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے وقت ان کی عمر پچاسی سال لگ بھگ تھی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ امیر خاں اور حشمت داد خاں کی طرف سے کلکتے میں چیف جسٹس نارمن کی عدالت میں ہیپس کارپس کی درخواستیں دی گئی تھیں۔ یہ درخواستیں انگریز قابل وکیلوں نے دی تھیں، مگر نارمن نے ۱۹۔ اگست ۱۸۷۰ء کو یہ درخواستیں مسترد کر دی تھیں۔ اس کے بعد ایک شخص عبداللہ پنجابی نے احاطہ عدالت میں چیف جسٹس نارمن پر قاتلانہ حملہ کیا اور ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو نارمن وفات پا گیا۔ قتل کے پس منظر کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ حملہ آور عبداللہ دماغی خرابی کے مرض میں مبتلا تھا، لیکن اس کے باوجود عبداللہ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد یہ پانچ بڑے مقدمے تھے جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کے سلسلے میں ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک سات سال کے عرصے میں وہابیوں پر قائم کیے گئے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں یہ مقدمے ''وہابی مقدمے'' کے نام سے موسوم ہوئے۔ انگریزوں کی سیاسی اصطلاح میں وہابی اور باغی دونوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے تھے۔ چنانچہ ہنٹر اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں وہابی کو باغی اور باغی کو وہابی قرار دیتا ہے۔

وہابی تحریک میں حصہ لینے والوں کو جن آلام سے دوچار کیا گیا اور جن مصائب میں ڈالا گیا وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا نہایت دردناک باب ہے۔ انھیں جیلوں میں خوف ناک سزائیں دی گئیں، ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں اور ان کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم کر دیے گئے۔ حق و آزادی کی خاطر ان لوگوں نے جو قربانیاں دیں اور جو تکلیفیں برداشت کیں، اس کی تفصیلات کو الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کو جزائر انڈمان بھیجا گیا، جسے ''کالا پانی'' کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق بھی اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

کالا پانی:

کالا پانی اپنی ہولناکیوں اور وحشت ناکیوں کے اعتبار سے ایک مشہور مقام ہے۔ گزشتہ صفحات میں متعدد مرتبہ اس کا نام آیا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انگریزی حکومت نے تحریک مجاہدین یا وہابی تحریک کے بہت

سے ارکان کو گرفتار کر کے بطور سزا وہاں بھیجا اور اس سزا کا نام ”عبور دریائے شور“ رکھا۔ اس جگہ کا دوسرا نام ”انڈمان“ ہے جو بحر ہند میں چھوٹے بڑے ایک ہزار جزیروں پر محیط ہے۔ مختلف جزیروں کے اس پورے مجموعے کو ”جزائر انڈمان“ کہا جاتا ہے۔ نقشے پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ جزائر کلکتے سے سات سو اسی میل جنوب میں، رنگون سے تین سو ساٹھ میل جنوب مغرب میں، مدراس سے سات سو چالیس میل جنوب مشرق میں سیلون سے اتنے ہی فاصلے پر مشرق میں واقع ہیں۔

شروع شروع میں ان جزیروں کے متعلق لوگوں میں بہت سے ہیبت ناک اور خوف ناک افسانے مشہور تھے۔ ستمبر ۱۷۸۹ء میں جو انگریز پہلی مرتبہ ان جزیروں میں قیدیوں کو لے کر گیا، اس کا نام بلیئر تھا، اور اسی کے نام پر جزیرے کے دارالحکومت کو ”پورٹ بلیئر“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا اس قدر خراب اور مضر صحت تھی کہ سات سال بعد ۱۷۹۶ء میں اس منصوبے پر عمل درآمد کا سلسلہ ترک کر دیا گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس کی آبادی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس جنگ میں شامل ہونے والے جن لوگوں کو انگریزی حکومت نے لمبی قید کی سزائیں دیں وہ درحقیقت سیاسی قیدی تھے، اس لیے کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے باقاعدہ جنگ لڑی تھی یا یہ کہ آزادیِ وطن کے لیے میدان جہاد میں اترنے کا ان پر الزام عائد کیا گیا تھا۔ انگریزی حکومت ان کو ملک کے عام جیل خانوں میں رکھنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ ان کے افکار و خیالات سے دوسرے قیدی بھی اثر پذیر ہوں گے اور جیل کی فضا خراب ہوگی۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ جزائر انڈمان کو دوبارہ آباد کیا جائے اور ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کو وہاں بھیجا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان جزائر کی فضا، آب و ہوا اور زمین انسانی آبادی کے قطعاً قابل نہ تھی اور اس کا تجربہ ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود انگریزی حکومت نے ان اسیرانِ حریت کو وہیں بھیجنا ضروری سمجھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حکومت ان سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ قید کے دوران قیدیوں کے جسمانی تحفظ اور صحت کی ذمے داری حکومت کے فرائض میں شامل ہوتی ہے، مگر اس کی انگریزوں نے کوئی پروا نہیں کی اور انھیں ایسی جگہ بھیجا جو ان کی صحت کے لیے ہر اعتبار سے تباہ کن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کی اس طویل فہرست میں بعض ایسی اونچی شخصیتیں بھی شامل تھیں، جنھیں دوبارہ وطن آنا نصیب نہ ہوا۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۱ء میں ”غدر“ کے تقریباً ایک ہزار قیدی رہا کر دیے گئے تھے، جن کے خلاف نہ قتل کا کوئی الزام تھا اور نہ انھوں نے تحریک ۱۸۵۷ء میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ ”غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نواب اور زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی، کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالدار، صوبیدار، جمعدار وغیرہ وہاں قید ہیں ❶۔“

۱۸۵۷ء کے بعد پانچ ”وہابی سازش مقدمات“ کے ان مجرموں کو جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، انڈمان

❶ کالا پانی ص ۹۹

بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انڈمان میں ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہوا؟ اور انھیں کیا کیا مصائب برداشت کرنا پڑے؟ اس کا ہلکا سا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیا جا سکتا ہے:

مولانا احمد اللہ:

ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا احمد اللہ تھے، جن کے مقدمے اور جرم کے بارے میں گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ انھیں ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو عظیم آباد (پٹنہ) سے پورٹ بلیئر پہنچایا گیا تھا۔ یعنی جو عالی ہمت لوگ مجاہدین کی امداد و اعانت کے جرم میں ماخوذ تھے، ان میں سے انڈمان (کالا پانی) پہنچنے والے یہ سب سے پہلے بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک صاحب سید اکبر زمان اکبر آبادی چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی تھے ❶۔ انھوں نے مولانا کے علمی و عملی اور خاندانی حالات سے پوری واقفیت حاصل کر لی تھی۔ وہ چیف کمشنر سے اجازت لے کر مولانا کو اپنے مکان پر لے گئے جو انڈمان کے ایک جزیرے "روس آئی لینڈ" میں تھا۔ پھر اس کے بعد اپنے قریب ہی ان کے لیے ایک اور مکان کا بندوبست کر دیا، اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت لکھنے پڑھنے کا کام بھی ان کو دلا دیا۔ اس طرح ان کی قید کے ابتدائی پانچ سال کسی قدر اطمینان سے گزر گئے۔

۸ فروری ۱۸۷۲ء کو ہندوستان کا وائسرائے لارڈ میو انڈمان کے دورے پر گیا اور اسی دن رات کے وقت ایک مسلمان قیدی شیر علی نے اسے قتل کر دیا (جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آ رہی ہے) اس کے بعد تمام مسلمان قیدیوں بالخصوص وہابی مقدمات کے اسیروں پر سختی شروع ہو گئی۔ ان لوگوں کو دور دراز جزیروں میں بھیج دیا گیا۔ مولانا احمد اللہ کو وائپر آئی لینڈ لے جایا گیا جہاں نہایت خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ وہاں محکمہ طبابت میں محرری کا کام ان کے سپرد کیا گیا، اور راشن کے علاوہ دس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ہسپتال کے قریب مکان بھی دیا گیا اور خدمت کے لیے ملازم بھی۔! سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد ان کا زیادہ وقت تلاوت قرآن مجید، نماز، ذکر الٰہی اور تسبیح و استغفار میں صرف ہوتا تھا۔ وہ بہت بڑے مبلغ تھے۔ اپنے ساتھیوں کو اللہ کی توحید کا درس دیتے اور نیکی کی تلقین فرماتے۔ ان کے ساتھ رہنے والے قیدی تو ان کی نیکی و تدین سے اثر پذیر تھے ہی، پولیس والے اور وہ فوجی جوان کے قریب رہتے تھے، وہ بھی ان سے نہایت متاثر ہوئے اور ان میں سے ہر شخص نماز روزے کا پابند، تہجد گزار، توحید کا دلدادہ اور پکا مومن بن گیا۔

مولانا مرحوم بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ متقی، بلند کردار، سخی اور سب کے ہمدرد تھے۔ جو کچھ پاس ہوتا مستحق اور غریبوں کو دے دیتے۔ آخر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ مسلسل بخار کی وجہ سے چلنے پھرنے

❶ سید اکبر زمان عمدہ خصال اور شریف آدمی تھے۔ وہابی مقدمات کے تمام لوگوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندوستان میں قلعہ آگرہ کے فوجی محکمے میں میر منشی تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ انڈمان میں قید کی مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آگرہ آئے اور یہیں وفات پائی۔

کے قابل نہ رہے تھے۔ مولانا عبدالرحیم (جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے) ان کے عزیز تھے۔ وہ کئی میل کا سفر طے کر کے ان کے پاس جاتے اور خدمت کرتے۔ بالآخر صبر و استقلال کے اس پیکر نے ۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء) کو رات کے آٹھ بجے وفات پائی۔ ان کے ملازم کا نام عبدالواحد تھا۔ اس کا بیان ہے کہ آخری وقت میں آنکھ کھولی' لا الہ الا اللہ یا مالک الملک کہا اور سرد ہو گئے [1]۔ مولانا عبدالرحیم' مولانا محمد جعفر تھانیسری' میاں عبدالغفار' سید اکبر زمان' مولوی محمد جان اور دوسرے حضرات کو اطلاع ہوئی تو وہاں پہنچے اور تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

اس سے قبل مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو وفات پا چکے تھے' اور انھیں جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کیا گیا تھا۔ کوشش کی گئی کہ انھیں بھی وہیں بھائی کے پہلو میں دفن کیا جائے' لیکن حکومت نے اجازت نہیں دی۔ مجبوراً ان کو ڈنڈاس پائنٹ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر جہاں چند قبریں اور بھی تھیں' سپرد خاک کر دیا گیا۔ مولانا عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ وہ مقام انتہائی وحشت ناک تھا۔ ایک طرف لمبے لمبے جنگلی درخت آسمان کو چھو رہے تھے' دوسری طرف سمندر کی موجیں جو اونچائی میں پہاڑ کی مانند دکھائی دیتی تھیں' جزیرے سے آ کر ٹکراتی تھیں۔ یہ تمام منظر انتہائی خوف ناک اور دل ہلا دینے والا تھا۔ ایسی حالت میں ہم لوگ ایسے در یتیم کو' ایسے لعل شب چراغ کو' ایسے یاقوت احمر کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دبا کر آہ سرد بھرتے ہوئے' باچشم گریاں و دل بریاں اپنی اپنی جگہوں پر واپس آئے [2]۔

مولانا یحییٰ علی:

مولانا موصوف ''انبالہ وہابی سازش کیس کے'' مجرم تھے۔ وہ انبالہ سے لاہور' ملتان' کراچی اور بمبئی وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہنچے۔ چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی سید اکبر زمان نے انھیں بھی اپنے پاس جزیرہ ''روس آئی لینڈ'' میں رکھا۔ اس طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا یحیی علی دونوں بھائی ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ تبلیغ دین' اشاعت اسلام اور اصلاح عوام کے لیے مولانا یحیی علی بھی اسی طرح کوشش کرتے جس طرح ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ کرتے تھے۔ اوقات فرصت میں لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دینا اور نیکی کی تلقین کرنا ان کا بنیادی کام تھا۔ نہایت صابر و شاکر بزرگ تھے۔ پہلے پھانسی اور ضبطی جائداد کا حکم سنایا گیا۔ اس کے بعد پھانسی کی سزا عبور دریائے شور میں بدل دی گئی' مگر ضبطی جائداد کا حکم بدستور باقی رہا۔ تمام جائداد نیلام کر دی گئی' مکانات خالی کرا لیے گئے' عورتوں اور بچوں کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ تمام مال و اسباب'

---

[1] کالا پانی' ص ۱۲۷۔

[2] تذکرہ صادقہ۔ ص ۵۷۔

کتابیں اور مسودے ضبط کر لیے گئے۔ جن مکانوں میں یہ لوگ کئی پشتوں سے سکونت پذیر تھے' انھیں مسمار کر دیا گیا۔ خاندانی قبرستان بھی کھدوا دیا گیا اور مردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر باہر پھینک دی گئیں۔ یہ بہت بڑی مصیبتیں تھیں جو ان پاک باز حضرات نے برداشت کیں۔ یہ عظیم قربانیاں محض سیاست کے لیے نہ تھیں۔ یہ تقاضائے فرض تھا اور اس کا مقصد صرف اللہ اور رسول ﷺ کی رضا مندی وخوش نودی تھا۔ کوئی دینوی مفاد اس میں ہرگز نہ تھا' بلکہ اس لحاظ سے سراسر نقصان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مصائب و آلام کو انھوں نے نہایت تحمل سے برداشت کیا۔ کبھی حرف شکایت زباں پر نہیں لائے۔ گھر میں پیش آنے والے حوادث سے مطلع ہونے کے بعد انڈمان سے جو خط اہلیہ محترمہ کو تحریر فرمایا وہ لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یحیٰ علی کی طرف سے' بخدمت ام حبیب ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ۔

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مد عمرہ کے' حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا' اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ سکونت قدیم سے' وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو' اور کاروبار فریضہ بہت اجرا پائے ہوں' مومنین کو انس ومحبت بطور اہل وعیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو روح انور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے' مالکان کو خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے' اور ہونے کی جگہ ہے' اور ان آیات کریمہ کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ❶ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ❷ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ❸

❶ یہ سورہ البقرہ کی آیات نمبر ۱۵۵ تا ۱۵۷ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:۔ اور جو لوگ صبر کرنے والے ہیں' انھیں کامیابی کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے:۔ انا للہ و انا الیہ راجعون (کہ ہم تو مال واولاد سمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب دنیا سے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والے ہیں) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف وکرم کی بارش ہوتی رہتی ہے اور وہی اس کی رحمت کے حق دار ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

❷ یہ سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۲۶ ہے' اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں صبر کی محنت سے شاد کام فرما' اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اٹھا۔

❸ یہ سورہ القلم کی آیت نمبر ۳۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

اور فرمایا ان آیات کو ورد زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکانات انبیا علیہم السلام بخت نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیا ہو گئے اور یہ اماکن متبرکہ از سر نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی امید رکھو ___ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشق خالق ہر دو جہاں میں ہم
نام و نشان دار فنا کے ڈھا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
جوگی ہوئے ہیں محرم اسرار کے لیے

اے خدائے من، فدایت جان من جملہ فرزندان و خادمان من ❶

کالے پانی پہنچنے کے تقریباً دو سال بعد مولانا ممدوح بیمار ہو گئے اور قانون کے مطابق ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم (جو ان کے بھانجے تھے) حکام بالا کی اجازت سے کچھ دیر اپنا کام کرتے اور کچھ دیر مولانا کی خدمت میں گزارتے۔ بیماری کے دنوں میں بھی مولانا کا یہ معمول رہا کہ جو لوگ عیادت کے لیے آتے انھیں پند و نصیحت فرماتے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہے۔

بیماری اگرچہ زیادہ نہ تھی تاہم اس کی تکلیف ضرور تھی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ دن میں دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے آتے۔ ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو مولانا احمد اللہ کو بھی بلا لیا گیا اور مولانا عبدالرحیم بھی آ گئے۔ زبان پر اللہ کا ذکر جاری تھا اور ہوش بجا تھے کہ اسی دن یعنی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ کالا پانی جا کر دو سال ایک مہینا اور نو دن زندہ رہے۔

وفات ہسپتال میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میت کو گھر لے گئے۔ سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین اور نماز جنازہ میں شریک ہونا چاہیں،

---

❶ اقتباس از مکتوب مولانا یحییٰ علی جو ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ/ یکم اکتوبر ۱۸۶۶ء کو یک شنبہ کے روز انڈمان سے اپنی اہلیہ محترمہ کے نام ارسال فرمایا: بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ ج ۴، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸۔

ان کے مکان پر پہنچ جائیں' چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی مقررہ مقام اور متعین وقت پر پہنچ گئے۔ پانچ ہزار کے قریب لوگ اس مرد مجاہد کی خبر وفات سن کر ان کے گھر پہنچے۔ نماز جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور اس پیکر عزیمت کو انڈمان کے جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کیا گیا۔

مولوی کبیر احمد پھلواروی نے مندرجہ ذیل اشعار میں تاریخ وفات کہی:

چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال — عالم و زاہد و محدث بود
روح پاکش گزاشت مجلس تن — راہ ملک وصال حق پیمود
گشت راضی خدائے پاک ازو — عزتش پیش قدسیاں افزود
ہاتف سال او زروئے الم — رضی اللہ ربہ فرمود ❶

۱۲۸۴ھ

مولانا عبدالرحیم:

وہابی سازش کے پہلے اور دوسرے مقدمے کے اسیروں میں سے مولانا عبدالرحیم تمام اسیروں کے بعد انڈمان پہنچے۔ یہ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی کے بھانجے تھے۔ سید اکبر زمان اکبرآبادی نے (جن کا ذکر ایک سے زیادہ مرتبہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) ان کے قیام کا انتظام بھی مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی کے مکان میں کر دیا تھا۔ انھیں بھی محرری کا کام دیا گیا' جس کی تنخواہ چھ روپے ماہانہ تھی۔ ان کے رفیق کار ایک بزرگ سید انشاء اللہ تھے جو ہندوستان کے ایک مقام باندہ کے رہنے والے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں قید ہو کر کالے پانی پہنچے تھے۔ یہ بہت ضعیف ہو گئے تھے اور مولانا عبدالرحیم از راہ ہمدردی ان کے کام میں ان کی مدد کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا کو دوسرے محکمے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے حکام کی اجازت سے ایک دکان دار کے ساتھ مل کر تجارت بھی شروع کر دی تھی۔

لارڈ میو کے قتل کے بعد (جس کا ذکر آگے آئے گا) وہابی سازش مقدمات اور ۱۸۵۷ء کے سلسلے کے مسلمان قیدی ہدف عتاب بنے تو مولانا عبدالرحیم کو بھی ایک دور افتادہ مقام پر بھیج دیا گیا۔ جس انگریز افسر کے ماتحت یہ کام کرتے تھے' وہ انتہائی سخت مزاج تھا۔ مولانا نے محنت اور مستعدی سے کام کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے جسم پر کسی بیماری کی وجہ سے کثرت سے سیاہ دھبے پڑ گئے تھے۔ وہ خود ڈاکٹر تھا' لیکن اپنی اس بیماری کا علاج نہ کر سکا۔ اس کے باورچی نے اسے بتایا کہ مولانا کے پاس اس مرض کی دوا ہے۔ چنانچہ اس نے مولانا سے کہا اور مولانا نے ایک خاص ترکیب سے روغن لوبان کشید کر کے اسے دیا' جس کے استعمال سے تمام داغ دھبے دور ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مولانا پر اور مہربان ہو گیا' بلکہ محکمہ صحت کے حکام سے اس دوا کو سرکاری

❶ سرگزشت مجاہدین ص ۴۴۴۔

شفا خانے میں رکھنے کی درخواست کی، لیکن یہ درخواست اس وجہ سے منظور نہ ہوئی کہ اس سے حکومت کے ایک مسلمان باغی قیدی کا اعزاز وقت کے تمام انگریز ڈاکٹروں سے بڑھ جائے گا۔

تقریباً اٹھارہ سال بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لارنس نے مولانا کے حبس دوام کا حکم منسوخ کر دیا، لیکن حکم ثانی جاری ہونے تک بدستور انڈمان میں رہنے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ اس کے بعد لارڈ رپن نے جزائر انڈمان کے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جنھیں اعانت مجاہدین کے سلسلے میں سزائیں دی گئی تھیں۔ چنانچہ یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ (۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء) کو سوا انیس سال بعد مولانا وطن پہنچے۔ ان کے خاندانی مکانات جو محلّہ صادق پور میں تھے گرا دیے گئے تھے اور وہ تمام جگہ پٹنہ کی میونسپل کمیٹی کو دے دی گئی تھی، اب وہاں بازار بن چکے تھے اور کمیٹی کی عمارت تعمیر ہو گئی تھی۔ ان کے خاندانی قبرستان کا بھی نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ اہل و عیال "محلّہ نمو ہیہ" میں جا بسے تھے۔ پٹنہ پہنچنے کے بعد دوسرے دن مولانا اپنے مکانوں کی جگہ پر گئے تو نقشہ بالکل بدل چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کو سخت ذہنی کوفت ہوئی اور وہاں کھڑے ہو کر انتہائی دردانگیز لہجے میں یہ شعر پڑھے:۔

یا منزلہ لعب الزمان باھلہ فا بادھم یتفرق لا یجمع
ان الذین محھد تھم بك مرة كان الزمان بھم یضر و ینفع
اصبحت تفزع من یراك وطالما كنا الیك من المعاول نفزع
ذھب الذین یعاش فی اكنافھم بقی الذی حیاتھم لا تنفع،

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:

اے وہ منزل، جس کے رہنے والے زمانے کی دست برد کا شکار ہوئے اور انھیں اس طرح منتشر کر دیا گیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔

وہ جنھیں کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع و نقصان پہنچاتا تھا۔

جو تجھے اب دیکھتا ہے، گھبرا اٹھتا ہے۔ کبھی یہ حالت تھی کہ مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔

وہ لوگ تو گزر گئے جن کے سائے میں اصل زندگی تھی۔ اب وہ باقی رہ گئے ہیں، جن کی زندگیاں کسی بھی کام کی نہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے یہاں آکر شہر کا رنگ ڈھنگ، اسلوب زیست، لباس و پوشاک اور تمام طرز معاشرت یک قلم بدلا ہوا پایا تو رہائی پر از حد افسوس ہوا۔ کاش میں بھی انڈمان کی زمین میں مرجاتا تو حشر کے روز اپنے دونوں ساتھیوں (مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی) کے ساتھ اٹھنے کی سعادت حاصل کرتا[1]۔

مولانا عبدالرحیم جوں ہی پٹنہ پہنچے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پابندی عائد کر دی کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ

[1] تذکرہ صادقہ ص ۱۷۹۔

کو کچہری میں حاضری لکھوائی جائے اور اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہ جائیں۔ اگر کہیں جائیں تو وہاں کی قریبی پولیس چوکی یا تھانے میں اطلاع دیں۔ سات برس تک یہ پابندی قائم رہی۔ ملک سے باہر جانے کے لیے اجازت لینا ضروری تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں باہر جانے کے لیے پروانہ راہداری لینے کا کوئی قانون نہ تھا۔ انھوں نے دو حج کیے۔ پہلی مرتبہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں اور دوسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۴ء) میں۔

اس جلیل القدر عالم اور عظیم مجاہد نے ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ (۲۴ اگست ۱۹۲۳ء) کو تقریباً نوے برس کی عمر میں نماز مغرب سے قبل وفات پائی۔

''تذکرہ صادقہ'' جس کا دوسرا نام ''الدرالمنشور فی تراجم اھل صادق فور'' ہے انھی کا مرتب کردہ ہے۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ''مولانا ابوالکلام آزاد بھی مولانا عبدالرحیم سے ملے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ پٹنہ گیا اور مولوی مظہر الحق بیرسٹر کے مکان پر ٹھہرا تو مولانا عبدالرحیم نے پیغام بھیجا کہ ملنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ آگئے اور کچھ دیر بات چیت کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن میں ان کی ملاقات کے لیے گیا۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے ❶۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری:

مولانا محمد جعفر نے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (۱۶ جون ۱۸۶۲ء) سے اپنے حالات قلم بند کرنا شروع کیے تھے جو ان کے مکان وغیرہ کی تلاشی کے وقت ارکان حکومت کے ہاتھ لگے۔ ان حالات سے پتا چلتا ہے کہ مولانا موصوف کی ولادت ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ دس سال کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہ کی۔ بارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد میاں جیون وفات پا گئے۔ اس وقت ان کا چھوٹا بھائی محمد سعید صرف چھ مہینے کا تھا۔ والد کی وفات کے بعد تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ چند کتابیں پڑھیں تو عرائض نویسی شروع کر دی۔ بہت ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ تمام عرائض نویس اور وکلا' عدالتی قواعد و ضوابط کو سمجھنے اور بعض قانونی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ان سے مشورہ لینے لگے تھے۔

ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور محنت کر کے تھانیسر میں اچھی خاصی جائداد پیدا کر لی تھی۔ انگریزی حکومت کے ہمیشہ مخالف رہے اور آزادی وطن کو اپنا نقطہ نظر قرار دیے رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب کہ بیس سال کی عمر تھی اور بھرپور جوانی کا عالم تھا، دس بارہ ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے دہلی پہنچے تھے۔ لیکن جب انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو واپس آ گئے اور معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ شادی پانی پت میں ہوئی۔ گرفتاری کے وقت ان کی تین اولادیں تھیں' دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا باپ کے زمانہ قید میں انتقال کر گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا' بیٹی اور بیوی رہائی کے وقت زندہ تھے۔

❶ سرگزشت مجاہدین' ص ۴۳۹۔

مولانا محمد جعفر ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ کو مولانا یحییٰ علی اور میاں عبدالغفار کے ساتھ انڈمان پہنچے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر انڈمان کے ساحل پر جہاز سے اترے اور ادھر سید اکبر زمان کی کوشش سے چیف کمشنر کی کچہری میں نائب میر منشی مقرر ہو گئے۔ رہنے کو مکان اور خدمت کو نوکر ملا۔ کہیں قیام کرنے اور آنے جانے کی مطلق روک ٹوک نہ تھی۔ اہلیہ کو قانون کے مطابق وطن سے بلانے کے لیے حکومت سے درخواست کی، لیکن حکومت نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس زمانے میں ایک کشمیری خاتون کسی مصیبت میں پھنس کر قیدی کی حیثیت سے انڈمان میں مقیم تھی، مولانا نے اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن یہ بیوی ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو فوت ہو گئی۔

اسی دوران المورہ (ہندوستان) کے ایک برہمن خاندان کی عورت وہاں پہنچی جسے خاندان کے لوگوں نے کسی دشمنی کی بنا پر قتل کے الزام میں کالے پانی کی سزا دلوا دی تھی، مولانا نے اسے مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔

مولانا نے وہاں انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ ان کے سوا مسلمان قیدیوں سے کوئی بھی انگریزی نہ جانتا تھا۔ عرائض نویسی بھی کرتے تھے، انگریزوں کو اردو بھی پڑھاتے تھے اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے تھے، جس سے انھوں نے ہزاروں روپے کمائے۔ مسلمان قیدیوں کو ان کی قابلیت سے بہت فائدہ پہنچا۔

اپنی مشہور کتاب "کالا پانی" میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۱ء میں ان کے دل میں یہ خیال کروٹ لینے لگا تھا کہ جلد ہی رہائی پا کر ہندوستان چلے جائیں گے۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء کو ان کی رہائی کا حکم جاری ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ اطلاع پانی پت میں ان کی بیوی کو ملی۔ ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم کالے پانی پہنچا۔ لیکن ان کی انڈمان والی اہلیہ کی مدت قید ابھی پوری نہیں ہوئی تھی، اس لیے حکومت سے اجازت لے کر اس کی رہائی کا حکم آنے تک وہاں مزید کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں اپنا سامان فروخت کیا۔ مکان وقف کر کے اس کی مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن ڈپٹی کمشنر نے اس کی منظوری نہ دی۔

بیوی کی رہائی کا حکم آیا تو ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے روانہ ہوئے۔ جس جہاز میں سوار ہوئے، اس میں ایک بڑا تاجر بھی سفر کر رہا تھا، جس کا نام علی رضا تھا۔ اس نے جہاز میں ان کی بہت خدمت کی۔ ۱۴ نومبر ۱۸۸۳ء (۱۴ محرم ۱۳۰۱ھ) کو کلکتے پہنچے۔ وہاں چنیا پاڑا میں مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے) کے بھائی مولوی عبدالرؤف مقیم تھے۔ دو روز ان کے ہاں قیام کیا۔ پھر الہ آباد، کان پور، علی گڑھ اور سہارن پور ہوتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو رات کے نو بجے انبالہ چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچے۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے گھر تھانیسر سے نکلے تھے، کچھ دن کم بیس سال بعد وطن واپس آئے۔ بے چارگی کی حالت میں اکیلے گھر سے روانہ ہوئے تھے، اب واپس آئے تو ایک بڑا کنبہ جو ایک بیوی اور آٹھ بچوں پر مشتمل تھا، ان کے ساتھ تھا۔ علاوہ ازیں آٹھ ہزار روپے نقد ان کے پاس تھے۔

ان کا ایک انگریز شاگرد کپتان ٹمپل تھا، جو رہائی کے زمانے میں انبالہ چھاؤنی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس کو

استاد کی رہائی اور واپسی کا پتا چلا تو خط لکھا کہ اگر میرے پاس قیام کرنا پسند کریں تو ضمانت دے کر حکومت سے اجازت لے سکتا ہوں' چنانچہ وہ انبالہ چھاؤنی چلے گئے۔ ٹمپل انھیں بیس روپے ماہانہ خود دیتا تھا اور تیس روپے بعض دوسرے انگریزوں کو پڑھانے سے مل جاتے تھے۔ اس طرح پچاس روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ جب تک ٹمپل انبالہ چھاؤنی میں رہا' انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اس کا تبادلہ ہو گیا تو ان پر کئی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ لیکن فروری ۱۸۸۸ء میں حکومت نے خود ہی تمام پابندیاں اٹھا دیں اور وہ مختلف مقامات اور شہروں میں آنے جانے لگے۔ ہر جگہ کے مسلمان ان کا نہایت احترام کرتے تھے ❶۔

۱۸۹۵ء میں نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف سید عبدالحی رائے بریلوی' پانی پت' سرہند' انبالہ' دیو بند' گنگوہ وغیرہ کے سفر پر گئے تو انبالہ میں مولانا محمد جعفر کے مکان پر بھی گئے۔ لیکن مولانا کچھ روز پیشتر ریاست پٹیالہ کے ایک مقام ''کھرنولہ'' تشریف لے گئے تھے' اس لیے ملاقات نہ ہو سکی ❷۔

مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں جنھیں تحریک آزادی وطن کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ اس موضوع پر کتب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ متفرق رپورٹیں یا مجموہائے ضوابط بھی تحریر کیے۔ علاوہ ازیں تین اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جن کا مختصر تعارف یہ ہے۔

۱- تاریخ عجیب: یہ جزائر انڈمان کی تاریخ ہے' جس میں جزیروں کی جغرافیائی تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور ان کی آبادکاری کی عہد بہ عہد کیفیت بھی تحریر کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اختصار کے ساتھ ان تمام زبانوں کی بول چال کا مرقع درج کیا ہے جو انڈمان میں بولی جاتی تھیں' مثلاً اردو' عربی' فارسی' ترکی' ساحلی' پشتو' مکرانی' بلوچی' سندھی' نکوباری' مرہٹی' بنگالی' برمی' چینی' کشمیری' پنجابی وغیرہ۔ انڈمان کے زمانہ قید میں انھوں نے وہاں کی تقریباً تمام بولیاں سیکھ لی تھیں۔ یہ کتاب حکومت کی منظوری سے ۱۸۷۹ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ نے شائع کی تھی۔

۲- تواریخ عجیب: یہ کتاب ''کالا پانی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی گرفتاری' مقدمے' قید' سفر انڈمان' اسیری کی زندگی اور رہائی کی پوری سرگزشت بیان کی ہے۔ ضمناً اپنے رفقا کے حالات بھی تحریر کر دیے ہیں۔

۳- سوانح عجیبہ: یہ کتاب سید احمد شہید اور ان کے اکابر خلفا کے حالات پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے غالباً ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند ارجمند مولوی محمد اسماعیل وکیل انبالہ' ۱۹۴۷ء کے فسادات میں غیر مسلموں کے ہاتھوں شہید ہوئے ❸۔

---

❶ سرگزشت مجاہدین' ص ۴۴۴

❷ ماہانہ ''معارف'' مارچ ۱۹۳۹ء

❸ سرگزشت مجاہدین' ص ص ۴۴۳-۴۴۴۔

میاں عبدالغفار:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے' میاں عبدالغفار عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے۔اور وہابی سازش کے مقدمہ انبالہ میں ماخوذ اور قید ہوئے تھے۔ ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر کے ساتھ انڈمان پہنچے۔ انھوں نے مارچ ۱۸۷۲ء میں حکومت سے درخواست کر کے بیوی اور دولڑکوں کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔رہائی کے بعد اہل وعیال کے ساتھ عظیم آباد واپس آئے۔۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) کے قریب وفات پائی۔

مولوی امیر الدین:

مولوی امیر الدین کو مالدہ کے مقدمہ وہابی سازش میں حبس دوام اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی تھی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان بھیجے گئے۔اس وقت وہاں نئے قانون جاری ہو چکے تھے جو بہت سخت تھے۔ان کی رو سے وہ تمام مراعات ختم ہو گئی تھیں' جو اس سے قبل قیدیوں کو حاصل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی امیر الدین کو کئی سال تک شدید مشقت کرنا پڑی۔اس کے بعد ان کو مدرسے میں معلم مقرر کر دیا گیا۔۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم اور میاں عبدالغفار کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔

مولوی تبارک علی:

انھیں عظیم آباد (پٹنہ) کے دوسرے مقدمہ سازش میں حبس دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی تھی۔ان کے والد مکرم مولوی مبارک علی حالت قید میں فوت ہو گئے تھے۔مولوی تبارک علی کو بھی انڈمان پہنچنے کے بعد ابتدا میں سخت مشقت کرنی پڑی۔ پھر سٹیشن محرر مقرر ہو گئے تھے۔ رہا ہونے کے بعد ۲ مارچ ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے وطن روانہ ہوئے۔

میاں مسعود گل:

انھیں مسعود خاں بھی کہا جاتا ہے۔ بنگال کے ضلع بوگرہ کے رہنے والے تھے۔۱۸۶۰ء میں گرفتار ہوئے اور قید کر کے انڈمان بھیجے گئے۔ مدت قید ختم کر کے ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو وہاں سے عازم وطن ہوئے۔

ابراہیم منڈل:

راج محل کے مقدمہ سازش کے ضمن میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔انڈمان پہنچنے کے وقت بہت بوڑھے اور ضعیف تھے۔قید کی مدت پوری کر کے واپس آئے اور ۱۹۰۳ء کے لگ بھگ سفر آخرت اختیار کیا۔

ان کے علاوہ وہابی سازش مقدمات کے اور بھی بہت سے قیدی تھے، جنھیں کالے پانی بھیجا گیا یا برصغیر کے مختلف جیل خانوں میں بند کیا گیا اور شدید سزائیں دی گئیں، لیکن ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے یا معلوم ہوئے ہیں تو بہت کم ____!

حکومت ہند کا اعلان:

۱۱ جنوری ۱۸۸۳ء کو وہابی اسیران انڈمان کی رہائی کے بارے میں حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کی طرف سے مندرجہ ذیل اعلان بغرض اطلاع عام شائع ہوا:

"مقدمے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور وفکر اور حکومت بنگال وحکومت پنجاب کے مشورے کے بعد گورنر جنرل نے اپنی کونسل کے اجلاس میں فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو سلطنت کے خلاف جنگ میں شرکت واعانت کے جرم کی بنا پر حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سزا بھگت رہے ہیں، انھیں اب رہا کر کے گھروں میں آنے کی اجازت دے دی جائے۔ البتہ انھیں پولیس کی نگرانی قبول کرنا ہوگی۔ نیز مقامی حکومتیں ان کے کہیں آنے جانے اور رہنے سہنے پر جو پابندیاں عائد کرنا مناسب سمجھیں، وہ لازماً منظور کرنا پڑیں گی ❶۔

لارڈ میو کا قتل:

گزشتہ صفحات میں اس دور کے وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل کا ذکر کئی مرتبہ ہوا ہے۔ اس کے قتل کا حادثہ انڈمان میں پیش آیا اور اس کی وجہ سے مجاہدین اسلام اور سرفروشان آزادی کی قید کا زمانہ بھی بڑھ گیا اور ان پر سختیاں بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہونے لگیں۔ چونکہ یہ واقعہ بھی ان کی اسیری سے کچھ تعلق رکھتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل کے بارے میں بھی اس موقعے پر اختصار کے ساتھ ضروری باتیں بیان کر دی جائیں۔

لارڈ میو ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس کو برصغیر کے سیاسی اور دیگر معاملات سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ انڈمان میں بھی بعض اصلاحات جاری کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے کچھ تجاویز سوچیں، ضابطے مرتب کیے اور ۱۸۷۱ء میں انھیں نافذ بھی کر دیا۔ اس اثنا میں اس نے خود انڈمان جانے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے رنگون گیا اور وہاں سے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا۔ اس کی بیوی بھی ساتھ تھی، اور بھی بہت سے لوگ اس کے ہمرکاب تھے۔ وہاں کے چیف کمشنر نے جہاں تک ممکن تھا، وائسرائے کی حفاظت کے تمام انتظامات کر لیے تھے ____ مثلاً

❶ سرگزشت مجاہدین، ص ۴۴۵ بحوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۸۳ء

۱- سب مشقتی قیدیوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی بھی اپنے کام سے غیر حاضر نہ رہے۔
۲- پولیس کی گارد وائسرائے کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہے۔
۳- گارد کے ہر سپاہی کی بندوق بھری ہو۔
۴- جن جزیروں میں زیادہ سنگین مجرم رہتے تھے' ان میں پولیس کے علاوہ مسلح فوج وائسرائے کی حفاظت کے لیے متعین کر دی گئی تھی۔

چیف کمشنر اور حکام بالا نے پرانے قیدیوں کو یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کے واپس جانے کے بعد اچھے چال چلن والے باغی اور دوسرے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا' اس لیے پرانے قیدی وائسرائے کی آمد پر خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ جلد ہی رہا ہو کر وطن واپس چلے جائیں گے۔

۸ فروری ۱۸۷۲ء کی صبح کو وائسرائے کا جہاز انڈمان کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو اسے اکیس ضرب توپوں کی سلامی دی گئی۔ اس کے بعد وہ جہاز سے اترا' اور فوراً ہی مختلف مقامات کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ قیدیوں کے زنانہ اور مردانہ ہسپتالوں میں گیا۔ بعض بارکوں کا معائنہ کیا اور قیدیوں کی اصلاح و بہبود کے لیے گفتگو کی۔ جزیرے میں ریل گاڑی جاری کرنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ وائسرائے کا انداز ایسا تھا کہ وہ بھی قیدیوں سے اظہار ہمدردی کرتا تھا اور قیدی بھی چند گھنٹوں میں اسے اپنا خیر خواہ سمجھنے لگے تھے۔ اس وقت مولانا محمد جعفر تھانیسری بھی وائسرائے کے ساتھ تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راستہ چلتے وقت پولیس کے آدمی جب وائسرائے کے بہت نزدیک ہو جاتے اور قیدیوں کو اس سے ذرا دور ہٹاتے تو وائسرائے اس پر ناراضی کا اظہار کرتا اور پولیس سے کہتا کہ انھیں کچھ نہ کہو' آزادی سے چلنے پھرنے دو۔ مولانا فرماتے ہیں کہ خود وہ وائسرائے سے اتنے قریب ہو جاتے کہ کپڑے سے کپڑا چھونے کی نوبت آ جاتی۔ اس نے دوپہر کا کھانا چیف کمشنر کے ساتھ کھایا❶۔

انڈمان میں ایک بہت ہی سرخ رنگ کی لکڑی ہوتی ہے جو نہایت مضبوط' خوش نما اور خوشبودار ہے۔ اس لکڑی کے لیے اس زمانے میں ایک آرا گھر بھی بنایا گیا تھا۔ وائسرائے اسے بھی دیکھنے گیا اور اس عجیب و غریب لکڑی کا ایک بڑا تختہ ملاحظہ کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بالآخر اسی لکڑی کے تختے سے وائسرائے کا تابوت بنایا گیا❷۔

وائسرائے تمام دن مختلف مقامات میں گھومتا رہا۔ جب دن غروب ہونے میں ایک گھنٹا باقی رہ گیا تو اس کے پرائیویٹ سیکریٹری نے اصرار کیا کہ اب باقی مقامات کا دورہ دوسرے دن پر ملتوی کر کے آرام کے لیے جہاز پر تشریف لے جانا چاہیے۔ وائسرائے نے جواب دیا' ابھی دن باقی ہے' ٹھنڈا اور سہانا وقت ہے' اب ماؤنٹ ہیریٹ❸ کو دیکھ لینا چاہیے' جہاں ایک سینوریم بنانے کی تجویز تھی' چنانچہ اس کی سواری کے لیے ایک

---

❶ کالا پانی ص ۱۱۴۔

❷ کالا پانی' ص ۱۱۴۔

❸ یہ جنوبی انڈمان کی مشہور پہاڑی ہے' جس کی بلندی ۱۱۹۳ فٹ ہے۔ اس کا نام انڈمان کے ایک حاکم کرنیل ٹائٹلر (۱۸۶۲-۱۸۶۴) کی بیوی ہیریٹ (harriet) کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خوش گوار ہے۔

گھوڑا حاضر کر دیا گیا۔ لیکن آدھی چڑھائی پر گئے تو وائسرائے نے پیدل چلنے پر اصرار کیا اور کہا کہ جو شخص چاہے گھوڑے پر سوار ہو جائے، میں تو پیدل چلوں گا۔ ماؤنٹ ہیریٹ پر وائسرائے بہت خوش تھا۔ وہاں دیر تک غروب آفتاب کا نظارہ کرتا رہا۔ اس نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا کہ ایسا شان دار نظارہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔

ماؤنٹ ہیریٹ سے واپس آنے لگے تو فضا پر تاریکی چھا رہی تھی۔ وائسرائے اور اس کے ساتھی، تین چوتھائی حصہ طے کر چکے تو مشعل بردار بھی پہنچ گئے۔ اس وقت سات بجے تھے۔ اس سے آگے مولانا محمد جعفر تھانیسری کے الفاظ پڑھیے، جو انھوں نے اپنی کتاب کالا پانی میں تحریر فرمائے ہیں:

"لارڈ صاحب بہادر پل ہوپ ٹاؤن پر پہنچے۔ دو مشعل والے لارڈ صاحب کے آگے، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور پرائیویٹ سیکریٹری لارڈ صاحب کے داہنے بائیں اور ایک لیفٹیننٹ اور ایک کرنیل تھوڑے فاصلے پر پیچھے کی طرف لارڈ صاحب بہادر کے داہنے بائیں چلتے تھے اور مسلح گارڈ فری پولیس کا دستہ لارڈ صاحب سے پیچھے پاؤں سے پاؤں ملا ہوا چلتا تھا ____ لارڈ صاحب بہادر نے مع پرائیویٹ سیکریٹری کے آہستہ آہستہ چل کر گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف جا کر بوٹ میں اترنا چاہا۔ اس وقت یک بیک لارڈ صاحب بہادر کی طرف کچھ ضرب کے کھٹکے کی آواز سنی گئی، اور جب اس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب کی پشت پر کوئی ہاتھ مع چھری کے وار کر رہا ہے اور ایک آدمی لارڈ صاحب کی پشت پر چمٹا ہوا ہے۔"

اب دس بارہ آدمی اس شخص پر گر پڑے۔ ایک قیدی نے جس کا نام ارجن تھا، چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ افراتفری میں شمعیں گل ہو گئی تھیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے قیدی کو مار پیٹ سے بچایا۔

لارڈ میو ضرب کھانے کے بعد سمندر میں گر گئے۔ لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ گہرے پانی میں کھڑے منہ صاف کر رہے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا، مجھے ضرب لگائی گئی ہے، لیکن فکر کی بات نہیں، ضرب معمولی ہے۔ اس کے بعد ان کو گاڑی پر بٹھا دیا گیا جو پل پر کھڑی تھی۔ مشعلیں دوبارہ روشن کر دی گئیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ پشت پر سے کوٹ کٹ گیا ہے اور جسم میں اتنا بڑا زخم ہو گیا ہے کہ پرنالے کی طرح خون بہہ رہا ہے۔ خون کو رومالوں سے بند کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن بند نہیں ہوا۔ لارڈ میو ایک دو منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر لڑکھڑائے اور پیچھے کی طرف گر پڑے۔ آہستہ سے کہا۔ "میرا سر اوپر اٹھاؤ" اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

اب ان کو اٹھا کر جہاز پر پہنچایا گیا۔ وہاں آکر ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دو شدید زخم کندھے کے قریب سے شروع ہو کر سینے تک جسم کو چیرتے چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی جان لینے کے لیے کافی تھا۔

وائسرائے کا قاتل:

وائسرائے ہند لارڈ میو کے قاتل کا نام شیر علی تھا اور وہ پہلے سے قتل ہی کے مقدمے میں کالے پانی میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ یہ اصلاً تیراہ کا آفریدی تھا۔ کسی زمانے میں کمشنر پشاور کے سوار اردلیوں میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے دو گروہوں میں بہت عرصے سے سخت دشمنی چلی آ رہی تھی اور اس سلسلے میں فریقین کے متعدد آدمی قتل ہو چکے تھے۔ شیر علی کو اس کے خاندان کے لوگوں نے کئی دفعہ گھر آنے کے لیے بلایا تاکہ دشمنوں سے بدلہ لیا جائے، لیکن یہ گھر نہیں گیا، پشاور ہی میں ملازمت کرتا رہا۔ ایک دفعہ اسے پتا چلا کہ مخالف فریق کا ایک شخص پشاور آیا ہوا ہے، چنانچہ اس نے موقع پا کر پشاور کے ایک باغ میں اسے قتل کر دیا۔ اس پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا، اور ۲۔ اپریل ۱۸۶۷ء کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ لیکن بعد میں سزائے موت کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔

انڈمان میں شیر علی کا معمول یہ تھا کہ کثرت سے روزے رکھتا۔ تنخواہ اور مزدوری سے جو روپے بچ جاتے، مہینے دو مہینے کے بعد اس رقم سے کھانا پکاتا اور غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ نیکی اور اچھائی کی وجہ سے سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور اس کو اونچے کردار کا آدمی قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظتی عملہ بھی اس کی زیادہ نگرانی نہ کرتا تھا۔ مشقتی قیدیوں کے لیے اسے حجام بنا دیا گیا تھا۔ لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ۱۸۶۹ء میں اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بڑے انگریز کو قتل کرے گا۔ چنانچہ جوں ہی موقع ملا، اس نے ہندوستان کے وائسرائے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وائسرائے ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا تھا اور پہنچتے ہی وہاں کے مختلف مقامات کا دورہ شروع کر دیا تھا۔ شیر علی اس کو قتل کرنے کے لیے دن بھر گھات میں رہا، لیکن حملے کا موقع نہ ملا۔ ناامید ہو کر وہ ماؤنٹ ہیریٹ پر جا بیٹھا۔ یعنی تقدیر خود ہی اسے مقام قتل پر لے گئی۔

منقول ہے کہ لارڈ میو طویل القامت اور بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس کے مقابلے میں شیر علی بہت دبلا پتلا اور بظاہر کمزور جسم کا آدمی تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا شہ زور اور طاقت ور تھا کہ ایک مرتبہ بھاری بیڑی اور ہتھکڑی توڑ کر بتی بجھائی اور گورے پہرے دار کی سنگین چھین کر اسے زخمی کر دیا تھا ——— تاہم دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ لارڈ میو جیسے لمبے تڑنگے اور جسیم و جیم آدمی کو یہ شخص حملہ کر کے قتل کر سکتا ہے۔

بہر حال شیر علی کو گرفتار کیا گیا اور اس پر مقدمہ چلا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ حملہ کس کے اشارے سے کیا؟ تو جواب دیتا، خدا کے حکم سے۔!

عدالتی کارروائی مکمل ہوئی تو اس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ــــــ پھانسی دینے لگے تو اس نے بلند آواز میں کہا: میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا تو اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ مسلمان بھائیو! میں نے تمھارے دشمن کو مار ڈالا۔ اب تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں (پھر) کلمہ پڑھا۔ دو دفعہ پورا کلمہ پڑھا۔ تیسری بار پھانسی کی رسی سے گلا گھٹ گیا اور پورا کلمہ ادا نہ ہوا❶۔

لارڈ میو کے قتل سے ایک مہینا چار روز بعد ۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء کو اسے پھانسی دی گئی۔

قتل کا ردعمل وہابی قیدیوں پر:

اس قتل کا ردعمل وہابی قیدیوں کے لیے نہایت اذیت ناک ثابت ہوا۔ حکومت نے اسے بہت گہری سازش کا نتیجہ قرار دیا۔ وہابیوں کی تمام چھوٹی بڑی مراعات ختم کر دی گئیں اور انھیں الگ الگ دور دور جزیروں میں بھیج دیا گیا۔ بلکہ انھیں اس قتل میں ملوث کر کے سخت ترین سزائیں دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں تفتیش کے لیے انگریزی حکومت نے ایک تو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ کو انڈمان بھیجا۔ دوسرے لالہ ایشوری پرشاد کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ وہی لالہ ایشوری پرشاد ہے جس نے انبالہ اور عظیم آباد کے سازش کے مقدموں میں بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا اور مجاہدین کو سزا دلانے کے صلے میں یہ سورج گڑھ کا ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گیا تھا۔ ان تفتیشی افسروں اور بعض حکام نے وہابی قیدیوں اور بغاوت کے اسیروں کو وائسرائے کے قتل میں الجھانے کی از حد کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہابی سازش مقدمات میں مجاہدین کو سزائیں دینے والے اور ہیبس کارپس کی دونوں درخواستیں مسترد کر دینے والے چیف جسٹس نارمن پر ایک شخص عبداللہ پنجابی نے احاطہ عدالت میں قاتلانہ حملہ کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں نارمن ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو وفات پا گیا تھا۔ نارمن پر حملے اور قتل کے بعد وائسرائے ہند لارڈ میو کو بھی صورت حال سے مطلع کر دیا گیا تھا اور حفاظت کے انتظامات بڑھا دیے گئے تھے، لیکن لارڈ میو مسکراتے ہوئے کہتا کہ مارنے والے کو یہ انتظامات روک نہ سکیں گے۔

بہر حال لارڈ میو کے قتل کے بعد مجاہدین کو انڈمان میں سخت تکلیفوں اور اذیتوں سے دوچار کیا گیا اور انھیں کئی سال مزید وہاں قید میں رہنا پڑا۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ پھانسی کے تختے پر شیر علی نے لارڈ میو کو مسلمانوں کا دشمن اس لیے قرار دیا کہ اس کے زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں بالخصوص ''وہابیوں'' پر بہت تشدد ہوا تھا اور بغاوت کے مختلف مقدمات میں پھنسا کر انھیں سخت سزائیں دی گئی تھیں۔

❶ یہ واقعات مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ''تاریخ عجیب'' میں مرقوم ہیں۔ اس واقعہ کے وہ چشم دید گواہ تھے۔

چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں:

فقہائے ہند کی یہ جلد صرف حرف ع پر مشتمل ہے، جو قمری حساب سے آج تقریباً تیس سال یکم رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ کو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے لکھو پر شائع ہوئی تھی۔ اب ادارہ دارالنوادر نے خوب صورت انداز سے کمپیوٹر پر شائع کی ہے۔ اس کے مقدمے میں جو کہ آغاز ہی سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ لکھا جا رہا ہے، مختصر طور پر ۱۸۵۷ء سے بعد کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ دسویں جلد کے مقدمے میں ان شاء اللہ العزیز معاملہ آگے چلے گا۔

اللهم يسرو لا تعسر وتمم بالخير

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور

۴ر جنوری ۲۰۱۲ء / ۹ صفر ۱۴۳۳ھ

ع

۱- سید عالم علی حسینی نگینوی

سید عالم علی حسینی نگینوی کے والد کا اسم گرامی سید کفایت علی اور دادا کا سید فتح علی تھا۔ اپنے زمانے اور علاقے کے شیخ' محدث اور عالم تھے۔ بہت اچھے طبیب تھے۔ قرآن کے قاری اور حافظ تھے۔ نگینہ (ضلع بجنور' یوپی) میں ولادت ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے' مفتی شرف الدین رام پوری اور مولانا غفران بن تائب فقیہ افغانی رام پوری سے کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر دہلی کا عزم کیا۔ وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے بعض کتابوں کی تکمیل کی۔ علم طب کا شوق پیدا ہوا تو حکیم نصر اللہ خاں دہلوی سے طب کی کتابیں پڑھیں اور ماہر اطبا میں شمار کیے گئے۔ اس عہد کی دہلی میں بہت سے فضلائے کرام فروکش تھے' حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق کا سلسلہ درس بھی جاری تھا' ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کتب حدیث کا درس لیا۔

مجموعی اعتبار سے سید عالم علی حسینی نگینوی نے متعدد اساتذہ سے فیض حاصل کیا' جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا فرید الدین سہارن پوری' مولانا غفران رام پوری' حافظ شبراتی رام پوری' مولانا محمد رام پوری' مفتی شرف الدین رام پوری' مولانا مملوک علی نانوتوی' مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی' حکیم نصر اللہ خاں دہلوی' حکیم غلام حیدر خان دہلوی' مولانا نوازش علی نگینوی' مولانا تہور علی نگینوی۔

مولد و منشا چونکہ نگینہ تھا' اس لیے نگینوی کہلائے۔ بعد کو مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی' لہٰذا مراد آبادی کی نسبت سے شہرت پائی۔

مراد آباد کے زمانہ قیام میں ان کی دلچسپیوں کا محور صرف دو علوم تھے۔ ایک درس حدیث اور دوسرے علم طب۔! ان دو علوم میں خوب مہارت پیدا کی اور اپنے وقت کے نامور محدث اور کامیاب طبیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ بہت سے اہل علم نے ان سے استفادہ کیا اور حلقہ علما میں مستحق تعظیم قرار پائے۔

چند کتابیں بھی تصنیف کیں' جن کے نام یہ ہیں: (۱) رسالہ فضائل صیام (۲) رسالہ فضائل النبی ﷺ (۳) رسالہ در مخرج ضاد (۴) رسالہ تعدد جمعہ (۵) شرح ضابطۃ التہذیب یزدی۔ یہ ایک مفصل و بسیط شرح ہے۔ (۶) الحجۃ البالغہ (۷) الوثیقۃ الباہرہ۔

مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' میں سید عالم علی کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے تعلق رکھتا ہے، وہ واقعہ مندرجہ ذیل ہے:

''مولانا عالم علی رئیس مراد آباد جو روہیل کھنڈ کے ایک مشہور عالم، طبیب اور نامور محدث تھے، انھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیمہ ان کے مکان میں گزرا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ان مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا، سرکاری (انگریزی) تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو ان کی تلاش در پیش تھی، اور ان کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ ان کی ضرور سازش تھی، ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے۔ مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحب ضلع سے، باوجودیکہ وہ نہایت برافروختہ تھے، بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور کہا کہ مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں، لیکن جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا، اس وقت تک میں ان کو بلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطے کی تحقیقات تو ضرور کریں گے، لیکن چونکہ تمھارے نزدیک وہ بے قصور ہیں، بعد ضابطے کی کارروائی کے ان کو بری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطے کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیے گئے۔''

یہاں ''باغیوں'' سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف میدان جہاد میں اترے تھے۔

مولانا عالم علی مراد آبادی سے متعلق یہ واقعہ نجم الغنی نے بھی اپنی تصنیف ''اخبار الصنادید'' میں درج کیا ہے، لیکن اس میں سرسید کا ذکر نہیں ہے۔ ان کے بقول یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران نواب مجدالدین خاں عرف مجو خاں مراد آباد کا حاکم بنا تھا۔ انھوں نے یورپین لوگوں کے قتل کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے، مگر ہمارے موضوع سے متعلق درج ذیل سطور ہیں:

''کچھ عیسائی لوگ اور ایک ڈپٹی کلکٹر جو انگریز افسروں کے ساتھ (مراد آباد سے) بھاگنے سے رہ گئے تھے، مولوی عالم علی صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر جان بر ہوئے۔ مولوی صاحب نے ان لوگوں کو آرام سے رکھا اور ان کے واسطے کچھ چندہ بھی کیا گیا۔ ۱۴ جون (۱۸۵۷) کو بریلی کا برگیڈ بخت خاں کی افسری میں مراد آباد میں داخل ہوا۔ مراد آباد کے باغیوں نے مولوی عالم علی صاحب کی نسبت بخت خاں سے شکایت کی کہ انھوں

نے عیسائیوں کو پناہ دی ہے۔اس بات پر مولوی صاحب کا گھر لوٹا گیا اور عیسائیوں کو پکڑ کر' گاڑیوں سے باندھ کر باغیوں کے لشکر میں لے گئے۔ مسٹر کچن ڈپٹی مجسٹریٹ اور اس کا سالا مسٹر کاربری اور اس کا ایک لڑکا پندرہ برس کی عمر کا جوان' ایک کائستھ کے گھر میں پکڑے گئے۔ یہ تینوں انگریز رات کے وقت نرپت گنج کے مغربی دروازے کے قریب مسجد کے سامنے قتل کیے گئے۔"

بہر حال مولانا سید عالم علی حسینی نگینوی مرادآبادی' تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے مشہور عالم تھے۔ مرادآباد کے رئیس بھی تھے۔اور وہاں ان کا سلسلہ درس جاری تھا' جس میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ برصغیر کے اس عالم و فاضل بزرگ نے ۶۷ سال عمر پائی۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۹۵ھ (۱۷ ستمبر ۱۸۷۸ء) کو جمعرات کے دن عصر اور مغرب کے درمیان سفر آخرت پر روانہ ہوئے [1]۔

۲- قاضی عباس علی کلکتوی

قاضی عباس علی کلکتوی' فن ریاضی اور علم فقہ میں درک رکھتے تھے۔ شیخ محمد مبین لکھنوی اور مولانا تفضل حسین کشمیری کے شاگرد تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین عالم تھے۔ بارعب اور بلند مرتبت تھے۔ اپنے عہد کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

قاضی ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ فقہیات میں عبور کا یہ عالم تھا کہ کلکتے کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں علمی صلاحیتیں مزید اجاگر ہوئیں تو وہاں کے قاضی اکبر بنا دیے گئے۔ پھر پورے ہندوستان کے قاضی القضاۃ کا منصب ان کے سپرد کر دیا گیا۔

تصنیف و تالیف اور درسیات میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ پر تعلیقات و حواشی لکھے۔ اور بھی متعدد درسی کتابوں پر حواشی تحریر فرمائے۔ یہ حواشی اور تعلیقات اس نہج سے لکھے کہ مدرسین اور طلبا ان سے استفادہ کر سکیں اور وضاحت طلب مسائل آسانی سے ان کے ذہن کی گرفت میں آجائیں۔

اس زمانے میں انہی اہل علم کو افتا و قضا کے منصب پر مامور کیا جاتا تھا جو مسائل فقہیہ میں ماہر ہوتے تھے۔ قاضی ممدوح چونکہ اس صفت سے بہرہ ور تھے' لہٰذا یہ اہم ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ تصنیف و تالیف کا بھی انھیں تجربہ تھا اور درس و تدریس میں بھی مصروف رہتے تھے۔ اس وجہ سے کتابوں پر پوری نظر تھی۔ چنانچہ جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے ان کو کامل دیانت و امانت کے ساتھ نباہا۔

برصغیر کے اس جید عالم اور نامور فقیہ نے ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۲۰ھ/۱۵ دسمبر ۱۸۰۵ء کو کلکتہ میں وفات پائی [2]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۰' ۱۰۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۹۔ حیات جاوید ص ۱۴۱۔ اخبار الصنادید ص ۵۵۲' ۵۵۳۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۹' ۲۳۰ بحوالہ قسطاس البلاغہ۔

۳- قاضی عبدالاحمد سورتی

ہندوستان کے علاقہ گجرات کا شہر سورت اس اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے کہ یہ متعدد معروف اور عالی قدر علما کا مولد و مسکن رہا۔ یہاں کے بہت سے علما و فقہا کا تذکرہ فقہائے ہند کی پہلی جلدوں میں بیان ہوا ہے۔ اس شہر میں اہل علم اور ارباب فقہ نے ہمیشہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی محفلیں بپا رکھی ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری میں جو علما و فقہا یہاں رونق افروز رہے ان میں قاضی عبدالاحمد سورتی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور قبیلہ باعکظہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے لاہور کے ایک جید عالم سید عبداللہ حسینی لاہوری سے علم حاصل کیا جو لاہور کی سکونت ترک کر کے سورت میں جا بسے تھے اور سید عبداللہ حسینی لاہوری سورتی کی نسبت سے مشہور ہو گئے تھے۔ سید ممدوح سے قاضی عبدالاحمد طویل عرصے تک استفادہ کرتے رہے اور ادب و بلاغت، فن شعری اور دیگر علوم میں درجہ کمال کو پہنچے۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے تو علاقہ گجرات کے شہر بہرائچ کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور نہایت ذمے داری سے یہ اہم خدمت انجام دی۔

بہادر بن احمد سورتی نے اپنی تصنیف ''حقیقت سورت'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے اصل نام میں اختلاف ہے، احمد تھا یا عبدالاحمد ____؟ اگر عبدالاحمد ہو تو اس میں نسبت عبدیت غیر اللہ کی طرف ہو جاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی احمد کی وجہ سے تادباً لوگ انھیں ''عبدالاحمد'' کے نام سے پکارتے تھے۔ مگر یہ خود اپنا نام ''عبد'' کے بغیر فقط ''احمد'' لکھتے تھے۔ لہٰذا ان کا اصل نام ''احمد'' ہی تھا۔

بہرحال یہ اپنے عصر میں سورت کے سربرآوردہ علما اور مشہور فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۲۵ھ/ ۲۰ جولائی ۱۸۱۰ء کو انتقال کیا[1]۔

۴- مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی

مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی تیرھویں صدی ہجری کے مشاہیر علمائے فرنگی محل میں سے تھے۔ بحر العلوم مولانا عبدالعلی کے بیٹے، درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین سہالوی کے پوتے اور مولانا قطب الدین شہید انصاری سہالوی کے پڑپوتے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان فضل و کمال اور درس و تدریس میں ممتاز تھا۔ اس خانوادۂ بلند مرتبت کا ہر عالم اپنی جگہ خاص اہمیت کا مالک تھا۔ ان میں صاحب ترجمہ مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی لکھنوی بھی مختلف علوم و فنون میں شہرت رکھتے تھے۔

مولانا ممدوح کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ اپنے والد گرامی مولانا عبدالعلی سے حصول علم کیا اور طویل مدت

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۰۔ بحوالہ حقیقت سورت

تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ جب تمام علوم مروجہ پر عبور حاصل کر لیا تو عازم کلکتہ ہوئے۔ وہاں کے حکام سے تقرب پیدا کیا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ لیکن جو توقعات لے کر وہاں گئے تھے وہ پوری نہ ہوئیں اور اپنے علم کی بنا پر جس منصب پر فائز ہونا چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واپس لکھنؤ آگئے۔ کچھ عرصے بعد پھر کلکتے کا قصد کیا، لیکن سوئے اتفاق سے اب بھی اپنے مرتبے کے مطابق حصول ملازمت میں ناکام رہے۔ اس زمانے میں ان کے والد مکرم بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی مدراس میں اقامت گزیں تھے اور درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اب یہ مدراس پہنچے اور والد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں بیماری کا حملہ ہوا جو خطرناک صورت اختیار کر گیا اور سخت کمزور ہو گئے، مگر حالت مرض ہی میں لکھنؤ کے لیے تیار ہو گئے۔ شدت مرض کی وجہ سے باپ نے سفر سے روکا اور مدراس میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن نہیں رکے اور مدراس سے لکھنؤ کو روانہ ہو گئے۔ بیماری چونکہ سخت تھی، اس لیے اثنائے سفر ہی میں وفات پا گئے۔

مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی ممتاز فاضل اور فقیہ تھے۔ مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے دور کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف و شارح اور محشی تھے۔ شرح فقہ اکبر ان کی معروف تصنیف ہے۔ اپنے پردادے کے حالات میں رسالہ قطبیہ تصنیف کیا جو اس خاندان کے رجال سے متعلق حوالے کی کتاب ہے۔ ان کے جد امجد مولانا نظام الدین فرنگی محلی دیار ہند کے مشہور عالم دین تھے اور شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے حالات میں فارسی میں مناقب رزاقیہ کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی نے شرح مناقب رزاقیہ کے نام سے اس کی شرح سپرد قلم کی۔

مولانا عبدالاعلیٰ علمائے احناف میں اونچے مرتبے کے مالک تھے اور فقہ حنفیہ پر عبور رکھتے تھے۔ درس نظامیہ کے سلسلے میں انھوں نے رسالہ قطبیہ میں بعض اہم باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ درس و تدریس کے بارے میں علما کا ہمیشہ مختلف طریقہ رہا ہے اور مدرسین نے درس دیتے وقت اپنے زمانے کے حالات اور طلبا کی ذہنی استعداد کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ مثلاً مولانا قطب الدین شہید سہالوی ہر فن کی ایک ایک کتاب کا درس دیتے تھے جس میں کامل تحقیق و تدقیق سے کام لیتے تھے۔ ان کے اسلوب درس کا یہ کمال تھا کہ علمائے محققین اور ذہین طلبا جب ان سے ہر فن کی ایک ایک کتاب پڑھ لیتے تھے تو وہ تمام فنون پر حاوی ہو جاتے تھے۔

مولانا قطب الدین شہید کے بیٹے مولانا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ طلبا کو ہر فن کی دو دو کتابیں پڑھاتے تھے۔ البتہ ذہین و ذکی طلبا کو صرف ایک کتاب پڑھاتے اور اس انداز سے ہر مسئلہ ان کے ذہن نشین کراتے تھے کہ متداول علوم کے بند دروازے ان کے سامنے کھل جاتے تھے۔

بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی طلبا کی استعداد اور قابلیت کا لحاظ رکھتے تھے۔ بعض طلبا کو ہر فن کی ایک ایک کتاب پڑھاتے تھے، بعض کو دو دو اور بعض کو تین تین۔!

مولانا عبدالاعلیٰ اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میرا نہج تدریس ان سب سے الگ ہے اور خود اپنا اختراع

کردہ ہے۔ وہ یہ کہ طلبا کو صغرسنی ہی میں یعنی حد بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی فنون کی تعلیم دینی چاہیے، اس لیے کہ اس دور میں قوت حفظ تیز ہوتی ہے اور بچے کا ذہن آسانی سے ہر بات کو اخذ بھی کر لیتا ہے اور اسے یاد بھی رکھتا ہے۔ اس زمانے کی یاد کی ہوئی بات ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔

مولانا نے اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا ہے کہ علوم معقول ومنقول کی کتابیں چھوٹی عمر ہی میں ختم کر لینی چاہئیں اور پھر تدریس وتالیف کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے۔

بہر حال مولانا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی تیرھویں صدی ہجری کے فاضل اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۲۸ شعبان ۱۲۰۷ھ/۱۱۔ اپریل ۱۷۹۳ء کو مدراس سے لکھنؤ جاتے ہوئے راستے میں وفات پائی ❶۔ وہ بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

۵۔ مولانا عبدالباسط قنوجی

علمائے قنوج میں مولانا عبدالباسط بن رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی، مشہور فاضل اور عالم کبیر تھے۔ صاحب فتاویٰ عمادیہ شیخ عماد الدین کرمانی کی اولاد سے تھے جو کرمان کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آئے اور قنوج میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہ مشہور اور نامور بزرگ تھے۔ کئی پشتوں سے اس خاندان کے افراد مرتبہ علم میں ممتاز چلے آ رہے تھے۔

مولانا عبدالباسط ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء کو قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ گھر میں علم کا چرچا تھا اور ان کے والد مولانا رستم علی قنوجی اس نواح کے جلیل القدر عالم تھے۔ لائق بیٹے نے ہوش سنبھالا تو باپ کے حلقہ درس میں شرکت کی اور عرصے تک ان سے استفادہ کرتے رہے، یہاں تک کہ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں کمال حاصل کیا اور فنون مروجہ ورسمیہ میں فائق تر گردانے گئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس بچھائی اور اپنے آباو اجداد کے منصب عالی پر فائز ہوئے۔ پھر اللہ نے اس قدر شہرت سے نوازا اور لوگوں میں اس درجے تکریم عطا فرمائی کہ اپنے عہد کے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ قرار پائے۔ مختلف بلاد وامصار سے دور دراز کی مسافت طے کر کے طلبا ان کی طرف شدرحال کرتے اور ان سے مستفید ہوتے۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے حصول علم کیا۔

مولانا عبدالباسط تفسیر، حدیث، فقہ واصول میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے اور واقعہ یہ ہے کہ معقول ومنقول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان تمام علوم کے لیے انھوں نے اپنے والد ماجد کے حضور زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔

متعدد جید علما نے ان سے فیض حاصل کیا، جن میں تفسیر نظم الجواہر کے مصنف مفتی ولی اللہ فرخ آبادی،

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۴۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۰ تا ۲۳۳۔

مولانا فصیح الدین قنوجی کے دو بیٹے مولانا نعیم الدین اور مولانا علیم الدین قنوجی' مولانا قادر بخش بلہوری قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات علم وفضل میں یگانہ اور اصحاب تصنیف تھے۔

مولانا موصوف کو تصنیف وتالیف میں بھی درک حاصل تھا۔ بہت سی مفید ترین کتابوں کے مصنف تھے' جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

(۱) تفسیر ذوالفقار خانی (۲) نظم الآلی فی شرح ثلاثیات البخاری (۳) زبدۃ الفرائض (۴) انتخاب الحسنات ترجمہ احادیث دلائل الخیرات (۵) حبل المتین فی شرح الاربعین (۶) جواہر خمسہ۔ یہ کتاب علم فرائض میں ہے۔ (۷) عجیب البیان فی اسرار القران (۸) شفاء الشافیہ۔ یہ علم صرف کی انتہائی کتاب شافیہ ابن حاجب کی شرح ہے (۹) علم منطق کی شرح تہذیب کی شرح (۱۰) عاملی کی خلاصۃ الحساب کی شرح' یہ باب المساحہ تک ہے۔ (۱۱) سلم العلوم کی شرح۔ یہ مبحث شرطیہ تک ہے۔ (۱۲) المنازل الاثنا عشریہ فی طبقات الاولیا اس میں بارھویں صدی ہجری کے آخر تک کے حالاتِ اولیا مرقوم ہیں۔

مولانا عبدالباسط قنوجی کا خط نہایت خوب صورت تھا اور کتابت وتحریر میں تیز بھی تھے۔ ان کی تصنیفات جو خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں' بہترین خط میں ہیں۔ بعض دیگر علما کی چند درسی کتابوں کی بھی اپنے ہاتھ سے کتابت کی۔ طلبا انھیں پڑھتے تو بہت خوش ہوتے۔

مولانا ممدوح قنوج اور اس کے گردونواح میں نہایت عزت واحترام کے مالک تھے۔ علما وطلبا ان کی خدمت میں آتے تو ان کے طریق تدریس اور اسلوب تفہیم سے انتہائی متاثر ہوتے۔ اس قدر عمدگی سے بات کرتے کہ مشکل سے مشکل مسئلے کے تمام گوشے مخاطب کے سامنے نکھرتے چلے جاتے۔ سمجھنے والے کو کوئی دقت پیش نہ آتی اور کوئی الجھاؤ باقی نہ رہتا۔

نواب سید صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم اور اتحاف النبلا میں بے حد احترام کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔

اس جلیل القدر عالم وفقیہ نے ۲ ربیع الثانی ۱۲۲۳ھ/ ۲۸ اپریل ۱۸۰۸ء کو قنوج میں وفات پائی اور اپنے آباواجداد کے پہلو میں دفن ہوئے ❶۔

۶۔ مولانا عبدالجلیل شہید علی گڑھی

مولانا عبدالجلیل دیار ہند کے اکابر علمائے اہل حدیث میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا ریاض الدین تھا۔ یہ لوگ ''بنی اسرائیل'' مشہور تھے۔ جس محلے میں یہ مقیم تھے' وہ محلّہ ''بنی اسرائیل'' کہلاتا تھا۔ مولانا عبدالجلیل ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء کو علی گڑھ کے اسی محلے میں پیدا ہوئے۔ معقولات کی تحصیل مولانا بزرگ علی مارہروی

❶ ابجد العلوم ص ۸۴۱۔ اتحاف النبلا ص ۳۰۹' ۳۱۰۔ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۸۵ تا ۳۸۷۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۴' ۴۶۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۷۔

سے کی۔ بعض کتابیں دیگر علمائے کرام سے بھی پڑھیں۔ حدیث کے لیے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے کتب حدیث کی تکمیل کی اور سند واجازہ سے سرفراز ہوئے۔ علم فقہ میں بھی عبور حاصل کیا۔ علوم ظاہری کے ساتھ فیوض باطنی سے بھی آراستہ تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی سے اخذ طریقت کیا۔ ان کے والد مولانا ریاض الدین علی گڑھ کی جامع مسجد کے خطیب وامام تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالجلیل کو ان کے علم وفضل کی بنا پر علی گڑھ کی جامع مسجد کا منصب امامت وخطابت تفویض کیا گیا جو اس دور کا بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس مسجد میں ان کا حلقہ درس بھی قائم تھا۔ نہایت پاک باز، متقی اور باخدا عالم وفقیہ تھے۔ علی گڑھ اور اس کے گردونواح کے باشندے ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور یہ مرجع خلائق تھے۔ کتاب وسنت کو سمجھنے اور مسائل فقہیہ میں استفسار کے لیے لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے۔ بعض انگریز بھی ملاقات کو آتے مگر وہ انھیں قابل اعتنا نہ گردانتے اور بہت ہی کم ملاقات کی اجازت دیتے۔ چونکہ زیادہ تر درس وتدریس اور افتا نویسی میں مشغول رہتے اس لیے پیغام بھجوا دیتے کہ اس وقت مصروف ہوں۔ اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ انگریز بہادر کے ساتھ اس کی میم بھی تشریف لائی ہیں تو ملاقات سے قطعی طور پر منع فرمادیتے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہنگامہ شروع ہوا' اور اس کے اثرات علی گڑھ پہنچے تو ۲۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شہر پر انقلابیوں نے قبضہ کرلیا۔ ۳ جون کو مولانا عبدالجلیل نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور شہر کی زمام قیادت انہی کے حوالے کی گئی۔ کم وبیش دو مہینے تک شہر کا نظم ونسق ان کے سپرد رہا۔ پھر جب انگریزوں نے وسیع پیمانے پر ملک میں قتل وغارت کا سلسلہ شروع کیا تو جولائی یا اگست (۱۸۵۷) میں ان کی تازہ دم فوجیں آگرے کی جانب سے علی گڑھ کی طرف بڑھیں۔ شہر انگریزی فوج کے محاصرے میں آگیا اور اس پر حملہ کردیا گیا۔ مولانا اپنے ساتھیوں کی معیت میں میدان محاربہ میں اترے اور دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہوگئے۔ یہ معرکہ سونپال کے باغ میں اس شہراہ پر ہوا جو آگرے کو جاتی ہے۔ اُدھر انگریزی فوج ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھی اور اِدھر صرف جذبہ ایمانی اور جوش قربانی تھا' جس کی وجہ سے یہ مجاہد میدان جنگ میں ثابت قدم رہے۔ اس موقعے پر مولانا نے اپنے بہتر (۷۲) رفقا کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۔ محرم ۱۲۷۴ھ/ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پیش آیا ____ ان بہتر (۷۲) نعشوں کو جامع مسجد میں لایا گیا اور شمالی دروازے کے قریب دفن کیا گیا۔ مولانا ممدوح کی تدفین بھی وہیں ہوئی۔

اس کے بعد انگریزی فوج خون خوار درندوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں گھومنے لگی۔ جہاں کوئی مسلمان صورت شخص ملا' شہید کردیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ پر اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں نصب کردی گئیں۔ جوں ہی کسی مخالفِ آزادی نے کسی کے بارے میں کہا کہ یہ بھی شریک جہاد تھا اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ مجاہدین کے بیوی بچوں کو بھی چن چن کر قتل کیا گیا۔

شہر میں قتل وغارت کا بازار گرم تھا اور ہر طرف قیامت بپا تھی۔ اس ہنگام ابتلا میں مولانا کی اہلیہ محترمہ

نے اپنے چاروں بچوں کو پکڑا' ان کے منہ پر پوتا مٹی ملی اور شہر سے جنگل کی طرف بھاگیں اور تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں رسول پور میں جا کر رکیں۔ وہاں تین سال تک ان بچوں کو چھپائے رکھا۔ یہ طویل عرصہ انتہائی تکلیف اور مصیبت کے ساتھ گزارا۔ جب گرفتاریوں کا سلسلہ رکا اور عام معافی کا اعلان ہوا تو بچوں کو علی گڑھ لے آئیں۔ وہاں پہنچیں تو معلوم ہوا کہ معاملہ بالکل دگرگوں ہے۔ ان کے مکانات نیلام ہو چکے ہیں اور جائداد دوسروں کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب کوئی مادی سہارا باقی نہیں رہا تھا اور وسائل معاش ختم ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالجلیل کو ایک زمانے میں چھتاری کا نواب محمود علی خاں اپنے ہاں لے گیا تھا اور وہاں انھیں درس و تدریس پر مامور کر دیا تھا۔ وہ انھیں کچھ وظیفہ بھی دیتا تھا۔ اب یہ وظیفہ پھر ملنے لگا تھا' لیکن یہ وظیفہ کافی نہ تھا۔ ایک مرد حق عزت علی خاں صاحب نے یہ مہربانی کی کہ نئے مالکوں سے نیلام شدہ مکان خرید کر اصل مالکوں کو واپس دلائے۔ علی گڑھ کے لوگوں پر بھی اس خاندان کی خدمات علمی اور خلوص و وجاہت کا بہت اثر تھا' جس کی وجہ سے دوبارہ سکونت کے مواقع میسر آئے۔

مولانا عبدالجلیل علی گڑھی شہید اپنے دور اور علاقے کے جلیل القدر عالم و فقیہ' نہایت متین' عالی ہمت' بلند حوصلہ اور عمدہ خصال بزرگ تھے۔ بہت سے علما نے ان سے علم حاصل کیا اور نیک نام ہوئے۔ اس عالم دین نے ۱۷ محرم ۱۲۷۴ھ/ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو درجہ شہادت پایا❶۔

ان کے دو بیٹوں میں سے ایک مولانا محمد اسماعیل تھے اور ایک مولانا محمد اسحاق عرشی۔ مولانا محمد اسماعیل نے علم و عمل میں بڑی شہرت پائی اور وہ دیار ہند کے نامور عالم ہوئے۔ ۲۷ شوال ۱۳۱۱ھ/ ۳ مئی ۱۸۹۴ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔

۷۔ مولانا عبدالحق بنارسی

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی اپنے دور کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا فضل اللہ عثمانی تھا۔ دراصل ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک قصبے نیوتن کے باشندے تھے جو ضلع اناؤ میں واقع ہے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے بنارس میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالحق کی ولادت ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۲ء کو نیوتن میں ہوئی اور اپنے والد گرامی مولانا فضل اللہ اور چند علما سے بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں عازم دہلی ہوئے۔ وہاں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی' مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی سے حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تکمیل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ وہاں کے علما

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۸۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی' ج ۴ ص ۳۱۶' ۳۱۷۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۲۳' ۲۲۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۱۹۳' حاشیہ

سے بعض فقہی مسائل میں مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ مسلک اہل حدیث کے پابند اور کتاب وسنت پر عامل تھے' لیکن مکہ مکرمہ کے علمائے کرام متعدد مسائل میں ان سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ اس اختلاف نے زیادہ شدت اختیار کر لی تو وہاں کی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ پھر کچھ مدت بعد رہا ہوئے تو واپس ہندوستان آ گئے۔

دوسری مرتبہ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ یہ قافلہ سات سو ترپن (۷۵۳) افراد پر مشتمل تھا' جس میں بہت سے علما و زعما' شامل تھے۔ بعض خواتین بھی اس قافلے میں شریک تھیں۔ یہ قافلہ ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ/ ۲۱ مئی ۱۸۲۲ء) کو مکہ معظمہ میں داخل ہوا تھا۔

مولانا عبدالحق عثمانی حج کے بعد جب مدینہ منورہ پہنچے تو اپنی عادت کے مطابق فقہی نوعیت کے بعض مختلف فیہ مسائل میں وہاں کے علما سے بھی بحثیں شروع ہو گئیں۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد سعید اسلمی بنارسی فروکش تھے۔ یہ ان کے ہم وطن تھے۔ انھوں نے وہاں کے قاضی سے ان کی شکایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ممدوح مدینہ منورہ سے نکلے اور ایک مقام ''جریدہ'' جا پہنچے۔ وہاں سے ایک قافلے کے ساتھ ''جدہ'' گئے اور جدہ سے یمن کا عزم کیا۔ وہاں قاضی محمد بن علی شوکانی' قاضی عبدالرحمٰن بہکلی' شیخ عبداللہ بن محمد بن اسماعیل امیر یمانی اور شیخ محمد عابد سندھی سے ملاقات کی۔ یہ تمام حضرات اپنے دور کے جلیل القدر علما اور نامور بزرگ تھے۔ ان سب سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ یہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء کا واقعہ ہے۔ بعد ازاں ''مخا'' آئے اور پھر ہندوستان پہنچے۔

اس زمانے میں سفر حج کوئی آسان کام نہ تھا۔ آمد ورفت کی سہولتیں میسر نہ تھیں اور بہت کم لوگ یہ سعادت حاصل کر پاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی نے سات مرتبہ سفر حجاز کیا اور سات حج کیے۔ ان کا حجاز مقدس کا ساتواں سفر آخری سفر تھا اور وہ اس سفر میں منیٰ کے مقام پر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا عبدالحق عثمانی نے مدینہ منورہ سے امام شوکانی کی خدمت میں صنعا (یمن) کا عزم کیا تو راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ کہیں سمندری سفر تھا اور کہیں بری۔ اثنائے راہ میں کثرت باراں نے بھی قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کی۔ بالآخر وہ صنعا پہنچے۔ وہاں ایک مکان میں اتر کر امام شوکانی کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا۔ انھوں نے اپنے ہاں ان کو طلب فرمایا اور عزت و اکرم سے پیش آئے۔ عمر دریافت فرمائی کہ کتنی ہے اور علمی کوائف پوچھے۔ پھر اپنی تصنیفات عنایت کیں اور ان کے مطالعے کا حکم دیا۔ انھوں نے ان کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ اسی دوران کر لیا۔ ہفتے میں دو دن سوموار اور جمعرات کو امام شوکانی کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا اور ان سے سماع علم کرتے۔ امام انتہائی توجہ اور انہاک سے پڑھاتے اور مشکل و پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کرتے۔ اسی اثنا میں مولانا بیمار پڑ گئے اور کافی عرصے تک بخار میں مبتلا رہے۔ صحت یاب ہوئے تو امام ممدوح کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ اس وقت صنعا سے کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہ درجہ غایت تلطف و شفقت سے

پیش آئے۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا' اور تاریخ ۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۸ھ/۲۲ فروری ۱۸۲۳ء تھی۔ اپنے مبارک ہاتھ سے انھوں نے سند و اجازہ لکھ کر دی' جسے وہ ''اتحاف الاکابر فی اسناد الدفاتر'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ سند کو نقل کرنے کے لیے فرمایا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم: الحمد لله يقول محمد بن علي الشوكاني غفرالله لهما حامدالله تعالي و مصليا علي رسوله و آله و صحبه' اني قد اجزت الشيخ العلامة ابا الفضل عبدالحق بن الشيخ العلامة محمد فضل الله المحمدي الهندي كثر الله فوائد بمنه و كرمه و نفع بمعارفه ماشتمل عليه هذا الثبت الذي جمعته و سميته " اتحاف الاكابر باسنادالدفاتر" فليرو عني ماشتمل عليه من كتب الاسلام علي اختلاف انواعها كما يراه فيه رهوا اصل لما هنالك ولم اشترط عليه شرطا فهو اجل من ذلك واعلي واخذت عليه ان يصلني با لدعوة المستقلة في حياتي و بعد مماتي--- حررته يو م الجمعة بتاريخ عاشر جمادي الاخريٰ سنة ۱۲۳۸ سن الهجرة النبوية علي صاحبها افضل الصلوة والتحية۔

شیخ محمد عابد سندھی نے بھی ان کو سند و اجازہ سے مفتخر فرمایا۔ سبل السلام کے مصنف شہیر کے پوتے شیخ عبداللہ یمانی نے بھی اپنے حلقہ درس میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ شیخ سے صحیح بخاری' قرآن مجید کی تفسیر جامع البیان اور بعض دیگر اہم کتابوں کے تبرکاً و تیمناً کچھ حصے پڑھے اور سند عطا ہوئی۔ قاضی عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن بھکلی نے بھی ان کو سند و اجازہ سے سرفراز کیا۔

یہ تمام حضرات اپنے وقت کے جید علما اور بہت بڑے ائمہ دین تھے۔ مولانا عبدالحق نہایت خوش قسمت اور بلند بخت عالم تھے جن کو ان حضرات سے شرف لقا کے مواقع میسر آئے اور سعادت سند و اجازہ حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالحق عثمانی بنارسی مسائل فقہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ وہ کسی خاص امام کے مقلد نہ تھے بلکہ نصوص کتاب و سنت پر عامل تھے۔ ان کے دور میں برصغیر کے علما و عوام زیادہ تر تقلید کے حامی تھے اور مولانا ممدوح کا نقطہ نظر متعدد مسائل میں ان سے مختلف تھا' اسی لیے اجتہاد و تقلید کے موضوع پر علمائے احناف اور ان کے درمیان مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ''الدر الفرید فی المنع عن التقلید'' زیادہ مشہور ہے۔

بنارس میں ان کا اپنا حلقہ درس بھی قائم تھا۔ ان کے تلامذہ میں قاضی محمد مچھلی شہری' سید جلال الدین بنارسی' سید سعید الدین احمد' سید حمید الدین احمد اور سید شہید الدین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مولانا ممدوح

نے حالت احرام میں ۲ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ/ ۲۱ جون ۱۸۶۰ء کو ستر سال کی عمر میں منیٰ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا اور جمعۃ المبارک کی رات کو مسجد خیف کے دروازے کے قریب مدفون ہوئے ❶۔

۸- مولانا عبدالحکیم لکھنوی

مولانا عبدالحکیم انصاری فرنگی محلی لکھنوی' تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ مولانا عبدالرب فرنگی محلی کے بیٹے' بحر العلوم مولانا عبدالعلی کے پوتے اور درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری فرنگی محلی کے پڑپوتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور علم وفضل کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدائی اور متوسط کتابیں مولانا محمد دائم اور اپنے والد محترم مولانا عبدالرب سے پڑھیں۔ مطولات کی تکمیل مولانا نورالحق لکھنوی سے کی۔ تحصیل علم کے بعد درس وتدریس کی مسند بچھائی اور فتویٰ نویسی میں مشغول ہوئے۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ جس طرح ان کے آبا واجداد تدریسی خدمات انجام دیتے رہے تھے' انھوں نے بھی اسی انداز میں یہ اہم خدمت انجام دی۔ اوقات درس کے پابند تھے اور شب وروز اسی میں مصروف رہتے۔ طلبا کا بہت خیال رکھتے اور ان کے لیے خود ہی طعام وقیام کا انتظام فرماتے اور کتابیں مہیا کرتے۔ صلاح وتقویٰ سے آراستہ اور متدین بزرگ تھے۔ متقی اور قائم اللیل عالم دین تھے۔ علوم پر گہری نظر تھی۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ میں ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ ان کو بلند اخلاق اور مسافر نواز پایا۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحلیم اور مولانا محمد نعیم بھی اپنے اسلاف کے صحیح جانشین تھے۔

مولانا عبدالحکیم متعدد کتابوں کے شارح' محشی اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات وحواشی میں یہ کتابیں شامل ہیں: (۱) شرح کافی' یہ کتاب فارسی میں ہے (۲) تفسیر بسم اللہ: فارسی میں (۳) ترجمہ دقائق الحقائق 'فارسی میں (۴) حاشیہ شرح سلم مولانا حمداللہ عربی میں (۵) شرح دائر الوصول الی علم الاصول' عربی میں (۶) شرح هداية آخرين عربی میں (۷) شرح چهل کاف: فارسی میں (۸) شرح رسالہ نظامیہ: یہ رسول اللہ ﷺ کے وضو کے بیان میں ہے (۹) مجدد۔ علم صرف میں ہے (۱۰) زبدۃ النحو: علم نحو میں (۱۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی عربی میں (۱۲) شرح رسائل الارکان (۱۳) حاشیہ برحاشیہ زاهدیه برشرح تهذیب ملا جلال الدین دوانی عربی میں (۱۴) حاشیہ برحاشیہ کمالیہ شرح عقائد جلالیه (۱۵) جدول الصرف فارسی میں (۱۶) جدول النحو: فارسی میں۔ یہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا عبدالحکیم انصاری فرنگی محلی نے ۲۴ صفر ۱۲۸۶ھ/ ۵ جون ۱۸۶۹ء کو وفات پائی ❷۔

❶ تذکرہ مشائخ بنارس' ص ۵۸' ۵۹۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۱۰۔ سیرت سید احمد شہید' ص ۴۴۵' ۴۴۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۹ تا ۲۴۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۳۴۴' ۳۴۵۔

❷ احوال علمائے فرنگی محل ص ۶۷' ۶۸۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۴۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۱' ۱۱۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۵' ۲۴۶۔

۹-مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی

برصغیر کے علمائے احناف میں مولانا عبدالحلیم انصاری فرنگی محلی لکھنوی کا اسم گرامی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالحلیم بن امین اللہ بن محمد اکبر بن مفتی احمد ابوالرحم بن مفتی محمد یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن قطب الدین شہید سہالوی! اس سلسلۂ نسب کی تمام کڑیاں بڑی مضبوط ہیں اور یہ تمام افراد علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔

مولانا عبدالحلیم کی تاریخ ولادت ۲۱ شعبان ۱۲۳۹ھ/۲۱ اپریل ۱۸۲۴ء ہے اور مقام ولادت بلدہ فضل و تحقیق لکھنؤ____! دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر علوم درسیہ کی تحصیل کے لیے کمر ہمت باندھی۔ صرف ونحو کی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا امین اللہ سے پڑھیں، لیکن افسوس ہے وہ اپنے لائق بیٹے کی علمی رفعت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ بیٹا ابھی ان کے زیر درس تھا کہ خود سفر آخرت اختیار کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے محترم نانا مفتی ظہور اللہ کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر علمائے فرنگی محل مثلاً مفتی محمد اصغر، مولانا نعمت اللہ اور مفتی محمد یوسف سے اکتساب فیض کیا اور سولہ برس کی عمر میں درس نظامیہ کے مروجہ نصاب سے فراغت حاصل کر لی۔ اپنے عصر کے باکمال فاضل، متبحر، جامع علوم عقلی و نقلی، اور بہت ذہین و فطین عالم تھے____ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند درس آراستہ کی اور علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور علمی دنیا میں مرتبہ بلند کو پہنچے۔

مولانا عبدالحلیم ممدوح ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں نواب ذوالفقار الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ سے باندہ تشریف لے گئے۔ نواب مذکور اہل علم اور اصحاب فضل کا بہت قدردان تھا، وہ نہایت تکریم سے پیش آیا اور اپنے مدرسے کی مسند تدریس پیش کی۔ ایک عرصے تک اس خدمت پر مامور رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آ گئے اور ایک سال وہاں مقیم رہے۔ پھر جون پور کا عزم کیا۔ وہاں ایک شخص حاجی امام بخش مرحوم تھے، جو شہر کے رئیس تھے۔ انھوں نے مدرسہ امامیہ حنفیہ کے نام سے جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس مدرسے کا مولانا ممدوح کو مدرس مقرر کر دیا۔ نو سال اس منصب پر فائز رہے اور بہت سے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں جون پور سے وطن واپس آئے۔ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں حیدر آباد کے مدارالمہام سید تراب علی سالار جنگ تھے۔ وہ بہت نیک طینت اور عمدہ اوصاف شخص تھے۔ انھوں نے وہاں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم انصاری وہاں پہنچے تو مدارالمہام موصوف نے ان کی بڑی توقیر کی اور انھیں اپنے مدرسے کی مسند تدریس پر فائز کیا۔ حیدر آباد کے دوران سفر میں جب وہ "ریوان" کے مقام پر پہنچے تو تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کے ہاں بھی قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحی فرنگی محلی صغیر السن تھے اور منطق کی کتاب قطبی پڑھتے تھے۔

حیدر آباد میں مولانا عبدالحلیم انصاری دو سال مقیم رہے۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء میں وہاں سے اجازت

لے کر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حرمین شریفین کے علمائے کرام ان سے بے حد احترام سے پیش آئے۔ ان سے مولانا نے خوب استفادہ کیا۔ مکہ مکرمہ میں مفتی احناف شیخ محمد جمال مکی اور مفتی شافعیہ شیخ سید احمد دحلان تھے' ان سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ شیخ علی حریری مدنی سے اجازہ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا عبدالرشید مجددی بھی مدینہ شریف میں فروکش تھے' ان سے بھی سند واجازہ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ اس سے پہلے وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ رشید مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی سے بھی سند حدیث حاصل کر چکے تھے۔ حجاز مقدس کے مذکورہ بالا علما سے حدیث کے علاوہ تفسیر' فقہ اور دیگر علوم عقلیہ ونقلیہ کی سند بھی لی۔

۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں حج سے فارغ ہو کر واپس حیدرآباد تشریف لائے اور مدار المہام سید تراب علی سالار جنگ نے ان کو حیدرآباد کی عدالت دیوانی کا منصب نظامت تفویض کیا۔ یہ خدمت انھوں نے حسن و خوبی سے انجام دی اور بہتر طریقے سے مقدمات کے فیصلے کیے۔ تاحین حیات اس منصب پر فائز رہے۔

مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی مصنف اور شارح بھی تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے مشہور تصنیفات یہ ہیں:

(۱) رسالہ در مسئلہ اشارہ سبابہ (۲) حاشیہ شرح عقائد جلالی المساۃ رجل المعاقد (۳) نظم الدرر فی سلك شق القمر (۴) امعان النظر لبصارۃ شق القمر (۵) التحلیہ شرح التسویہ: یہ شیخ محب اللہ آبادی کی التسویہ کی شرح ہے (۶) الا ملاء فی تحقیق الدعاء (۷) ایقاد المصا بیح فی التراویح (۸) غایۃ الکلام فی بیان الحلال و الحرام (۹) خیر الکلام فی مسائل الصیام (۱۰) قول الحسن فیما یتعلق بالنوافل والسنن (۱۱) عمدۃ التحریر فی مسائل اللون و اللباس والحریر (۱۲) السیاقہ شرح الهدایہ: ہدایہ کی یہ شرح نامکمل رہی۔ (۱۳) نور الایمان فی آثار حبیب الرحمن (۱۴) قمر الاتمار حاشیہ نور الانوار (۱۵) رسالہ در مسئلہ رحلت حرمین (۱۶) التعلیق الفاضل فی مسئلۃ الطهر المتخلل (۱۷) حاشیہ شرح وقایہ۔ یہ حاشیہ نامکمل رہا (۱۸) ایک رسالہ ان تمام فتووں کے بارے میں جو ان سے پوچھے گئے۔ (۱۹) رسالہ تراجم علمائے ہند کے بارے میں: یہ مکمل نہ ہو سکا۔ (۲۰) تحقیقات المرضیہ لحل حاشیہ سید زاھد علی رسالۃ القطبیہ (۲۱) القول الا سلم لحل شرح السلم: ملا حسن کی شرح سلم پر حاشیہ (۲۲) اقوال الاربعہ (۲۳) کشف المکتوم لحل حاشیۃ بحر العلوم (۲۴) قول المحیط فیما یتعلق بالجعل المئولف والبسیط (۲۵) معین الفائصین فی رد المغالطین (۲۶) ایضا حات لمبحث المختلطات (۲۷) کشف الاشتباہ فی شرح السلم لحمد اللہ (۲۸) بیان العجیب فی

شرح ضابطة التهذيب (۲۹) كاشف الظلمه في بيان أقثا الحكمه (۳۰) العرفان في المنطق (۳۱) حاشيه شرح موجز از نفيسى (۳۲) حاشيه قديمه: نامکمل (۳۳) شرح تجديد قوشجى (۳۴) حاشيه بديع الزمان: نامکمل (۳۵) حاشيه مصباح۔

مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اپنے عصر میں تفسیر' حدیث' فقہ اور دیگر علوم میں کامل تھے۔ حیدر آباد میں مقیم تھے کہ اپنے لائق فرزند مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی کی شادی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے۔ اس سے فارغ ہو کر جمادی الاخریٰ ۱۲۸۴ھ/ اکتوبر ۱۸۶۷ء میں واپس حیدر آباد گئے۔ وہاں ماہ صفر ۱۲۸۵ھ/ جون ۱۸۶۸ء میں اچانک مرض سل اور دق کا حملہ ہوا۔ اسی مرض سے ۲۹ شعبان ۱۲۸۵ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۸ء کو دوشنبہ کے روز حیدر آباد میں انتقال کر گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی وصیت کے مطابق انھیں شاہ یوسف قادری کی قبر کے' (جو دکن کے کبار اولیاء اللہ میں سے تھے) پائیں میں دفن کیا گیا[1]۔

۱۰-مولانا عبدالحی بڑھانوی

مولانا عبدالحی صدیقی بڑھانوی دیار ہند کے مشہور فقہا اور نامور علما میں سے تھے۔ بڑھانہ ضلع مظفر نگر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی ہبتہ اللہ اور جد امجد کا مولانا نور اللہ تھا۔ مولانا نور اللہ صدیقی بڑھانوی اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ طویل عرصے تک استاد سے صحبت و لزوم کا شرف حاصل رہا اور ان کی زندگی ہی میں کبار علمائے ہند میں گردانے گئے۔ ۱۱۸۷ء/۱۷۷۳ء کے لگ بھگ وفات پائی۔

مولانا نور اللہ کے شاگردوں کی فہرست بڑی وسیع ہے' جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ مولانا ممدوح نے اپنی بیٹی بھی شاہ عبدالعزیز کے عقد نکاح میں دے دی تھی۔

مولانا عبدالحی کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے دہلی آئے اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بھی شرف شاگردی حاصل تھا اور ان سے سند و اجازہ سے بھی مفتخر ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز اپنے اس شاگرد پر بہت خوش تھے اور ان کے تدین و صالحیت اور فطانت و ذکاوت کی وجہ سے ان پر شفقت فرماتے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی صاحب زادی کی شادی بھی مولانا سے کر دی تھی۔ لیکن اس خاتون سے مولانا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور کچھ عرصے بعد وفات پا گئیں۔ ان کی وفات کے بعد اپنے چچا کی لڑکی سے شادی کی' جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ جو تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم و فقیہ گزرے ہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۲ تا ۱۱۴۔ احوال علمائے فرنگی محل' ص ۶۸۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۴ تا ۴۸۶۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل' ص ۱۲۹ تا ۱۳۱۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۷' ۲۲۸۔ الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات السنیہ علی الفوائد البھیہ ص ۱۰۴ (حاشیہ)

صفحات میں کیا جا رہا ہے۔

جب سید احمد شہید رحمہ اللہ نے نکاح بیوگان کی سنت تازہ کی تو مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے محض احیائے سنت کی غرض سے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح مولانا عبدالحی صدیقی سے کر دیا تھا۔ انتقال کے وقت مولانا نے دو بیوائیں چھوڑیں۔

مولانا عبدالحی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں یہ سب سے زیادہ فقہ کے عالم اور درسیات میں ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھیں میرٹھ میں مفتی عدالت کا عہدہ پیش کیا گیا اور انھوں نے شاہ صاحب سے اجازت لے کر یہ عہدہ قبول فرمایا۔ یہ اس زمانے میں بہت بڑا منصب تھا۔ کچھ مدت تک مولانا عبدالحی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

حضرت سید احمد شہید بریلوی جب نواب امیر خاں سے علیحدگی اختیار کر کے وارد دہلی ہوئے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ایک مستقل جماعت کی تاسیس و تنظیم کا سلسلہ شروع کیا' اس زمانے میں مولانا عبدالحی بھی دہلی میں مقیم تھے۔ اسی اثنا میں انھیں سید صاحب سے کسب فیض کا موقع ملا اور ان سے بیعت ہوئے۔

سید صاحب سے مولانا عبدالحی کی بیعت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن انھوں نے شاہ عبدالعزیز سے اسرار نماز اور حضور قلب کے بارے میں استفسار کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کتب اخلاق و تصوف میں اس کی تفصیل مرقوم ہے۔ امام غزالیؒ کی احیاء علوم الدین کا مطالعہ اس ضمن میں ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ مرشد کامل کے بغیر حصول مرام مشکل ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے ان کو سید احمد بریلوی سے رجوع کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اس اہم کام کے لیے وہ زیادہ موزوں ہیں۔ چنانچہ مولانا ممدوح نے سید صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور وہی سوال کیا جو شاہ صاحب سے کیا تھا۔ سید صاحب نے جواب میں اس کی پوری کیفیت بیان کر کے فرمایا:

مولانا صاحب! حصول ایں مقصد بہ گفتگو راست نمی آید۔ ہمیں نماز است کہ در بدو نبوت سید الانبیا (ﷺ) را حضرت جبرئیل امین بحکم رب العالمین برائے تعلیم آں امامت فرمودہ اند۔ بیا' برخیز و تحریمۂ دو رکعت نماز بہ اقتدا ایم بربند۔ مولانا رحمہ اللہ حسب المامور بہ عمل آوردہ' تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائے آں عالی جناب بربستند۔ دریں مقام اکثر آں عالی مقام (یعنی مولانا عبدالحی) بیان می فرمودند کہ آنچہ درآں دو رکعت یافتہ ام ہیچ گاہ درعمر خود نیافتہ ام[1]۔

(مولانا صاحب! یہ مقصد بات چیت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نماز ہے جو حضرت جبریل امین نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود امام بن کر سید الانبیا ﷺ کو آغاز نبوت میں پڑھائی تھی۔ اٹھیے اور دو رکعت نماز میری اقتدا میں پڑھیے۔ چنانچہ مولانا نے حسب ارشاد سید صاحب کی اقتدا میں دو رکعت نماز کی نیت

[1] مخزن احمدی' ص ۴۵

باندھ لی۔ مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں، وہ عمر بھر مجھے کہیں نہ مل سکیں۔)

بلاشبہ مولانا عبدالحی بہت بڑے عابد و زاہد اور جلیل القدر عالم و فقیہ تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز، مولانا موصوف کو ''شیخ الاسلام'' اور مولانا محمد اسماعیل کو ''حجۃ الاسلام'' کے پُرشکوہ القاب سے یاد فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''تفسیر قرآن مجید میں عبدالحی میرا نمونہ ہے اور تحریر میں رشید الدین۔ حدیث میں مرزا حسن علی اور فقہ میں اسحاق۔'' مولانا اسماعیل کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ''اسماعیل کا علم کسی خاص شعبے میں محدود نہیں۔ جن لوگوں نے میرے عہد شباب کا علم دیکھا ہے، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو اسماعیل کو دیکھ لیں❶۔

نواب وزیر الدولہ نے بھی ''وصایا'' میں نماز سے متعلق سید احمد شہید سے مولانا عبدالحی کی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا نے سید صاحب سے صحابہ کرام کی نماز کا اشتیاق ظاہر کیا تو سید صاحب نے اس کا طریقہ بیان کر دیا۔ مولانا نے نماز عشا کے بعد اسی طریقے کے مطابق دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ سید صاحب حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوری رات انھی دو نفلوں میں گزار دی۔ بس اس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ایسی عقیدت اور راہ ایمان پر ایسی استقامت نصیب ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا❷۔

مولانا عبدالحی کو سید صاحب سے انتہائی محبت تھی اور وہ آخر دم تک ان کے دامن عقیدت سے وابستہ رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدا نے ایسے شیخ طریقت کی خدمت میں پہنچایا ہے جیسے حضرت خضر کی زیارت سے بہرہ مند ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے لیے ان سے دعائے خیر کی التجا کے سوا کوئی دینوی غرض نہیں۔

وقت ارادت و بیعت سے لے کر ہمیشہ سید صاحب کے ساتھ رہے۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں فریضہ حج بھی انھی کے ساتھ ادا کیا اور یہ مبارک سفر اسی جہاز میں کیا جس میں سید صاحب سوار تھے۔ سفر حج ہی کے دوران یمن کے نامور محدث قاضی محمد بن علی شوکانی سے مکاتبتاً حدیث کی سند لی۔ ان کی کتاب الموضوعات بھی مولانا ہی ہندوستان لائے، اس سے قبل برصغیر میں یہ کتاب موجود نہ تھی۔ قاضی شوکانی نے ان کو بعض دیگر تصنیفات بھی مرحمت فرمائیں اور ان کی روایت کی اجازت سے سرفراز کیا۔

مولانا بہت اچھے واعظ اور مقرر تھے۔ بدعات کے ردّ سنت کے احیا اور جہاد کی ترغیب میں نہایت موثر وعظ کہتے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا۔ وعظ کی ابتدا مدرسے کی چار دیواری سے ہوئی۔ جب لوگ زیادہ تعداد میں آنے لگے اور سامعین کا حلقہ بہت بڑھ گیا تو مجالس وعظ دہلی کی جامع مسجد میں منعقد ہونے لگیں۔

مولانا بہت بڑے مناظر بھی تھے۔ جہاں کوئی چیز کتاب و سنت کے کسی حکم کے خلاف پاتے، میدان میں

❶ سید احمد شہید ص ۱۱۸

❷ وصایا الوزیر علی طریقۃ البشیر والنذیر، ج ۲ ص ۱۰۷۔

نکل آتے اور اس میں کوئی مصلحت ان کا راستہ نہ روک سکتی۔ پوری کوشش فرماتے کہ تمام معاملات احکام شریعت کے مطابق طے ہوں۔ ایک مرتبہ بعض مسائل میں مولانا رشید الدین دہلوی مرحوم سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولانا رشید الدین کا شمار بھی فحول علمائے برصغیر میں ہوتا تھا اور مولانا عبدالحی بھی علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی بھی زیر بحث مسائل میں مولانا عبدالحی کے حامی تھے۔ مولانا رشید الدین اور مولانا عبدالحی کے درمیان تحریری مناظرہ ہوا' جو انھوں نے ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر دیا تھا❶۔

کہا جاتا ہے کہ معترضین کی طرف سے مولانا رشید الدین سترہ سوال مرتب کر کے لائے تھے۔ وہ سامنے آئے تو مولانا عبدالحی نے فرمایا:

ملائے محض نیستم' سپاہ گری ہم دانم۔ اگر با ساز و تفنگ گراں بار قطع یک منزل راہ پیادہ نمودہ باشم و تعب آں دامن گیر حال من باشد' دراں وقت نیز اگر سوالات پیش خواہید نمود' بہ تائید تعالیٰ جواب باصواب خواہید یافت ❷۔

(میں نرا ملا نہیں' سپاہ گری بھی جانتا ہوں۔ اگر بھاری بندوق اور گولہ بارود لے کر ایک منزل پیادہ پا طے کر کے آؤں اور تکان کے باعث چور ہو جاؤں' اس وقت بھی آپ جو سوالات پیش کریں گے' خدا کی مدد سے ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔)

مولانا عبدالحی چونکہ بہت بڑے فقیہ عالم دین تھے' اس لیے لوگ ان سے فقہی مسائل کثرت سے دریافت کرتے تھے اور ان کے فتوے کثیر تعداد میں موجود ہیں❸۔

مولانا ممدوح اپنی بیماری و نقاہت کے باوجود نہایت جفاکش اور ہمت ور تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ مگر سید صاحب نے ان کو روک دیا' اور دو اور بزرگوں ــــــ مولانا عبدالقدوس اور حاجی احمد ــــــ کو ارادت مندوں کی تعلیم و تربیت اور بعض ضروری انتظامات کی تکمیل پر مامور فرمایا۔ مولانا کو سید صاحب کی یہ مفارقت گوارا نہ تھی' لیکن تعمیل حکم ضروری تھا۔ شدید خواہش کے باوجود ان کے ساتھ نہیں جا سکے۔ تاہم حکم ثانی کا انتظار رہا۔ پانچ مہینے کے بعد نامہ طلب صادر ہوا۔ جلدی جلدی سامان سفر تیار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اگرچہ بیماری کی وجہ سے نقاہت کا غلبہ تھا' مگر اپنے رفقائے سفر کی معیت میں تھانیسر' مالیر کوٹلہ' ممدوٹ اور بہاول پور کے راستے سے سرحد پار پہنچے۔ راستے میں سخت بیمار بھی ہوئے' لیکن عزم اور ارادے کی پختگی برقرار رہی اور سید صاحب اور مجاہدین سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

سید صاحب کی کتاب ''صراط مستقیم'' کی ترتیب میں بھی مولانا شریک تھے۔ سید صاحب اپنی مجالس میں جو حقائق و معارف ارشاد فرماتے' مولانا اسماعیل شہید انھیں فارسی میں قلم بند کر کے سید صاحب کو سناتے

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۰۔

❷ جماعت مجاہدین' ص ۱۱۳۔

❸ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۰۔

تھے۔ کتاب کا اکثر حصہ مولانا اسماعیل نے مرتب کیا اور دو باب مولانا عبدالحی نے لکھے۔

قیام حرمین کے زمانے میں مولانا عبدالحی نے ''صراط مستقیم'' کا عربی میں ترجمہ کر دیا تھا تا کہ عرب کے اہل علم بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا عبدالحی نے نکاح بیوگان کے مسئلے پر بھی ایک رسالہ مرتب کیا تھا' لیکن اس کے متعلق مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں'' یہ (رسالہ) خود سید صاحب کا ہے' اس لیے کہ اس کے تمام مطالب سید صاحب نے ارشاد فرمائے تھے۔ میں نے اس کے جتنے قلمی نسخے دیکھے' ان میں اس کا انتساب سید صاحب ہی سے کیا گیا تھا❶''

بہر حال مولانا عبدالحی علم و فضل میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں خود شاہ عبدالعزیز ان کی تعریف فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ علم تفسیر میں عبدالحی میرا نمونہ ہیں۔ ایک خط میں انھوں نے مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل کو'' تاج المفسرین' فخر المحدثین اور سر آمد علمائے محققین'' لکھا۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں تفسیر' حدیث' فقہ' اصول' منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔ دونوں کو علمائے ربانی میں شمار کیا۔

مولانا عبدالحی نرم مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ عمل و کردار' علو اخلاق' تاثیر وعظ' عذوبت لسان' تقلیل غذا' پاکیزگی قلب اور قناعت لباس وغذا میں اپنی مثال آپ تھے۔ کم گوئی' توکل علی اللہ اور تمکنت و وقار ان کا شیوہ تھا۔ سنت رسول ﷺ سے محبت و انسلاک' بدعات و رسوم سے تنفر اور عبادت الٰہی میں انہماک میں خاص طور سے مشہور تھے۔ کوئی نصیحت کرتا تو خوش ہوتے اور اپنی تعریف سنتے تو ناراضی فرماتے۔ جامع الصفات بزرگ تھے اور تقویٰ و صالحیت کے نشان ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔

مولانا ممدوح کبر سنی کو پہنچ گئے تھے اور کئی عوارض انھیں لاحق ہو گئے تھے۔ بواسیر کا بھی شدید عارضہ تھا۔ اس کے درد نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا' اور بیماری بڑھتی گئی' یہاں تک کہ نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ کسی وقت بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور کسی وقت ہوش میں آ جاتے۔ سید احمد شہید کو پتا چلا تو تشریف لائے۔ جب ہوش آیا اور سید صاحب کو دیکھا اور پہنچانا تو آپ نے پوچھا' اب کیا حال ہے؟ کہا بہت تکلیف ہے' آپ میرے لیے دعا کریں اور میرے سینے پر اپنے قدم رکھیں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے مجھ کو نجات دے۔ سید صاحب نے فرمایا' مولانا صاحب! آپ کا سینہ علوم قرآن و حدیث کا گنجینہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ میں اس پر قدم رکھوں۔ پھر بسم اللہ پڑھ کر دست مبارک سینے پر رکھا۔ مولانا کو کچھ تسکین ہوئی اور ''اللھم الحقنی بالرفیق الاعلی'' کے الفاظ زبان پر جاری ہوئے اور یہی الفاظ کہتے کہتے انتقال فرمایا❷:

---

❶ جماعت مجاہدین ص ۱۱۷۔

❷ جماعت مجاہدین صفحہ ۱۱۴' ۱۱۵ بحوالہ وقائع احمدی ص ۵۲۵

۸ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) کی شب کو آزاد علاقے میں بمقام خران کی وفات ہوئی۔

دوسرے دن صبح کے وقت مولانا اسماعیل دہلوی‘ مولانا محمد حسن رام پوری‘ قاضی علاء الدین بگھروی‘ میاں نظام الدین چشتی اور میاں جی محی الدین نے غسل دیا‘ اور اس دوران سید صاحب مولانا کے فضائل ومحاسن بیان کرتے رہے۔ فرمایا‘ مولانا عبدالحی دین اسلام کے ایک رکن تھے اور بہت بابرکت شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاں بلالیا۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ حزن وملال میں مبتلا تھے۔ جنازہ اٹھانے والوں میں وہ خود بھی شامل تھے۔ نماز جنازہ انھی نے پڑھائی۔ باشندگان خر کے علاوہ تقریباً سات سو مجاہدین شریک جنازہ تھے۔ مقام خر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کے فاصلے پر قبرستان تھا‘ جس میں جماعت مجاہدین کے اس مایہ ناز شیخ الاسلام کو سپرد خاک کیا گیا۔ آج کل ان کا مرقد ”دلی بابا“ کا مزار کہلاتا ہے۔

مولانا عبدالحی نے وفات سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا‘ جس میں تمام چیزیں اپنی اہلیہ محترمہ (والدہ مولانا عبدالقیوم) کے حوالے کردی تھیں۔ مولانا عبدالقیوم کی عمر اس زمانے میں تیرہ چودہ سال ہوگی۔ وہ سید صاحب کے ساتھ سرحد پار چلے گئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ عبدالقیوم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ بعد میں اس خیال سے انھیں ہندوستان واپس بھیج دیا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی خبر پہنچے گی تو لازماً مغموم ہوں گی۔ ان کا غم غلط کرنے کے لیے بیٹے کو ان کے پاس رہنا چاہیے۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں ــــــ شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین ــــــ بھی جو سید صاحب کی رکاب میں سرحد پار پہنچے تھے اور جماعت مجاہدین میں شریک تھے‘ ان کے ساتھ ہندوستان آئے [1]۔

۱۱۔ مولانا عبدالرحیم رام پوری

مولانا عبدالرحیم کے والد کا اسم گرامی محمد سعید تھا۔ پٹھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے یگانہ روزگار علما میں سے تھے۔ تمام عمر رام پور میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ زہد وقناعت کا پیکر تھے۔ دنیا اور اسباب دنیا کو کبھی قابل التفات نہیں گردانا۔ اس سلسلے میں ان کی طرف بہت سے عجیب وغریب واقعات منسوب ہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ علاقہ روہیل کھنڈ کے انگریز گورنر ہاکنس کو جب ان کی وسعت علم کا پتا چلا تو ان کو بریلی تشریف لانے کی دعوت دی۔

---

[1] فتاویٰ عزیزی‘ ج ۱ ص ۸۶۔ ابجد العلوم ص ۹۱۵‘ ۹۱۶۔ الیانع الجنی ص ۶۷۔ تذکرہ علمائے ہند‘ ص ۱۱۴۔ سید احمد شہید ص ۱۱۶‘ ۱۱۷۔ سیرت سید احمد شہید‘ ص ۳۶۵ تا ۳۷۳۔ جماعت مجاہدین ص ۱۱۱ تا ۱۱۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۹‘ ۲۵۰۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۲۵ تا ۱۲۸۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۰۔ آثار الصنادید ص ۲۷۰۔ سوانح احمدی‘ ص ۱۶ تا ۱۹۔

وہ تشریف لائے تو گورنر نے بڑے احترام کے ساتھ کہا:

''ہم آپ کو انگریزی سکول میں علوم عربیہ کا استاد مقرر کرنا چاہتے ہیں' آپ کی خدمت میں ماہانہ ڈھائی سو روپے تنخواہ پیش کی جائے گی اور جلد ہی تین سو روپے کر دی جائے گی۔''

مولانا نے انگریز گورنر کو اس پیش کش کا عجیب تر جواب یہ دیا کہ ''اگر میں نے آپ کے ہاں ملازمت کر لی تو والیٔ رام پور نواب احمد علی خاں جو مجھے دس روپے ماہانہ دیتے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔''

گورنر نے کہا: 'ہم تو اس سے کئی گنا زیادہ دے رہے ہیں۔ اور آپ کو دس روپے کی فکر پڑی ہے۔''

یہ جواب موثر ثابت نہ ہوا تو فرمایا: ''میرے گھر میں ایک بیری کا درخت ہے۔ اس کے بیر بہت میٹھے ہیں' اگر میں آپ کے ہاں آ گیا تو وہ میٹھے بیر کیسے کھا سکوں گا۔''

گورنر نے کہا: ''آپ کے گھر والے وہ بیر آپ کو بھیج دیا کریں گے۔''

فرمایا: ''یہ تو ٹھیک ہے لیکن رام پور میں مجھ سے جو طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں' میرے بعد ان کا کیا بنے گا؟ اور وہ کس سے تعلیم حاصل کریں گے۔؟''

گورنر نے کہا: ''وہ سب طلبا آپ کے ساتھ ہی بریلی آ جائیں گے اور میں ان کے لیے وظائف مقرر کر دوں گا۔''

فرمایا: ''آپ یہ بھی کر دیں گے، لیکن اگر اللہ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم علم پڑھانے کے بدلے میں اجرت لیتے تھے تو اس کا کیا جواب دوں گا؟''

اس کے بعد وہ رام پور واپس چلے گئے اور انہی دس روپے میں جو نواب احمد علی خاں انھیں ماہانہ دیتا تھا، عمر صرف کر دی۔ یہ جید عالم دین تھے اور بہت اونچے مرتبے کے حامل تھے، جنھوں نے انگریزی حکومت کی ڈھائی تین سو روپے کی تنخواہ منظور نہیں کی اور خالصتاً لوجہ اللہ علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔

اس ساری گفتگو کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں یا تو یہ انگریز کی ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر قناعت کا ان پر اس قدر غلبہ تھا کہ دس روپے کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ اس جلیل القدر عالم نے ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء کو رام پور میں وفات پائی❶۔

۱۲۔ سید عبدالسلام حسینی ہسوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک مقام ہسوہ ہے' جو اعمال فتح پور میں واقع ہے۔ اس میں تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ مولانا عبدالسلام ہسوی گزرے ہیں' جو اپنے علاقے اور عہد کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ والد کا اسم گرامی شاہ ابوالقاسم نقشبندی تھا۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۸' ۲۵۹ بحوالہ نجم الغنی رام پوری

مولانا عبدالسلام ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء کو موضع ہسوہ میں پیدا ہوئے اور کچھ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر ابتدائی اور متوسط درجے کی درسی کتابیں اپنے عم محترم سید سراج الدین احمد حسینی واسطی سے پڑھیں۔ بعدازاں عازم لکھنؤ ہوئے' وہاں شیخ معین الدین کڑوی' مولانا محمد معین لکھنوی اور بعض دیگر اساتذہ سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر وطن واپس لوٹے اور اپنے والد محترم شاہ ابوالقاسم حسینی واسطی سے جو اپنے عصر کے کبار مشائخ میں سے تھے' اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان سے مشغول استفاضہ رہے۔ شاہ ابوالقاسم نے ۶ ربیع الاول ۱۲۶۶ھ/ ۲۰ جنوری ۱۸۵۰ء کو اپنے وطن ہسوہ میں وفات پائی۔ والد کی وفات کے بعد لائق بیٹے نے دہلی کے لیے شد رحال کیا۔ اس زمانے میں دہلی میں شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی کا غلغلہ درس حدیث بلند تھا' سید عبدالسلام نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور تفسیر و حدیث کی تحصیل کی۔ اسی زمانے میں شیخ عبدالغنی ممدوح کے برادر مکرم شیخ احمد سعید مجددی دہلوی سے تصوف و طریقت میں حصول فیض کیا اور تین سال ان کی صحبت میں رہے۔ ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں علوم مروجہ سے فارغ ہوئے۔ جب علوم میں مہارت حاصل ہوگئی اور مرتبہ مشیخت کو پہنچ گئے تو مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ عرصے تک وطن میں رہ کر لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء میں سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ قیام حجاز کے دوران میں شیخ احمد دحلان شافعی مکی سے سند حدیث لی اور شیخ علی بن یوسف ملک باشلی حریری سے "دلائل الخیرات" کی سند سے بہرہ ور ہوئے۔

مولانا عبدالسلام ہسوی زہد و تقویٰ اور عبادت و ورع کی دولت سے مالا مال تھے' جامع علم و عمل اور کتاب و سنت کے شیدائی تھے۔ بے مقصد بات سے پرہیز کرتے اور اپنے معاصرین پر تنقید و تشنیع سے دامن کشاں رہتے۔ حفظ لسان ان کا بہت بڑا وصف تھا۔ سکوت' قناعت' عفت' ایثار اور استغنا کے اوصاف حسنہ سے متصف تھے۔ معرفت و سلوک کے دروازے اللہ نے ان کے لیے وا کر دیے تھے اور راسخین فی العلم میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت پاکیزہ اخلاق بزرگ تھے۔ نہ اپنے سے بغض رکھنے والوں کی پروا کرتے اور نہ تعریف کرنے والوں سے خوش ہوتے۔ کسی کو مطعون قرار دینا یا کسی کو لائق ملامت ٹھہرانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ سچی اور صحیح بات کہنے سے کوئی انھیں روک نہیں سکتا تھا۔ ان سے شرعی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وضاحت سے بتاتے۔ اگر کسی مسئلے میں انھیں تردد ہوتا تو صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں' کسی دوسرے عالم سے پوچھو۔ یہ ان میں بہت بڑی صفت تھی' ورنہ عام طور پر علما کو دیکھا گیا ہے کہ اپنی علمی کمزوری کا اظہار نہیں کرتے' غلط ہو یا صحیح کہتے چلے جاتے ہیں۔

ان کا معمول تھا کہ نصف رات کو اٹھتے اور نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ ذکر الٰہی اور خوف خدا کا غلبہ ان پر طاری رہتا۔ فجر کی نماز مسجد میں جا کر باجماعت غلس میں ادا کرتے۔ پھر اشراق تک وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ نماز اشراق کے بعد لوگوں کو تلقینِ اذکار فرماتے۔ پھر قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ بعدازاں

گھر جاتے اور اہل خانہ کو ضروری مسائل بتاتے۔ پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرتے۔

ان کا تمام وقت عبادت، طلبا کے درس و افادہ، مطالعہ کتب اور فتویٰ نویسی میں گزرتا۔ بہت سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے جو مختلف فقہی مسائل بھی دریافت کرتے، فتوے بھی لکھواتے اور وظائف بھی پوچھتے۔ ان کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہر آن کھلا رہتا۔ کسی سے ایسی بات نہ کہتے جو دل شکنی کا باعث ہو۔

اس زمانے میں جو مسائل اہل علم کے زیر بحث رہتے، ان میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دیہات میں نماز جمعہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ صاحب ترجمہ مولانا ممدوح دیہات میں نماز جمعہ کے قائل تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں نماز جمعہ ادا کرنی فرض ہے۔ اس مسئلے میں متعدد علمائے مشاہیر سے ان کے مباحثوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، جن میں مفتی محمد یوسف انصاری لکھنوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد امیر فتح پوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات علما دیہات میں نماز جمعہ کے قائل نہ تھے۔ اور مولانا عبدالسلام ہسوی سے مخالف رائے رکھتے تھے ___ اس موضوع سے متعلق انھوں نے چند رسالے بھی تحریر فرمائے۔ مثلاً ایک رسالے کا نام تذکرۃ الجمعہ، ایک کا اشاعت الجمعہ اور ایک کا نام تبصرۃ الجمعہ ہے۔

ان رسائل کے علاوہ انھوں نے جواز تقلید کے بارے میں بھی ایک رسالہ لکھا جس کو ''التمہید فی اثبات التقلید'' کے نام سے موسوم کیا۔

ردشیعہ سے متعلق بھی انھوں نے متعدد رسائل تصنیف کیے، جن میں تذکرہ اثنا عشریہ اور تفضیع الشیعہ زیادہ مشہور ہیں۔

فقہی مسائل سے متعلق انھوں نے بہت سے فتوے جاری کیے۔

مولانا عبدالسلام ہسوی نے ۴ شوال ۱۲۹۹ھ/ ۱۹۔ اگست ۱۸۸۲ء کو بعارضہ نبل وفات پائی ❶۔

۱۳۔ قاضی عبدالسلام عباسی بدایونی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر بدایوں کی سرزمین علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس میں بے شمار اصحاب کمال اور ارباب فضیلت پیدا ہوئے اور ان کی خدمات گوناگوں کا دائرہ دور دور تک پھیلا۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں عیسوی میں، اس شہر کی زرخیز مٹی سے جن بزرگوں نے جنم لیا، ان میں صاحب ترجمہ قاضی عبدالسلام عباسی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی عطاء الحق عباسی تھا۔

قاضی عبدالسلام کی ولادت ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء میں بدایوں میں ہوئی اور اسی شہر میں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عم محترم قاضی بہاء الحق قاسمی سے جو بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی کے تلمیذ تھے، حصول علم کیا اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں شمار کیے گئے۔

جب علوم فقہ میں مہارت پیدا کر لی، دیگر علوم رسمیہ سے بھی فارغ ہو گئے اور طریقت کی منزلیں بھی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۳ تا ۲۶۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۰، ۱۲۱۔

طے کر لیں تو رام پور شہر کے قاضی مقرر کیے گئے اور عرصے تک محکمہ قضا پر متعین رہے۔

قاضی عبدالسلام بدایونی' مختلف علوم پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی تیز تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- زادالاخرت: یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے' جو اردو زبان میں ہے اور منظوم ہے۔ یہ تفسیر انھوں نے ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء میں لکھی۔ تقریباً دو لاکھ اردو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا نام بھی تاریخی ہے۔

۲- انشراحات العلیہ: یہ اصول فقہ میں ہے اور المنار کی شرح ہے۔

۳- علم الفرائض: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور میراث سے متعلق ہے۔

۴- اخبار الابرار: یہ علم تصوف میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۵- شرح دلائل الخیرات: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور دلائل الخیرات کی شرح ہے۔

۶- مثنوی طوفان عشق: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مثنوی ہے۔

قاضی عبدالسلام عباسی بدایونی مفسر تھے' فقیہ بھی تھے اور شاعر بھی ____! ۵ ذیقعدہ ۱۲۸۹ھ/ ۴ جنوری ۱۸۷۳ء کو ان کا انتقال ہوا❶۔ خزینۃ الاصفیا اور حدائق الحنفیہ میں سن وفات ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء اور تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء لکھا ہے جو غلط ہے۔

۱۴- سید عبدالشکور بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں رائے بریلی ایک مشہور شہر ہے اور یہ وہی شہر ہے جس میں سید احمد شہید رحمہ اللہ پیدا ہوئے اور ان کی جماعت مجاہدین کے برصغیر پاک و ہند میں غیر اسلامی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اس جماعت سے وابستہ لوگ' ۱۹۴۷ء تک انگریزی اقتدار کو للکارتے رہے۔ یہ شہر صدیوں سے علم و علما اور اصحاب فضل و کمال کا مسکن ہے اور اب تک اس کی یہ شہرت قائم ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس بلدہ علم میں جو حضرات پیدا ہوئے ان میں سید عبدالشکور حسنی حسینی بریلوی کا نام لائق تذکرہ ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سید محی الدین اور جد امجد کا سید عبدالمقتدر تھا۔

سید عبدالشکور بریلوی کی ولادت ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ شعور کی آنکھیں کھولیں تو سید محمد طاہر بریلوی اور دیگر علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ نہایت ذکی' اور قوی حافظہ تھے۔ فقہ' میراث' حساب' سیر و رجال اور انساب کے ماہر تھے۔ تمام علوم عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

---

❶ تذکرۃ الواصلین۔ ص ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ قاموس المشاہیر۔ ج ۲۔ ص ۶۲' ۶۳۔ خزینۃ الاصفیا ج۔ ج ۲ ص ۳۹۱' ۳۹۲۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۷۴۔ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۵۔ اکمل التاریخ حصہ اول ص ۷۱۔ عین الانسان' ص ۴۳۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۲۹۸' ۲۹۹۔

آخر عمر میں بریلی سے ٹونک چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ علم انساب ایک نہایت اہم علم ہے' اس میں انھیں دست رس حاصل تھی۔ اس موضوع سے متعلق ''گلشن محمودی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اپنے موضوع میں مفصل ومبسوط کتاب ہے۔

سید عبدالشکور بریلوی نے منگل کے روز ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ/ ۶ ستمبر ۱۸۶۵ء کو وفات پائی ❶۔

۱۵- شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

شیخ وقت' امام عصر' عالم کبیر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علم وفضل میں نہایت اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ علمائے کرام انھیں ''سراج الہند'' اور ''حجۃ اللہ'' کے پر عظیم القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سب سے بڑے بیٹے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پوتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز ۲۲ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ/ ۲۵ ستمبر ۱۷۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا' پھر اکثر درسی کتابیں اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہ سے پڑھیں۔ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو ماہ محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ/ ۲۱۔ اگست ۱۷۶۲ء میں والد مکرم وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا نور اللہ بڑھانوی' شیخ محمد امین کشمیری اور شیخ محمد عاشق پھلتی کے حلقہائے درس میں شامل ہوئے اور جو کتابیں والد محترم سے نہیں پڑھ سکے تھے' وہ ان بزرگوں سے پڑھیں۔ سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے اور باپ کی مسند درس سنبھالی۔ تفسیر' حدیث' فقہ' ادبیات عربی' صرف ونحو اور منطق وفلسفہ میں عبور حاصل تھا۔ خط نہایت عمدہ تھا اور خط نسخ اور خط رقاع میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ تیر اندازی اور گھڑ سواری میں بھی ماہر تھے۔ علم موسیقی میں بھی درک رکھتے تھے۔ ذکاوت وفطانت میں یگانہ' فہم وفراست میں منفرد اور حفظ وذہانت میں بے مثال تھے۔ مسند درس پر بیٹھتے ہی ان کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور دور دراز سے علما وطلبا حاضر خدمت ہونے اور استفادہ کرنے لگے تھے۔

تلامذہ کرام:

شاہ صاحب ساٹھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ ان کے فضل وکمال کی وجہ سے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں دعوت درس دی گئی۔ دہلی میں اگرچہ ان کے روزگار کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا' تاہم انھوں نے دہلی کی سکونت ترک نہ کی اور سادہ زندگی بسر کرنے اور علوم دینی کی نشر واشاعت کو ہر شے پر مقدم رکھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ پورے برصغیر میں ان کے علم وفضل کی دھوم تھی۔ ملک کے ہر علاقے اور ہر حصے سے تشنگان علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۶۔

کرتے۔ جو حضرات بعض دیگر علمائے عصر سے مستفید ہو چکے تھے' وہ بھی ان کی خدمت میں آتے اور سند واجازہ سے بہرہ مند ہوتے۔ لاتعداد لوگوں نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ جس طرح ان کے والد گرامی حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں' اسی طرح ان کے شاگردوں کی تعداد بھی حدِ شمار سے باہر ہے۔ پھر جن لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا' وہ آگے چل کر علم و کمال' تقوی و تدین' تحقیق و تدقیق' تدریس و تعلیم' تصنیف و تالیف' نشر و اشاعت دین' وعظ و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: شاہ رفیع الدین' شاہ عبدالقادر' مولانا محمد اسماعیل شہید' شاہ محمد اسحاق' شاہ محمد یعقوب' شاہ غلام علی' مفتی صدر الدین' سید احمد شہید بریلوی' مولانا فضل حق خیر آبادی' مولانا عبدالحی بڑھانوی' میر محبوب علی' مفتی الٰہی بخش کاندھلوی' شاہ عبدالغنی' مولانا حسین احمد ملیح آبادی' نواب صدیق حسن خاں کے والد مکرم سید اولاد حسن قنوجی' مولانا حسن علی لکھنوی' شاہ ابوسعید مجددی مولانا رؤف احمد مجددی' شاہ احمد سعید مجددی۔

ان کے شاگردوں میں سے یہ ان چند حضرات کے نام ہیں' جن میں سے ہر بزرگ علم و فضل میں یکتا تھا اور ہر ایک نے تحقیق و کاوش کے مختلف میدانوں میں کارنامے انجام دیے جو کے تذکرہ و رجال کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ شاگردوں کے مقام و مرتبے کی رفعت سے استاد کی عظمت کا بخوبی پتا چل سکتا ہے۔

مختلف زبانوں پر عبور:

شاہ صاحب بوقلموں اوصاف کے مالک تھے۔ وہ جہاں علوم عربی و فارسی میں ممتاز تھے' وہاں اور بھی متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اردو اور عبرانی سے بھی انھیں آگاہی حاصل تھی۔ اردو زبان ان کے عہد میں خاصی مقبول و مروج ہو چکی تھی اور اس زمانے کے متعدد نامور شعرا جن میں خان آرزو' سودا' میر' درد اور میرزا مظہر جان جاناں خاص طور پر قابل ذکر ہیں' اپنے کلام بلاغت نظام سے گیسوئے اردو کو سنوار چکے تھے۔ خود شاہ ولی اللہ کو بھی اردو کی عام پذیرائی اور ملک گیر مقبولیت کا احساس تھا اور وہ اپنے فرزندان گرامی کو اردو سیکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق شاہ عبدالعزیز اردو زبان کی تعلیم کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں جاتے' انہماک و توجہ سے خواجہ صاحب کی تقریر سنتے اور اردو محاورات کو سمجھنے کی بالخصوص کوشش کرتے۔ شاہ ولی اللہ اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ مستقل فن ہیں' اسی طرح اصول زبان بھی ایک باقاعدہ فن ہے۔ اردو زبان کے موجد اور اس میں کامل درک رکھنے والے خواجہ میر درد ہیں' اس فن کے حصول کے لیے ان کی صحبت کو غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب چراغ سحری ہیں [1]۔

---

[1] ملفوظات شاہ عبدالعزیز (اردو ترجمہ) ص ۱۱۔

شاہ عبدالعزیز کے بھائی شاہ عبدالقادر بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بھی اردو زبان خواجہ صاحب ممدوح سے سیکھی تھی۔

شاہ عبدالعزیز کو اردو زبان پر اس درجے عبور تھا کہ مشہور شاعر ابراہیم ذوق نے ایک مرتبہ اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور اسے شاہ صاحب کے پاس لے گئے کہ وہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے قصیدہ سن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد ولی عہد بہادر شاہ ظفر نے اپنے شقہ (رقعہ) کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے جو کچھ ذوق مرحوم سے کہا تھا وہی ولی عہد کو جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں　　　کسے بدیدۂ بینا خود بردانگشت

یعنی میری بات پر اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنی دیدۂ بینا میں انگلی ڈال لے۔

شاہ صاحب کے اس جواب سے ذوق کا حوصلہ اور بڑھا اور دل کو اتنی تقویت پہنچی کہ دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا اور اس کے بڑے چرچے ہوئے[1]۔

شاہ صاحب اپنے دور کے نہایت باخبر عالم دین تھے۔ عبرانی زبان سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ یہ زبان انھوں نے باقاعدہ سیکھی تھی اور تورات کا علم اسی زبان میں حاصل کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

فاضلے از اکابر علما از و تحقیق توریت بلسان عبرانی می کردم[2]

یعنی میں تورات کے ایک فاضل شخص سے جس کا شمار اس کے اکابر علما میں ہوتا ہے، عبرانی زبان میں اس کے متعلق تحقیق کرتا رہا۔

قرآن اور حدیث سے شغف و تعلق:

شاہ صاحب یوں تو تمام مروجہ علوم و فنون پر دست رس رکھتے تھے، لیکن قرآن مجید اور حدیث رسول (ﷺ) سے انھیں بالخصوص شغف اور بہ درجہ غایت تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی حیات مبارکہ کا زیادہ تر حصہ حدیث نبوی (ﷺ) کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ و تدریس میں صرف کیا۔ حدیث کی خدمت کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی متاع قرار دیتے تھے۔ طلبائے علم اور اصحاب ارادت کو بھی اتباع حدیث کی تلقین اور احیائے سنت کی تاکید فرماتے۔ قرآن مجید کی تفسیر احادیث کی روشنی میں کرتے اور اس کے مطالب و معانی کی شرح و وضاحت میں حدیث نبوی ہی کو پیش نگاہ رکھتے۔

---

[1] آب حیات۔ ص ۴۴۳۔

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۲۷

قوت حافظہ:

شاہ صاحب کی قوت حافظہ نہایت تیز تھی اور یادداشتوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے نہاں خانہ ذہن میں محفوظ تھا۔ ان کو بعض وہ باتیں بھی یاد تھیں جن کا تعلق ان کی عمر کے بالکل ابتدائی دور اور عہد طفلی سے تھا۔ اس کا ثبوت ان کے ملفوظات کی ایک تحریر سے ملتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں پانچ چھ سال کا تھا کہ والد ماجد نے ایک شخص کو ایک مسئلہ بتایا جو شافعی مذہب کے مطابق تھا❶۔"

طالب علمی کے زمانے میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھایا پڑھا تھا' وہ پوری طرح یاد تھا۔ "تحفہ اثنا عشریہ" میں کتب شیعہ کے جو حوالے درج ہیں' وہ زیادہ تر حافظے کی مدد سے دیے گئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ تمام حوالے صحیح ہیں اور ان کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی تمام کتابیں ان کے سامنے کھلی پڑی ہیں اور ہر کتاب کو دیکھ کر قلم کو حرکت دیتے ہیں۔

جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوتے اور طلبا کی جماعت ان سے مشغول استفادہ ہوتی تو ان کے حافظے کی قوتیں خوب جولانیاں دکھاتیں اور وہ دوران تقریر میں استشہاد و استدلال کے لیے غیر درسی کتابوں کی طول طویل عبارتیں محض اپنی یادداشت کے بل پر طلبا کو لکھا دیتے۔ قوت حافظہ اور ذکاوت ذہن کی یہ کیفیت آخر عمر تک قائم رہی۔ زندگی کے کسی حصے' یہاں تک کہ شدید حوادث و آلام کے دور میں بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ دقیق سے دقیق علمی مسائل اور نازک شرعی نکات کو اس اسلوب سے زیر بحث لاتے کہ سامعین تصویر حیرت بن جاتے۔ جب ان سے کوئی علمی سوال کیا جاتا تو بڑے بڑے اہل فضل اور ارباب علم ان کے ہونٹوں کی جنبش کا بے تابی سے انتظار کرتے اور زبان کو حرکت دیتے تو معلومات کا دریا بہنے لگتا۔ وہ اپنے دور کے برصغیر کی عظیم الشان ہستی تھے اور ان کے کمالاتِ بوقلموں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

انداز خطابت وتقریر:

شاہ صاحب جہاں اقلیم علم میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے وہاں تقریر و خطابت اور انداز وعظ و نصیحت میں بھی ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ تقریر کی صلاحیتیں اللہ نے اوائل عمر ہی میں ان میں ودیعت کر دی تھیں اور اس ضمن میں ان کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں سے طالبان علوم اور متلاشیان حق ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفاضہ کرتے۔ ایسے دلنشین اور عمدہ طریقے سے وعظ کہتے کہ لوگ انتہائی متاثر ہوتے۔ گفتگو کا ڈھنگ کچھ ایسا تھا کہ مشکل ترین مسائل کی گرہیں خود بخود ان کے سامنے کھلتی چلی جاتیں۔ ویسے تو محفل تبلیغ اور مجلس وعظ ہر وقت گرم رہتی' لیکن ہفتے میں دو دن منگل اور جمعے کو بالخصوص دہلی کے کوچہ

❶ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۲۷

چیلاں میں مجمع عام میں وعظ کہتے‘ جس میں دور دراز کے لوگ انتہائی شوق سے حاضر ہوتے اور فیض حاصل کرتے۔ وعظ خالص قرآن و حدیث کی روشنی میں کہتے جو فصاحت و بلاغت سے بھی مزین ہوتا اور تاریخی حقائق و واقعات کے اعتبار سے بھی بے مثال۔

طلبا سے شفقت:

طلبائے علم سے ان کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ان کی ضروریات کی کفالت کرتے اور بہت ہی الفت و محبت سے پیش آتے۔ ان کے سوالات کامل توجہ سے سنتے اور اس طرح دلائل و براہین سے جواب دیتے کہ ان کے تمام شکوک رفع ہو جاتے اور وہ مطمئن ہو کر حلقہ درس سے رخصت ہوتے۔ ان کے قیام و طعام میں بھی حتی الامکان ان کی مدد کرتے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حصول معاش میں بھی ان سے پورا تعاون فرماتے۔ مفتی صدر الدین آزردہ ان کے حلقہ درس سے فارغ ہو کر نکلے تو حصول معاش کے لیے عازم کلکتہ ہونے کا ارادہ کیا۔ اس کا ذکر شاہ صاحب سے ہوا تو انھوں نے کمال شفقت و مہربانی سے وہاں کے مدرسے کے مہتمم مولانا امین اللہ کے نام خط لکھ کر مفتی صاحب ممدوح کو دیا۔ اس خط میں مفتی صاحب کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ ان کا شمار دہلی کے فضلائے نامدار میں ہوتا ہے۔ فقہ و اصول‘ علوم عربیہ اور فنون عقلی و نقلی میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور یہ کلکتے میں آپ سے ملیں گے‘ ان سے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کریں ❶۔

یہ پورا خط نہایت شان دار ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے تلامذہ سے انتہائی شفقت اور مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔

اسی طرح اپنے شاگردوں کے اعتراضات بھی بلند حوصلگی سے سنتے اور انھیں اطمینان بخش جواب سے نوازتے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ تذکرہ غوثیہ میں نقل کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی‘ شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور شاہ صاحب ان سے بہت تلطف و کرم کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں مولانا فضل امام اور مولانا فضل حق (دونوں باپ بیٹا) اور غوث علی شاہ قلندر حاضر تھے۔ مولانا فضل حق نے اپنا ایک قصیدہ شاہ صاحب کو سنایا۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر ٹوکا تو مولانا فضل حق نے شعرائے عرب کے اشعار بطور استشہاد اپنی تائید میں پیش کیے۔ اس پر مولانا فضل امام نے بیٹے سے کہا ”پاس ادب!“ مولانا فضل حق نے کہا۔ ”یہ تو ادبی گفتگو ہے۔“ شاہ صاحب نے فرمایا ”تم مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو کھل کر پوچھو۔“ یعنی اس طرح شاہ صاحب نے اپنے لائق شاگرد مولانا فضل حق کی حوصلہ افزائی کی ❷۔

---

❶ اتحاف النبلا‘ ص ۲۶۱۔

❷ مقدمہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز (اردو ترجمہ) ص ۱۷

عادات واطوار:

شاہ عبدالعزیز عالی مرتبت خاندان کے فرد تھے اور عالم طفولیت کی منزلیں اونچے ماحول میں طے کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عادات واطوار اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے تھے۔ امرا کی محفلوں اور رؤسا کی مجلسوں سے انھیں شدید نفرت تھی۔ اس کے برعکس غربا ومساکین، یتامیٰ اور طلبائے علم سے محبت والفت کا برتاؤ کرتے تھے۔ بیماروں کی عیادت، بیواؤں کی امداد، مہمانوں کی تواضع اور مسافروں کی خاطر داری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر شخص سے خوش ہو کر ملتے اور عجز وانکسار سے پیش آتے۔ عالمانہ غرور ان میں بالکل نہ تھا۔ نخوت وتکبر سے نفور تھے۔ بچپن سے لے کر آخر عمر تک نہایت صاف ستھری زندگی بسر کی۔ تواضع، خلوص اور ہمدردی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ تقویٰ وللّٰہیت کا پیکر حسیں تھے اور ان کی حیات مستعار کا ہر پہلو قابل رشک تھا۔ دین اسلام کو پھیلانے اور احکام شرعیہ کو عام کرنے کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں وہ لائق صد احترام ہیں۔ ان کی جدوجہد سے دہلی کو مرکز دین کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، مسجدیں نمازیوں سے بھر جاتی تھیں، دہلی کی جامع مسجد بڑی وسیع مسجد ہے لیکن نمازیوں کی کثرت سے اپنی وسعت کے باوجود تنگ معلوم ہوتی تھی۔ رمضان المبارک میں بالخصوص مسجدوں میں بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔

شاہ صاحب کے زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم پر زیادہ زور دیتے تھے اور دیگر علوم وفنون کی تحصیل کو غیر مستحسن قرار دیتے تھے، لیکن شاہ صاحب نے کچھ ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ لوگ دیگر فنون بھی حاصل کرنے لگے۔ ان فنون سے دلچسپی رکھنے والے لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں آتے تو وہ انھیں خود پڑھاتے اور اس انداز سے پڑھاتے کہ ان فنون سے طلبا کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوتا۔

حاضر جوابی:

شاہ صاحب خشک عالم نہ تھے۔ یبوست اور عبوست جو عام طور پر علمائے دین میں پائی جاتی ہے، ان میں بالکل نہ تھی۔ وہ حاضر جواب اور زندہ دل عالم تھے۔ غیر مذاہب کے اہل علم سے مناظرے بھی کرتے اور ہلکے پھلکے انداز میں جس میں لطیفے کا پہلو بھی ہوتا، حریف کو خاموش کرا دیتے ____ عیسائیوں سے ان کی بالخصوص بحثیں رہتیں۔ ہندوستان میں عیسائی پادریوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ عہد اکبری میں شروع ہوا تھا ____ دور اکبری کے مشہور مناظروں میں مولانا سعد اللہ خاں، مولانا عبداللہ اور شیخ قطب الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد مناظرات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں اس میں اور تیزی آگئی تھی، اس لیے کہ اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت تقریباً پورے ملک میں قائم ہوگئی تھی اور انگریز اپنے ساتھ عیسائی پادریوں کو بھی لائے تھے تاکہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو دائرۂ

عیسائیت میں شامل کرنے کی مہم شروع کی جائے۔ شاہ صاحب اس صورت حال سے پوری طرح باخبر تھے اور عیسائیوں کا باقاعدہ مقابلہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کا عیسائیوں سے پہلا مناظرہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی جامع مسجد میں ہوا۔ وہ قرآن مجید کا درس دے رہے تھے کہ دوران درس میں ایک پادری نے ان سے کہا کہ آگے بڑھنے سے پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا' آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ پادری نے کہا آپ کے پیغمبر زمین میں دفن کیے گئے ہیں اور ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰ کو خدا نے آسمان پر جگہ دی' لہٰذا ہمارے پیغمبر کا مرتبہ آپ کے پیغمبر سے بڑا ہے۔ شاہ صاحب نے اس اعتراض اور سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کو فارسی کے ان دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے:

کسے بگفت کہ عیسیٰ زمصطفےٰ اعلیٰ است کہ ایں بہ زیر زمیں دفن او بہ اوج سما است

بہ گفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد حباب برسر دریا گہر تہہ دریا است ❶

یعنی ایک شخص نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے اونچا مرتبہ رکھتے ہیں' اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ تہہ زمین مدفون ہیں اور حضرت عیسیٰ آسمان کی بلندیوں پر ہیں۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ دلیل قوی نہیں ہے' جھاگ ہمیشہ دریا کے اوپر ہوتا ہے اور موتی دریا کی تہہ میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور پادری ان کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ کیا ''آپ کے پیغمبر اللہ کے حبیب ہیں؟'' فرمایا ''ہاں۔!'' وہ بولا ''تو پھر انھوں نے حضرت حسین کے قتل کے وقت اللہ سے فریاد نہ کی یا ان کی اللہ کے حضور فریاد سنی نہ گئی؟'' شاہ صاحب نے جواب دیا۔'' ہمارے نبی نے فریاد تو کی' لیکن اللہ طرف سے انھیں جواب ملا کہ تمھارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے' لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے۔'' یہ جواب سن کر پادری خاموش ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کے پاس کسی مصور کی بنائی ہوئی ایک تصویر لایا اور کہا کہ ''یہ تصویر جناب رسالت مآب ﷺ کی ہے۔'' انھوں نے کہا۔ ''حضرت رسول اکرم باقاعدہ غسل کرتے تھے' تم بھی اس تصویر کو غسل دے کر دھو ڈالو۔''

ایک دفعہ ایک ہندو گاڑی بان شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' اور کہنے لگا ''مجھے یہ بتائیے کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟'' آپ نے فرمایا' جو میں جواب دوں اسے خوب سمجھ لینا' وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہندو ہوتا تو گؤ ہتیا کبھی نہ ہوتی۔''

ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ ''کسبی عورتوں کی نماز جنازہ پڑھنی درست ہے یا نہیں؟'' آپ نے فرمایا ''ان کے آشنا مردان کی نماز جنازہ پڑھ لیا کریں۔''

❶ ذکیوں کا جال' ص ۱۳۷۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد اور شاہ صاحب کا خاندان دہلی کے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ میر درد کے ہاں محفل گرم تھی۔ شاہ صاحب بھی وہیں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ خواجہ صاحب کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اس لیے سب کے سامنے حاضر تھیں' باوجود یکہ شاہ صاحب اس وقت بچے تھے مگر ان کا تبسم اور طرز نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے؟ خواجہ صاحب خاموش رہے [1]۔

غرض شاہ صاحب بہت حاضر جواب' زندہ دل اور عمدہ خصال عالم تھے۔ ہر قسم کے لوگ ان کی خدمت میں آتے اور محظوظ ہوتے۔

انگریزوں کے خلاف فتویٰ:

شاہ صاحب کا زمانہ سیاسی اعتبار سے نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ مغل حکومت دم توڑ رہی تھی اور انگریز پورے ملک پر قبضہ جما رہے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب نے ایک طرف تو درس وتدریس کے ذریعے شاہ اسماعیل شہید' مولانا عبدالحی بڑھانوی اور سید احمد شہید جیسے نامور مجاہد پیدا کیے جنھوں نے اپنی زندگیاں برصغیر سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ دوسری طرف تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو نہایت مضبوط اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس سے لوگ ہر دور میں مستفید ہوتے رہیں گے۔ تحریر کے اس عظیم الشان ذخیرے میں ایک فتویٰ بھی ہے جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری کیا۔ اس فتوے کے الفاظ یہ ہیں:۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری است' ومراد از اجراء احکام کفر ایں ست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و باج وعشور' اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق وسراق وفیصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ وعیدین واذان وذبح بقر تعرض نہ کنند نہ کردہ باشند' لیکن اصل الاصول ایں چیز با نزد ایشاں ہباد ہدار است زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر ونواح آں نمی تواند آمد برائے منفعت خود واردین ومسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند' اعیان دیگر مثل شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد' واز یں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ وراست مثل حیدر آباد' لکھنو ورام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحہ واطاعت مالکان آں ملک [2]۔

(یہاں عیسائی افسروں کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے۔ ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا

---

[1] آب حیات ص ۱۴۶

[2] فتاویٰ عزیزی ا ص ۳۰' ۳۱

مطلب یہ ہے کہ ملک داری' انتظامات رعیت' خراج' باج' عشر و مال گزاری' اموال تجارت' ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات' مقدمات کے فیصلے اور جرائم کی سزاؤں وغیرہ میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہیں۔ اگرچہ یہ نماز جمعہ' عیدین' اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے احکام میں رکاوٹ نہیں ڈالتے' لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے' وہ یہاں بالکل بے حقیقت اور پامال ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہ (عیسائی حکمران) بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں' عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے' یہاں تک کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کی اجازت کے بغیر اس شہر (دہلی) یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آ سکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی جو اجازت دی جاتی ہے وہ بھی ملکی مفاد یا شہری آزادی کی بنا پر نہیں' بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے مقابلے میں خاص خاص اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک کے شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتے تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں' ان کے فرماں رواؤں کے اطاعت قبول کر لینے کی وجہ سے براہ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ (باقی ہر حصہ ملک میں ان کے احکام چلتے ہیں)

اسی فتوے اور شاہ صاحب کی انگریز دشمنی کا نتیجہ تھا کہ مجاہدین کی ایک زبردست جماعت تیار ہوگئی جس نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا۔ جہاد کے لیے جو لوگ عملاً میدان میں نکلے وہ مولانا اسماعیل دہلوی' سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کرام تھے۔ ان حضرات کی مساعی جمیلہ نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ آزادیٔ برصغیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

انگریزی حکومت کی ملازمت کے بارے میں بھی شاہ عبدالعزیز سے فتویٰ طلب کیا گیا تھا' اس کا انھوں نے جو جواب دیا اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

نصاریٰ بلکہ کافروں کی ملازمت کئی قسم کی ہے۔ اس میں بعض ملازمتیں مباح' بعض مستحب' بعض حرام' بعض مکروہ اور بعض گناہ کبیرہ اور مفضی الی الکفر ہیں۔ اگر کافر کسی مسلمان کو نیک رسمیں پھیلانے اور اچھے کام انجام دینے کے لیے ملازم رکھے تو یہ ملازمت جائز ہے۔ مثلاً چوروں اور رہزنوں کو ختم کرنے' شریعت کے مطابق فتوے دینے کے لیے۔ پل اور سرائے وغیرہ بنانے کے لیے ملازم رکھے تو یہ ملازمت مستحب ہے' جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے خزانوں کا انتظام بہتر بنانے کی ملازمت کی اور عدل و انصاف کا دائرہ وسیع کرنے کی درخواست کی یا حضرت موسیٰ کی والدہ نے اپنے بیٹے موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے (فرعون کی) ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اگر بری رسمیں اور غلط چیزیں ملازمت میں نظر آئیں۔ مثلاً سپہ گری' خدمت گاری اور منشی گیری میں قلم سے کافر اور نصاریٰ کی امداد کرنی پڑے یا تعظیم و تکریم کے لیے بار بار اٹھنے کی ذلت برداشت کرنا پڑے' یا مسلمانوں کو قتل اور ان کی ریاست کو درہم برہم کرنے یا کفر کو رواج دینے یا دین اسلام میں عیب نکالنے کا فریضہ انجام دینا پڑے تو یہ ایسا گناہ کبیرہ ہے جو کفر کی سرحد کے قریب لے جاتا ہے[1]۔

● ملفوظات شاہ عبدالعزیز (مقدمہ) ص ۲۵ بحوالہ فتاویٰ عزیزیہ ج ۲ ص ۱۱۹

شاہ عبدالعزیز نہایت دور رس نگار رکھتے تھے اور حالات کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے زمانے میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تقریباً تمام ہندوستان میں قائم ہو چکی تھی۔ ان کو اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ انگریز اس ملک پر چھا جائیں گے اور ان کی زبان' تہذیب اور ثقافت یہاں آ کر رہے گی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب دہلی کالج قائم کیا اور لوگ اس میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق تامل کرنے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں کے شبہات کو دور کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا❶۔

اذیت و مصیبت:

شاہ صاحب کو حق گوئی اور صاف بیانی کی وجہ سے شدید اذیتوں اور مصیبتوں میں بھی مبتلا کیا گیا۔ نجف خاں نے جو متعصب شیعہ اور مغل حکومت میں اچھا خاصا منصب دار تھا' شاہ صاحب کو ان کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اور تمام اہل و عیال کے ساتھ دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ شاہ صاحب اس زمانے میں بیمار تھے اور زیادہ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کی گئی اور پورے خاندان کو شہر بدر کر دیا گیا۔ شاہ صاحب اور شاہ رفیع الدین کے نام خاص طور سے احکام جاری کیے گئے کہ وہ پیدل اور ننگے پاؤں سفر کریں۔ سخت گرمی کے دن' چلچلاتی دھوپ' بیماری کا عالم' اس پر مزید ظلم یہ کہ دونوں بھائیوں کو پیدل اور برہنہ پا چلنے کا حکم۔! دہلی سے جون پور تک کی طویل مسافت انتہائی تکلیف اور صعوبت سے طے کی۔ راستے میں ایسی ایسی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ شاہ عبدالعزیز کی بینائی بھی جاتی رہی اور کئی قسم کی بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔

جلاوطنی کی مدت پوری کر کے دہلی واپس آئے تو شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا' عملاً ریذیڈنٹ کی حکومت تھی اور مغل بادشاہ اثر و اقتدار سے تقریباً محروم ہو گیا تھا۔ ملک کی اکثر ریاستیں انگریزی اقتدار کے سامنے جھک گئی تھیں اور ان کے حکمرانوں نے تملق اور چاپلوسی کو شعار بنا لیا تھا اور اسی کو اپنی بقا اور حفاظت کا اصل ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ شاہ صاحب اس صورت حال سے انتہائی پریشان اور آزردہ خاطر ہوئے اور فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہو گیا ہے' کیونکہ یہاں شعائر اسلام کی بے حرمتی کی جا رہی ہے اور عیسائی حکومت کے احکام جاری و نافذ ہیں۔ اس فتوے کا لوگوں پر یہ اثر پڑا کہ آگے چل کر انگریزی حکومت کے خلاف مستقل جہاد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جماعت مجاہدین نے وہ نمایاں کارنامے انجام دیے جو برصغیر کی تاریخ حریت کا ایک زریں باب بن گئے۔

تصنیفات:

شاہ صاحب متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں

---

❶ رود کوثر ص ۵۹۱

شامل ہیں:

۱- تفسیر فتح العزیز (معروف بہ تفسیر عزیزی) فارسی میں ہے اور سوا تین پاروں پر مشتمل ہے۔ سورہ فاتحہ سے پارہ دوم کے ربع تک اور پارہ ۲۹ اور ۳۰ کی تفسیر۔ یہ تفسیر شاہ صاحب کی آخر عمر کی تصنیف ہے جب کہ ان کی قوت بصارت باقی نہیں رہی تھی۔ اپنے ایک شاگرد کو بٹھا کر املا کراتے تھے۔ اپنی نوعیت کی یہ ایک منفرد تفسیر ہے۔

سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی (وھو فی مجلدات کبار) لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گئی اور پہلی اور آخری صرف دو جلدیں باقی رہ گئیں ❶۔

۲- بستان المحدثین: محدثین کے حالات و کوائف پر محیط ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے بعد اس موضوع سے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں، یہ ان سب کا ماخذ ہے۔

۳- سر الشھادتین: عربی میں ہے اور حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے حالات میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شاہ صاحب کے شاگرد اور مشہور عالم مولانا خرم علی بلہوری نے کیا اور ان کے دوسرے شاگرد مولانا سلامت اللہ کشفی نے ''تحریر الشھادتین'' کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

۴- فتاویٰ عزیزی: فارسی میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ مختلف عنوانات کے بہت سے فتووں کو اپنے دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

۵- عجالہ نافعہ: اصول حدیث پر فارسی میں یہ ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔

۶- عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس: خلفائے راشدین کے حالات میں یہ ایک محققانہ تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے۔

۷- شرح میزان المنطق: عربی میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو میزان المنطق کی شرح ہے۔

۸- حواشی بدیع المیزان: عربی میں ہے اور بدیع المیزان کی ایسی عمدہ شرح ہے کہ اس کے مطالعہ سے مسائل منطق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

۹- حواشی بر شرح عقائد: عربی میں ہے اور شرح عقائد کے مشکل مسائل اس کے مطالعہ سے آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔

۱۰- تحفہ اثنا عشریہ: فارسی میں ہے اور شاہ صاحب کی یہ بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ شیعہ کے رد میں ہے اور بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول شیعہ مذہب کے ابتدائی اور اس کے مختلف فرقوں کے آغاز کے بارے میں ہے۔ باب دوم میں جو ایک طویل باب ہے، ان حیلوں اور طریقوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، جن سے لوگوں کو غلط راہ پر لگایا جاتا اور اپنے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۷۳۔

کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ باب سوم میں اسلاف شیعہ اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں ابواب میں علی الترتیب الٰہیات، نبوت اور امامت سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ دسویں باب میں خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں، ان کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے اور ان کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ گیارھویں باب میں شیعہ فرقوں اور ان کے اطوار و خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری باب جو دراصل بارھواں باب ہے، تولی و تبری سے متعلق ہے۔

شیعہ سنی مباحث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے بھی دو کتابیں تصنیف کیں، ایک ''قرۃ العین فی تفصیل الشیخین'' اور دوسری ''ازالۃ الخفا'' ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے بعض رسائل میں بھی ان مسائل کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے جن میں شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز صاحب کی ''تحفہ اثنا عشریہ'' اس موضوع کے بارے میں ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۰۰ھ (نومبر ۱۷۸۵ء) کے بعد تصنیف کی۔ یہ اس قدر جامع اور مبسوط کتاب ہے کہ اسے شیعہ اور اہل سنت کے مسائل کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ اس کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صحیح اور مستند روایات بیان کی گئی ہیں جو شیعہ کتب میں مندرج ہیں یا جن پر شیعہ اور اہل سنت دونوں متفق ہیں۔ پیرایہ بیان معروضی اور سنجیدہ ہے۔

آغاز کتاب میں مصنف نام دار نے اس کی وجہ تصنیف بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے عہد اور بلاد و امصار میں، شیعیت نے اس قدر فروغ حاصل کر لیا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جس میں ایک یا دو آدمی اس مذہب کے حامی اور افکار شیعہ سے اثر پذیر نہ ہوں۔ اس کا اصل سبب صحیح مسائل سے عدم واقفیت ہے اور اسی سے ذہن و فکر میں غلط فہمیاں ابھرتی ہیں۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ عام پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور بحث و مناظرے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

یہ کتاب چونکہ بڑی جان دار اور معلومات افزا ہے اس لیے شیعہ حلقوں میں اس سے ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور متعدد نامور علمائے شیعہ نے اس کا جواب دینے اور اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کے شیعہ علما میں مولانا دلدار علی مجتہد اول ایک مشہور اور ممتاز عالم تھے۔ انھوں نے تحفہ اثنا عشریہ کے جواب اور تردید میں چھ کتابیں اور رسالے تحریر کیے۔ صوارم الالٰھیات، حسام الاسلام اور احیاء السنہ میں تحفہ اثنا عشریہ کے ان ابواب کا جواب دیا جو علی الترتیب الٰھیات، نبوت اور معاد و حجت سے متعلق ہیں۔ ایک رسالہ ذوالفقار کے نام سے لکھا، جو تحفہ اثنا عشریہ کے گیارھویں باب کے جواب میں ہے۔ صوارم الالٰھیات کے آخر میں اثبات امامت کا ذکر کیا ہے۔ ایک رسالہ غیبت ہے، جس میں شاہ صاحب کے ان اقوال و افکار کی تردید کی گئی ہے جو مسئلہ غیبت سے تعلق رکھتے ہیں۔

علامہ حکیم محمد کامل دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں ''نزھت اثنا عشریہ'' کے نام سے کتاب

لکھی اور پھر تمام عمر تقریروں اور مضمونوں کے ذریعے سے بھی اس کی تردید کرتے رہے۔

مفتی محمد قلی خاں معروف شیعہ عالم تھے اور مولانا دلدار علی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کافی عرصے تک میرٹھ میں مفتی عدالت کے منصب پر فائز رہے۔ بعد میں ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بقول شیخ محمد اکرام ''ان کا وظیفہ حیات تحفہ اثنا عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے❶۔

انھوں نے ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے آٹھویں باب کے جواب میں دو بڑی بڑی جلدوں میں ایک مبسوط و مفصل کتاب لکھی، جس کا نام ''تشیید المطاعن وکشف الظغائن'' ہے۔ علاوہ ازیں ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے جواب میں ''سیف ناصری'' تصنیف کی۔ پھر دوسرے باب کے رد میں ''تقلید المکاید'' اور ساتویں باب کے جواب میں ''برہان سعادت'' لکھی۔ گیارھویں باب کی تردید ''مصارع الافہام'' میں کی۔

مولانا دلدار علی لکھنوی کے بیٹے مولانا سید محمد لکھنوی نے بھی ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے رد میں کئی رسالے تحریر کیے۔

شیخ محمد اکرام نے ''رود کوثر'' میں ''آسودگان ڈھاکہ'' کے حوالے سے حکیم حبیب الرحمٰن کی یہ تحریر درج کی ہے کہ جب کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے ایک رئیس میر اشرف علی نے دس ہزار روپیہ اس کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا❷۔

میر اشرف علی فارسی کے مشہور شاعر سید محمد آزاد جہاں گیری اور اردو کے ممتاز ادیب نواب سید محمد کے پڑدادا تھے۔ لیکن حکیم حبیب الرحمان کے بیان کے مطابق ان دونوں صاحبان نے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا تھا❸۔

بہر حال تحفہ اثنا عشریہ اپنے دور کی ایک اہم تصنیف ہے اور اس زمانے میں اس قسم کی کتاب لکھنا بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ کتاب لکھ کر بہت بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ انجام دیا۔

شعر و شاعری:

شاہ عبدالعزیز صاحب عربی کے شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے عربی میں بہت سی نظمیں اور نعتیں کہیں۔ اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام عربی نظم میں ایک خط لکھا، جس میں اپنے زمانے کے سیاسی حالات اور مرہٹوں اور سکھوں کی جنگی چالوں اور ان کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی ہے۔ ایک عربی نظم دہلی کی تعریف میں ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ایک قصیدہ سوڈان کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔

❶ رود کوثر ص ۵۹۲۔

❷ ایضاً

❸ رود کوثر ص ۵۹۳۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی جامع الحیثیات شخص تھے۔ بہ یک وقت جلیل القدر عالم' رفیع المرتبت مفسر' نامور محدث' وسیع النظر فقیہ' خوش بیان مقرر' بہت بڑے مناظر' عظیم مصنف' منجھے ہوئے مدرس' صاحب طرز ادیب اور ممتاز شاعر تھے۔

مرض اور وفات:

شاہ صاحب کے مرض الموت کا آغاز بخار سے ہوا۔ پھر بخار بہت شدت اختیار کر گیا۔ جب حالت نازک ہوگئی تو اعزہ واقارب کو بلایا۔ اپنا سامان جمع کیا اور شریعت کے مطابق تقسیم کیا۔ پھر یہ آیت پڑھی:

وَاٰتِ ذَالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ - (بنی اسرائیل:۲۶)

(اور قرابت داروں اور محتاج اور مسافر کو اس کا حق دو)

پھر حاضرین کو وصیت کی کہ غسل پورے احترام سے دیا جائے' البتہ کفن کا وہی معمولی اور سادہ کپڑا ہونا چاہیے جو میں پہنتا ہوں۔ شہر سے دور جنگل میں جنازہ پڑھا جائے۔ سلطان وقت کو جنازے میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے۔ اس کے بعد اوراد و وظائف میں مصروف ہو گئے اور آخر وقت میں یہ آیت پڑھی:

توفنی مسلما و الحقنی بالصلحین۔ (یوسف:۱۰۱)

(اے اللہ) مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دینا اور نیک لوگوں سے مجھے ملانا۔)

اس کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ ۵۵ دفعہ جنازہ پڑھا گیا۔ ساٹھ سال درس حدیث دیا۔ ۷۹ سال عمر پائی۔ ۷ شوال ۱۲۳۹ھ (۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء) کو انتقال کیا۔ یک شنبہ کا دن تھا اور صبح کا وقت۔

بہت سے لوگوں نے تاریخ وفات کہی۔ مومن نے جنھوں نے اپنے اصلی نام "حبیب اللہ" سے نہیں' بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام "مومن خاں" سے شہرت پائی' اس شعر سے تاریخ نکالی۔

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں' فضل و ہنر' لطف و کرم' علم و عدل

حلیہ:

شاہ صاحب نہایت خوش مزاج اور عمدہ خصال بزرگ تھے۔ دراز قامت' لاغر اندام' گندم گوں' موٹی موٹی آنکھیں اور جسم صاف' لیکن بعض ایسی شدید بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں کہ بینائی جاتی رہی تھی۔ پچیس سالی کی عمر میں چودہ بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے' لیکن اس کے باوجود طلبا کو باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائیوں ـــــ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ـــــ کو بھی درس و تدریس پر مامور کر دیا تھا۔[1]

فتویٰ نویسی، وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف اور تدریس و تعلیم کا سلسلہ شدت مرض میں بھی جاری رہا اور زندگی کے آخری سانس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اولاد:

شاہ صاحب کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف تین بیٹیاں تھیں۔ ایک کی شادی حضرت شاہ رفیع الدین کے صاحب زادے مولانا محمد عیسیٰ سے ہوئی۔ دوسری شیخ محمد افضل کے عقد میں آئیں، جن سے شاہ محمد اسحاق دہلوی اور شاہ محمد یعقوب پیدا ہوئے۔ تیسری کا نکاح مولانا عبدالحی بڑھانوی سے ہوا، جن سے مولانا عبدالقیوم بھوپالی ظہور میں آئے [1]۔

۱۶- مولانا عبدالعزیز قریشی پرہیاروی

مولانا عبدالعزیز قریشی پرہیاروی کے والد کا نام احمد اور دادا کا حامد تھا۔ ابو عبدالرحمٰن کنیت تھی۔ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں خطہ پنجاب کے کبار علما میں سے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مقام ولادت کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے مقام ولادت کوٹ ادو قرار دیا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ درحقیقت افغانستان سے وارد پنجاب ہوئے تھے اور ولادت غزنی کے محلہ حکیم سنائی میں ہوئی تھی۔ اس میں بہر حال کوئی شبہ نہیں کہ کوٹ ادو (ضلع مظفر گڑھ) کے نواحی قصبہ پرہیاراں میں ان کی سکونت تھی اور وہیں ان کی کچی قبر ہے۔ یعنی مسکن اور مدفن ایک ہی قصبہ ہے۔

خواجہ نور محمد مہاروی ایک نامور بزرگ تھے اور ان کے خلیفہ حافظ جمال ملتانی تھے۔ مولانا عبدالعزیز پرہیاروی انہی حافظ جمال ملتانی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب متقی اور پارسا بزرگ تھے۔ مولانا عبدالعزیز کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کی وفات کے بعد فضائل رضیہ اور اسرار جمالیہ کے نام سے ان کے بارے میں دو رسالے لکھے۔ فضائل رضیہ اب نایاب ہے۔

[1] حالات کے لیے دیکھیے: اتحاف النبلا ص ۲۹۶، ۲۹۷۔ مقدمہ فتاویٰ عزیزی (فارسی) ص ۷ تا ۱۷۔ مقدمہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۸ تا ۳۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲۔ ابجد العلوم، ص ۹۱۴۔ حیات ولی ص ۵۸۶ تا ۶۲۸۔ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۴۹۔ تا ۶۲۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲ ص ۵۸۶ تا ۵۸۸۔ آثار الصنادید، ص ۲۴۸ تا ۲۵۱۔ تراجم الفضلا، ص ۱۵ تا ۱۷۔ رود کوثر ص ۵۸۷ تا ۵۹۵۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۲ ص ۳۸ تا ۷۴ و ۷۹ تا ۸۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۷۰۔ الیانع الجنی، ص ۷۳ تا ۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۶۸ تا ۲۷۶۔ مفتاح التواریخ ۳۸۱، ۳۸۲۔ تذکرہ کاملان رام پور، ص ۲۰۳ تا ۲۱۲۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۴۵ تا ۲۴۷۔ تاریخی مقالات، ص ۲۴۲ تا ۲۴۵۔

مولانا عبدالعزیز جلیل القدر عالم دین تھے۔ علوم معقول و منقول میں گہری نگاہ تھی۔ مصنف بھی تھے اور اہم علمی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ہمیشہ مطالعہ کتب میں مشغول رہتے۔ یہی ان کا دن رات کا کام تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کس عالم کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ کس استاد سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کن کن مدارس میں پڑھیں معلوم ہوتا ہے اس زمانے کے بعض علما بھی جو ان سے حسد کرتے تھے' برملا کہتے تھے کہ انھوں نے علم کہاں حاصل کیا اور کس سے حاصل کیا؟ مولانا نے اس اعتراض یا سوال کا جواب اشعار میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا علم وہبی اور اشراقی ہے' اکتسابی نہیں۔ اس ضمن میں ان کے چند فارسی شعر ''ایمان کامل'' (ص ۲۴) سے ملاحظہ ہوں۔

احمقا نے چند بے عقل و خرد عیب می گیر ند برمن از حسد
ایں نمی دانند ایں قوم حسود کایں حسد برفضل ربانی چہ سود
علم ایشاں نظری و کسبی بود علم ما اشراقی و دہبی بود
نسبتے بامن ندارند ایں خساں برزمین اندومنم برآسمان

یعنی چند بے عقل لوگ بربنائے حسد میری عیب جوئی کرتے ہیں۔ یہ حاسد نہیں جانتے کہ اللہ کے فضل کے مقابلے میں ان کا حسد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا علم نظری اور اکتسابی ہے' لیکن میرا علم اشراقی اور وہبی ہے۔ یہ ذلیل لوگ مجھ سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ یہ زمین پر ہیں اور میں آسمان پر ہوں۔ یعنی یہ مجھ سے حقیر اور پست درجے کے ہیں اور میرا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

مولانا عبدالعزیز بہت اچھے طبیب بھی تھے اور حاکم ملتان نواب مظفر خاں نے ان کو اپنا خاص طبیب مقرر کیا تھا۔ فن طب میں انھوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

بلند اخلاق اور عمدہ خصال تھے۔ اتباع سنت میں بہت سخت تھے' اس میں کسی کی ملامت یا طعن و تشنیع کی کوئی پروانہ کرتے۔

زہد و عبادت میں یگانہ تھے۔ متوکل علی اللہ اور راضی برضائے الٰہی تھے۔ حدیث رسول ﷺ ہی کو ہدف عمل ٹھہراتے اور اس کے مقابلے میں کسی امام کے قول کو اہمیت نہ دیتے۔ بہت بڑے واعظ اور مبلغ دین تھے۔ امرا و حکام کے دروازے پر جانے سے نفرت تھی۔ اس قدر خوددار اور عالی نفس تھے کہ نہ دولت مند لوگوں سے ملتے' نہ کسی سے نذر و نیاز قبول کرتے اور نہ کوئی چیز لیتے۔ ہر معاملے میں اللہ پر بھروسا رکھتے۔ تقلید کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

ان کی ایک تصنیف ''الاکسیر'' ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ ایک عالم شمس الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے' وہ اس کے دفتر ثالث کے صفحہ ۲۳۷ پر لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالعزیز نے ہر مسئلے میں پابندیٔ شریعت کو ملحوظ رکھا اور بتایا کہ یہ مسئلہ شریعت محمدیؐ کے خلاف ہے اور یہ موافق۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں مسئلے میں شریعت نے سکوت اختیار کیا ہے۔

ان کی کتاب ''الیاقوت'' تقلید کے رد میں ہے اور عربی میں ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''قصہ کوتاہ کسی مسلمان کے لیے اللہ کے حکم کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی اتباع سے سرتابی کی قطعاً گنجائش نہیں۔ یقین کو چھوڑ کر شک کے در پے نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر ہمیں کوئی ملامت کرتا ہے تو بے شک کرتا رہے۔ ہمیں بہر حال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنی چاہیے۔''

ماہ نامہ ''اسرار حکمت'' علم طب سے متعلق ایک رسالہ ہے۔ اس کے اگست ۱۹۶۴ء کے شمارے میں جناب محمد حسین صاحب کا مولانا کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''بے باکی اور صاف گوئی آپ کی فطرت تھی۔ حضرت حافظ جمال ملتانی آپ کی نسبت کہا کرتے تھے کہ یہ نوجوان کس قدر ذہین اور فصیح اللسان ہے، میں اپنے زمانے میں کسی کو اس کا مثل نہیں پاتا۔ لیکن اس کی جرات اور بے باکی سے مجھے یہ خوف ہے کہ یہ چیز اس کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔''

نہایت ذکی، ذہین اور نکتہ رس تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو ''مناقب المحبوبین'' میں درج ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ میں اور حضرت حافظ جمال ملتانی اکٹھے کشتی میں سوار تھے۔ ملاح نے گہرائی معلوم کرنے کے لیے اپنا لمبا بانس دریا میں ڈالا۔ دریا بہت گہرا تھا۔ ملاح کی زبان سے حیرت میں لفظ ''اللہ'' نکلا۔ حافظ صاحب نے میری طرف دیکھا اور فرمایا، اس کا مطلب سمجھے؟ میں نے عرض کیا، جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی گہرائی کی پیمائش عقل کا کوئی پیمانہ نہیں کرسکتا۔ فرمایا، ہاں، صحیح ہے۔''

مولانا عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ''وہ حضرت حافظ جمال ملتانی کے خطوط لکھا کرتے تھے، لیکن ان کا خط پیچیدہ اور شکستہ تھا۔ حافظ صاحب انھیں صاف اور واضح لکھنے کی تلقین کرتے، اور فرماتے کہ کاتب کو یہی گناہ ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے کہ پڑھنے والا اس کے مشکل مکتوب کے پڑھنے کی تکلیف سے دوچار ہو، یعنی اس کی بدخطی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس کرے اور کسی عبارت کو کچھ کا کچھ پڑھ جائے۔

مولانا عبدالعزیز جہاں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے، وہاں بہت اچھے شاعر اور طبیب بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- الصمصام: رد تاویل میں ہے اور تفسیر اور اس کے متعلقات کے بارے میں عربی زبان میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے شائع کی۔

۲- البحر المحیط: اس کا تعلق بھی تفسیر اور متعلقات تفسیر سے ہے۔ یہ بھی عربی میں ہے۔

۳- اللبیل: اس کا موضوع بھی یہی ہے اور عربی میں ہے۔

۴- وحی مقدس: یہ بھی تفسیر سے متعلق ہے۔ ''الاکسیر'' کے مترجم شمس الدین لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے مطالعہ سے گزری ہے۔ قلمی ہے۔

۵- کوثر النبی: مصطلحات حدیث سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ مکتبہ قاسمیہ چوک فوارہ ملتان نے شائع کی۔

۶- رسالہ فی اثبات رفع السبابۃ: عربی نظم میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں از روئے حدیث تشہد میں انگشت شہادت اٹھانے کا ثبوت دیا گیا ہے۔

۷- النبراس فی شرح العقائد: عربی میں ہے ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں تصنیف ہوئی۔

۸- سدرۃ المنتہیٰ: فارسی زبان میں ہے۔

۹- مرام الکلام فی عقائد الاسلام: عقائد اسلام سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے شائع کی۔ اس کا قلمی نسخہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور میں محفوظ ہے۔

۱۰- ایمان کامل: فارسی نظم میں ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان کی طرف سے شائع ہوئی۔

۱۱- الناھیہ عن ذم معاویہ: یہ ایک مطبوعہ رسالہ ہے جو شیعہ کے رد میں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت میں ہے۔ اس میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دیا گیا ہے جو شیعہ حضرات، رسول اللہ ﷺ کے نامور صحابی اور کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر وارد کرتے ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی (جہانیاں منڈی) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۲- الحاشیۃ العزیزیہ: منطق کے مشہور رسالے ''ایساغوجی'' پر حاشیہ۔ اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی کے پاس جہانیاں منڈی میں محفوظ ہے۔

۱۳- الاکسیر: یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ طب سے متعلق ہے۔

۱۴- زمرد اخضر: طب سے متعلق ہے۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں تصنیف کی۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۵- العنبر الاشہب: عربی میں ہے اور علم طب کے بارے میں ہے۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۶- یاقوت احمر: یہ بھی طب کے موضوع پر ہے۔ شیخ الٰہی بخش جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کی۔

۱۷- فرہنگ مصطلحات طبیہ: فارسی میں ہے اور علم طب کے بارے میں ہے۔

۱۸- الیاقوت: یہ رسالہ رد تقلید میں ہے اور عربی میں ہے۔

۱۹- تریاق: طب کے موضوع پر ہے۔ لائبریری تونسہ میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

۲۰- العتیق:

۲۱- صراط المستقیم: دینیات سے متعلق۔

۲۲- لوح محفوظ: دینی معاملات میں۔

۲۳- ستر المعاد: دینی مسائل و معاملات سے متعلق۔

۲۴- تکمیل العرفان:

۲۵- صلوٰۃ المسافر: مسافر کی نماز سے متعلق

۲۶- منتھی الکمال: دینی مسائل سے متعلق۔ قلمی نسخہ اسد نظامی کے پاس محفوظ ہے۔

۲۷- مخزن العوارف: تصوف کے بارے میں۔

۲۸- حاشیہ مسلم الثبوت: اصول فقہ کی کتاب مسلم الثبوت پر حاشیہ۔ اس کا قلمی نسخہ اسد نظامی (جہانیاں منڈی) کے پاس موجود ہے۔

۲۹- مسائل السماع: اس کا قلمی نسخہ بھی جناب اسد نظامی کے پاس محفوظ ہے۔

۳۰- سر مکتوم: عملیات اور تعویذات وغیرہ سے متعلق۔

۳۱- نہایت الاعمال: یہ بھی عملیات کے بارے میں ہے۔

۳۲- رسالہ الجفر الجامع: عملیات سے متعلق

۳۳- الدر المکنون: عملیات سے متعلق۔

۳۴- زیج: عملیات سے متعلق ہے اور ''الاکسیر'' کے مترجم شمس الدین کے مطالعہ میں رہی ہے۔

۳۵- کسوف: طبیعیات کے بارے میں۔

۳۶- خسوف: طبیعیات کے بارے میں۔

۳۷- الیواقیت فی علم المواقیت: طبیعیات کے بارے میں۔

۳۸- حاشیہ شرح جامی: علم نحو کی انتہائی کتاب شرح جامی پر حاشیہ۔ اس کا قلمی نسخہ جناب اسد نظامی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

۳۹- نعم الوجیز:

۴۰- فضائل رضیہ:

۴۱- سر السماء۔

۴۲- اسرار جمالیہ۔ اس کا ترجمہ گلزار جمالیہ کے نام سے ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

۴۳- مزناب۔

۴۴- المرفوعات۔

۴۵- معجون الجواہر۔

۴۶- النبطاسیا:

۴۷- جامع العلوم الناموسیہ والعقلیہ۔

۴۸- مولانا عبدالعزیز پرہیاروی کے چند اوراق جن پر ان کے دستخط ثبت ہیں' محمد شفیع (ڈیرہ غازی خاں) کے پاس محفوظ ہیں۔

ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی چھوٹے بڑے رسائل تحریر فرمائے۔ ان کتب و رسائل میں سے کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ کچھ اصحاب علم کے پاس محفوظ ہیں اور بعض دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

مولانا عبدالعزیز پرہیاروی اپنے عہد اور علاقے کے بہت بڑے عالم وفقیہ اور مقرر ومصنف تھے۔ افسوس ہے' انھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ صرف (۳۳) تینتیس سال کی عمر میں ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء کو انتقال کر گئے۔ پرہیاراں (ضلع مظفر گڑھ) میں مدفون ہیں ❶۔

۱۷- مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی

مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے۔ ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء کو نگرام میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں مضافاتِ لکھنؤ میں ایک قصبہ تھا۔ اس قصبے کو علمی لحاظ سے ہمیشہ اہمیت حاصل رہی اور بڑے بڑے علما یہاں پیدا ہوئے' جنھوں نے برصغیر میں بہت شہرت پائی۔

حافظ عبدالعلی نگرامی نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے ماموں مولانا حافظ علیم اللہ نگرامی سے پڑھیں۔ بعد ازاں لکھنؤ گئے' جو اس دور میں مرکز علم وعلما تھا۔ وہاں سید انور علی مراد آبادی' مولانا اوحدالدین بلگرامی' مولانا عبدالحکیم لکھنوی اور بعض دیگر علمائے کرام سے استفادہ کیا۔ قاضی عبدالکریم نگرامی سے اخذ طریقت کیا۔ پھر ان کے خلیفہ شاہ گزار علی کشتوی سے تلقین واجازۃ سے مشرف ہوئے۔

صاحب ترجمہ مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی متعدد کتابوں کے مصنف تھے' جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱- تفسیر آیات الاحکام: ایک جلد میں۔

۲- رد المبتدعین: بدعات اور اصحاب بدعت کے رد میں۔

۳- تحقیق الامور فی حدوث الفاتحۃ والنذور: فاتحہ اور نذر وغیرہ کے سلسلے میں ہے۔ اس کتاب میں مروجہ فاتحہ اور نذر ونیاز کو بدعات ومحدثات میں قرار دیا گیا ہے۔

۴- التحریر فی حرمۃ المزامیر: مزامیر کی حرمت میں۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۷۶ تا ۲۷۸۔ ماہنامہ اسرار حکمت لاہور اگست ۱۹۶۴ء۔ "المعارف" بات ماہ جون ۱۹۸۳ء مضمون پروفیسر جعفر بلوچ گورنمنٹ کالج لاہور۔ ہفت روزہ "الھام" بہاول پور' اگست ۱۹۷۶ء مضمون جناب اسد نظامی۔

۵- السکین المسلول علی من انکرکون مسح الرقبة من سنت الرسول۔

۶- التحقیق فی المولد والقیام: عربی میں ہے۔

۷- نورالایمان فی تائید مذهب النعمان: امام ابوحنیفہ کے فقہی نقطہ نظر کی تائید میں۔

۸- الیواقیمت اللطیفه فی تائید مذهب ابی حنیفه: یہ بھی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے فقہی مسائل کی تائید میں۔

۹- ایک رسالہ حفاظ شیعہ کے بارے میں۔

۱۰- هدایة الانام الی خرقة المشائخ العظام: تصوف اور صوفیا کے سلسلے میں۔

۱۱- رسالہ تقریر حق:

۱۲- رسالہ مولد شریف:

مولانا عبدالعلی نگرامی منکسر المزاج، عالم و فقیہ تھے۔ بدھ کے روز ۲۸ شوال ۱۲۹۶ھ/ ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو اپنے وطن نگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

۱۸- مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل کی تاریخ علم و عمل، تصنیف و تدریس اور فضل و کمال کے اعتبار سے بڑی شہرت کی حامل ہے۔ اس خانوادہ بلند مرتبت نے جو خدمات بوقلموں انجام دیں، ان کا دائرہ فقط برصغیر تک محدود نہیں رہا، عالم عرب کے شائقین علم بھی ان سے مستفید ہوئے۔ اس خاندان کی شہرت علمی کا آغاز بارھویں صدی ہجری کے عشرۂ اول سے ہوا، جب کہ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) میں اس کے رکن اعظم ملا قطب الدین سہالوی نے جام شہادت نوش کیا۔ وہ لکھنؤ کے نواح میں ایک قصبے ''سہالی'' کے رہنے والے تھے اور وہاں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ عثمانی خاندان کے لوگوں نے زمین کے جھگڑے کی بنا پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا اور وہ ''قطب الدین شہید سہالوی'' کے نام سے مشہور ہوئے ❷۔ اس وقت سے لے کر آج تک تین سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس خاندان کے نقوش فضل و عرفان نمایاں ہیں اور لوگوں کے فکر و عمل کی گہرائیوں میں مرتسم ہیں۔ علمائے فرنگی محل کے متعدد حضرات کا تذکرہ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں کیا گیا ہے، اور اس جلد میں بھی مرقوم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علمی و تدریسی لحاظ سے جو عمر دراز اس خاندان نے پائی، برصغیر کے کسی خاندان کو نصیب نہ ہوئی۔ صاحب ترجمہ مولانا عبدالعلی اسی خاندان کے فرد فرید اور دنیائے تحقیق کے جوہر قابل تھے۔ باپ کا اسم گرامی مولانا نظام الدین ❸ اور جد امجد کا قطب الدین شہید تھا۔

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۷۸، ۲۷۹۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے ''فقہائے ہند'' ج ۵

❸ مولانا نظام الدین فرنگی محلی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند، ج ۷

مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کے عالم کبیر، علامہ دوراں اور شیخ و امام تھے۔ اپنے عصر میں انھیں بجا طور پر بحر العلوم اور ملک العلما کے القاب سے ملقب کیا گیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، لغت و ادب، معانی و بیان، مناظرہ و کلام، غرض جملہ علوم و فنون پر عبور و استحضار میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

ولادت اور تعلیم و تربیت:

یہاں یہ واقعہ قابل تذکرہ ہے کہ مولانا نظام الدین کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ لوگ دوسری شادی کے لیے کہتے تھے لیکن مولانا اس پر رضا مند نہ تھے، اور فرماتے تھے کہ میں اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب سب نے مجبور کیا اور شادی کے لیے مصر ہوئے تو فرمایا میں ذاتی طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہوں، البتہ کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوراً یہ کام کرنا پڑے گا۔ مولانا ممدوح نے شیخ اسماعیل بلگرامی (متوفی ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ/ ۱۱ نومبر ۱۸۴۸ء) سے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے القا کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمھارے اولاد ہوگی۔ چنانچہ آخر عمر میں قصبہ سترکھ میں دوسری شادی کی جس سے وہ درِ تاب دار پیدا ہوا، جس کے علم و فضل کی روشنی سے پورا ہندوستان چمک اٹھا اور جو بحر العلوم کے پرشکوہ لقب سے مشہور ہوا۔ ذیل کی سطور میں اسی عالم اجل کا علمی تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

مولانا عبدالعلی ۱۱۴۳ھ کے آخر یا ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کے آغاز میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے [1]۔ تمام درسی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا نظام الدین سے پڑھیں۔ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اسی زمانے میں والد نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کر دی۔ اس سے چھ ماہ بعد والد مکرم وفات پا گئے۔ لیکن والد کی وفات کے بعد بھی لائق بیٹے نے حصول علم و فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب وہ اپنے والد کے تلمیذ خاص اور اس دور کے جلیل القدر فاضل مولانا کمال الدین فتح پوری کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔

ذہانت و فطانت:

مولانا عبدالعلی آغاز عمر ہی میں بحث و مناظرے کے عادی تھے اور اس میں اس درجے تیز تھے کہ زبان کو حرکت دیتے وقت کسی کی پروانہ کرتے اور بڑے بڑوں کے مقابلے میں اتر آتے۔ یہاں تک کہ اپنے استاد مکرم مولانا کمال الدین فتح پوری سے بھی سلسلہ بحث جاری رکھتے۔ لوگ مولانا کمال الدین سے کہتے کہ یہ

---

[1] ان کا سال ولادت کہیں صراحت سے مرقوم نہیں۔ ان کے والد مولانا نظام الدین کی وفات ۹ جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ/ ۱۶ مئی ۱۷۴۵ء کو ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ساڑھے سترہ سال کی تھی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۱۴۳ھ کا آخر یا ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء کا آغاز بنتا ہے۔

لڑکا گفتگو میں حد ادب کو پھلانگ جاتا ہے' اسے روکنا اور سمجھانا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ استاد اور اہل علم سے مخاطب ہونے کا یہ طریقہ نہیں جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ مولانا جواب دیتے کہ ایک تو یہ استاد زادہ ہے' دوسرے ذہانت و فطانت سے بہرہ مند ہے اور تیسری خوبی اس میں یہ ہے کہ اوائل عمر ہی میں مروجہ علوم درسیہ میں اس نے مہارت حاصل کر لی ہے۔ لہٰذا اگر یہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا اور اسلوب کلام میں حدود ادب سے باہر قدم رکھ لیتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں' اس سے استاد کی اہانت نہیں ہوتی بلکہ اس نوجوان کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے اور میرے لیے یہ عین باعث مسرت ہے۔ یہ اگرچہ کم عمر ہے مگر اس میں تحقیق و کاوش کے وہی جوہر پائے جاتے ہیں جو علامہ صدر الدین شیرازی اور محقق جلال الدین دوانی کے حصے میں آئے تھے۔ جو شخص عالم شباب ہی میں' خالص علمی اور فنی مباحث میں اپنے دور کے اکابر علما اور نامور اساتذہ سے مناظرہ و مجادلہ کر سکتا ہو' وہ آگے چل کر بلاشبہ اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ مولانا عبدالعلی نے دنیائے علم میں امامت کا درجہ حاصل کیا اور مشکل ترین مسائل کی عقدہ کشائی میں سب سے بازی لے گئے۔

مسند تدریس اور لکھنؤ کی ترک سکونت:

حصول علم سے فراغت کے بعد باپ کی مسند تدریس سنبھالی اور باقاعدگی و انہاک سے طلبا کو درس دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت علمی دور دور تک پہنچ گئی اور تشنگانِ علوم کا بہت بڑا ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا۔ مدت تک لکھنؤ کے مدرسہ فرنگی محل میں خدمت درس انجام دیتے رہے اور اس اثنا میں بہت سے اہل علم نے ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد ایک ایسا بڑا ناگوار سانحہ پیش آیا کہ اپنے آبائی مدرسے اور شہر کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے اور پھر حالات ایسی کروٹ بدلتے رہے کہ زندگی بھر ادھر کا رخ نہ کر سکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شیعہ بزرگ سید نور الحسن بلگرامی لکھنؤ آئے۔ وہ بیمار تھے اور مولانا محب اللہ لکھنوی کے ہاں فرنگی محل میں مقیم تھے۔ محرم کا مہینا آیا تو شدت مرض کی وجہ سے تعزیے کی زیارت کو نہ جا سکے اور پیغام بھجوا دیا کہ تعزیہ ان کی قیام گاہ کی طرف سے لے جایا جائے تاکہ وہ وہیں سے زیارت کر سکیں۔ مولانا عبدالعلی کا مدرسہ اسی راستے میں پڑتا تھا' جس سے تعزیے کا جلوس گزرنا تھا۔ جب تعزیہ آیا مولانا تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ انھیں اصل واقعہ کا علم نہ تھا' وہ سمجھے کہ یہ لوگ راستہ بھول گئے ہیں۔ چونکہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اس لیے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ تعزیہ بردار لوگوں کو پیچھے ہٹا دیں اور صحیح راستہ بتا دیں۔ وہ سمجھے کہ مولانا نے تعزیہ توڑنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور تعزیہ توڑ ڈالا۔ یہ نوابانِ اودھ کا زمانہ تھا جو شیعہ تھے اور ان کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت کا زور تھا۔ نواب شجاع الدولہ برسر حکومت تھا۔ شہر میں شور مچ گیا کہ مولانا عبدالعلی باغی ہو گئے ہیں اور تعزیہ توڑ کر شیعہ مذہب اور اس کے ماننے والوں کی توہین کی ہے۔ قاضی غلام مصطفےٰ جو شیعان لکھنؤ میں بہت اثر و رسوخ کے مالک تھے' مولانا کی مخالفت

میں خاص طور پر آ گئے تھے۔ وہ ایک بڑے ہجوم کے ساتھ مولانا کے گھر پر حملہ آور ہوئے۔ مولانا بھی بہت دلیر اور تیز تھے، انھوں نے اپنے شاگردوں اور ارادت مندوں کو جمع کیا اور مقابلے پر اتر آئے۔ جب شیعہ حضرات نے دیکھا کہ وہ مولانا سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو صلح کی درخواست کی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن یہ صلح بربنائے مصلحت تھی۔ اس کے بعد شیعہ حضرات نے قاضی غلام مصطفیٰ کی انگیخت پر مولانا کو دھوکے سے قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے چچازاد بھائیوں اور دیگر اہل خاندان سے مشورہ کیا۔

اب معاملہ انتہائی نازک اور سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایک طرف مولانا کے شاگرد اور اصحاب عقیدت تھے جو مصر تھے کہ وہ اپنے والد مکرم مولانا نظام الدین کے مدرسے ہی میں رہیں۔ لکھنؤ سے باہر نہ نکلیں۔ اگر کسی موقعے پر حالات نے خطرناک رخ اختیار کیا تو مقابلہ کیا جائے گا۔ دوسری جانب مولانا کے اعزہ و اقارب تھے جو ان کے علمی عروج اور شہرت سے خوش نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا یہاں سے چلے جائیں اور کسی دوسری جگہ اپنا ٹھکانا بنالیں۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ یہاں کی شیعہ حکومت بھی ان کی مخالف ہے اور شیعہ عوام بھی۔! ان دو طاقتوں کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اگر وہ یہاں رہیں گے تو خود بھی مشکل میں پھنس جائیں گے اور رشتے داروں کو بھی مصیبت میں ڈالیں گے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ رشتے داروں ہی کا رویہ بدل گیا ہے تو چھپ کر گھر سے نکلے اور شاہ جہان پور چلے گئے۔

شاہ جہان پور میں قیام

اس زمانے میں شاہ جہان پور کا حکمران حافظ رحمت خاں تھا، جو بہت علم دوست اور متدین آدمی تھا۔ مولانا وہاں پہنچے تو حافظ رحمت خاں نہایت تعظیم سے پیش آیا، ان کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کی اور طلبا کو مناسب وظائف دینا شروع کیے۔ مولانا کے قیام کا انتظام شاہ جہان پور کے رئیس نواب عبداللہ خاں کے مکان میں کیا گیا جو قلعے میں تھا۔ وہاں انھوں نے اپنے آپ کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا اور ان کا نام سن کر طلبا کی بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ اب شاہ جہان پور میں ایک عظیم درس گاہ قائم ہو چکی تھی جس میں کثرت سے طلبائے علم آتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ وہاں وہ بیس سال مقیم رہے اور اس اثنا میں متعدد اصحاب علم ان کی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ مولانا نے تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی وہاں جاری رکھا۔ یہ سلسلہ حافظ رحمت خاں کی شہادت (۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ۔ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء) تک قائم رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے قبضے میں آ گیا جو شیعہ تھا اور مولانا کا مخالف تھا۔

رام پور کا عزم:

اس کے بعد مولانا نے رام پور کا عزم کیا۔ اس عہد میں ریاست رام پور کا حاکم نواب فیض اللہ خاں

تھا۔ اس نے رام پور میں مولانا کی آمد کو اپنی خوش بختی قرار دیا اور ان سے انتہائی تکریم کا برتاؤ کیا۔ مولانا اور ان کے طلبا کے لیے معقول وظائف مقرر ہوئے اور تعلیم و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا نے قیام رام پور کے دوران میں بعض کتابیں بھی تصنیف کیں اور جو تعلیقات و حواشی لکھنؤ اور شاہ جہان میں معرضِ تحریر میں آ چکے تھے، ان کی تکمیل و تصحیح کی۔ رام پور میں علما و طلبا کی کثیر جماعت ان سے مستفید ہوئی اور دور و نزدیک کے بہت سے لوگوں نے ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ وہاں وہ پانچ سال قیام فرما رہے۔ اس اثنا میں طلبا کی جماعت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اور مصارف بہت بڑھ گئے تھے، تاہم نواب فیض اللہ خان انھیں وہاں رکھنا چاہتا تھا۔

قصبہ بوہار:

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں ملک کے کھاتے پیتے لوگوں نے ترویج دین اور اشاعت علم کے لیے مدارس قائم کر رکھے تھے۔ ان مدارس میں ایک مدرسہ کلکتہ کے نواح میں "بوہار" کے مقام پر منشی صدرالدین خاں نے قائم کیا تھا۔ یہ ایک عظیم مدرسہ تھا جس میں طلبا کا گروہِ کثیر نامور اساتذہ سے تحصیل علم میں مشغول تھا۔ اس کے بانی منشی صدرالدین خاں چاہتے تھے کہ مولانا عبدالعلی فرنگی محلی ان کے مدرسے میں تشریف لے آئیں، اس کے لیے انھوں نے مولانا سے بھی اصرار کیا، نواب رام پور پر بھی زور دیا اور بعض انگریز حکام سے بھی ملے اور نواب فیض اللہ خاں (والی رام پور) کے پاس ان کی سفارشیں بھجوائیں کہ وہ مولانا کو بوہار جانے کی اجازت دے دیں۔ منشی صدرالدین خاں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور مولانا پانچ سال رام پور میں گزار کر ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں اپنے علما و طلبا کے ساتھ بوہار تشریف لے گئے۔ رام پور سے بوہار جاتے ہوئے وہ رائے بریلی سے گزرے، وہاں تکیہ سید علم اللہ شاہ میں قیام پذیر ہوئے اور سید علم اللہ کے پوتے سید محمد عدل کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت ان کے داماد مولانا ازہار الحق انصاری لکھنوی بھی ان کے رفیقِ سفر تھے۔

بوہار پہنچے تو منشی صدرالدین خاں نے شان دار استقبال کیا اور نہایت احترام سے پیش آیا۔ مولانا کی چار سو روپے اور مولانا ازہار الحق کی سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ایک سو طالب علم ان کے درس میں شامل تھے، ان کے ماہانہ وظائف مقرر ہوئے۔ بارہ سال بوہار میں مقیم رہے اور اس اثنا میں شائقین علم نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ اس کے بعد صدرالدین خاں سے تعلقات بگڑ گئے اور مزید قیام کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

مدراس کا عزم اور والہانہ استقبال:

اس زمانے میں مدراس کا حکمران والا جاہ نواب محمد علی خاں والی ارکاٹ تھا۔ وہ صوبہ یوپی کے ایک

مقام گوپامئو کا رہنے والا تھا اور اس لحاظ سے مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کا ہم وطن تھا۔ اس کو منشی صدرالدین خاں سے مولانا کی دل برداشتگی کا پتا چلا تو مدراس تشریف لانے کی درخواست بھیجی۔ مولانا بوہار سے عازم مدراس ہوئے۔ چھ سو علما و طلبا ان کے ہم رکاب تھے۔ مدراس کے قریب پہنچے تو نواب محمد علی خاں نے امرائے دربار، خاندان کے معززین اور خود اپنے بیٹوں کو ایک منزل آگے استقبال کے لیے بھیجا۔ مولانا اور ان کے رفقا پورے اعزاز کے ساتھ ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ/۲۴۔ اگست ۱۷۹۱ء کو شہر مدراس میں داخل ہوئے۔ مولانا کی پالکی نواب کے محل کے قریب پہنچی تو نواب ارکان دولت اور اعزہ کے ساتھ پیادہ پا دروازے پر کھڑا تھا۔ مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا تو نواب نے دوڑ کر پالکی کو کندھا دیا اور اسی طرح صحن محل میں داخل ہوا۔ دربار میں اپنی مسند خاص پر بٹھایا، ان کے قدم چومے اور انتہائی اکرام کا برتاؤ کیا۔ رہنے کو ایک عالی شان محل ان کے لیے مخصوص کیا۔ وہ ہمیشہ صبح و شام اپنے باورچی خانے سے بہترین کھانا پیش کرتا تھا۔ مولانا جب بھی اس کی ملاقات کو محل میں جاتے، اسی طرح استقبال اور تعظیم کرتا جس طرح کہ پہلے دن کیا تھا۔

مولانا کے مدراس تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد نواب نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس کا شمار ہندوستان کے مشہور اور بڑے مدارس میں ہوتا تھا۔ مولانا اور ان کے رفقا اور تلامذہ کے لیے معقول وظائف مقرر کیے اور درس و تدریس کا وسعت پذیر سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا محل سے منتقل ہو کر مدرسے کی عمارت میں آ گئے اور طلبا کے ساتھ رہنے لگے۔ مدراس کے قرب و جوار اور ملک کے دور دراز حصوں سے کثیر تعداد میں شائقین علم ان کی خدمت میں آتے اور فیض حاصل کرتے۔ طویل عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ نواب محمد علی نے انھیں ''بحرالعلوم'' کا خطاب عطا کیا۔

نواب محمد علی خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عمدۃ الامرا نے باپ کی مسند سنبھالی۔ یہ سیاسی اعتبار سے ایک نازک موڑ تھا اور تخت نشینی کے مسئلے پر حکمران خاندان میں جھگڑے کا احتمال تھا۔ لیکن مولانا نے جب عمدۃ الامرا کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسند حکومت پر بٹھایا تو سب کی گردنیں جھک گئیں اور یہ خطرناک منزل نہایت آسانی سے طے ہو گئی۔ عمدۃ الامرا نے باپ سے بھی زیادہ ان کی عزت کی۔ مولانا کے علاوہ ان کے اہل قرابت کے لیے الگ ماہانہ رقم مختص کی گئی۔ عمدۃ الامرا نے مسند نشینی کے دس دن بعد ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۹۵ء) کو خطابات تقسیم کیے تو مولانا ممدوح کو ''ملک العلما'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

عمدۃ الامرا کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے تاج الامرا علی حسین خاں کو مسند نشین کیا، لیکن مولانا اس کے عقیدہ و مذہب سے مطمئن نہ تھے، لہٰذا اس تقریب میں شریک نہیں ہوئے۔ اپنے خاندان کے افراد سے بھی اس کا طرز عمل اچھا نہ تھا اور لوگ انگریز حکام سے اس کی شکایت کرتے تھے، اس لیے انگریزوں نے اس کو حکومت سے معزول کر دیا۔ وہ صرف چھ مہینے برسر اقتدار رہا۔

عظیم الدولہ نواب محمد علی خاں کا نبیرہ تھا۔ تاج الامرا کی معزولی کے بعد اس کو حکومت دی گئی۔ یہ

مولانا کا شاگرد خاص تھا۔لیکن اس کی حکومت اور نوابی برائے نام تھی' انگریزوں نے اس کے زمانے میں مدراس پر قبضہ کرلیا اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا' لیکن اس معزول نواب نے مولانا اور دیگر علما وطلبا کے ماہانہ وظائف سابق دستور کے مطابق جاری رکھے۔

عادات وخصائص:

مولانا عبدالعلی نہایت فیاض اور سخی تھے۔ جو کچھ آتا فقرا و مستحقین اور احباب ورفقا میں بانٹ دیتے۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے اہل وعیال عام طور پر تنگ دست رہتے تھے۔لیکن کسی سے اس کا اظہار نہ کرتے۔ مولانا سے اس کی شکایت کی جاتی تو پروانہ کرتے ____ البتہ اگر نواب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اہل خانہ کو کچھ مزید رقم بھیج دیتا۔

مولانا کے والد گرامی مولانا نظام الدین بہت نرم طبیعت اور منکسر مزاج تھے' اس کے برعکس بیٹے کے مزاج میں تشدد اور ادعا کا عنصر غالب تھا۔ جمال کے بجائے جلال اور عجز کے بجائے تمکنت پائی جاتی تھی۔ کسی کے سامنے خاموش رہنے اور مسائل میں دبنے کے عادی نہ تھے۔ جو علمائے کرام سن وسال میں ان سے بہت بڑے تھے' ان کے مقابلے میں بھی اتر آتے۔ مجادلہ ومباحثہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مسائل بیان کرتے وقت بھی یہ انداز برقرار رہتا' تصنیفات میں بھی طبیعت کی سختی نمایاں نظر آتی ہے۔

تصنیفات اور حواشی وتعلیقات:

تیرھویں صدی ہجری کے حلقہ احناف کے علمائے ہند میں مولانا عبدالعلی کا مرتبہ علمی بہت بلند تھا۔ مسائل میں دقت نظر کی جو خوبی ان میں پائی جاتی ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ وسعت نظر اور اظہار و بیان میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ جلیل القدر مصنف بھی تھے۔ حدیث' فقہ' اصول فقہ' عقائد وکلام اور فلسفہ وحکمت وغیرہ ہر موضوع پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں اور حواشی وتعلیقات بھی سپرد قلم کیے' جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱- رسالہ فی تقسیم الحدیث:۔ یہ ایک قلمی رسالہ ہے جو رضا لائبریری رام پور (ہندوستان) میں محفوظ ہے۔

۲- رسالہ اصول الحدیث:۔ یہ بھی قلمی رسالہ ہے اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۳- الارکان الاربعہ:۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں حنفی نقطہ نظر سے فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب ہے۔

۴- فاتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت:۔ یہ کتب ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۷ء میں تصنیف کی' مطبوعہ ہے۔

۵- مسائل متعلقہ حقہ وحرمت نان پاؤ وافیون وجوز وبنگ:۔ یہ درحقیقت ایک استفتا کے جوابات ہیں جو

مختلف اوقات میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' شاہ رفیع الدین اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے دیے تھے۔ یہ جوابات مطبع مصطفائی کان پور سے عربی میں مع بین السطور فارسی ترجمے کے شائع ہوئے۔

۶- تنویر المنار شرح منار الانوار:۔ یہ اصول فقہ سے متعلق ہے۔ فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۷- تکملہ شرح تحریر الاصول:۔ فتح القدیر کے مصنف ابن الہمام نے اصول فقہ سے متعلق ''تحریر الاصول'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے حلقہ اہل علم میں بہت اہمیت دی گئی۔ متعدد اہل علم نے اس کتاب کو ہدف التفات ٹھہرایا اور اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔ مولانا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی' لیکن پیغام اجل آ گیا اور شرح مکمل نہ ہو سکی۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی نے ''تکملہ شرح تحریر الاصول'' کے نام سے اس کی تکمیل کی۔

۸- شرح الدائر فی الاصول:۔ یہ اصول فقہ کے بارے میں ہے۔

۹- احوال قیامت:۔ یہ عقائد و کلام کے بارے میں ہے اور فارسی میں ہے۔ غیر مطبوعہ ہے۔

۱۰- شرح فقہ اکبر:۔ یہ مطبوعہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۱۱- رسالہ توحید:۔ یہ رسالہ مسئلہ توحید سے متعلق ہے۔

۱۲- الحاشیہ علی حاشیۃ میر زاہد علی شرح المواقف:۔ یہ عقائد و کلام سے متعلق ہے اور مطبوعہ ہے۔

۱۳- الرسالۃ الصغریٰ فی السلوک: یہ رسالہ تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

۱۴- شرح فص نوح من فصوص الحکم:۔ ابن عربی کی فصوص الحکم میں ایک ''فص نوح'' ہے' مولانا عبدالعلی نے اس فص کی شرح لکھی۔ یہ بھی تصوف کے موضوع پر ہے۔

۱۵- شرح مثنوی مولانا روم: فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔ تصوف کے بارے میں ہے۔

۱۶- وحدت الوجود:۔ یہ کتاب مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق ہے۔ فارسی میں ہے اور تصوف کے اسلوب کی ہے۔

۱۷- تنزلات ستہ:۔ یہ رسالہ بھی تصوف میں ہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء کے سہ ماہی ''اقبال ریویو'' میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۱۸- ہدایت الصرف:۔ یہ علم صرف میں ہے' فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۱۹- الحاشیہ علی حاشیۃ میر زاہد علی رسالۃ القطبیہ:۔ یہ حاشیہ چھپ چکا ہے اور منطق سے متعلق ہے۔

۲۰- الحاشیہ علی حاشیۃ میر زاہد ملا جلال:۔ یہ حاشیہ بھی چھپ چکا ہے اور منطق میں ہے۔

۲۱- الحاشیہ علی ضابطۃ التہذیب:۔ یہ بھی چھپ چکا ہے۔ منطق کے بارے میں ہے۔

۲۲- شرح سلم العلم: یہ شرح چھپ گئی ہے۔

۲۳- شرح الضابطہ:- یہ شائع ہو چکی ہے۔ منطق میں ہے۔

۲۴- تعلیقات علی الافق المبین:- یہ فلسفہ و حکمت سے متعلق ہے اور قلمی ہے جو رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

۲۵- الحاشیہ علی الصدرا:- یہ فلسفے کے بارے میں ہے اور مطبوعہ ہے۔

۲۶- الحاشیہ علی المثناۃ بالتکریر:- یہ حاشیہ قلمی ہے اور فلسفے کے بارے میں ہے۔

۲۷- حاشیہ شمس البازغہ:- یہ بھی قلمی ہے اور اس کا موضوع بھی فلسفہ ہے۔

۲۸- العجالتہ النافعہ:- یہ قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اور فلسفے میں ہے۔

۲۹- شرح المجسطی: یہ قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے اور علم ہیئت میں ہے۔

۳۰- شرح مقامات السبادی:- اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے۔

مولانا عبدالعلی فرنگی محلی اپنے دور کے بہت بڑے حنفی المسلک عالم و فقیہ تھے۔ ان سے بے شمار اصحاب علم نے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ سید سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' میں تحریر کرتے ہیں:-

ملا نظام الدین کے مشہور صاحب زادے ملا عبدالعلی ہیں' جن کے دم سے (فرنگی محل کا) یہ چشمہ فیض بڑھ کر دریائے فیض بن گیا اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا۔ یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رام پور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا۔

وفات:

زندگی کے آخری دنوں میں مولانا عبدالعلی بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ۸ رجب ۱۲۲۵ھ/۹۔ اگست ۱۸۱۰ء کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ چار دن یہ کیفیت رہی کہ کبھی ہوش آ جاتا اور کبھی غشی طاری ہو جاتی۔ حالت ہوش میں فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی۔ خدا کے سوا کوئی شے موجود نہیں۔ ۸۱ برس کی عمر پا کر ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۳ اگست ۱۸۱۰ء) کو مدراس میں انتقال کیا اور دوسرے دن مسجد والا جاہی کے قریب دفن کیے گئے۔ تذکرہ علمائے ہند میں سال وفات ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء مرقوم ہے جو صحیح نہیں ❶۔

۱۹- شاہ عبدالغنی دہلوی

شاہ عبدالغنی دہلوی' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان

❶ حالات کے لیے دیکھیے۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۸۲ تا ۲۸۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲' ۱۲۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محلی ص ۱۳۷ تا ۱۴۱۔ ابجد العلوم ص ۹۲۷۔ علم و عمل ج ۱ ص ۷۴' ۷۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۷۔ حیات شبلی ص ۲۱۔ مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۱۶ تا ۱۲۱۔ اخبار الصنادید (ص ۴۱۵) میں نواب فیض اللہ خان کے عہد کے علماء و مشائخ کے ضمن میں ان کا نام تحریر ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں' ص ۳۳' ۳۴' ۵۹۔ رود کوثر ۶۱۰

کی تاریخ ولادت اور حالات کا پتا نہیں چل سکا۔ تذکروں سے صرف اتنی سی بات کا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہ اور برادر کبیر شاہ عبدالعزیز سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ باقی علوم مروجہ کی تحصیل بھی انہی سے کی۔ ان کی کسی تصنیف کا علم بھی نہیں ہو سکا۔ البتہ تذکرہ نگاروں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ حدیث' فقہ اور دیگر علوم میں درک رکھتے تھے اور ان کا دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔ وہ اتباع سنت میں بڑے حریص اور قرآن وحدیث پر عمل میں انتہائی تیز تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور دنیا کے مال و اسباب سے کوئی رغبت نہ تھی۔ توکل وقناعت اور زہد وعبادت میں کوئی ان کا مثل نہ تھا۔ شکل وصورت اور وضع ولباس میں اپنے والد کے مشابہ تھے' جس نے ان کے والد کو دیکھا تھا' بیٹے کو دیکھ کر شاہ صاحب کا نقشہ اس کے سامنے آ جاتا تھا۔

تذکروں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ شاہ عبدالغنی طلبا کو درس دیتے تھے اور ان کا زیادہ وقت اسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن ان کے شاگردوں کے نام اور ان کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اتنے بڑے آدمی اور اتنے بڑے خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص کے حالات سے اس کا دامن خالی ہے۔

شاہ عبدالغنی کے کوائف زندگی بے شک پردہ خفا میں ہیں اور ہم اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں' لیکن اس خلا کو ان کے فرزند عالی قدر حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید نے پر کر دیا اور تاریخ کو ایک نیا اور شان دار موڑ عطا کیا۔ اس کی تفصیل ان شاءاللہ مولانا شہید کے حالات میں بیان کی جائے گی۔

شاہ عبدالغنی نے عالم شباب میں وفات پائی۔ ان کا سال وفات ۱۲۲۷ھ بیان کیا جاتا ہے [1]۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چار صاحب زادے تھے' ان میں سب سے چھوٹے یہی شاہ عبدالغنی تھے' لیکن ان کا انتقال سب سے پہلے ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں ہوا۔ ان سے بڑے شاہ عبدالقادر تھے' انھوں نے ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ/ ۲۷ جون ۱۸۱۵ء کو وفات پائی۔ ان سے بڑے شاہ رفیع الدین ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/۱۰ اگست ۱۸۱۸ء کو فوت ہوئے اور سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز نے ۷ شوال ۱۲۳۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یعنی سب سے چھوٹے نے سب سے پہلے' ان سے بڑے نے ان کے بعد' ان سے بڑے نے ان کے بعد اور سب سے بڑے نے سب کے بعد اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھا۔ گویا جو ولادت کی ترتیب تھی' اس کے برعکس وفات کی ترتیب ہوئی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۲۰۔ مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی

برصغیر میں تیرھویں صدی ہجری کے جن بلند بخت حضرات علما نے خدمت حدیث میں نمایاں کردار ادا کیا' ان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا اسم گرامی

[1] حیات ولی' ص ۶۴۱۔ تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۶۳' رود کوثر' ص ۵۹۶۔

تاریخ تدریس حدیث میں ابھرے ہوئے الفاظ میں مرقوم ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ لیکن اس وسعت پذیر حلقے میں دو بزرگ وہ ہیں، جن کی دور متاخرین میں خدمت حدیث کے سلسلے میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ ہیں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ۔

ان دو بزرگان عالی قدر سے بلا امتیاز مسلک فقہی بے شمار علمائے عظام نے فیض حدیث حاصل کیا اور پھر اپنی ذہنی وفکری استعداد کے مطابق اس بنیادی علم کی ترویج و اشاعت میں زندگیاں وقف کر دیں۔ سید نذیر حسین دہلوی کا تذکرہ ہم اپنی کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں تفصیل سے کر چکے ہیں۔ ان سطور میں مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

مولانا ممدوح حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے اخلاف میں سے تھے۔ اس خانوادہ عالی مرتبت کا ہر فرد زیور علم سے آراستہ تھا۔ آج اس برصغیر کے مختلف گوشوں میں فروغ علم کی جو مسندیں بچھی ہوئی ہیں، ان میں سے کسی نہ کسی شکل میں اس خاندان کے اصحاب کمال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے کسی بزرگ نے تصوف و طریقت کی محفلیں جمائیں، کسی نے وعظ ونصیحت کا راستہ اختیار کیا، کوئی تصنیف و تالیف کی راہوں پر گامزن ہوا، اور کوئی درس و تدریس کے میدان میں اترا۔ غرض ہر ایک نے اپنی بساط و استطاعت اور حالات کے مطابق وہ خدمات انجام دیں کہ جن کی ہمہ گیر اثر پذیری سے بنجر دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوئیں اور قلب ونظر کے بھٹکے ہوئے قافلوں نے تسکین وراحت کی منزل پائی۔ ان حضرات کے نوع بنوع کارنامے آج تذکرہ ورجال کی کتابوں کے زریں باب بن گئے ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مولانا عبدالغنی مجددی اسی بحر نا پیدا کنار کی ایک موجِ خوش خرام تھے، جس سے ہزاروں تشنہ لبوں نے سیراب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا شاہ عبدالغنی مجددی ۲۲ شعبان ۱۲۳۵ھ/۴ جون ۱۸۲۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب ساتویں پشت میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے ملتا ہے اور وہ یہ ہے! عبدالغنی بن شاہ ابوسعید بن صفی اللہ بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔! نسلاً فاروقی تھے اور ان تمام اوصاف سے متصف تھے، جو ان کے آبا واجداد میں پائے جاتے تھے۔ ان کے والد گرامی مولانا شاہ ابوسعید مجددی دہلوی دیار ہند کے بلند مرتبت علما وفقہا اور اصحاب طریقت وتصوف میں سے تھے[1]۔ برادر کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی کا شمار بھی خطہ ہند کے جلیل القدر ارباب فقہ اور نامور صوفیا و اتقیا میں ہوتا ہے[2]۔ ان کا گھرانا علم وعمل اور فضل وکمال کا گھرانا تھا اور بڑے بڑے فضلا ان کے حلقے میں

---

[1] ملاحظہ ہو ''فقہائے ہند جلد ۸

[2] ایضاً

شامل ہونے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کو موجب فخر و شرف قرار دیتے تھے۔

شاہ عبدالغنی نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا‘ پھر مولانا حبیب اللہ دہلوی سے صرف ونحو اور علوم عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حصول حدیث وفقہ کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ حدیث کی تحصیل مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کی۔ موطا امام محمد اپنے والد گرامی شاہ ابوسعید سے پڑھا۔ اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ مشکوٰۃ کا درس شاہ رفیع الدین دہلوی کے فرزند گرامی شاہ مخصوص اللہ سے لیا۔ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میں عازم حجاز ہوئے اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں سرزمین حجاز میں مولانا محمد عابد سندھی اور شیخ ابوزاہد اسماعیل رومی کا غلغلۂ درس حدیث بلند تھا۔ شاہ عبدالغنی نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور سند حدیث سے مفتخر ہوئے۔ بعدازاں اپنے وطن مالوف ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور دہلی میں مسند درس حدیث آراستہ کی۔

تیرھویں صدی ہجری میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کے دریائے فیض سے دو طویل وعریض نہریں جاری ہوئیں‘ ایک سرعنوان بزرگ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے نام سے موسوم ہے اور ایک حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے نام نامی سے! آگے چل کر ان سے فیض کے بے شمار چشمے پھوٹے‘ جنھوں نے برصغیر کے علاوہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی سیراب کیا۔

شاہ عبدالغنی علم وعمل میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ زہد وعبادت‘ صداقت وامانت‘ عفت وصیانت‘ حلم وتواضع‘ اخلاص ودیانت اور ابتہال ورجوع الی اللہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہر وقت دل پر خوف خدا طاری رہتا۔ حدیث رسول پاک ﷺ کی محبت اور اتباع سنت کا جذبہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حسن اخلاق کا پیکر تھے۔ لوگوں کو ہر معاملے میں نفع پہنچانا اور ان سے نیکی کا برتاؤ کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دنیا کے مال ومتاع سے کبھی تعلق نہیں رکھا وہ اس جہان گزراں میں فرشتہ سیرت عالم تھے۔

برصغیر پاک وہند میں انھوں نے علم حدیث کی تدریس وترویج میں بے پناہ خدمت انجام دی۔ وہ گوشہ گیر بزرگ تھے اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر درس حدیث دیتے تھے۔ ان سے لاتعداد علمانے کسب علم حدیث کیا اور پھر آگے چل کر وہ اس علم کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ بنے۔ ان کے تلامذۂ حدیث کے وسیع حلقے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی‘ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی ایسے بہت سے اہل علم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ آج ہندوستان‘ پاکستان اور بنگلہ دیش میں علوم حدیث کے جو مراکز دکھائی دیتے ہیں‘ ان کی نسبت قیام جن بزرگوں کی طرف جائے گی‘ ان میں شاہ عبدالغنی کے اسم گرامی کو ہمیشہ خاص حیثیت حاصل رہے گی۔

شاہ عبدالغنی مجددی جس دور میں دہلی میں مشغول تدریس حدیث تھے‘ اسی دور میں ۱۸۵۷ء کا حادثہ

ہائلہ پیش آیا۔ قمری اعتبار سے وہ ۱۲۷۳ھ تھا۔ شدید خوں ریزی کے بعد انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا اور دہلی کے گلستان علم اجڑ گئے۔ حضرت شاہ صاحب کا روح پرور مدرسہ بھی انگریزوں کی دست برد کی نذر ہو گیا۔ علمائے ہند کے لیے بالخصوص یہ نہایت ابتلا کا وقت تھا۔ یہ بوریا نشین مسجدوں اور مدرسوں میں علوم اسلامی کی جو خدمت انجام دے رہے تھے، اس میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور یہ ملک اپنی انتہائی وسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ ہو گیا۔ علمائے دین حالات سے مایوس اور وقت کی آندھیوں سے دل برداشتہ ہونے کے کبھی عادی نہیں رہے، لیکن یہ انقلاب وتغیر کی ایسی سنگین لہر تھی کہ اس میں بعض حضرات کے لیے آگے چلنے کے راستے بالکل مسدود ہو گئے تھے۔ ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس ملک سے، جس میں انھوں نے قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرنے میں عمریں کھپا دی تھیں، ہجرت کر جائیں اور اس کی سکونت ترک کر کے ارض حجاز کو اپنا مسکن بنالیں۔ چنانچہ اس ہنگامہ دار وگیر میں شاہ صاحب ممدوح نے دہلی کو خیر باد کہا اور حجاز کی راہ لی۔ پہلے مکہ معظمہ گئے، اس کے بعد مدینہ منورہ کا قصد کیا اور پھر وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ان کے برادر کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی دہلوی نے بھی اسی ہنگامے کے نتیجے میں اہل وعیال سمیت مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔

حضرت شاہ عبدالغنی کا عمر بھر ایک ہی مشغلہ رہا اور وہ تھا درس علم حدیث ____! مدینہ منورہ میں بھی اسی خدمت میں مصروف رہے۔ جس طرح دہلی میں طلبائے حدیث کا ہجوم ان کے گرد رہتا تھا اسی طرح مدینہ طیبہ میں بھی شائقین حدیث کا بہت بڑا گروہ ان کے درس میں جمع ہو گیا۔ اس گروہ میں ہندوستان کے طلبا بھی شامل تھے اور حجاز، نجد، یمن، عراق، ترکی، خراسان، ماوراء النہر اور دیگر ممالک اسلامیہ کے بھی ____! واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ دہلی کی بہ نسبت مدینہ منورہ میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہر ملک کے طلبائے حدیث کھنچے ہوئے ان کے درس میں شامل ہوتے تھے، اس لیے کہ مطالب حدیث اور علوم حدیث کے حل وکشود میں ان کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی نے تدریس کے علاوہ تحریری طور پر بھی حدیث کی خدمت کی اور ''انجاح الحاجۃ'' کے نام سے حدیث کی مشہور کتاب ''سنن ابن ماجہ'' پر ذیل سپرد قلم کی جو اپنے انداز کی بہترین ذیل ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے یہ وہ ہندی عالم تھے جو تدریس حدیث اور ولایت وجلالت کے لحاظ سے عرب وعجم کے علما وطلبا میں خاص شہرت وقبولیت کے حامل تھے۔ اس عالم کبیر، علامہ وقت، محدث شہیر اور فقیہ نامدار نے منگل کے روز ۶ محرم ۱۲۹۶ھ/ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۷۸ء کو مدینہ منورہ میں داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۸۹، ۲۹۰۔ الیانع الجنی۔ آثار الصنادید ص ۲۱۵، ۲۱۶۔ ابجد العلوم ۹۲۹، ۹۳۰۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲ ص ۳۹۵۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۰، ۴۹۱۔

۲۱-مولانا عبدالقادر رام پوری

مولانا عبدالقادر رام پوری کے والد کا نام محمد اکبر اور دادا کا محمد اسلم تھا۔ ان کا خاندان دراصل ہرات سے تعلق رکھتا تھا اور ان میں سے ایک بزرگ کسی دور میں دہلی آگئے تھے' اس لیے انھیں دہلوی بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات دہلی سے نقل مکانی کرکے رام پور میں آبسے تھے' لہٰذا یہ رام پوری کہلائے۔ صاحب ترجمہ مولانا عبدالقادر کی ولادت ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں رام پور میں ہوئی۔ اس زمانے میں مفتی شرف الدین رام پوری مسند درس پر متمکن تھے ❶۔ مولانا عبدالقادر نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب ممدوح کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے اور دیگر علما سے مروجہ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف مقامات میں گھومتے اور تھوڑی بہت خدمات انجام دیتے رہے' کسی جگہ جم کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی اثنا میں سہارن پور پہنچے اور اس شہر کے منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک عرصے تک اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن رہے۔ اس عہد میں رام پور کا والی نواب محمد سعید خاں تھا' اس کو ان کی صلاحیت وقابلیت کا علم ہوا تو واپس رام پور تشریف لانے کی دعوت دی۔ اگرچہ مولانا کا اصل موضوع ریاضی تھا اور اس فن میں خوب عبور رکھتے تھے' تاہم حدیث اور فقہ کی باریکیوں پر بھی گہری نظر تھی اور ان علوم کے دقیق مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر نواب مذکور نے ان کو ریاست رام پور میں قاضی القضاۃ کا منصب تفویض کیا۔ مولانا ممدوح نے یہ خدمت حسن وخوبی سے انجام دی۔ اب وہ مالی مشکلات کی منزل سے گزر چکے تھے اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف موضوعات سے متعلق متعدد کتابیں سپرد قلم کیں' جن میں درج ذیل کتابیں لائق تذکرہ ہیں:

۱- ایک کتاب خود اپنے حالات سے متعلق تحریر کی۔ یہ خاصی ضخیم کتاب ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۲- ایک کتاب شاہان ہند سے متعلق لکھی' جو ہندوؤں کے عہد سے شروع ہوتی اور مسلمانوں کے آخری دور پر ختم ہوتی ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ہے۔

۳- شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''جامع البرکات'' پر تعلیقات۔

۴- شرح الحکم المرتضویہ: اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو اوامر ونواہی مروی ہیں' ان میں شرعی اعتبار سے کیا حکمتیں اور فوائد کارفرما ہیں۔

۵- ایک کتاب میں بتایا ہے کہ بعض علما سے کن کن امور میں کہاں کہاں سہو قلم ہوا ہے۔

۶- شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب ''حسن العقیدہ'' کا ترجمہ۔

---

❶ مفتی شرف الدین رام پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''فقہائے ہند جلد ۸

۷- شرح العقیدہ از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔

۸- ایک کتاب اس موضوع سے متعلق ہے کہ ہندوؤں نے اپنے بتوں کے جو نام رکھے ہیں' اس کا کیا مطلب ہے۔

۹- شاہ عبدالعزیز کی ''میزان البلاغہ'' کی شرح۔

۱۰- تعلیقات علیٰ شمائل الترمذی۔

۱۱- رسالہ فی حقیقت الدعاء والاجابتہ۔

۱۲- رسالہ قبلہ نما۔

۱۳- ایک مختصر سا رسالہ علم عروض کے بارے میں۔

۱۴- ایک رسالہ مختلف مذاہب کے بارے میں۔

۱۵- ایک رسالہ اردو گرائمر سے متعلق۔

۱۶- ایک رسالہ ہندی ضرب الامثال سے متعلق

۱۷- تاریخ اجمیر و مارواڑ۔

۱۸- ایک رسالہ روزے کی فرضیت اور فضیلت کے متعلق۔

۱۹- ایک رسالہ رمل' نجوم' جفر اور سحر کے ابطال میں۔ اس میں حقیقت سحر بھی بیان کی گئی ہے۔

۲۰- ایک رسالہ احکام نکاح اور اس کے اسرار سے متعلق۔

۲۱- ایک رسالہ امکان خرق عوائد کے موضوع میں۔

۲۲- ایک رسالہ تعلیم و تربیت سے متعلق۔

۲۳- ایک رسالہ ''سیاستہ المدن'' میں۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے رسائل ان سے یادگار ہیں۔

مولانا عبدالقادر رام پوری نے ۷ رجب ۱۲۳۵ھ/ ۲۱- اپریل ۱۸۲۰ء کو رام پور میں وفات پائی[1]۔

۲۲- قاضی عبدالقادر کنتوری

قاضی عبدالقادر بن قاضی شریف الدین حسینی کنتوری' شیخ نظام الدین چشتی اورنگ آبادی کی اولاد سے تھے۔ ان کے آباو اجداد اصلاً نقوی سادات تھے اور نیشا پور کے رہنے والے تھے۔ اس خاندان کے بعض اسلاف کسی زمانے میں نیشا پور سے اٹھ کر ہندوستان آگئے تھے اور لکھنؤ کے نواح میں قصبہ ''کنتور'' میں مقیم ہو گئے تھے' اس لیے یہ لوگ کنتوری کہلائے۔ قاضی عبدالقادر کنتوری کے والد کنتور سے دکن کے ایک شہر اورنگ آباد

[1] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۳' ۲۹۴۔

گئے اور وہاں کے قاضی مقرر کر دیے گئے' لہٰذا اس شہر کی نسبت سے اورنگ آبادی مشہور ہوئے۔ قاضی عبدالقادر' باپ کے زمانہ قیام اورنگ آباد میں "۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء کو وہیں پیدا ہوئے' اس لیے مقام ولادت کی بنا پر انھیں اورنگ آبادی کی نسبت سے بھی پکارا جاتا ہے۔

قاضی صاحب موصوف کچھ بڑے ہوئے تو پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر شیخ فخر الدین نائطی اور قاضی شیخ الاسلام خاں سے درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید غلام علی حسینی بلگرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے' ان سے عربی ادب کی کتابوں کی تکمیل کی۔ شعروشاعری کا بھی ذوق تھا' اس میں بھی انھی سے اصلاح لیتے رہے۔ مہرباں تخلص کرتے تھے۔

علوم عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کے بعد اورنگ آباد میں مسند درس بچھائی اور طلبا کو تفسیر' حدیث اور تصوف کی تعلیم دینا شروع کی۔ صاحب طریقت بھی تھے اور اس سلسلے میں اپنے ماموں شیخ فخر الدین اورنگ آبادی سے فیض یافتہ تھے۔ چونکہ حدیث وفقہ اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے' اس لیے والد کی وفات کے بعد اورنگ آباد کے منصب قضا پر فائز ہوئے۔ لیکن اس خدمت پر صرف تین سال مامور رہے۔ اس کے بعد اس منصب سے معزول ہو گئے اور ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء میں مدراس کے نواب والا جاہ محمد علی خاں کے دربار میں مدراس چلے گئے' اس نے ان کی بہت پذیرائی کی اور انتہائی عقیدت واحترام کا برتاؤ کیا۔ مدراس میں ہر حلقے کے لوگوں نے ان کو مستحق عزت گردانا۔ مدراس سے قصبہ میلاپور منتقل ہو گئے جو اس کے مضافات میں واقع ہے اور وہاں کی خانقاہ میں رہنے لگے' اس وجہ سے انھیں میلاپوری بھی کہا جاتا ہے۔

قاضی عبدالقادر کنتوری اپنے دور کے عالم وفقیہ اور شاعر تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱- اصل الاصول فی تطبیق المنقول بالمعقول: اس کتاب میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ عقلی اور نقلی علوم میں مطابقت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے۔

۲- کحل الجواهر فی ترجمة شیخ عبدالقادر: یہ کتاب شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ہے۔

۳- مفتاح المعارف: یہ کتاب تصوف سے متعلق ہے۔

۴- شرح مثنوی معنوی: یہ مثنوی مولانا روم کی شرح ہے۔

۵- ایک دیوان عربی اشعار پر مشتمل ہے۔

۶- ایک دیوان فارسی اشعار کا ہے۔

قاضی عبدالقادر حسینی کنتوری نے ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۹۰ء کو قصبہ میلاپور میں وفات پائی جو مدراس کے نواح میں ہے اور وہاں کی خانقاہ میں مدفون ہوئے [1]۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۲' ۲۹۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۸ (اس میں سال ولادت ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱ء مرقوم ہے)۔

۲۴۳- شاہ عبدالقادر دہلوی

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ ترتیب کے اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب کے تیسرے فرزند تھے۔ یعنی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین دونوں سے چھوٹے تھے۔ ان کا سال ولادت اس دور کے تذکرہ نگاروں نے محفوظ نہیں کیا اور حالات زندگی بھی کسی ایک جگہ مرقوم نہیں۔ مختلف حضرات نے ان سے متعلق جو کچھ لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال کے قریب تھی۔ شاہ صاحب کی وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں ہوئی۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۱۶۳ھ/۱۷۶۰ء بنتا ہے۔

حصول علم:

شاہ عبدالقادر نہایت ذہین وطباع تھے۔ تدین اور تقوے میں بھی اس خاندان کے تمام افراد بے مثال تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ان پر بھی گھر کے ماحول کا اثر ہوا' اور بچپن ہی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ عظیم القدر باپ سے بھی یقیناً کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی' لیکن کم عمری کی بنا پر ان سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکے۔ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ سال کی تھی اور وہ سب بھائیوں سے بڑے تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کر دیا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے بھی انہی سے تحصیل کی اور تمام مروج و متداول علوم بڑے بھائی سے پڑھے۔ انہی کی کفالت و تربیت میں رہے اور وہی آخر وقت تک اپنے اس گوشہ نشین برادر صغیر کی سرپرستی کرتے رہے۔

مسجد اکبر آبادی:

''مدرسہ شاہ عبدالعزیز'' دہلی میں ''گلی شاہ عبدالعزیز'' میں قائم تھا۔ مسجد شاہ عبدالعزیز بھی وہیں تھی۔ آج بھی یہ گلی اور مسجد اسی نام سے مشہور ہیں۔ شاہ عبدالقادر پہلے وہیں تھے۔ اس کے بعد مسجد اکبر آبادی میں چلے گئے تھے۔ یہ مسجد ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں شاہ جہان بادشاہ کی بیوی اعزالنسا بیگم نے بنوائی تھی۔ اس خاتون کو ''اکبر آبادی محل'' کا خطاب دیا گیا تھا' اس لیے یہ مسجد ''مسجد اکبر آبادی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بہت وسیع اور شاندار مسجد تھی ❶۔ شاہ عبدالقادر اسی مسجد میں فروکش تھے اور یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ نہایت قانع اور سادگی پسند بزرگ تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب ان کے لیے سال بھر میں دو جوڑے کپڑے اور صبح و شام دونوں وقت کا کھانا مسجد اکبر آبادی میں بھیج دیتے تھے۔ بس اس درویش منش عالم کی یہی کل کائنات تھی۔

❶ آثار الصنادید ص ۱۷۸۔

تلامذہ کرام:

مسجد اکبر آبادی میں ان سے متعدد حضرات نے علم حاصل کیا۔ امیرالمجاہدین حضرت سید احمد شہید بریلوی نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا اسماعیل شہید سے پڑھی تھیں' لیکن قرآن مجید کے ترجمہ اور حدیث کا درس اسی مسجد میں شاہ عبدالقادر سے لیا۔ سلوک وتصوف کی منزلیں بھی انہی کی صحبت میں طے کیں۔ شاہ احمد سعید مجددی دہلوی بھی کبھی زیارت اور کبھی استفادے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ❶۔

مولانا فضل حق خیرآبادی جو فلسفہ وحکمت میں درجہ امامت پر فائز تھے' حدیث میں شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے ❷۔

اس دور کے نامور شاعر حکیم مومن خاں مومن حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے میں عرش گیاوی لکھتے ہیں: ''کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں اور یہیں عربی' فارسی' حدیث' فقہ' منطق' معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی ❸۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا عبدالحی بڑھانوی' مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی' مرزا حسن علی شافعی لکھنوی' شاہ محمد اسحاق دہلوی' سید محبوب علی جعفری' سید اسحاق بریلوی اور خلق کثیر نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا ❹۔

رعب وجلال:

شاہ صاحب ظاہری سادگی اور انکسار کے باوجود نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ رؤسائے شہر' امرائے مملکت اور علمائے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے' لیکن ان کے جلال اور وجاہت کا یہ عالم تھا کہ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی۔ مزاج میں استغنا حد درجے کا تھا۔ اس دور کی سیاسیات میں درک رکھتے تھے۔ لیکن عملاً اس جھمیلے میں کبھی نہیں پڑے' ہمیشہ خدمت دین میں مشغول رہے اور پوری زندگی مسجد اکبر آبادی کے حجرے میں گزاردی۔

---

❶ محاسن موضح قرآن' ص ۲۰

❷ ایضاً ص ۲۴

❸ مطالعہ مومن' ص ۲۲

❹ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۵

ترجمہ قرآن:

شاہ صاحب کی بہت بڑی خدمت قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے بارے میں سید عبدالحی حسنی نزہۃ الخواطر میں اپنے والد مکرم سید فخر الدین حسنی کی کتاب ''مہر جہاں تاب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے خواب دیکھا کہ ان پر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ خواب انھوں نے اپنے برادر کبیر شاہ عبدالعزیز سے بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد نزول وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے' لیکن خواب بلا شبہ حق ہے۔ آپ کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت قرآن کی ایسی توفیق عطا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی❶۔

چنانچہ اللہ نے ان کو اردو زبان میں ترجمہ قرآن مجید کی توفیق سے نوازا جو ''موضح قرآن'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا ترجمہ نہ کبھی ہوا' نہ ہوگا۔ صاف ستھری اردو' نہ کوئی لفظ زائد نہ کم۔ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ پھر اللہ نے اس ترجمے کو اس قدر قبولیت عامہ عطا کی کہ ہر گھر میں موجود اور ہر شخص اس سے استفادہ کرنے پر مجبور ____ ! نہ کوئی لفظ متروک نہ غیر مانوس ____ !! جو شخص قرآن سے ذرہ بھی انس رکھتا اور اس کو سمجھنا چاہتا ہے' وہ اس ترجمے کی تلاش کرتا ہے اور پھر جب اس کو الفاظ قرآن سے ملا کر پڑھنا شروع کرتا ہے تو اشتیاق مطالعہ لحہ بہ لحہ بڑھتا جاتا ہے۔ ترجمے سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو اردو زبان اور اس کے محاوروں پر عبور تھا۔ اندازہ کیجیے جب اردو کے قواعد وضوابط بھی نہیں بنے تھے اور زیادہ مقبول بھی نہیں ہوئی تھی' اس زمانے میں قرآن مجید کا اس زبان میں ترجمہ کرنا کس درجے مشکل کام تھا۔

یہ ترجمہ انھوں نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں مکمل کیا' ''موضوع قرآن'' اس کا تاریخی نام ہے۔

خواجہ میر درد کی شاگردی:

بعض تذکروں میں بتایا گیا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو زبان خواجہ میر درد سے سیکھی تھی۔ شاہ عبدالعزیز بھی اپنے والد مکرم کے حکم سے بچپن میں اردو سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی مجلس میں جاتے تھے۔ اس زمانے میں اردو اگرچہ ابتدائی مراحل میں تھی' لیکن بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اس کو اپنا لیا تھا اور اس کی ترقی کے مواقع پیدا ہو رہے تھے۔ چند شعرا نے بھی اسے ذریعہ اظہار و بیان قرار دے لیا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس صورت حال سے خوب آگاہ تھے' چنانچہ وہ اپنے بیٹوں کو اس کے سیکھنے کی تاکید کرتے تھے۔ ناصر نذیر فراق ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' میں لکھتے ہیں:

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۵

''مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے' جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے' اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجودہ مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں۔ ان کی صحبت اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو' کیونکہ خواجہ صاحب پکے پان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے ❶''

ہندوستان کے نامور عالم مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی شاہ صاحب کو خواجہ میر درد کا شاگرد ماننے سے متامل ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ''خواجہ صاحب سے کچھ استفادہ'' تو کیا ہوگا'' لیکن استادی اور شاگردی کا تعلق ایسا معمولی تعلق نہیں کہ اس دور کی تاریخیں اس سے خاموشی اختیار کرتیں ❷۔

مولانا قاسمی نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ ''اس دور کی تاریخوں'' سے وہ کون سی ''تاریخیں'' مراد لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک گزارش تو یہ ہے کہ اس کا ذکر مطالعہ مومن (ص ۲۳۷) اور لال قلعہ کی ایک جھلک (ص ۶۳) میں موجود ہے' جن کا حوالہ خود مولانا نے بھی دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بقول ان کے شاہ صاحب نے استفادہ کیا ہوگا تو لفظ ''استفادہ'' کا اطلاق شاگردی پر بھی ہوتا ہے اور تذکرہ و رجال کی کتابوں میں شاگردی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ شاہ عبدالقادر یا کسی اور بزرگ نے اگر واقعی خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کی ہے تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

خواجہ صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے عالم' فقیہ' صوفی اور مصنف تھے اور بہت اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شاگردی سے خدانخواستہ شاہ صاحب کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا' بلکہ ان کے لیے سطح فکر پر عزت و احترام کے جذبات ابھرتے ہیں اور ذہن میں یہ خیال کروٹ لیتا ہے کہ ہمارے اسلاف حصول علم کے اس درجے شائق تھے کہ کسی بھی دروازے پر دستک دینے کو معیوب نہیں گردانتے تھے۔

مولانا قاسمی نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ ''خواجہ صاحب کی زبان میں جو متروک الفاظ ملتے ہیں' شاہ (عبدالقادر) صاحب کی زبان ان سے بالکل پاک ہے ❸۔

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ خواجہ میر درد کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا ہے۔ وہ ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو وفات پائی۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا دور تیرھویں صدی ہجری کا ہے۔ وہ ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ/ ۲۷ جون ۱۸۱۵ء کو انتقال کیا۔ یعنی خواجہ میر درد سے تیس سال بعد پیدا ہوئے اور اکتیس سال بعد وفات پائی۔ مولانا قاسمی اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ زبانیں ہر روز بدلتی اور ترقی کرتی ہیں' اور یہاں تو پورے تیس سال کا فرق ہے۔ ظاہر ہے' جو زبان خواجہ صاحب

❶ لال قلعہ کی ایک جھلک' ص ۶۳

❷ محاسن موضح قرآن ص ۲۱

❸ ایضاً

کے زمانے میں رائج تھی، وہ شاہ صاحب کے زمانے میں باقی نہ رہی تھی۔ شاہ صاحب نے بلا شبہ خواجہ میر درد کی وفات سے صرف ۶ سال بعد ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء میں ترجمہ مکمل کرلیا تھا، لیکن اسی وقت طبع تو نہیں ہو گیا تھا۔ مسودے میں اس کے بعد بھی اصلاح و ترمیم کا عمل جاری رہا ہو گا اور ایسے الفاظ جو پہلے مستعمل تھے اور بعد کو متروک ہو گئے، نظر ثانی میں نکال دیے ہوں گے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بسا اوقات شاگرد، انداز و بیان میں استاد سے بڑھ جاتا ہے۔

ترجمے کی خصوصیات:

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ متعدد خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض مقامات پر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی تحریر کیے گئے ہیں جب کہ اس زمانے کی اردو نظم و نثر میں اس کا رواج نہ تھا۔ ان الفاظ کے تحریر کرنے کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم طبقہ قرآن کے پیغام سے قریب ہو۔"

اس ضمن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کے عربی متن کے ایک اقتباس کا ترجمہ اردو میں ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

"کسی غیر مسلم قوم میں دین حق کی تبلیغ، اتمام حجت کی حد تک کرنا مسلمانوں کی اصل ذمے داری ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی زبان میں اسلامی اصول پیش کیے جائیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔ اگر اس درجے ابلاغ دین نہ ہوگا تو وہ قوم اصحاب اعراف کی حیثیت میں ہوگی۔ ❶"

شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی فتاویٰ عزیزی میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہر قوم کو اس کی زبان میں اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ زبانی اور تحریری افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق حسنہ کو بھی بطور دلیل کے ان کے سامنے پیش کریں۔ اس طرح وہ کفر اور اسلام کے درمیان امتیاز کر کے دکھائیں۔ اگر کسی قوم پر اس طرح اتمام حجت نہ ہوگا تو وہ قوم "اصحاب فترت" کہلائے گی۔ شاہ صاحب کے فارسی الفاظ یہ ہیں: حکم او حکم اہل فترت بود علیٰ اختلاف المذاہب ❷۔

اسی تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کی غرض کو جو شاہ عبدالقادر کے اکابر کا مقصد حیات تھا، خود انھوں نے بھی پیش نگاہ رکھا اور قرآن مجید کے ترجمے میں بھی بعض ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال فرمائے تاکہ ان کے ملک کے ہندو بھی آسانی سے اس کو سمجھ سکیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام کی نشر و ترویج اسی بولی میں کرنی چاہیے جو لوگوں کے لیے زیادہ مؤثر اور مفید ہو۔

شاہ صاحب کے خاندان کے علما کی تصنیفی اور علمی زبان عربی اور فارسی تھی، لیکن وہ اپنے ملک کی ہندی

---

❶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۱۷۔

❷ فتاویٰ عزیزی ص ۱۴۰۔

زبان سے بھی آگاہ تھے۔ شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کے چند ہندی اشعار نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زبان میں شعر کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

جب جیو تھا تب پیو نہ تھا　　اب پیو ہے جیو ناتھ
رحیم پیاسوں یوں ملی　　جوں بوند سمندر ناتھ ❶

بہر حال شاہ ولی اللہ کا خاندان نہایت بلند مرتبت خاندان تھا۔ اس کا ہر فرد علم کی دولت سے مالا مال اور پاک بازی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے، جن کی اس برصغیر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی خدمت میں ان کو اولیت حاصل ہے۔ فارسی میں شاہ ولی اللہ کا ترجمہ اور اردو میں ان کے فرزندان گرامی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اب اردو زبان ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور قرآن کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن جو خصوصیت ان دو ترجموں میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ بالخصوص شاہ عبدالقادر کا ترجمہ جن اوصاف سے مزین ہے، کم وبیش ڈھائی سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی اور ترجمہ اس کی مثال پیش نہ کر سکا۔

وفات:

حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے بدھ کے روز ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ/ ۲۷ جون ۱۸۱۵ء کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے والد محترم کے قریب دفن کیے گئے۔ ان کی وفات کے وقت دونوں بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین زندہ تھے اور تدفین کے موقعے پر نہایت حزن وملال کے ساتھ بار بار کہتے تھے کہ آج ہم کسی انسان کو دفن نہیں کر رہے ہیں بلکہ علم وعرفان کو دفن کر رہے ہیں۔

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (ص ۱۲۹) میں ان کی تاریخ وفات ۱۹ رجب ۱۲۴۲ھ/ ۱۶ فروری ۱۸۲۷ء لکھی ہے جو صحیح نہیں، مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے بھی تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۶۴) میں یہی تاریخ رقم کی ہے جو غلط ہے۔ اسی طرح شاہ رفیع الدین کی تاریخ ارتحال ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۸۔ اگست ۱۸۱۸ء ہے، لیکن مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (ص ۶۶) میں اور مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے تراجم علمائے حدیث ہند (ص ۶۵) میں ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء لکھی ہے جو قرین صحت نہیں ❷۔

❶ انفاس العارفین، ص ۸۱

❷ شاہ عبدالقادر دہلوی کے حالات کے لیے دیکھیے: نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۵، ۲۹۶ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۹ ــــ آثار الصنادید، ص ۲۶۹۔ حیات ولی ص ۶۳۵ تا ۶۴۱۔ واقعات دارالحکومت دہلی، ج ۲ ص ۵۸۸، ۵۸۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱۔ علم وعمل ج ۱ ص ۲۴۹۔ ابجد العلوم ص ۹۱۵۔ الیانع الجنی ص ۷۵۔ تراجم الفضلا ص ۱۷۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۶۴، ۶۵۔ رود کوثر ص ۵۹۶، ۵۹۷۔

۲۴- مفتی عبدالقیوم صدیقی بڑھانوی

مفتی عبدالقیوم صدیقی بڑھانوی تیرھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے عالم کبیر' شیخ و امام اور نامور محدث وفقیہ تھے۔ جماعت فقہا کے مشاہیر اور اکابر علما میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اپنے دور کے بہت بڑے مفتی اور مسائل میں مرجع خلائق تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا عبدالحی بڑھانوی' دادا کا ہبۃ اللہ اور پڑدادا کا نوراللہ تھا۔ نسباً صدیقی تھے اور اصل وطن بڑھانا (ضلع مظفر نگر' یوپی) تھا۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی اپنے عہد کے معروف عالم دین تھے۔ ان کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

مفتی عبدالقیوم بڑھانوی کی ولادت ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء کو بڑھانہ میں ہوئی۔ خاندان کے تمام افراد علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ابتدائی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ صرف ونحو کے مختصر رسائل اور فنون ریاضیہ سید نصیر الدین حسینی شافعی سے پڑھے جو ماں کی طرف سے حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی اولاد میں سے تھے۔ بعض درسی کتابوں کی تحصیل مولانا نصیر الدین لکھنوی سے کی جن کا سلسلۂ درس دہلی میں جاری تھا۔

ان کے والد مولانا عبدالحی بڑھانوی امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ بیٹے نے بھی صغرسنی میں سید صاحب کی بیعت کر لی تھی۔

مولانا عبدالحی کے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے دو رشتے تھے۔ ایک یہ کہ مولانا عبدالحی کی پھوپھی شاہ صاحب کی اہلیہ تھیں۔ دوسرے شاہ صاحب کی ایک صاحب زادی کی شادی مولانا سے ہوئی' لیکن ان سے مولانا کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا نے اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کیا' جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے جو مولانا کے اکلوتے فرزند تھے۔

عبدالقیوم کی تربیت نہایت اچھے طریقے سے ہوئی تھی۔ چھوٹی عمر میں سید احمد بریلوی کے سلسلہ بیعت میں شامل ہو گئے تھے۔ جس زمانے میں سید صاحب نے جہاد کے لیے عزم سرحد کیا' عبدالقیوم کا سن بارہ تیرہ سال کا تھا اور سید صاحب کے ساتھ سرحد چلے گئے تھے۔ مولانا عبدالحی بھی وہیں تھے۔ مولانا نے ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) کو وفات پائی۔ یوں تو سید صاحب عبدالقیوم پر پہلے ہی سے بہت شفقت فرماتے تھے' لیکن باپ کی وفات کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے اور ہر لحاظ سے ان کا خیال رکھتے۔ بعد میں اس لیے انھیں واپس وطن بھیج دیا تھا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی اطلاع ہو گی تو بیٹے کا خیال بھی دل میں آئے گا' اس سے اور مغموم ہوں گی۔ بیٹا ان کے پاس ہو گا تو کسی حد تک شدت غم میں کمی آ جائے گی۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین بھی سید صاحب کے لشکر میں شامل تھے' وہ بھی کم عمر بھانجے کے ساتھ وطن واپس آئے۔

علاقہ سرحد سے واپس آ کر عبدالقیوم دہلی میں شاہ محمد اسحاق دہلوی اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوب کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ شاہ محمد اسحاق سے حدیث وفقہ کی تکمیل کی اور شاہ محمد یعقوب سے علم فرائض کی کتابیں پڑھیں۔ شیخ محمد عظیم سے جو سید صاحب سے فیض یافتہ تھے اور ٹونک میں فروکش تھے' اخذ طریقت کیا اور عرصے تک ٹونک میں ان کی صحبت میں رہے۔ شادی شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحب زادی امتہ الغفور سے ہوئی' جو بہت عابدہ وزاہدہ اور عالمہ خاتون تھیں اور حدیث وفقہ میں عبور کا یہ عالم تھا کہ مفتی صاحب جب بھوپال میں عہدۂ افتا پر فائز تھے تو بعض فقہی نوعیت کے مسائل میں ان سے رجوع فرماتے تھے ❶۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی صاحب مع اہل وعیال کے حجاز مقدس گئے' سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوئے اور کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ اسی اثنا میں والیہ بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم حج کے لیے مکہ مکرمہ گئیں' وہاں مفتی صاحب ممدوح کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ سے نہایت متاثر ہوئیں اور بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی۔ وہ اہل وعیال سمیت بھوپال آئے تو وسعت علم اور کتاب وسنت پر عبور کی وجہ سے ریاست بھوپال کا منصب افتا پیش کیا اور سکونت کے لیے قطعہ زمین عطا فرمایا۔

مفتی صاحب نہایت پابند شریعت اور متبع کتاب وسنت تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ والیہ بھوپال نے ان کی اہلیہ محترمہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور انھیں محل میں بھیجنے کے لیے کہا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ والیہ بھوپال نے پیغام بھیجا کہ اگر آپ انھیں محل میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تو میں خود ان سے ملاقات کے لیے آپ کے گھر آ جاؤں گی۔ فرمایا آپ پردہ نہیں کرتیں' اس لیے اجازت نہیں دے سکتا۔ برقع اوڑھ کر آئیں تو ملاقات کر سکتی ہیں۔

علمائے وقت کے نزدیک مفتی صاحب نہایت قدر ومنزلت کے حامل تھے۔ کبھی دہلی تشریف لے جاتے تو میاں سید نذیر حسین دہلوی ان کی خدمت میں جاتے اور انتہائی احترام سے ان کی مجلس میں بیٹھتے' حالانکہ میاں صاحب عمر میں ان سے بڑے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں بھی ان کی بہت تکریم کرتے اور مختلف مسائل میں ان سے گفتگو فرماتے۔

علم وحلم' انکسار وتواضع' وعظ وتذکیر' علو اخلاق اور درس وافادہ میں اپنے اسلاف کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ منصب افتا کی بھاری ذمے داریوں کے باوجود تدریس قرآن وحدیث میں مشغول رہتے۔ ان سے متعدد حضرات علما نے استفادہ کیا' جن میں مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی اور مولانا احمد حسن امروہوی شامل ہیں۔

مفتی صاحب ممدوح میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ خواب کی تعبیر دینے میں ماہر تھے' جو تعبیر دیتے' صحیح ثابت ہوتی۔

---

❶ دیکھیے ''فقہائے ہند ج ۸

آخر عمر میں خرابی صحت کی بنا پر بھوپال سے اپنے وطن بڑھانہ منتقل ہو گئے تھے اور پھر وہیں ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں فوت ہوئے۔ اڑسٹھ سال کی عمر پائی ❶۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے ”تراجم علمائے حدیث ہند“ (ص ۱۲۴) میں مقام وفات و تدفین بھوپال لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

۲۵-مولانا عبداللہ مدراسی

ارض ہند کے شہر مدراس اور اس کے گردونواح میں بے شمار ارباب علم اور اصحاب کمال پیدا ہوئے۔ جنھوں نے تصنیف و تدریس کے میدان میں بڑی شہرت پائی اور اپنی خدمات گوناگوں کی وجہ سے عالی مرتبے کو پہنچے۔ ان خوش نصیب حضرات میں مولانا عبداللہ مدراسی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی قاضی صبغت اللہ ❷ اور جد امجد کا شیخ محمد غوث تھا۔ یہ تمام حضرات علم و عرفان کی دولت سے مالا مال تھے اور حدیث و فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔

مولانا عبداللہ مدراسی کی ولادت ۲۸ ربیع الاول ۱۲۳۶ھ/ یکم جنوری ۱۸۲۱ء کو ہوئی۔ اپنے والد مکرم قاضی صبغت اللہ مدراسی اور عم محترم سے مروجہ علوم کی کتابیں پڑھیں۔ قاضی ارتضیٰ علی گوپاموی اس زمانے کے جید اساتذہ میں سے تھے' ان سے بھی اکتساب علم کیا۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی متعدد علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔

اس عہد کے سرکاری مناصب میں صدارت کا منصب بہت اہم تھا اور یہ اسی شخص کو تفویض ہوتا تھا جو علم و ادراک بالخصوص فقہ میں عبور رکھتا ہو۔ مولانا عبداللہ فقہ شافعی میں اس معیار پر پورا اترتے تھے اور اس علاقے میں شوافع اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ مولانا ممدوح کو ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں یہ منصب جلیلہ حکومت مدراس کی طرف سے عطا کیا گیا۔

مولانا موصوف جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ بے حد عابد و زاہد اور متقی تھے۔ سرزمین حرم سے انھیں بہت محبت تھی۔ چنانچہ وہ چار مرتبہ حج و زیارت کے لیے عازم حجاز ہوئے۔ اس زمانے میں یہ انتہائی مشکل سفر تھا۔ ایک مرتبہ سال بھر سے زیادہ عرصہ وہاں رہے' اس طرح انھوں نے پانچ حج کیے اور یہ بہت بڑی سعادت تھی جو انھیں حاصل ہوئی۔

وہ نامور مصنف بھی تھے اور کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں' چونکہ مسلکاً شافعی تھے' لہٰذا فقہ شافعی کے سلسلے میں ان کی خدمات زیادہ ہیں۔ تصنیفات یہ ہیں۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۷' ۲۹۸۔ تراجم علمائے حدیث ہند' ص ۱۲۲ تا ۱۲۴۔ جماعت مجاہدین ص ۱۱۵' ۲۹۳' ۲۹۴۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۴۶۸۔ طی الفراسخ الی منازل البرازخ ص ۵۱۳' ۵۱۴۔

❷ قاضی صبغت اللہ کے حالات کے لیے دیکھیے ”فقہائے ہند ج ۸

۱- الفوائد الغوثیه فی فقه الشافعیه: یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فقہ شافعی سے متعلق ہے۔
۲- تعلیقات علی مختصر ابی شجاع: یہ بھی فقہ شافعی کے بارے میں ہے۔
۳- تخریج احادیث البیضاوی: تفسیر بیضاوی میں درج احادیث کی تخریج۔
۴- تحفة الاحبه فی بیان استحباب قتل الوزغه۔
۵- تحفة المحبین لمولد حبیب رب العالمین۔
۶- کتاب الزجر الی منکر شق القمر۔
۷- اوضح المناسك۔

یہ عالم کبیر آخری حج سے واپس آرہے تھے کہ ۲۵ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ/۱۴۔ جون ۱۸۷۱ء کو دکن کے شہر "گلبرگہ" (ہندوستان) میں انتقال کر گئے ❶۔

۲۶- مولانا عبداللہ مدراسی

مدراس کے علمائے کرام اور فقہائے عظام میں ایک اور مولانا عبداللہ مدراسی کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔ عبداللہ بن عبدالقادر بن صادق بن عبداللہ بن نظام الدین۔ یہ بھی شافعی تھے۔ اور محتشم الدولہ، نجشی الملک، میر عسکری خان بہادر سالار جنگ ان کے خطابات تھے۔

۲۷ شعبان ۱۲۰۵ھ/ یکم مئی ۱۷۹۱ء کو پیدا ہوئے اور مولانا محمد حسین مدراسی، بحرالعلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی اور مولانا غلام غوث شافعی مدراسی سے علم حاصل کیا۔ بحرالعلوم اس زمانے میں مدراس میں قیام پذیر تھے اور طلبا کی کثیر جماعت ان کے حلقہ درس میں شریک تھی۔ مولانا محمد غوث مدراسی شافعی المسلک تھے اور ان مولانا عبداللہ مدراسی کے جدامجد تھے، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحے میں ہوا۔ وہ صاحب ترجمہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

مولانا عبداللہ مدراسی کا شمار اپنے علاقے اور عہد کے اصحاب علم میں بھی ہوتا تھا اور ارکان دولت میں بھی۔! امیر مدراس نے ان کو اپنے عساکر کا سربراہ مقرر کیا تھا اور ان کی سرکاری خدمات کی وجہ سے وہ خطابات عطا کیے تھے، جو ابتدائی سطور میں بیان ہوئے ہیں۔ سرکاری کام کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہتے۔ ان کی تصنیفات جو خاص اہمیت کی حامل ہیں یہ ہیں:۔

۱- الدر الثمین فی شرح الاربعین: امام نووی کی اربعین کی شرح۔
۲- شرح اسماء النبی صلی الله علیه وسلم: رسول اللہ ﷺ کے اسمائے گرامی کی شرح۔
۳- رجال الصحیح لمسلم بن الحجاج نیساپوری۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ج ۷ ص ۳۰۱ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

مدراس کے اس نامور عالم وفقیہ نے ۲۶ محرم ۱۲۶۷ھ/ یکم دسمبر ۱۸۵۰ء کو مدراس میں وفات پائی اور نماز جنازہ شیخ محمد غوث نے پڑھائی۔ جنازے میں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا اور حزن وملال کی وجہ سے شرکائے جنازہ کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ ہر حلقے میں عزت واحترام کے مالک تھے اور لوگ ان سے نہایت خوش تھے۔ وفات پر سب نے انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔ مدراس کے قریب میلا پور میں مدفون ہوئے۔ باسٹھ سال عمر پائی ❶۔

۲۷- مولانا عبداللہ الہ آبادی

مولانا عبداللہ صدیقی محمدی الہ آبادی' تیرھویں صدی ہجری کے شیخ وعالم اور محدث وفقیہ تھے۔ بمقام مئو پیدا ہوئے جو الہ آباد (یوپی) کے نواح میں واقع ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی حصول علم میں مشغول ہو گئے اور الہ آباد اور گردونواح کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے اخذ علم کیا۔ خط بہت اچھا تھا۔ قیام دہلی کے زمانے میں حواشی وتعلیقات کے ساتھ متعدد متداولہ' وغیر متداولہ کتابوں کی کتابت کی۔ کتابت وتحریر میں بہت تیز تھے۔ ایک روایت کے مطابق پوری صحاح ستہ کی اپنے ہاتھ سے کتابت کی اور پھر یہ ضخیم کتابیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اولاد واحفاد سے پڑھیں۔ یہ بھی منقول ہے کہ ان کتابت شدہ کتابوں کی تکمیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کی۔

مولانا عبداللہ الہ آبادی کا تذکرہ صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اپنی تصنیف ''تذکرۃ النبلا'' میں کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک نسخہ مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی کے کتب خانے (رائے بریلی) میں محفوظ ہے۔ سید صاحب موصوف نے نزہۃ الخواطر میں ان کا مختصر ترجمہ ''تذکرۃ النبلا'' کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے۔ یہ سطور اسی سے مستفاد ہیں۔

مولانا عبداللہ محمدی الہ آبادی نسباً صدیقی تھے اور اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور محدث تھے۔ قلیل الدرس لیکن کثیر التصانیف تھے۔ توحید کے موضوع پر انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں' جن میں سے بعض میں شہد کی سی شیرینی ہے اور بعض میں حنظل کی سی تلخی۔ اپنے نقطۂ نظر کے مخالفوں پر سخت تنقید کرتے اور ان پر اظہار خیال میں بہت آگے نکل جاتے۔ ظواہر نصوص کو مدار عمل ٹھہراتے اور اس کا یہ مطلب لیتے کہ دیگر فقہی مذاہب ومسالک کے لوگ مثلاً حنفیہ' مالکیہ' شافعیہ' حنبلیہ وغیرہ نعوذ باللہ کفر کی سرحدوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ طرق تصوف' قادریہ' نقشبندیہ' چشتیہ' اور مجددیہ وغیرہ کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے تھی۔ اپنی کتاب ''اعتصام السنہ'' میں لکھتے ہیں کہ ان کی طرف نسبت بہتر فرقوں میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے' جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱- الیم الزغرب فی لغات الحدیث المنتخب: یہ حروف معجم کی ترتیب سے مرتب کی ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۱' ۲۰۲ بحوالہ تاریخ نوائط۔

۲- العروۃ الوثقیٰ لمنبع سنۃ سید الوریٰ: یہ کتاب حدیث سے متعلق ہے اور اس میں ابواب فقہی کی ترتیب سے احادیث درج کی ہیں۔

۳- عہدۃ الصلوٰۃ وفائز النجاۃ: اس میں حدیث کی روشنی میں نماز کے مسائل بیان کیے ہیں۔

۴- اعتصام السنۃ وقامع البدعۃ: یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک باب میں اتباع سنت اور رد بدعت سے متعلق قرآن مجید کے احکام بیان کیے ہیں اور دوسرے میں اس موضوع کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ درج کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں تصنیف کی۔

۵- النبراس المنیر لصلوۃ الدیا جیر۔

۶- معین الابرار علی الصلوٰۃ فی اللیل والنہار: اس میں یہ وضاحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات دن کی نماز میں کون کون سی سورتیں تلاوت فرماتے تھے۔

۷- الریاض الانضر فی الفقہ الاکبر: اس کتاب میں نماز کے مسائل صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں اور کتاب ابواب فقہ کی ترتیب سے مرتب کی ہے۔

۸- صمصام الحدید المسلول: بدعات‘ رسوم ورواج‘ رائے اور تقلید کے رد میں ہے۔

۹- الاعجاز المتین فی معجزات سید المرسلین: رسول اللہ ﷺ کے معجزات کے سلسلے میں۔

۱۰- ترجمہ شرح الصدور۔

۱۱- البدور السافرہ۔

۱۲- سیف الحدید فی قطع المذاہب والتقلید۔

ان کتابوں کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے جو درج ذیل ہیں:

۱- اللباب فی صلوٰۃ الاحباب: یہ مختصر سا رسالہ اردو میں ہے اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں تصنیف ہوا۔

۲- العروۃ المتین فی اتباع سنۃ سید المرسلین: یہ رسالہ اردو میں ہے۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں لکھا۔

۳- السیف المسلول فی ذم التقلید المخذول: یہ بھی اردو میں ہے۔ اس کا سن تالیف بھی ۱۲۷۳ھ ہے۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ صدیقی الہ آبادی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم‘ محدث‘ فقیہ اور مصنف تھے۔ سنت کی نشرواشاعت ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا۔ فقہی نوعیت کے بعض اختلافی مسائل میں متشدد تھے۔ تاہم ان کا مرتبہ علمی بہت اونچا تھا اور علوم کی خدمت میں ممتاز مقام رکھتے تھے ___ ان کی تاریخ ولادت ووفات کا علم نہیں ہوسکا❶۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

۲۸- سید عبداللہ غزنوی

سرزمین پاک و ہند، علم و عمل اور فضل و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ اس میں بے شمار علما و صلحا اور صوفیا و اتقیا نے یا تو جنم لیا یا کسی اور ملک سے یہاں آکر آباد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جو ایک دوسرے ملک (افغانستان) سے ہجرت کر کے یہاں آئے۔

نام و نسب:

ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ عبداللہ بن محمد بن محمد بن محمد شریف عمرزئی غزنوی۔ اپنے دور کے شیخ و امام اور محدث و فقیہ تھے۔ زہد و عبادت، ریاضت و تصوف اور جہاد فی سبیل اللہ میں یگانہ عصر تھے۔ ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء کو قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے جو ضلع غزنی میں واقع ہے۔ مولانا غلام رسول (قلعہ والے) لکھتے ہیں کہ ان کے گاؤں کا نام "گیرو" ہے جو ہلال پہاڑ کے متصل ضلع غزنی میں ہے اور نسبی تعلق عمرزئی قبیلے سے ہے ❶۔

والدین نے ان کا نام محمد اعظم رکھا تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا تھا۔ فرماتے ہیں:

محمد کہ اعظم از کائنات، افضل از مخلوقات است، ہماں رسول اللہ ہست۔ تسمیہ ما عبداللہ خوب است ❷۔

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا اسم گرامی رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہی کو زیب دیتا ہے جو تمام کائنات سے معظم اور تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ ہمارا نام تو عبداللہ ہی بہتر ہے۔

ان کے فرزند گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی فرماتے ہیں کہ عبداللہ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اللہ کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار و اقرار ہے۔

خاندان:

مولانا سید عبداللہ کے آبا و اجداد اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے بارے میں تفصیلات کا علم تو نہیں ہو سکا، تاہم ان کے صاحب زادے مولانا عبدالجبار غزنوی کی ایک عبارت سے جو انھوں نے اپنے والد مکرم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان صالحیت اور تقوے کے لحاظ سے غزنی میں خاص

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول ص ۲۸

❷ ایضاً

شہرت رکھتا تھا۔ یہ سادات کا خاندان تھا' جس کو دین داری اور احکام اسلام کی اتباع میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ خاندان غزنی کے معروف سادات میں سے تھا' لیکن مولانا عبداللہ صاحب کی یہ حالت تھی کہ اگر ان سے کوئی شخص یہ سوال کرتا کہ آپ کا تعلق سادات سے ہے؟ تو فرماتے لوگ ہمیں سید کہتے ہیں' مگر عجم میں انساب کے سلسلے کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان سے سادات کی صحیح طور پر نشان دہی کرنا ممکن نہیں رہا❶۔

مولانا عبداللہ غزنوی پر انکسار اور تواضع کا غلبہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے اپنے اسلاف سے متعلق کسی خاص بات کی وضاحت نہیں کی' بلکہ اظہار عجز کرتے ہوئے ایک مکتوب میں فرمایا:

صاحبا! فقیر و فقیر زادہ ام و غریب زادہ' عاجزی و گم نامی و خاک ساری کار ماست و گوشہ نشینی و زاویہ گزینی شعار ماست۔

(میں فقیر آدمی ہوں اور فقیر زادہ و غریب زادہ ہوں' عاجزی' گم نامی اور خاک ساری ہمارا کام' گوشہ نشینی ہماری عادت اور زاویہ گزینی ہمارا شعار ہے۔)

اس انکسار میں یہ حقیقت بہر حال نمایاں ہے کہ اس خاندان کے اسلاف راہ طریقت پر گام زن اور جادۂ درویشی پر قدم فرسا تھے۔ اگرچہ ہماری تاریخ نے ان کے نقوش علم اور آثار تصوف کو محفوظ نہیں رکھا' تاہم یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عہد کے ممتاز اہل علم اور نامور اصحاب سلوک تھے۔

قریہ صاحب زادگان:

حضرت سید عبداللہ غزنوی کے بزرگوں کے آثار اب بھی ان کے قدیم وطن (افغانستان) میں موجود ہیں اور وہاں کے لوگ عزت و احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا سید داؤد غزنوی کے بھتیجے سید عثمان غزنوی صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ ۱۹۷۱ء میں ایک بزرگ لاہور میں ان کے مکان پر تشریف لائے۔ ان کی وضع قطع' لباس اور گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت نیک اور پرہیز گار آدمی ہیں۔ وہ غزنی کے ایک گاؤں سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ مولانا عبداللہ غزنوی کے آباؤ اجداد کی قبریں اب تک محفوظ ہیں۔ لوگوں نے ان کے ارد گرد دیوار تعمیر کر دی ہے کہ وہ منہدم نہ ہوں۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ وہاں جاتے اور اصحاب قبور کے لیے دعا کرتے ہیں۔ پرانے لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کون سی قبر مولانا عبداللہ غزنوی کے کس بزرگ کی ہے اور وہ تقویٰ و تدین کے کس درجے پر فائز تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کی پرہیز گاری اور دین داری سے لوگ واقف ہیں' اور جن مصائب و آلام سے انھیں دو چار کیا گیا' اس کی تفصیلات سے بھی وہ آگاہ ہیں' کس بادشاہ نے انھیں کیا تکلیفیں پہنچائیں اور کیوں پہنچائیں' یہ تمام واقعات

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی' ص ۲

انھیں یاد ہیں اور اپنی مجلسوں میں ان واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ اب وہ گاؤں جس میں وہ پاک باز حضرات قیام پذیر تھے، اجڑ چکا ہے، لیکن اس کا نام ختم نہیں ہوا۔ اسے اب ''قریہ صاحب زادگان'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے قریب جو گاؤں آباد ہے اور جہاں بس بھی جاتی ہے، اس کا نام ''قریہ عبدالشکور'' ہے۔ ''قریہ صاحب زادگان'' کو دیکھنے اور وہاں کی قبروں پر دعا کرنے والے لوگ بس کے ذریعے قریہ عبدالشکور جاتے ہیں، وہاں سے پیدل قریہ صاحب زادگان پہنچتے ہیں۔

عثمان غزنوی صاحب نے بتایا کہ وہ شخص تین دن ان کے پاس رہا اور اس اثنا میں مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے اسلاف سے متعلق جو باتیں وہاں مشہور ہیں، وہی سناتا رہا۔ وہ غریب آدمی معلوم ہوتا تھا اور بہت مشکل سے پوچھتے پچھاتے یہاں پہنچا تھا۔ جاتے وقت وہ ان سے مل کر نہیں گیا اور اس نے ان سے نہ روپیہ پیسا لیا، نہ کوئی چیز۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، مولانا عبداللہ غزنوی کے گاؤں کا نام ''گیرو'' تھا۔ معلوم ہوتا ہے ''قریہ صاحب زادگان'' اس کا نام ان کے وہاں سے آنے کے بعد پڑا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے اسلاف نیکی میں مرجع خلائق تھے اور افغانستان کے لوگ ان سے بہت متاثر تھے۔ اور یہ تاثر اب تک قائم ہے۔

حصول علم:

حضرت عبداللہ غزنوی عالم طفولیت ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ علوم مروجہ کی تحصیل غزنی کے علما سے کی۔ ان کے سرعت ادراک اور حدت فہم سے لوگ متعجب ہوتے۔ کتب درسیہ کے مشکل سے مشکل مقام آسانی سے ان کے ذہن کی گرفت میں آ جاتے۔ ابتدائے عمر ہی سے کتاب اللہ اور حدیث رسول ﷺ سے شغف و تعلق تھا۔ علوم متداولہ کے مختلف گوشوں پر اس قدر حاوی تھے کہ غزنی کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ کسی مسئلے میں اگر انھیں کوئی الجھن پیش آتی تو کوئی عالم اطمینان بخش جواب نہ دے پاتا۔ اس زمانے میں قندھار میں ملا حبیب اللہ قندھاری کا سلسلۂ درس جاری تھا جو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور مصنف تھے۔ مولانا عبداللہ صاحب غزنی سے چلے اور راستے کی بے پناہ مشکلات کو عبور کرتے ہوئے قندھار پہنچے۔ وہاں ملا ممدوح کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ وطن رہے اور پھر عازم قندھار ہوئے۔ اس طرح ملا حبیب اللہ سے انھوں نے خوب استفادہ کیا۔ ملا حبیب اللہ اپنے اس شاگرد اور مرید کے بہت مداح تھے۔ ان کی قوت فہم کی سب علما کے سامنے تعریف کرتے اور صاف لفظوں میں فرماتے۔

مسائل دینیہ راچناں کہ ایں شخص می فہمد من خود نمی فہم۔

(دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا ہوں۔)

اس کے بعد ملا صاحب نے ان کو قندھار تشریف لانے سے روک دیا اور فرمایا اگر آپ کو کبھی کوئی

مشکل پیش آئی تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا اور تمام عقدے حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ سید صاحب فرمایا کرتے:

رب جل شانہ موافق گفتہ شیخ بامن معاملہ کردہ است ❶۔

(میرے پروردگار نے میرے ساتھ وہی معاملہ کیا جو شیخ نے فرمایا۔)

''ملفوظات ملا حبیب اللہ قندھاری'' کے نام سے ملا صاحب کے ایک مرید اور شاگرد نے ان کے ملفوظات جمع کیے ہیں، جو غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں ملا ممدوح نے مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے اور ان کے زہد واتقا اور ورع وعبادت کی تعریف کی۔

توحید سے متعلق ارشادات:

مولانا عبداللہ غزنوی مسئلہ توحید سے متعلق نہایت سخت تھے۔ یہ ملا حبیب اللہ قندھاری کی صحبت وتلمذ کا اثر تھا۔ توحید کے بارے میں ان کے ارشادات لائق تذکرہ ہیں۔ فرماتے ہیں، اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنا شرک فی العبادت ہے، نیز کسی سے استعانت کرنا بھی شرک ہے۔ تمام امور اور سب معاملات میں فقط اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

فرماتے ہیں، بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی قبروں پر اس نیت سے حاضری دینا کہ ان کی برکت اور توجہ سے کوئی مقصد حل ہو جائے، سراسر توحید کے خلاف اور کلمہ شہادت کے منافی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں صلحائے امت کی قبروں پر کچھ مانگنے اور طلب کرنے کے لیے نہیں، بلکہ حصولِ برکت کے لیے جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہاں میری دعا کو جلد درجہ قبولیت حاصل ہو گا، تو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عبادت کے لیے مسجد مقرر کی ہے، قبروں کو مقام عبادت قرار نہیں دیا۔ جیسا کہ اغاثۃ اللہفان میں امام ابن قیم نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ صاحب فرماتے ہیں:

زمانہ طفولیت میں مجھے جنگل میں جا کر تنہائی میں اللہ کی عبادت کرنے اور دعا مانگنے کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں بعض اہل اللہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ میرے شوق عبادت کو دیکھ کر فرماتے کہ تمھاری پیشانی میں نور کی شعاعیں دکھائی دیتی ہیں، اور تاکید کرتے کہ علمائے سوء کی صحبت اختیار کر کے اپنے قلب وروح کی کیفیتوں کو نقصان نہ پہنچانا۔

فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل سے تمام اوصاف ذمیمہ کو میرے دل اور جسم سے خارج کر دیا ہے۔ مجھے مرتبہ احسان سے نوازا اور ماسوی اللہ کو میرے دل سے باہر نکال پھینکا ہے۔ مجھ پر اس نے یہ حقیقت منکشف فرما دی کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی مربی نہیں۔ ہر شے اللہ کے قبضے اور اختیار میں ہے۔

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۹۔

فیضان عام:

سلوک وطریقت کے دور آغاز میں حضرت عبداللہ صاحب غزنوی لوگوں سے میل جول سے احتراز کرتے۔ یہاں تک کہ عزیزوں اور رشتے داروں سے بھی دور رہتے۔ ان دنوں خواجہ ہلال پہاڑ میں مقیم ہو گئے تھے جو آبادی سے دور تھا۔ لیکن لوگوں کو پتا چلا تو وہاں پہنچنے لگے۔ اس زمانے میں ان پر کیفیت جذب کا غلبہ تھا اور وہاں کے اصحاب علم اور ارباب فضل بھی اس پر متحیر تھے۔ اب ان کی شہرت حدود غزنی سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی تھی اور لوگ استفادے اور زیارت کے لیے حاضر خدمت ہونے لگے تھے' جن میں علما و مشائخ بھی شامل تھے۔ جب سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے تو فضا گونج اٹھتی اور محسوس ہوتا کہ شجر و حجر بھی ان کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول اور حالت وجد و اضطراب میں ہیں۔ بعض لوگ ان کا لباس دیکھ کر ہی وجد میں آ گئے' چنانچہ ایک طالب علم نے ان کی پوستین اٹھائی تو وجد طاری ہو گیا اور وہ ''مرید پوستین'' کے نام سے موسوم ہوا[1]۔

دنیا داروں سے کبھی تعلق نہیں رکھا' ان سے ہمیشہ دامن کشاں رہے۔ اولاد اور متعلقین کو بھی ان کی صحبت و مجلس سے دور رہنے کی تاکید فرماتے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے عمر بھر امرا اور اصحاب مال سے محفوظ رکھا۔

جذبہ احیائے سنت:

حضرت سید صاحب میں احیائے سنت اور اتباع شریعت کا جذبہ نہایت شدید تھا۔ خلاف سنت کوئی عمل اور حرکت برداشت نہ کرتے۔ لیکن اس وقت افغانستان کی دینی حالت بالکل دگرگوں تھی۔ عوام اور خواص بدعات کے خوگر اور مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے۔ علما اور مشائخ کی حالت بھی یکسر بدلی ہوئی تھی۔ وہ بھی بدعات کو دین اور غلط رسوم کو اسلام قرار دینے لگے تھے۔ حضرت ممدوح کو اس صورت حال سے سخت ذہنی اور روحانی تکلیف ہوتی۔ بظاہر حالات اگرچہ ناموافق تھے' لیکن وہ اللہ کا نام لے کر میدان عمل میں اترے' اشاعت سنت اور تبلیغ قرآن و حدیث پر کمر ہمت باندھی اور بدعات کی تردید اور مشرکانہ رسوم و عوائد کی مخالفت شروع کی۔ اس پر قندھار کے قاضی اور علمانے تو بہت خوشی کا اظہار کیا' کیونکہ وہ ملا حبیب اللہ قندھاری سے متاثر تھے اور مسلک محدثین کے حامی اور پابند تھے' لیکن ملا کٹہ اور دیگر دنیا پرست علما اس سے نہایت برافروختہ ہوئے اور علانیہ دشمنی اور مخالفت پر اتر آئے۔

اس زمانے کے قندھار کے قاضی کا نام غلام تھا۔ قاضی غلام مولانا عبداللہ غزنوی کے حامی اور ان کے انداز دعوت و تبلیغ کے موید تھے۔ ان کو ملا کٹہ کی مخالفت سے بہت دکھ ہوا۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا جو ملا سعد الدین مقری کو تحریر کیا۔ اس خط میں ملا کٹہ کے نقطہ نظر کو غلط ٹھہرایا اور مولانا کی تعریف کی۔

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۴

یہ خط فارسی میں ہے اور مولانا عبداللہ غزنوی کی اس سوانح عمری میں درج ہے جو مولانا عبدالجبار غزنوی نے لکھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

وہ حقائق و معارف آگاہ الموفق من عنداللہ' قائد الخلق الی صراط اللہ محی السنہ و قامع البدعہ میاں محمد اعظم ❶ صاحب زادہ کے بارے میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ رجل مملو بالسنة من الفرق الی القدم (یہ شخص سر سے پاؤں تک سنت میں ڈوبا ہوا ہے۔) انھوں نے سیر و سلوک باطن میں نسبت اویسی حاصل کرنے کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے طریقہ نقشبندیہ میں قدم رکھا اور اس کے سیر و سلوک کی تکمیل کی اور اس میں مجاز ہوئے۔ اس کے بعد سید آدم بنوری قدس اللہ سرہ کے طریقے کا بھی اکتساب کیا اور سلسلہ بنوریہ میں مجاز ہوئے۔ مختصر یہ کہ میاں محمد اعظم کا ظاہر' تقویٰ اور شریعت مصطفوی کے زیور سے آراستہ ہے اور ان کا باطن' اہل صفا کے احوال و مقامات سے مزین ہے۔ اس صاحب زادے میں نقص صرف یہ ہے کہ اپنے آپ کو ملا کٹہ کے محبین و مخلصین میں شمار نہیں کرتے۔ ملا کٹہ بزرگ دار صاحب زادہ صاحب کو کبھی وہابی کہتا ہے اور کبھی بدعتی کہہ کر پکارتا ہے۔ بلکہ بعض قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہے کہ ملا کٹہ نے غلجائی کے ارد گرد کے علاقوں میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پھیلانے کے لیے خطوط بھی ارسال کیے ہیں ❷۔

علمائے سوا اور امیر کابل کی ایذا رسانی:

جب مولانا نے علی الاعلان کتاب و سنت کی دعوت دینا شروع کی' توحید خالص کا نعرہ لگایا اور بدعات کی مخالفت اور مشرکانہ رسوم کی تردید میں آواز بلند کی تو غزنی کی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا' اس لیے کہ وہاں کے لوگ کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور ان کے کان اس سے آشنا نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اہل علم اور ارباب حکومت اور خاص و عوام کے وہ طبقے جو محض مولانا کی نیکی اور کرامتیں دیکھ کر ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے تھے' ان کی مخالفت کرنے لگے اور اذیت رسانی پر اتر آئے۔ مولانا فرماتے تھے کہ مسائل میں حدیث رسول ﷺ کو مدار عمل ٹھہرانا ضروری ہے۔ اگر کسی فقہی مذہب کا کوئی پہلو حدیث کے خلاف ہو تو اس کو حدیث کے مقابلے میں ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن وہاں کے علما اس بات کو نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خلاف مذہب فقہی عمل بالحدیث کی ضرورت نہیں۔ اس مسئلے پر وہ مولانا سے مباحثے اور مناظرے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن ان پر مولانا کی شخصیت اور للّٰہیت کا اس درجے اثر پڑا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مولانا اپنے موقف میں صحیح ہیں۔ یہ تو غزنی اور اس کے مضافات کے علما کا حال تھا۔ دوسرے علاقوں کے اہل علم کو حالات کا علم ہوا تو انھوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی اور اس مسئلے پر مولانا کے ساتھ گفتگو اور بحث کا ارادہ ترک کر دیا۔

❶ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا' مولانا عبداللہ غزنوی کا اصل نام محمد اعظم تھا۔ عبداللہ انھوں نے بعد میں رکھا تھا۔

❷ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی ص ۹' ۱۰

اس کے بعد مخالفین نے مولانا کے ساتھ باقاعدہ جنگ و جدال کا منصوبہ بنایا اور اپنے حامیوں کو ان پر حملہ آور ہونے کے لیے اکسایا۔ یہ نہایت خطرناک منصوبہ تھا۔ اس کا علم مولانا کے عقیدت مندوں اور اصحاب ارادت کو ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی تعداد بھی کم نہ تھی اور وہ ایسے نازک موقعے پر اپنے مرشد اور استاد کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں کی یہ چال بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔

اب علمائے سو نے ایک اور پینترا بدلا۔ اکٹھے ہو کر افغانستان کے دارالسلطنت کابل پہنچے اور بعض امرا و وزرا کو اپنا ہم نوا بنایا اور ان کی وساطت سے حاکم وقت کے دروازے پر دستک دی۔ اس زمانے میں افغانستان کا حکمران امیر دوست محمد خاں تھا اور اس کے بعض ارکان حکومت مولانا کے معتقد بھی تھے۔ امیر مذکور سے مخالفین نے سیاسی رنگ میں بات کی، جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتا اور متاثر ہو سکتا تھا۔ اس سے کہا کہ یہ شخص آپ کی سلطنت کو ختم کرنے اور بادشاہت کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ اگر اس کو ایک سال کی بھی مزید مہلت دی گئی تو تمام نظام حکومت ناکارہ ہو جائے گا، اس لیے کہ حکومت کے متعدد امرا و وزرا اس کے معتقد و مرید ہیں جو ظاہر ہے اس کے زیر اثر ہیں۔ وہ نظام حکومت کو مختل کرنے میں اس کا ساتھ دیں گے یہ ایسی بات تھی جو آسانی سے امیر دوست محمد خاں کی برہمی کا سبب بن سکتی تھی۔

اس کا علم جب مولانا کے بعض معتقدین کو ہوا تو انھوں نے مولانا کو مشورہ دیا کہ تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ امیر دوست محمد خاں کے طلب کرنے سے پہلے ہی آپ کابل تشریف لے جائیں اور اس کو حقیقت حال سے آگاہ کریں۔ یہ بات اگرچہ مولانا کی طبع بے نیاز کے خلاف تھی، تاہم وہ اپنے مخلص احباب کے مشورے کے مطابق عازم کابل ہوئے اور امیر دوست محمد خاں سے ملاقات کی۔ مخالف نقطہ نظر کے علما بھی امیر کے دربار میں آ گئے، جن میں خان ملا درانی، ملا نصراللہ لوہانی، ملا مشکی انڈری اور بہت سے با اثر علما شامل تھے۔ ان علما نے باہم مشورے سے طے کیا کہ ہمیں مولانا سے فقہی اور دینی مسائل میں مناظرہ اور مباحثہ نہیں کرنا چاہیے، اس میں ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور امیر کے سامنے بھری محفل میں شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ بہتر یہ ہے کہ ان کے خلاف جھوٹی گواہی دی جائے اور گواہوں کے ذریعے یہ بات ثابت کر دی جائے کہ یہ شخص خلاف شرع حرکات کا مرتکب ہے۔ چنانچہ جھوٹے گواہ پیش کیے گئے جنھوں نے امیر کابل سے ایسی باتیں کہیں جو عام طور پر دوسروں کو بھڑکانے کے لیے بعض لوگ کرتے ہیں۔ اس کو بتایا کہ یہ شخص رسول اکرم ﷺ کی بے ادبی کرتا ہے اور حضور ﷺ کی شفاعت کا منکر ہے۔ خود نبوت کا مدعی ہے اور ایسی باتیں زبان سے نکالتا ہے، جن کی رو سے یہ کافر اور مرتد قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اس کو یا تو قتل کر دیا جائے یا ملک سے نکال دیا جائے۔ اس موقعے پر انھوں نے سیاسی نوعیت کا کوئی الزام ان پر عائد نہیں کیا۔ یعنی جو بات تنہائی میں امیر سے کہی تھی، اب مولانا کی موجودگی میں نہیں کہی۔ امیر نے ساری باتیں سنیں تو سمجھ گیا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے اور افترا باندھتے ہیں، لیکن اس میں

علمائے سو کی مخالفت کی جرأت نہ تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ مولانا کی حمایت اور علمائے سو کی مخالفت سے ملک ایک نئے ہنگامے اور فساد کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ مولانا کو ملک بدر کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کو اپنے حدودِ سلطنت سے باہر نکال دیا۔ اس سے ان کے عقیدت مندوں اور احباب کو تو بہت تکلیف ہوئی، لیکن خود انھوں نے کوئی ذہنی یا قلبی پریشانی محسوس نہیں کی۔

جلاوطنی اور حصول علم حدیث:

مولانا نے راہ خدا میں اہل وعیال اور دوست احباب کو چھوڑ کر کابل سے سوات کی راہ لی۔ وہاں سے کوٹھہ پہنچے اور پھر ہزارہ تشریف لے گئے۔ اثنائے سفر میں تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار لوگ ان سے مستفیض ہوئے۔ اس زمانے میں دہلی علم وفضل کا مرکز تھا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا وہاں وسیع حلقہ درس قائم تھا۔ مولانا نے ہزارہ سے دہلی کا قصد کیا اور لاہور اور امرتسر سے گزرتے اور قیام کرتے ہوئے دہلی جا کر حضرت میاں صاحب کے درس میں شریک ہوئے۔ ان سے حدیث پڑھی اور سند واجازہ سے بہرہ یاب ہوئے۔ یہ وہی زمانہ تھا، جب دہلی میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ گرم ہوا، اور شہر میں بموں کے دھماکے شروع ہوئے۔ حضرت میاں صاحب کی مسجد اور مدرسے میں بھی بم گر رہے تھے، لیکن مولانا عبداللہ اس سے قطعاً مضطرب نہ ہوتے تھے۔ مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے بھی ان کے شریک درس تھے۔ ان بزرگوں نے حضرت میاں صاحب سے حدیث کی سند لی اور اپنی نیکی اور خدمت دین کی وجہ سے چار دانگ عالم میں شہرت پائی۔

مراجعت وطن اور مزید اذیتیں:

حضرت میاں صاحب سے حصول سند حدیث کے بعد حضرت عبداللہ غزنوی دہلی سے پنجاب آئے۔ کچھ عرصہ پنجاب کے مختلف بلاد وقصبات میں مقیم رہے اور وعظ ونصیحت اور کتاب وسنت کی تبلیغ کا سلسلہ اس سفر میں بھی حسب معمول جاری رکھا۔ اس اثنا میں وہ امرتسر میں بھی مقیم رہے۔ پھر ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہوتے ہوئے واپس غزنی تشریف لے گئے۔ انھیں خیال تھا کہ اب جلاوطنی پر خاصی مدت گزر گئی ہے اور ان کے بارے میں امیر دوست محمد خاں کا نقطۂ نگاہ بدل چکا ہوگا۔ لیکن وطن آئے ابھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ناگہاں امیر دوست محمد خاں کے فرستادہ سرکاری آدمی آئے اور وطن سے اخراج کا حکم دیا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور وہ ملک نادہ جا کر مقیم ہو گئے۔ امیر مذکورہ نے وہاں سے بھی نکل جانے کا حکم دیا۔ اب انھوں نے اہل وعیال کو ساتھ لے کر یاغستان کے پہاڑوں میں جا بسیرا کیا۔ جب نادہ کے علمائے سو کو ان کے یاغستان کے پہاڑوں میں قیام کا پتا چلا تو کئی سو آدمیوں کو ساتھ لے کر ان پر حملہ کر دیا۔ گھر کو آگ لگا دی اور تمام شاگردوں اور عقیدت مندوں کو زخمی کر دیا۔ اس حملے میں حضرت مولانا اور ان کے اہل وعیال کو کوئی گزند نہیں

پہنچا۔ وہ دشمن کی گرفت سے بچ کر محفوظ مقام پر چلے گئے۔ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں۔

سبحان اللہ! دریں امتحانات وجلاوطنی ودشمنی تمام عالم چناں مرفہ الحال وخوش عیش می ماند کہ ہیچ امیری اطیب عیش از وندیدم، وگویا از غیب نعم گونا گوں بر سرش می بارید۔ کدام نعمتے بود کہ درآں کوہا بیشش نمی رسید ❶۔“

(سبحان اللہ! ان آزمائشوں کے دور میں اور جلاوطنی اور تمام جہان کی دشمنی کے زمانے میں وہ اس قدر خوش حال تھے اور اس درجے اچھی زندگی بسر کرتے تھے کہ کسی امیر کو میں نے ان سے بڑھ کر خوش حال اور بہتر زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گویا غیب سے قسم قسم کی نعمتیں ان کے سر پر برستی تھیں، وہ کون سی نعمت تھی جو ان پہاڑوں میں آپ کے پاس نہیں پہنچی تھی۔)

پھر جلاوطنی:

اسی زمانے میں امیر دوست محمد خاں نے شہر ہرات میں وفات پائی اور اس کا بیٹا شیر علی خاں افغانستان کا حکمران ہوا۔ حضرت مولانا یاغستان کے پہاڑوں سے وطن واپس چلے گئے۔ علمائے سو نے امیر شیر علی خاں کے بھی کان بھرنے شروع کر دیے اور مولانا کے خلاف اسے خوب بھڑکایا۔ اب انھوں نے امیر شیر علی خاں کو ایک خط لکھا کہ ”میں مظلوم ہوں، حاسدوں نے مجھ پر جھوٹی تہمتیں لگائی تھیں، جن کی وجہ سے تمھارے باپ نے مجھے ملک سے نکال دیا تھا۔ تم اس سلسلے میں اپنے باپ کے نقش قدم پر نہ چلو۔“

اس نے جواب میں لکھا کہ ”میں تمام رعایا کی مخالفت کر کے ایک شخص کی حمایت نہیں کر سکتا۔ تم فوراً ہمارے ملک سے باہر نکل جاؤ۔“

اخراج کا یہ حکم نامہ ملا تو بہت حیران ہوئے کہ کدھر کا قصد کریں۔ بالآخر جنگل کی راہ لی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپ گئے۔ کچھ عرصہ وہیں رہے۔ اس اثنا میں اللہ کی طرف سے القا ہوا۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔(الانعام: ۴۵)

یعنی جن لوگوں نے ظلم ڈھایا تھا ان کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور حمد وستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اسی دوران میں افغانستان میں انقلاب بپا ہو گیا اور امیر شیر علی خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ وہ ذلیل وخوار ہو کر کابل سے بھاگا اور ہرات میں جا کر پناہ لی۔

مصائب کی انتہا اور مولانا کی استقامت:

اس کے بعد مسند حکومت پر محمد افضل خاں متمکن ہوا۔ علمائے سو نے حضرت مولانا کے خلاف پھر اپنی

❶ سوانح مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۱۵، ۱۶۔

سرگرمیوں کا آغاز کیا اور امیر محمد افضل خاں سے ان کی شکایات کیں۔ امیر مذکور نے ایک خط کے ذریعے مقر کے حاکم کو ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سردار محمد عمر خاں نے جو امیر دوست محمد خاں کا بیٹا تھا' رات کے وقت مسلح سواروں کا دستہ روانہ کیا' جس نے نصف رات کے قریب مولانا کے مکان کا محاصرہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا۔ وہ لوگ ان کو گرفتار کر کے اور گھر کا تمام سامان اٹھا کر سردار محمد عمر خاں کے پاس لے گئے۔ مولانا کے بیٹوں میں سے تین بیٹے مولانا محمد' مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار بھی ان کے ساتھ تھے۔ سب کو یقین تھا کہ اب سخت سزا دی جائے گی' لیکن سردار محمد عمر خاں ان کے چہرے کی نورانیت اور جلال سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوا کہ سارا غصہ جاتا رہا اور نہایت ادب اور احترام سے بولا کہ آپ نے جو راہ اختیار کر رکھی ہے' اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آپ بھی وقت کے علما کے ساتھ مل جائیں اور وہی کچھ کریں جو وہ کرتے ہیں۔ حضرت مولانا نے انکار کیا۔ سردار محمد عمر خاں کا جرنیل پاس ہی کھڑا تھا' غضب ناک ہو کر بولا۔

بدست من بدہید تا بتوپ پرانم۔

(اسے میرے حوالے کرو کہ میں اسے توپ سے اڑا دوں۔)

مولانا نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کتاب و سنت کے احکام کی اشاعت کروں۔ مجھے بارہا القا ہوا ہے کہ۔

یا عبدی هذا کتابی و هؤلاء عبادی' فاقرأ کتابی علی عبادی۔

(اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں۔ تو میری کتاب میرے بندوں کو پڑھ کر سنا۔)

پھر فرمایا یہ بھی مجھے حکم دیا گیا ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (البقرہ:۱۲۰)

(اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی' اس علم کے بعد جو تیرے پاس آ چکا ہے تو کوئی حامی اور مددگار تجھے اللہ کی سرزنش سے بچا نہ سکے گا۔)

اس وقت مولانا پر عجیب کیفیت طاری تھی اور وہ پورے جلال اور جوش میں تھے۔ کڑک کر بولے۔

قصد محکم دارم و عزم مصمم کہ تا جان در بدن دارم و سر برتن' درخدمت کتاب و سنت بہ نہایت سرگرمی کوشم۔ ایں چہ مصائب است کہ برمن می آید' من از رب خود ہمیں می خواہم کہ دریں راہ تکہ تکہ شوم و اعضاء و رود ہائے من در بیاباں بر سر بوتہ و خار افتادہ زاغہا بنولہ ہائے خورند ❶۔

(میں قصد محکم اور عزم مصمم رکھتا ہوں کہ جب تک میرے بدن میں جان باقی ہے اور جسم پر سر سلامت

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی۔ ص ۱۷'۱۸

ہے، کتاب وسنت کی خدمت نہایت گرم جوشی سے کرتا رہوں گا۔ یہ کیا مصیبتیں ہیں جو مجھ پر آئی ہیں۔ میں اپنے اللہ سے یہی آرزو رکھتا ہوں کہ اس راہ میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور میری انتڑیاں جنگلوں کی خار دار جھاڑیوں پر پھینک دی جائیں اور کوے ان پر اپنی چونچیں ماریں۔)

اس وقت آپ پر حق گوئی کی انتہائی کیفیت طاری تھی اور نہایت درجے جوش وجذبے اور حالت جلال میں تھے۔ اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کہیں۔ مگر سب خاموش تھے اور مجلس میں سناٹا چھا گیا تھا۔ جرنیل اور صوبے کا حاکم بھی موجود تھے جو آپ کے طرز کلام سے اس قدر مرعوب ومتاثر تھے کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ صورت حال سردار محمد عمر خاں نے دیکھی تو قلم پکڑا اور امیر محمد افضل خاں اور محمد اعظم خاں کو خط لکھا کہ ''آپ کے حکم کی تعمیل میں مولانا عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے' لیکن یہ شخص فقیر منش اور ولی اللہ ہے۔ دینوی اعتبار سے بھی بے سروسامان ہے۔ مطلع فرمائیں اب اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔''

امیر افضل خاں اور اعظم خاں نے جواب میں لکھا کہ ''اس کو کامل احتیاط کے ساتھ ہمارے پاس کابل پہنچا دو۔''

اس حکم کے بعد ملا مشکی اور ملا نصر اللہ لوہانی کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ شاید مولانا عبداللہ کو ان الزامات سے بری کر دیا جائے گا جو ان پر عائد کیے گئے ہیں اور حکومت کے اہل کار بھی ان کے زیر اثر آ جائیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں فوراً امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ امیر دوست محمد خاں کے عہد میں ہم اس شخص پر کفر ثابت کر چکے ہیں' اب دوبارہ تحقیق کی ضرورت نہیں۔

افغانستان کے علمائے سوء نے مولانا کے قتل کا فتویٰ صادر کیا' لیکن ملا مشکی نے اس پر دستخط نہیں کیے۔ وہ ان میں کچھ انصاف پسند عالم تھا۔ بعد میں کافی بحث وتمحیص کے بعد قتل کا فتویٰ تو واپس لے لیا گیا' لیکن یہ فتویٰ جاری کیا گیا کہ اس کو درے مارے جائیں۔ چنانچہ انھیں درے مارے گئے۔ سر اور داڑھی مونڈ دیے گئے۔ چہرہ مبارک سیاہ کیا گیا اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں گشت کرایا گیا۔ بعد ازاں انھیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

ان کے مریدوں میں سے ایک شخص قید خانے میں ملاقات کو گیا تو دیکھ کر رونے لگا۔ فرمایا روتے کیوں ہو' عزت اور داڑھی کیا شے ہے جو اللہ کی راہ اور اس کی رضا میں چلی گئی' شکر کرو دین ہاتھ سے نہیں گیا۔ رونا تو مخالفین کو چاہیے کہ وہ دین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس زمانے میں حضرت مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے اہل وعیال کو جن مصائب وآلام سے دوچار کیا گیا' اس سے متعلق حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے وفات سے چند روز پیشتر اپنی ایک پھوپھی مرحومہ کے حوالے سے ان سطور کے راقم کو بتایا کہ غزنی کی پولیس اور حکمران ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ وہ انھیں انتہائی اذیتیں پہنچاتے اور یہ لوگ پہاڑوں کے غاروں میں چھپتے پھرتے تھے۔ کوئی شخص بھی اس نواح میں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے والا نہ تھا۔ مولانا داود غزنوی فرماتے تھے کہ جب ان کی پھوپھی مرحومہ اس دور کے واقعات بیان کرتیں تو ہم سن کر کانپ اٹھتے تھے۔

جلاوطنی اور ظالم حکام کا انجام:

حضرت عبداللہ غزنوی دو سال اپنے تین بیٹوں (مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار) کے ساتھ قید میں رہے۔ ۷ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو امیر محمد افضل خاں بعارضہ وبا مرگیا تو اس کا بیٹا امیر اعظم خاں تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں مولانا کی جلاوطنی کے احکام جاری کیے اور ملا خاں عبدالرحمن کے کہنے پر سخت گرمی کے دنوں میں ان کو پاپیادہ پشاور کی طرف دھکیل دیا۔ اس وقت پینے کو پانی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں۔

''مولانا کی جلاوطنی کے احکام جاری ہوئے ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ امیر اعظم خاں کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور دشمن سے شکست کھا کر سراسیمگی کی حالت میں حیران و سرگرداں پہاڑوں میں پھرنے لگا۔ اس کے اہل وعیال کو بھی جو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، وطن سے نکال دیا گیا۔ قرآن کا فرمان کتنا صحیح ہے۔

فَلَمَّا اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (الزخرف:۵۵)

(جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔)

امیر دوست محمد کے خاندان کو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ ایسا پراگندہ اور منتشر کیا کہ وہ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہوگئے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا۔۱۹)

(کہ ہم نے انھیں افسانے بنادیا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔)

وہ لوگ پشاور اور پنجاب میں انگریزوں کے ہاتھوں قید و بند کی سختیوں میں مبتلا ہوئے اور ان میں سے بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں پریشان و سرگرداں پھرنے لگے۔ ایسا کیوں نہ ہو، حدیث میں اللہ کا ارشاد مروی ہے: من عادى لي وليا فقد بارزني بالحرب۔

(جو شخص میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرتا ہے، وہ حقیقت میں میرے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔)

یہ بالکل سچ ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء:۱۲۲)

اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے؟ ❶

کابل سے روانگی اور امرتسر میں ورود:

جب بادشاہ افغانستان نے حضرت عبداللہ صاحب کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا تو کابل سے

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۲۱، ۲۲

ہندوستان کا رُخ کیا اور فرمایا۔

بخت افغانستان خوابیدہ شدہ بخت ہندوستان بیدار شد ❶۔

(افغانستان کی قسمت سو گئی اور ہندوستان کی قسمت جاگ اٹھی۔)

افغانستان سے نکلنے کے بعد کچھ عرصہ پشاور میں مقیم رہے۔ اس کے بعد عازم لاہور ہوئے۔ یہاں بھی کچھ مدت قیام رہا' لیکن اس کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ پھر اہل دل اور فضل و کمال کے اس قافلے نے بعض احباب کی درخواست پر پنجاب کے شہر امرتسر کا رخ کیا اور شہر کے قریب ایک گاؤں ''خیرالدین'' میں اترے۔ اس اثنا میں ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور یہ چھوٹا سا گاؤں فیض حاصل کرنے والوں کا مرکز قرار پایا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس گاؤں میں چند مہینے قیام رہا اور متعدد حضرات نے ان کی خدمت میں یہاں حاضری دی۔ اسی لیے رجال کی بعض مستند کتابوں میں اس گاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی جیسا کہ آئندہ سطور میں بیان کیا گیا ہے' اپنی تصنیف تقصار جیود الاحرار میں اس گاؤں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کے نزول کی وجہ سے اس گاؤں کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس گاؤں میں امرتسر کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ پھر وہی لوگ انھیں امرتسر شہر لے گئے۔

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ دہلی میں مقیم تھے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے صحیح بخاری کا درس لیتے تھے۔ مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والے) بھی ان کے شریک درس تھے۔ میاں صاحب کا مدرسہ اس زمانے میں مسجد اورنگ آبادی میں قائم تھا۔ مولانا عبداللہ غزنوی خود فرماتے ہیں۔

بخدمت خاتم المحدثین شیخنا سید محمد نذیر حسین صاحب رسیدم و کتاب صحیح بخاری شروع نمودؔ درآں میاں بلوائے دہلی شروع شد۔ درعین بلوائے شدید کہ ہر کس بہ غم جان خود بود و من مشغول بخواندن کتاب مذکور ❷۔

(میں اپنے شیخ خاتم المحدثین سید محمد نذیر حسین صاحب کی خدمت میں پہنچا اور صحیح بخاری پڑھنا شروع کی۔ اس اثنا میں دہلی کا شہر سخت ہنگامے کی زد میں آ گیا۔ اس شدید ہنگامے میں جب ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا' میں صحیح بخاری پڑھنے میں مشغول تھا۔)

جب دہلی میں فساد کی آگ بھڑک رہی تھی اور خاندانوں کے شیرازے بکھر رہے تھے' اس خطرناک وقت میں بھی وہ موت سے خوف زدہ نہ تھے' اس لیے کہ وہ مقام ولایت کے اس زردۂ علیا پر سرفراز تھے' جہاں موت و حیات کے سربستہ راز واشگاف ہو جاتے ہیں۔ اس ہنگام قتل و غارت میں اگر انھیں کوئی ڈر تھا تو صرف

❶ حضرت مولانا داؤد غزنوی ص ۱۲ (مضمون مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم)

❷ الحیات بعد الممات' ص ۵۳۷۔

یہ کہ کہیں ایسے لمحے موت کا شکار نہ ہو جائیں جب کہ یاد خدا سے غافل ہوں۔ مولانا غلام رسول ان کی اس کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

مارا یک فکر است کہ مبادا بے یاد مولائے خود جاں بجان آفریں بدہیم و بغفلت روح پرواز کند ❶۔

(ہمیں فقط ایک ہی فکر ہے، مبادا یاد الٰہی کے بغیر مر جائیں اور ذکر خدا سے غفلت میں روح جسم سے پرواز کر جائے۔)

پھر جب کسی حد تک کشت و خون کا طوفان تھا اور لوگوں کے قافلے شہر سے نکلنے لگے تو حضرت سید عبداللہ غزنوی نے کمال اطمینان کے لب و لہجے میں فرمایا۔

مانمی ردیم، ہر چہ بادہ باد۔ شاید کہ امتحان رسیدہ باشد و عندالامتحان یکرم الرجل او یہان ❷۔

(ہم نہیں جائیں گے جو ہونا ہے ہو جائے۔ شاید آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے اور یہی وہ وقت ہے جس میں آدمی یا تو قابل احترام قرار پاتا ہے یا ذلت و رسوائی کے گڑھے میں پھینک دیا جاتا ہے۔)

اس طوفان بلا کے زمانے میں وہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کا یہ واقعہ سنایا کرتے کہ جب تاتاریوں نے خوارزم میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس وقت شیخ وہیں تھے۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو بلایا اور سب کو اپنے اپنے وطن کی طرف لوٹ جانے کو کہا۔ مریدوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو آپ کے لیے بھی سواری کا انتظام کیا جائے۔ شیخ نے فرمایا۔ ''مرا اذن نیست کہ بیروں روم'' (مجھے بارگاہ خداوندی سے شہر چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں) چنانچہ وہ وہیں رہے اور تاتاریوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

بہر حال دہلی میں جب لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا سلسلہ حد سے بڑھ گیا تو مولانا سید نذیر حسین سخت پریشان ہو گئے تھے اور عالم اضطراب میں شہر کی آبادی اور تباہی کے متعلق لوگوں سے پوچھتے تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی ان کی پریشانی دیکھ کر فرماتے:۔

معلوم نیست مولوی صاحب راچہ شدہ است کہ ہمہ روز بہ سخن ہائے این و آں می گزارند۔ ایام فتن است، بایستی کہ صحیح بخاری می خواندیم و بمولائے خود پرداختیم۔

(معلوم نہیں مولانا (نذیر حسین) کو کیا ہو گیا ہے کہ دن بھر لوگوں سے باتیں پوچھتے رہتے ہیں، یہ فتنے کا زمانہ ہے۔ ہم تو صحیح بخاری پڑھتے ہیں اور حالات کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔)

مولانا عبداللہ غزنوی اس ہنگام فتنہ خیز میں نہایت اطمینان سے مسجد میں بیٹھے اور صحیح بخاری پڑھتے رہتے۔ مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ ایک دن مسجد کی دیواروں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مولانا عبداللہ ذکر الٰہی میں منہمک تھے۔ مولانا غلام رسول کو وہ عام طور پر ''عبداللہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جب بہت

❶ سوانح مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول ص ۴۲

❷ سوانح مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۲۳

زیادہ شور ہوا تو ان سے مخاطب ہو کر پوچھا "عبداللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بلا شبہ ان کے استغراق کی یہی کیفیت تھی۔ مولانا امام عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں کہ ان کا ایک عقیدت مند ان کے پاس کوئی شکایت لے کر گیا تو فرمایا:

من در دنیا نیستم' فقط بظاہر بدن مرا شما در دنیا مشاہدہ می کنید ورنہ من در آخرت ہستم ❶۔

(میں دنیا میں نہیں ہوں' تم محض میرا جسم دنیا میں دیکھتے ہو ورنہ میں تو عقبیٰ میں رہتا ہوں۔)

اس سے آگے حضرت امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ہم چنیں بود بجز درویت او خدا یاد می آمد بہ نشستن ہمراہش ہمہ خطرات وغموم ہبا منثورا می شدند ❷۔

(بات فی الواقع ایسی ہی تھی' محض ان کے دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا اور ان کے پاس بیٹھنے سے رنج و غم کی گھٹائیں چھٹ جاتی تھیں۔)

دہلی میں تحریک آزادی کا آغاز ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو ہوا۔ مولانا غلام رسول عید الفطر پڑھ کر مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما سے دہلی سے وطن روانہ ہوئے' لیکن مولانا عبداللہ خود وہیں رہے اور مولانا غلام رسول کو رخصت کرنے کے لیے لاہوری دروازے کے باہر شاہدرہ تک تشریف لائے۔

مولانا غلام رسول نے دہلی سے روانہ ہوتے وقت وصیت طلب کی تو فرمایا:

أُوْصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ۔

(میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔)

جب مولانا غلام رسول لاہور پہنچے تو ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے۔ انگریزی حکومت مولویوں سے بدگمان بھی تھی اور خوف زدہ بھی تھی' اس لیے کہ اس کے نزدیک وعظ و تقریر کے ذریعے یہی لوگ ملک میں "فساد" بپا کرتے اور انگریزی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے تھے۔ مولانا غلام رسول کے بڑے بھائی نے ان کو روپوش ہو جانے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کیا اور فرمایا روپوش ہونا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جانا مردوں کا کام نہیں۔ میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں اور اپنے آپ کو اسی کے سپرد کرتا ہوں۔ چند روز بعد ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد تحقیقات کا سلسلہ چلا تو رہا کر دیے گئے۔ لیکن یہ پابندی لگا دی گئی کہ وعظ کہنے کے لیے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہے۔ انگریزی کی عدالت نے تحقیقات کے دوران مولانا سے پوچھا "کوئی آپ کا ضامن ہے کہ اس کی ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا جائے"؟ فرمایا "ہے۔" پوچھا "کون؟" آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "اللہ تعالیٰ____"!!

مولانا عبداللہ غزنوی اس وقت دہلی سے نکلے جب دہلی اجڑ گئی۔ اس کے باشندے منتشر ہو گئے اور اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اہل دہلی کے لیے یہ اتنا سنگین وقت تھا کہ کوئی شخص انگریزی حکومت کی اجازت

❶ سوانح مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی ص ۲۳

❷ ایضاً

اور پروانہ راہداری کے بغیر نہ اس شہر سے باہر نکل سکتا تھا اور نہ اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ مولانا عبداللہ نے بھی پروانہ راہداری لیا اور دہلی سے امرتسر تشریف لائے ❶۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں حضرت عبداللہ غزنوی افغانستان سے ہجرت کر کے مستقل طور پر امرتسر نہیں آئے تھے‘ غزنی ہی میں ان کا گھر بار تھا۔ یہ ان کی جلاوطنی کا دور تھا اور تحصیل علم حدیث کے لیے دہلی گئے تھے۔ واپسی پر وطن جاتے ہوئے امرتسر رکے اور سال بھر وہاں ان کا قیام رہا۔ اس سے قبل دہلی جاتے ہوئے بھی کچھ عرصہ امرتسر رہے تھے۔

ایک سچا خواب:

یہاں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی نے دہلی جانے سے پیشتر اپنے وطن (غزنی) میں ایک خواب دیکھا تھا‘ جس میں ان کو ان حالات سے آگاہ کر دیا گیا تھا جو دہلی جا کر پیش آئے۔ وہ خواب اور اس کی تعبیر وہ خود ہی بیان کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے۔

دیدم کہ در تہہ خانہ زینہ دار فرومی روم۔ وقتے کہ بہ صحن خانہ رسیدم چراغ روشن یافتم‘ ودراں حالت در بغلم کتاب صحیح بخاری بود‘ پیش چراغ نشستہ کتاب مذکور را وانمودم۔ می بینم کہ کتاب از اول تا آخر سیاہ گشتہ۔ دودۂ دخانیہ چناں برآں چپیدہ کہ حرف بہ نظر نمی آید۔ آخر الامر رومالے را گرفتم و از اول کتاب صاف نمودن شروع نمودم۔ دورق ورق صاف نمودہ‘ قریب آخر رسانیدم۔ اوراق متعددہ باقی ماندہ نہایت ماندہ شدہ‘ نفس سرد کشیدہ گفتم اللہ اکبر‘ چہ قدر تکلیف برداشتم۔ ودرآں خواب چہرہ خود بہ نظر می آید‘ می بینم کہ گرد آں کتاب بر اسنانم نموداری باشد۔ در تعبیر ایں خواب حیران بودم کہ اتفاق سفر دہلی کہ بہ نسبت بلاد ما نہایت زیر است‘ افتاد۔ بخدمت خاتم المحد ثین شیخنا سید محمد نذیر حسین رسیدم و کتاب صحیح بخاری شروع نمودم۔ درآں میان بلوائے دہلی شروع شد۔ درعین بلوائے شدید کہ ہر کس بغم جان خود بود من مشغول بخواندن کتاب مذکور‘ تا حدے کہ نصاریٰ غالب آمدند و اہل بلدہ را متفرق نمودند۔ درآں ایام کتاب صحیح بخاری قریب الاختتام بود‘ مگر بسبب پراگندگی اہل بلدہ درمیان من و سید صاحب ہم جدائی افتاد و کتاب نا تمام ماند۔ تعبیر خواب ہمیں بود کہ زیر خانہ‘ دہلی بود۔ چراغ ‘ سید صاحب مذکور‘ وصاف نمودن صحیح بخاری خواندن آں بود در اعسر اوقات الا اوراق چند کہ بنا بر لا چاری باقی ماند ❷۔

(یعنی میں نے دیکھا کہ میں ایک سیڑھیوں والے مکان کے نیچے اترا ہوں۔ اس کے صحن میں پہنچا تو وہاں چراغ جل رہا تھا۔ اس وقت میری بغل میں کتاب صحیح بخاری تھی۔ چراغ کے سامنے بیٹھ کر میں نے یہ کتاب کھولی تو دیکھتا ہوں کہ کتاب شروع سے آخر تک سیاہ ہو گئی ہے اور اس پر اس قدر دھوئیں کی تہہ جمی ہوئی ہے کہ حرف نظر نہیں آتے۔ بالآخر میں نے رومال پکڑا اور صفحہ اول سے کتاب صاف کرنا شروع کی اور ایک ایک ورق صاف کرتا ہوا آخر

---

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول ص ۳۳۔

❷ الحیات بعد الممات‘ ص ۵۳۶ تا ۵۳۸۔

کتاب کے قریب پہنچ گیا۔ کچھ اوراق جو باقی تھے، بہت خراب تھے۔ ٹھنڈی آہ بھر کر میں نے کہا' اللہ اکبر میں نے کتنی تکلیف برداشت کی ہے ــــ اس خواب میں اپنا چہرہ مجھے نظر آ رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کی گرد میرے دانتوں پر نمودار ہو رہی ہے۔ خواب کی تعبیر کے لیے میں حیران تھا کہ اچانک دہلی کا سفر پیش آیا اور یہ وہ شہر ہے جو ہمارے ملک کے شہروں کی نسبت بہت نشیب میں ہے۔ وہاں خاتم المحدثین شیخ سید محمد نذیر حسین کی خدمت میں حاضر ہوا' اور ان سے کتاب صحیح بخاری پڑھنا شروع کی۔ اس اثنا میں دہلی میں (۱۸۵۷ء) کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شدید ہنگامے کے دوران میں' جب کہ ہر شخص کو اپنی جان کا خطرہ لاحق تھا' میں صحیح بخاری پڑھنے میں مشغول تھا۔ پھر صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ اس ملک پر انگریز غالب آ گئے اور باشندگان دہلی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ ان دنوں کتاب صحیح بخاری ختم ہونے کے قریب تھی' مگر اہل شہر کے انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے میرے اور سید (نذیر حسین) صاحب کے درمیان بھی جدائی ہو گئی اور کتاب پوری نہ پڑھی جا سکی۔ میرے اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ "زیر خانہ" سے مراد شہر دہلی تھا ــــ "چراغ روشن" سید (نذیر حسین) صاحب تھے "صحیح بخاری کو صاف کرنے سے" مراد سخت مشکل اور ناموافق حالات میں اس کا پڑھنا تھا' سوائے ان چند اوراق کے جو انتہائی مجبوری کی وجہ سے باقی رہ گئے۔)

ایک اور سچا خواب:

اسی طرح انھوں نے ایک اور خواب دیکھا۔ وہ بھی بالکل صحیح اور سچا ثابت ہوا۔ وہ خواب یہ ہے۔

فرماتے ہیں:

دیدم کہ از دہان شیخنا سید محمد نذیر حسین صاحب' چشمہ شربت شیریں جاری است و آں شربت در ہر دو دست من می ریزد و من آں رامی نوشم۔ مطلب کہ چشمہ آں شربت از دہان شیخنا می باشد و مجرائے آں ہر دو دست من و مدخل آں فم من می باشد۔۔ در تعبیر ایں خواب متحیر بودم کہ اتفاقاً فرزندم عبدالجبار بخدمت شیخ مذکور رسیدہ و تحصیل علم حدیث از ایشاں نمود۔ چشمۂ شیریں علم حدیث است' کہ از جناب سامی جاری است و تحصیل علم حدیث فرزندم از جناب ایشاں نوشیدن من است' ازاں چشمہ شیریں کہ فرزند مذکور جزو من است و از باقیات صالحات من خواہد شد' ان شاء اللہ تعالیٰ ❶۔

(یعنی میں نے خواب میں دیکھا کہ ہمارے شیخ محترم سید محمد نذیر حسین صاحب کے دہن مبارک سے شیریں شربت کا چشمہ جاری ہے اور وہ شربت میرے دونوں ہاتھوں پر گر رہا ہے اور میں اسے پی رہا ہوں' جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شربت کا چشمہ ہمارے شیخ کا دہن مبارک ہے' میرے دونوں ہاتھ اس کے جاری ہونے کی جگہ اور اس کا مدخل میرا منہ ہے۔ میں اس خواب کی تعبیر میں حیران تھا کہ اتفاق سے میرا بیٹا عبدالجبار شیخ مذکور کی خدمت میں پہنچا اور ان سے اس نے علم حدیث کی تحصیل کی' تو گویا وہ چشمہ شیریں' علم حدیث ہے جو آں جناب

❶ الحیات بعد الممات ص ۵۳۸

سے جاری ہوا ہے' اور میرے فرزند کا ان سے علم حدیث حاصل کرنا میرا اس چشمہ شیریں سے شربت پینا ہے' اس لیے کہ میرا مذکورہ فرزند میرا ہی ایک حصہ ہے۔ اور میری باقیات صالحات میں سے ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔)

شیرازہ بکھر گیا:

حضرت عبداللہ غزنوی کے اس دور طالب علمی میں میاں سید نذیر حسین دہلوی مسجد اورنگ آبادی میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ یہ دہلی کی ایک عظیم الشان تاریخی مسجد تھی جو' مغل بادشاہ کی بیوی نواب اورنگ آبادی نے بنوائی تھی اور پھر اسی خاتون کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ یہ مسجد جس جگہ تعمیر ہوئی' اس کا نام ''پنجابی کٹرہ'' تھا۔ یہ ایک مکان تھا جو مختلف مقامات کے سوداگروں کی قیام گاہ تھا' لیکن اس میں زیادہ تر پنجابی سوداگر آتے اور قیام کرتے تھے۔ اسی بنا پر یہ پنجابی کٹرہ کہلایا۔ اورنگ آبادی مسجد بھی چونکہ اسی جگہ بنائی گئی تھی اس لیے اسے ''مسجد پنجابی کٹرہ'' بھی کہتے تھے۔ میاں سید نذیر حسین کے سسر مولانا سید عبدالخالق اور خود میاں صاحب اسی مسجد میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس میں دن رات قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی رہتی تھیں [1]۔ مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول نے اسی مسجد میں حضرت میاں صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو وہ جوش انتقام میں اندھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے نہایت بے دردی سے اس شہر کو تاراج کیا۔ کئی محلے بیخ و بن سے اکھاڑ دیے۔ بہت سی شاہی عمارتیں زمین بوس کر دیں اور مسجدوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ پنجابی کٹرہ جو اہل اللہ کا مسکن تھا' ڈھا دیا گیا اور اصحاب فضل اور ارباب علم کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ میاں صاحب کا مکان بچا' نہ مسجد اورنگ آبادی کے آثار باقی رہے۔ اس مسجد کی زمین ریلوے سٹیشن کے احاطے میں شامل کر دی گئی۔ میاں صاحب پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے اور زندگی کے آخری سانس تک وہیں رہے۔

سبعہ معلقہ عربی ادب کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا چوتھا معلقہ لبید بن ربیعہ عامری کا ہے' جنھوں نے زمانہ جاہلیت بھی پایا اور زمانہ اسلام بھی۔ ظہور اسلام کے بعد مسلمان ہوئے اور شرف صحابیت حاصل کیا۔ ان کا معلقہ زمانہ جاہلیت کا ہے' جس کا تشبیب کا شعر یہ ہے جو ولی کے اس عہد کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

عَفَتِ الدِّيَارُ مَحِلها وَ مَقَامُهَا　　بِـمِـنًى تَأَبَّدَ غُوْلُهَا فَرِجَامُهَا

(منیٰ میں دیار محبوب کے نشانات مٹ گئے۔ اب نہ وہ مقام ہے' نہ فرودگاہ۔ اس کے غول اور رجام برباد ہو گئے۔ یعنی وہ تمام مقامات جہاں محبوب کا بسیرا تھا اور جن سے عشق و محبت کی داستانیں وابستہ تھیں' تباہ ہو گئے۔)

---

[1] آثار الصنادید ص ۱۸۸

تذکرہ نگاروں کا خراج عقیدت:

مولانا سید عبداللہ غزنوی منبع علم و عرفان اور مقصودِ عباد و زہاد تھے۔ تذکرہ نگار حضرات نے نہایت احترام و عقیدت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا سید عبدالجبار غزنوی جو اپنے فضائل بوقلموں کی وجہ سے ''امام صاحب'' کے عرف سے معروف ہوئے' سفر و حضر میں ہمیشہ باپ کے ہم رکاب رہے۔ وہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عابد كثير الذكر رجاع الى الله المتذلل له الخاشع الخاضع الورع المتضرع المتواضع المبتهل الحنيف المتبتل الى الله الكامل البارع الملهم المحدث المخاطب المخلص الصديق الكريم الجواد الاواه الحليم المتوكل المنيب الصابر القانت لم تاخذه فى الله لومة لائم قط❶۔

(یعنی وہ عبادت گزار' بہت ذکر کرنے والے' اللہ کی طرف رجوع کرنے والے' اس کے سامنے بہت جھکنے والے اور خشوع و خضوع کرنے والے تھے۔ گناہوں سے بچنے والے' اللہ کے حضور گریہ و زاری کرنے والے' بہت صدقہ و خیرات کرنے والے' عاجزی کرنے والے' سب سے کٹ کر اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونے والے اور اسی سے دعا و التجا کرنے والے تھے۔ مردِ کامل اور یگانۂ روزگار تھے۔ اللہ کی طرف سے القا اور خطاب سے نوازے جاتے تھے اور اس سے انتہائی ہدایت یابی کا انھیں شرف حاصل ہوتا تھا۔ اللہ کے مخلص بندے' بہت سچے' بزرگ اور سخی' نہایت درجے کے دردمند' بردبار' اللہ پر بھروسا کرنے والے تھے۔ اسی کی طرف رجوع کرنے والے' مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور اللہ کے اطاعت گزار تھے۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت انھیں اللہ کی راہ سے ہرگز روک نہ سکتی تھی۔)

مولانا شمس الحق ڈیانوی جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے' مقدمہ ''غایۃ المقصود'' میں مولانا عبداللہ غزنوی کی توصیف میں رقم طراز ہیں:

انه كان فى جميع احواله مستغرقا فى ذكر الله عزوجل حتى ان لحمه و عظامه و اعصابه و اشعاره و جميع بدنه كان متوجها الى الله تعالى فانيا فى ذكره عزوجل۔

(وہ ہر وقت اور ہر حالت میں خدائے بزرگ و برتر کے ذکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا گوشت' ان کی ہڈیاں' ان کے پٹھے اور ان کا ہر ہر بنِ مو اللہ کی طرف متوجہ

❶ مولانا عبدالجبار غزنوی ص ا

تھا۔ وہ اللہ عزوجل کے ذکر میں فنا ہو گئے تھے۔)

سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں:

الشیخ الامام العالم المحدث عبدالله بن محمد بن محمد بن محمد شریف الغزنوی الشیخ محمد اعظم الزاهد المجاهد الساعی فی مرضاة الله المئوثر لرضوانه علیٰ نفسه و اهله و ماله واوطانه صاحب المقامات الشهیرة والمعارف العظیمة الکبیرة❶۔

(شیخ و امام اور عالم و محدث عبداللہ غزنوی' زاہد و مجاہد اور رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھے۔ خوشنودئ خدا کے لیے اپنی جان' گھر بار' مال و متاع اور ملک و وطن سب کچھ قربان کر دینے والے تھے۔)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

عکف علی العبادة والافادة' انتهیٰ الیه الورع و حسن السمت والتواضع والاشتغال بخاصة النفس' واتفق الناس علی الثناء علیه والمدح بشمائله و صارالمشارالیه فی هذا الباب و انتفع الناس بصالح دعواته و قصدوه لذالك❷

(وہ عبادت الٰہی اور افادہ علما و طلبا کے لیے وقف ہو گئے۔ ان میں پرہیز گاری' حسن اخلاق' تواضع اور اصلاح نفس کا جذبہ حد کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ لوگ ان کے اخلاق و عادات کی مدح و توصیف میں متفق ہیں اور اس باب میں ان کو اس درجے انفرادیت حاصل تھی کہ لوگوں کی ان کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں۔ ان کی صاف ستھری دعوت دین سے مخلوق خدا نے بے حد فائدہ اٹھایا اور اس کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔)

سید عبدالحی حسنی مزید فرماتے ہیں:

وکان حسنة الزمن و زینة الهندقد غشیه نورالایمان وسیماء الصالحین' وله کشوف و کرامات لایسعها البیان❸۔

(وہ اپنے دور کی زینت اور ہندوستان کی آرائش تھے۔ ان پر نور ایمانی اور صلحائے امت کی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ ان سے ایسے ایسے کشوف و کرامات کا ظہور ہوا کہ جن کو حیطہ تحریر

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۳۰۲

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۳۰۳

❸ نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۳۰۳

میں لانا ممکن نہیں۔)

نواب سید محمد صدیق حسن خان نے اپنی تصنیف تقصار جیود الاحرار میں ان کا تذکرہ شاندار الفاظ نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کی نیکی' تدین' اتقا' جذبہ اتباع سنت' ایثار و قربانی اور خشیت الٰہی کو بہترین اسلوب میں حوالہ قرطاس فرمایا ہے۔ ان کو جن مصائب سے دوچار کیا گیا اور جس وجہ سے کیا گیا' نواب صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ نیز بتایا ہے کہ حکومت وقت اور اہل بدعت کی ستم رانیوں کے سبب کابل سے نکل کر وہ پشاور پہنچے۔ پھر موضع خیر الدین اور امرتسر گئے۔

نواب صاحب کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ ان کے حضرت عبداللہ صاحب سے گہرے روابط تھے اور ان دونوں کے درمیان سلسلہ مراسلت جاری تھا۔ وہ نواب صاحب کی تصنیفات خود بھی پڑھتے اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی ان کے مطالعہ کی تلقین کرتے تھے۔ نواب صاحب کی کتابیں ان کی کوشش سے افغانستان' خراسان' زابلستان وغیرہ علاقوں میں پہنچیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت کا حلقۂ ارادت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

ہم چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کی پوری عبارت یہاں درج کر دی جائے تاکہ اختصار کے ساتھ ان کے تمام اوصاف و کمالات قارئین کرام کے سامنے آ جائیں۔ نواب صاحب کی فارسی عبارت بلاشبہ طویل ہے۔ لیکن لائق مطالعہ ہے۔ پہلے ان کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ پھر اردو ترجمہ پڑھیے:

شاہ عبداللہ غزنوی قدس سرہ' ولادت وی تقریباً و در اواخر عشرہ ثالثہ از مائۃ ثالث عشر ہجرت بودہ' بسے بزرگ بود' جامع میان علم حدیث نبوی ﷺ و علم سلوک سنی' در ایثار حق بر خلق از دست اہل بدعت در وطن جفاء کشیدہ' تا آنکہ می گوید کہ ریش او را تراشیدہ از کابل بدر کروند' در قرب پشاور' و در موضع خیر دین و امرتسر بسر می بردؤ اشتغال داشت بعبادت و ریاضت و اشاعت علم حدیث و اتباع سنت و انسانی بزرگ بود دریں باب کہ نظیر آں از اہل عصر حاضر معلوم نیست۔ با محرر سطور حب للہ داشت د با وجود علو رتبہ و کبر سن' من صغیر العمر والرتبہ را بالفاظ عالی در مکاتیب یاد می فرمود' گاہی استاذ خود می نوشت و گاہی بلفظ شاہ فلان یاد می کرد' و خود را عائذ باللہ عبداللہ می نگاشت۔ دم گیر داشت ہر کہ بصحبت وی رسیدہ از خلق رمیدہ و بخالق رسیدہ و نماز در پس او رنگ حضور دیگری آورد۔ وی مولفات محرر سطور را کہ غالباً در فقہ سنت و اصول حدیث ست در بلاد خراسان و افغانستان و زابلستان و آں نواح و دیار ترویج بلیغ بخشید۔ آلہ بود از آلات ازاعت سنت و جارحہ بود از جوارح اضاعت بدعت و امانت محدث۔ در اصول و فروع مماشات بر طریقۂ سلف صالح داشت' و تقلیدات مذاہب و رجال را ثلمہ در حصن حصین دین مبین و شرع متین می انگاشت۔ چرخ اگر ہزار چرخ زند مشکل کہ چنین ذات جامع کمالات بر روئے ظہور آرد۔ ہم محدث بود و ہم محدث رویا ہای صادقہ حسنہ دیدہ و مبشرات صحیحہ آوردہ۔ در حق ایں ناچیز خوابی عظیم مشاہدہ کردہ و خودش بہ تعبیر آں پرداختہ۔ می فرماید فلانی را دیدم بر اسپی تیز رفتار سوار ست و تاج زریں بر سر دارد کہ نور آں چشم نظارہ را خیرہ می ساز دتا آں کہ فرس بعنان سما رسیدہ بلکہ خودش بر عرش عظیم شتافتہ و ترقی عجیب گرفتہ۔

فرمود ایں کرامت از اشاعت علم حدیث ست کہ دریں باب جہد بلیغ نمودہ واصول وفروع ملت اسلام را بروفق حدیث خیرالانام باقطار ارض از عرب وعجم رسانیدہ' انتہی۔ ازیں نفس مبارک شیخ امیدواری دارم وچشم درراہ وگوش برآواز' عفو وعافیت ومغفرت ورضوان خویشم' وکیف کہ رویائے صالحہ از صالح یکی از اجزاء نبوت ومبشرات آخرامت ست، یری او تری لہ دریں نزدیکی شب سہ شنبہ پانزدہم ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/ ۱۵ فروری ۱۸۸۱ء واصل رحمت حق شدو داغ فراق بردل اہل اتباع ومستفیدان سنت سنیہ گزاشت۔ شیخ اہل قرآن تاریخ وفات ست کہ مولوی محمد یحییٰ کشمیری درحلیہ نظم برآوردہ اند' وقاضی طلا محمد پشاوری مرثیہ اودرقصاید عربیہ میمیہ سرائیدہ' رحمہ اللہ تعالیٰ وایانا❶۔

نواب صاحب کی اس عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''شاہ عبداللہ غزنوی مرحوم ومغفور کی ولادت تیرھویں صدی ہجری کے تیسرے دہے میں ہوئی۔ وہ بڑے بزرگ اور علم حدیث اور علم سلوک کے جامع تھے۔ لوگوں کو کلمہ حق سنانے کی پاداش میں اپنے وطن کے اہل بدعت کے ہاتھوں ان کو کئی قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ ان کی داڑھی مونڈ دی گئی اور ان کو حدود کابل سے نکال کر پشاور کے قریب دھکیل دیا گیا۔ وہاں سے وہ موضع خیرالدین پہنچے اور پھر امرتسر جا آباد ہوئے۔ عبادت وریاضت' اشاعت علم حدیث اور اتباع سنت ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا۔ وہ اس ضمن میں اتنے مستعد اور اس قدر اونچے درجے پر فائز تھے کہ اُس دور میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم السطور (صدیق حسن خاں) سے حب للہ رکھتے تھے۔ مرتبے میں عالی اور عمر میں بڑے ہونے کے باوصف مجھ کم عمر اور کم مرتبہ کو اپنے مکتوبات میں معززانہ الفاظ سے یاد فرماتے تھے۔ کبھی میرے لیے لفظ ''استاذ'' تحریر فرماتے اور کبھی لفظ ''شاہ'' سے خطاب کرتے اور اپنے لیے ''عائذ باللہ عبداللہ'' کے الفاظ رقم کرتے۔ وہ دم گیر صوفی اور صاحب طریقت تھے۔ جو ان کی صحبت میں آیا وہ مخلوق سے دور اور خالق کے قریب ہوا۔ ان کی اقتدا میں نماز کچھ اور ہی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ راقم السطور (صدیق حسن خان) پر وہ اس قدر مہربان تھے کہ میری ان تصانیف کو جو زیادہ تر تفہیم سنت اور مسائل حدیث سے متعلق ہیں' پوری کوشش کے ساتھ خراسان' افغانستان' زابلستان اور اس کے گردونواح کے بلاد وقصبات میں پہنچایا اور ان کی خوب ترویج کی۔ وہ اشاعت سنت نبوی ﷺ کا زبردست آلہ اور بدعات ومحدثات کا قلع قمع کرنے کے لیے تیغ براں تھے۔ اصول وفروع میں طریقہ سلف صالح کے پابند تھے۔ شریعت کے قصر رفیع اور احکام دین میں تقلید مذاہب ورجال ان کا شیوہ نہ تھا۔ آسمان اگر ہزار بار گردش کرے تو مشکل ہے کہ اب ایسی جامع صفات ہستی عالم وجود میں آئے۔ وہ محدث بھی تھے اور اللہ سے ہم کلامی کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ اللہ نے ان کو اس صفت سے نوازا تھا کہ وہ سچے اور عمدہ خواب دیکھتے اور اس کی صحیح ترین تعبیر دیتے۔ یقیناً اسے مبشرات صحیحہ کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اس ناچیز (صدیق حسن) کے بارے

❶ تقصار جیود الاحرار وتذکار جنود الابرار ص ۱۹۳' ۱۹۴۔

میں بھی انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ پھر خود ہی اس کی تعبیر دی۔ فرمایا میں نے دیکھا ہے کہ (صدیق حسن) تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہے اور اس نے تاج زریں پہن رکھا ہے‘ جسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں‘ یہاں تک کہ وہ گھوڑا لگام سمیت عرش عظیم پر پہنچ گیا ہے اور بے حد ترقی کر گیا ہے۔ فرمایا یہ اشاعت علم سنت کی کرامت ہے کہ اس باب میں انتہائی جدو جہد کی ہے اور ملت اسلام کے اصول و فروع کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارکہ کی روشنی میں سرزمین عرب و عجم کے دور دراز کناروں تک پہنچا دیا ہے۔

نواب صاحب لکھتے ہیں: ”شیخ عبداللہ کی زبان مبارک ہو‘ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور چشم براہ اور گوش برآواز ہوں کہ وہ عفو و عافیت عطا فرمائے اور اپنی مغفرت و رضا مندی سے سرفراز کرے ___ بلا شبہ اچھا خواب جو مرد صالح دیکھے‘ اجزائے نبوت اور مبشرات آخرامت میں سے ہے۔ ایسا خواب وہ اپنے لیے دیکھے یا دوسرے کے لیے۔“

”حضرت عبداللہ صاحب نے سہ شنبہ کی رات ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/ ۱۵ فروری ۱۸۸۱ء کو جنت الفردوس کی راہ لی اور اپنے عقیدت مندوں اور متبعین سنت کو داغ فراق دیا۔ ان کی تاریخ وفات ”شیخ اہل قرآن“ ہے جو مولوی محمد یحییٰ کشمیری نے اپنی ایک نظم میں بیان کی ہے۔ قاضی طلا پشاوری نے عربی میں ان کا ایک دردناک مرثیہ کہا۔ اللہ ان پر اور ہم سب پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔“

نواب صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حضرت عبداللہ غزنوی سے ملاقات تھی اور ان کی اقتدا میں ان کو نماز پڑھنے کا بھی موقع ملا، جس سے ان کی قلب و روح کی دنیا پر خاص نوع کی کیفیات طاری ہوئیں اور خاص قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ ”نماز در پس اورنگ حضور دیگری آورد“ سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم‘ مولانا عبداللہ غزنوی کے مرید تھے۔ ان کے نام ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے مشہور عالم و محقق اور معروف مصنف و مترجم نواب وحید الزمان خاں حیدر آبادی نے تسہیل القاری میں مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے اور نہایت ادب و احترام کے الفاظ سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”ہمارے شیخ وحید العصر‘ امام الزمان مولوی عبداللہ صاحب اپنے مکتوب میں جو جرنیل مولوی محمد حسین صاحب کی طرف لکھا تھا‘ کہتے ہیں: ۔ پس شمارا ضرور است کہ کلام اللہ را بزن و مرد تعلیم کنید با ترجمہ و ترجمہ نماز رابزن و مرد تعلیم کنید۔ شیخ حبیب اللہ قندھاری می گفت ہر کہ معانی نماز یاد نہ دارد نماز او مقبول نیست ❶۔

(یعنی آپ کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو مرکز التفات ٹھہرائیں اور اسے با ترجمہ غور و فکر کے

❶ تسہیل القاری ترجمہ صحیح بخاری‘ پارہ پنجم‘ ص ۴۰۔ یہاں یہ یاد رہے کہ نواب وحید الزمان خان نے ”تیسیر الباری“ کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ کیا تھا جو کئی مرتبہ چھپ چکا ہے اور اہل علم میں مقبول و متداول ہے۔ سب سے آخر میں ”تسہیل القاری“ کے نام سے مع شرح کے‘ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ شروع فرمایا‘ صرف پانچ پارے مکمل ہوئے تھے کہ وفات پا گئے اور ترجمہ و شرح پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

ساتھ پڑھیں اور پڑھائیں۔ ترجمہ نماز کو بھی ضروری قرار دیں اور لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیں۔ شیخ حبیب اللہ قندھاری کا فرمان ہے کہ جو شخص نماز کے معانی نہیں جانتا' اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔)

''میاں سید نذیر حسین دہلوی کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری اپنی تصنیف'' الحیات بعد المماتؔ'' میں مولانا عبداللہ غزنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا محمد اعظم الشہیر بہ عبداللہ الغزنوی امرتسری المتوفی لیلتہ الثلثاء ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/۱۵ فروری ۱۸۸۱ء صوفی محدث تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اگر کوئی شخص تصوف نبوی کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہو تو اس کے لیے آپ کی ذات بابرکات کے برابر کوئی دوسرا نمونہ نہ مل سکتا تھا۔ آپ کے دو رویائے صالحہ جناب مولوی عبدالجبار صاحب (آپ کے صاحب زادے) کے دست خاص کے لکھے ہوئے ہیں' جن کی نقل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ مولانا عبداللہ نے میاں نذیر حسین دہلوی سے حدیث پڑھی ❶۔

الحیات بعد المماتؔ کے فاضل مصنف مولانا فضل حسین بہاری اس سے آگے لکھتے ہیں:

''مولانا عبداللہ غزنوی نے اپنے چار صاحب زادوں کو تحصیل علم حدیث کے لیے جناب میاں صاحب کے حضور میں دہلی بھیجا اور چاروں دہلی سے کامیاب ہو کر اپنے بے نظیر باپ کی جناب میں حاضر ہوئے۔ (۱) مولانا محمد غزنوی خلف اکبر جناب ممدوح المتوفی ۱۲۹۶ھ۔ آپ نے اپنے والد ماجد کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ تفسیر جامع البیان پر ان کا حاشیہ ہے۔ (۲) مولانا عبدالجبار غزنوی امرتسری جانشین والد ماجد قدس سرہ (۳) مولانا عبدالواحد غزنوی امرتسری (۴) مولانا عبداللہ بن عبداللہ غزنوی۔ (ان کے علاوہ مولانا عبداللہ غزنوی کے پوتوں میں سے) مولانا عبدالاول بن مولانا محمد غزنوی' مولانا عبدالغفور بن مولانا محمد غزنوی' مولانا عبدالقدوس غزنوی' مولانا عبدالاعلیٰ غزنوی اور مولانا عبدالحق غزنوی نے حضرت میاں سید نذیر حسین سے درس حدیث لیا ❷۔''

جناب پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی سوانح عمری ''مہر منیر'' کے مصنف مولانا فیض احمد فیض نے بھی مولانا عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ان کا انداز تحریر مخالفانہ ہے' لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ وہ ان کی اور مولانا اسماعیل شہید کی تبلیغی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس زمانے میں مملکت ہند میں وہابیت نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا اور تصوف و اہل تصوف کو ہدف بنا رکھا تھا۔ اس تحریک کو مولوی اسماعیل دہلوی اور مولوی عبداللہ غزنوی ثم امرتسری کی تعلیمات سے' غیر مقلدین کے وجود اور خود اہل سنت میں سے کئی سرگرم داعی مل جانے کے باعث تقویت ہوئی۔ یہ لوگ تاویلوں کے جال پھیلاتے ہوئے' بزرگان دین کے اعراس میں جا پہنچتے اور زائرین کو قبر پرستی اور حدیث شد رحال کے طعنے دے کر پھنسانے کی کوشش کرتے' جس کی وجہ سے اکثر سادہ لوح عقیدت مندان کی باتوں میں آ کر بھٹک جاتے ❸۔''

---

❶ ''الحیات بعد المماتؔ ص ۶۷۹۔ اس سے آگے فارسی میں دو رویا مرقوم ہیں جو گزشتہ صفحات میں درج کیے جا چکے ہیں۔

❷ الحیات بعد المماتؔ ص ۶۸۱

❸ مہر منیر' ص ۲۵۹

مولانا عبداللہ غزنوی علم و فضل میں یکتا' تقویٰ و تدین میں یگانہ' تصوف و طریقت میں بے مثال اور ضبط و تحمل میں منفرد تھے۔ علامہ اقبال نے محمد دین فوق کے نام ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو' ان کے بیٹے کی تعزیت کے سلسلے میں ایک خط لکھا' اس میں تحریر کرتے ہیں:

''مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی۔ ایک منٹ تامل کیا' پھر طلبا کو مخاطب کر کے کہا: ما برضائے او راضی ہستیم، بیائید کہ کار خود می کنیم۔ یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے ❶۔

علامہ اقبال کو یہاں سہو ہو گیا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی کا کوئی بیٹا قتل نہیں ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد غزنوی تھے' وہ باپ کی زندگی میں ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں وفات پا گئے تھے۔ یہ واقعہ انہی سے متعلق ہو گا۔ وفات کی خبر کو غلطی سے قتل کی خبر لکھ دیا گیا۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ''تاریخ اہل حدیث'' میں رقم طراز ہیں:

''مولانا عبداللہ غزنوی کے والد کا نام محمد اور دادا کا نام بھی محمد تھا۔ پردادا محمد شریف تھے۔ یہ سب ولی اللہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ولایت کی گود میں پرورش پائی۔ بچپن ہی سے تحصیل علم میں مصروف ہو گئے اور اسی حالت میں جوانی کی حد کو پہنچے۔ ان دنوں کا ایک واقعہ آپ سنایا کرتے کہ میں ایک دفعہ اپنے پردادا محمد شریف کی قبر پر (جو اس علاقے میں مقبول انام ہے) گیا' تو مجھے القا ہوا'' لا الہ غیری'' میں نے محسوس کیا' اللہ نے مجھے جتلایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی طرف رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ قبروں پر اس نیت سے جانا کہ فلاں مطلب حاصل ہو جائے' توحید میں رخنہ ڈالتا ہے اور کلمہ شہادت (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کے معنی کے مخالف ہے' اور اگر کوئی گمان کرے کہ میں کسی نیک آدمی کی قبر پر اس لیے نہیں جاتا کہ اس سے کچھ سوال کروں' بلکہ اس لیے جاتا ہوں کہ وہ قبر مبارک مقام ہے' وہاں میری دعا قبول ہو گی' یہ بھی دین میں غلطی ہے۔ عبادت اور دعا کی قبولیت کے لیے شارع علیہ السلام نے بہتر جگہ مسجد مقرر فرمائی ہے ❷۔

اس سے آگے لکھتے ہیں:

''حامی شریعت شیخ حبیب اللہ قندھاری جو اس علاقے میں صاحب علم اور زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے' (مولانا عبداللہ غزنوی نے) ان سے بعض مسائل میں استفادہ کیا۔ ان کی منشا سے تقویۃ الایمان کا مطالعہ کیا اور تمام قسم کے شرک کو سمجھ کر مالک حقیقی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کو صاحب کمالات سمجھتے۔ اکثر حدیث کی کتابوں (بخاری شریف وغیرہ) کا مطالعہ کیا' تو دل میں سنت کی تابعداری کا خیال محکم ہو گیا اور ہر مسئلے میں صحیح حدیث پر عمل کرنے لگے۔ فقہ کی جزئیات

---

❶ انوار اقبال ص ۷۱-۷۲ مکتوب بنام محمد دین فوق۔

❷ تاریخ اہل حدیث ص ۴۲۵

میں سے کوئی جزئی حدیث کی مخالف ہوتی تو اسے چھوڑ دیتے اور فرماتے‘ تعجب ہے‘ صحیح حدیث جو چند واسطوں سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جاتی ہے‘ ترک کی جائے اور اس کے خلاف فقیہ کا قول‘ جس کے نقل کرنے والے مفتی اور قاضی ہیں‘ وہ بھی معلوم نہیں کس واسطے سے ان کے پاس پہنچا ہے‘ اس پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے تشہد میں رفع سبابہ‘ رکوع سے پہلے اور بعد میں رفع یدین‘ آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نماز بھی اول وقت میں خشوع خضوع سے پڑھتے ❶۔

تلامذہ اور اصحاب ارادت:

مولانا عبداللہ غزنوی کے تلامذہ اور اصحاب ارادت کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جو غزنی‘ قندھار اور افغانستان کے رہنے والے تھے اور قیام غزنی کے زمانے میں ان سے مستفیض ہوئے تھے۔ یہ ان کے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں ان کے حلقہ بیعت وارادت میں شامل ہونا اپنے آپ کو مشکلات کے حوالے کرنا تھا۔ ظاہر ہے جن تکلیفوں میں مرشد کو ڈالا جائے گا وہ کسی نہ کسی شکل میں مسترشدین کے حصے میں بھی آئیں گی۔ افغانستان میں وہ جہالت اور آمریت کا دور تھا۔ اس میں کلمہ حق بلند کرنے اور دعوت توحید دینے والوں کو حکومت بھی باغی قرار دیتی تھی اور علمائے سو بھی ان کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ اس لیے کہ یہ دعوت ان کے خود ساختہ عقاید اور ذاتی مفادات سے متصادم تھی۔ تاہم واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور علمائے سو کی بے پناہ مخالفت کے باوجود حضرت عبداللہ کو غزنی اور افغانستان کے دیگر مقامات میں اپنے زہد وورع کی بنا پر لائق اکرام گردانا جاتا تھا اور لوگ ان سے فیض حاصل کرتے تھے‘ لیکن افسوس ہے اس کی تفصیل فراہم نہیں ہو سکی۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی:

افادہ وفیض کا دائرہ کبھی محدود نہیں رہا۔ نہ اس کے مقام کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ اس کے حدود کے لیے کوئی لکیر کھینچی جا سکتی ہے۔ جہاں کوئی نیک اور متقی آدمی سکونت پذیر ہوگا‘ اس کی شہرت پھیلے گی اور تشنگان فیض اس کے پاس پہنچیں گے۔ حضرت عبداللہ غزنوی کے بارے میں بھی یہی صورت حال تھی۔ ان کے فیض کے حدود بھی دور دور تک پھیلے اور افغانستان کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے ہندوستان میں آ پہنچے۔ یہاں کے بعض لوگ ان کی خدمت میں گئے اور فیض یاب ہوئے۔ ان عالی مرتبت حضرات میں حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ کے نامور فرزند مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

حافظ محمد لکھوی کچھ عرصہ اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ انھوں نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی اور اللہ سے

---

❶ تاریخ اہل حدیث ص ۴۴۵

عہد کیا کہ اگر ان کے بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے راہ خدا میں وقف کر دیں گے۔ دعا قبول ہوئی اور اللہ نے انھیں بیٹا عطا فرمایا جس کا نام محی الدین رکھا❶۔ جلیل القدر باپ نے بیٹے کی بہت اچھی تربیت کی اور خوب تعلیم دلائی۔ اس وقت غزنی میں حضرت عبداللہ غزنوی کا چشمہ فیض جاری تھا۔ حضرت حافظ محمد لکھوی نے لائق بیٹے کو ان کی خدمت میں غزنی بھیجا اور سو روپے جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی، زادراہ کے طور پر دیے۔

یہ آج سے کم و بیش دو سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت آمد و رفت کے ذرائع نہایت مخدوش اور پرخطر تھے۔ مولانا ممدوح ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) کے گاؤں "لکھوکے" سے چلے اور راستے کی مشکلات عبور کرتے اور پیچ در پیچ پہاڑی سفر طے کرتے ہوئے غزنی پہنچے۔

مولانا عبداللہ غزنوی کو اللہ کی طرف سے القا ہو گیا تھا کہ کوئی بزرگ ملاقات کو آ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے استقبال کے لیے گھر سے نکلے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ ایک بڑے بزرگ تشریف لا رہے ہیں، ان کے لیے اچھا کھانا تیار کرو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرید بھی نیکی کے کس قدر اونچے درجے پر فائز تھا، جس کی آمد کی اطلاع اللہ کی طرف سے مرشد کو دی گئی ___ مولانا عبداللہ پیشوائی کے لیے راستے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ادھر مولانا لکھوی بھی پہنچ گئے۔ مولانا غزنوی معزز مہمان کو گھر لے کر آئے اور کھانا وغیرہ کھلا کر نام پوچھا تو بتایا کہ میرا نام محی الدین ہے۔ فرمایا نام تو اچھا ہے، لیکن یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہم لوگ کس حد تک احیائے دین کرتے ہیں۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن وہ نام ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ میرا نام محمد اعظم تھا۔ بے شک اعظمیت کا تعلق محمد (ﷺ) کی ذات ستودہ صفات سے ہے، تاہم میں نے اس کو بدل کر اپنا نام عبداللہ رکھ لیا کہ اللہ کا بندہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ آپ اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیجیے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ عبدالرحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے، اگرچہ بعض حضرات انھیں مولانا محی الدین بھی کہتے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی دو ماہ کی طویل اور تکلیف دہ مسافت طے کر کے غزنی پہنچے تھے۔ وہاں جا کر انھوں نے حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور واپس وطن آ گئے۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ پھر غزنی جا کر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس طرح وہ دو مرتبہ مولانا غزنوی کے آستانہ فیض پر گئے اور ان سے مستفیض ہوئے❷۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے سفر غزنی کا ذکر مولانا عبدالجبار غزنوی نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔

---

❶ اس کے بعد ایک اور بیٹے کی ولادت ہوئی، جن کا نام مولانا محمد حسین لکھوی تھا۔ یہ بھی ممتاز عالم تھے۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ستمبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔

❷ یہ واقعہ پوری تفصیل سے اس بندہ عاجز کو حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اوقات میں دو تین مرتبہ سنایا۔ مولانا داود غزنوی، لکھوی خاندان کا بہت احترام کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ لکھوی اور غزنوی خاندانوں کے تعلقات و مراسم بہت پرانے ہیں اور خالص للّٰہیت پر مبنی ہیں۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دوران سفر میں لوگ مولانا عبدالرحمن لکھوی سے مولانا عبداللہ غزنوی کی مخالفت کرتے تھے اور اس سے وہ بہت متحیر ہوتے تھے۔ اثنائے راہ میں انھیں ایک رات میں تین مرتبہ اللہ کی طرف سے القا ہوا' اور قرآن مجید کی آیات ان کے پردۂ سماع سے ٹکرائیں' جن کا مطلب یہ تھا کہ اپنا سفر جاری رکھو اور عبداللہ سے ملو' وہ نیک آدمی ہیں۔ مولانا عبدالجبار غزنوی کے فارسی الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

مولوی عبدالرحمن بن شیخ محمد بن بارک اللہ جو اپنے دور کے علما میں بہت مشہور عالم ہیں اور زہد و تقویٰ اور رشد و صلاح میں اپنے زمانے کے امام ہیں' ان (مولانا عبداللہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے' ملک غزنی تک گئے۔ یہ دو ماہ کی طویل اور تکلیف دہ مسافت ہے جو انھوں نے طے کی۔ راستے میں انھوں نے حضرت مولانا عبداللہ کی نسبت' مخالفوں سے جو کلمات سنے' اس سے حیران ہوئے' چنانچہ اسی رات کو ان کو یہ الہام ہوا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ۔ (الذریت:۲۳)

(سو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی' وہ برحق ہے' اسی طرح جیسے کہ تم بات چیت کر رہے ہو۔)

دوسری بار یہ الہام ہوا:

وَاِنَّهُمْ عِنْدَ نَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ط (ص:۴۷)

(اور بے شک یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں ہیں)

تیسری بار یہ الہام ہوا:۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ۔ (الزخرف:۵۹)

(وہ تو بس ہمارے ایک بندے ہیں' جن پر ہم نے اپنا فضل کیا) ❶

مولانا عبدالجبار غزنوی کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اس طویل سفر کے مختلف مقامات میں لوگوں نے مولانا عبداللہ غزنوی سے متعلق مولانا عبدالرحمن سے جو باتیں بیان کیں' ان سے وہ پریشانی اور حیرانی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے افکار و عقائد کے بارے میں کئی قسم کی باتیں ان کے ذہن میں گھومنے لگی تھیں۔ ان کی یہ پریشانی اس وقت دور ہوئی' جب اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی اور قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات یکے بعد دیگرے ان کے ذہن میں بہ صورت الہام و القا گردش کرنے لگیں۔

خاندان غزنویہ اور لکھویہ کے روابط:

مولانا عبداللہ غزنوی کے دامن ارادت سے وابستہ ہونے کے بعد علمائے غزنویہ اور علمائے لکھویہ کے

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی ص ۱۰

درمیان سلسلہ روابط بہت بڑھ گیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے نہایت تکریم و اعزاز کا برتاؤ کرتے تھے۔
مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے صاحب زادے مولانا محمد علی لکھوی مدنی نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات پر مدینہ منورہ سے ان کے صاحب زادوں مولوی عمر فاروق اور مولانا ابوبکر غزنوی کے نام ایک تعزیتی مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس میں انھوں نے غزنوی اور لکھوی خاندان کے باہمی تعلقات اور مولانا عبدالرحمٰن لکھوی سے مولانا عبداللہ غزنوی کے روابط کے بارے میں تحریر فرمایا تھا کہ:

''حضرت امام مولانا عبدالجبار صاحب رحمہ اللہ نے ایک دن اخی المرحوم مولانا داؤد غزنوی کو فرمایا تھا کہ داؤد! تم محمد علی کو اپنا بھائی سمجھا کرو۔ اس کے والد مولانا عبدالرحمٰن صاحب میرے بھائی تھے۔ حضرت امام صاحب کی اس وصیت پر میرے الاخ المرحوم نے پورا عمل کیا۔ مسجد غزنویہ (امرتسر) میں ایام طالب علمی سے لے کر ہم آج تک لڑکپن، جوانی، بڑھاپے تک ہمدرد و ہمراز بھائی بھائی رہے۔ للہ الحمد ___ اگرچہ ہمارے خاندان الگ الگ ہیں۔ مگر روحانی اور دینی سلوک میں ایک ہی ہیں۔ حضرت ولی اللہ المعروف مولانا عبداللہ صاحب غزنوی، راقم کے والد ماجد (رحمتہ اللہ علیہما) کو اپنی صلبی اولاد سے مقدم رکھتے تھے۔ صوفی عبدالحق صاحب مرحوم غزنوی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''بسوئے عبدالرحمٰن بروکہ آں آفتاب است۔'' یعنی علم سلوک کے لیے عبدالرحمٰن کی طرف جاؤ کہ وہ علم سلوک کا آفتاب ہے۔ الحاصل کہ حضرت والد ماجد، حضرت عبداللہ صاحب کے روحانی لڑکے تھے۔ لہٰذا اخی المرحوم حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی تغمدہ اللہ تعالی برحمتہ راقم کے بھائی روحانی ہوئے جو کہ نسبی بھائیوں سے بدرجہا افضل و اعلیٰ مقام ہے [1]۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی نہایت پاک باز اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ مولانا نواب وحید الزمان خاں حیدر آبادی نے نماز کے سلسلے میں تسہیل القاری (اردو ترجمہ صحیح بخاری) میں بہ درجہ غایت تکریم کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہمارے شیخ اتقی زماں مولوی عبدالرحمٰن صاحب ساکن لکھو کے رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنی نہیں جانتا، اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف پر اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے [2]۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی جلیل القدر عالم اور بہت بڑے صاحب طریقت تھے۔ حدیث میں حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ۱۳۱۳ھ کو مدینہ منورہ میں بحالت سجدہ وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کے والد مکرم حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ کا انتقال اس سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ۱۳ صفر ۱۳۱۱ھ/ ۲۶ اگست ۱۸۹۳ء کو ہوا تھا۔

---

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) ۷ فروری ۱۹۶۴ء

[2] تسہیل القاری، پارہ پنجم، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی کی شہرت ان کے قیام غزنی کے دور ہی میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں پہنچ گئی تھی اور لوگ حصول فیض کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اپنی جلاوطنی کے دوران اور قیام دہلی کے زمانے میں بھی وہ پنجاب سے گزرتے ہوئے بعض مقامات میں تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے لیے کچھ عرصہ مقیم رہے۔ ان مقامات میں ڈیرہ اسماعیل خاں اور اس کا نواحی علاقہ بھی شامل ہے۔ اس اثنا میں جیسا کہ آگے ذکر ہوگا' انھیں امرتسر میں بھی اقامت گزینی کا موقع ملا اور ان علاقوں کے لوگ ان کے مواعظ حسنہ اور صحبت بابرکت سے اثر پذیر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ افغانستان سے ہجرت کے بعد اور امرتسر میں ورود سے قبل اس کے نواحی گاؤں خیر الدین پہنچے تو فوراً ہی کثرت کے ساتھ فیض و زیارت کی غرض سے لوگ ان کی خدمت میں آنے لگے اور چند ہی روز میں وہ مرجع عقیدت قرار پا گئے اور اس چھوٹے سے غیر معروف گاؤں کو مرکز فیض کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

راقم عاجز کے بزرگوں کی حاضری:

راقم الحروف کے جد امجد میاں محمد مرحوم کے حقیقی چچا میاں امام الدین مرحوم اور ہماری برادری کے ایک اور بزرگ حاجی نور الدین مرحوم بھی اسی زمانے میں موضع خیر الدین میں مولانا عبداللہ غزنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ آزادئ پاکستان و ہندوستان سے قبل ایک مرتبہ حاجی نور الدین مرحوم نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی: ''ہمیں پتا چلا کہ غزنی سے ایک بزرگ جن کا نام عبداللہ ہے' امرتسر آئے ہیں۔ ان کو اور ان کے اہل و عیال کو کابل کے بادشاہ نے اپنے ملک سے فقط اس لیے نکال دیا ہے کہ وہ کلمہ حق بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر میں اور میاں امام الدین اپنے شہر (کوٹ کپورہ)❶ سے چلے اور امرت سر پہنچے۔ یہ سفر پیدل طے کیا۔ امرتسر جا کر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ اپنے خاندان سمیت قریب کے ایک گاؤں خیر الدین میں قیام فرما ہیں۔ وہاں گئے تو لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان کے گرد جمع تھا۔ وہ نہایت خوب صورت بزرگ تھے۔ سرخ و سفید رنگ' بارعب چہرہ' مناسب قد و قامت اور ہر آن ذکر الٰہی میں مشغول۔ ہم تین دن اور تین راتیں وہاں رہے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نور کی بارش ہو رہی ہے اور اللہ کی رحمت گھٹائیں باندھ کر آگئی ہے۔ ہم لوگ ان سے بیعت ہونا چاہتے تھے' لیکن نہ وہ ہماری بولی سمجھتے تھے اور نہ ہم ان کی زبان سے آشنا تھے۔ ہم خالص پنجابی بولنے والے اور ان کی زبان فارسی۔! فرمایا' اب تم جاؤ' کچھ پڑھو' پھر آنا۔ لیکن ہم لوگ دوبارہ نہیں جا سکے۔ واپس آ کر مولانا عبدالرحمٰن لکھوی سے بیعت ہو گئے' جو غزنی جا کر ان کے مرید

❶ آزادی سے پہلے کوٹ کپورہ، مشرقی پنجاب کی سکھ ریاست فرید کوٹ کا ایک شہر تھا، آزادی کے بعد ریاستیں ختم ہوگئیں اور فرید کوٹ کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ اب یہ شہر ضلع فرید کوٹ میں ہے۔ میرا آبائی وطن یہی شہر ہے۔ امرتسر وہاں سے ایک سو کلو میٹر کے لگ بھگ ہوگا۔

ہوئے تھے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقہ ارادت میں شمولیت کا شرف حاصل ہوا۔ حاجی نورالدین مرحوم فرماتے تھے کہ ''تین دن اور تین راتوں کی ان نمازوں میں جو مولانا عبداللہ غزنوی کی اقتدا میں پڑھیں' ایسا روحانی لطف اور قلبی سرور حاصل ہوا کہ اس کے بعد نصیب نہ ہو سکا۔

میاں امام الدین مرحوم اور حاجی نورالدین مرحوم نہایت صالح اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ایک ہی شہر کے باشندے تھے اور حسن اتفاق سے ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے شہر (کوٹ کپورہ) میں دین کی خوب اشاعت کی اور بے شمار لوگوں کو قرآن پڑھایا اور اسلام سکھایا۔

میرے والد مکرم (میاں عبدالمجید نے ایک مرتبہ بتایا تھا) انھوں نے بتایا کہ میاں امام الدین کی وفات کے وقت وہ تقریباً بارہ سال کے تھے۔ یہ بات انھوں نے ۱۹۸۴ء کے لگ بھگ بتائی تھی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۹۰ سال تھی۔ انھوں نے ۱۶ر ستمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ میاں صاحب کئی روز سے بیمار تھے۔ بے شمار لوگ ان کی عیادت کو آتے اور ان کے مکان کے قریب مسجد میں آکر بیٹھ جاتے۔ جس رات وہ فوت ہوئے' اس رات مسجد میں لوگوں کی بہت بھیڑ تھی۔ والد صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے والد (میاں محمد) کے ساتھ تمام رات مسجد میں رہے۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے روشنی کی ایک لمبی شعاع میاں امام الدین کے مکان سے نکلی اور آسمان تک چلی گئی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ اسی وقت شور مچ گیا کہ میاں امام الدین فوت ہو گئے۔ یہ ۱۹۰۵ء کے قریب کا واقعہ ہے۔

حاجی نورالدین نے کم و بیش سو سال عمر پائی۔ بچوں کو قرآن پڑھانا ان کا اصل کام تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے خوں ریز ہنگامے میں بہت بڑے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے لیکن یہاں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو فیروز پور کے راستے سے دریائے ستلج عبور کیا اور اسی دن دوپہر کے وقت گنڈا سنگھ والا (ضلع قصور) میں وفات پا گئے۔ نماز جنازہ پڑھنے والوں میں ان سطور کا راقم بھی شامل تھا۔ وہیں سڑک کے کنارے' ایک ویرانے میں دفن کیے گئے' جس کے ارد گرد سرکنڈے کا دور تک پھیلا ہوا جھنڈ تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا محمد حسین بٹالوی:

جیسا کہ پہلے گزر چکا' دیار ہند کے جید عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم بھی مولانا عبداللہ غزنوی کے زمرۂ مریدین میں شامل تھے۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے فاضل تھے۔ ۱۷ محرم ۱۲۵۶ھ/۲۴ مارچ ۱۸۴۰ء کو پیدا اور ۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ (۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء) کو فوت ہوئے۔

مولانا غلام رسول:

مولانا عبداللہ غزنوی کے ایک بہت ہی نامور اور ممتاز مرید مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ

ضلع گوجرانوالہ) تھے' جو طویل عرصے تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کا ذکر مولانا غزنوی کے حالات میں کثرت سے آتا ہے۔ دہلی میں میاں سید نذیر حسین دہلوی سے دونوں نے ایک ساتھ حدیث پڑھی۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا' یہ دونوں بزرگ میاں صاحب کے درس میں شامل تھے۔ ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو دہلی میں جنگ آزادی کا پہلا شعلہ نمودار ہوا۔ مولانا غلام رسول نے عید الفطر دہلی میں پڑھی اور پھر وہاں سے وطن روانہ ہو گئے۔ لیکن مولانا غزنوی کچھ عرصہ وہیں رہے۔

مولانا غلام رسول نہایت صاحب فراست عالم تھے اور ان کی سوچ بہت اونچی تھی۔ انھوں نے دہلی میں عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر کہا تھا کہ معلوم نہیں اب ہندوستان کب تک غلام رہے [1]۔

مولانا عبداللہ غزنوی اپنے اس مرید اور شاگرد پر بہت شفقت فرماتے اور عام طور پر انھیں ''عبداللہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے نام جو خطوط تحریر کیے ان میں بھی ''عبداللہ ساکن قلعہ'' لکھا ہے۔ بعض دفعہ دونوں اکٹھے سفر پر جاتے۔ ایک مرتبہ ضلع سیالکوٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا غلام رسول ہم رکاب تھے۔ جب ایک گاؤں ''ہلو والی'' پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کو روک لیا۔ وہ لوگ مولانا غلام رسول کو بہت اچھی طرح جانتے تھے' لیکن مولانا عبداللہ سے متعارف نہ تھے۔ وہاں کے چند سرکردہ آدمی مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وعظ کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا۔ ''حضرت مولانا عبداللہ ساتھ ہیں' ان کا مقام شیخ اور مرشد کا ہے' ان کی اجازت کے بغیر وعظ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ لوگ مولانا عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ فرمایا ''ایں مردماں چہ می گویند''؟ (یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟) بتایا گیا کہ آپ سے یہ عرض کرنے آئے ہیں کہ مولانا غلام رسول کو وعظ کہنے کی اجازت دے دیں۔ یہ سن کر مولانا غلام رسول سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

''مولوی غلام رسول قابل وعظ شدی''؟ (مولوی غلام رسول تم وعظ کہنے کے قابل ہو گئے ہو؟)

فرمایا' کلمہ حق کہنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بے شک کتنی بھی مخالفت کی جائے اور لوگ جتنا جی چاہے ہنگامہ بپا کریں' ماریں' پیٹیں' منبر سے اتار دیں' لیکن پیشانی پر بل نہ پڑے۔ وہ بار بار تکلیف پہنچائیں اور مبلغ اتنے ہی زور اور جذبے سے بار بار کلمہ حق بلند کرے۔ اگر یہ چیز آپ میں پیدا ہو گئی ہے تو بے شک آپ کو وعظ کہنے کا حق ہے [2]۔

ایک روز مولانا غلام رسول صاحب سے کسی مسئلے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

مولوی غلام رسول! تو مولوی شدی' محدث شدی' عالم شدی' واعظ شدی' واللہ ہنوز مسلمان نشدی۔

یعنی مولوی غلام رسول! تم مولوی ہو گئے ہو' محدث ہو گئے ہو' واعظ ہو گئے ہو' لیکن ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔

---

1. ''الاعتصام'' تحریک آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۲۲، ماہ مئی ۱۹۵۷ء

2. ''حضرت مولانا داود غزنوی'' ص ۱۶ (مضمون مولانا محی الدین احمد قصوری)

یہ سن کر مولوی غلام رسول فرش پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔ پھر فرمایا: ”بگو لا الہ الا اللہ۔“ منقول ہے کہ اس وقت مسجد کے در و دیوار سے لا الہ الا اللہ کی آواز آ رہی تھی❶۔

مولانا غلام رسول کی ولادت ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء میں اور وفات ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے مولانا عبداللہ غزنوی کی فارسی میں سوانح عمری بھی لکھی ہے‘ جس کے حوالے ان صفحات میں کئی بار آئے ہیں (ان کے حالات اس کتاب کی دسویں جلد میں ملاحظہ فرمایے)۔

مولوی غلام قادر:

مولانا عبداللہ غزنوی بلا شبہ ولی اللہ اور عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ اکثر ان پر استغراق و محویت کا عالم طاری رہتا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کے ایک استاذ مولوی حافظ عبدالرحمٰن مرحوم‘ مولانا عبداللہ غزنوی کے شاگرد تھے۔ مولانا قصوری ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”وہ فرمایا کرتے تھے کہ قیام امرتسر کے زمانے میں جب وہ حضرت مولانا (عبداللہ) سے حدیث پڑھا کرتے تھے‘ ان کی محویت کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے میں آئے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ یکایک سخت بارش شروع ہوگئی‘ ایسی سخت کہ مقتدی سب نماز چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف دو چار رہ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھ سب کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے! ”باراں شد؟ واللہ عبداللہ را خبر شد❷۔ (کیا بارش ہوگئی ہے؟ عبداللہ کو اس کا احساس نہیں ہوا)

”نماز عصر کے بعد مولانا عبداللہ غزنوی کا خاص وقت تھا۔ جن لوگوں کو دعا کرانا ہوتی‘ وہ اس وقت پہنچ جاتے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے پھوپھا مولوی غلام قادر کو مولانا عبداللہ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ امرتسر گئے تو نماز کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اپنے خاندان کا ذکر کیا۔ فرمایا‘ اگر تمھارا تعلق اس خاندان سے ہے تو ضرور علم سے کچھ دست رس رکھتے ہوگے۔ انھوں نے از راہ انکسار عرض کیا ”کچھ شد بد رکھتا ہوں۔“ ایک دن مولانا نے اپنی کسی کتاب کا قلمی نسخہ نکالا اور مولوی غلام قادر سے فرمایا کہ کتابت کر سکتے ہو تو یہ چھوٹی سی کتاب نقل کر دو۔ ان کا خط بہت اچھا تھا۔ کئی دن کے بعد جب کتاب نقل کر کے پیش خدمت کی تو بہت خوش ہوئے۔ ایک روز نماز عصر کے بعد مولوی غلام قادر نے عرض کیا ”حضرت میرے لیے دعا فرمائیں۔“ پوچھا ”کیا دعا کروں؟“ عرض کیا‘ مجھے بعض دفعہ دردِ سر کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ بے حال ہو جاتا ہوں اور نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ دعا فرمائیں کہ ایک تو دردِ سر کی شکایت دور ہو جائے۔ دوسرے نماز با جماعت قضا نہ ہو۔ تیسری کسی اور چیز کے لیے دعا کی اور درخواست کی جو (مضمون نگار مولانا محی الدین احمد قصوری) کو یاد نہیں رہی‘ حضرت مولانا نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور فرمایا: ”قبول شد ان شاء اللہ۔“

---

❶ حضرت مولانا داؤد غزنوی‘ ص ۱۶ (مضمون مولانا محی الدین احمد قصوری)

❷ حضرت مولانا داؤد غزنوی‘ ص ۱۴

——— مولوی غلام قادر اس وقت بالکل جوان تھے۔ کل ستر سال کی عمر پائی۔ یعنی دعا کے بعد کم وبیش پچاس سال زندہ رہے۔ اس طویل مدت میں نہ کبھی درد سر ہوا' نہ سفر و حضر میں کبھی نماز باجماعت قضا ہوئی۔ زندگی کی آخری رات عشا کی نماز باجماعت ادا کی۔ تہجد کی نماز پڑھ چکے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔ ذکر الٰہی شروع کیا اور فجر کی نماز سے قبل جان جان آفریں کے سپرد کر دی❶۔

یہ حضرت مولانا غزنوی کے چند مریدوں کا ذکر ہے۔ ورنہ ان کا حلقہ عقیدت و ارادت بہت وسیع تھا اور امرتسر تشریف لانے کے بعد پنجاب کے تقریباً تمام مقامات کے لوگ تصوف و سلوک میں انھیں اپنا کعبہ مقصود قرار دیتے تھے۔

قید خانے کی سختی اور پشاور کو روانگی:

امرتسر میں ورود سے قبل مولانا عبداللہ غزنوی اپنے تین بیٹوں ——— مولانا محمد' مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار سمیت کابل کے قید خانے میں بند رہے۔ یہ ان کے لیے انتہائی اذیت کا زمانہ تھا۔ سنگ دل حاکموں نے ایک حبہ بھی ان کے خرچ کے لیے مقرر نہ کیا۔ یہ بے گناہ لوگ قید میں ڈال دیے گئے' پھر کسی نے خبر نہ لی کہ کس حال میں ہیں۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں اللہ کی طرف سے القا ہو گیا کہ یہ لوگ بھوک پیاس میں مبتلا اور سخت پریشانی کے عالم میں ہیں۔ چنانچہ اہل شہر ہر وقت قسم قسم کے کھانے اور نوع بنوع پھل ان کے لیے اس قدر فراخی اور کثرت سے لاتے کہ اپنے گھر میں بھی یہ فراخی اور کثرت نہ دیکھی تھی ——— اس اثنا میں امیر افضل خاں بعارضہ وبا انتقال کر گیا تو امیر اعظم خاں کابل کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے مولانا پر یہ ستم ڈھایا کہ خان ملا خاں عبدالرحمٰن کے بہکانے سے ان کو اور ان کے بیٹوں کو جیل سے نکالا' ان کے اہل و عیال کو غزنی سے کابل بلایا اور خاندان کے ان افراد کو جن میں عورتیں' مرد اور بچے شامل تھے' شدید گرمی کے موسم میں پیادہ پا' کوئی زاد راہ یا سفر خرچ دیے بغیر پشاور کی طرف نکال دیا اور سخت دل سپاہیوں کو ان پر متعین کیا اور تاکید کی کہ بہت جلد ان کو پشاور پہنچا دیں۔ اوپر سے گرمی کی آگ برستی تھی اور نیچے زمین کی تپش سے پاؤں جلتے تھے۔ ان پتھر دل سپاہیوں کی سختی کی وجہ سے جوان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے' آرام کا ایک لمحہ بھی میسر نہ تھا۔ خطرناک اور پہاڑی راستے میں ڈاکو بار بار ان پر حملہ آور ہوتے اور یہ مظلومین اپنا دفاع کرتے ——— حملہ آور لوگ حکومت کابل کے اپنے آدمی تھے جن کو خاص طور سے اس نے اس کام کے لیے مقرر کیا تھا۔

اس الم ناک سفر میں مولانا کے دو خادم ساتھ تھے۔ ایک خادم کا نام "ملا سفر" تھا۔ اور ایک کا "ملا مراد ———"! دھوپ کی شدت اور سفر کی تھکاوٹ کے باعث آپ کے لیے چلنا مشکل ہو جاتا تو وفادار خادم ملا سفر آگے بڑھتا اور آپ کو پیٹھ پر اٹھا لیتا۔ اسی بنا پر ملا سفر کو "راحلہ عبداللہ" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ خوش

❶ حضرت مولانا داود غزنوی' ص ۱۴' ۱۵

بخت خادم اسی نام سے مشہور ہوا۔ غرض نہایت جسمانی تکلیف اور بدنی اذیت برداشت کرتے ہوئے یہ لوگ پشاور پہنچے ❶۔"

مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی مصیبتیں اور تکلیفیں وہ پندرہ سال سے برداشت کرتے چلے آرہے تھے ❷۔ یعنی حکومت افغانستان اور علمائے سو نے ان کو پورے پندرہ سال مبتلائے اذیت رکھا۔

پشاور میں وہ تھوڑی مدت قیام پذیر رہے اور وہاں سے بعض دوستوں کی استدعا سے پنجاب کے شہر امرتسر تشریف لے گئے ❸۔ یہ ان کی امرتسر میں آمد کا تیسرا اور آخری مرحلہ تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ خاندان کے تمام افراد ایک ہی وقت میں غزنی سے امرتسر نہیں آ گئے تھے، بعض حضرات جن میں مولانا کے کچھ قریبی عزیز بھی شامل تھے، بعد میں آئے۔

اس کاروان فقر و درویشی کو افغانستان کی حدود سے نکلے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ امیر اعظم خان کی حکومت ختم ہوگئی اور وہ ہزیمت اٹھا کر ملک سے بھاگ گیا۔ اس پر ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں بھاگا پھرتا تھا، اور کہیں پناہ نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کے اہل و عیال کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، لیکن اس کی وجہ سے انھیں بھی نکال دیا گیا اور محلات و قصور میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ تمام خاندان انتشار اور پراگندگی کا شکار ہوگیا اور اس بھری پڑی دنیا میں کوئی ان پر ترس کھانے والا نہ تھا۔ امیر دوست محمد خاں افغانستان کا پہلا حکمران تھا جس نے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں مولانا عبداللہ غزنوی کو ہدف ستم بنایا تھا، اب خود اس کا شاہی خاندان انتہائی اذیتوں میں مبتلا تھا۔

حضرت عبداللہ غزنوی کو افغانستان کے چار بادشاہوں نے مبتلائے اذیت کیا، جن کے علی الترتیب نام یہ ہیں:۔

(۱) امیر دوست محمد خاں (۲) امیر شیر علی خاں (۳) امیر محمد افضل خاں اور (۴) امیر محمد اعظم خاں۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایران کابل کے خاندان کے بہت سے لوگ پشاور، پنجاب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انگریزی حکومت کی قید میں آئے، اس کا تختہ مشق بنے، اور کئی قسم کی اذیتوں سے دوچار ہوئے۔

امرتسر میں پہلی دفعہ آمد اور قیام:

مولانا عبداللہ غزنوی امرتسر آئے تو یہ شہر ان کے لیے کوئی اجنبی اور غیر مانوس شہر نہ تھا۔ اس سے پہلے وہ دو دفعہ اس شہر میں آ چکے اور قیام فرما چکے تھے۔ پہلی دفعہ کب آئے؟ پھر دوسری دفعہ کب آئے اور کتنا عرصہ

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۱

❷ ایضاً، ص ۲۲

❸ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۱

وہاں رہے؟ اس موقعے پر اس کی وضاحت ضروری ہے۔ مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میہاں سنگھ والا) نے اس ضمن میں جو کچھ بیان کیا ہے' اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

جب حضرت مولانا کو دوسری مرتبہ غزنی سے نکالا گیا اور ان کے خلاف بہت بڑا ہنگامہ بپا ہوا تو وہ سوات آئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ سوات میں ایک بزرگ اخوند عبدالغفور تھے جو زہد و ریاضت اور عبادت و تدین میں ممتاز تھے۔ وہ تصوف میں مجددیہ قادریہ سلسلے میں سے منسلک تھے اور صائم الدہر اور شب زندہ دار تھے۔ مولانا ان کے ہاں پہنچے تو وہ نہایت شفقت اور مروت سے پیش آئے اور ان کی بہت دل دہی اور دل داری کی۔ لیکن جب افغانستان میں مولانا کے حاسدوں کو اس کا علم ہوا' تو انھوں نے اخوند عبدالغفور کو ان کے خلاف ایک خط تحریر کیا۔ اخوند صاحب نے وہ خط پڑھا تو اصل معاملے کی تحقیق کیے بغیر مولانا سے سلسلہ مروت منقطع کر لیا۔ اس کے بعد بھی مولانا کچھ مدت سوات رہے' لیکن اخوند صاحب کی ہمدردیاں ان سے ختم ہو گئی تھیں اور رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس طرح سوات کی اس مدتِ قیام کو ان کے دورِ ابتلا ہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔

اب ان کے لیے سوات میں مزید قیام ممکن نہ رہا تھا اور اخوند صاحب کی مخالفت بہت روحانی پریشانی کا باعث بن گئی تھی' اس لیے وہ وہاں سے نکلے اور علاقہ سرحد کے ایک مقام ''کوٹھہ'' تشریف لے گئے۔ وہاں سید امیر صاحب کے ہاں مقیم ہوئے جو حضرت سید احمد شہید بریلوی کے مرید اور خلیفہ تھے اور اپنی برگزیدگی اور دین داری میں پورے علاقے میں شہرت رکھتے تھے۔ سید امیر صاحب نے مولانا کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی اور انتہائی شفقت سے پیش آئے۔ سید صاحب ممدوح سے حضرت مولانا نے تبرکاً شرف بیعت بھی حاصل کیا۔ وہیں مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میہاں سنگھ والے) سے ملاقات ہوئی اور جلد ہی دونوں کے درمیان رشتہ اخوت اور تعلق مودت استوار ہو گیا۔ سید امیر صاحب اس پر بے حد مسرت کا اظہار کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی اس مودت و اخوت پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ آپس میں اسی قسم کا برتاؤ ہونا چاہیے تاکہ ایک دل سے دوسرے کے دل میں نور کی شعاع پہنچتی رہے۔ مولانا غلام رسول صاحب بھی سید امیر کے مرید اور ان سے بیعت تھے اور مولانا عبداللہ کی آمد سے پہلے سے سید صاحب کے ہاں مقیم تھے۔

حضرت سید امیر صاحب بہت ہی مہربان اور مشفق بزرگ تھے۔ جب تک حضرت عبداللہ صاحب وہاں رہے وہ ہمیشہ ان کی تسکین خاطر فرماتے رہے اور شروع سے آخر تک ایک ہی نہج اور دستور کے مطابق ان سے معاملہ قائم رکھا۔ انھوں نے مولانا عبداللہ غزنوی اور افغانستان کے امیر اور علما کے درمیان مصالحت کرانے کی بھی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں فریقوں میں مسائل شرعیہ سے متعلق جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے' رفع ہو جائے اور مولانا اپنے وطن غزنی واپس چلے جائیں۔ لیکن مولانا کی طبعی آہستہ روی اور اس باب میں عدم دلچسپی کی بنا پر تصفیہ و مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے بھی مولانا کی طرف دست صلح بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

اسی اثنا میں گرمی کا موسم آگیا۔ مولانا نے سید صاحب ممدوح سے سرد علاقے میں جانے کی اجازت طلب کی اور منگل تھانہ میں رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مولانا غلام رسول نے ہزارہ اور اس کے گردونواح میں قیام کرنے کا مشورہ دیا اور مولانا عبداللہ نے اس مشورے کو قبول فرمایا۔ سید امیر نے ان کو رخصت عطا کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سکندر پور (ہری پور' ہزارہ) کے باغ میں جو چھوٹی سی مسجد ہے' اس میں یہ حیات گل کے پاس رہیں اور ان کو تلقین کریں۔ چنانچہ مولانا وہاں گئے اور قیام پذیر ہوئے۔ وہاں ان کو امیر افغانستان کا خط پہنچا کہ "آئندہ آپ جائیں اور افغانستان کے علما۔ ہم اس میں دخل نہیں دیں گے اور نہ آپ سے کچھ کہیں گے۔" اس خط کا مطلب بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ امیر افغانستان نے مولانا کے متعلق اپنا رویہ بدل لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا افغانستان واپس آجائیں۔

امیر افغانستان کے نقطہ نظر میں اس تبدیلی کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک میں حضرت مولانا کے مریدین بہت بڑی تعداد میں موجود تھے اور وہ اس کو مجبور کرتے تھے کہ ان کو مراجعت وطن کی اجازت دی جائے اور جو پابندیاں ان پر عائد کی گئی ہیں وہ ختم کی جائیں ___ مولانا کابل کے امیر کا خط پڑھ کر پہلے تو وطن جانے کو تیار ہو گئے اور اس ارادے سے نوشہرہ تک چلے بھی گئے۔ لیکن دوسرے دن صبح کو ارادہ بدل گیا اور اپنے دوستوں سے فرمایا کہ یہاں سے ہم نے شاہ جہان آباد یعنی دہلی جانے کا عزم کرلیا ہے' کوئی شخص ہم کو اس سے نہ روکے۔

اب وہ نوشہرہ سے یکے میں سوار ہوئے اور ایک ہفتے میں لاہور پہنچے۔ لاہور میں کچھ عرصہ قیام کیا اور لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان کی صحبت نہایت مؤثر تھی' جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی اور قلب میں عجز وانکسار کے دروازے کھول دیتی تھی۔

لاہور سے چلے تو امرتسر پہنچے۔ وہاں حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں قیام فرمایا اور اپنی توجہات خاص سے غافل لوگوں کے دلوں سے برائی کا زنگ اتارا❶۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس مرتبہ امرتسر کتنا عرصہ مقیم رہے' البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ مہینے سے زیادہ عرصہ قیام رہا اور لوگوں کو وعظ وارشاد سے مستفید فرمایا۔

اس سے آگے مولانا غلام رسول لکھتے ہیں:۔

امرتسر سے دہلی کا عزم کیا اور وہاں سے یکے میں سوار ہو کر آٹھ روز میں دہلی پہنچے۔ دہلی میں میاں سید نذیر حسین صاحب کے مدرسے میں گئے اور صحیح بخاری پڑھی❷۔

معلوم ہوتا ہے سوات سے لے کر دہلی تک کے اس تمام سفر میں مولانا غلام رسول صاحب ان کے ہم رکاب تھے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ درس بخاری میں وہ ان کے ساتھ تھے۔

---

❶ مولانا غلام رسول' ص ۳۲' ۳۳

❷ ایضاً' ص ۳۳

اس سے آگے لکھتے ہیں:

سیدنذیر حسین بے تکلف آدمی تھے۔ اپنے کام کاج خود ہی کر لیتے تھے۔ کسی قسم کا تصنع نہ فرماتے تھے' اس لیے مولانا عبداللہ ان سے بہت خوش تھے ❶۔

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں:

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے ہم لوگ زیادہ عرصہ سید نذیر حسین صاحب کے پاس دہلی میں نہ رہ سکے۔ مولانا عبداللہ کو اس پر بہت افسوس تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تھوڑی مدت مزید اقامت کا موقع مل جاتا تو بہت فائدے مرتب ہوتے' لیکن اب تو دہلی ویران ہوگئی اور لوگ بکھر گئے۔ دہلی سے راہ داری یعنی انگریزی حکومت سے تحریری اجازت لے کر نکلے تو امرتسر تشریف لائے اور حافظ محمود کی تربیت کرنے لگے۔ جب حافظ محمود کو اذکار میں بخوبی جمعیت حاصل ہوگئی' نماز میں حضور قلب ہونے لگا اور تلاوت قرآن میں ان کی استعداد کے مطابق سرور ولذت کی نعمت حاصل ہونے لگی تو ایک سال کے بعد امرتسر سے رخصت ہو کر اپنے وطن عزیز چلے گئے ❷۔

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امرتسر میں مستقل قیام سے قبل مولانا عبداللہ امرتسر سے پوری طرف واقف تھے۔ وہاں وہ دو دفعہ جا چکے تھے اور دونوں دفعہ لوگوں کو فائدہ پہنچایا اور نیکی کی ترویج واشاعت کی تھی۔ ایک مرتبہ تو دہلی سے واپسی پر پورا ایک سال وہاں قیام کیا تھا۔ امرتسر کے لوگ ان سے متاثر تھے اور فیض حاصل کرتے رہے تھے۔ حافظ محمود صاحب تو ان کے باقاعدہ مرید تھے۔ بعض اور لوگ بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے افغانستان سے ہجرت کے بعد باقاعدہ سکونت کے لیے امرتسر کو ترجیح دی۔

موضع خیر الدین میں مدت قیام:

مولانا عبداللہ غزنوی کو جب آخری مرتبہ کابل کے قید خانے سے نکالا گیا تو ان کی پہلی منزل پشاور تھی' جہاں افغانستان کے سپاہی انھیں چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہاں سے مختلف بلاد وقصبات میں سے گزرتے ہوئے بستی خیر الدین پہنچے۔ یہ گاؤں امرتسر سے سات کوس (تقریباً ۱۴ کلومیٹر) کے فاصلے پر جنوب مغرب میں ہے۔ مولانا کی آمد کے بعد اس گاؤں کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور مولانا سے فیض حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت ہر وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کئی مہینے اس گاؤں میں مقیم رہے۔ وہ متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ انھوں نے دینوی مال و دولت کے حصول کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور وہ تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا اسم گرامی سید احمد غزنوی تھا۔ ایک تحریر سے پتا چلتا ہے کہ وہ باپ کی ہجرت کے بعد غزنی سے روانہ ہوئے تھے اور قریبہ

❶ مولانا غلام رسول، ص ۳۳

❷ ایضاً۔

خیر الدین میں آ کر ان سے ملے تھے۔ اس دور میں ان لوگوں کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ زیادہ نہیں تو چند مہینے لازماً موضع خیر الدین میں اس قافلۂ خیر و صلاح کا قیام رہا۔

مولانا سید احمد غزنوی فرماتے ہیں:۔

یاد دارم وقتے کہ در قریہ خیر الدین بخدمت والد صاحب از غزنی آمدہ بودم، روزے خط محمد حسن خاں کہ برائے طلب احقر فرستادہ بود، پیش والد مرحوم عرض کردم کہ نام بردہ ایں خط برائے من ارسال داشتہ و گزارۂ من در آں سرزمین نہایت تنگ، اگر مرضی والد باشد، احقر ملازمت او اختیار کند۔ وگرنہ فصبر جمیل ❶۔

یعنی مجھے یاد ہے کہ جب میں غزنی سے قریہ خیر الدین میں والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ایک دن محمد حسن خاں کا خط آیا، جس میں انھوں نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ میں یہاں نہایت تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ خط میں نے والد صاحب مرحوم کی خدمت میں پیش کیا کہ وہ اجازت دیں تو میں محمد حسن خاں کی ملازمت اختیار کر لوں اور اگر نہ اجازت دیں تو صبر جمیل کو اوڑھنا بچھونا بنا لوں۔

مولانا نے بیٹے کی اس گزارش پر دو تین روز غور کیا اور مراقبے کے بعد کچھ وصیت کی، لیکن ملازمت کی اجازت نہیں دی۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ علم و فقر کا یہ قافلہ کافی عرصہ موضع خیر الدین میں قیام پذیر رہا ___ یہ عرصہ اگر سال بھر کو نہیں تو چند مہینوں پر ضرور محیط ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دنوں یہ حضرات مالی لحاظ سے بہت تنگ دست اور پریشان تھے۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔

حکومت کابل کے امرا میں سے ایک امیر عالم گل خاں کہا کرتا تھا کہ مولانا عبداللہ کو جب ہدف ستم بنایا گیا وہ کبیر السن بھی تھے اور کمزور جسم بھی، لیکن نہایت صبر سے تکلیفیں برداشت کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت مولانا کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔

امرتسر میں مستقل سکونت:

امرتسر کے جو لوگ ان سے تعلق ارادت رکھتے تھے وہ انھیں موضع خیر الدین سے امرتسر لے گئے۔ وہاں جس مقام پر علم و تصوف کا یہ کارواں جا کر اترا، اس نے محلہ غزنویہ کے نام سے شہرت پائی۔ جو مسجد تعمیر کی گئی وہ مسجد غزنویہ کہلائی اور جو مدرسہ قائم کیا گیا وہ مدرسہ سلفیہ غزنویہ کے نام سے موسوم ہوا۔ مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ اس شہر کو مرکز بنا کر مولانا عبداللہ نے کتاب و سنت کی نشر و ترویج میں بے حد کوشش کی۔ توحید الٰہی، اتباع سنت اور عقائد سے متعلق بہت سی کتابوں اور رسالوں کے فارسی اور اردو زبان میں ترجمے کرا کے شائع کیے، جس سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا ❷۔

---

❶ "مکتوبات امام الزمان شیخ عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ و الغفران" ص ۸۲،

❷ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۲

مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے فرزندانِ گرامی کے زمانے میں ''جس قدر خوش عقیدہ لوگ'' اس شہر امرتسر میں موجود تھے' بقول مولانا عبدالجبار غزنوی ''گمان نہیں کہ ہندوستان اور خراسان کے شہروں میں سے کسی شہر میں اس قدر خوش عقیدہ لوگ موجود ہوں' باوجودیکہ یہ شہر ہندوؤں اور کافروں کی قرارگاہ ہے ❶۔

افغانی اصحاب عقیدت کی آمدورفت:

مولانا کے پڑپوتے جناب عثمان غزنوی صاحب نے ان سطور کے راقم کو اپنے بعض بزرگوں کے حوالے سے بتایا کہ جب یہ خانوادۂ فضل وکمال غزنی سے ہجرت کر کے مستقل طور پر امرتسر آ گیا تو افغانستان کے مختلف مقامات' غزنی کے گردونواح اور پشاور و ہزارہ وغیرہ کے بہت سے لوگ مولانا عبداللہ اور ان کے فرزندان عالی قدر کی خدمت میں آتے اور مستفیض ہوتے تھے۔ وہ لوگ پرانے واقعات بیان کرتے اور ان کے آباواجداد کی بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے۔ کئی کئی دن وہ لوگ امرتسر رہتے اور مستفید ہوتے۔ عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ امرتسر کے مقامی باشندے بھی افغانی اصحاب عقیدت سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور نہایت شوق اور توجہ سے ان کی باتیں سنتے۔ وہ اس انداز سے ان کے دردناک واقعات بیان کرتے کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

عثمان غزنوی صاحب مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم کے بھتیجے اور حافظ سلیمان غزنوی مرحوم کے بیٹے تھے اور اپنے ان بزرگوں سے جو مولانا عبداللہ کے قریب العہد تھے' انھوں نے بہت سی باتیں سنی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا عبداللہ غزنوی کی وہاں تھوڑی بہت جائداد بھی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ان کے بعد بعض عقیدت مندوں نے فروخت کر دیا تھا۔ اس کی رقم وغیرہ ادا کرنے کے لیے بھی وہاں سے لوگ ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔ لیکن مولانا عبداللہ اور ان کے بیٹوں کو اس جائداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصانیف سے شغف:

حضرت عبداللہ غزنوی کے فرزند گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی تحریر فرماتے ہیں کہ میرے والد مکرم حضرت عبداللہ غزنوی کا یہ معمول تھا کہ:

ازدیاد ہدایت کے لیے ہمیشہ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور اس کے آگے گریاں ونالاں رہتے۔ یوں سمجھیے ان کا تمام جسم اللہ کی طرف راغب تھا اور وہ اس سے خوف وخشیت کی مکمل تصویر تھے۔ کتب محققین محدثین کی طلب میں بہت حریص تھے۔ بالخصوص امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف کے طلب ومطالعہ

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی' ص ۲۲

کے بے حد شائق تھے۔ ہر صورت میں ان کی تصانیف حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے مطالعہ سے کبھی سیر نہ ہوتے۔ ان دونوں سے ان کو بہت ہی تعلق خاطر تھا۔ ان کو اکثر اہل علم پر فضیلت دیتے اور فرماتے کہ شاہ ولی اللہ کی نسبت ان سے ایسی ہے، جیسی علمائے خراسان کی شاہ ولی اللہ سے ہے۔ امام ابن تیمیہ کی فضیلت میں فرمایا کرتے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جس دن نور تقسیم ہوا، ابن تیمیہ کو نور کا ایک بڑا حصہ ملا۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیف ''زاد المعاذ'' سے بالخصوص انھیں پیار تھا، اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی سعی فرماتے۔ پورے انہماک سے اس کا مطالعہ کرتے اور اللہ سے دعا کرتے کہ یا ارحم الراحمین زاد المعاد کو میرے لیے توشہ آخرت بنا❶۔

قبولیت دعا:

حضرت ممدوح مستجاب الدعوات عالم تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبولیت بخشتا تھا۔ اس ضمن میں مولانا عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول کرنے میں اس بڑی جلدی فرماتا۔ مستجاب الدعواب ہونا آپ کا ہندوؤں میں بھی مشہور تھا۔ صوفیا کے تمام مشاغل مستحدثہ ان کے نزدیک گمراہی اور بدعت تھے اور ان سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ کل بدعة ضلالة کے مضمون کے مطابق❷۔

بلا شبہ حضرت عبداللہ غزنوی ولی کامل تھے۔ تمام امور سے منقطع ہو کر انھوں نے فقط اللہ سے رشتہ قائم کر لیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، قول و فعل، میل جول سب اللہ کے حکم کے تابع تھا۔ وہ بہت بڑے صوفی تھے لیکن صوفیا کے ایک گروہ نے جو بدعات و محدثات اختیار کر رکھی ہیں، ان سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ان کا تصوف مبنی بر کتاب و سنت تھا اور ان کی ولایت احکام الٰہی اور فرامین رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم آہنگ تھی۔ ان کی قبولیت دعا کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کا معاملہ براہ راست اللہ سے تھا اور جو بات دل سے نکلتی تھی وہ اپنے اندر خلوص اور للّٰہیت رکھتی تھی۔

تلاوت قرآن اور ادعیہ ماثورہ:

زیادہ تر تلاوت قرآن مجید میں مصروف رہتے یا ان دعاؤں کا ورد کرتے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں اور ادعیہ ماثورہ کہلاتی ہیں۔ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ شاید ایسے وظائف بھی پڑھتے ہوں گے، جو حدیث رسول اللہ ﷺ میں موجود نہیں ہیں، لیکن صوفیا سے منقول ہیں۔ مگر بعد میں یہ سب چیزیں ترک کر دی تھیں اور

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۴

❷ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۵

فقط قرآن مجید کی تلاوت اور مسنون دعاؤں کو اپنا معمول قرار دے لیا تھا۔ حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی فرماتے ہیں:۔

مولوی عبداللہ ساکن قلعہ (میہاں سنگھ) نے جو غلام رسول کے نام سے مشہور ہیں، آپ کے حالات و واردات چند ورق میں لکھے ہیں۔ ایک دن وہ رسالہ آپ کے پاس ایک شخص پڑھ رہا تھا۔ اس رسالے کے آخر میں آپ نے یہ چند حرف اپنے ہاتھ سے لکھے۔ "آخر ہمہ اشغال را ترک کردند بجز تلاوت کلام اللہ وادعیہ ماثورہ، واز بدعت احترازمی کرد خواہ بدعت اصلی باشد یا وصفی ❶۔

یعنی بعد میں تمام اشغال کو ترک کر دیا تھا اور بجز تلاوت قرآن اور مسنون دعاؤں کے اور کوئی مشغلہ نہ رہا تھا۔ امور بدعت سے کلیتہً احتراز کرتے، خواہ وہ بدعت اصلی ہو یا وصفی۔

سخاوت و جودت:

نہایت سخی اور کھلے دل کے مالک تھے۔ دنیا کے مال و زر کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ سیکڑوں روپے ان کے پاس آتے، لیکن جس وقت آتے، اسی وقت لوگوں میں بانٹ دیتے۔ چونکہ بہت زیادہ سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ فرماتے، اس لیے یتیم اور مسکین نہایت بے تکلفی سے روپیہ طلب کرتے۔ جس وقت کوئی رقم آپ کے پاس ہوتی، مستحق لوگ آپ کے ہاتھ اور دامن سے فوراً کھینچ لے جاتے۔ ان کی اس بے تکلفی اور دلیری پر آپ مسکرا دیتے، کسی کو کچھ نہ کہتے۔ جن لوگوں کو کچھ نہ ملتا وہ آپ کی جیبیں ٹٹولتے اور ہاتھ اور رومال وغیرہ کی تلاشی لیتے کہ شاید کچھ مل جائے۔ آپ ہنستے اور مسکراتے ہوئے ان کو کپڑے اور جیبیں ٹٹولنے کا پورا موقع دیتے۔ مستحقین سے کہتے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی، سب کچھ تقسیم کر دیا گیا ہے، پھر کچھ آیا تو ان شاء اللہ تمھیں ضرور دیا جائے گا ❷۔

عفو و درگزر:

کسی سے کوئی عداوت اور دشمنی نہ رکھتے۔ کوئی شخص اگرچہ کتنی بھی تکلیف پہنچاتا، اسے فوراً معاف کر دیتے۔ عفو و درگزران کا شیوہ تھا۔ مولانا قاضی عبدالاحد خان پوری بہت بڑے عالم اور ان کے مرید تھے، انھوں نے ایک دن درخواست کی کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ایمان و استقامت عطا فرمائے۔ فرمایا: میں اس شخص کے لیے بھی دعا کرتا ہوں، جو کابل میں نہایت سختی سے مجھ کو مارتا پیٹتا تھا۔ میں اللہ سے اس کے لیے التجا کرتا ہوں کہ "اے اللہ اس کو معاف فرما اور جنت میں داخل کر، کیونکہ وہ جاہل تھا، کوئی بات جانتا نہ تھا۔" مولانا

❶ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار (غزنوی) ص ۲۵

❷ مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۳

عبدالاحد خان پوری سے فرمایا ''جب اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ میرا یہ رویہ ہے اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں تو آپ کے لیے کیوں نہ کروں' ضرور کروں گا۔''

فرمایا میرے دل سے بے اختیار تمام مسلمانوں کے لیے دعا نکلتی ہے۔ آدم سے لے کر اب تک میں سب کے لیے دعا گو ہوں۔ میں ان کافروں کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرتا ہوں جو زندہ ہیں۔

فرمایا کرتے کہ جن لوگوں نے مجھے مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچائیں اور گوناگوں آلام میں مبتلا کیا' میں نے ان سب کو معاف کر دیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری وجہ سے کسی کو نہ پکڑے۔

جب علمائے سو اور ارکان حکومت آپ کی زدوکوب اور تشہیر سے فارغ ہوئے اور آپ کو بیٹوں سمیت قید خانے میں لے گئے تو بعض احباب نے کہا کہ اس زدوکوب کا کچھ علاج کرنا چاہیے' ورنہ آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ لیکن جب کپڑا اٹھا کر پشت کو دیکھا گیا تو نہ کوئی جگہ سرخ ہوئی تھی اور نہ مار پیٹ کا کوئی نشان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چوٹ نہیں لگی۔

فرماتے تھے کہ گرفتاری کے بعد کابل کے ایک بہت بڑے پہلوان کو مجھے زدوکوب کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ نہایت زور سے مارتا تھا' کیونکہ اسے اسی کام پر مامور کیا گیا تھا' لیکن مجھے قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ مار رہا ہے یا نہیں مار رہا ہے۔

امرائے کابل میں سے ایک امیر کا نام عالم گل خاں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے اسی واقعہ کی وجہ سے ان کے ولی ہونے کا کامل یقین ہو گیا کہ جس قدر مار انھیں پڑی ہے اور جو بے پناہ سختی ان پر کی گئی ہے' اگر میرے ہاتھی پر کی جاتی اور اسے اس بے دردی سے مارا جاتا تو بخدا وہ ہلاک ہو جاتا۔ لیکن اس شخص کو باوجود اس قدر جسمانی ضعف اور کبرسنی کے کچھ نہیں ہوا[1]۔ بہرحال حضرت مولانا نے ان سب لوگوں کو معاف فرما دیا۔

وفات:

حضرت عبداللہ غزنوی نے ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ/ ۱۵ فروری ۱۸۸۱ء) کو منگل کی آدھی رات کے وقت وفات پائی اور بدھ کے روز زوالِ آفتاب کے بعد نمازِ ظہر سے پہلے دفن کیے گئے۔ بہت بڑی کثرت کے ساتھ لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ انسانوں کا اس قدر ازدحام تھا کہ بازار بند ہو گئے تھے۔ ہر طبقہ و خیال کے لوگ کثیر تعداد میں شریک جنازہ تھے۔ غریب' امیر' رئیس' علما سب موجود تھے اور جنازے کو اٹھانا اور کندھا دینا ہر ایک کے لیے ممکن نہ رہا تھا ___ مولانا عبدالجبار غزنوی لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کے اس قول کی سچائی کا اس دن پتا چلا کہ الفرق بیننا و بین اھل البدع یوم الجنائز یعنی ہمارے اور اہل بدعت کے درمیان فرق جنازوں کے دن معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۰

کئی دن لوگ ان کی قبر پر نماز جنازہ پڑھتے رہے اور روتے اور آنسو بہاتے رہے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ان کا مرقد امرتسر میں دروازہ سلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے ہے[1]۔

اولاد:

حضرت عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے اور پندرہ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد (۲) مولانا عبداللہ (۳) مولانا احمد (۴) مولانا عبدالجبار (۵) مولانا عبدالواحد (۶) مولانا عبدالرحمٰن (۷) مولانا عبدالستار (۸) مولانا عبدالقیوم (۹) مولانا عبدالعزیز (۱۰) مولانا عبدالحی (۱۱) مولانا عبدالقدوس (۱۲) مولانا عبدالرحیم۔ ان میں سے بعض کے نام آپ نے مختلف اوقات میں خط بھی لکھے اور وصیتیں بھی تحریر کیں۔ یہ تمام حضرات اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ اور دیگر علوم پر عبور رکھتے تھے۔ بعض اہم کتابوں کے مصنف' مترجم اور شارح تھے۔ ان حضرات نے بہت سی عمدہ کتابیں شائع کیں۔ دین داری اور تقوے میں ممتاز تھے۔ ان کے جو حالات میسر آ سکے' ان میں سے بعض کے حالات اس فقیر نے اپنی کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں' بعض کے ''قافلہ حدیث'' میں اور بعض کے ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں تحریر کیے ہیں۔ باقی بزرگوں کا تذکرہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ فقیر اپنی کسی کتاب میں تحریر کرے گا۔

عبداللہ غزنوی کے مکتوبات میں ان کی بعض بیٹیوں کے نام بھی مرقوم ہیں۔ انھوں نے بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کو بھی خط تحریر فرمائے۔ ان میں سے جن قابل احترام خواتین کے نام معلوم ہو سکے ہیں' وہ یہ ہیں:-

(۱) فاطمہ (۲) مریم (۳) امتہ اللہ (۴) امتہ الغفار (۵) امتہ الرحیم (۶) امتہ الحمید (۷) امتہ الوہاب (۸) امتہ الفتاح۔

بھائی اور والدہ:

مولانا عبداللہ غزنوی کے بھائی بھی تھے۔ بھائیوں میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے ہیں' جن کے نام انھوں نے خطوط بھی ارسال کیے ہیں اور وہ ہیں عبدالعظیم اور عبدالخالق ___ والدہ ماجدہ کے نام بھی انھوں نے خطوط لکھے۔ یہ خطوط فارسی میں ہیں اور نہایت نصیحت آموز ہیں۔ انداز بیان واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ ان میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور تصوف کا رنگ بھی۔ ان کے خطوط ایک مستقل مضمون کے متقاضی ہیں۔ یہ خط انھوں نے اپنے زمانہ قید اور جلاوطنی میں لکھے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کی عورتیں اور مرد سب پڑھے لکھے اور متقی و متدین تھے۔

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا عبدالجبار غزنوی، ص ۲۳، ۲۴

بیٹوں کی اولاد:

مولانا عبداللہ غزنوی کے چار بیٹوں مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالستار، مولانا عبدالحی اور مولانا عبدالقدوس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ لاولد ہی اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ باقی بیٹوں کی اولادیں اس طرح ہیں:۔

۱۔ مولانا محمد کے دو بیٹے نام اور کام میں بہت مشہور تھے۔ مولانا عبدالاول غزنوی اور مولانا عبدالغفور غزنوی۔

۲۔ مولانا احمد کے بھی دو بیٹے تھے۔ حکیم عبدالشافی اور مولانا عبدالوارث۔

۳۔ مولانا عبداللہ بن عبداللہ کی اولاد سے ایک بزرگ حافظ عبداللہ غزنوی تھے، جو اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر تھے۔

۴۔ مولانا عبدالجبار غزنوی کے بیٹوں کے نام یہ تھے: مولانا احمد علی، مولانا عبدالستار، مولانا محمد داؤد، مولانا عبدالغفار اور حافظ محمد سلیمان۔

۵۔ مولانا عبدالواحد غزنوی کے صاحب زادوں کے نام یہ تھے: مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا عبدالحمید، مولانا ابراہیم اور مولانا عبدالوالی۔

۶۔ مولانا عبدالعزیز کے بیٹے مولانا عبدالاعلیٰ تھے۔

۷۔ مولانا عبدالرحیم غزنوی کے بیٹوں کے نام یہ تھے:۔ مولانا یحییٰ، مولانا ہارون، مولانا عیسیٰ، حافظ زکریا، مولانا موسیٰ، مولانا احمد اور مولانا نوح۔

پھر آگے چل کر حضرت مولانا کے پوتوں اور پڑپوتوں کی اولادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ لیکن اس خاندان کے علما سے نیکی اور تدین کا جو ایک خاص تصور ابھرتا تھا، اب وہ ختم ہوگیا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم اس خاندان کے مختلف افراد کے درمیان نقطۂ اتصال تھے۔ ان کی زندگی میں دودمان غزنویہ کے سب لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ خود وہ بھی ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔

مولانا عبدالرحیم اور مولانا عبدالواحد دونوں بھائیوں کی تجارت کے سلسلے میں عرب کے بعض علاقوں میں آمدورفت تھی۔ اس ضمن میں وہ کویت گئے تو وہاں نجد وحجاز کے والی سلطان عبدالرحمٰن اور ان کے بیٹے سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں کویت میں مقیم تھے اور نجد پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ غزنوی برادران سے ان باپ بیٹوں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی، نجد کی فتح کے بعد اپنے ہاں ان کو درس وتدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی بھی دعوت دی، چنانچہ یہ بزرگ تقریباً پانچ سال وہاں رہے اور خاندان

سعود کے بعض افراد اور اہل نجد ان سے مستفید ہوئے۔

اس اثنا میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی بعض قلمی کتابیں بھی ان کی وساطت سے برصغیر میں پہنچیں جو یہاں کے ناشروں اور خاندان غزنویہ کے علما نے شائع کیں۔ مولانا اسماعیل اور مولانا داؤد غزنوی کی زندگی تک آل سعود سے ان کے تعلقات کسی نہ کسی شکل میں قائم رہے۔

علمائے غزنویہ کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات:

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ جب افغانستان سے ہجرت کر کے وارد ہند ہوئے' ان کے بارہ بیٹے اور پندرہ بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹے کا نام باپ نے اپنے نام پر عبداللہ رکھا تھا۔ ہجرت کے وقت ان میں سے اکثر ان کی رکاب میں یہاں پہنچے۔ بعض کو یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی اور وہ اس ملک میں آنے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ یہ سب حضرات قرآن و حدیث کے بھی عالم تھے اور طریقت و سلوک کی منزلوں سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ ان میں سے جن بزرگوں کے جو حالات فراہم ہو سکے' وہ میں نے اپنی بعض کتابوں میں بیان کیے ہیں۔ یہاں اس دودمان عالی قدر کے معزز ارکان کی تصنیفی خدمات بیان کرنا مقصود ہے۔ اس فہرست میں ان کی وہ خدمات بھی شامل ہیں جو انھوں نے اہم کتابوں کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں انجام دیں۔ یہ معلومات اس فقیر نے زیادہ تر حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے حاصل ہوئیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر جامع البیان مع حاشیہ: جامع البیان قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اہل علم میں متداول ہے۔ اس کا حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی کے سب سے بڑے صاحب زادے مولانا محمد غزنوی نے لکھا۔ یہ تفسیر مع حاشیہ مولانا محمد غزنوی ۱۸۹۲ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل تیرہ کتابیں پہلی دفعہ چھپیں:

- ☆ اکلیل فی استنباط التنزیل: امام جلال الدین سیوطی۔
- ☆ مفحمات الاقران فی مبهمات القرآن: امام جلال الدین سیوطی۔
- ☆ تفسیر سورۃ النور: امام ابن تیمیہ
- ☆ فوائد شتی: تفسیر کے سلسلے کے مختلف علمی فوائد
- ☆ خاتمة الطبع المشتملة علی الفوائد المهمه۔
- ☆ فوائد شریفیه: امام ابن تیمیہ
- ☆ فتیا فی مسئلة کلام الله تعالیٰ: امام ابن تیمیہ
- ☆ کتاب الرد علی الجهمیة: امام احمد بن حنبل
- ☆ رساله فی القرآن: امام ابن تیمیہ

☆ الفوز الكبير فی اصول التفسير: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

☆ احاديث التوحيد وردالشرك:

☆ اسباب الاحتراز من الشيطن:

۲- حمائل غزنويه: یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کے ترجمہ وحواشی نواب وحیدالزمان خاں کے تحریر فرمودہ ہیں۔ یہ حمائل مولانا محمد غزنوی کے صاحب زادے مولانا عبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

۳- حمائل غزنويه: یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے اور فوائد سلفیہ اور حواشی مولانا عبدالاول نے شائع کی اور پھر کئی دفعہ چھپی۔ اس حمائل غزنویہ نے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت پائی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب نایاب ہے۔

۴- مصفّی مع مسوّیٰ: یہ دو کتابیں ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف کردہ ہیں اور موطا امام مالک کی شرحیں ہیں۔ مسوی فارسی میں ہے اور مصفی عربی میں ____ یہ دونوں شرحیں ایک ساتھ پہلی مرتبہ مولانا محمد غزنوی نے دہلی سے شائع کیں۔

۵- كشف المغطا: یہ موطا امام مالک کا اردو ترجمہ ہے جو نواب وحیدالزمان خان مرحوم نے کیا۔ اسے پہلی دفعہ مولانا محمد غزنوی نے مطبع مرتضوی دہلی سے شائع کیا۔

۶- رياض الصالحين: حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما سے پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا ممدوح کے ایک مرید مولانا احمد الدین کوموی نے کیا۔ ''کوم'' ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں ایک گاؤں ہے۔ یہ ریاض الصالحین کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔

۷- مشارق الانوار: یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے اور امام حسن بن محمد صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء) کی تصنیف ہے۔ کسی زمانے میں یہ باقاعدہ نصاب درس میں شامل تھی۔ پہلی مرتبہ مع ترجمہ تحفۃ الاخیار کے علمائے غزنویہ نے شائع کی۔

۸- ايقاظ همم اولى الابصار: ازفلانی۔ یہ کتاب ردتقلید سے متعلق ہے۔ حضرت عبداللہ غزنوی کے ایما پر میاں عبدالعزیز مرحوم بارایٹ لا کے والد مکرم مولوی الٰہی بخش وکیل مرحوم کے خرچ سے پہلی دفعہ لاہور میں چھپی۔

۹- ترجمه مشكوة المصابيح: مشکوۃ کا اردو ترجمہ مولانا عبدالاول غزنوی نے کیا۔ کئی بار چھپا اور بہت مقبول ہوا۔

۱۰- نصرة البارى ترجمه صحيح بخارى: مولانا عبدالاول غزنوی نے نصرۃ الباری کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ مع حواشی کے شروع کیا تھا۔ صرف آٹھ پارے مکمل ہو سکے تھے۔

۱۱- انعام المنعم ترجمہ صحیح مسلم: مولانا عبدالاول غزنوی نے صحیح مسلم کا اردو ترجمہ انعام المنعم کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس کا صرف ایک پارہ چھپا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا یا نہیں۔

۱۲- اجتماع الجیوش الاسلامیہ علی غزو المعطلات الجھمیہ: یہ امام ابن قیم کی تصنیف ہے۔ پہلی مرتبہ مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۳- رسالہ الحقیقتہ والمجاز: یہ ابن امام تیمیہ کا رسالہ ہے جو پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور و مولانا عبدالاول غزنوی نے شائع کیا۔

۱۴- جلاء الافہام فی الصلوۃ والسلام علی خیر الانام: امام ابن قیم کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے مولانا عبدالقدوس بن مولانا عبداللہ غزنوی کی کوشش سے پہلی مرتبہ مطبع القران والسنہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۵- شرح حدیث النزول: امام ابن تیمیہ کی تصنیف ہے۔ اسے پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور عبدالاول غزنوی نے مطبع القران والسنہ امرتسر سے شائع کیا۔

۱۶- شرح خمسین: ابن رجب حنبلی کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے اسے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کیا۔

۱۷- تحفۃ العراقیہ فی الاعمال القلبیہ: امام ابن تیمیہ کی تالیف ہے۔ مولانا عبدالغفور و مولانا عبدالاول غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کی۔

۱۸- فتوی الحمویہ: اس کے مصنف بھی امام ابن تیمیہ ہیں۔ اسے بھی پہلی مرتبہ امرتسر سے مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے شائع کیا۔

۱۹- مجموعہ البیان المبدی الشبناعۃ القول المجدی: علامہ سلیمان بن سحمان نجی اس کے مصنف ہیں۔ اسے بھی مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے پہلی دفعہ امرتسر سے شائع کیا۔

۲۰- مجموعۃ التوحید النجدیہ و مجموعۃ الحدیث النجیدیہ: اسے بھی پہلی مرتبہ علمائے غزنویہ نے مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا۔

۲۱- فتح المجید شرح کتاب التوحید: یہ کتاب مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی نے پہلی مرتبہ شائع کی۔

۲۲- فتح المجید شرح کتاب التوحید: یہ کتاب مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی کے اہتمام میں پہلی دفعہ مطبع القران والسنہ امرتسر سے اشاعت پذیر ہوئی۔

۲۳- اثبات علو الرب و مباینتہ عن الخلق: یہ حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی کی تصنیف ہے

اور عربی میں ہے۔

۲۴- اثبات الالهام والبيعة: یہ بھی مولانا عبدالجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔

۲۵- اعانة الملت الاسلاميه: مولانا عبدالجبار غزنوی کا یہ رسالہ اردو میں ہے اور کفار کی ملازمت کے عدم جواز سے متعلق ہے۔

۲۶- الا ربعين بان ثناء الله ليس على مذهب المحدثين: یہ بھی مولانا عبدالجبار غزنوی کا رسالہ ہے اور عربی میں ہے۔ اس میں ان چالیس مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے' جن کی تعبیر میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم نے اسلاف کے متعین کردہ خطوط سے مختلف زاویہ فکر کا اظہار کیا ہے۔ یہ رسالہ ان مباحث پر محیط ہے جو علمائے غزنویہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے درمیان کسی زمانے میں موضوع گفتگو رہے۔ یہ ایک دور کی بات تھی۔ اب ان مباحث سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

۲۷- معارج الوصول بان الاصول والفروع بينه الرسول: یہ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم کا رسالہ ہے۔

۲۸- تحشيه دارمی: حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے لائق فرزند مولانا عبدالرحیم غزنوی نے حدیث کی مشہور کتاب سنن دارمی پر عربی میں حاشیہ لکھا تھا۔ افسوس ہے یہ حاشیہ گم ہو گیا' اس کا آخری حصہ البتہ قلمی صورت میں کسی زمانے میں موجود تھا۔ اب پتا نہیں موجود ہے یا نہیں۔

حضرت عبداللہ غزنوی کے سوانح حیات:

حضرت عبداللہ غزنوی کے سوانح حیات ان کے دور کے دو جید علمائے کرام نے قلم بند کیے۔ ایک ان کے فرزند نامدار امام عبدالجبار غزنوی نے اور ایک ان کے مرید خاص مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) نے۔ یہ دو الگ الگ سوانح حیات ہیں' اگرچہ بہت مختصر ہیں' تاہم ان میں خاصا مواد موجود ہے۔ ان کے علاوہ مولانا غزنوی کے مکتوبات اور ملفوظات بھی ہیں' پھر ان کے مرشد ملا حبیب اللہ قندھاری کے ملفوظات بھی قلمی صورت میں موجود ہیں۔ مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم چاہتے تھے کہ ان سب کو سامنے رکھ کر حضرت عبداللہ غزنوی کی ایک مفصل سوانح عمری مرتب کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے ان سطور کے راقم سے مشورہ کیا تو میں نے مولانا غلام رسول مہر کا نام تجویز کیا اور عرض کیا کہ یہ ان کا خاص موضوع ہے۔ دوسرا کوئی شخص ان سے بہتر سوانح عمری نہیں لکھ سکے گا۔ اس دور کے افغانستان اور ہندوستان کے سیاسی اور علمی کوائف اور حضرت عبداللہ کے معاصرین کا تذکرہ نہایت ضروری ہے اور یہ مہر صاحب ہی ضبط تحریر میں لا سکتے ہیں۔ مولانا نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا اور مجھے مہر صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے مہر صاحب سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں اس ضمن میں ضروری مشورے کے لیے مولانا کے پاس آؤں گا۔ مولانا نے اس

اثنا میں میری معرفت ملفوظات حبیب اللہ قندھاری (قلمی) بھی خرید لیے تھے۔ بہرحال میں نے مولانا کو بتایا کہ مہر صاحب کسی روز آپ کے ہاں آئیں گے تو فرمایا کہ میں خود جا کر ان سے بات کروں گا۔ اس کا علم مولانا کے صاحب زادے مولانا ابوبکر غزنوی کو ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں خود حضرت عبداللہ غزنوی کی سوانح عمری لکھوں گا۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تصنیف و تالیف کا کام بہت مشکل اور انتہائی نازک ہے۔ ہر شخص اسے کما حقہ انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے خاص ذہن کا حامل ہونا ضروری ہے۔ مہر صاحب ہی اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں۔ اس سے کچھ عرصہ بعد (۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو) مولانا غزنوی وفات پا گئے اور جو مواد انھوں نے جمع فرمایا تھا' وہ سید ابوبکر صاحب کے قبضے میں چلا گیا اور کوئی کام نہ ہو سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مواد کو جو مولانا عبداللہ غزنوی کے سلسلے میں دست یاب ہے' بنیاد بنا کر ان کی ایک مفصل سوانح عمری معرض تحریر میں آ سکتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش وہ خطہ زمین ہے جس میں بے شمار علما و فقہا اور مشائخ و صوفیا پیدا ہوئے یا کسی اور ملک سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے اور پھر اسی کو اپنا مستقر قرار دے لیا۔ انھوں نے یہاں بے پناہ خدمات انجام دیں۔ بعض نے درس و تدریس کے حلقے قائم کیے' بعض نے تصوف و طریقت کی مسندیں بچھائیں۔ بعض تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے اور بعض نے وعظ و تقریر کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا۔ ان بزرگان عالی مرتبت میں حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' شیعہ ہر مسلک فقہی کے اہل علم موجود تھے' مگر احناف کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ اپنے اپنے وقت کے جلیل القدر لوگ تھے۔ لیکن افسوس ہے ان میں سے بہت سے حضرات کے حالات محفوظ نہیں کیے گئے اور ان کی سرگرمیوں اور فقہی کاوشوں کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا لائق فخر علمی سرمایہ بے خبری کی دبیز تہوں میں دفن ہو گیا۔ حضرت عبداللہ غزنوی اس قطعہ زمین کی نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ علم و کمال' تدین و تقویٰ' تصوف و سلوک اور اعتدال و توازن میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ہماری علمی تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ ان کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ملتے۔ اور تو اور ان کے موجودہ اخلاف بھی ان سے بے خبر ہیں۔

تعلقات کا پیمانہ:

حضرت عبداللہ غزنوی اور ان کے فرزندان گرامی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور یہی ان کا شعار اور یہی ان کی پہچان تھی۔ وہ بہت بارعب' خوب رو' وجیہ اور حسین و جمیل لوگ تھے۔ علم و فضل اور فہم و فراست کی دولت سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔ للّٰہیت' خوف خدا اور تقوے کی نعمت سے بھی مالا مال تھے۔ عزت و تکریم سے بھی حصہ وافر عطا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نہایت منکسر اور متواضع تھے۔ ان سے برصغیر کے بعض نوابوں اور رئیسوں نے رشتے داریاں قائم کرنے کی کوشش کی اور کئی اونچے اونچے خاندان ان سے تعلقات مناکحت پیدا کرنے کے لیے' ساعی ہوئے' مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ نہ کسی دولت مند کو لڑکی دی اور نہ کسی امیر

کے گھر اپنے کسی بیٹے کی شادی کی۔ شادی اور نکاح کے سلسلے میں ان کا صرف ایک ہی معیار تھا' اور وہ تھا تقویٰ، نیکی اور صالحیت۔! ذات پات یا دنیا کے مال و دولت کو اس باب میں ان کے ہاں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ جو شخص ان کے نزدیک ان اوصاف کا حامل ہوتا' اس سے رشتے داری قائم کر لیتے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی ہے اور لطیفہ بھی کہ حضرت امام عبدالجبار غزنوی کے مدرسے امرتسر میں ایک صاحب مولانا محمد حسین ہزاروی تھے' جن میں دینوی وجاہت کی کوئی بات نہ تھی' البتہ نیک اور عالم آدمی تھے۔ ایک دن امام صاحب نے ان سے فرمایا' مولوی محمد حسین! آج عصر کے بعد میں تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو یہیں مسجد میں رہنا۔ مولانا محمد حسین کے لیے یہ بات بالکل خلاف توقع تھی' وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ امام صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپنے لگے اور ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ امام صاحب نے تسلی دی اور فرمایا' گھبراؤ نہیں۔ عصر کے بعد اسی مسجد میں یہ سنت پوری ہوگی۔

اس ایک ہی واقعہ سے ان لوگوں کے تدین و تقویٰ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انسان کی پرکھ کا اصل پیمانہ کیا تھا۔ وہ طالب دنیا نہ تھے' طالب دین تھے۔ وہ مال و زر کی حرص نہ رکھتے تھے' اتباع شریعت اور احکام دین کی پابندی ان کا مطمح نظر تھا۔ آج ہم اسلام کا نام تو بہت لیتے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک اس کی تبلیغ و اشاعت بھی کرتے ہیں' لیکن ہم میں کتنے ہیں جو اس معیار اور اصول پر کاربند ہوں جو ان بزرگوں نے اپنے عمل و کردار سے قائم کیا۔

فتاویٰ غزنویہ:

علمائے غزنویہ کی خدمات بوقلموں میں ایک قابل ذکر اور لائق تحسین خدمت فتاویٰ غزنویہ ہے' جسے فقہی ابواب کی ترتیب سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کے سابق شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب (وفات ۱۴؍ جولائی ۲۰۰۲ء) نے مرتب کیا۔ مختلف مسائل سے متعلق یہ فتوے مولانا عبدالجبار غزنوی' مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے تحریر فرمودہ ہیں۔ معلوم نہیں اس فتاویٰ غزنویہ کی طباعت و اشاعت کا معاملہ کس منزل میں ہے۔

فتویٰ نویسی بہت اہم اور نازک کام ہے۔ مفتی کے لیے جہاں کتاب و سنت کا عالم ہونا ضروری ہے وہاں فقہیات پر عبور بھی لازمی ہے۔ علمائے غزنویہ کا اس باب میں ایک خاص اسلوب اور نقطہ نظر تھا۔ مولانا سید داؤد غزنوی علمی اور فقہی اعتبار سے اس خانوادۂ عالی مرتبت کے آخری رکن تھے۔ یہ اسلوب اور نقطہ نظر ان کی زندگی تک قائم رہا۔ غزنوی علما کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ لکھتے تھے' لیکن اس کی تائید میں فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا قول ضرور پیش کرتے تھے' اسی وجہ سے علمائے غزنویہ کے فتوے کو اہل علم میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ مولانا داؤد غزنوی کا فتویٰ ان شرعی مسائل میں جو قانونی نوعیت کے حامل ہیں'

عدالت میں باقاعدہ تسلیم کیا جاتا اور مدارِ فیصلہ قرار پاتا تھا۔

علمائے غزنویہ فقہ کی تعلیم و تحصیل کو طلبا کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا داؤد غزنوی کے کتب خانے میں تمام مسالک فقہ کی کتابیں موجود تھیں اور وہ باقاعدہ انھیں زیر مطالعہ رکھتے تھے۔ جو عالم علم فقہ سے دلچسپی نہ لیتا، علمائے غزنویہ اس کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

حافظ محمود امرتسری:

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے تذکرے میں حافظ محمود کا ذکر ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے۔ امرتسر میں مستقل سکونت سے قبل حصول حدیث کے لیے دہلی جاتے ہوئے بھی حضرت مولانا عبداللہ غزنوی ان کے ہاں مقیم رہے اور انھیں تلقین فرمائی۔ واپسی پر بھی ان کے ہاں تشریف لائے اور ایک سال اقامت اختیار کیے رکھی۔

حافظ محمود صاحب مولانا کے بہت ہی مخلص مرید تھے اور باقاعدہ عالم تھے۔ امرتسر میں باغ والی مسجد کے امام تھے۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سے ان کے پرانے تعلقات تھے اور دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ جبھی تو مولانا نے ان کو اس درجہ اہمیت دی کہ دو مرتبہ ان کے پاس تشریف لائے اور طویل عرصے تک اقامت گزیں رہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۲۹۔ سید عبداللطیف حسینی ویلوری

سید عبداللطیف بن ابوالحسن کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ابوالحسن بن عبداللطیف بن ولی اللہ بن عبداللطیف بن محمد بن عبدالحق بن قطب الدین بن عبدالفتاح عسکری حسینی نقوی۔ اپنے عہد کے متقی عالم تھے۔ جنوبی ہند کے شہر ویلور کے باشندے تھے۔ فقہ اور تصوف کے نامور علما میں سے تھے۔ ہفتے کے روز ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۲۰۷ھ/ ۲۷ جنوری ۱۷۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے والد سید ابوالحسن حسینی نقوی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور علم حاصل کرنے لگے۔ بعد میں مولانا محمد حسین مدراسی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بہت سی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں مدراس کو بلدۂ فضل و کمال کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے مدرسے میں مولانا علاء الدین انصاری لکھنوی کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔ مولانا علاء الدین اپنے علم و ادراک کی وجہ سے "ملک العلما" کے لقب سے ملقب تھے۔ سید عبداللطیف نے مدراس میں ان سے بھی استفادہ کیا اور ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء میں سند فراغ حاصل کی۔ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں عازمِ حجازِ مقدس ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے

گئے تھے اور وہاں درس حدیث دیتے تھے۔ سید عبداللطیف ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں ان سے سند حدیث لی۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر اس عالم دین اور فقیہ نامور نے پوری زندگی علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں صرف کر دی۔

سید عبداللطیف حسینی وسیع العلم، فہیم و فریس اور ذہین و فطین عالم تھے۔ آخر عمر میں انگریزی زبان سیکھی اور ملکہ برطانیہ کو انگریزی میں ایک رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں اس کو قبول اسلام کی دعوت دی۔ یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور تھا اور ہندوستان انگریزی حکومت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ انگریزی حکومت نے اس عہد میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، وہ برطانوی حکومت کی تاریخ جبر و استبداد کا ایک نہایت الم ناک باب ہے۔ اس عہد میں کسی انگریز کو اسلام کی دعوت دینا، بالخصوص ملکہ برطانیہ کے سامنے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا اور پھر اس کو قبول کرنے پر زور دینا، انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن سید موصوف کی جرأت مومنانہ اور جذبہ تبلیغ اسلام ملاحظہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمنوں کو بھی اس کی دعوت دے رہے ہیں۔

اس وقت سید عبداللطیف مدراس میں قیام پذیر تھے۔ سید محمد علی حسینی رام پوری بھی وہیں تھے۔ ایک اور عالم مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی بھی مدراس میں اقامت فرما تھے۔ سید محمد علی حسینی رام پوری، امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کے مرید اور علاقہ مدراس میں ان کے خلیفہ تھے، جب کہ مولانا جمال الدین انصاری ان کے شدید مخالف تھے۔ وہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی تکفیر کرتے اور ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کو غلط قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے میں سید محمد علی رام پوری اور مولانا جمال الدین انصاری کے درمیان بحث شروع ہوئی، جو بہت جلد شدید نزاع کی صورت اختیار کر گئی، پھر علمائے مدراس میں یہ سلسلۂ بحث انتہائی نازک صورت حال میں بدل گیا تھا۔ سید عبداللطیف حسینی نے ان دنوں سید محمد علی رام پوری سے ملاقات کی۔ وہ ان کے حامی تھے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس میں علمائے مدراس اور سید محمد علی رام پوری کے درمیان نزاعی مسائل وضاحت سے بیان کیے۔ اس کتاب کو انھوں نے ''القول الفصل'' کے نام سے موسوم فرمایا۔ ''القول الفصل'' کے علاوہ سید عبداللطیف حسینی نے چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ''جواہر الحقائق'' اور ''جواہر السلوک'' شامل ہیں۔

سید عبداللطیف حسینی نقوی ویلوری، تیرھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور حدیث و فقہ کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے ۱۱ محرم ۱۲۸۹ھ/ ۲۱ مارچ ۱۸۷۲ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی❶۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۰۹، ۳۱۰ بحوالہ حدیقۃ المرام

۳۰۔ سید عبدالمغنی پھلواروی

پھلواری کے علمائے نام دار اور فقہائے ذی اکرام میں سید عبدالمغنی بن معین الدین ہاشمی جعفری پھلواروی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ یہ اس نواح کے فقیہ و مفتی تھے۔ پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ وحید الحق پھلواروی سے علم حاصل کیا اور شیخ مجیب اللہ جعفری سے تصوف و طریقت کا درس لیا۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم عربیہ میں یگانۂ عصر ہوئے اور بہت شہرت پائی۔ ماہر فقہ و اصول اور عالم کتاب و سنت ہونے کی وجہ سے مدت دراز تک پھلواری کے عہدۂ افتا پر متعین رہے۔

اپنے دور کے جلیل القدر فاضل اور پرہیز گار عالم تھے۔ اپنے مفوضہ فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے اور حتی الامکان کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بلند اخلاق اور عالی کردار عالم تھے۔ انتہائی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد فتویٰ جاری کرتے۔

پھلواری کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۳۳ھ/۱۰۔ اگست ۱۸۱۷ء کو اپنے وطن پھلواری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے❶۔

۳۱۔ مفتی عبدالواجد خیر آبادی

مفتی عبدالواجد خیر آبادی، شیخ عصر اور عالم کبیر تھے۔ شیخ محمد اعلم سندیلوی کے بھانجے تھے۔ اکثر کتب درسیہ انہی سے پڑھیں، پھر بعض کتابوں کے لیے قاضی وہاج الدین گوپاموی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ احمد اللہ حسینی خیر آبادی سے شرح ھدایۃ الحکمت کا کچھ حصہ پڑھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد خیر آباد ہی میں قیام کیا اور درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اور بہت سے علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔

بعد ازاں راجہ تکیت رائے نے لکھنؤ تشریف لانے کی دعوت دی اور اس شہر کا منصب افتا پیش کیا۔ افتا کی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں مسند درس بھی آراستہ کی اور متعدد علما و طلبا کو تعلیم دی۔ ان کے شاگردوں کی وسیع تعداد میں مولانا فضل امام خیر آبادی بھی شامل ہیں۔

مفتی عبدالواجد خیر آبادی نے جمعۃ المبارک کی رات ۴ شوال ۱۲۱۶ھ/ ۷ فروری ۱۸۰۲ء کو وفات پائی❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۱۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۲۔ تراجم الفضلاء ص ۱۰، ۱۱

۳۲- مفتی عبدالواحد فرنگی محلی لکھنوی

مفتی عبدالواحد انصاری فرنگی محلی لکھنوی تیرھویں صدی ہجری کے فاضل اور مفتی تھے۔ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے پوتے اور مولانا عبدالاعلیٰ کے بیٹے تھے۔ فقہ و اصول میں دسترس رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ابتدائی درسی کتابیں مولانا از ہارالحق لکھنوی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے جد محترم مولانا عبدالعلی مدراس کی مسند درس پر فائز تھے۔ عبدالواحد نے مدراس کا عزم کیا اور انتہائی کتابوں کی تکمیل اپنے جد امجد سے کی۔ سند فراغ بھی انہی سے لی۔ فتویٰ نگاری اور فقہیات میں عبور تھا' اس لیے کسی اونچے منصب کے متمنی تھے۔ اس وقت بنگال کا چیف جسٹس انگریز تھا جس کا نام رنگٹن تھا۔ مفتی صاحب اس کے پاس کلکتے پہنچے اور وہاں کی عدالت عالیہ میں عہدۂ قضا و افتا کی درخواست کی۔ کافی عرصہ اس سلسلے میں وہاں مقیم رہے' لیکن یہ منصب قاضی نجم الدین کاکوروی کے سپرد تھا' مفتی صاحب کو حاصل نہ ہو سکا۔ قاضی صاحب ممدوح کی وفات کے بعد دوبارہ کوشش کی تو یہ عہدہ مفتی سراج الدین کے حصے میں آیا۔ مفتی صاحب اب بھی اس کے حصول میں ناکام رہے۔ بعد ازاں انھیں پنجاب کے شہر "رہتک" کا قاضی و مفتی بنایا گیا اور دو سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ کافی عرصے تک رہتک میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر رہتک سے ان کو پانی پت بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی سرکاری طور پر اسی منصب پر فائز رہے۔ پانی پت میں تبدیل ہونے کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔

مفتی عبدالواحد فرنگی محلی نے علم و فضل کی گود میں پرورش پائی تھی اور اپنے عہد کے نامور علمائے احناف میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۲۹ محرم ۱۲۶۱ھ/ ۷ فروری ۱۸۴۵ء کو ان کا انتقال ہوا[1]۔ ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۳- مولانا عبدالوہاب مدراسی

مولانا عبدالوہاب مدراسی کے والد کا نام مولانا محمد غوث اور دادا کا ناصرالدین تھا۔ مسلکاً شافعی تھے اور اہل علم خاندان کے فرد تھے۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۸ھ/ ۱۳ دسمبر ۱۷۹۳ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی اس وقت مدراس میں نواب محمد علی خاں والا جاہ کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے اور پورے ہندوستان میں ان کے فضل و کمال کا شہرہ تھا۔ عبدالوہاب اسی شہر کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان کے لوگ بحرالعلوم کی فراوانی علم سے خوب آگاہ تھے۔ وہ عبدالوہاب کو بحرالعلوم کی خدمت میں لائے اور اس نوعمر طالب علم نے ان سے تبرکاً علم صرف کی ابتدائی کتاب میزان الصرف پڑھی۔ اس کے بعد مولانا عبدالقادر' مولانا جعفر حسین اور مولانا علاء الدین لکھنوی وغیرہ علمائے عصر اور اساتذۂ فن کی خدمت میں

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۳۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۴۲

حاضر ہوئے اور ان سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ آخری اور انتہائی کتابوں کی تکمیل اپنے والد مکرم مولانا غوث محمد سے کی اور انہی سے سند فراغت حاصل کی۔ شیخ علی بن عبداللہ حموی اس زمانے میں قرات وتجوید کے ماہر تھے فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبدالوہاب نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا اور قرات وتجوید سیکھی۔

یہ جلیل القدر شافعی عالم دو مرتبہ حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پہلا حج ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں کیا اور دوسری مرتبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں یہ شرف حاصل کیا۔

مولانا عبدالوہاب کا شمار مدراس کے امرائے سلطنت میں ہوتا تھا اور وہاں کے نواب نے ان کو متعدد بڑے بڑے خطابات سے سرفراز کیا تھا۔ مثلاً مدارالامراء' مدیرالملک' مختار الدولہ' وزارت خان بہادر' ارسطو جنگ وغیرہ خطابات سے ممتاز تھے۔ ان کے والد محترم بھی جید عالم تھے اور حکومت مدراس کے اعلیٰ مناصب پر متعین رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ مناصب بلکہ اس سے بھی زیادہ بیٹے کو تفویض ہوئے۔

مولانا عبدالوہاب بلند اخلاق' باہمت' جرأت مند اور سخی تھے اور معاملات دین ودنیا کی عقدہ کشائی میں ماہر تھے۔ ان کے والد نے ۱۱ صفر ۱۲۳۸ھ/ ۲۸۔ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو وفات پائی اور اس کے بعد لائق بیٹے کو بعض حکومتی ذمے داریوں پر مامور کیا گیا۔ ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء میں افواج مدراس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں منصب وزارت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں کئی بڑے بڑے خطابات سے نوازے گئے۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں حکومت کی ذمے داریوں سے الگ ہو گئے۔

۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء سے لے کر ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء تک حکومت مدراس کے متعدد اہم مناصب پر فائز رہے لیکن بائیس سال کے اس طویل عرصے میں والی مدراس نے ان کو ہمیشہ ان آداب سے مستثنیٰ قرار دیے رکھا' جن کا کسی والی ریاست کے حضور پیش ہونے کے وقت امراوعمال کے لیے بجالانا ضروری تھا۔ یعنی سلام اور کورنش وغیرہ سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ عالم دین حکومت کی تمام ذمے داریاں سرانجام دینے کے ساتھ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے لیے بھی وقت دیتے تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱- اکمل الوسائل لرجال الشمائل: یہ کتاب شمائل ترمذی کے رجال سے متعلق ہے۔
۲- الکواکب الدریہ منتخب احادیث مجالسة الدینوریہ:
۳- کشف الاحوال عن نقد الرجال: ضعیف رواتِ حدیث سے متعلق۔
۴- بدء الغرره فی اسماء القرأة العشره۔
۵- ایک رسالہ جغرافیے سے متعلق۔
۶- نهاية السول فی مناقب ریحانة الرسول۔
۷- کاشف الرموزات الی الورقات: یہ کتاب اصول فقہ سے متعلق ہے۔
۸- هبة الوهاب: یہ فقہ شافعی کے بارے میں ہے۔

۹- سفرنامہ:

یہ تمام کتابیں عربی میں ہیں:

مدراس کے اس شافعی المسلک فقیہ نے تہتر سال کی عمر پائی اور ۵ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۲۶ جون ۱۸۶۸ء کو انتقال کیا❶۔

۳۴- قاضی علی احمد گوپاموی

قاضی علی احمد بن قاضی مصطفیٰ علی فاروقی گوپاموی کو قاضی ارتضا علی خاں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنے دور اور علاقے کے شیخ و فاضل تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء میں صوبہ یوپی کے شہر "گوپامئو" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں کا شمار اپنے عہد کے جید علما میں ہوتا تھا۔ بیٹے نے درس نظامیہ کی ابتدائی کتابیں انھی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے' وہاں اساتذۂ عصر کی کثیر تعداد مشغول درس وافادہ تھی' ان کی خدمت میں حاضری دی اور حصول علم کیا۔ سات سال علمائے لکھنؤ سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر سندیلہ گئے' وہاں منطق و فلسفہ کے مشہور عالم ملا حمد اللہ سندیلوی کے بیٹے مولانا حیدر علیؒ سندیلوی کا سلسلہ درس جاری تھا' اس میں شامل ہوئے اور منطق، فلسفہ اور علم کلام کی تحصیل کی۔ بعد ازاں بلگرام کا قصد کیا۔ بلگرام میں مولانا ابراہیم مالاباری سے علم حدیث پڑھا اور شیخ نصیر الدین سعدی بلگرامی سے اخذ طریقت کیا۔ سات سال بلگرام میں مقیم رہے۔ جب علوم عقلیہ ونقلیہ اور تصوف وسلوک میں مہارت پیدا کر لی تو واپس اپنے وطن گوپامئو تشریف لے گئے۔

اس زمانے میں ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں بہادر مدراس کے قاضی القضاۃ تھے' یہ بھی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء میں مدراس چلے گئے اور وہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں وہاں کے منصب افتا پر فائز ہوئے۔ ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء میں ان کے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۲۰ء میں انھیں چتوڑ کے قاضی مقرر کیا گیا۔ ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء میں شیخ عمر بن عبدالکریم مکی سے مکاتبتاً شرف سند و اجازہ حاصل کیا۔ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء کو مدراس کے جنوبی بلاد و قصبات کا عہدۂ قاضی القضاۃ تفویض ہوا۔ اس عہدۂ جلیلہ پر تیرہ سال متمکن رہے۔ اس سے کئی سال بعد فریضہ حج ادا کرنے کے لیے حرمین شریفین گئے اور وطن واپس آتے وقت حدیدہ کے مقام پر وفات پائی۔

قاضی علی احمد دو ناموں سے موسوم ہیں' ایک قاضی علی احمد سے اور دوسرے قاضی ارتضا علی خاں سے۔ معلوم ہوتا ہے' ارتضا علی خاں ان کا سرکاری لقب تھا' جو چتوڑ کے مفتی اور مدراس کے جنوبی شہروں کے قاضی القضاۃ مقرر ہونے کے بعد ملا۔ چونکہ اصل وطن گوپامئو تھا' اس لیے قاضی علی احمد گوپاموی کہلائے۔ پھر مدراس کو

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۱۵، ۳۱۶، بحوالہ تاریخ احمدی۔

اپنا مسکن بنا لیا تھا اور وہاں جا کر قاضی القضاۃ کے عہدے سے سرفراز ہو گئے تھے' لہٰذا قاضی ارتضا علی خاں مدراسی کے نام سے موسوم کیے گئے۔

یہ عالم دین تیرھویں صدی ہجری میں علاقہ مدراس اور جنوبی ہند کے بہت بڑے مفتی' قاضی اور فقیہ تھے۔ مدراس اور اس کے گردونواح میں علم و کمال کے اعتبار سے کوئی ان کا حریف نہ تھا' مسائل فقہ میں ان کے فتوے اور فیصلے کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ قضا و افتا کی عظیم ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ تدریس بھی جاری تھا' جو بہت وسیع تھا۔ ان سے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ علاوہ ازیں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ قاضی علی احمد گوپاموی نے ہر علمی محاذ پر کام کیا اور شہرت پائی۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱- النفائس الارتضائیہ شرح میزان البلاغہ: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصنیف میزان البلاغہ کی شرح۔

۲- الفرائض الارتضائیہ: علم وراثت سے متعلق۔

۳- نقود الحساب۔

۴- تنبیہ الغفول فی اثبات ایمان آباء الرسول: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں آنحضرت ﷺ کے والدین کا ایمان ثابت کیا گیا ہے۔

۵- شرح قصیدہ بردہ: بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح۔

۶- حاشیہ علی شرح ھدایۃ الحکمۃ: شیرازی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ

۷- حاشیہ علی میرزاھد:

۸- حاشیہ علی میر زاھد' ملا جلال:

۹- حاشیہ علی میر زاھد شرح المواقف۔

۱۰- فارسی اشعار کا دیوان

۱۱- الفوائد السعدیہ: سلوک و تصوف سے متعلق

۱۲- منحۃ السراء فی شرح الدعاء: اس کا نام کاشف الضراء بھی ہے۔

۱۳- شرح اسماء اللہ الحسنیٰ: ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء میں تصنیف کی۔

نزھۃ الخواطر میں اس عالم وفقیہ کی تاریخ وفات ۷ شعبان ۱۲۷۰ھ تحریر کی گئی ہے اور تذکرہ علمائے ہند میں سال وفات ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء مرقوم ہے ❶۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف کا یہ لکھنا کہ وہ "در سال دوازدہ صدو پنجاہ و یک ہجری وفات فرمودہ"

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۴، ۳۲۵۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

(۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں فوت ہوئے) صحیح نہیں۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں وہ بلاد جنوبی مدراس کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور تیرہ سال اس عہدے پر متمکن رہے۔ اس حساب سے وہ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں زندہ تھے۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ ظاہر ہے' یا تو صاحب تذکرہ علمائے ہند کو ان کی تاریخ وفات میں سہو ہو گیا ہے یا یہ کتابت کی غلطی ہے۔

۳۵- سید علی اعظم پھلواروی

پھلواری ہندوستان کے صوبہ بہار کا ایک مردم خیز شہر ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں' اس شہر میں جن ارباب علم اور اصحاب فقہ نے جنم لیا' ان میں سید علی اعظم بن سید افضل حسینی پھلواروی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ حنفی المسلک فقیہ تھے اور اپنے وقت کے شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ زہد و عبادت اور تقویٰ و تدین میں یکتائے عصر تھے۔ مولانا عبدالغنی بن عبدالمغنی جعفری سے تحصیل کی اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ اخذ طریقت شیخ ابوالحسن پھلواروی سے کیا۔ مسائل میں مرجع خلائق تھے۔ اس برصغیر میں جو بدعات پھیلی ہوئی ہیں ان کی شدید مخالفت کرتے اور لوگوں کو کتاب و سنت پر عمل کرنے اور خلاف شرح امور سے بچنے کی تاکید فرماتے۔ انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی' جس میں قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں بزرگوں کے مزاروں پر نذر و نیاز دینے کی مخالفت کی ہے اور بتایا ہے کہ ائمہ فقہ سے یہ رسوم کہیں منقول نہیں' یہ سب چیزیں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں تصنیف کی۔

پھلواری کے اس عالم و فقیہ نے ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۸ھ/ ۲۷ اپریل ۱۸۸۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا❶۔

۳۶- سید علی حبیب ہاشمی پھلواروی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں بے شمار اصحاب علم اور ارباب فضل پیدا ہوئے۔ اس صوبے کے شہر' قصبے اور قریے علمی لحاظ سے نہایت زرخیز تھے۔ جگہ جگہ علما کا بسیرا تھا اور گاؤں گاؤں میں مدرسے قائم تھے۔ ان مراکز علم میں ایک قابل ذکر مرکز ''پھلواری'' تھا۔ یہ شہر صحیح معنوں میں تصوف و طریقت کا گلستاں اور علم و معرفت کا مہکتا ہوا باغ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں اس جنت علم میں جن حضرات نے جنم لیا' ان میں مولانا سید علی حبیب بن ابوالحسن بن نعمت اللہ ہاشمی جعفری کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ اپنے وقت کے شیخ و فاضل اور صالح عالم دین تھے۔ ۲۵ رمضان ۱۲۴۹ھ/ ۵ فروری ۱۸۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ خاندان کے تمام افراد میدان علم کے شہسوار تھے اور ماحول نہایت

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۲۷، ۳۲۸، بحوالہ تاریخ الکملا۔

صاف ستھرا تھا۔ بعض ابتدائی مروجہ کتابیں اپنے والد مکرم سید ابوالحسن سے پڑھیں، بڑی کتابوں کے لیے اپنے بھائی نور العین اور چچا ابو تراب اور محمد حسین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ یہ تمام حضرات مولانا احمدی پھلواروی کے تلامذہ میں سے تھے۔

اس زمانے میں ان کے بھتیجے سید آل احمد پھلواروی جو جید عالم تھے، مدینہ طیبہ میں فروکش تھے۔ وہ مدینہ منورہ سے پھلواری آئے اور مسند درس آراستہ کی۔ بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ استفادہ کرنے والوں کی وسیع فہرست میں صاحب ترجمہ سید علی حبیب پھلواروی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ انھوں نے سید آل احمد سے پوری صحاح ستہ پڑھی اور سند و اجازہ سے سعادت اندوز ہوئے۔

سید علی حبیب پھلواروی تیرھویں صدی ہجری میں ارض ہند کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ان کو کتابیں جمع کرنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مسائل فقہ پر کامل عبور تھا۔ سنت رسول ﷺ کے شیدائی اور عمل بالحدیث میں انتہائی حریص تھے۔ بہت بڑے مبلغ اور متبع کتاب و سنت تھے۔ بدعات و محدثات کے شدید مخالف تھے۔ بزرگان دین کی قبروں پر حصول برکت کے لیے حاضری دینے، اصحاب قبور سے مرادیں مانگنے، نذر و نیاز دینے، قبروں پر چراغ جلانے اور مجالس عرس منعقد کرنے کی سختی سے تردید کرتے اور اسے خلاف قرآن و حدیث قرار دیتے تھے۔

ابتلا کے وقت نماز فجر میں دعائے قنوت کو جائز ٹھہراتے، تشہد میں رفع سبابہ کے قائل اور سری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ بعد از رکوع اور دونوں سجدوں کے درمیان ادعیہ ماثورہ خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ ارکان نماز نہایت اعتدال سے ادا کرتے اور اول وقت میں نماز پڑھتے۔

سید علی حبیب پھلواروی متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جو فقہ و عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں:

۱- النعمت العظمیٰ: یہ ان کی پہلی تصنیف ہے، جو بعض مسائل شرعیہ سے متعلق ہے۔ اس میں چند مسائل جو حدیث کے خلاف ہیں، ان سے بعد میں رجوع کر لیا تھا۔

۲- شواھد الجمعہ: اس میں ثابت کیا ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے لوگوں پر جمعہ پڑھنا فرض ہے۔ فرضیت جمعہ کے سلسلے میں فقہائے حنفیہ نے جو شرائط بیان کی ہیں حدیث کی رو سے انھیں غلط قرار دیا ہے۔

۳- الاسوۃ الحسنہ: خلفائے راشدین کی فضیلت سے متعلق ہے۔

۴- صلاۃ المحبین:

۵- فارسی اشعار کا دیوان۔

سید علی حبیب جعفری پھلواروی شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ نصر تخلص کرتے تھے۔

فقہ حنفیہ کے مسائل پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کا حدیث صحیحہ سے موازنہ کرتے' جو مسئلہ حدیث کے مطابق ہوتا اس پر عمل کرتے اور جو حدیث سے ہم آہنگ نہ ہوتا' اسے بلا تامل ترک کر دیتے۔

پھلواری کے اس ممتاز عالم وفقیہ نے دوشنبہ کے روز ۲۷ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/ ۳۱ مارچ ۱۸۷۸ء کو وفات پائی ❶۔

۳۷۔ سید علی سجاد جعفری پھلواروی

برصغیر اس عالم آب وگل کا وہ خطہ ہے جس کے تمام بلاد وامصار اور قصبات ودیہات میں اصحاب معرفت وادراک نے جنم لیا اور ہر جگہ علم وعرفان کی شمعیں روشن ہوئیں۔ بعض علاقوں میں تو اس کثرت سے علما پیدا ہوئے کہ اس کو حدوشمار کے دائرے میں لانا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دور تک نظر دوڑا کر دیکھیے اہل علم کے خیمے گڑے ہوئے دکھائی دیں گے اور ان سے قال اللہ و قال الرسول کی دلنواز صدائیں بلند ہو کر بار بار پردۂ سماع سے ٹکرائیں گی۔ بالخصوص یوپی اور بہار میں تو گاؤں کے گاؤں اصحابِ تصوف اور اہل علم سے بھرے پڑے تھے۔ ان مقامات میں صوبہ بہار کے قصبہ پھلواری کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ قصبہ صحیح معنوں میں علم پرور اور علما آفرین تھا۔ صدیوں سے یہاں علم کی نہریں جاری اور معرفت کے چشمے رواں ہیں۔ یہاں کے تیرھویں صدی ہجری کے علما کی وسعت پذیر فہرست میں جن حضرات کو نمایاں مقام حاصل ہے' ان میں سید علی سجاد جعفری پھلواروی کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سید نعمت اللہ اور دادا کا مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی تھا۔ اس خاندان کے سب افراد عالی مرتبے کے حامل تھے اور ہر شخص میدان کمالات میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھا۔

سید علی سجاد کی تاریخ ولادت ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۹۹ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۷۸۵ء ہے۔ پھلواری کے اس نونہال نے مولانا احمدی بن وحید الحق ہاشمی جعفری سے حصولِ علم کیا جو اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم اور نامور مدرس تھے۔ طریقت وسلوک کی منزلیں اپنے والد گرامی سید نعمت اللہ کی صحبت میں طے کیں اور ایک عرصے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ علم سے فراغت کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بے شمار تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھائی۔ سلوک وتصوف کی روح پروادی سے بھی بہت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ تصنیف وتالیف کی راہوں میں بھی قدم زن ہوئے۔ شعر وشاعری کی محفلیں بھی جمائیں۔ غرض ہر مقام علم پر رسائی حاصل کی اور ہر بابِ خیر پر دستک دی۔ ان کی تصانیف میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:۔

۱۔ فضائل آنحضرت ﷺ

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۳۱، ۳۳۲۔ تذکرہ علمائے ہند (ص ۲۱۷) میں صرف یہ لفظ مرقوم ہیں: ''مولوی علی حبیب سجادہ نشین پھلواروی۔''

۲- صلوۃ النبی ﷺ
۳- رسالہ در فقہ حنفی
۴- دیوان شعری، فارسی

سید علی سجاد ہاشمی جعفری پھلواروی نے ۱۸ رمضان ۱۲۷۱ھ/۴ جون ۱۸۵۵ء کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالم آخرت کی راہ لی❶۔

۳۸- سید علی کبیر الہ آبادی

سید علی کبیر بن علی جعفر بن علی رضا بن فقیر اللہ حسینی الہ آبادی تیرھویں صدی ہجری کے علمائے ہند میں علمی اور تحقیقی اعتبار سے ممتاز تھے۔ شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ فقہ اور دیگر علوم پر عبور حاصل تھا۔ ۲۸ محرم ۱۲۱۲ھ/۲۱ جولائی ۱۷۹۷ء کو الہ آباد میں ولادت ہوئی۔ مختصرات درسیہ اپنے والد مکرم کے عم محترم سید نور الحسن سے پڑھیں۔ شرح ھدایۃ الحکمت اور شرح عقائد نسفی کے لیے شیخ رضی الدین الہ آبادی اور ان کے بیٹے نصیر الدین الہ آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ تحریر اقلیدس، سلم العلوم، شرح سلم، میر زاہد ملا جلال، رسالہ میر زاہد وغیرہ کتب منطق کی تحصیل شیخ برہان الدین فقیہ دیوی سے کی۔ مختصر المعانی کا کچھ حصہ مولانا محمد حنیف ولایتی سے پڑھا۔ باقی کتب درسیہ مولانا روح الفیاض موی سے مکمل کیں اور ان سے مختلف علوم وفنون میں بہت استفادہ کیا۔ سید علی کبیر کے والد محترم سید علی جعفر علوم ظاہری و باطنی میں مہارت رکھتے تھے، ان سے سند حدیث بھی لی اور اخذ طریقت بھی کیا۔ سید ادریس مغربی محدث سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس وتصنیف میں مشغول ہوئے اور اس میں خوب شہرت پائی۔

سید علی کبیر الہ آبادی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- تحفة الكبير فی مناقب الخلفاء و اصحاب التطهير۔
۲- اتحاف ارباب الحيات لارواح الا موات۔
۳- وظيفة القبول فی تعيين مولدالرسول۔
۴- غاية التوضيح فی مشروعية التسبيع۔
۵- رسالہ ابطالِ تقيه۔
۶- هداية الاحباب فی كشف عما شجربين الاصحاب۔
۷- خلاصة المناقب فی فضائل بيت سيد آل غالب۔
۸- غاية المطالب فی بحث ايمان ابی طالب۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۲ بحوالہ شجرۃ شیخ بدر الدین۔

۹- اظهار السعاده شرح اسرار الشهاده۔
۱۰- الاربعين فى مناقب الخلفاء الراشدين۔
۱۱- نجوم الاهتداء فى اقتداء الاربعة من الائمة الخلفاء۔
۱۲- مطلوب الطالبين فى اسماء رجال الاربعين۔
۱۳- غاية البيان فى ذم مروان۔
۱۴- ضياء القلوب فى سير المحبوب۔
۱۵- تقوية الايمان فى فضائل شهر رمضان۔
۱۶- غرة الكمال فى ذكر شهر شوال۔
۱۷- بسط الكلام فى فضائل ذى الحجة الحرام۔
۱۸- العشرة المبشره فى مناقب العشره۔
۱۹- الفوائد الجعفريه۔
۲۰- انتخاب العقيده۔
۲۱- صحيفة العوائد فى ذكر وفات الوالد۔
۲۲- ترجمه رجال الشمائل ترمذى۔

بے شبہ سید علی کبیر الہ آبادی جلیل القدر مصنف، جید عالم اور نامور فقیہ تھے۔ درس و تدریس میں بھی ان کا دائرۂ خدمت بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۴ محرم ۱۲۸۵ھ/ ۲۶ اپریل ۱۸۶۸ء کو انتقال کیا ❶۔

۳۹- مفتی علی کبیر مچھلی شہری

مفتی علی کبیر جعفری مچھلی شہری، مشہور عالم مولانا علی محمد جعفری مچھلی شہری کے فرزند نام دار تھے۔ اپنے وقت اور علاقے کے عالم کبیر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کہلائے۔ مولد و منشا جون پور ہے اور سن ولادت ۱۱۷۰ھ/ ۱۸۵۶ء۔ اپنے والد گرامی مولانا علی محمد کے ظل عاطفت میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے اور بعض ابتدائی درسی کتابیں والد مکرم سے صرف دو سال میں پڑھ لیں۔ اس کے بعد علوم عربی و فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ وہاں مولانا محمد مبین فرنگی محلی کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ ان سے منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ فنون ریاضیہ کی تکمیل علامہ تفضل حسین کشمیری سے کی۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث اور فقہ کی تحصیل کی۔ شیخ محمد آفاق نقشبندی سے اخذ طریقت کیا۔ تکمیل علم کے بعد حصول ملازمت کے لیے کوشاں

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۳۳، ۳۳۴ بحوالہ ذیل الوفیات۔

ہوئے۔ ان کے والد مکرم اس زمانے میں مچھلی شہر (یوپی) میں مقیم تھے۔ وہاں پہنچے تو انگریزی حکومت نے مچھلی شہر کی مسند افتا تفویض کی اور اپنے علم و دیانت اور حسن کارکردگی کی بنا پر عمال حکومت اور عوام و خاص میں عزت و تکریم کے مستحق قرار پائے۔ ان کے چچازاد بھائی اور بعض دیگر اعزہ بھی ان کی سفارش سے حکومت کے اونچے مناصب پر فائز ہوئے۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد کو ان کی قابلیت کے مطابق عدل و انصاف اور افتا و قضا وغیرہ کے محکمے عطا کیے گئے' جس کی وجہ سے مچھلی شہر اور اس کے گرد و نواح میں اس خاندان کو بہت اعزاز و اکرم حاصل ہوا' اور یہ لوگ جو کہ اصلاً جون پور اور دیگر علاقوں کے رہنے والے تھے' مچھلی شہر آ کر مچھلی شہری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اس علاقے کے لوگوں کو ان کے علم و فضل سے بہت فائدہ پہنچا۔

مفتی علی کبیر بلند اخلاق' رحم دل' بامروت' مشفق' حلیم الطبع اور کریم النفس تھے۔ اس کے علاوہ متقی' صاف دل اور صاف گفتار تھے۔

مفتی صاحب ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں انگریزی حکومت کے منصب افتا سے علیحدہ ہو گئے تھے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ ایک عرصہ گھر ہی میں بیٹھے ہوئے گزر گیا۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کے لیے ارض حجاز کا سفر کیا۔ حج سے فارغ ہو کر واپس وطن آ رہے تھے کہ مچھلی شہر سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر فرید پور کے مقام پر وفات پا گئے۔

سو سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے مگر بینائی بالکل صحیح تھی۔ آخر عمر تک مطالعہ کتب جاری رہا۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف رحمان علی لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں دیکھا تھا جب میں ان کے بھانجے مولانا محمد شکور مچھلی شہری کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھا۔ اس قدر ضعیف و نحیف تھے کہ صرف ہڈیوں اور کھال پر مشتمل ایک ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔ کمر جھک گئی تھی اور رکوع کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ غالباً اس زمانے میں نوے سال کی عمر ہو گی۔ ہم طلبا کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو نہایت اخلاق سے پیش آتے اور بڑی شفقت کے ساتھ ہمارا حال پوچھتے۔ اگر کوئی طالب علم ان سے کوئی کتاب مانگتا تو جس حالت میں کتاب رکھی ہوتی اسی حالت میں اٹھا کر دے دیتے اور فرماتے:

کتابم می دہم لاکن باایں شرط   کہ طبل وبوق و صندوقش نسازی

اس ہندی عالم و فقیہ نے جمعۃ المبارک کی رات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ/۴ جنوری ۱۸۵۳ء کو وفات پائی[1]۔

۴۰۔ مولانا علی محمد مچھلی شہری

مولانا علی محمد جعفری مچھلی شہری کا شمار اپنے دور کے علمائے صالحین میں ہوتا ہے۔ ممتاز فقیہ' نامور فاضل

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۴، ۳۳۵۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۷۶۸، ۷۶۹

اور شیخ وقت تھے۔ مفتی علی کبیر مچھلی شہری کے (جن کا گزشتہ صفحے میں تذکرہ ہوا) والد مکرم تھے۔ شروع سے آخر تک تمام علوم مولانا باب اللہ مچھلی شہری سے پڑھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے، اور اس خدمت میں بڑی شہرت پائی۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ جو شخص ان کے درس میں شامل ہوا' مرتبہ کمال کو پہنچا۔ شب بیدار اور عبادت گزار عالم تھے۔ مسند درس پر طلباء سے مخاطب ہوتے تو ان کے دلوں پر ان کی روحانیت اور نیکی کے اثرات نقش ہوتے جاتے تھے۔ دھیمے مزاج کے عالم تھے' علم اور حلم دونوں اوصاف سے متصف۔

تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ منهاج الاسلام: مسائل فقہ اور احکام عقائد پر محیط ہے۔

۲۔ تهذيب اليمان: عربی میں ہے اور اخلاق و آداب کے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۳۔ چهار عناصر: فارسی میں ہے اور صرف ونحو اور منطق سے متعلق ہے۔

مچھلی شہر (یوپی) کے اس عالم و فقیہ نے دوشنبہ کے روز ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۳۶ھ/ ۲۵ جون ۱۹۲۱ء کو سفر آخرت اختیار کیا❶۔

۴۱۔ مفتی علیم الدین کاکوروی

ہندوستان کے شہر کاکوری کو کسی زمانے میں اہل علم کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں بے شمار فقیہ' مفتی' قاضی' مدرس اور صوفی پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری کے علمائے کاکوری میں مفتی علیم الدین کاکوروی نامور فاضل' شیخ اور مفتی گزرے ہیں۔ ان کے والد کا اسم گرامی قاضی نجم الدین کاکوروی تھا' جو کلکتہ کے منصب قاضی القضاۃ پر متمکن تھے اور دیار ہند کے جید عالم اور فقیہ تھے۔ مفتی علیم الدین نے بھی حصول علم کے بعد خوب ترقی کی اور نام پایا۔

انھوں نے درسی کتابیں اپنے والد قاضی نجم الدین' مولانا فضل اللہ نیوتنی' مفتی عبدالواحد خیرآبادی اور مولانا عماد الدین لبکنی سے پڑھیں۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم میں خوب مہارت پیدا کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عہدۂ افتا پر فائز ہوئے' اس کے بعد قاضی مقرر کیے گئے۔ پھر منصب صدارت پایا۔

نہایت ذکی عالم تھے۔ مروجہ علوم وفنون میں کامل تھے۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ/ ۳۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا❷۔

❶ تجلی نور ج ۲، ص ۱۲۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۷، ۶۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔

۴۲-سید علیم اللہ جالندھری

خطہ پنجاب کے علمائے مشاہیر میں جالندھر (مشرقی پنجاب) کے سید علیم اللہ حسینی جالندھری کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ سید عتیق اللہ حسینی جالندھری کے فرزند گرامی تھے۔ جالندھر کو پنجاب میں ایک مردم آفریں علاقے کی حیثیت حاصل تھی، اس میں بے شمار علما و فقہا، بہت سے مؤلفین و مصنفین اور متعدد ادبا و شعرا پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں جن نامور اہل علم اور ممتاز اصحاب فقہ نے اس خطے میں جنم لیا، ان میں سید علیم اللہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ اپنے دور کے فاضل بزرگ تھے۔

سید علیم اللہ حسینی ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۹ھ/ ۲۶ نومبر ۱۶۹۷ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اس زمانے میں جالندھر اور انبالے کو علما و صوفیا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جالندھر کے علما میں شیخ بہلول برکی اور انبالے کے ارباب تصوف میں شیخ محمد سعید انبالوی بڑی شہرت کے مالک تھے۔ سید علیم اللہ نے فیض کے ان دونوں چشموں سے قلب و روح کی کھیتی کو سیراب کیا۔ شیخ بہلول برکی اور جالندھر کے بعض دیگر علما سے اخذ علم کیا اور شیخ محمد سعید انبالوی کی خدمت میں کسب فیض کے لیے حاضر ہوئے اور طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے۔

سید علیم اللہ حسینی مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱- انهار الاسرار: تصوف و طریقت سے متعلق ہے۔

۲- نزهة السالكين: اس کا موضوع بھی تصوف و طریقت ہے۔

۳- زبدة الروايات: یہ کتاب مسائل فقہ پر محیط ہے۔

۴- نثر الجواهر: یہ مرزا خاں محدث برکی جالندھری کی عربی کتاب نظم الدرر والمرجان کا فارسی ترجمہ ہے۔ مرزا خان برکی کا لقب اوحدالدین تھا، وہ فارسی اور عربی کے معروف عالم تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ "نظم الدرو المرجان فی تلخيص سير سيد الانس والجان" کے نام سے عربی میں تصنیف کی۔ اس کا ایک خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ مخطوطات شیرانی میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر ۱۱۵۸ ہے۔ ۱۱۳۷ھ/ ۱۷۲۵ء میں سید علم اللہ حسینی جالندھری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا جو ۱۹۰۲ء میں "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہوا۔ فاضل مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے کہ: میں نے محسوس کیا کہ اوحدالدین میرزا خان برکی جالندھری کی عربی کتاب "نظم الدرر والمرجان فی تلخيص سير سيد الانس والجان" اگرچہ مبسوط نہیں، تاہم یہ نادر معلومات پر محیط ہے اور ہر چند کہ خواص اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں لیکن عوام اس کے اشارات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے مجھے خیال آیا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بصورت تفصیل پیش کر کے "نثر الجواهر في تلخيص سير ابي الطيب والطاهر" کے نام سے

اس کا فارسی میں ترجمہ کردوں، چنانچہ میں نے ترجمہ شروع کردیا (دیباچہ صفحہ۲)

سٹوری نے "نظم الدرر اور نثر الجواھر" دونوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل بیان کرتے ہوئے اسے غلط فہمی ہوگئی ہے، اس نے لکھا ہے کہ: کتاب "نظم الدرر"، علیم اللہ حسینی کی تصنیف ہے اور اس کا ترجمہ مرزا خاں نے "نثر الجواھر" کے نام سے کیا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر کی عبارت میں واضح کیا گیا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

۵- شرح اخلاق ناصری۔

۶- شرح بوستان سعدی۔

۷- زبدۃ الروایات۔

ان تصانیف وشروع کے علاوہ مختلف عنوانات سے متعلق انھوں نے اور بھی متعدد کتب ورسائل قلم بند کیے۔

سید علیم اللہ حسینی نے ۹۳ سال کی عمر پاکر ۱۶ صفر ۱۲۰۲ھ/ ۲۷ نومبر ۱۷۸۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا❶۔

۴۳-مولانا عماد الدین رفیقی کشمیری

کشمیر کی سرسبز وشاداب وادی میں ہر عہد میں علما وفقہا کی کثیر جماعت پیدا ہوئی اور ہر عالم وفقیہ نے اپنی خدمات گوناگوں میں شہرت پائی۔ ان حضرات میں مولانا عماد الدین رفیقی کشمیری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔ عماد الدین بن عبدالرسول بن ابراہیم بن اسلم بن یحییٰ بن معین رفیقی کشمیری۔

مولانا عماد الدین رفیقی صالح عالم تھے اور علم فقہ اور دیگر علوم ان کا ایک مقام تھا۔ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے بہت سے نامور اساتذہ سے حصول علم کیا۔ بعد ازاں مشہور عالم و بعد ازاں مشہور عالم وشیخ احمد علی واعظ سے صحیح بخاری پڑھی اور سند حدیث لی۔ اس کے بعد سفر حجاز کیا اور سعادت حج حاصل کی۔

مولانا عماد الدین رفیقی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند درس بچھائی اور متعدد اہل علم نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ نظام الدین، شیخ حمزہ اور مولانا کے بعض اعزہ واقارب شامل ہیں۔

کشمیر کے اس فقیہ اور عالم نے جمعہ کے روز عصر کے وقت ۸ رمضان المبارک ۱۳۰۰ھ/ ۱۲ جون ۱۸۸۳ء کو رحلت فرمائی۔ کل ۵۱ سال عمر پائی❷۔

❶ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۳۳۷، ۳۳۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۷۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۳۷، ۳۳۸۔ انوار العارفین، ص ۴۲۶۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ذیل لفظ "برکی"

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۹۳، ۴۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۳۸۔

۴۴-مولانا عمر رام پوری

مولانا محمد بن ابو عمر حنفی رام پوری کو محمد عمر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ علمائے حنفیہ میں اونچے مرتبے کے شیخ اور فقیہ تھے۔ مسلک احناف کی مدافعت میں نہایت تیز تھے۔ مذہب حنفی پر جو اعتراض کیے جاتے ان کا جواب دینے میں انتہائی جوش و جذبے کا ثبوت دیتے۔ مختلف فیہ مسائل میں علمائے اہل حدیث سے ان کے خوب مناظرے اور مباحثے رہتے۔

ان کا مولد و منشا رام پور ہے، لیکن اس سے ریاست رام پور مراد نہیں، بلکہ وہ رام پور مراد ہے جو یوپی کے ضلع سہارن پور میں ایک گاؤں ہے۔

مولانا عمر رام پوری نے کچھ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہوئے۔ بعض درسی کتابیں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے پڑھیں، لیکن زیادہ اور انتہائی کتابیں دہلی میں مولانا محمد علی حامد پوری کے حلقۂ درس میں مکمل کیں۔

اپنے مذہب کے تحفظ و دفاع کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں اور اس ضمن میں غیر احناف اہل علم سے ان کی جو مناظرانہ بحثیں ہوئی، وہ ان کی مذہبی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ اپنے مذہب کے دفاع کے سلسلے میں جن اہل حدیث علما سے ان کے مناظرے اور مباحثے جاری رہتے، ان میں مولانا محمد حسین بٹالوی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مولانا بٹالوی اپنے دور کے جلیل القدر اہل حدیث عالم تھے اور صاحب ترجمہ مولانا عمر رام پوری کا شمار بھی چوٹی کے حنفی علما میں ہوتا ہے۔

مولانا عمر رام پوری بعض کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے اور اس میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

۱- تعلیقات علیٰ شرح ھدایة الفقه: علامہ عینی کی شرح ہدایہ پر تعلیقات۔

۲- طنطنه صولت:

۳- سماع کی بحث سے متعلق ایک رسالہ۔

۴- عشرہ مبشرہ: مولانا محمد حسین بٹالوی نے بعض مسائل میں ان پر دس اعتراضات کیے تھے۔ رسالہ عشرہ مبشرہ میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

مولانا عمر رام پوری نے صرف چھبیس برس عمر پائی اور عین عالم جوانی میں مرض استسقا سے ۳ رمضان ۱۲۹۸ھ/۳۰ جولائی ۱۸۸۱ء کو دہلی میں فوت ہوئے[1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۴۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۸۹، ۴۹۰

۴۵- مولانا عمران رام پوری

رام پور (یوپی) کے علمائے حنفیہ میں مولانا عمران بن غفران بن تائب بن سعد اللہ رام پوری بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔ علم فقہ اور دیگر علوم میں شہرت رکھتے تھے اور اپنے علاقے کے مشاہیر فقہا میں سے تھے۔

مولد و منشا (سابق ریاست) رام پور ہے۔ ان کے والد گرامی مولانا غفران بھی ممتاز عالم تھے۔ بیٹے نے فقہ کی کتابیں باپ کے حلقہ درس میں مکمل کیں اور باقی کتب درسیہ کی تکمیل مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکی سے کی۔ طویل عرصے تک مولانا حیدر علی سے وابستہ رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ پھر والد کے ساتھ کلکتہ تشریف لے گئے۔

اس وقت باپ بیٹا دونوں بوڑھے ہو چکے تھے، جو لوگ ان کے باہمی رشتے سے واقف نہ ہوتے وہ انھیں بھائی بھائی سمجھتے تھے۔

مسائل فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے مشکل مقامات کی عقدہ کشائی میں منفرد تھے۔ فتوے کے لیے لوگ انھی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

میت کی تجہیز و تکفین کے متعلق اردو میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ اس رسالے میں فقہ حنفیہ کے نقطہ نگاہ سے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ تمام عمر درس و افادہ اور علم و علما کی خدمت میں صرف کر دی۔

مولانا عمران رام پوری نے بہتر سال کی عمر میں ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا❶۔

۴۶- مفتی عنایت احمد کاکوروی

کاکوری ہندوستان کے صوبہ یوپی میں لکھنؤ کے قریب وہ مقام ہے جو بہت سے علما و فقہا کا مسکن رہا اور ان خوش بخت حضرات نے بلند مناصب تک رسائی حاصل کی۔ سلسلہ فقہائے ہند کی زیر مطالعہ جلد اور اس سے پہلی جلدوں میں کاکوری کے متعدد اہل علم اور اربابِ فقہ کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ صاحب ترجمہ مفتی عنایت احمد بھی کاکوری کے جید علما اور مشاہیر فقہا میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: عنایت احمد بن محمد بخش بن غلام محمد بن لطف اللہ۔ ولادت ۹ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۵ اکتوبر ۱۸۱۳ء) کو بمقام دیوہ ہوئی۔ حصولِ علم کے لیے پہلے رام پور گئے۔ اس وقت تیرہ سال کی عمر تھی۔ وہاں مولانا سید محمد بریلوی سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا حیدر علی ٹونکی اور مولانا نور الاسلام دہلوی سے رام پور میں استفادہ کیا اور کافی عرصہ ان کے حلقۂ درس میں رہے۔ اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے دائرۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور سند حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ کو روانہ ہوئے۔ وہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۴۱۔

الدین دہلوی کے شاگرد مولانا بزرگ علی مارہروی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے معقول ومنقول کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا بزرگ علی کے بعد علی گڑھ میں ایک سال تک ان کے مدرسے میں پڑھاتے بھی رہے۔

یہ مدرسہ قلعے کی جامع مسجد میں تھا اور مغل حکمران محمد شاہ کے عہد میں علی گڑھ کے گورنر نواب ثابت خاں نے اپنی تعمیر کردہ مسجد میں قائم کیا تھا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی کے عہد اہتمام میں صوبجات متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر نے خوش ہو کر ان کو ایک سو روپے انعام بھی دیا تھا' جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ اس کی روداد ''اخبار الحقائق وتعلیم الخلائق'' (آگرہ) میں شائع ہوئی تھی' جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

''خبر علی گڑھ: وہاں کے جمیع شرفا اور روسا جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے شکر گزار ہیں کہ جناب حال درس وتدریس مدرسہ علی گڑھ سے کمال رضا مند ہوئے۔ سو روپے انعام دیے۔ مولوی مفتی عنایت احمد مہتمم مدرسہ اور مدرسین کی از بس تحسین کی۔ واقعی میں وہ مدرسہ اور مہتمم ممدوح اور مدرس سب قابل تحسین وآفرین ہیں کہ ایک عجیب علوم خیز مدرسہ ہے۔''

مفتی عنایت احمد بہت ذہین' فقہیات کے ماہر اور عالم خوش اخلاق تھے۔ اپنی قابلیت کی بنا پر علی گڑھ کے مفتی مقرر ہوئے۔ تدریس کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ تین سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ کا عہدۂ عدل وانصاف اور منصب قضا بھی ان کے سپرد ہوا۔ دو سال اس عہدے پر مامور رہے۔ پھر بریلی میں تبادلہ ہو گیا اور وہاں کے صدر امین مقرر کیے گئے۔ چار سال اس منصب پر فائز رہے۔ بعد ازاں ترقی کر کے آگرہ کے صدر اعلیٰ بنا دیے گئے۔ نئے منصب پر متمکن ہونے کے لیے بریلی سے آگرہ جا رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ قمری حساب سے یہ ۱۲۷۳ھ کی بات ہے۔ تمام راستے مخدوش ہو گئے۔ پورے ملک میں افراتفری پھیل گئی اور ادھر سے ادھر جانا اور سفر کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ان حالات میں آگرہ نہ جا سکے' بریلی اور رام پور میں قیام رہا۔ اس اثنا میں مفتی صاحب نے ہندوستانیوں کی فوجی حکومت کی امداد کے لیے فتویٰ دیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں اہل ہند نے پہلے انگریزوں کی پٹائی کی اور ان کو دل کھول کر مارا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے حالات پر قابو پا لیا اور باشندگانِ ملک سے انتقام لینے لگے۔ اس میں مسلمانوں کو بالخصوص نقصان ہوا۔ جس کے چہرے پر داڑھی دیکھی اور عالم یا واعظ معلوم ہوا' پکڑ لیا گیا اور شدید سزا دی گئی۔ مفتی صاحب ممدوح بھی گرفت میں آ گئے۔ بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

مفتی صاحب جزائر انڈمان (کالا پانی) پہنچے تو ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی' لیکن اتنے ذہین اور متبحر عالم تھے کہ کتابیں نہ ہونے کے باوجود وہاں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ ترجمہ تقویم البلدان:۔ یہ ایک عربی کتاب ہے اور اپنے موضوع میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ انڈمان کے انگریز حاکم نے اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ کرانے کا ارادہ کیا تاکہ بعد کو اسے اردو سے

انگریزی میں منتقل کرنے میں آسانی رہے۔عربی کے جو علما اس زمانے میں سیاسی قیدی کی حیثیت سے کالا پانی میں موجود تھے‘ ان میں سے بعض علما سے اس کا اردو ترجمہ کرنے کو کہا گیا‘ مگر کسی نے نہ کیا۔مفتی صاحب سے کہا تو انھوں کر دیا۔اس سے انڈمان کا انگریز حاکم بہت خوش ہوا‘ اور پھر یہی کتاب ان کی رہائی کا سبب بنی۔

۲- علم الفرائض:۔یہ ان کی سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی۔یہ علم فرائض کے بارے میں ہے۔

۳- ملخصات الحساب:۔۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔

۴- تصدیق المسیح وردع حکم القبیح: ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی۔

۵- الکلام المبین فی آیات رحمتہ للعالمین: ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی۔

۶- محاسن العمل الافضل فی الصلوۃ: یعنی نماز میں کون سے اعمال افضل ہیں۔مطبوعہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔

۷- الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید: یہ کتاب نماز‘ روزہ‘ قیام اللیل اور عید کے مسائل پر مشتمل ہے۔۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں طبع ہوئی۔

۸- ہدایات الاضاحی: یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوا۔

۹- لیلتہ القدر: یہ ایک رسالہ ہے جس میں شب قدر کے فضائل مرقوم ہیں۔۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں طبع ہوا۔

۱۰- فضل العلم والعلماء: یعنی علم اور علمائے دین کے فضائل میں۔مطبوعہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔

۱۱- فضائل درود وسلام: رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کے فضائل کے بارے میں ایک رسالہ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔

۱۲- میلوں کی مذمت میں: یہ ایک رسالہ ہے جو ہولی‘ دیوالی اور ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کے رد میں ہے۔اس کا مطلب مسلمانوں کو بدعات سے دور رکھنا ہے۔۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں طبع ہوا۔

۱۳- ضمان الفردوس: ترغیب وترہیب کے انداز کا ایک رسالہ۔

۱۴- الاربعین من احادیث النبی الامین: طبع ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء۔

۱۵- علم الصیغہ: یہ علم صرف کی کتاب ہے‘ جو انڈیمان میں حافظ وزیر علی کی فرمائش پر لکھی۔مطبوعہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔

۱۶- وظیفہ کریمہ: مطبوعہ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء۔

۱۷- تاریخ حبیب اللہ: رسول اللہ ﷺ کی سیرت۔۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔

۱۸- خجستہ بہار: گلستان کے انداز کی فارسی نثر میں یہ کتاب ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی۔

۱۹۔ مواقع النجوم: صوبہ یوپی کے گورنر ٹامس نے یہ کتاب دیکھی تو اسے بہت پسند کیا۔

تقویم البلدان کے اردو ترجمے کی وجہ سے انڈیمان کے انگریز حاکم کی سفارش سے رہا ہوئے تو واپس ہندوستان آئے اور کان پور میں اقامت اختیار کی۔ وہاں مطبع نظامیہ کے مالک حاجی عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کے لیے ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا جو ''مدرسہ فیض عام'' کے نام سے مشہور ہوا۔ وہاں صرف تین سال پڑھایا۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ جب جہاز جدہ کے قریب پہنچا تو ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ دوسرے عازمین حج کے ساتھ یہ بھی سمندر میں ڈوب گئے اور درجہ شہادت پایا۔

مفتی صاحب کا ذوق شعری بھی بڑا بلند تھا اور برجستہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن کچھ لوگ بیٹھے اس مصرعے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس پر گرہ لگانے کی فکر میں تھے۔

سحر برخاستم از خواب و بوسیدم در خود را

اتنے میں مفتی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مصرع سن کر فوراً پہلا مصرع لگایا اور شعر مکمل کر دیا۔

بہ شب درخواب دیدم بردرِ خود دلبرِ خود را
سحر برخاستم از خواب و بوسیدم درِ خود را

مفتی صاحب ممدوح متقی، متورع اور فاضل و متبحر تھے۔ علمائے ربانیین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی وفات کا واقعہ ۱۷ شوال ۱۲۷۹ھ (مطابق ۷ اپریل ۱۸۶۳ء) کو پیش آیا❶۔

۴۷۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی

مولانا عنایت علی عظیم آبادی کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نہایت جری، شجاع اور مجاہد علما و فقہا کی جماعت میں ہوتا ہے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ عنایت علی بن فتح علی بن وارث علی ہاشمی صادق پوری عظیم آبادی!

عظیم آباد اس زمانے میں صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ کا نام تھا اور صادق پور اس کا ایک محلّہ تھا۔ مولانا عنایت علی کے اعزہ و اقارب اسی محلے میں رہتے تھے۔ وہ ایک باثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے اسلاف میں ایک بزرگ احمد علی تھے جو ضلع گیا کے ایک قصبہ ''اردل'' کے جج تھے۔ اس خدمت کے صلے میں مغل حکومت کی طرف سے انھیں بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ان کے نانا رفیع الحسن خاں تھے جو صوبہ بہار کے ایک دولت مند اور معزز رئیس تھے، بلکہ مولانا عبدالرحیم الدر المنثورفی احوال صادق فور میں لکھتے ہیں کہ وہ مغل دور میں صوبہ بہار کے آخری ناظم تھے۔

❶ تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۲۹۶۔ قیصر التواریخ، ج ۲، ص ۳۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۴۱ تا ۳۴۳۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۰۴، ۲۰۵۔ تذکرہ مصنفین درس نظامی، ص ۱۷۷ تا ۱۸۴۔ معارف اعظم گڑھ۔ جلد ۶۸ شمارہ ۳ و جلد ۶۹ شمارہ ۳

مولانا عنایت علی کے خاندان کے تمام افراد علم وفضل کے زیور سے آراستہ تھے اور اپنے علاقے اور عہد میں دینی اور دنیوی اعتبار سے مرجع خلائق تھے۔ مولانا ممدوح نے ہوش سنبھالا تو خاندانی روایت کے مطابق حصول علم میں مشغول ہوئے اور اپنے زمانے کے متعدد علما سے تحصیل کی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی تھے۔ (جن کا تذکرہ اس کتاب کی دسویں جلد میں ہوگا) مولانا ولایت علی نے سید احمد شہید کی بیعت کی تو یہ (مولانا عنایت علی) بھی ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے۔ سید صاحب جہاد کے لیے سرحد پار گئے تو عنایت علی بھی ساتھ تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد سید صاحب نے انھیں وطن واپس بھیج دیا تھا اور دعوت وتبلیغ کے لیے بنگال میں متعین کر دیا تھا۔ یہ بنگال ہی میں تھے کہ بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کا واقعہ پیش آیا' لیکن مولانا عنایت علی اس کے بعد بھی بنگال میں فریضہ دعوت وتبلیغ میں مصروف رہے۔ جب مجاہدین کی تنظیم کا سلسلہ معرض خطر میں پڑ گیا تو مولانا ولایت علی نے اس چھوٹے بھائی (مولانا عنایت علی) کو سرحد بھیج دیا۔ کچھ عرصے بعد مولانا ولایت علی خود بھی مستقلاً وطن سے ہجرت کر کے سرحد پار پہنچ گئے اور مجاہدین نے ان کو اپنا امیر مقرر کر لیا۔ اس اثنا میں طریق کار کے سلسلے میں دونوں بھائیوں میں اختلاف بھی پیدا ہوا' اور مولانا عنایت علی منگل تھانہ چلے گئے۔

مولانا عنایت علی کی مقصد سے محبت اور جذبۂ جہاد سے تعلق کا یہ عالم تھا کہ وطن میں لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑی' آرام وآسائش کی زندگی کو ترک کیا' دینوی نعمتوں سے منہ پھیرا' اور خطروں سے پُر اندازِ زیست اختیار کیا۔ ان کی زندگی سراپا جہاد اور سراسر جہد وامتحان کی زندگی تھی۔

پہلے مولانا ولایت علی مجاہدین کے امیر تھے۔ وہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو فوت ہوئے تو یہ ذمے داری مولانا عنایت علی کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے اس عظیم ذمے داری کو نہایت ہمت اور استقلال کے ساتھ نباہا۔ ان کے زمانۂ امارت میں بہت سے مشکل ترین مراحل پیش آئے' لیکن وہ ہر موقعے پر ثابت قدم رہے اور تمام امور انتہائی حسن وخوبی سے انجام دیے۔ مولانا عنایت علی نے اپنے علم ومطالعہ کی بنا پر مسلمانوں کی زندگی کا جو نقشہ مرتب کیا تھا' وہ اس طرح تھا۔

۱۔ جس ملک پر کافروں کا تسلط ہو جائے' وہاں کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ متحد ہو کر کافروں سے جنگ کریں۔

۲۔ جو لوگ کافروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں' وہ ہجرت کر کے کسی آزاد ملک میں چلے جائیں۔

۳۔ وہ اپنے زمانے میں ہجرت کو فرض قرار دیتے تھے۔ جو لوگ ہجرت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے' ان کے نزدیک وہ منافق قرار پاتے تھے۔

۴۔ مولانا ممدوح دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ جو لوگ ہجرت بھی نہ کر سکیں' وہ کافروں کی حکومت سے

قطع تعلق کر لیں۔ یعنی نہ کسی معاملے میں کافر حکومت کی مدد کریں اور نہ اس کی عدالتوں میں جائیں، اگر ان میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کو نمٹانے کے لیے اپنی پنچایتیں اور کمیٹیاں بنالیں جو اچھے اور دیانت دار افراد پر مشتمل ہوں۔ انھوں نے اس قسم کے کئی اعلامیے جاری کیے تھے اور بنگال میں جب وہ دعوت وتبلیغ کا کام کرتے تھے، تو مسجدوں کی تعمیر اور آبادی کا بھی انتظام کرتے تھے۔ پھر فصل خصومات کے لیے وہ پنچایتیں اور کمیٹیاں بناتے تھے۔ مجاہدین کے زمانہ امارت میں انھوں نے اس قسم کے متعدد اعلامیے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں بھیجے تھے۔

مولانا کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی صاحب زادی سیدہ آمنہ سے ہوئی تھی۔ بہار کے ایک مسلمان خاندان میں یہ پہلی شادی تھی جو انتہائی سادگی سے شریعت کے مطابق ہوئی۔ سیدہ آمنہ سے حافظ عبدالمجید پیدا ہوئے۔ کچھ مدت بعد اس خاتون کا انتقال ہو گیا تو مولانا کا نکاح ثانی شاہ محمد حسین کی صاحب زادی سے ہوا جو بیوہ تھیں۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام ہاجرہ تھا۔

حافظ عبدالمجید نے اپنے چچا مولانا فرحت حسین سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد یہ بھی اپنے والد کے ساتھ سرحد چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولانا عمر بھر تبلیغ دین و اشاعت اسلام میں مصروف رہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں زندگی صرف کر دی۔ ظاہر ہے اس اثنا میں انھوں نے تبلیغ و اشاعت سے متعلق چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے بھی لکھے ہوں گے۔ لیکن ان کے صرف ایک چھوٹے سے رسالے کا پتا چلتا ہے، جس کا نام ہے ''بت شکن''۔ یہ رسالہ اس مجموعۂ رسائل میں شائع ہوا تھا جو مولانا عبدالرحیم نے ''رسائل تسعہ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اہل بیت کے مصائب موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی تعزیہ داری کی حقیقت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت حسین اور اہل بیت کے عمل اور اسوہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ غیر شرعی رسوم اور غیر دینی امور کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جس میں جہاد کے احکام بیان کیے گئے تھے اور لکھا ہماری جنگ انگریز سے تھی۔'' کہ ایں جنگِ ما با فرنگی بود۔''

بلا شبہ مولانا عنایت علی ایک پرجوش اور باحمیت عالم تھے۔ انھوں نے ہر موقعے پر اللہ کی ... انتہائی عزیمت و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تمام زندگی امور دینیہ کے لیے وقف رہی۔ انھوں نے بنگا... ملک کے دوسرے حصوں میں بے حد محنت اور عزم و استقلال سے تبلیغ اسلام کی۔ اس زمانے میں سکھ اور ا... دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ مولانا اپنی استطاعت کے مطابق دونوں سے نبرد آزما ہوئے۔ انھوں نے اپنی تمام دولت اللہ کی راہ میں لٹا دی۔ جب ملک میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، اس وقت مجاہدین کی زمام امارت انہی کے ہاتھ میں تھی اور یہ ان کی تاریخ کا بہت ہی نازک موڑ تھا جو کامیابی سے طے ہوا ____ مجاہدین کو جو مسائل

پیش آتے' ان کے فیصلے یہی کرتے اور یہی مرکز سے فتوے جاری فرماتے۔

مولانا موصوف علاقہ سرحد میں جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ان پر بخار کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اس وقت وہ غالباً پرگنہ منصور جدون کے مقام نوبانڈہ میں تھے۔ وہاں سے لوگوں نے ان کی چارپائی اٹھائی اور چنئی کی جانب روانہ ہوئے۔ کوہ چنئی کی چڑھائی پر بخار بہت تیز ہوگیا اور مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی۔ لیکن اسی لمحے سکرات موت کا عالم طاری ہوگیا اور کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ لکھنے کی سکت نہ رہی۔ ان کے بیٹے حافظ عبدالمجید نے پوچھا کہ ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں اور آپ کے بعد امیر کون ہو___؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ان کی صحیح تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا' البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۶ شعبان ۱۲۷۴ھ (۲۲ مارچ ۱۸۵۸ء) کو زندہ تھے۔ اس سے ایک یا دو روز بعد انتقال کیا۔ ان کا حادثہ موت انگریز کے پنجتار' چنگلئی' منگل تھانہ اور ستھانہ پر حملے سے پہلے پیش آیا[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے سرگزشت مجاہدین، ص ۲۸۲ تا ۲۹۰، ۲۹۹ تا ۳۰۴ نیز ملاحظہ ہوں اس کتاب کے مختلف مقامات۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۳، ص ۶۱ تا ۷۰، نیز اس کتاب کے مختلف مقامات۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۴۳، ۳۴۴۔

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱- آثارالاول من علماء فرنگی محل: عبدالباری فرنگی محلی۔ مطبع مجتبائی' لکھنؤ۔

۲- آثارالصنادید: سرسید احمد خاں۔ ترتیب و حواشی: ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۶۶ء۔

۳- ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع صدیقی' بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ

۴- اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی' کان پور ۱۲۸۸ھ

۶- اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع مجتبائی۔ لکھنؤ۔

۷- احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن' مطبع مجتبائی' لکھنؤ۔

۸- انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' مطبع مجتبائی لکھنؤ۔

۹- انوار العارفین: حافظ محمد حسین مرادآبادی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۲۷۶ھ

۱۰- انوار اقبال: بشیر احمد ڈار۔ اقبال اکادمی پاکستان' کراچی۔ طبع اول مارچ ۱۹۶۷ء۔

۱۱- تاریخ اہل حدیث: مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔ ناشر:۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی۔ لاہور' ۱۹۵۳ء

۱۲- تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس' جون پور' ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء۔

۱۳- تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ مطبوعہ عزیز المطابع حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۲ھ۔

۱۴- تاریخی مقالات: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین' دہلی' ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء۔

۱۵- تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پور: نورالدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع جون پور۔ ۱۸۸۹ء۔

۱۶- تذکرہ علمائے فرنگی محل: مولوی محمد عنایت اللہ۔ مطبوعہ لکھنؤ' ۱۹۳۰ء۔

۱۷- تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام' ندوۃ المعارف' بنارس' ۱۳۷۱ھ

۱۸- تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ' ۱۹۱۴ء۔

۱۹- تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر' مطبع اصح المطابع' لکھنؤ' ۔ ۱۹۲۷ء۔

۲۰- تذکرہ مصنفین درس نظامی: اختر راہی۔ مسلم اکادمی لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔

۲۱- تراجم علمائے حدیث ہند: ابویحییٰ امام خاں نوشہروی۔ جید برقی پریس' دہلی ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء۔

۲۲- تسہیل القاری: ترجمہ صحیح بخاری: نواب وحید الزمان خاں۔ طبع اول' لاہور۔

۲۳- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبوعہ بھوپال' ۱۲۹۸ھ۔

۲۴- حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' مکتبہ سلفیہ' لاہور' ۱۹۷۵ء

۲۵- حضرت مولانا سید داؤد غزنوی: مرتبہ: سید ابوبکر غزنوی۔ طبع اول' لاہور۔

۲۶- جماعت مجاہدین: مولانا غلام رسول مہر۔ کتاب منزل' لاہور۔ ۱۹۵۵ء

۲۷- جنگ آزادی ۱۸۵۷ھ (واقعات و شخصیات: ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء۔

۲۸- حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ' ۱۹۰۹ء۔

۲۹- حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالی' اکادمی پنجاب' لاہور' ۱۹۵۷ء

۳۰- حیات شبلی: سید سلیمان ندوی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء۔

۳۱- حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ' لاہور' ۱۹۵۵ء۔

۳۲- الحیات بعد الممات: فضل حسین۔ طبع کراچی' ۱۹۵۹ء

۳۳- خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ موسوم بہ ثمر ہند' لکھنؤ۔

۳۴- رود کوثر: شیخ محمد اکرام ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔

۳۵- سرگزشت مجاہدین:۔ مولانا غلام رسول مہر۔ کتاب منزل' لاہور۔ ۱۹۵۶ء۔

۳۶- سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی: از مولانا عبدالجبار غزنوی و مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ۔ طبع لاہور۔

۳۷- سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۵۴ء

۳۸- طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی' لکھنؤ ۱۹۲۱ء۔

۳۹- علمائے ہند کا شاندار ماضی: مولانا محمد میاں۔ مکتبہ محمودیہ۔ لاہور ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء

۴۰- علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) مرتبہ محمد ایوب قادری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرس' کراچی۔ ۱۹۶۰ء

۴۱- فتاویٰ عزیزی: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ ترتیب: مولانا محمد احسن نانوتوی۔ مطبع مجتبائی' دہلی۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء۔

۴۲- فقہائے ہند: جلد پنجم حصہ دوم:۔ محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور۔ ۱۹۸۱ء۔

۴۳- فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری: جلد اول۔ محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور۔ ۱۹۸۲ء۔

۴۴- الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا عبدالحی لکھنوی۔ طبع مصر' ۱۳۲۴ھ

۴۵- قاموس المشاہیر: (جلد دوم) نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس' بدایوں۔ ۱۹۲۵ء۔

۴۶- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: مولوی ذوالفقار احمد' مطبع فیض منبع مفید عام' آگرہ' ۱۳۱۶ھ۔

۴۷- کالا پانی:۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ ترتیب و تہذیب:۔ محمد سرور طارق۔ طارق اکیڈمی فیصل آباد۔ ۱۹۷۷ء

۴۸- لال قلعہ کی ایک جھلک: ناصر نذیر فراق۔ طبع دہلی۔

۴۹- محاسن موضح قرآن: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ طبع دہلوی۔ ۱۹۷۷ء۔

۵۰- مومن خاں مومن: کلب علی فائق۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔

۵۱- مفتاح التاریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۴ھ۔

۵۲- مقالات شبلی: جلد ۳۔ مرتبہ۔ سید سلیمان ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء۔

۵۳- ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی: مطبع مجتبائی، میرٹھ۔ ۱۳۱۴ھ۔

۵۴- مکتوبات امام الزمان شیخ عبداللہ غزنوی علیہ الرحمۃ والغفران:۔ طبع لاہور۔

۵۵- مہر منیر (سوانح عمری پیر مہر علی شاہ) از مولانا فیض احمد فیض۔ مطبوعہ پاکستان انٹرنیشنل پرنٹرز، مغل پورہ۔ لاہور۔

۵۶- نزہۃ الخواطر، جلد ۷۔ سید عبدالحی حسنی، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد (دکن) ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء۔

۵۷- ہمارے ہندوستانی مسلمان: اردو ترجمہ:۔ ڈاکٹر صادق حسین۔ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔ ۱۹۴۶ء۔

۵۸- واقعات دار الحکومت دہلی: (جلد ۲) بشیر الدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس، آگرہ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء۔

۵۹- الیانع الجنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہتی۔ مطبع صدیقی پریس، بریلی ۱۲۸۷ھ۔

۶۰- ماہنامہ ''اسرار حکمت'' اگست ۱۹۶۴ء۔ لاہور۔

۶۱- ہفت روزہ ''الہام'' اگست ۱۹۷۶ء۔ بہاول پور۔

۶۲- ہفت روزہ ''الاعتصام'' ۷ فروری ۱۹۶۴ء لاہور۔

۶۳- ہفت روزہ ''الاعتصام'' تحریک آزادی ۱۸۵۷ء نمبر (مئی ۱۹۵۷ء) لاہور۔

۶۴- ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۳۹ء۔ ۶۵۔ ''المعارف'' لاہور۔ جون ۱۹۸۳ء۔

فقہائے ہند

تیرھویں صدی ہجری

حصہ سوم

نام کتاب: ــــــــ فقہائے ہند
مصنف: ــــــــ محمد اسحاق بھٹی
اہتمام: ــــــــ محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بہ اشتراک دار النوادر
مطبع: ــــــــ شفیق پریس
حروف خوانی: ــــــــ محمد سعید بھٹی
کمپوزنگ: ــــــــ محمود فرید
صفحات: ــــــــ ۲۹۷
سرورق: ــــــــ ضیاء الرحمٰن
جلد ساز: ــــــــ بنیامین

ترتیب

♦ مقدمہ	۴۲۵
♦ سرسید احمد خان	۴۲۶
♦ تصنیفی خدمات	۴۲۸
♦ اشاعت تعلیم کے لیے تگ وتاز	۴۲۸
♦ قومی غیرت وحمیت	۴۲۸
♦ آئینی اصلاحات کا سلسلہ	۴۳۲
♦ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام	۴۳۲
♦ دارالعلوم دیوبند کا قیام	۴۳۳
♦ دارالعلوم دیوبند کا دستور العمل	۴۳۴
♦ مظاہر علوم۔سہارن پور	۴۳۵
♦ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۴۳۶
♦ غ	
♦ ۱۔مولانا غلام امام حیدر آبادی	۴۳۹
♦ ۲۔مولانا غلام حسین امیٹھوی	۴۴۰
♦ ۳۔مولانا غلام حسنین صدیقی قنوجی	۴۴۱
♦ ۴۔مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی	۴۴۲
♦ ۵۔مولانا غلام رسول۔قلعہ میہاں سنگھ	۴۴۲
♦ ولادت	۴۴۳
♦ عالم طفولیت	۴۴۳
♦ تعلیم وتربیت	۴۴۴
♦ قلعہ میہاں سنگھ میں سکونت	۴۴۷
♦ اخوند صاحب سوات سے ملاقات	۴۴۸
♦ سید امیر صاحب کی خدمت میں	۴۴۸
♦ خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات	۴۴۹
♦ ایک مجذوب سے ملاقات	۴۵۰
♦ دوبارہ عزم کوٹھا	۴۵۱
♦ مولانا عبداللہ غزنوی سے ملاقات	۴۵۲
♦ کوٹھا سے روانگی اور ایک مجذوب سے ملاقات	۴۵۲
♦ لاہور میں قیام اور سلسلۂ وعظ وارشاد	۴۵۳
♦ طلب حدیث کے لیے عزم دہلی	۴۵۴
♦ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی	۴۵۴
♦ ایک انگریز عورت کی امداد	۴۵۵
♦ وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری	۴۵۶
♦ گرفتاری	۴۵۷
♦ اللہ کی ضمانت پر رہائی	۴۵۹
♦ دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی بندش	۴۵۹
♦ حج بیت اللہ اور سند علم حدیث	۴۵۹
♦ سلسلۂ تدریس اور چند شاگرد	۴۶۱
♦ نقطۂ نظر کی اصابت	۴۶۲
♦ مکتوبات	۴۶۳
♦ قبولیت دعا اور تقرب الٰہی	۴۶۳
♦ کرامات کے ظہور کی وجہ	۴۷۱
♦ ایک اور واقعہ	۴۷۲

صحابہ کرام کی خوشبو	۴۷۲
سخاوت اور مہمان نوازی	۴۷۳
اولاد کی تربیت	۴۷۴
چند خصوصیات	۴۷۵
فقہی مسلک	۴۷۶
وصیت	۴۷۶
تصانیف	۴۷۹
شعروشاعری	۴۷۹
وفات	۴۸۳
اولادواحفاد	۴۸۴
۶۔خلیفہ غلام رسول لاہوری	۴۸۴
۷۔مفتی غلام سبحان بہاری	۴۸۵
۸۔قاضی غلام علی ہاشمی سورتی	۴۸۵
۹۔شیخ غلام علی مجددی دہلوی	۴۸۶
۱۰۔مفتی غلام غوث گوپاموی	۴۹۳
۱۱۔مولانا غلام فرید لاہوری	۴۹۳
۱۲۔مولانا غلام قادر گوپاموی	۴۹۴
۱۳۔خلیفہ غلام اللہ لاہوری	۴۹۴
۱۴۔مفتی غلام محمد لاہوری	۴۹۵
۱۵۔حافظ غلام محمد قادری لاہوری	۴۹۶
۱۶۔حافظ غلام محی الدین بگوی	۴۹۷
۱۷۔مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی	۵۰۰
۱۸۔مولانا غلام ناصر رام پوری	۵۰۰
۱۹۔قاضی غلام یحییٰ بہاری	۵۰۱
ف	
۲۰۔مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی	۵۰۱
۲۱۔مولانا فیاض علی عظیم آبادی	۵۰۴
۲۲۔مولانا فرحت حسین عظیم آبادی	۵۰۵
ق	
۲۳۔مولانا قطب الدین دہلوی	۵۰۵
۲۴۔سید قطب الہدیٰ بریلوی	۵۰۷
۲۵۔مفتی قوام الدین کشمیری	۵۰۷
ک	
۲۶۔مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری	۵۰۸
۲۷۔مولانا کرامت علی اسرائیلی دہلوی	۵۱۰
۲۸۔مولانا کرم الٰہی لاہوری	۵۱۱
۲۹۔مولانا کرم اللہ دہلوی	۵۱۲
۳۰۔مولانا کریم اللہ فاروقی	۵۱۲
ل	
۳۱۔مولانا لطف علی راجگیری	۵۱۳
۳۲۔مولانا لطف اللہ لکھنوی	۵۱۴
م	
۳۳۔سید مجاہد الدین حسینی بالاپوری	۵۱۵
۳۴۔مولانا محبوب علی سنبھلی	۵۱۶
۳۵۔شیخ محسن ترہٹی	۵۱۷
۳۶۔قاضی محمد مغربی	۵۱۸
۳۷۔سید محمد سورتی	۵۱۸
۳۸۔مولانا محمد حیدر آبادی	۵۱۹
۳۹۔مولانا محمد تھانوی	۵۲۰
۴۰۔مولانا محمد شاہ جہان پوری	۵۲۰
۴۱۔سید محمد لکھنوی	۵۲۱

۴۲۔مفتی محمد بردوانی	۵۲۳
۴۳۔مولانا سید محمد غزنوی	۵۲۴
۴۴۔قاضی محمد خاں رام پوری	۵۲۵
۴۵۔مرزا محمد کشمیری	۵۲۵
۴۶۔مولانا محمد کشمیری	۵۲۷
۴۷۔مولانا محمد رفیق کشمیری	۵۲۸
۴۸۔سید محمد پھلواروی	۵۲۸
۴۹۔مفتی محمدی عظیم آبادی	۵۲۹
۵۰۔مولانا محمد آفاق دہلوی	۵۲۹
۵۱۔شاہ محمد اسحاق دہلوی	۵۳۰
۵۲۔مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی	۵۳۵
تعلیم وتربیت	۵۳۵
سید احمد شہید کی بیعت	۵۳۶
سفر حج	۵۳۸
دعوتِ جہاد	۵۳۹
ہجرت	۵۳۹
جہاد فی سبیل اللہ	۵۴۰
سیرت وکردار	۵۴۱
تصانیف	۵۴۱
مکتوبات	۵۴۴
شعروشاعری	۵۴۴
شہادت	۵۴۴
شاہ محمد عمر	۵۴۵
۵۳۔مفتی محمد اصغر انصاری فرنگی محلی	۵۴۷
۵۴۔مفتی محمد افضل پھلواروی	۵۴۷
۵۵۔مولانا محمد اکبر کشمیری	۵۴۸
۵۶۔مولانا محمد اکرم شاہ جہان پوری	۵۴۸
۵۷۔مفتی محمد برکت عظیم آبادی	۵۴۸
۵۸۔سید محمد تقی لکھنوی	۵۴۹
۵۹۔قاضی محمد جمیل برہان پوری	۵۵۰
۶۰۔سید محمد حسین حیدر آبادی	۵۵۱
۶۱۔شیخ محمد حسین انصاری سندھی	۵۵۱
۶۲۔مولانا محمد سالم دہلوی	۵۵۲
۶۳۔مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی	۵۵۳
۶۴۔مولانا محمد سلیم جون پوری	۵۵۳
۶۵۔سید محمد سیادت امروہوی	۵۵۵
۶۶۔محمد شاکر سورتی	۵۵۵
۶۷۔مولانا محمد شکور ہاشمی مچھلی شہری	۵۵۵
۶۸۔سید محمد طاہر حسنی بریلوی	۵۵۷
۶۹۔علامہ محمد عابد سندھی	۵۵۸
۷۰۔سید محمد عسکری امروہوی	۵۶۱
۷۱۔حافظ محمد عظیم پشاوری	۵۶۲
۷۲۔مولانا محمد علی بھیروی	۵۶۲
۷۳۔مولانا محمد علی صدر پوری	۵۶۳
۷۴۔مفتی محمد عوض بریلوی	۵۶۴
۷۵۔مولانا محمد غفران رام پوری	۵۶۵
۷۶۔مولانا محمد غوث مدراسی	۵۶۵
۷۷۔مولانا محمد قاسم نانوتوی	۵۶۸
ولادت اور ابتدائی حالات	۵۶۸
حصولِ علم کا دور	۵۶۸
مطبع احمدی سے تعلق ملازمت	۵۶۹
دہلی میں سلسلۂ تدریس	۵۶۹
صحیح بخاری کا تحشیہ	۵۷۰
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی	۵۷۰

♦ روپوشی اور حج بیت اللہ	۵۷۲
♦ اعلان معافی	۵۷۴
♦ حج سے واپسی	۵۷۴
♦ حفظ قرآنِ مجید	۵۷۵
♦ مطبع مجتبائی میرٹھ کی ملازمت	۵۷۵
♦ دوسری مرتبہ حج کو روانگی	۵۷۵
♦ مطبع ہاشمی میرٹھ سے وابستگی	۵۷۵
♦ علی گڑھ میں قیام	۵۷۶
♦ پھر مطبع مجتبائی میں	۵۷۶
♦ حمائل شریف کی اشاعت	۵۷۶
♦ مطبع مصطفائی میں	۵۷۷
♦ ماہانہ آمدنی	۵۷۸
♦ دارالعلوم دیوبند کا قیام	۵۷۸
♦ نئی جگہ کی خرید اور سنگ بنیاد	۵۷۹
♦ تیسرا حج	۵۷۹
♦ پادری تاراچند سے مناظرہ	۵۸۰
♦ شاہ جہان پور کا میلۂ خداشناسی	۵۸۱
♦ رودادِ رڑکی	۵۸۲
♦ میرٹھ کا واقعہ	۵۸۲
♦ مہمان کے لیے حقے کا انتظام	۵۸۲
♦ اندازِ تبلیغ کی ایک اچھوتی مثال	۵۸۳
♦ بدعتی کی مہمان نوازی	۵۸۶
♦ تصنیفات	۵۸۶
♦ تلامذہ	۵۸۹
♦ انتقال	۵۸۹
♦ ۷۸۔ مفتی محمد قلی کنتوری	۵۹۰
♦ ۷۹۔ مولانا محمد لبیب عثمانی	۵۹۱
♦ ۸۰۔ سید محمد لطیف مچھلی شہری	۵۹۱
♦ ۸۱۔ مولانا محمد مبین فرنگی محلی	۵۹۲
♦ ۸۲۔ مولانا محمد مرشد سرہندی	۵۹۳
♦ ۸۳۔ مولانا محمد مستعان کاکوروی	۵۹۳
♦ ۸۴۔ قاضی محمد معروف مدراسی	۵۹۴
♦ ۸۵۔ مولانا محمد معین انصاری لکھنوی	۵۹۴
♦ ۸۶۔ مولانا محمد نعیم کشمیری	۵۹۵
♦ ۸۷۔ محمد وجیہہ کلکتوی	۵۹۶
♦ ۸۸۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی	۵۹۶
♦ ۸۹۔ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی	۵۹۷
♦ ۹۰۔ مولانا محمود سورتی	۵۹۹
♦ ۹۱۔ مولانا محمود جون پوری	۵۹۹
♦ ۹۲۔ مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی	۶۰۰
♦ ۹۳۔ مولانا محی الدین عثمانی بدایونی	۶۰۱
♦ ۹۴۔ سید محی الدین دیلوری	۶۰۱
♦ ۹۵۔ شاہ مخصوص اللہ دہلوی	۶۰۲
♦ ۹۶۔ مولانا مراد اللہ لکھنوی	۶۰۲
♦ ۹۷۔ سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی	۶۰۳
♦ ۹۸۔ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی	۶۰۴
♦ ۹۹۔ قاضی مصطفیٰ فاروقی گوپاموی	۶۱۵
♦ ۱۰۰۔ مولانا مصطفیٰ رفیقی کشمیری	۶۱۶
♦ ۱۰۱۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی	۶۱۷
♦ ۱۰۲۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادی	۶۱۸
♦ ۱۰۳۔ سید معزالدین حسینی کڑوی	۶۱۹
♦ ۱۰۴۔ مولانا معشوق علی جون پوری	۶۱۹
♦ ۱۰۵۔ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی	۶۲۰
♦ ۱۰۶۔ مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی	۶۲۳

♦ نانوتہ میں آمد اور سکونت	۶۲۴
♦ تعلیم	۶۲۵
♦ سلسلۂ درس وتدریس	۶۲۵
♦ دہلی کالج میں تقرر	۶۲۷
♦ تنخواہ میں اضافہ	۶۲۷
♦ دہلی کالج میں مولانا کی تدریسی مساعی کے نتائج	۶۲۸
♦ چند تلامذہ کرام	۶۲۹
♦ حج بیت اللہ	۶۳۰
♦ عوام اور حکومت کے نزدیک قدر ومنزلت	۶۳۰
♦ سیاسیات سے بے تعلقی	۶۳۱
♦ اخلاق وکردار	۶۳۲
♦ تراجم	۶۳۳
♦ وفات	۶۳۴
♦ مولانا محمد یعقوب نانوتوی	۶۳۴
♦ تذکرہ نگاروں کا اظہارِ عقیدت	۶۳۵
♦ ۱۰۷۔ ملا مہدی مازندرانی	۶۳۷
♦ ۱۰۸۔ سید مہدی لکھنوی	۶۳۸
♦ ن	
♦ ۱۰۹۔ سید ناصر حسین جون پوری	۶۳۹
♦ ۱۱۰۔ سید نثار علی ظفر آبادی	۶۴۰
♦ ۱۱۱۔ قاضی نجم الدین علی خاں ثاقب کاکوروی	۶۴۰
♦ نام ونسب	۶۴۱
♦ ولادت اور تعلیم	۶۴۱
♦ علم وفضل	۶۴۲
♦ منصب قاضی القضاۃ	۶۴۳
♦ گورنر جنرل کا تعزیتی خط	۶۴۴
♦ تصانیف	۶۴۵
♦ شاعری	۶۴۶
♦ وفات	۶۴۶
♦ اولاد	۶۴۷
♦ ممتاز العلما قاضی محمد سعید الدین خان بہادر	۶۴۷
♦ مفتی حکیم الدین خان	۶۴۷
♦ قاضی علیم الدین خان	۶۴۸
♦ مفتی جلیل الدین خان بہادر سفیر شاہِ اودھ	۶۴۸
♦ ۱۱۲۔ مولانا نصر اللہ مارہروی	۶۴۹
♦ ۱۱۳۔ مولانا نصر اللہ خورجوی	۶۵۰
♦ ۱۱۴۔ سید نصیر الدین حسینی برہان پوری	۶۵۱
♦ ۱۱۵۔ سید نصیر الدین دہلوی	۶۵۲
♦ ابتدا میں تحصیل علم سے بے اعتنائی	۶۵۲
♦ حصول علم کا شوق	۶۵۳
♦ مجاہدین کی تنظیم	۶۵۳
♦ اختلاف سے نفرت	۶۵۴
♦ امیر دوست محمد خان سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ	۶۵۴
♦ قصد ہجرت	۶۵۵
♦ والدہ سے اجازت	۶۵۵
♦ لمبا سفر اور نہایت مختصر سامان	۶۵۶
♦ تاریخ روانگی	۶۵۶
♦ پیر کوٹ میں قیام	۶۵۷
♦ حروب کی تحریک	۶۵۷

♦ پیرکوٹ کا کتب خانہ	۶۵۸
♦ سلسلۂ دعوت وتبلیغ	۶۵۹
♦ مزاریوں کے علاقے میں	۶۶۰
♦ بہرام خاں کی شخصیت	۶۶۳
♦ سکھوں سے لڑائیاں	۶۶۳
♦ سکھوں اور مزاریوں کی صلح	۶۶۴
♦ نئی قیام گاہ	۶۶۴
♦ قلات کے وزیر اعظم کا اصرار	۶۶۶
♦ بلوچستان میں	۶۶۷
♦ انگریزوں سے جہاد	۶۶۷
♦ ستھانہ میں	۶۶۸
♦ عادات واطوار	۶۶۸
♦ وفات	۶۶۹
♦ اہل وعیال	۶۷۰
♦ ۱۱۶۔مفتی نظام الدین سورتی	۶۷۰
♦ ۱۱۷۔مفتی نظر محمد سہسوانی	۶۷۱
♦ ۱۱۸۔مفتی نعمت اللہ لکھنوی	۶۷۲
♦ ۱۱۹۔مولانا نقی علی خاں بریلوی	۶۷۲
♦ ۱۲۰۔مفتی نور احمد سہسوانی	۶۷۴
♦ ۱۲۱۔مفتی نور اللہ لکھنوی	۶۷۵
♦ ۱۲۲۔مولانا نور محمد سوتری	۶۷۵
♦ و	
♦ ۱۲۳۔مفتی واجد علی بناری	۶۷۸
♦ ۱۲۴۔سید وحید الحق پھلواروی	۶۷۹
♦ ۱۲۵۔مولانا ولایت علی عظیم آبادی	۶۸۰
♦ سید احمد شہید سے پہلی ملاقات	۶۸۰
♦ ایک عجیب وغریب واقعہ	۶۸۱
♦ تبلیغ دین اور وعظ وارشاد	۶۸۱
♦ خدمات دینی کی وسعت	۶۸۲
♦ تعلیم وتدریس	۶۸۳
♦ وعظ کی اثر انگیزی	۶۸۳
♦ کتب دینیہ کی اشاعت کا اہتمام	۶۸۳
♦ حج بیت اللہ	۶۸۴
♦ چھوٹے بھائی کا کردار	۶۸۴
♦ سکھوں کی باہمی کش مکش	۶۸۵
♦ سکھوں کے خلاف ہنگامے	۶۸۶
♦ مولانا ولایت علی کو دعوت	۶۸۶
♦ بالاکوٹ پر قبضہ	۶۸۷
♦ مسلمانوں کا نظم ونسق	۶۸۷
♦ مرکز سے تعلقات	۶۸۸
♦ مولانا ولایت علی کی آمد	۶۸۹
♦ کامیابی کے بعد ناکامی	۶۹۰
♦ صورت حال پر ایک نظر	۶۹۰
♦ پیچیدگی	۶۹۱
♦ درۂ دُبّ کی جنگ	۶۹۳
♦ مولانا ولایت علی اور عنایت علی کے مچلکے	۶۹۳
♦ آزادی کے بعد مستقل ہجرت	۶۹۴
♦ دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات	۶۹۴
♦ ستھانہ کو روانگی	۶۹۵
♦ تصنیف وتالیف	۶۹۵
♦ وفات	۶۹۶
♦ کشف قبور کے ایک ماہر کا بیان	۶۹۶
♦ ۱۲۶۔مفتی ولی اللہ فرخ آبادی	۶۹۷

♦	۱۲۷۔ مولانا ولی اللہ فرنگی محلی	۶۹۸
♦	۱۲۸۔ مولانا ولی اللہ سورتی	۶۹۹
♦	۱۲۹۔ حافظ ولی اللہ لاہوری	۷۰۰
♦	ی	
♦	۱۳۰۔ مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی	۷۰۱
♦	۱۳۱۔ مفتی یعقوب علی سندیلوی	۷۰۷
♦	۱۳۲۔ مولانا یعقوب دسنوی	۷۰۷
♦	۱۳۳۔ قاضی یوسف شاہ جہان پوری	۷۰۸
♦	۱۳۴۔ سید یوسف بیجاپوری	۷۰۸
♦	مراجع ومصادر	۷۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

فقہائے ہند کی جلد ششم حصہ سوم آخری جلد ہے جو خوانندگانِ محترم کے زیر مطالعہ ہے۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک پھیلی ہوئی یہ دس جلدیں پچیس سو سے زائد صفحات پر محیط ہیں اور ان میں برصغیر کے پندرہ سو چورانوے فقہا و علما کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی اور تدریسی و تصنیفی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ہر جلد کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں متعلقہ صدی کے حکمرانوں اور ملوک و سلاطین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ حکمران اپنے دور کے اہل علم اور اصحاب فقہ سے کس درجے تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے نزدیک ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ نیز یہ کہ خود ان بوریا نشین فقہا اور درویش منش علما کو ان حکمرانوں کی کتاب حیات کے کن کن اوراق سے بربنائے للّٰہیت اختلاف یا اتفاق تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ کیا لب و لہجہ اختیار کرتے تھے۔ یہ مقدمات متعلقہ عہد کے بہت سے پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

سلسلہ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں میں جن علمائے عظام کی تگ و تاز گوناگوں کو حیطہ تسوید میں لایا گیا ہے، ان میں ہر مسلک فقہ کے لائق تکریم حضرات شامل ہیں۔ حنفی بھی اور شافعی بھی، مالکی بھی اور حنبلی بھی، شیعہ بھی اور اہل حدیث بھی۔ جن حضرات کی جن مساعی علمی تک رسائی ہو سکی ہے، اسے بلا کم و کاست حوالہ قرطاس کر دیا گیا ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ بحمد اللہ ہم نے بزرگان دین اور فقیہان بلند مرتبت کی خدماتِ عالیہ کا تذکرہ کرتے وقت ہر بزرگ کے احترام و اکرام کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ کون بزرگ کس مسلک سے وابستہ تھے اور میدانِ علم و عمل میں انھوں نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

ہمارے نزدیک تمام مسالک فقہ کے اہل علم ہم سب کی مشترکہ میراث اور متاعِ بے بہا ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا اور ان کی علمی و فکری مساعی کو نمایاں کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں کی تحریر و تصنیف میں ہمارے چودہ سال صرف ہوئے۔ ان کی تصنیف کے علاوہ اس عرصے میں ہم نے اور بھی متعدد خدمات انجام دیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ

کے ترجمان ماہانہ "المعارف" کی ادارت ہمارے سپرد رہی جو ایک مستقل کام تھا۔ "المعارف" کے لیے خالص علمی و تحقیقی مضامین فراہم کرنا، ان کا ایک ایک لفظ پڑھنا، اپنی پالیسی کے مطابق کتابت و طباعت کے لیے ان کا انتخاب کرنا، کتابت کے بعد ان کی پروف ریڈنگ کرنا اور انھیں خاص انداز سے ترتیب دینا نہایت ذمہ دارانہ کام تھا' جو انتہائی محنت اور توجہ چاہتا تھا۔ اللہ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے اس بندۂ عاجز کو ہمت و توفیق کی نعمت عظمیٰ سے حصۂ وافر عطا فرمایا۔ آئندہ کے لیے بارگاہ ایزدی سے عاجزانہ دعا ہے کہ اللھم وفقنا لماتحب و ترضٰی۔

اس موقعے پر ہم فخر و مباہات کے طور پر نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کناں ہیں کہ بتوفیق خداوندی، ہمارا ذہن ہمیشہ جادۂ صواب پر رہا ہے اور ہم نے اپنی دانست میں انتہائی احتیاط و توازن سے قلم کو حرکت دینے کی سعی کی ہے۔ تاہم اگر کہیں سہواً نوک خامہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہو تو ہم انتہائی عجز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں معافی کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں اور جن حضرات کو ہماری کسی تحریر سے ذہنی اذیت پہنچی ہو' ان سے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ ان دس جلدوں میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک حرفِ آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے بہت سے فقہا و علما کے حالات تک ہماری رسائی نہ ہوسکی ہو یا بعض بزرگوں کے بارے میں ہمیں کم معلومات میسر آئی ہوں اور تفصیل ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔

یہ جو کچھ بھی ہے معزز قارئین کے سامنے ہے۔ ہمارے علم و مطالعہ کے مطابق اس موضوع کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جن اصحاب کا دائرۂ معلومات اس باب میں زیادہ وسیع ہے، وہ اگر ہماری رہنمائی کے لیے وقت نکالیں گے اور ہماری لغزشوں سے مطلع فرمائیں گے تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ ان کے نام اور ان کے فراہم کردہ معلومات کے حوالے سے اپنی لغزشوں کا اعتراف کریں گے اور ان کے لیے اللہ کے حضور دعا گو ہوں گے۔

"فقہائے ہند کی آٹھویں جلد کا مقدمہ آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے سانحہ وفات پر ختم ہوا تھا۔ نویں جلد کے مقدمے میں ۱۸۵۷ء سے بعد کے حالات، وہابی مقدمات، کالے پانی کی سزاؤں، ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو کالا پانی میں وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل اور وہابی قیدیوں پر اس کے رد عمل وغیرہ امور کی صراحت کی گئی تھی۔ اب اس کے بعد کی چندان تحریکوں کا ذکر کیا جائے گا جو ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص مسلمانوں کے علمی و ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے شروع کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اختصار کے ساتھ سرسید احمد خاں اور ان کی عملی مساعی کا جائزہ لیا جائے گا۔

سرسید احمد خاں:

سرسید احمد خاں کی ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے دادا جواد الملک سید ہادی تھے

جو مغل حکمران شاہ عالم کے عہد میں صوبہ شاہ جہاں آباد کے محکمہ احتساب اور قضائے لشکر کے منصب رفیع پر فائز تھے۔ والد کا اسم گرامی میر محمد متقی تھا۔ میر محمد متقی آزاد منش آدمی تھے اور معاملاتِ دنیوی سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ اس دور کے معروف بزرگ شاہ غلام علی مجددی دہلوی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ان کی خدمت و صحبت میں رہنا اور ان سے استفادہ کرنا ان کے اصل مشاغل تھے۔

سرسید احمد خاں کے نانا کا نام خواجہ فریدالدین احمد تھا جنھیں مغل حکومت کی طرف سے دبیرالدولہ امین الملک، خان بہادر اور مصلح جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ فریدالدین احمد کچھ عرصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر مقرر ہو گئے تھے۔ نیک اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ علم و فہم اور سیاست و تدبر میں مشہور تھے۔ مشکل اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں مہارت رکھتے تھے۔ سرسید کی زندگی کا دورِ آغاز ننھیال کے اسلوبِ زیست سے بھی متاثر ہوا اور ددھیال کے طرزِ حیات سے بھی۔

حکومت و اقتدار کے اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کا یہ دورِ زوال تھا، لیکن علم و عرفان اور معرفت و ادراک کے لحاظ سے دہلی کا ستارہ عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کے افق پر اشاعت مذہب اور تبلیغ علومِ اسلامی کے دو عظیم الشان مرکز جلوہ گر ہیں۔ ایک شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ جسے مذہبی و دینی علوم کا گہوارہ کہنا چاہیے، اور دوسرا مرکز شاہ غلام علی مجددی کی خانقاہِ تصوف و طریقت کا۔

سرسید کے ننھیال شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے دامن عقیدت سے وابستہ تھے اور ان کے والد میر محمد تقی کا شاہ غلام علی سے باقاعدہ تعلق ارادت تھا۔ اس بنا پر سرسید نے فیض کے ان دونوں سرچشموں پر حاضری دی اور ان سے سیراب ہوئے۔

سرسید کا نام احمدؔ ان کے والد کے مرشد عالی قدر شاہ غلام علی نے رکھا تھا اور ان کی تقریب بسم اللہ بھی انہی کے دست حق پرست سے ہوئی تھی۔ شاہ صاحب ممدوح سے سرسید کو بے حد عقیدت تھی۔ اپنے والد کے ساتھ بھی وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفاضہ کرتے تھے۔ تنہا بھی ان کے ہاں ان کی آمد و رفت اور ان سے فیض یابی کا سلسلہ جاری تھا۔

سرسید نے قدیم طریق تعلیم کے مطابق حصول علم کیا۔ طب بھی باقاعدہ پڑھی اور ریاضی میں بھی نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ''صدر امین'' کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کے امتحان میں شامل ہوئے اور اس میں کامیاب رہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی کے منصف کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس اثنا میں مختلف اساتذہ سے مزید تحصیل علم کے مواقع میسر آئے۔ انھوں نے جولائی ۱۸۷۶ء تک پینتیس سال ملازمت کی اور اس اثنا میں دہلی، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں اقامت گزیں رہے۔

تصنیفی خدمات:

پینتیس سالہ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد سرسید نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں قولِ متین در ابطالِ حرکت زمین، تسہیل فی جر الثقیل، انتخاب الاخوین یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ، اسبابِ بغاوت ہند، آثار الصنادید، تبیین الکلام، رسالہ طعامِ اہل کتاب، خطباتِ احمدیہ، تفسیر قرآن۔ نیز سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے عقائد و افکار کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں جن میں راہِ سنت در ردِ بدعت اور کلمۃ الحق شامل ہیں۔

سرسید کی بعض تصانیف میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور اس کا اظہار متعدد اہل علم نے ان کی زندگی میں بھی پرزور الفاظ میں کیا اور بعد میں بھی اب تک ہو رہا ہے۔

اشاعت تعلیم کے لیے تگ و تاز:

تصنیف و تالیف کے علاوہ اشاعت تعلیم کے سلسلے میں سرسید نے جو تگ و تاز کی اس کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے سرکاری ملازمت کے دور میں ۱۸۵۹ء مراد آباد میں فارسی کا مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور ہی میں ایک مدرسہ جاری کیا، جس میں انگریزی، اردو، عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ بعد میں یہ مدرسہ وکٹوریہ ہائی سکول کے نام سے موسوم ہوا۔ علی گڑھ میں جس مدرسے کا آغاز کیا تھا، اس کا انتظام و انصرام مولوی سمیع اللہ خاں کے ہاتھ میں تھا۔ جولائی ۱۸۷۶ء میں جب سرسید پنشن پا کر علی گڑھ آگئے تو اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ مدرسہ ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کی شکل اختیار کر گیا۔

قومی غیرت وحمیت:

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سرسید انگریزی حکومت کے زیادہ حامی نہ تھے البتہ انگریزی تعلیم کے حامی تھے اور اس کے حصول کا فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی دیا تھا۔ علمائے کرام نے سرسید کی جو مخالفت کی ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کا تعلق سرسید کے اس نقطۂ نظر سے ہے، جس کا اظہار انھوں نے جنات، ملائکہ اور معجزات وغیرہ سے متعلق کیا ہے۔ اس سے اختلاف اس وقت بھی صحیح تھا، اب بھی صحیح ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ سرسید کا مقابلہ عیسائیوں سے تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں انتہائی بغض و عناد رکھتے اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ممکن ہے سرسید کا نقطۂ نظر چند مسائل میں تاویل کر کے زیادہ تر اسلامی مسائل اسلام کا تحفظ کرنا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ جن اہل علم کا سابقہ علمی میدان میں غیر مسلموں سے رہا ہے، ان میں سے بعض حضرات ایسا کرتے رہے ہیں۔ بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو،

سرسید نے مذہبی مسائل کی توضیح وتبیین میں جہاں جہاں ٹھوکر کھائی ہے' اس میں ان کے موقف کو ہرگز قرین صحت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جن مسائل میں انھوں نے تاویل کی ہے، وہ نہایت اہم اور بنیادی ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

قومی معاملات ومسائل کے بارے میں سرسید نہایت غیور اور انتہائی نازک مزاج تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان کے سامنے بپا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کو ختم ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسلامیانِ ہند کی غیرت وحمیت کو جو شدید اجتماعی صدمہ پہنچا تھا' اس کے وہ عینی شاہد تھے۔ اس صورتِ حال سے وہ بدرجۂ غایت متاثر ومتالم اور غم گین تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے زوردار قلم نے مغموم ومحزون لہجے میں اس وقت کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھی جب پورا ملک پھانسی گھر بنا ہوا تھا اور جگہ جگہ اس کے پھندے لٹک رہے تھے اور لوگوں کی گردنوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ جب ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شبلی کے الفاظ میں ''کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔''

سرسید انگریز کے ہاتھوں باشندگانِ ملک کی سبکی برداشت نہ کر سکتے تھے اور صرف اس بنا پر آگرہ کے دربار سے برہم ہو کر چلے آئے تھے کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجے پر نہ تھیں۔

سرولیم میور نے جو کسی زمانے میں یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا' ''لائف آف محمد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اسلام اور آں حضرت ﷺ کے خلاف نہایت گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ سرسید نے ''خطباتِ احمدیہ'' کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ وہ لائف آف محمد کو پڑھ کر کس درجے کبیدہ خاطر ہوئے' اس کے مطالعے سے ان کے جذبات کو کتنی اذیت پہنچی اور ان کا احساس کتنا زخمی ہوا' اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے نواب محسن الملک کے نام ۲۔ اگست ۱۸۶۹ء کو لندن سے لکھا۔ اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور پھر اسلام سے متعلق ان کی محبت کی داد دیجیے۔ لکھتے ہیں:

ان دنوں میں ذرا دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت ﷺ کے حال میں لکھی ہے' اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا' کتاب لکھ دی جاوے۔ اگر روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا' حاضر کرو۔

مارا ہمیں تمغۂ شاہنشاہی بس است ❶

نواب وقار الملک کا کسی زمانے میں ایک ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو کچہری کے اوقات میں نماز پڑھنے

❶ مکتوباتِ سرسید ص: ۶۲

میں معترض ہوتا تھا۔ سرسید کو اس صورت حال کا پتا چلا تو انھیں ۹ جنوری ۱۸۷۵ء کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا!

''نماز جو خدا کا فرض ہے' اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے' جس طرح خرابی سے ہو' ادا کریں یا قضا کریں' لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو' اس کا صبر ایک لحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے' جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی' اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا؟ ''حضور رخصت ہی دیں' تنخواہ کاٹ لیں'' کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفا دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان' قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی' فاقے سے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ ❶''

قومی اور اجتماعی کاموں میں مال خرچ کرنا سرسید کے نزدیک ضروری تھا۔ اس سے پہلو تہی کرنے والوں کو وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک دوست کو اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''اپنے ضروری کاموں کے لیے تنگی اخراجات کا عذر' میں اپنے خیال کے مطابق مہمل سمجھتا ہوں۔ پس تم پر کیسی ہی تنگی ہو اور آمدنی اخراجات کو کافی نہ ہو اور ہر مہینے قرض ہوتا جاوے' ایسے امور میں میں ان باتوں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا۔ دنیا کا کارخانہ اسی طرح لشتم پشتم چلا جاتا ہے' بجز ان لوگوں کے جو اپنی زندگی کا مقصود گنج قارون جمع کرنا سمجھتے ہیں اور جس قدر جمع ہو جاوے بس نہیں کرتے۔ اور زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا مجھ کو اور تم کو ایسا نہ کرے۔ ❷''

سرسید کے خطوط نہایت دلچسپ ہیں اور ان میں بڑی پتے کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ان سے ایک شخص نے بذریعہ خط استفسار کیا کہ اگر نماز میں قرآن مجید کے الفاظ کے بجائے صرف ان کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟ اس کے خط کا جواب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:

''مخدومی!

''نماز میں قرآنِ مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔ ❸''

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا سرسید انگریزی۔ اقتدار کے حامی نہ تھے' انگریزی تعلیم کے حامی تھے۔ اس کی بنیادی وجہ اس تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو منازل ارتقا سے روشناس کرانا اور اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں ان

❶ مکتوباتِ سرسید ص: ۲۳۰

❷ موج کوثر ص ۱۱۰

❸ مکتوباتِ سرسید ص: ۶۶۹

کو راہِ تقدم پر گامزن کرنا تھا اور اس دور میں یہ ضروری تھا۔

یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں وہابی کو انگریزی حکومت کا باغی سمجھا جاتا تھا اور وہابیت کو بغاوت کے مترادف قرار دیا جاتا تھا' لیکن سرسید اپنے آپ کو دھڑلے سے وہابی کہتے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے وہ موید تھے' جب کہ انگریزی حکومت اس تحریک کی سخت مخالف تھی اور اس کے پیروکاروں پر بغاوت کے مقدمے قائم کر کے انھیں کالا پانی اور پھانسی کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس سلسلے کے پانچ مشہور وہابی مقدمات کی تفصیل فقہائے ہند کی نویں جلد کے مقدمے میں بیان کی جا چکی ہے۔

آثار الصنادید میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کا تذکرہ محبت و عقیدت سے بھرپور الفاظ میں کیا ہے۔

ہندوستان میں کانگریس ۱۸۸۴ء میں انگریزوں نے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد اس ملک کے باشندوں کو جمہوریت کی ان اقدار سے متعارف کرانا تھا جو برطانیہ میں رواج پذیر تھیں اور اس کے ذریعے انھیں کچھ مراعات سے نوازنا تھا۔ لیکن سرسید نے اس کے بعض پہلوؤں کی شدید مخالفت کی۔ اگر وہ انگریز کے حامی ہوتے تو اس عہد میں کانگریس کے خلاف قلم و زبان کو حرکت میں نہ لاتے۔ یاد رہے سرسید کے زمانے میں کانگریس کا پروگرام برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنا اور اس مقصد کے لیے اس سے پنجہ آزما ہونا نہ تھا۔ بلکہ انگریز کے بتائے ہوئے طریقے اور اس کی ہدایات کے مطابق مودبانہ الفاظ میں اس کی خدمت میں کچھ مطالبات پیش کرنا تھا اور سرسید کو اس سے اتفاق نہ تھا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" ہندوستان کی سیاست پر پہلی کتاب تھی' جس کی تلخ نوائی نے برطانوی حکومت کے حلقوں میں ایک تہلکہ بپا کر دیا تھا اور بڑے بڑے انگریز منصب دار اس کی اشاعت کے بعد اہل ہند کے سیاسی اور اجتماعی مسائل کو غور و فکر کا ہدف قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے صرف دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی عام بغاوت کا اصل ذمے دار انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے بارے میں اس کے طرزِ عمل کو قرار دیا گیا ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ممکن ہے' اس کتاب سے انگریزوں کی اثر پذیری کا نتیجہ ہو۔

سرسید احمد خاں نے (۸۰) سال سے زائد عمر پا کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ مرض الموت میں حالت ہذیان طاری ہونے سے پہلے قرآنِ مجید کی یہ آیات ان کی زبان پر جاری رہیں۔

حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

آئینی اصلاحات کا سلسلہ:

ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں بنائی گئی تھی' جب کہ اس ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی' لیکن اس کونسل میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو اس کے اثرات انگلستان کی پارلیمنٹ تک پہنچے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں آئینی اصلاحات کا پہلا قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبر بذریعہ نامزدگی لینا منظور کیے گئے۔

اس کے بعد ملک کے بعض صوبوں میں چند نیم سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئیں۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں ''انڈین ایسوسی ایشن'' قائم ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں ''مہاجن سبھا'' کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۸۴ء ہی میں ''انڈین نیشنل یونین'' قائم کی گئی۔ اسی سال ایک انگریز مسٹر ہیوم نے ہندوستان کے باشندوں میں سیاسی شعور کو تیز کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن تھا۔ ہیوم اس کے پاس کچھ تجاویز لے کر گیا' جن کا مفاد یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں اصلاحِ رسوم اور اصلاح تمدن کی ایک انجمن کی طرح ڈالیں۔ لیکن لارڈ ڈفرن نے اس کی تجاویز سن کر کہا کہ اس ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو انگلستان کی طرح حکومت کے خلاف کام کرتی ہو۔ چوں کہ انگریزوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے اور ان کی حکومت کے بارے میں ہندوستانی کیا رائے رکھتے ہیں' اس لیے یہاں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اس خلا کو پر کرے۔ حاکم اور محکوم دونوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستان کے باشندے ہر سال اپنا ایک اجتماع کر کے حکومت کو یہ بتانے کا اہتمام کریں کہ اس کے نظام حکومت میں کہاں کہاں نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے اور ملک کی حالت کس صورت میں زیادہ سے زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔

اپنی بات ختم کر کے لارڈ ڈفرن نے ہیوم سے کہا کہ جب تک وہ اس ملک کا وائسرائے ہے' اس تجویز کا اظہار کسی سے نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب تک ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے رہا' ہیوم نے اس کی یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ جب وہ اپنی مدت ختم کر کے ہندوستان سے چلا گیا تو ہیوم اس کے بعد انگلستان گیا اور اس مسئلے سے متعلق وہاں کے متعدد لیڈروں سے بات کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام:

انگلستان میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوستان میں ایک جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ ہیوم نے ہندوستان واپس آکر ملک کے مختلف لوگوں سے مشورہ کیا اور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔

اس وقت حکومت سے کانگریس کا اس درجہ قریبی تعلق تھا کہ ہیوم نے وائسرائے ہند سے مل کر یہ کوشش کی کہ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت ملک کے کسی صوبے کے انگریز گورنر کو کرنی چاہیے۔ لیکن وائسرائے نے اس تجویز کو اس لیے عمل میں نہ آنے دیا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اپنے خیالات

کا اظہار نہ کر سکیں گے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی تھی' جس کا صدر وہاں کا ایک انگریز سرولیم ڈبرن تھا جو صوبہ بمبئی میں سول سروس کا ایک بڑا افسر رہ چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد انتیس سال یہ شخص زندہ رہا اور عمر بھر انڈین کانگریس کی خدمت کو اس نے اپنا معمول بنائے رکھا۔ اس کو ملازمت کی ایک ہزار پونڈ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ یہ تمام رقم وہ کانگریس کے کاموں میں خرچ کر دیتا تھا۔

۱۸۸۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا تھا' جس کی صدارت اسی نے کی تھی اور اس کے لیے وہ انگلستان سے آیا تھا۔ کانگریس کا یہ وہ دور تھا جس کی سرسید نے مخالفت کی تھی۔ بہت بعد میں آہستہ آہستہ کانگریس نے اپنی حیثیت بدل لی تھی اور انگریزی حکومت کے خلاف اس نے بہت بڑا محاذ قائم کر لیا تھا جس کا نتیجہ آزادیٔ وطن کی صورت میں ظاہر ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت نے بے حد اذیتوں میں مبتلا کیا۔ دہلی کی علمی رونق اجڑ گئی اور وہاں کے مدارس کو شدید نقصان پہنچا۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر بعض سرکردہ حضرات نے دیوبند (ضلع سہارن پور) میں عربی علوم کا ایک دارالعلوم قائم کرنے کا عزم کیا۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو بروز پنجشنبہ چھتے کی پرانی مسجد کے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں بغیر کسی رسمی تقریب اور نمائش کے نہایت سادگی کے ساتھ دارالعلوم کا افتتاح ہوا۔ ملا محمود دیوبندی کو جو اس زمانے میں میرٹھ میں مدرس تھے اور بلند پایہ عالم تھے' مدرس مقرر کیا گیا۔ محمود حسن جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے' اس دارالعلوم کے اولیں طالب علم تھے' جنھوں نے افتتاح کے موقعے پر استاد کے سامنے کتاب کھولی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا پہلا استاد بھی محمود تھا اور پہلا شاگرد بھی محمود!

دارالعلوم دیوبند کے افتتاح کے وقت اللہ پر توکل اور اس کے کرم کے سوا کوئی ظاہری ساز و سامان نہ تھا۔ پرخلوص داعیہ' خدمت دین کا جذبہ اور اللہ پر بھروسا ہی بانیانِ دارالعلوم کی کل کائنات تھی۔ نہ وسیع و عریض جگہ تھی' نہ عمارت اور نہ اساتذہ اور نہ طلبا کی کوئی بڑی جماعت۔ صرف ایک طالب علم اور ایک استاد! یہ حالت تھی اس ادارے کی جو اپنی خدماتِ گوناگوں کی بنا پر آج پوری دنیا میں مشہور ہے۔

اکابر دارالعلوم کی جانب سے قیام دارالعلوم کے موقعے پر جو اعلان شائع کیا گیا' وہ درج ذیل ہے اور جن حضرات کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا' ان کے اسمائے گرامی اعلان کے نیچے درج ہیں۔

''الحمد للہ دیوبند میں اکثر اہل ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء سے جاری ہوا' اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل مشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے۔ چوں کہ لیاقت مولوی صاحب کی بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلت چندہ کے کم۔ ارادہ مہمانِ مدرسہ کا ہے کہ بشرطِ وصول زرِ چندہ قابل اطمینان جس کی امید کر رکھی ہے' تنخواہ مولوی صاحب کی زیادہ کی جاوے اور

ایک مدرس فارسی وریاضی کا مقرر ہو۔ جملہ اہل ہمت وخیر خواہانِ ہند خصوصاً مسلمان سکنائے دیوبند وقرب وجوار دیوبند پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے' بہ دل شریک ہو کر امداد کافی دیویں' اور واضح ہو کہ سوائے چندہ فہرست ہذا کے جس کی میزان ۴۰۱ روپے آٹھ آنے ہے' دوسرا چندہ واسطے خوراک ومد خرچ طلبائے بیرون جات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صرف ہو گیا ہے اور ان شاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے۔ اس میں سے طلبائے بیرون جات کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا۔ کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہوگا۔ نام مہتممان کے درج ذیل ہیں۔ جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بیرنگ ارسال فرمادیویں۔ رسیدان کی بصیغہ پیڈ بھیجی جاوے گی۔ فقط

حاجی عابد حسین صاحب۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولوی مہتاب علی صاحب۔ مولوی ذوالفقار علی صاحب۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب۔ منشی فضل حق صاحب۔ شیخ نہال احمد صاحب۔

(العبد فضل حق سربراہ کار مدرسہ عربی وفارسی وریاضی۔ قصبہ دیوبند)

(تحریر بتاریخ ۱۹ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳ جون ۱۸۶۶ء۔ روز دوشنبہ)

یہ حضرات مدرسہ دیوبند کی ابتدائی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور اس کے اولین معمار بھی۔ ان میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے اور حاجی عابد حسین پہلے مہتمم۔

دارالعلوم کا دستور العمل:

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دینی مدارس بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے قیام وبقا کے لیے جو دستور العمل مرتب اور تجویز فرمایا' اس میں اسلامی دور حکومت کے سابقہ طریق کے برعکس عوامی چندے اور جمہوری طرز اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس دستور العمل کی آٹھ شقیں ہیں۔ مولانا نانوتوی نے بتایا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے وقت ان کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ یہ بنیادی اور ضروری اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں' اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقائے طعامِ طلبا بلکہ افزائش طلبا میں جس طرح ہو سکے' خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالف رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیِ مدرسہ ملحوظ رہے' سخن پروری نہ ہو اور اس لیے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں

نہ ہو' بہ دل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا ہو تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقرر اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو' پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں' جب تک ان شاء اللہ یہ مدرسہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا' اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے' ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔"

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی اس تحریر کو ان کے اصولِ ہشت گانہ کہیے یا دارالعلوم دیوبند کا دستور العمل قرار دیجیے' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہایت عمدہ باتیں ہیں۔ اس میں مدارس دینیہ کے لیے سرکاری امداد کے بجائے عوامی چندے کو اہمیت دی گئی ہے تاکہ دین کے یہ گہوارے اور اسلامی علوم کے یہ مراکز سرکاری عمل دخل سے پاک رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ظاہری شان و شوکت اور آمدنی کے حتمی اور یقینی ذرائع اختیار کرنے سے جو جاگیروں کی آمدنی اور نوابوں اور سرمایہ داروں کی وساطت سے حاصل ہوں' احتراز کیا جائے۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کے اپنانے سے اللہ کا خوف و رجا ختم ہو جاتا ہے اور رجوع الی اللہ کا سررشتہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

مظاہر علوم۔ سہارن پور:

رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) میں مولانا سعادت علی فقیہ اور بعض دیگر حضرات کی کوششوں سے

سہارن پور میں دینی علوم کا ایک مدرسہ "مظاہر علوم" کے نام سے قائم ہوا۔ اس کے اہتمام و تدریس کی ذمے داریاں مولانا سعادت علی فقیہ کے سپرد تھیں۔ مولانا ممدوح نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔ اس زمانے میں مولانا احمد علی سہارن پوری کلکتہ میں فروکش تھے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں وہ کلکتہ سے سہارن پور آ گئے اور مدرسہ مظاہر علوم کی تدریس و اہتمام کا سلسلہ بالاتفاق ان کے سپرد کر دیا گیا۔

مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) میں منقولات اور معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں جو حضرات فرائض تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے، وہ تمام علوم مروجہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اس مدرسے نے بڑی ترقی کی اور بے شمار علما و فضلا اس سے فارغ التحصیل ہوئے جنھوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے میدان میں بہت نام پایا۔ یہ مدرسہ اب بھی جاری ہے اور اللہ کے فضل سے اس کی رفتار خدمت بڑی تیز ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ:

علی گڑھ، دیوبند اور سہارن پور وغیرہ کے مدارس کے اٹھائیس تیس سال بعد جب کہ ملک میں متعدد قومی تحریکیں جاری تھیں، ندوۃ العلما کے قیام کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا مقصد علما کی اصلاح تھا جو بہت بڑا کام تھا۔ اس تحریک کے اصل محرک ایک بزرگ مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن اس کی تکمیل مولانا شاہ محمد علی کانپوری کے ہاتھوں ہوئی جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ ان کی محنت و سعی سے ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا۔ وہی اس کے ناظم اول مقرر ہوئے۔ اس کے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ نصاب تعلیم میں اصلاح، قدیم نصاب تعلیم اور علی گڑھ کے جدید طریق تعلیم کے درمیان ہم آہنگی کی ایک قابل قبول صورت پیدا کرنا۔

۲۔ علما کے باہمی نزاع ختم کر کے انھیں ایک مرکز پر جمع کرنا۔

۳۔ ملک کے سیاسی معاملات سے الگ رہ کر مسلمانوں میں حصولِ علم کا جذبہ پیدا کرنا۔

۴۔ ایک بڑے دارالعلوم کا قیام، جس کے نصابِ تعلیم کے ذریعے آپس کے مسلکی اختلافات ختم ہو سکیں۔

۵۔ ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود ہوں۔

۶۔ محکمۂ افتا کا قیام۔

اس دور میں عام طور سے علما پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مسلکی اختلافات کی بنا پر خود بھی باہم جھگڑتے رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آمادۂ پیکار رکھتے ہیں، لہٰذا ضرورت تھی کہ علما کو مصالحت و مفاہمت پر آمادہ کر کے ان کے آپس کے جھگڑوں کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور مشترکہ مقاصد کے لیے مختلف الخیال علمائے کرام ندوۃ العلما کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، جس سے آپس کے مذہبی نزاعات میں بہت حد تک کمی واقع ہوئی۔ مولانا شبلی اور صاحب تفسیر حقانی

مولانا عبدالحق نے اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔ سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور دیگر متعدد اکابر نے اس کے اغراض و مقاصد کو سراہا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں علما کی اس کوشش کا خیر مقدم کیا۔

اس سلسلے میں ندوۃ العلما کے ناظم مولانا محمد علی کے ایک خط کے جواب میں سرسید نے ۲۱ دسمبر ۱۸۹۴ء کو ان کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا وہ یہ ہے!

جناب مولانا مخدوم مکرم من مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلما۔!

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ کا نوازش نامہ اور حصہ اول روائداد ندوۃ العلما پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا۔ اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا پورا ادا کرنا کسی قدر مشکل اور نامناسب ہے۔ ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے، اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک، مولوی سید مہدی علی کانفرنس کے اجلاس میں ایک ریزولیشن پیش کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہے، اس پیرایہ میں اس کی تعمیل ہو جائے گی۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما کا اتفاق ہو۔ الا کوشش ضرور ہو۔ السلام علیکم ❶۔

علمائے کرام کے اتحاد کے علاوہ ندوۃ العلما کی دوسری بہت بڑی خدمت قدیم نصابِ تعلیم کی اصلاح ہے۔ اپنے دور کی ضرورت اور ماحول کے مطابق جلیل القدر اور ماہر فن علما کے مشورہ و تجویز سے ایک ایسا نصابِ تعلیم ترتیب دیا گیا جو قدیم و جدید کی دو انتہاؤں کے درمیان ''وسط'' کا درجہ رکھتا تھا۔ مئی ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں اپنا ایک دارالعلوم قائم کرکے اس نصاب تعلیم کے مطابق ابتدائی درجوں کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔

یہ نصابِ تعلیم اور طریق تعلیم نہایت کامیاب رہا اور ملک کے اہل علم نے اس کی تحسین کی۔ مسلمانوں میں مولانا احمد رضا خاں کے سوا شاید کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے اس کے خلاف پُرزور مضامین لکھے اور ندوہ کے مقابلے میں ایک جماعت ''جدوہ'' قائم کی۔

ہمارے خیال میں کسی علمی کوشش سے اختلاف اور اس پر تنقید اس بنا پر ضروری بھی ہے کہ اس سے بہت سی نئی باتیں سامنے آ جاتی ہیں اور اپنے کام میں اصلاح کے مواقع ابھرتے ہیں۔

ندوۃ العلما کے نصاب تعلیم میں تفسیر قرآن، حدیث وفقہ، عربی ادب اور عربی میں تحریر اور تقریر کو خاص طور پر شامل کیا گیا اور علما وطلبا نے انتہائی شوق و توجہ سے اس نصاب کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کی اور وہ ہر گوشہ علم اور شعبۂ فن میں ممتاز ہوئے۔ ان میں سے حضرات مرحومین میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، ریاست علی ندوی، معین الدین، محمد حنیف ندوی اور سید ابوالحسن علی ندوی، سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی، ابوظفر ندوی، مسعود علی ندوی اور مسعود عالم ندوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ بزرگ ہیں کہ تصنیف و تالیف کے مختلف دائروں میں جن کی خدمات پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا

❶ مکتوبات سرسید ص ۲۵۱

ہے۔ بہ الفاظ دیگر کہنا چاہیے کہ ندوۃ العلما کے محرک و بانی اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور جس جذبے کے تحت انھوں نے یہ صحت مندانہ قدم اٹھایا تھا اس میں انھیں کامرانی حاصل ہوئی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ علما کے دو دھڑوں میں جب اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ ختم نہیں ہوتا' قائم رہتا ہے بلکہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس اختلاف کے حدود جس قدر وسیع ہوتے ہیں، اسلام اور مسلک کے نام پر ہوتے ہیں۔ گویا اسلام اور ان کے مسلک کا بنیادی مقصد ان حضرات کو اختلاف کی راہ پر لگانا تھا۔ اب صلح کرنا اسلام اور مسلک کے خلاف ٹھہرا۔ (العیاذ باللہ) لیکن ندوۃ العلما کے قیام کا بیڑا اٹھانے والے حضرات نے کسی ایسی ساعت سعید اور نیت خالص کے ساتھ علما کے باہمی اتحاد کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہے اور اس کے بعد ندوہ میں جو نصاب ترتیب دیا گیا' وہ باقی مدارس برصغیر کے لیے ایک نمونہ اور مثال ثابت ہوا۔ پھر ندوۃ العلما سے فارغ ہونے والے حضرات نے جو علمی کام کیا' وہ سب مسلمانوں کا مشترکہ کام ہے۔ اس میں کہیں نزاع یا باہمی اختلاف کے جراثیم نہیں ہیں۔

بعض حضرات ندوہ اور فرزندانِ ندوہ پر تنقید بھی کرتے ہیں اور تنقید اگر صحت مندانہ ہو تو مفید بھی ہوتی ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی انھوں نے ندوہ کے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اس کے بانیوں کے اخلاص اور مصنفین کی کوششوں کے کس قدر شان دار نتائج نکلے اور انھوں نے ہر وُل کے میدان میں کتنی ترقی کی۔

بہر حال یہ چند مدارس کا تذکرہ ہے، ورنہ اس زمانے میں بہت سے مدارس قائم ہوئے' جن میں لاہور کا ایک مدرسہ بھی شامل ہے جو بادشاہی مسجد میں مدرسہ نعمانیہ کے نام سے قائم تھا۔ اس مدرسے میں بے شمار طلباء نے تعلیم حاصل کی' جن میں مولانا محمد علی لکھوی مدنی اور مولانا عطاء اللہ لکھوی بھی شامل تھے' جنھوں نے آگے چل کر حلقہ اہل علم میں بڑی شہرت پائی۔

جامعہ محمدیہ کے نام سے ایک دارالعلوم ۱۸۴۰ء میں موضع لکھوکے (ضلع فیروز پور موجودہ مشرقی پنجاب) میں جاری ہوا۔ اس کے جاری کرنے والے حافظ بارک اللہ لکھوی اور ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی تھے جو مفسر قرآن اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جامعہ محمدیہ اوکاڑہ (پنجاب) میں منتقل ہوا۔ حافظ محمد لکھوی کے پڑپوتے مولانا معین الدین لکھوی اس کے ناظم تھے۔ جنھوں نے ۹ر ستمبر ۲۰۱۱ء کو وفات پائی۔

ایک مدرسہ مولانا غلام العلی قصوری نے ۱۸۶۲ء کے قریب امرتسر میں تائیدالاسلام کے نام سے جاری فرمایا تھا' اور یہ امرتسر کا پہلا دینی مدرسہ تھا' مولانا ممدوح نے ۱۷ر اپریل ۱۸۸۹ء کو وفات پائی۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
۴ر جنوری ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غ

ا۔ مولانا غلام امام حیدر آبادی

علمائے ہند میں جن حضرات نے تاریخ، شعر و شاعری، حساب و ریاضی اور علم فقہ میں شہرت حاصل کی، ان میں حیدر آباد (دکن) کے مولانا غلام امام کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا مختصر نسب نامہ یہ ہے:-

غلام امام بن منور بن مکارم بن غلام محمد! یہ اصلاً افغانی تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کسی بزرگ نے افغانستان سے نقل مکانی کر کے حیدر آباد (دکن) میں سکونت اختیار کر لی تھی' اس لیے مولانا غلام امام افغانی حیدر آبادی کہلائے۔ ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء کو حیدر آباد میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی۔ ابتدا میں گھڑ سواری اور فن حرب میں مہارت پیدا کی۔ پھر بعض امرائے مملکت سے رابطہ قائم کیا اور ماہر حرب ہونے کی بنا پر فوج میں حصول ملازمت کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے حیدر آباد کے چند امرائے سلطنت نے ان کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء میں انھوں نے علم صرف کی ابتدائی کتاب ''میزان الصرف'' پڑھنا شروع کی اور حیدر آباد کے مقامی اساتذہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی تمام درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ شعر و شاعری اور تاریخ میں بھی مہارت پیدا کی اور اس میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ تاریخ میں ایک کتاب ''رشید الدین خانی'' کے نام سے تصنیف کی۔ اپنے اشعار کا ایک دیوان مرتب کیا، جس میں امرائے سلطنت کی مدح و توصیف کی اور بہت سے انعامات حاصل کیے۔ بعد ازاں منطق و فلسفے کو موضوع بنایا اور اس ضمن میں تمام درسی کتابیں باقاعدہ مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ کتب تصوف کی تکمیل بھی ماہر علما سے کی۔ حیدر آباد کے ایک عالم غلام علی سے اخذ طریقت کیا۔ ان تمام علوم و فنون میں درک حاصل کرنے کے بعد تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور علمِ کلام کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت وہ کبرسنی کو پہنچ چکے تھے۔ اب انھوں نے درس و افادہ کی مسند بچھائی اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا غلام امام باہمت اور صاحب عزم عالم تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا

سلسلہ بھی جاری رکھا۔ رشید الدین خانی اور دیوان شعری کے علاوہ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ خورشید جاہی: تاریخ کی ایک مبسوط کتاب ہے جو ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں لکھی۔

۲۔ محی الصلاۃ: یہ فقہ سے متعلق اور حنفی نقطہ نظر کی کتاب ہے۔

۳۔ ترجمہ کیدانی: یہ بھی فقہ حنفی کے بارے میں ہے۔

۴۔ احسن التراکیب: حکمت و فلسفے کے متعلق ہے۔

۵۔ خورشید دانش: یہ بھی فلسفہ اور حکمت کے موضوع پر ہے۔

۶۔ مائتہ رسائل: اپنے دوستوں کے نام خطوط، جن کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے۔ یہ خطوط ادب وانشا سے تعلق رکھتے ہیں۔

۷۔ کشف الغوامض: معموں کے حل کرنے کے بارے میں۔

۸۔ مطالع خورشید: علم منطق میں۔

۹۔ تیغ ہندی: لغت ہندی کی اصطلاحات سے متعلق۔

۱۰۔ خورشید حساب: فن ریاضی میں۔

۱۱۔ ایک رسالہ علم ہیئت کے موضوع پر۔

۱۲۔ ایک دیوان شعری۔

مولانا غلام امام افغانی حیدر آبادی اپنے دور میں دیار ہند کے ایک بڑے عالم تھے اور علوم کے بہت سے پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ خط نہایت عمدہ تھا، اپنے کمالات کی وجہ سے ہر حلقے میں احترام کے مستحق گردانے جاتے تھے۔ امرائے مملکت، عمال حکومت، اصحاب تدریس، ارباب تصوف، علمائے وقت سب تکریم سے پیش آتے تھے۔ علم کے ساتھ اللہ نے عمل کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔

اس عالم و فاضل نے باسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۸ شوال ۱۲۸۵ھ/ یکم فروری ۱۸۶۹ء کو حیدر آباد میں انتقال کیا[1]۔

۲۔ مولانا غلام حسین امیٹھوی

مولانا غلام حسین امیٹھوی کے والد کا نام محمد عظیم تھا۔ صالح اور صاحب تقویٰ عالم دین تھے۔ شیخ حسن غوری کی اولاد سے تھے۔ یوپی کے ایک مقام دیوناتہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عہد کے نامور عالم شیخ فقیر اللہ قادری سے اکتساب علم کیا۔ پھر دہلی گئے۔ اس زمانے میں دہلی میں شیخ برخوردار لاہوری کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے اور دہلی کے دیگر اساتذہ سے حصول علم کیا۔ علم سے فراغت کے بعد علاقہ اودھ میں

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۴۸۔

وارد ہوئے اور یوپی کے شہر امیٹھی میں اقامت اختیار کی۔ اسی بنا پر امیٹھوی کہلائے۔ امیٹھی مشہور عالم و شیخ احمد عرف میاں جیون کا مسکن تھا، جنھوں نے ۹ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۷۱۹ء کو دہلی میں وفات پائی اور تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیں۔

مولانا غلام حسین کچھ عرصہ یوپی کے ایک شہر متھرا میں اقامت گزیں رہے اور وہاں کے لوگوں کو مستفید فرمایا۔

مولانا ممدوح حدیث، فقہ، تصوف اور دیگر علوم عقلیہ و نقلیہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ مسائل فقہ کی وضاحت صاف اسلوب میں کرتے۔ تصوف اور سلوک کی باتیں بھی مؤثر انداز میں لوگوں کے ذہن نشین کراتے۔ تفسیر و حدیث کی تبلیغ و توضیح میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

مولانا غلام حسین شاعر بھی تھے۔ مسائل فقہ میں ایک منظوم کتاب لکھی جو ان کے دور میں بڑی مقبول ہوئی ❶۔ اس عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۔ مولانا غلام حسنین صدیقی قنوجی

ہندوستان کا شہر ''قنوج'' کسی زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جو اصحاب علم پیدا ہوئے ان میں مولانا غلام حسنین صدیقی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: غلام حسنین بن حسین علی بن عبدالباسط بن رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی! یہ تمام بزرگ علم و فضل میں یکتا اور مسائل فقہ میں مرجع خلائق تھے۔

مولانا غلام حسنین کی ولادت ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ تاریخی نام ''غلام علیم'' تھا۔ بعض درسی کتابیں مولانا محمد سعادت خاں فرخ آبادی سے پڑھیں جو اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور ''متوکل'' کے عرف سے معروف تھے۔ ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء میں مفتی فرخ آباد مولانا ولی اللہ بن احمد علی حسینی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے علوم عقلیہ کی بعض کتابوں کا درس لیا اور تفسیر و حدیث کی مروجہ کتابیں مکمل کیں۔ بعد ازاں ارض حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اسی اثنا میں مکہ مکرمہ میں شیخ عبداللہ سراج، شیخ شمس الدین شطا اور سید عمر آفندی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مستفید ہوئے۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے میں مولانا محمد عابد سندھی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے بھی استفادہ کیا اور کتب صحاح اور سنن مشہورہ کی سند لی۔ قیام حجاز کے دور میں تصوف کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔

وطن واپس آئے تو بڑودہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کے جد امجد مولانا عبدالباسط صدیقی قنوجی نے ایک کتاب ''منازل الاثناء عشر'' تصنیف کی تھی، انھوں نے اس کی ذیل لکھی اور اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ یہ خدمت

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۱۔

نہایت محنت اور سرگرمی سے انجام دی۔

مولانا غلام حسنین قنوجی اپنے عصر میں ارض ہند کے جید عالم، مشہور فقیہ، بہت بڑے صوفی اور ممتاز محقق تھے۔ مسائل فقہ میں انھیں جو عبور حاصل تھا وہ کم لوگوں کو حاصل ہوگا۔ تفسیر اور حدیث میں بھی ان کی نظر وسیع تھی۔ علوم عقلی و نقلی میں ان کا مرتبہ بالخصوص بڑا بلند تھا اور فقہی معاملات میں ان کی تحقیق اور فتوے کو مستند سمجھا جاتا تھا۔

آخر عمر میں پھر سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ واپسی پر جہاز بمبئی کے ساحل پر لگا تو نیچے اترے اور بیمار پڑ گئے۔ بمبئی ہی میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں مرقوم ہے کہ ''حج کر کے بمبئی میں واپس آئے تو وہاں بیمار رہ کر حدود ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں وفات پائی۔'' دوسرے تذکرہ نگاروں نے سالِ وفات تحریر نہیں کیا❶۔

۴۔ مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی

مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والد مکرم کا نام محمد غوث تھا۔ مفتی صاحب ممدوح تیرھویں صدی ہجری کے بلدہ لکھنؤ میں ممتاز فقیہ اور بہت بڑے شیخ و عالم کی حیثیت سے معروف تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے جو اس دور میں مجمع علما اور مرکز فقہا تھا۔ انھوں نے اپنے شہر لکھنؤ کے اساتذہ سے کسب علم کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ علم سے فارغ ہوئے تو لکھنؤ کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور تادم حیات اس پر فائز رہے۔ افتا کی ذمے داری اپنے اندر بہت سی نزاکتیں رکھتی ہے اور مفتی صاحب موصوف نے ان ذمے داریوں کو پوری طرح نباہا۔ ان کے اخلاص اور فراوانی علم کے باعث لکھنؤ کے امرا و وزرا ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

مفتی غلام حضرت نے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء کو وفات پائی❷۔

۵۔ مولانا غلام رسول ---قلعہ میہاں سنگھ

خطہ پنجاب میں بے شمار علما و محدثین اور صوفیا و فقہا پیدا ہوئے، جن کی علمی مساعی اور فقہی کاوشوں سے لاتعداد لوگوں نے استفادہ کیا۔ ان اعاظم رجال میں ایک بزرگ مولانا غلام رسول تھے جو ضلع گوجراں والا کے ایک قصبے قلعہ میہاں سنگھ میں فروکش تھے۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور تصوف و صالحیت میں مشہور تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: غلام رسول بن رحیم بخش بن نظام الدین بن بہاء الدین بن محمد اکرم بن حافظ عصمت اللہ بن عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد ___ یہ تمام بزرگ اپنے

❶ ابجد العلوم ج۳ص ۲۶۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳، ۱۵۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۰، ۴۸۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۲، ۳۵۳۔

❷ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۳۔

اپنے دور کے عالم، فاضل، صوفی اور دین دار لوگ تھے۔ وعظ ونصیحت اور تحقیق مسائل میں اس نواح کے باشندے انہی سے رجوع کرتے تھے اور اس اعتبار سے انھیں مرجع خلائق کی حیثیت حاصل تھی۔

مولانا غلام رسول کے دادا مولوی نظام الدین جو تدین وتقوے کی دولت سے مالا مال تھے، فارسی کے شاعر تھے۔ خادم تخلص کرتے تھے، نظامی گنجوی کے تتبع میں انھوں نے فارسی مثنوی بھی لکھی تھی جو اس عہد میں بہت مقبول ہوئی۔

ولادت:

یہ خاندان ضلع گجرات کے موضع سکندر پور میں سکونت پذیر تھا۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے یہ لوگ ضلع گوجراں والا کے ایک گاؤں کوٹ بھوانی داس میں آ بسے تھے۔ وہیں ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں مولوی غلام رسول پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے سلسلے میں دو واقعے قابل ذکر ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ مولوی غلام رسول کے دادا مولوی نظام الدین خادم کے ایک دوست کا نام میاں محمد یوسف تھا جو ضلع گوجراں والا کے ایک مقام پیروکوٹ کے رہنے والے تھے۔ متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ نجاری کا کام کرتے تھے۔ کوٹ بھوانی داس سے پیروکوٹ تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے۔ میاں محمد یوسف کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک دن چھوڑ کر ہر دوسرے دن مولوی نظام الدین سے ملنے کوٹ بھوانی داس آتے تھے۔ مولوی غلام رسول کے بڑے بھائی کا نام حکیم غلام محمد تھا جو طبابت کرتے تھے اور دینی علوم سے بہرہ ور تھے۔ ان کی پیدائش کے بعد میاں محمد یوسف نے مولوی غلام رسول کے والد مولوی رحیم بخش سے کہا:

"آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام غلام رسول رکھنا۔ یہ عالم باعمل، صوفیٔ باکمال، متبع سنت نبوی، مقتدائے انام اور ہادیٔ کتاب وسنت ہوگا۔ لوگ اس کے علم وعرفان اور مواعظ ونصائح سے استفادہ کریں گے۔

دوسرا واقعہ جو لائق تذکرہ ہے، یہ ہے کہ غلام رسول کی ولادت سے پہلے ان کی ماں نے خواب دیکھا کہ چودھویں رات کا چاند ان کی جھولی میں آ گرا ہے۔ دور دور تک اس کی روشنی پھیل گئی ہے اور چاند مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ معبروں سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایک ایسا بیٹا عطا فرمائے گا جو صاحب ورع وتقویٰ ہوگا اور لوگ اس سے مستفید ہوں گے ❶۔

عالم طفولیت:

غلام رسول ابھی عالم طفولیت ہی میں تھے کہ ان کے عمل وحرکت سے ایسے آثار نمایاں ہونے لگے جو زہد واتقا کے سلسلے میں ان کے تابناک مستقبل کی نشان دہی کرتے تھے۔ مثلاً وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود کے

❶ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۲۔

عادی نہ تھے۔ اپنے ہم عمر بچوں کو شرارتوں سے روکتے اور گالی گلوچ سے منع کرتے تھے۔ مزاج میں نرمی اور انکسار کا غلبہ تھا، بڑوں کا احترام بجالاتے اور آگے بڑھ کر ان کو سلام کرتے۔ والدہ نماز میں مشغول ہوتیں تو خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ قرآن مجید پڑھا جاتا تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ''متقی'' مشہور ہو گئے تھے۔ گاؤں کے مسلمان اور ہندو ان کی تعریف کرتے اور ان کے والد مولوی رحیم بخش سے کہا کرتے کہ آپ کا بیٹا بڑا سعادت مند ہے اور اس کی عادات واطوار اولیاء اللہ سے ملتی ہیں۔ اس بچے سے لوگوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس سے پانی دم کراتے' اور بیمار پر چھڑک دیتے۔ بعض لوگ مریضوں پر دم کرانے کے لیے اسے اپنے گھر لے جاتے اور مریض اس کے دم سے واقعی اچھا بھلا ہو جاتا۔ کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو اس بچے سے دعا کرائی جاتی اور چیز کہیں نہ کہیں سے مل جاتی ❶۔

تعلیم وتربیت:

پانچ برس کے ہوئے تو زمانے کے دستور کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کے لیے انھیں مسجد میں لے جا کر معلم کے سپرد کیا گیا، لیکن والدین اور معلم کو نہایت پریشانی ہوئی کہ بچہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے یکسر عاری اور حفظ وذکاوت کی نعمت سے ذہن بالکل خالی ہے۔ بڑی مشکل سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ والد انتہائی متفکر کہ جو لڑکا بچپن ہی میں نیک اور پرہیز گار مشہور ہے اور لوگ جسے ''متقی'' کہتے ہیں وہ پڑھنے لکھنے کے اوصاف سے تہی دامن ہے۔ توقع کچھ اور تھی، ظہور میں کچھ اور آرہا ہے۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ ایک دن خود غلام رسول نے خواب دیکھا کہ وہ مہاراجا رنجیت سنگھ کی حویلی میں اذان دے رہے ہیں اور اذان کی آواز سن کر لوگ ہجوم در ہجوم ان کی طرف آرہے ہیں۔ صبح ہوئی تو خواب اپنے دادا حافظ نظام الدین خادم کو سنایا۔ انھوں نے تعبیر دی کہ بہت سے لوگ تیرے ہاتھ پر مسلمان ہوں گے۔ اس واقعہ سے چند روز بعد حافظ نظام الدین کو اسہال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ایام مرض میں غلام رسول نے ان کی بے حد خدمت کی اور حافظ صاحب نے اپنے پوتے کو بڑی دعائیں دیں۔

اسی اثنا میں ایک بزرگ حضرت کا کا شاہ (جو موضع گڈ گور ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔) کوٹ بھوانی داس میں حافظ نظام الدین سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ وہ حافظ صاحب سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب نے ان کو بتایا کہ غلام رسول نے میری بے انتہا خدمت کی ہے' میں نے اس کے لیے بارگاہ خداوندی میں فیض رسانی کی دعا کی ہے۔ اب میرا وقت رحلت قریب ہے۔ میرے بعد اس کی روحانی تربیت اور ظاہری پرورش کا اہتمام آپ کے ذمے ہے۔ جب تک آپ زندہ ہیں اس کا خیال رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکا

❶ سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۲۳، ۲۴

ضائع ہو جائے۔ شاہ صاحب نے اس ذمے داری کو نبھانے کا عہد کیا اور فی امان اللہ کہہ کر تشریف لے گئے۔ اس سے دوسرے دن حافظ نظام الدین وفات پا گئے۔

چند روز بعد حضرت کا کا شاہ پھر کوٹ بھوانی داس آئے اور غلام رسول سے ملے۔ گلے لگایا اور کچھ پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ حافظ صاحب کی قبر پر جانے کے لیے بھی کہا۔ دوسرے دن پوچھا، جو کچھ میں نے بتایا تھا، وہ پڑھا؟ عرض کی "حضرت! میں تو وہ الفاظ بھول گیا ہوں۔" شاہ صاحب نے ہنس کر فرمایا: "حافظ ندارد" پھر انھیں اپنے پاس بلا کر فرمایا "تم میرے دوست کے پوتے ہو اور تمھارے بارے میں انھوں نے مجھے خاص طور سے وصیت کی ہے۔" یہ کہہ کر غلام رسول کے سینے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: "برخوردار! کہو "اللھم بارك فی علمی و عملی۔ رب زدنی علماً۔" اس وقت غلام رسول کی عمر بارہ برس تھی ❶۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کوٹ بھوانی داس میں متعدد اہل علم اور ارباب تصوف سکونت پذیر تھے اور مولوی نظام الدین کی وجہ سے بہت سے صلحا و اتقیا کی وہاں آمد و رفت تھی، اسی بنا پر مشہور تھا:

کوٹ بھوانی داس دا بغداد اے پنجاب دا

کچھ دن کا کا شاہ صاحب کوٹ بھوانی داس میں مقیم رہے، جانے لگے تو غلام رسول دور تک ان کے ساتھ گئے۔ رخصت ہوتے وقت فرمایا: بیٹے! میں جب بھی تمھیں بلاؤں، مجھے ضرور ملنا۔ جس طرح بھی ہو سکے کتابیں پڑھ لو، زیادہ محنت کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود تمھاری حفاظت کرے گا۔ وہی تمھیں کتابیں اور ان کے مضامین حفظ کرائے گا۔ محنت و مشقت جس قدر ہو سکے یاد خدا میں کرو۔" اس کے بعد دعا کی اور تشریف لے گئے ❷۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں جس دن شاہ صاحب نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا کی تلقین کی تھی، اس دن کے بعد میری یہ کیفیت ہوگئی کہ میں نے کسی کتاب کے سو صفحات کا بھی مطالعہ کیا ہے تو کتاب کے تمام الفاظ اگر یاد نہیں رہے تو مطالب ضرور ذہن میں محفوظ ہو گئے ❸۔

اب اللہ نے حصول علم کے لیے ان کا سینہ کھول دیا اور وہ باقاعدہ طلب علم کی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذکر الٰہی اور وظائف و اوراد کو بھی اپنا معمول ٹھہرا لیا۔ یعنی علم ظاہری اور علم باطنی دونوں کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اللہ نے دونوں میں حصۂ وافر عطا فرمایا۔ ذلك فضل الله یوتیه من یشآء۔

---

❶ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۵ تا ۲۷۔

❷ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۹۔

❸ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۹۔

حضرت کاکا شاہ صاحب کے تشریف لے جانے سے چند روز بعد غلام رسول گاؤں سے چلے اور لاہور آ گئے۔ وہاں بازار حکیماں کی لال مسجد میں موضع بگہ کے مولانا غلام محی الدین بگوی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور باقاعدہ حصول علم کا آغاز کیا❶۔ دو مہینے بعد خواب میں حضرت کاکا شاہ کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں: ''تم مجھے ضرور ملو۔'' صبح اٹھے تو مولانا غلام محی الدین بگوی سے اجازت لی اور موضع گڈکور پہنچے۔ شاہ صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ نصیحتیں کیں، وظائف بتائے، اتباع سنت پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی، صحابہ کرام کا عملی نمونہ بننے کا درس دیا اور حصول علم کی تاکید کی۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں شاہ صاحب کی ان باتوں سے میں نہایت متاثر ہوا۔ ان کی ہر بات دل میں اترتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی تھی۔ ان کے دلنشیں وعظ اور اثر میں ڈوبے ہوئے اسلوب کلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مدارجِ محبت کا مرکز رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس قرار پا گئی اور قلب کی گہرائیوں میں ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اتباع رسول ﷺ اور پیروئ سنت کے لیے میری جان بھی چلی جائے اور میرے جسم کے پرزے اڑا دیے جائیں تو بھی مجھے کوئی پروا نہ ہوگی اور میں اس نعمت عظمیٰ کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ اس دن سے مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ میں آنحضرت ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اگر مجھ سے خلاف سنت کوئی کام ہونے لگتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ خود آنحضرت ﷺ اس سے منع فرما رہے ہیں۔ میں ہر وقت نشہ محبت رسول ﷺ میں سرشار رہتا تھا❷۔

شاہ صاحب سے اجازت لے کر مولانا غلام رسول واپس آنے لگے تو فرمایا ''غلام رسول! میری زندگی میں مجھ سے ملتے رہنا۔ شاید تم میری باقیات صالحات میں سے ہو اور ممکن ہے یہی بات میرے لیے ذریعہ نجات بن جائے۔ دیکھو! علم حاصل کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا۔''

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا غلام محی الدین لاہور سے اپنے وطن بگہ تشریف لے گئے اور

---

❶ ''بگہ'' ضلع سرگودھا میں بھیرہ کے قریب ایک مشہور گاؤں ہے جسے کسی زمانے میں علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا غلام محی الدین یہیں کے رہنے والے تھے اور اپنے عہد کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ۲ محرم ۱۲۱۰ھ/۱۹ جولائی ۱۷۹۵ء) کو بگہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے اور ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے بھائی مولانا احمد الدین بگوی کے ساتھ دہلی گئے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث پڑھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے سند حدیث حاصل کی اور شاہ غلام علی مجددی کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کو وطن واپس آئے۔ والد صاحب (حافظ نور حیات) وفات پا چکے تھے، ان کی مسند درس کو رونق بخشی۔ فقیر عزیز الدین کی درخواست پر لاہور آئے اور بیس برس تک بازار حکیماں کی لال مسجد میں درس حدیث دیتے رہے۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ واستفاضہ کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن بگہ چلے گئے۔ ۳۰ شوال ۱۲۷۲ھ/۴ جولائی ۱۸۵۶ء کو وفات پائی۔

❷ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۱۔

ان کی جگہ ایک اور عالم کو مدرس مقرر کر لیا گیا جو علم میں تو بلاشبہ کامل تھے، مگر عمل میں ان کا درجہ کم تھا۔ مولانا غلام رسول نے ان سے علم نحو کی کتابیں ہدایت النحو اور کافیہ پڑھیں۔ اسی اثنا میں ایک رات مولانا غلام رسول نے خواب دیکھا کہ حضرت کا کا شاہ صاحب نے ان سے ملاقات کے لیے فرمایا ہے۔ مولانا نے استاد سے وہاں جانے کی اجازت طلب کی' لیکن استاد نے اجازت نہ دی۔ دوسری رات پھر وہی خواب دیکھا۔ استاد نے اب بھی اجازت دینے سے انکار کیا۔ تیسری رات خواب دیکھا کہ شاہ صاحب فرما رہے ہیں، ''یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے۔ تم لاہور سے بگہ چلے جاؤ اور مولوی غلام محی الدین سے استفادہ کرو، تمہارے موجودہ استاد دین دار نہیں ہیں۔'' اب مولانا غلام رسول نے کتابیں اٹھائیں اور استاد سے اجازت لیے بغیر لاہور سے روانہ ہوئے اور حضرت کا کا شاہ صاحب کے گاؤں گڈ کور پہنچے۔ لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے قبل شاہ صاحب وفات پا چکے تھے۔ ان کی قبر پر گئے۔ نماز جنازہ پڑھی۔ پھر اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ بیٹے کو دیکھ کر ان کے والد مولوی رحیم بخش بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ''اچھا ہوا تم آ گئے اور مجھ سے ملاقات ہو گئی۔'' دوسرے دن مولوی رحیم بخش نماز عصر ادا کر رہے تھے کہ چوتھی رکعت کے سجدے میں جان جان آفریں کو دے دی۔ سعادت مند بیٹے نے پدر بزرگ وار کو غسل دیا اور کفن دفن کا انتظام کیا۔ چند روز وہاں مقیم رہے۔ پھر بگہ تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا غلام محی الدین بگوی کے برادر صغیر مولانا احمد الدین بگوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور تمام درسی کتابوں کی تکمیل انہی سے کی [1]۔

قلعہ میہاں سنگھ میں سکونت:

موضع بگہ کے مولانا احمد الدین بگوی سے تحصیل علم کے بعد مولانا غلام رسول واپس اپنے گاؤں کوٹ بھوانی داس آ گئے۔ اس سے قبل سردار میہاں سنگھ (جس کے نام سے قلعہ میہاں سنگھ کا قصبہ موسوم ہے) مولانا غلام رسول کے والد مولوی رحیم بخش سے علم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد کو قلعہ میہاں سنگھ لے آیا تھا اور ان کے علم و عمل اور پرہیزگاری سے بہت متاثر تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ مولانا غلام رسول

---

[1] مولانا حافظ احمد الدین بگوی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں موضع بگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ علم بیان و معانی میں مطول اور فقہ میں شرح وقایہ تک کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا غلام محی الدین بگوی سے پڑھیں۔ بعد ازاں انہی کی معیت میں مزید حصول علم کے لیے دہلی گئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے استفادہ کیا۔ چودہ سال وہاں قیام فرما رہے اور علوم قرآن، حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تکمیل فرمائی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا اور واپس وطن آ کر مسند تدریس آراستہ کی۔ لاتعداد لوگ ان سے مستفید ہوئے اور اپنے علاقے میں تبلیغ اسلام اور اشاعت علم کا مؤثر ترین ذریعہ بنے۔ حضرت ممدوح متقی اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور عربی کے شاعر تھے۔ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۳ رشوال ۱۲۸۶/۱۹ جنوری ۱۸۷۰ء کو وفات پائی۔

بھی یہیں آ گئے اور پھر اسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور خطابت و امامت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ یہاں آنے کے بعد ان کے علم و عرفان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور لوگ وسیع تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے جو ان سے علم بھی حاصل کرتے تھے اور تصوف و سلوک کا درس بھی لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کے جید عالم، صاحب تقویٰ، صوفی و سالک اور عارف باللہ تھے۔

اخوند صاحب سوات سے ملاقات:

مولانا غلام رسول پر اب یہ کیفیت طاری تھی کہ ہر آن محبت الٰہی میں سرشار اور مے توحید میں سرمست رہتے۔ جس طرف کسی مے کدۂ معرفت کا پتا چلتا، اسی طرف دوڑ پڑتے۔ اس راہ کی مشکلات کو عبور کرنے میں وہ انتہائی خوشی محسوس کرتے اور مجاہدہ و ریاضت کی کٹھن منزلوں سے گزرنا ان کے لیے باعث مسرت ہوتا۔ انھیں معلوم ہوا کہ سوات میں ایک بزرگ کامل اخوند صاحب فروکش ہیں۔ بہت سے جویان حق ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ مولانا غلام رسول وہاں پہنچے اور اخوند صاحب سے ملے۔ مولانا فرماتے ہیں اخوند صاحب عابد و زاہد اور متقی تو ہیں لیکن سنت رسول ﷺ سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ وہاں انھیں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا، صرف دو دن ان کے ہاں ٹھہرے اور واپس چلے گئے ❶۔

سید امیر صاحب کی خدمت میں:

واپسی پر علاقہ ہزارہ کے ایک مقام تربیلہ میں آئے تو ان کی ملاقات وہاں کے ایک ارباب (یعنی رئیس یا نمبردار) سے ہوئی۔ ارباب صاحب نے ان کو اپنا مہمان ٹھہرایا۔ گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے مولانا غلام رسول سے اس تکلیف دہ اور طویل و عریض سفر کا سبب دریافت کیا۔ مولانا نے جب تفصیل بیان کی تو ارباب صاحب نے ان کو سید امیر صاحب ساکن کوٹھا کا پتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی سید امیر صاحب کے مرید اور عقیدت مند ہیں اور کہا کہ وہ عبادت و زہد میں یکتا ہیں، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ ہیں اور عامل کتاب و سنت ہیں۔ ارباب صاحب کی باتوں سے وہ اس درجے متاثر ہوئے کہ بڑی مشکل سے وہاں ایک رات گزاری۔ فجر کی نماز پڑھی اور عازم کوٹھا ہو گئے۔ سید امیر صاحب سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سلسلۂ بیعت سے متعلق پوچھا تو امیر صاحب نے بتایا ”میں بیعت شدہ سید صاحب بریلوی مرشد مولوی اسماعیل صاحب شہید کا ہوں ❷۔“ سید امیر صاحب کو حضرت سید احمد بریلوی سے فیض حاصل تھا اور بلاشبہ وہ

---

❶ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۸۔

❷ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۹۔

بہت متقی اور پرہیزگار عالم تھے❶۔

مولانا غلام رسول کو سید امیر صاحب نے سینے سے لگایا اور فرمایا تم روحانی اعتبار سے تعجب انگیز استعداد کے حامل ہو۔ تیری خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں اور میری خوشی کا بھی کوئی حساب نہیں۔ مجھے آج تک تیرے جیسا مشتاقِ سنت نہیں ملا۔ الحمد للہ کہ اس نے تمھیں بدعتیوں اور بے راہ رو لوگوں سے بچا لیا❷۔

مولانا چند روز سید امیر صاحب کی خدمت میں رہے اور پھر واپس قلعہ میہاں سنگھ آ گئے۔ اب ان کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ یادِ الٰہی اور اتباعِ سنت ان کا اصل مشغلہ قرار پا گیا تھا۔ جو طالب علم ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے انھیں بھی جواب دے دیا۔ قلب پر خوفِ خدا نے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور زبان اس کے ذکر سے تر رہتی تھی۔

خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات:

اس زمانے میں خواجہ سلیمان تونسوی کے تصوف و ریاضت کا بڑا شہرہ تھا۔ مولانا غلام رسول کے دل میں ان سے ملاقات کی خواہش نے کروٹ لی اور عازمِ تونسہ ہوئے۔ تونسہ سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں پہنچے تو سورج غروب ہو گیا اور وہیں رہ پڑے۔ اس گاؤں کی مسجد کے امام صاحب دین داری کے اوصاف سے متصف تھے۔ اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں درک رکھتے تھے۔ وہ نہایت تکریم سے پیش آئے اور مولانا کو کھانا کھلایا۔ اثنائے گفتگو میں جب انھیں پتا چلا کہ مولانا علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور ہیں تو ان سے بعض مشکل علمی مسائل دریافت کیے۔ مولانا نے جو جواب دیا، اس سے وہ متاثر ہوئے اور تسکینِ خاطر ہوئی۔ پھر پوچھا:

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

---

❶ اخوند سید امیر صاحب نے ''ملا صاحب کوٹھا'' کے نام سے شہرت پائی۔ کوٹھا تحصیل صوابی ضلع مردان کا ایک مشہور مقام ہے۔ سید امیر صاحب یہیں کے رہنے والے تھے اور سید احمد صاحب بریلوی کے مخلص ارادت مند تھے۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد سید احمد بریلوی نے انھیں کوٹھا کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۵ر شعبان ۱۲۴۴ھ/ ۲۰ فروری ۱۸۲۹ء کو ان کے نام باقاعدہ قضا نامہ جاری ہوا۔ سید صاحب سے تعلق ارادت کی بنا پر ملا صاحب گوناگوں مصائب و آلام کا ہدف بنے۔ ایک موقع پر انھیں ''وہابیت'' سے متہم کیا گیا اور ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی' لیکن وہ اپنے موقف و مسلک پر قائم رہے۔ اکابر ہند میں سے دو بزرگوں کو ملا صاحب کوٹھا سے خاص تعلق پیدا ہوا' ایک مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ کو اور ایک مولانا سید عبداللہ غزنوی کو۔ ملا صاحب ممدوح کے بھانجے اور داماد صاحب زادہ عبداللطیف تھے جو جلیل القدر عالم تھے۔ عالم جوانی میں انھیں شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے صاحب زادے (یعنی ملا صاحب کے نواسے) صاحب زادہ نواب سر عبدالقیوم خاں تھے' جو اس ملک کی سیاست میں خاصے نامور ہوئے اور تعلیمی خدمات کے اعتبار سے ''صوبہ سرحد کے سرسید'' کہلائے۔

❷ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۴۰۔

فرمایا: ”خواجہ سلیمان کے پاس تونسے جا رہا ہوں۔“

بولے: ”وہاں تو بدعات کا زور ہے۔ آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ وہاں نہ جائیں۔“

لیکن مولانا نہیں مانے اور وہاں جانے پر مصر رہے۔ اب امام صاحب نے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور اللہ سے دعا مانگی کہ:

”اے اللہ! اگر میں اپنے عقیدے میں سچا ہوں اور وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ میں جانتا ہوں تو مولوی غلام رسول کو اس کی ملاقات کا موقع نہ دے۔“

مولانا غلام رسول جب تونسے پہنچے تو خواجہ سلیمان صاحب وہاں موجود نہ تھے اور وہاں سے بہت دور کہیں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔

مولانا پھر اسی گاؤں میں اسی امام صاحب کے پاس آ گئے اور خواجہ صاحب سے ملاقات نہ ہونے کی اطلاع دی۔ امام صاحب یہ سن کر خوش ہوئے۔

اس سے کئی مہینے بعد پھر تونسہ گئے اور خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ان کو فارسی نظم میں ایک طویل خط لکھ کر پیش کیا۔ یہ خط نہایت عمدہ ہے۔ اس میں بہترین الفاظ اور دلنشین اسلوب میں نصیحتیں کی گئی ہیں اور دنیا کی ناپائیداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔

مولانا فرماتے ہیں: یہ خط پڑھ کر خواجہ سلیمان صاحب خوش ہوئے۔ ”لیکن میری اور ان کی نسبت نہ ملی، کیونکہ خواجہ صاحب کی حالت موافق سنت نہ تھی۔“ مولانا ان کے بعض وظائف سے بھی اتفاق نہ کرتے تھے اور تصورِ شیخ کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں: ”میں ایسی باتوں کا سخت مخالف تھا۔“

مولانا غلام رسول خواجہ صاحب کے بارے میں یہ بھی فرماتے ہیں۔

”مجھ پر آپ نے بڑی مہربانی کی، اپنے مجربہ تعویذ اور وظائف سکھائے اور بلا بیعت ہونے کے مجھے اپنا خلیفہ ہونے کا لقب عطا فرمایا۔ چند روز مجھے وہاں ٹھہرایا۔ مجھ پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب تم کو مرید ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم خود لوگوں کو اپنا مرید بنایا کرو۔ بعد رخصت میں گھر آیا[1]۔

ایک مجذوب سے ملاقات:

تونسہ سے مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ آئے اور وہاں سے فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور، مشرقی پنجاب) گئے۔ ان کی شادی فتح گڑھ چوڑیاں میں ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں نے ان کو بتایا کہ علاقہ تخت ہزارہ میں ایک گاؤں کا نام ”بچے“ ہے۔ وہاں ایک بزرگ رہتے ہیں جو حافظ قرآن اور باکمال ولی ہیں۔ فتح گڑھ چوڑیاں کے

[1] یہ تمام تفصیلات سوانح حیات مولوی غلام رسول میں درج ہیں۔ (دیکھیے صفحہ ۴۰ تا ۴۴)

سب لوگ ان حافظ صاحب کے مرید تھے۔ مولانا غلام رسول وہاں سے موضع بچے پہنچے۔ یہ سفر انھوں نے پیدل طے کیا اور حافظ صاحب سے ملاقات کی۔ کئی دن حافظ صاحب کے ہاں مقیم رہے۔ حافظ صاحب نے ان سے فرمایا:

''میرے پاس براہ راست آپ کا کوئی حصہ نہیں مگر ایک مجذوب کے طفیل میرے فیض کا کچھ حصہ آپ کو ملے گا۔''

حافظ صاحب نے اس مجذوب کے نام ایک خط لکھ کر مولانا کو دیا اور فرمایا: ''اس کا نام نامدار ہے اور قوم کا مارتھ ہے۔ موضع گڑھی اعواناں میں ملک رحمت خاں کے گھر میں رہتا ہے۔ برا بھلا کہے گا۔ آپ برا نہ مانیں۔ میرا یہ خط ان کو دے دیں اور میری طرف سے السلام علیکم کہہ دینا۔''

مولانا غلام رسول حافظ صاحب سے اجازت لے کر موضع اعواناں گئے۔ ان کے ساتھ ایک کشمیری طالب علم تھا جو ان سے علم معانی و بیان کی کتاب ''مطول'' پڑھتا تھا۔ اس گاؤں میں جا کر مجذوب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گاؤں سے باہر گئے ہیں اور جنگل میں بیمار گدھوں کو چرا رہے ہیں [1]۔

مولانا اپنے کشمیری شاگرد کے ساتھ جنگل میں پہنچے اور مجذوب کے قریب گئے تو وہ مولانا سے مخاطب ہوا۔ ''یہ تیرا ساتھی شخص نسب کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اس کو میرے پاس نہ لاؤ، دور چھوڑ کر میرے پاس آجاؤ۔'' اس طالب علم کے بارے میں مجذوب نے کئی قسم کی باتیں کیں۔ مولانا طالب علم کو چھوڑ کر مجذوب کے پاس پہنچے تو حافظ صاحب کا خط پیش کیا اور ان کا سلام پہنچایا۔ اس نے اپنی گودڑی بچھائی۔ مولانا کو احترام کے ساتھ اس پر بٹھایا اور بہت عزت سے پیش آیا۔

مولانا کہتے ہیں اس دن سے میرا شوق ریاضت و مجاہدہ روز بروز ترقی کرتا گیا، میری شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور کثرت سے لوگ میرے پاس آنے لگے۔ لیکن مجھے حضرت سید امیر صاحب کوٹھا والے کا شوق ملاقات آرام نہیں لینے دیتا تھا۔ ان کی صحبت نہایت دلکش و دلآویز تھی اور اس کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔

دوبارہ عزم کوٹھا:

گڑھی اعواناں کے مجذوب سے ملاقات کے بعد مولانا اپنے گاؤں قلعہ میہاں سنگھ آئے اور اہل خانہ سے سید امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا عزم ظاہر کیا اور تیاری شروع کر دی۔ مولانا کے اعزہ و اقارب ان کے اس کثرت سے مختلف مقامات میں جانے پر تعجب و حیرت کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ''یہ مجنون

[1] اس مجذوب کی عادت تھی کہ لوگ اپنے گدھوں سے سخت محنت کا کام لے کر بے کار اور کمزور کر کے چھوڑ دیتے تو یہ اس قسم کے تمام گدھوں کو اکٹھا کر کے جنگل میں لے جاتے اور محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے ان کو چرایا کرتے۔ جب یہ گدھے تندرست اور کام کے لائق ہو جاتے تو مالک ان کو اپنے گھروں میں لے جاتے اور دوسرے بے کار و لاغر گدھوں کو چھوڑ جاتے۔ پھر یہ مجذوب ان گدھوں کو چرانا شروع کر دیتے۔ دن بھر وہ یہی کام کرتے رہتے۔

(سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۴۵)

ہوگیا ہے یا اس کے پاؤں کو چکر آ گیا ہے یا آسیب زدہ ہے۔ یہ شخص آب حیات کی تلاش میں ہے۔" مولانا فرماتے ہیں، اس قسم کے طعن وملامت سے میرے شوق میں مزید اضافہ ہوتا اور میری آتش اشتیاق اور بھڑکتی۔ بہرحال وہ اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے اور سید امیر صاحب کی خدمت میں دوبارہ کوٹھا پہنچے۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے ملاقات:

کوٹھا گئے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے کہ حسن اتفاق سے حضرت سید عبداللہ غزنوی وہاں پہنچ گئے اور مولانا غلام رسول اور حضرت عبداللہ کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی، جس نے آگے چل کر مضبوط روحانی تعلقات وروابط کی شکل اختیار کرلی۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان اس قدر محبت کا رشتہ استوار ہوگیا تھا کہ حضرت سید امیر صاحب اسے دیکھ کر انتہائی خوش ہوتے اور فرماتے کہ تم دونوں کے درمیان مجھے عجیب طرح کا نورِ اخوت گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور تمھیں دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کی محبت میں ترقی دے [1]۔

مولانا غلام رسول کا کوٹھے کا یہ دوسرا چکر تھا۔ وہ اس سے قبل جب پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے تو حضرت سید امیر صاحب کے حلقہ بیعت میں داخل ہوگئے تھے۔ اب مولانا عبداللہ غزنوی پہلی دفعہ تشریف لائے تو وہ بھی سید صاحب سے بیعت ہوئے اور ان کی بیعت کا مقصد محض سید امیر صاحب کے سلسلہ بیعت میں داخل ہونا تھا۔ ورنہ ان کو بیعت کی ضرورت نہ تھی۔

کوٹھا سے روانگی اور ایک مجذوب سے ملاقات:

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی چند روز کوٹھا میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں دونوں کے درمیان گہرے قلبی اور روحانی روابط پیدا ہوچکے تھے۔ دونوں کوٹھا سے قلعہ میہاں سنگھ کو روانہ ہوئے۔ جب گجرات کے قریب پہنچے تو مولانا عبداللہ غزنوی ایک مقام پر رکے اور فرمایا مجھے یہاں ایک ایسے مجذوب کی خوشبو آ رہی ہے جو ملاقات کے قابل ہے۔

یہاں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ کوٹھا سے روانگی کے بعد دوران سفر میں دونوں بزرگوں نے کتب حدیث پڑھنے کا ارادہ کرلیا تھا اور یہ بات بھی دونوں میں طے پا چکی تھی کہ دہلی جا کر حدیث کی تعلیم حاصل کی جائے گی۔ اسی خیال کو دل میں لیے ہوئے مجذوب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مجذوب کا نام جنگو شاہ تھا۔ اس سے یہ حضرات پوچھنا چاہتے تھے کہ حدیث کہاں جا کر پڑھی جائے؟

جب یہ مجذوب کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا دیکھو" دو ایسے شخص آ رہے ہیں جو عمل واخلاق کے اعتبار سے محمدی ﷺ نمونہ ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے جلدی سے

[1] سوانح مولوی غلام رسول ص ۴۸۔ مولانا عبداللہ غزنوی کے حالات کے لیے دیکھیے "فقہائے ہند جلد ۹۔

مجھے کپڑا پہنا دو اور ان کے لیے فرش بچھا دو“۔

جب یہ مجذوب کے قریب آئے تو اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر دہلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جنت اس طرف ہے۔“ اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ حیران تھے کہ یہ مجذوب کبھی کسی سے مخاطب نہیں ہوا، مگر آج ان بزرگوں سے باتیں کر رہا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول مجذوب کی مجلس سے اٹھ کر واپس آنے لگے تو اس نے کہا۔ ”لباس دیکھ کر نہ بھول جانا، وہ شخص مسکین صورت ہے اور اس کا نام سید نذیر حسین ہے۔ اس سے پڑھنا[1]۔

وہاں سے چل کر یہ بزرگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے القا ہوا ہے کہ میں چند مہینوں کے بعد حدیث پڑھنے دہلی جاؤں۔

مولانا غلام رسول کو سید امیر صاحب نے فی الحال لاہور جا کر قیام پذیر ہونے اور وہاں وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ دونوں قلعہ میہاں سنگھ سے لاہور آ گئے۔ چند روز وہاں قیام کیا، پھر امرتسر چلے گئے اور وہاں باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ حافظ صاحب نے مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

لاہور میں قیام اور سلسلۂ وعظ و ارشاد:

مولانا غلام رسول کچھ دن امرتسر رہے اور پھر لاہور آ گئے۔ لاہور میں انھوں نے مسجد چینی والی میں قیام کیا اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وعظ نہایت عمدہ اور مؤثر ہوتا تھا۔ وعظ میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شرکت کرتے اور ان کے ارشادات سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ بہت سے غیر مسلم وعظ کے دوران ہی میں اسلام قبول کر لیتے اور آگے چل کر تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنتے۔ اس طرح بے شمار لوگ ان کے وعظ سے مسلمان ہوئے، اور بہت سے افراد کی زندگیاں اسلام کے قالب میں ڈھلیں۔

اگر کسی جگہ کے لوگ مولانا غلام رسول کے وعظ سے متاثر نہ ہوتے یا دوران وعظ مخالفت پر اتر آتے تو بالکل نہ گھبراتے، نہ بد دل ہوتے بلکہ اپنا سلسلۂ ارشاد جاری رکھتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ واعظ اور مبلغ کا کام اپنی بات پورے اخلاص اور کوشش سے لوگوں کے کانوں تک پہنچانا ہے، کسی کو بات ماننے پر مجبور کرنا اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ بعض لوگ انبیا علیہم السلام کی بات نہیں مانتے تھے، حالانکہ وہ مبعوث من اللہ تھے۔ ہم لوگوں کی بات اگر کوئی نہیں مانتا تو افسوس و ملال کی ضرورت نہیں۔

ان کے وعظ میں عوام و خواص اور علما و طلبا کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور ان کے ارشادات عالیہ سے

[1] سوانح مولوی غلام رسول، ص ۴۸، ۴۹۔

فیض حاصل کرتے۔ بعض لوگ اعتراض و بحث کی غرض سے آتے اور اثر پذیر ہو کر واپس جاتے۔ ان کا انداز کلام نہایت شیریں اور پیارا تھا۔ وعظ میں قرآن کی آیات تلاوت کرتے، احادیث رسول ﷺ پڑھتے، ائمہ کے اقوال بیان فرماتے اور اشعار سناتے، جس سے سامعین محظوظ بھی ہوتے اور متاثر بھی۔ جو بات ان کی زبان سے نکلتی، وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ جب وعظ میں دوزخ، جنت اور قیامت کا ذکر کرتے تو سامعین پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی کہ گویا وہ ان تمام مقامات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے اور ان کی اثر پذیری کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

طلب حدیث کے لیے عزم دہلی:

کچھ عرصہ مولانا غلام رسول نے لاہور میں قیام کیا اور وعظ و نصیحت کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا۔ ان کے مواعظ و نصائح سے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور بے شمار لوگوں نے مسائل دین سیکھے اور اسلام قبول کیا۔ پھر لاہور سے امرتسر گئے اور باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے پاس ٹھہرے۔ امرتسر میں بھی وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا۔ امرتسر سے مولانا عبداللہ غزنوی کے ساتھ تحصیل علمِ حدیث کے لیے عازم دہلی ہوئے۔ امرتسر سے دہلی تک کا سفر بذریعہ یکہ آٹھ دن میں طے کیا۔ ان دنوں حضرت سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی وہاں درس حدیث دیتے تھے، مولانا غلام رسول بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور کتب حدیث پڑھنا شروع کیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی بھی ان کے شریک درس تھے۔ حضرت میاں صاحب سے مولانا غلام رسول نے سند حدیث حاصل کی۔

مولانا غلام رسول کے وعظ کی شہرت دہلی تک جا پہنچی تھی۔ جب وہاں کے لوگوں کو ان کی دہلی آمد کی اطلاع ہوئی تو وعظ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ایک دن لال قلعے سے ایک مغل شہزادہ بھی حضرت میاں نذیر حسین کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی صاحب کو وعظ کے لیے قلعے میں بھیجا جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور لال قلعہ میں مولانا نے وعظ کہا، جس میں خود سید نذیر حسین نے بھی شرکت فرمائی' اور بھی بہت سے حضرات مولانا کا وعظ سننے کے لیے قلعہ میں گئے۔ وعظ نہایت مؤثر اور دلنشین تھا۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی:

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی ابھی دہلی میں حضرت میاں صاحب کے حلقہ درس ہی میں تھے کہ ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو جنگ آزادی شروع ہو گئی، فتح کے بعد جسے انگریزوں نے ''غدر'' کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا آغاز میرٹھ سے ہوا۔ پھر یہ جنگ دہلی پہنچی اور اس کے بعد بہت جلد پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ دہلی شہر اس زمانے میں انتہائی بدامنی کی لپیٹ میں تھا اور چاروں طرف گولیاں چل رہی

تھیں۔ جس مسجد میں مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علمِ حدیث حاصل کرنے کے لیے اقامت گزیں تھے، وہاں مسلسل بندوق کی گولیاں آکر گرتیں اور مہیب آوازیں آتی تھیں۔ اس پر مولانا عبداللہ غزنوی جو مولانا غلام رسول کو عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے، ان سے حیرانی سے پوچھتے۔ ''عبداللہ! یہ کیا ہو رہا ہے [1]؟ یہ نہایت اضطراب اور گھبراہٹ کا زمانہ تھا۔ ہر شخص اپنی جان کی فکر میں تھا۔ کسی دوسرے کی خبر نہ تھی۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی اس وحشت ناک دور میں بھی نہایت اطمینان اور سکون کے عالم میں تھے اور حصول علم حدیث ہی ان کا اصل مشغلہ تھا۔ کسی اور طرف قطعاً ان کی توجہ نہ تھی۔

ایک انگریز عورت کی امداد:

ایک دن مولانا عبداللہ غزنوی نے مولانا غلام رسول سے کہا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم پر بلائے آسمانی نازل ہو رہی ہے، لہٰذا یہاں رہنے کی نسبت تمھارا اپنے گھر چلے جانا زیادہ بہتر ہے۔ جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے، تمھاری طرف سے بہت مضطرب ہوں۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ غزنوی مجھے بار بار گھر جانے کے لیے کہتے اور اس پر اصرار کرتے۔ میں انھیں جواب میں کہتا کہ اگر آپ مجھے واقعی مبتلائے مصیبت ہونے والا دیکھتے ہیں تو مجھ سے ایسی باتیں کریں، جن سے مجھے تسکین قلب اور اطمینان حاصل ہو، نہ کہ مزید گھبراہٹ میں ڈالنے کی کوشش فرمائیں۔ لیکن مولانا عبداللہ برابر اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ان کے بے حد اصرار پر وہ دہلی سے وطن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا عبداللہ غزنوی ان کو رخصت کرنے کے لیے میاں سید نذیر حسین کے مدرسے سے لاہوری دروازے کے باہر شاہدرہ تک ان کے ساتھ گئے۔ وہاں کھڑے دونوں بزرگ الوداعی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک انگریز عورت پر نظر پڑی جو سخت زخمی حالت میں تھی اور پیاس سے بلک رہی تھی، مگر کوئی اسے پانی نہ پلاتا تھا۔ انسانی ہمدردی کے پیش نظر یہ دونوں بزرگ اس عورت کے پاس آئے اور کہیں سے پانی لاکر اسے پلایا۔ اس وقت مولانا غلام رسول نے ایک عجیب فقرہ کہا جو بعد میں پیش آنے والے حالات کی روشنی میں الہامی ثابت ہوا۔ انھوں نے فرمایا:

''خبر نہیں، کب تک یہ ہندوستان غلامی میں رہے، کیوں کہ لوگ بچوں اور عورتوں پر ظلم کرنے لگ گئے ہیں جو اسلامی قانون کے خلاف ہے [2]۔

اس سے ٹھیک (۹۰) سال بعد (۱۹۴۷ء تک) یہ برصغیر انگریزوں کا غلام رہا۔ بعد ازاں پاکستان اور

---

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص ۶۰۔

[2] سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۵۹۔

ہندوستان کے نام سے دو مملکتیں معرض قیام میں آئیں۔

۱۸۵۷ء کا دور کچھ ایسا ہنگامہ خیز تھا کہ کسی انگریز سے اظہار ہمدردی کرنا اپنے آپ کو مصیبت کے منہ میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اگرچہ وہ انگریز بوڑھا ہو، مظلوم ہو، بیمار ہو، مرد ہو، عورت ہو، بچہ ہو، کوئی ہو، اس کی امداد کرنا نہایت مشکل تھا۔ حالاں کہ اسلام کی رو سے ایسے لوگوں کی امداد کرنا اور ان کو ظلم و زیادتی سے بچانا ضروری ہے۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس انگریز عورت کی مدد کی۔ اس کو کسی صورت میں مردانہ لباس پہنایا اور مسجد کے حجرے میں لے آئے۔ رات کو کچھ لوگوں کو شبہ ہوا تو وہ مسجد میں تلاشی کے لیے آئے۔ انھوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ کوئی مسافر مریض ہے جو حجرے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس پر وہ لوگ واپس چلے گئے۔

مولانا غلام رسول نے اب وطن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس عورت کے علاج اور خدمت میں مصروف ہو گئے۔ چند روز میں وہ صحت یاب ہو گئی تو پتا چلا کہ وہ ایک انگریز کرنل کی بیوی ہے۔ اسے کسی طرح اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ اب عورت نے مولانا غلام رسول کو اپنی طرف سے خط لکھ کر دینا چاہا کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ لیکن مولانا نے خط لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم نے یہ کام صرف رضائے الٰہی اور انسانی ہمدردی کے لیے کیا ہے۔ اللہ ہی اس کا صلہ دے گا۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو جائے، اس صورت میں یہ خط آپ کے کام آئے گا اور اگر انگریزی حکومت سے کسی نے آپ کی شکایت کی تو بھی متعلقہ لوگوں کو یہ خط دکھایا جا سکتا ہے، لیکن مولانا نہیں مانے۔ فرمایا ہم درویش آدمی ہیں، کوئی ہماری شکایت کیوں کرے گا اور ہمیں تکلیف پہنچا کر اسے کیا ملے گا۔

وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری:

اس انگریز عورت کی صحت یابی کے بعد اسے گھر پہنچایا اور پھر اس سے کئی دن بعد وطن کو روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں کسی نے حکومت سے شکایت کر دی کہ ''انگریزوں کے خلاف جو کچھ ہوا ہے اس میں مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کا بھی ہاتھ ہے اور یہ اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف سازش میں شریک تھے۔'' یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے بغاوت کو کچل دیا تھا اور ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر گرفتار کر کے انھیں سنگین سزائیں دی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پھانسیاں نصب تھیں اور جس پر کوئی ذرا سا شبہ ہوتا اسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا مولویوں سے حکومت بالخصوص بدظن تھی اور جن مولویوں پر وہابی کے لفظ کا اطلاق ہوتا تھا' انھیں بے حد ہدف ستم ٹھہرایا جاتا۔ اتفاق سے مولانا غلام رسول اسی زمرے میں شامل تھے اور انھیں وہابی کہا جاتا تھا۔ انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے بے شمار ہندوستانی اور بہت سے علمائے کرام گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ وہ دہلی سے چلے اور ادھر ادھر کے چکر کاٹتے

ہوئے امرتسر پہنچے۔ دو دن حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں رہے۔ وہیں انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی گرفتاری کے لیے حکومت نے اشتہار جاری کر دیا ہے یعنی پولیس کی اصطلاح میں انھیں ''اشتہاری مجرم'' قرار دے دیا گیا ہے۔ امرتسر میں دو دن قیام کے بعد اپنے سسرال فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور) گئے۔ ان کے سسر مولوی عبدالحق زندہ تھے اور مولانا کی گرفتاری سے متعلق اشتہار کا واقعہ ان کے علم میں آچکا تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ حکومت کے جاسوس اور ملازم مولانا کے رشتہ داروں اور واقفوں کے گھروں میں جا جا کر ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کا ڈپٹی کمشنر انگریز تھا جو اس قدر بدحواس ہوگیا تھا کہ جس شخص کے بارے میں فساد میں ملوث ہونے کی ذرا سی بھنک اس کے کان میں پڑتی اسے بلا تحقیق گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ عبدالحق اس صورت حال سے سخت پریشان تھے اور تمام دن دروازے پر بیٹھے رہتے تاکہ کسی کو پتا نہ چل جائے کہ مولانا غلام رسول ان کے گھر میں موجود ہیں۔

فتح گڑھ چوڑیاں کا ایک مشہور رئیس دیوان نرنجن داس تھا۔ وہاں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے، سرکار دربار میں بھی اچھی حیثیت رکھتا تھا اور حسن اتفاق سے مولوی عبدالحق کا شاگرد تھا اور ان کو انتہائی لائق احترام گردانتا تھا۔ ایک دن کچھ سرکاری لوگ دیوان نرنجن داس کے پاس پہنچے، اس کو مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری دکھائے اور ان کی گرفتاری کے لیے اس سے طالب امداد ہوئے۔ دیوان صاحب نے خفیہ طور پر اس کی اطلاع مولوی عبدالحق کو دی اور پیغام بھجوایا کہ اگر مولانا غلام رسول یہیں ہیں تو ان کو علی الصبح ان کے وطن (قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجراں والا) روانہ کر دیں۔ ان کا اپنے علاقے میں چلے جانا ہی مناسب ہے۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں کے لوگ ان کے حالات و معاملات سے ہماری نسبت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور خطرے کی صورت میں وہ ان کی اچھے طریقے سے مدد کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے وہاں کوئی ایسا حاکم ہو جو محض شبہے کی بنا پر پکڑنا مناسب نہ سمجھتا ہو، لوگوں کی شہادتیں اور بیان لینا بھی ضروری قرار دیتا ہو اور اسی کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔

دیوان نرنجن داس کی یہ بات بالکل صحیح اور ہمدردانہ تھی، چنانچہ مولانا فتح گڑھ چوڑیاں سے چلے اور اپنے وطن قلعہ میہاں سنگھ پہنچ گئے۔

گرفتاری:

یہاں ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے مولانا کو باہر نکلنے اور گھر ہی میں چھپے رہنے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے فرمایا چھپ چھپا کر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ میں اللہ کی رضا اور قضا پر راضی ہوں۔ حاکم وقت آخر میرا بیان بھی تو لے گا اور معاملے کی تحقیق بھی کرے گا۔ یوں ہی کسی کی شکایت پر تو پھانسی نہیں دے دے گا۔ آپ مجھے باہر نکلنے سے منع نہ کریں[1]۔

[1] سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۶۲۔

مولانا کا جواب سن کر حکیم صاحب مسجد میں چلے گئے۔ دیکھا تو مسجد میں ایک نووارد مسافر بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے اسے اجنبی سمجھ کر کھانے کے متعلق پوچھا، اس نے انکار کیا اور کھانا نہیں کھایا۔ اس کی شکل و شباہت سے حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی انگریز ہے جو بھیس بدل کر اور دیسی لباس پہن کر یہاں آیا ہے۔ وہ اسی وقت گھر گئے اور مولانا غلام رسول کو اس نووارد کے بارے میں بتایا۔ مولانا نماز کے لیے مسجد میں آئے تو وہ شخص ان کو دیکھتے ہی باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد پولیس کپتان اور اس کے ساتھ بہت سے پولیس والے مسجد میں آ گھسے۔ وہ نووارد مسافر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آتے ہی مولانا کو گرفتار کر لیا اور انھیں پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئے۔

اس پر گاؤں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور لوگوں نے پولیس والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور اندیشہ تھا کہ پولیس تمام گاؤں پر سختی کا برتاؤ کرے گی۔ مولانا نے جو پولیس کی حراست میں تھے بلند آواز سے لوگوں سے کہا کہ وہ پولیس کی کارروائی میں مزاحم نہ ہوں۔ اس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، سب لوگ آرام سے اپنے گھروں کو چلے جائیں، اگر مزاحمت کی گئی تو آپ لوگوں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا اور خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر امن و امان قائم رہا تو میں ان شاءاللہ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ مولانا کی یہ باتیں سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے اور پولیس مولانا کو پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئی۔ اس وقت تین آدمی ان کے ساتھ تھے۔ بڑے بھائی حکیم غلام محمد، پھوپھی زاد بھائی مولوی بدرالدین اور گوجراں والا کے مولوی علاءالدین جوان کے شاگرد تھے۔

میہاں سنگھ کی بہو کا نام "سکھدیئی" تھا۔ خود سکھدیئی اور اس کے خاندان کے لوگ مولانا کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ یہ مولانا کی گرفتاری سے بہت پریشان ہوئی۔ اس زمانے میں ایمن آباد (گوجراں والا) کا دیوان جوالا سہا مہاراجا جموں کشمیر کا وزیر تھا۔ وہ اتفاقاً چند روز پیشتر جموں سے ایمن آباد آیا تھا اور پولیس اور فوج کے کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سکھدیئی نے اس کو مولانا کی گرفتاری کی اطلاع دی اور ان کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کو کہا۔ وہ بھی مولانا کا بہت احترام کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کر کے مولانا کو اور اس پولیس کو جس نے انھیں گرفتار کیا تھا اپنے یہاں ایمن آباد بلا لیا اور پولیس سے کہا کہ مولانا کا تعلق چونکہ گوجراں والا سے ہے اور اسی علاقے میں انھیں گرفتار کیا گیا ہے' لہٰذا ان پر گوجراں والا ہی میں مقدمہ چلایا جائے، لاہور یا کسی دوسری جگہ انھیں نہ لے جایا جائے۔ اب پولیس والے مولانا کو دیوان جوالا سہا کے پاس چھوڑ گئے اور دیوان صاحب مولانا کو گوجراں والا لے گئے۔ دیوان صاحب کا مقصد یہ تھا کہ گوجراں والا کے لوگ مولانا کو جانتے اور قابل احترام گردانتے ہیں، اس لیے ضلعی حکام ان سے کسی قسم کی سختی کا برتاؤ نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ گوجراں والا کی ضلعی انتظامیہ نے مولانا کو لاہور پہنچا دیا اور کہا کہ یہ کیس فنانشل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی اس کی سماعت کریں گے۔

اللہ کی ضمانت پر رہائی:

لاہور میں ان کو فنانشنل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ انھیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور کرسی پر بٹھایا۔ بیان لینے کے بعد حسب قاعدہ انھیں حوالات میں بھیج دیا گیا۔ لاہور ان کے لیے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ یہاں کے بہت سے لوگ ان کے حلقہ عقیدت میں شامل تھے۔ انھیں گرفتاری کا پتا چلا تو فنانشنل کمشنر صاحب کے دفتر کے سامنے آ بیٹھے۔ فنانشنل کمشنر کو مختلف ذرائع سے مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انھیں دوبارہ عدالت میں طلب کیا اور کہا۔

''آپ کا کوئی ضامن ہے تاکہ آپ کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔''؟

فرمایا ''ہاں!''

پوچھا ''کون''؟

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ''میرا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔''

اس پر مسل خواں اور دیگر اہل کار جو وہاں موجود تھے، مسکرائے، لیکن فنانشنل کمشنر کے دل پر اس کا بے حد اثر ہوا، اور کہا۔

''اچھا تو ہم آپ کو اسی کی ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔'' اس کے بعد انھیں رہا کر دیا [1]۔

دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی بندش:

۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ نہایت نازک اور پر آشوب تھا۔ انگریزی حکومت اس قدر حساس ہوگئی تھی کہ ذرا سی شکایت اور شبہے پر بڑے سے بڑے آدمی کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتی۔ علمائے کرام کو بالخصوص نشانۂ ستم بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ ملک میں بغاوت پھیلانے کا ذمے دار یہی گروہ ہے۔ مولانا غلام رسول کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے حکومت کے کان بھرنا شروع کر دیے اور کہا گیا کہ یہ شخص وہابی ہے اور انگریزی حکومت کا مخالف ہے۔ اس وقت وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی لیے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا کو ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کافی عرصہ نظر بند رہے۔ نہ کہیں جانے کی اجازت تھی نہ وعظ و نصیحت کی۔

اس کے بعد حالات معمول پر آئے تو نظر بندی بھی ختم کر دی گئی اور وعظ و نصیحت کی اجازت بھی دے دی گئی۔

حج بیت اللہ اور سند علم حدیث:

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علمِ حدیث پڑھنے کے لیے میاں

---

[1] سوانح مولوی غلام رسول، ص ۶۶۔

سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی گئے تو ان کے قیام دہلی ہی کے زمانے میں رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت ہوگئی تھی، جس میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مولانا غلام رسول کو حضرت میاں صاحب نے جو سند عطا کی اس میں مرقوم ہے کہ انھوں نے ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء میں ان سے کچھ حصہ صحیح بخاری کا اور صحیح مسلم کا مقدمہ پڑھا۔ لکھا ہے کہ مولوی عبداللہ المعروف غلام رسول نہایت ذہین وطباع، بے حد نیک اور بلند اخلاق و عالی کردار شخص ہیں۔ میاں صاحب نے ان کو صحاح ستہ اور تمام کتب حدیث پڑھانے کی اجازت دی اور تلقین فرمائی۔ یہ سند ماہ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ/ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو تحریر فرمائی گئی، یعنی سال تعلیم سے چھ سال بعد اس کا اجرا ہوا۔

اس سے تقریباً دس سال بعد ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۲ء کو مولانا غلام رسول حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغنی مجددی کا سلسلۂ درس جاری تھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ حضرت میاں نذیر حسین صاحب کی طرح مولانا عبدالغنی مجددی بھی حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد تھے اور ہندوستان اور دیار عرب کے بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور علم حدیث پڑھا تھا۔ مولانا غلام رسول نے بھی مدینہ منورہ جا کر ان سے تفسیر، حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی سند حاصل کی [1]۔

حج بیت اللہ کو روانگی کے وقت مولانا غلام رسول کی عمر ۵۶ برس تھی۔ پانچ افراد اور تھے جو ان کے ہم رکاب تھے۔ یہ کل چھ افراد کا قافلہ تھا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ خود مولانا غلام رسول۔

۲۔ ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد۔

۳۔ بڑی صاحب زادی۔

۴۔ مولانا کے داماد مولوی محمد عثمان

۵۔ ایک طالب علم محمد قاسم۔

۶۔ چودھری حاکم سکنہ لدھے والا وڑائچ ضلع گوجراں والا۔

چودھری حاکم جہاز ہی میں بیمار پڑ گئے تھے۔ دس دن بیمار رہے اور جہاز ہی میں وفات پا گئے۔ ان کے ایام بیماری میں مولانا غلام رسول نے ان کی بہت خدمت کی۔ وفات کے وقت انھوں نے اپنا تمام سامان مولانا کے سپرد کر دیا تھا اور اختیار دے دیا تھا کہ جسے چاہیں اللہ کی راہ میں دے دیں۔ لیکن مولانا ان کا سامان واپس لائے اور ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا۔

[1] میاں سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبدالغنی مجددی کی یہ دونوں اسناد جو انھوں نے مولانا غلام رسول کو دیں۔ ''سوانح حیات مولوی غلام رسول'' کے صفحہ ۳۵، ۳۶ اور ۳۷ پر درج ہیں۔

اپنے وطن سے چل کر مولانا اور ان کے ساتھی پہلے مکہ معظمہ گئے اور سعادت حج حاصل کی، بعد کو عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جہاز میں بھی جاری رہا اور حرمین شریفین میں بھی۔! بلکہ حرمین شریفین میں اس میں اور تیزی آگئی تھی۔

سلسلہ تدریس اور چند شاگرد:

مولانا غلام رسول تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق و فلسفہ وغیرہ علوم مروّجہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اور قلعہ میہاں سنگھ میں ان کا باقاعدہ سلسلہ تدریس جاری تھا۔ بیس سے لے کر تیس ایسے طالب علم ہمیشہ ان کے درس میں موجود رہتے جن کا تعلق گاؤں سے باہر کے علاقوں اور دور کے قصبات و دیہات سے تھا۔ ان طلبا کی کفالت خود مولانا ہی کرتے اور ان کے خورونوش کے انتظامات انہی کے ذمے تھے۔ مقامی لوگ اور قرب و جوار کے بھی بہت سے حضرات ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں نے اپنے علاقوں میں بہت کام کیا۔ ہمیشہ خدمت علم میں مصروف رہے اور اپنے دور کی اہم شخصیتوں میں ان کا شمار ہوا۔ مولانا کے سوانح نگار نے ان کے متعدد تلامذہ اور فیض یافتگان میں سے مختلف علاقوں کے بائیس افراد کی ایک فہرست درج کی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کے نام انھیں یاد رہ گئے ہیں اور جو علم و عمل میں خاص شہرت کے حامل ہیں:۔

(۱) مولانا علاء الدین گوجراں والا (۲) مولوی محمد عظیم اللہ موضع بربن ضلع میر پور (۳) مولوی محمد عثمان سکنہ فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداس پور (۴) مولوی محمد موضع بکن ضلع گوجراں والا (۵) مولوی قطب الدین ضلع فیروز پور (۶) مولوی محمد علی میر واعظ سکنہ بوپڑ ضلع گوجراں والا (۷) مولوی محمود شاہ واعظ سکنہ ڈھینڈہ ضلع ہزارہ (۸) مولوی بدرالدین سیالکوٹ (۹) مولوی بدرالدین ساکن گلوالہ ضلع گوجراں والا (۱۰) مولوی احمد علی کوٹ بھوانی داس ضلع گوجراں والا (۱۱) مولوی شمس الدین جموں کشمیر (۱۲) حافظ کرم الدین جموں کشمیر (۱۳) حافظ ولی اللہ لاہور (۱۴) مولوی عبدالعزیز ناظم انجمن اہل حدیث لاہور و بانی انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۵) حافظ گوہر دین سکنہ نوکھر ضلع گوجراں والا (۱۶) حافظ غلام محمد سدھا کمبوہ ضلع شاہ پور (۱۷) مولوی برہان الدین جہلم (۱۸) مولوی محمد نعمان جہلم (۱۹) مولوی نور احمد سکنہ کمائی ضلع جہلم (۲۰) مولوی نور احمد چنیوٹ (۲۱) مولوی غلام حسین سکنہ ساہو والا چیمہ ضلع سیالکوٹ (۲۲) مولوی عمرالدین گوجرہ ضلع لائل پور۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مولانا غلام رسول سے مستفید ہوئے اور جنھوں نے اپنے عہد اور علاقے میں دینی و علمی خدمات سرانجام دیں اور عمل و کردار کی وہ روشنی پھیلائی جو عالی قدر استاذ کے فیض صحبت سے انھیں حاصل ہوئی تھی۔

نقطہ نظر کی اصابت:

اختلافی اور نزاعی مسائل کے اظہار و تبیین میں مولانا کا نقطہ نظر انتہائی اصابت فکر کا عکاس اور ذہنی سلجھاؤ کا غماز تھا۔ بعض لوگ دوران درس یا اثنائے وعظ میں ان سے اس انداز سے اختلافی مسائل پوچھتے کہ جس سے ان کا مقصد دو فرقوں میں باہم تصادم پیدا کرنا اور ایک دوسرے سے الجھانا ہوتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قابلیت اور صحت دماغی سے نوازا تھا کہ سائل کو ایسا جواب دیتے جس سے وہ قطعاً خاموش ہو جاتا اور اپنے مقصد فساد و شر میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ ایک مرتبہ وعظ کہہ رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ مقلد اور غیر مقلد کے بارے میں فرمائیے کہ دونوں میں سے حق پر کون ہے؟

مولانا نے اس کا نہایت عمدہ جواب دیا۔ فرمایا: یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے تالاب کی ہے، جس سے پانی کی چار نالیاں نکلتی ہیں۔ جو شخص جس نالی سے بھی پانی پیئے گا وہ تالاب ہی کا پانی ہوگا، اور جو شخص براہ راست تالاب سے پیئے گا وہ بھی وہی پانی ہوگا۔ یہی حال مقلد اور غیر مقلد کا ہے۔ کسی نے بعض مسائل میں براہِ راست حدیث رسول ﷺ پر عمل کر لیا اور کسی نے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی وساطت سے عمل کر لیا، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ دل کی تہہ میں یہ حقیقت راسخ رہنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے مقابلے میں کسی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی یہ فرمان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد و عمل سے ان کا قول یا فعل متصادم ہو تو اس کو بالکل نہ مانا جائے۔

مولانا نے فرمایا: فقہی مسائل بیان کرتے وقت لوگوں میں تفریق پیدا کرنی اور ناحق کسی کی تکفیر کرنی بہت بڑی معصیت ہے۔ فرمایا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ جب حضرت موسیٰ تورات لینے کے لیے اللہ کے حکم سے کوہِ طور پر گئے تو بعد میں بنی اسرائیل نے سامری کی شرارت میں آکر بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو صورت حال دیکھ کر بھائی پر خفگی کا اظہار کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے خاموشی اختیار کی کہ:

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ ۔ (طٰہٰ:۹۴)

(مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈال دی۔)

یعنی پیغمبر بھی معصیت تفرقہ کے ارتکاب سے ڈرتے تھے۔

مولانا وعظ میں منفی انداز اختیار کر کے کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے، مثبت انداز میں وعظ فرماتے۔ نہ خواہ مخواہ کسی کی تکفیر فرماتے اور نہ ایسی بات زبان سے نکالتے جو مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کا باعث بنتی ہو۔ وہ صاف ستھرے انداز میں مسائل بیان کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہزاروں لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے آتے اور گناہوں سے تائب ہوتے۔ غیر مذہب کے لوگ بھی کثیر تعداد میں ان کی باتوں سے متاثر ہوتے اور کفر کو ترک کر کے اسلام قبول کرتے۔

مکتوبات:

مولانا غلام رسول کے مکتوبات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق یہ تمام مکتوبات فارسی زبان میں ہیں۔ مولانا فارسی کے شاعر تھے۔ چنانچہ بعض مکتوب فارسی نظم میں ہیں۔ بعض مکتوب مولانا عبداللہ غزنوی کے نام ہیں، بعض اپنے شاگردوں مثلاً مولانا علاء الدین گوجراں والا اور حکیم نبی بخش وغیرہ کے نام ہیں۔ بعض اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ اور بعض ارادت مند حضرات کے نام مرقوم ہیں۔ ایک خط ایک ہندو کو لکھا گیا ہے جس کا نام رام دتہ ٹانڈو تھا اور حافظ آباد کا رہنے والا تھا۔ یہ خط بھی فارسی میں ہے اور اس کے ایک مذہبی استفسار کے جواب میں ہے۔ یہ ایک تفصیلی خط ہے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور ان کے مذہبی افکار و تصورات سے باخبر تھے۔

یہ مکتوبات مختلف مسائل اور نصائح پر مشتمل ہیں۔ بعض میں فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں، بعض میں تصوف و سلوک کے نکات حل کیے گئے ہیں اور بعض میں اختلافی معاملات کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

قبولیت دعا اور تقرب الٰہی:

مولانا غلام رسول بے شمار خصوصیات کے حامل اور بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اللہ کے مقرب اور ولی تھے۔ ان کی زبان میں بے پناہ اثر تھا اور اللہ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا تھا۔ اس سلسلے میں ان سطور کے راقم نے بہت سی باتیں متعدد ثقہ لوگوں سے سنی ہیں اور ان کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر نے بھی (جو ان کے بڑے صاحب زادے تھے) تہتر (۷۳) واقعات درج کیے ہیں، جو نہایت عجیب و غریب ہیں۔ قبولیت دعا اور تقرب الٰہی سے متعلق چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ موضع ستراہ سندھواں ضلع سیالکوٹ کے ایک شخص کا نام ''عمرا'' تھا جو کمھار برادری سے تعلق رکھتا تھا اور کثیر العیال تھا لیکن آمدنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر تنگ دستی اور غربت کا شکار رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ وہاں مولانا غلام رسول تشریف لے گئے۔ عمرا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تنگیٔ معاش کا ذکر کیا۔ مولانا نے فرمایا: ''یاحی یاقیوم برحمتك استغیث'' کثرت سے بلا تعداد پڑھا کرو، وضو ہو یا نہ ہو اس کی کوئی شرط نہیں، لیکن اس کے معنوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے (یعنی اے اللہ! جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، میں تیری رحمت سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں) اگر ایسا کرو گے تو اللہ فضل کرے گا۔

اس نے اس پر عمل کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں مال دار ہو گیا۔ موضع ستراہ میں اچھی خاصی زمین

بھی خرید لی ❶۔

۲۔ سلیمان ایک بنگالی طالب علم تھا جو تمام عمر مولانا کی خدمت میں رہا' ان کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف چلا گیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد ایک شخص شیخ غلام حسین بھیروی کے دو ہزار روپے کے مقروض تھے۔ وہ قرض جلدی ادا نہ کر سکے تو شیخ غلام حسین نے دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی اور حکیم غلام محمد کو عدالت نے جیل بھجوا دیا۔ مولانا غلام رسول اس وقت گاؤں میں موجود نہ تھے۔ اسی روز عصر کے قریب تشریف لائے اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق پہلے مسجد میں آئے۔ حکیم صاحب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہیں۔ سلیمان بنگالی نے تمام واقعہ بیان کیا۔ مولانا کو اس سے نہایت ذہنی کوفت ہوئی۔ نماز عصر سے فارغ ہوئے تو سلیمان سے کہا "پانی کا ایک لوٹا بھر لو اور میرے ساتھ آؤ۔" گاؤں سے کچھ دور جا کر اپنے گرد ایک حصار کھینچا۔ اسی میں وضو کیا' قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ سلیمان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف سے سفید لباس میں ملبوس ایک شخص آیا اور اس نے مولانا کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ مولانا نے فرمایا: "مجھے دو ہزار کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا "ہزار روپیہ دینے والے نے کہا ہے کہ باقی روپے (قرض خواہ) چھوڑ دے گا۔" مولانا ممدوح اسی وقت وہاں سے اٹھے اور شیخ غلام حسین کو تلاش کر کے ہزار روپیہ دیا اور فرمایا "باقی روپے میں جلد ہی ادا کر دوں گا۔" شیخ غلام حسین نے ایک ہزار روپیہ وصول کیا اور باقی ہزار چھوڑ دیا۔ مولانا گئے اور حکیم صاحب کو جیل سے رہا کرا کے گھر لے آئے۔

۳۔ علاقہ شاہ پور کے موضع سدرہ میں ایک بزرگ حافظ غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں کے قریب ایک گاؤں "کوٹلی" ہے۔ کوٹلی کا ایک زمیندار لاولد تھا۔ وہ اپنی بیوی اور انہی

❶ اس دعا کے بارے میں راقم الحروف بھی اپنا ایک ذاتی واقعہ اور تجربہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ میں ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں میں نے اپنا ایک سہ روزہ اخبار "منہاج" جاری کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک میں ایوب خان نے مارشل لا جاری کر دیا اور نیوز پرنٹ کنٹرول میں آ گیا۔ "منہاج" چوں کہ نیا نیا جاری ہوا تھا اس لیے اسے کنٹرول ریٹ میں اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا۔ اخباری کاغذ پرانے اخباروں کو ملتا تھا۔ میں نے یہ اخبار تنگ آ کر اپریل ۱۹۵۹ء میں بند کر دیا۔ حساب کیا تو میں تین ہزار روپے کا مقروض تھا۔ "الاعتصام" سے مجھے اس زمانے میں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور یہ قرض جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی' ادا کرنا نہایت مشکل تھا۔ میں نے مولانا محمد علی لکھوی مرحوم کو جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے' خط لکھا اور دعا کے لیے درخواست کی۔ انھوں نے فوراً جواب دیا اور یہی وظیفہ اسی طرح بتایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور چند ماہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں قرض سے سبک دوش ہو گیا اور تمام مالی تکلیفیں ختم ہو گئیں۔

حافظ غلام محمد کے ساتھ مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ''اللہ سے دعا کریں وہ مجھے اولاد عطا فرمائے۔'' مولانا نے اسی مجلس میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے' دعا کے بعد فرمایا: ''شاید اللہ تعالیٰ تمھیں لڑکی عطا کرے گا۔'' چنانچہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے لڑکی عطا فرمائی۔

۴۔ مولانا غلام رسول کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ قلعہ میہاں سنگھ میں ایک حافظ قرآن لڑکوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ان کے چہرے پر چنبل ہو گیا۔ بہت علاج کرایا' لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ایک دن انھوں نے مولانا سے عرض کیا تو آپ نے دیکھ کر دریافت فرمایا ''کوئی علاج نہیں کرایا۔؟'' کہا ''بہت علاج کرائے' سال بھر سے علاج کرا رہا ہوں مگر بجائے فائدے کے مرض بڑھ گیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے' اب خدائی علاج چاہتا ہوں۔'' مولانا نے اسی وقت دم کیا اور فرمایا'' متواتر تین دن دم کراؤ''۔حافظ صاحب نے مولانا کے فرمان کے مطابق تین دم کرایا اور بالکل صحت یاب ہو گئے۔

۵۔ قلعہ میہاں سنگھ کے حاجی کرم الٰہی کا بیان ہے کہ ان کی شادی کے موقعے پر ان کی والدہ کا زیور گم ہو گیا۔ جہاں رکھا تھا' بار بار وہاں دیکھا۔اور جگہوں میں بھی دیکھا مگر نہ ملا۔حاجی صاحب ممدوح کی والدہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور زیور کی گم شدگی کا ذکر کیا۔آپ نے فرمایا'' جہاں رکھا تھا وہیں پڑا ہے۔'' چنانچہ جا کر دیکھا تو وہیں پڑا تھا۔

۶۔ ضلع سیالکوٹ کے موضع ستراہ سندھواں کے چودھری محمود خان بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔مولانا ایک مرتبہ وہاں تشریف لے گئے تو اس نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی مالی کمزوری کا ذکر کیا۔فرمایا ''اللہ الصمد ہر روز بلا تعداد پڑھا کرو اور نماز تہجد بھی باقاعدہ پڑھا کرو۔'' چودھری محمود خاں کا بیان ہے کہ اس نے اس پر عمل کیا اور چند ہی روز میں مال دار ہو گیا۔یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اتنی دولت کہاں سے آ گئی۔مولانا نے تہجد پڑھنے کا حکم دیا تھا' نماز تہجد بھی بالالتزام پڑھنے لگا۔چودھری محمود خاں کا کہنا ہے کہ اگر کسی دن عمداً سو بھی جاؤں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تہجد کے لیے مجھے خود جگا رہے ہیں۔

۷۔ قلعہ میہاں سنگھ کا ایک درزی امام الدین کہتا ہے کہ وہ بالکل کند ذہن اور ان پڑھ تھا۔اس کا بڑا بھائی عبداللہ ایک دن اسے مولانا کے پاس لے گیا اور اس کا حال بیان کیا۔آپ نے فرمایا'' لوٹے میں تھوڑا سا پانی لاؤ''۔پانی لایا گیا تو آپ نے اس پر دم کیا اور فرمایا'' لو امام الدین اس کو پی جاؤ' تم تھوڑا بہت حساب کتاب سیکھ جاؤ گے''۔امام الدین کہتا ہے کہ اللہ کے فضل اور مولانا کی دعا سے اسی دن سے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ حساب کتاب بھی کر لیتا ہوں اور معمولی خط و کتابت بھی کر سکتا ہوں۔

۸۔ ایک شخص ملا کرم داد جو ملتان میں دکان دار تھا کہتا ہے کہ میرا والد مولانا کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ ہم مختلف مقامات پر مالِ تجارت لینے جاتے ہیں تو راستے میں چوری وغیرہ ہو جاتی ہے' کوئی وظیفہ بتا دیجیے تاکہ ہمارا مال محفوظ رہے۔ فرمایا "تم جہاں رات کو ٹھہرو' اپنے مال کے گرد ایک سو مرتبہ "یا محیط" پڑھ لیا کرو۔" وہ کہتا ہے کہ ہم یہ عمل کرتے رہے اور ہمیشہ سلامتی کے ساتھ مال لے کر گھر پہنچتے رہے' ہمارا کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا' جب کہ ہمارے ساتھیوں کا کئی دفعہ نقصان ہوا۔

۹۔ موضع کوٹلی سنگھ بھرڑاں (ضلع گوجراں والا) کے ایک زمیندار "بلندا" کا بیان ہے کہ اس کا بھائی علی گوہر ایک مدت تک بخار میں مبتلا رہا۔ اطبا نے تشخیص کی کہ اسے دق اور سل کی بیماری ہو گئی ہے۔ طبی علاج سے ناامید ہو کر وارث اس کو مولانا کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ طبیب اس کو مدقوق اور مسلول قرار دیتے ہیں۔ فرمایا "طبیبوں نے تشخیص میں غلطی کی ہے۔ اسے معمولی سا بخار ہے۔" اس کے بعد پانی دم کر کے اسے پلایا اور اسی روز بخار اتر گیا اور مریض اچھا بھلا ہو گیا۔

۱۰۔ بعض ہندو یا سکھ اپنے بچوں کو سودا وغیرہ لینے کے لیے اگر کسی ایسی دکان پر بھیجتے جو مولانا کی مسجد کی طرف ہوتی تو انھیں تاکید کرتے کہ مسجد کے قریب سے "دا بگر دوا بگر دیا رام رام کرتے جانا اور جلدی سے نکل جانا۔" ایک دن ایک ہندو لڑکی والدین کی ہدایت کے مطابق بھاگتی ہوئی جا رہی تھی اور رام رام کا لفظ اس کی زبان پر تھا۔ مولانا کے پاس سے گزری تو فرمایا "یا اللہ یا اللہ کہو۔ یہ کیسا پیارا لفظ ہے"۔ چنانچہ "یا اللہ یا اللہ" کے الفاظ اس کی زبان سے جاری ہو گئے اور یہی الفاظ ادا کرتی ہوئی گھر پہنچی۔ والدین بے حد پریشان ہوئے اور اسے بار بار کہا کہ "رام رام" کہو' مگر لڑکی مسلسل "یا اللہ یا اللہ" کہتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی گھر والوں سے کہتی تھی کہ تم بھی "یا اللہ یا اللہ" کہو' یہ بڑا پیارا لفظ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور سب کی زبان سے "یا اللہ یا اللہ" کے الفاظ ادا ہونے لگے۔

۱۱۔ گجرات کا ایک موچی لاہور میں اپنا کوئی کام کاج کرتا تھا۔ اتفاقاً مولانا لاہور تشریف لائے اور وعظ فرمایا۔ وعظ میں مولانا نے حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں حضرت یحییٰ کی پیدائش کا قصہ بیان کیا۔ اس وقت گجرات کا موچی بھی موجود تھا' وہ دورانِ وعظ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا "حضرت! اب بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ فرمایا: "ہاں اب بھی اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے"۔ موچی نے کہا "تو میرا حال بعینہ حضرت زکریا علیہ السلام کا سا ہے۔ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں' شاید آپ کی دعا کی برکت سے میرے گھر لڑکا پیدا ہو جائے۔" آپ نے دعا فرمائی' اور لوگوں نے آمین آمین کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو لڑکا عطا فرمایا۔ اس نے مولانا کو اطلاع دی تو آپ نے اس کا نام "اللہ دتا" رکھا۔ وہ لڑکا حافظ قرآن ہوا۔

۱۲۔ ایک دن مولانا لاہور میں کہیں وعظ فرما رہے تھے۔ دو گورے عیسائی‘ کچھ سکھ اور چند ہندو بھی وعظ میں موجود تھے۔ وعظ میں سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں‘ اور بادشاہ ہرقل کے دربار میں قریش مکہ کی سفارت کا ذکر کیا۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہرقل نے جس انداز سے بات کی اور کلمہ شہادت سنا‘ وہ بتایا تو ساتھ ہی اس طرح زوردار اور پرکشش آواز میں کلمہ شہادت پڑھا کہ سننے والوں میں ایک تہلکہ بپا ہوگیا اور ہندو‘ مسلمان‘ گورے عیسائی اور سکھ شدت تاثر سے تڑپنے لگے۔ اس وعظ میں جتنے بھی غیر مسلم موجود تھے‘ سب مسلمان ہوگئے۔

۱۳۔ لاہور ہی کا واقعہ ہے کہ آپ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وضو کرنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سکھ عورت ''داہگرو داہگرو'' کہتی ہوئی وہاں سے گزری۔ آپ نے فرمایا ''وحدہ وحدہ'' کہو۔ اس عورت کی زبان پر ''وحدہ وحدہ'' جاری ہوگیا۔ گھر والوں نے اسے بہت سمجھایا اور مار پیٹ بھی کی‘ مگر وہ باز نہ آئی اور مسلمان ہوگئی۔

۱۴۔ ایک مرتبہ مولانا ضلع گجرات میں سفر کر رہے تھے کہ ایک سکھ نے آپ سے پوچھا ''موضع ڈنگہ کا راستہ کون سا ہے۔''؟ فرمایا ''بھائی مجھے ڈنگوں کا راستہ تو یاد نہیں‘ البتہ سیدھوں کا یاد ہے۔'' اس نے کہا ''سیدھوں ہی کا بتا دو۔'' فرمایا سیدھوں کا راستہ لا الہ الا اللہ ہے۔'' اُدھر مولانا کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور ادھر سکھ کی زبان پر یہی کلمہ جاری ہوگیا اور اس نے اسلام قبول کرلیا۔

۱۵۔ موضع دلاور چیمہ (ضلع گوجراں والا) کے ایک بڑے زمیندار اور دولت مند سکھ کا نوجوان بیٹا مولانا کا وعظ سن کر مسلمان ہوگیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سکھ نے دلاور چیمہ اور علی پور میں اعلان کرا دیا کہ کوئی پنڈت یا گرنتھی قلعہ میہاں سنگھ والے مولوی صاحب سے بحث کر کے ان کو شکست دے دے اور میرے بیٹے کو دوبارہ سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر لے تو میں اس کو کوئی ایکڑ زمین اور پانچ سو روپے نقد انعام دوں گا۔ علی پور کے ایک پنڈت نے یہ اعلان سنا تو لالچ میں آکر مولانا سے بحث کے لیے تیار ہوگیا۔ سکھ زمیندار نے پانچ سو روپے نقد جمع کرا دیے۔ اس کے لیے دستاویز لکھ دی اور پنڈت کو ساتھ لے کر قلعہ میہاں سنگھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بہت سے اور لوگ بھی جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی‘ بحث سننے اور نتیجہ معلوم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ چل پڑے۔ یہ لوگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے تو مولانا غلام رسول اپنے بالا خانے پر تشریف فرما تھے اور ایک طالب علم کو شیخ سعدی کی مشہور کتاب بوستاں کا وہ سبق پڑھا رہے تھے‘ جس میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پنڈت نے آتے ہی مولانا سے ایک سوال کیا۔ آپ نے فرمایا‘ تشریف رکھیے آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ طالب علم کے سبق سے فارغ ہو جاؤں تو آپ سے بات ہوگی‘ جو جی چاہے سوال کریں‘ میں ان شاء اللہ نہایت خوشی سے جواب دوں گا۔ یہ الفاظ کہہ

کر اس شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔

دریں بحر جز مرد راعی نرفت
گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

کہتے ہیں یہ شعر پڑھتے ہی مولانا کا اسلوب بیان بدل گیا اور مجلس کا انداز کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیا۔ تقریر میں اللہ نے ایسی تاثیر بھر دی کہ سامعین یوں محسوس کر رہے تھے کہ درو دیوار سے کلمہ شہادت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پنڈت جی اور ان کے ساتھی بے جان تصویر بنے ہوئے مولانا کا منہ تک رہے تھے اور سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ ناگہاں پنڈت نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ''مجھے لے چلو، مجھے لے چلو''۔ کچھ لوگوں نے پنڈت کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑی مشکل سے بالا خانے سے نیچے اتارا۔ پنڈت پر مدہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس سکھ زمیندار نے جو اسے لے کر گیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا' تم بڑی شان اور ادعا سے وہاں گئے تھے' لیکن جاتے ہی خاموش ہو گئے اور کوئی بات کہے بغیر لوٹ آئے' اس کی کیا وجہ ہے؟ پنڈت نے جواب دیا میں اسلام کے خلاف اکیس اعتراض سوچ کر گیا تھا جو میرے نزدیک بڑے مضبوط تھے' لیکن مولوی صاحب کے سامنے جاتے ہی تمام باتیں ذہن سے نکل گئیں۔ ان کی تقریر میں کچھ ایسا جادو بھرا ہوا تھا کہ خود میرے دل میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا۔ ان کے مذہب کی سچائی میرے دل میں پیوست ہونے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا مذہب صحیح نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی طرف سے ایک روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میرے مذہب کے آثار مٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اگر چند ثانیے مزید ان کے سامنے بیٹھا رہتا تو میں کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں نے پنڈت جی کو مولانا کی خدمت میں لے جانے اور ان سے بحث و مناظرہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز مولوی غلام رسول سے بحث و مناظرہ نہیں کروں گا۔

۱۶۔ یہی عبداللہ نو مسلم' جس کے سکھ والد کے کہنے پر پنڈت مذکور مولانا سے بحث کرنے گئے تھے' بیان کرتے ہیں کہ مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے ایک مسلمان خاندان میں شادی کر لی تھی۔ قبول اسلام سے پہلے بھی وہ شادی شدہ تھے۔ ایک دن وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا ''کہو میاں عبداللہ مع اہل و عیال کے خوش ہو؟'' عرض کیا۔ ''حضرت! میری پہلی بیوی بہت سلیقہ شعار اور تابعدار تھی' مجھے وہ بہت یاد آتی ہے۔ آپ دعا فرمائیں وہ بھی اسلام قبول کر لے اور میرے پاس آ جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ دن تو گزر رہی رہے ہیں۔''

فرمایا: ''میاں عبداللہ! جس ذاتِ اقدس نے تم کو ہدایت دی ہے' وہ اس کو بھی ہدایت دینے پر قادر

ہے۔گھبراؤ نہیں‘ ان شاء اللہ جلد ہی تمھاری مراد پوری ہوگی۔اب تم گھر جاؤ۔‘‘
عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مولانا کے حسب فرمان گھر چلے آئے۔ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ان کی پہلی بیوی نے ایک شخص کے ہاتھ ان کو خط لکھ کر بھیجا کہ فلاں دن اور فلاں وقت آکر اسے لے جاؤ۔وہ گئے اور اسے ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں قلعہ میہاں سنگھ حاضر ہوئے اور وہ مسلمان ہوگئی۔

۱۷۔ موضع ستراہ سدھواں (ضلع سیالکوٹ) کے چودھری محمود خاں کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں کے برہمن نے ان سے کہا کہ سنا ہے جو غیر مسلم مولوی صاحب کا درشن کرنے آتا ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔انھوں نے جواب دیا ’’بات تو ایسی ہی ہے۔‘‘ برہمن نے کہا ’’کسی دن ہم کو بھی ان کے درشن کرانا‘‘۔چند روز بعد مولانا تشریف لے آئے اور چودھری محمود خان نے ان سے برہمن کی بات بیان کی۔فرمایا ’’اگر کوئی وقت آیا تو میں کہوں گا‘ تم انھیں بلا لانا۔ جمعے کا دن تھا‘ مولانا وعظ فرما رہے تھے کہ محمود خاں کو حکم دیا ’’برہمن کو بلا لاؤ۔کوئی اور غیر مسلم آنا چاہے تو وہ بھی آ جائے‘‘۔حسب ارشاد محمود خاں گئے۔ برہمن سے کہا اور اس کو لانے کی بہت کوشش ،کی مگر وہ نہیں آیا۔دو اور غیر مسلم ان کے ساتھ آ گئے۔جوں ہی وہ مولانا کے سامنے آئے‘ حالانکہ انھوں نے وعظ کا کوئی لفظ نہیں سنا تھا‘ ان کو دور سے دیکھتے ہی کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔
محمود خان کہتے ہیں کہ ایندھن کاٹنے کے لیے وہ ایک کلہاڑی برہمنوں سے مانگ کر لائے تھے۔ انھوں نے وہ کلہاڑی واپس کرنے کی بہت کوشش کی‘ لیکن برہمنوں نے نہیں لی اور کہا کہ اس کلہاڑی سے جو لکڑیاں کاٹ کر کھیت سے لائی گئی ہیں‘ ان سے مولوی صاحب کے لیے کھانا پکایا گیا ہے۔ممکن ہے اس کو دیکھ کر اور ہاتھ لگا کر ہی ہم مسلمان ہو جائیں۔

۱۸۔ گوجراں والا کے دو میاں بیوی اپنی چودہ سالہ لڑکی کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کی لڑکی کے سر پر کوئی بال نہیں ہے اور یہ بالکل گنجی ہے‘ اس کی شادی ہونے والی ہے۔آپ دعا فرمائیں کہ اس کے سر پر بال اگ آئیں۔
مولانا نے لڑکی سے فرمایا ’’بیٹی نماز پڑھا کرو‘ ان شاء اللہ تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔‘‘ لڑکی نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں سر پر بال اگ آئے اور گنجا پن ختم ہوگیا۔دو سال بعد وہ لڑکی اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں نذرانہ لے کر حاضر ہوئی۔اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔مولانا نے ان سے پوچھا: ’’تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟‘‘ لڑکی کی والدہ نے تمام واقعہ بیان کیا۔آپ نے پوچھا ’’نماز پڑھتی ہو یا نہیں؟‘‘ لڑکی نے جواب دیا۔’’پہلے تو نماز پڑھا کرتی تھی مگر اب چند روز سے چھوٹ گئی ہے‘‘۔یہ سنتے ہی آپ نے نذرانہ واپس کر دیا اور فرمایا ’’تمھارے جیسے لوگوں سے جو خدا سے وعدہ کر کے توڑ دیتے ہیں‘ مجھے کوئی سروکار نہیں۔‘‘ ہر چند اس

نے کہا، لیکن آپ نے نذرانہ قبول نہ کیا اور دونوں ماں بیٹی واپس گوجرانوالا چلی گئیں۔ رات کو وہ لڑکی سوئی، صبح اٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک بال بھی نہ تھا۔

۱۹۔ موضع کھبکی (ضلع گوجرانوالا) کے حکیم نبی بخش کا بیان ہے کہ انھیں ایک گاؤں میں ایک ایسے مریض کے علاج کی غرض سے جانا پڑا، جو مالیخولیا میں مبتلا تھا اور جسے طبیب لا علاج قرار دے چکے تھے۔ حکیم صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا علاج کرو، اللہ شافی مطلق ہے، شفا دے گا۔ حکیم صاحب نے اس کا علاج شروع کیا اور قدرتِ الٰہی سے ایک ہی دن کے علاج سے آدھی بیماری ختم ہوگئی۔ دوسرے روز مریض بالکل تندرست ہوگیا۔ حکیم صاحب بامذاق آدمی تھے اور مولانا ان کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ وہ مولانا کے پاس آئے، مریض کی صحت یابی کی اطلاع دی اور عرض کیا، وہ مریض تو صحت یاب ہوگیا، اگر کوئی ایسا ہی مریض اور آگیا تو پھر کیا ہوگا؟ فرمایا ''اللہ تعالیٰ تمھارے علاج سے ہمیشہ ایسے مریضوں کو صحت عطا فرمائے گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد سے مالیخولیا کے جتنے بھی مریض ان کے پاس آئے اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی۔

۲۰۔ لاہور کے میاں محمد صاحب کہتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں وہ گھوڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے گھوڑے خرید کر اپنے ملازموں کو سری نگر گھوڑے فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔ تین مہینے گزر گئے، لیکن گھوڑے فروخت نہ ہوئے۔ میاں محمد صاحب نہایت پریشان تھے کیوں کہ سری نگر میں ملازموں کا خرچ بھی پڑ رہا تھا اور گھوڑوں کا بھی۔ اتفاقاً مولانا غلام رسول لاہور تشریف لائے اور مسجد چنیوالی میں وعظ کہا۔ سامعین میں میاں محمد بھی موجود تھے۔ وعظ کے بعد وہ مولانا سے ملے اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ فرمایا، ان شاء اللہ تیسرے روز تمھارے گھوڑے حاکم کشمیر خرید لے گا اور تمھیں تین ہزار روپے منافع ہوگا۔ میاں محمد کہتے ہیں کہ وہ تاریخ انھوں نے لکھ لی۔ جب ملازم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا کے فرمان کے تین روز بعد گھوڑے فروخت ہوئے اور حساب کیا گیا تو ٹھیک تین ہزار روپے منافع ہوا۔

۲۱۔ گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے ایک ہندو مہنت کا نام کاہن داس تھا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ ایک مرتبہ ''موضع کالووالی'' آیا جو قلعہ میہاں سنگھ کے قریب ایک گاؤں ہے۔ مہنت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے قلعہ میہاں سنگھ کتنے فاصلے پر ہے؟ بتایا گیا تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ مہنت کاہن داس نے کہا، سنا ہے وہاں مولوی غلام رسول رہتے ہیں جو بہت عالم اور صوفی ہیں، میرے دل میں اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں ان سے یہ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس کئی پنڈت اور غیر مسلم بحث و مباحثہ کے لیے گئے اور مسلمان ہوگئے۔ آپ وہاں نہ جائیں۔ لیکن مہنت صاحب نہیں مانے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ جاتے ہی سوال کیا ''اسلام کیا چیز ہے''؟ فرمایا ''پہلی چیز ہے کلمہ پڑھنا۔'' پھر کلمہ

پڑھ کر سنایا۔ کلمہ سنتے ہی مہنت کاہن داس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد دو سال وہ مولانا کی خدمت میں قلعہ میہاں سنگھ فروکش رہے۔

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو مولانا غلام رسول کی طرف منسوب ہیں۔

ہم لوگوں پر مادیت نے قبضہ کر لیا ہے اور روحانیت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثریت کے ذہن اس قسم کے واقعات کی صحت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مولانا ممدوح ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۵ء میں فوت ہوئے۔ ان سطور کی تحریر تک ان کی وفات پر صرف ۱۳۰ سال گزرے ہیں اور اب سے پچاس پچپن برس پہلے ایسے کئی حضرات موجود تھے جنھوں نے مولانا کو دیکھا اور ان کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل کیا تھا۔ خود ان سطور کے راقم کو ایسے بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان سے مولانا کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنی ہیں۔

کرامات کے ظہور کی وجہ:

مولانا غلام رسول سے بہ کثرت کرامات کیوں ظاہر ہوئیں اور ان کی دعا دربار خداوندی میں اتنی جلدی کیوں شرف قبولیت حاصل کرتی تھی؟ اس کے بارے میں ان کے ایک شاگرد اور مرید مولوی قطب الدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز وہ مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ عرض کیا "حضرت! آپ سے اس درجہ بہ کثرت کرامات ظاہر ہونے کا سبب کیا ہے؟ پہلے بھی بہت سے بزرگ ہو گزرے ہیں، اب بھی کئی متدین اور متقی لوگ موجود ہیں، بلاشبہ ان سے بھی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے، لیکن اتنی کثرت سے نہیں، جتنا کہ آپ سے"۔

مولانا نے جواب دیا۔ "جب سے مجھے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے کرامات ظہور میں آ رہی ہیں۔"

مولوی قطب الدین کہتے ہیں کہ اب میں نے اس خواب کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ کئی دن ٹالتے رہے، لیکن جب میرا اصرار بہت بڑھ گیا تو فرمایا، ایک مبارک رات کو میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ اس حالت کو نہ تو میں خواب سے تعبیر کر سکتا ہوں اور نہ اسے عالم بیداری کہہ سکتا ہوں۔ مجھے حضور ﷺ نے صابن عنایت کر کے فرمایا: "اس سے اپنے کپڑے دھلواؤ۔" میں نے حسب حکم کپڑے دھوئے اور پھر حاضر ہوا۔ اب حضور ﷺ نے مجھے مسجد کے منبر پر کھڑا کر کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید دیا اور دوسرے میں صحیح بخاری دی۔ فرمایا "یہ لوگوں کو سناؤ، تم میرے وارث ہو"۔ مولانا فرماتے ہیں "ایسی رات پھر تمام عمر نصیب نہیں ہوئی۔ اس رات جو فیوض و برکات حاصل ہوئے، وہ کبھی حاصل نہ ہوئے۔"

اس قسم کے اصحاب تقویٰ اور عابد و زاہد لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ اللہ نے ان کو لاتعداد نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل و کرم خاص کا مستحق گردانا تھا۔

ایک اور واقعہ:

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزی حکومت کے نزدیک مولانا غلام رسول کا شمار انگریز کے باغیوں میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے انگریزی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا تھا اور پھر وعظ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ انگریزی حکام گاؤں میں آکر یا تھانے اور کچہری بلا کر انھیں اور ان کے خاندان کے بعض افراد کو پریشان کرتے تھے۔ بالخصوص ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سے زیادہ پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ اس ضمن میں مولانا غلام رسول کے سوانح نگار اور ان کے فرزند ارجمند مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے تایا حکیم غلام محمد نے بتایا کہ ایک روز انھوں نے مولوی غلام رسول سے کہا' ہم حکام کی باز پرس سے تنگ آ گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ یہاں کی بود و باش ترک کر کے کسی ریاست میں جا قیام کریں۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی صاحب آپ کا فرمان بجا ہے' لیکن میں مجبور ہوں' کیونکہ ایک دن میں مسجد میں سویا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آکر جگایا اور کہا ''تم میرے ساتھ چلو' تمھیں رسول اللہ ﷺ بلا رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب گاؤں سے باہر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی پالکی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔ ''غلام رسول ہم تمھاری مسجد میں جانا چاہتے ہیں''۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور پالکی والوں نے پالکی اٹھا لی' مسجد میں تشریف لے جا کر اسی پکڑے ہوئے ہاتھ سے مجھے منبر پر بٹھایا اور فرمایا ''وعظ کہا کرو' تم سے لوگوں کو ہدایت ہو گی' تمھاری یہی جائے بود و باش ہے۔''

یہ خواب سنانے کے بعد فرمایا: ''بھائی صاحب اب فرمایئے۔ میں تو مامور ہوں' کیسے اس جگہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ [1]

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تمام عمر وہ اسی گاؤں (قلعہ میہاں سنگھ) میں رہے اور خلق کثیر نے یہاں آکر ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔

صحابہ کرام کی خوشبو:

مولانا کے ایک شاگرد اور مرید مولوی علاء الدین کا بیان ہے کہ ایک دن وہ مولانا کے ساتھ موضع ہیراں والا جا رہے تھے۔ مولانا گھوڑی پر سوار تھے۔ راستے میں سطح زمین سے قدرے اونچا ایک مقام آیا تو آپ گھوڑی سے اتر پڑے اور فرمایا۔ ''علاء الدین! یہاں مجھے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی خوشبو آرہی ہے' تم گھوڑی پکڑ لو۔'' انھوں نے حسب ارشاد گھوڑی کی لگام پکڑی۔ آپؒ نے وضو کیا اور جوتے اتار کر ادھر ادھر گھومنے لگے' جیسے کوئی خاص جگہ تلاش کر رہے ہوں۔ بالآخر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ دوپہر کا وقت اور گرمیوں کا موسم تھا۔ آپ

[1] سوانح مولوی غلام رسول ص ۱۳۸' ۱۳۹۔

جذب کے عالم میں تھے، کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ دستار مبارک سر سے گر گئی تھی اور انھیں اپنے آپ کا کچھ پتا نہ تھا۔ مولوی علاء الدین تعجب و تحیر کے عالم میں کھڑے ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ مولانا ظہر کے اول وقت وہاں سے اٹھے اور نماز ادا کی۔ پھر فرمایا:

''میرا دل چاہتا ہے کہ میری قبر یہاں ہو❶۔''

یہاں یہ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے۔ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی تعداد بعض تاریخی روایات کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف جزیرۃ العرب ہی میں اقامت گزیں نہ رہے تھے، جنگ و جہاد، کاروبار اور تبلیغ دین و اشاعت اسلام کے سلسلے میں مختلف ملکوں اور علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ ہندوستان کے بعض شہروں اور علاقوں میں بھی پچیس صحابہ کرام تشریف لائے۔ ان کی آمد و رفت کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد (۱۵ ہجری) سے لے کر یزید بن معاویہ کے زمانے تک جاری رہا۔ ان کے نام بھی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ موجودہ بلوچستان کے متعدد علاقوں اور صوبہ سرحد کے شہر بنوں میں بھی (جسے عربوں نے ''بنہ'' کہا ہے) بغرض جہاد صحابہ کرام کا ورود مسعود ہوا۔ عین ممکن ہے اس سے آگے بڑھ کر موجودہ پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی آئے ہوں اور مولانا غلام رسول کو جس مقام سے صحابہ کرام کی خوشبو آئی، وہاں کوئی صحابی مدفون ہو۔ ہمارے لیے اگرچہ اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کہ اولیا و اتقیا کا معاملہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے، اور ان کے قلب و روح کی قوت حاسہ اس درجے تیز ہوتی ہے کہ اللہ ان پر فضل فرماتا ہے اور وہ اس کی مدد سے وہ ایسے آثار تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جہاں ہم ظاہر بینوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

سخاوت اور مہمان نوازی:

مولانا غلام رسول بے حد سخی اور مہمان نواز تھے۔ اہل و عیال کے علاوہ رشتے داروں اور اعزہ و اقارب پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے، ان کے شادی بیاہ کی ذمے داریاں بھی انھوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ ان کی تعلیم و تعلم کے معاملات بھی انہی کے سپرد تھے۔ ان کے مدرسے میں جو طلبا حصول علم کے لیے آتے اور جو لوگ فیض حاصل کرنے کی غرض سے وہاں مقیم رہتے، ان کے خورونوش کا انتظام بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ مہمانوں کی تعداد پندرہ کے قریب روزانہ ہوتی تھی، بعض دفعہ یہ تعداد چالیس تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ گھر کی عورتیں یا چکی پیستی رہتیں یا کھانا پکانے میں مصروف رہتیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ مہمان روحانی فیض بھی حاصل کرتے، کھانا بھی کھاتے، کئی کئی دن وہاں مقیم بھی رہتے اور پھر جاتے وقت سفر خرچ کا مطالبہ بھی کرتے۔ بعض بھنگی پوستی بھی ان کی سخاوت سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی اس ضرورت کے لیے ان سے پیسے لے جاتے۔

❶ سوانح مولوی غلام رسول ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

اس مرد درویش کا دستِ سخا اس قدر وسیع تھا کہ کسی شخص کا دامن طلب خالی نہ رہتا۔ ایک مرتبہ ایک پوستی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں پوست پینے کا عادی ہوں اور بہت زیادہ پیتا ہوں۔ آج بالکل خالی ہاتھ ہوں' پوست لینے کے لیے کوئی پیسا میرے پاس نہیں ہے' سخت طلب لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے کچھ پیسے دیجیے تا کہ پوست پی سکوں۔ آپ نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا' وہی ضرورت بیان کی اور ایک روپیہ لے گیا۔ اس طرح متواتر سات دن آتا اور ایک ایک روپیہ روزانہ لے جاتا رہا۔ اس اثنا میں جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے' وہ آپ کو کہتے رہتے کہ یہ شخص خود پوست پینے کا اعتراف کرتا ہے اور اسی کے لیے آپ سے پیسے لیتا ہے' آپ اس غلط کام کے لیے کیوں روزانہ ایک روپیہ دیتے ہیں۔ ایک روپے کی اس زمانے میں بہت قیمت تھی' لیکن مولانا نے کوئی پروانہ کی اور اس کا مطالبہ پورا کرتے رہے۔ آٹھویں دن وہ آیا اور روپیہ طلب کیا تو اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ نہایت شفقت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پوست اور دوسری نشہ آور چیزوں کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت پوست نوشی سے توبہ کر لی۔ اب پوست کے بجائے مولانا نے اسے اپنی جیب سے دودھ پلانا اور حلوہ کھلانا شروع کر دیا۔ چھ مہینے وہ ان کی خدمت میں رہا۔ ذکر الٰہی اور یاد خدا اس کا ہر وقت کا معمول بن گیا تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے مولانا غلام رسول بیعت بھی تھے اور دونوں کا آپس میں گہرا دوستانہ بھی تھا۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے چونکہ اتباع کتاب وسنت کی پاداش میں اپنا ملک چھوڑا تھا اور ہندوستان آ کر وہ خالصتاً دینی خدمات انجام دے رہے تھے' اس لیے مولانا غلام رسول ان سے بے پناہ تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کی مالی امداد کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

اولاد کی تربیت:

مولانا غلام رسول کے فرزند گرامی مولوی عبدالقادر مرحوم بیان کرتے ہیں کہ مولانا اپنی اولاد کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام فرماتے تھے۔ ان کو دینی مسائل سکھاتے اور پانچ وقت کی نمازیں با جماعت ادا کرنے کا حکم دیتے۔ سحری کے وقت تہجد کے لیے جگاتے اور مسجد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں:

''میری عمر اس وقت محض نو سال کی تھی۔ ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ ابھی یہ نابالغ ہے۔ شرع نے اس کو مکلف نہیں کیا تو اس کو تہجد کے لیے جگانے اور مہمانوں کی خدمت کے لیے تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: انما الاعمال بالنیات۔ میں اس کو اس نیت سے تکلیف دیتا ہوں کہ اس کو نیک کاموں کی عادت ہو جائے۔ دوسرا مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب یہ کسی دن یتیم ہو جائیں گے' جو کچھ میں اس سے اب کراتا ہوں' یہ اس کو یاد رہے گا اور بڑا ہو کر ان عادات کا

پابند ہو جائے گا۔اس کے دل میں تخم حمیت اور مروّت بو رہا ہوں۔ان شاء اللہ کسی روز یہ تخم پھل پھول جائے گا' میرا خدا میری محنت کو ضائع نہ کرے گا۔نابالغوں کا سینہ مثل آئینہ ہوتا ہے' جس طرف ان کو لگایا جائے وہ رستہ ان کے سینوں میں نقش ہو جاتا ہے ❶۔

اولاد کی دینی اور مذہبی تربیت نہایت ضروری ہے۔رسول اللہ ﷺ نے گھر کے سربراہ کو ''راعی'' یعنی نگہبان قرار دیا ہے۔اس حیثیت سے والد کا فرض ہے کہ اولاد کی ہر اعتبار سے نگرانی اور نگہداشت کرے۔اس ضمن میں مولانا غلام رسول کا نقطہ نظر جو یہاں بیان کیا گیا ہے' عین حقیقت پر مبنی ہے۔انھوں نے عمدہ طریقے سے اولاد کی تربیت کی اور بچپن ہی میں نیکی کی راہ پر لگا دیا اور اس کی جو وجہ بیان فرمائی وہ بالکل صحیح ہے۔

چند خصوصیات:

گزشتہ صفحات میں مولانا غلام رسول کے تقویٰ وطہارت اور خصائل حمیدہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ان کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت باوضو رہتے اور اپنے اصحاب عقیدت وارادت کو بھی باوضو رہنے کی تلقین فرماتے اور کہا کرتے الوضوء سلاح المؤمنین (وضو مومنوں کا ہتھیار ہے) ان کا ارشاد ہے کہ باوضو آدمی پر نہ جادو اثر کرتا ہے' نہ جن بھوت اسے تکلیف پہنچا سکتے ہیں اور نہ موذی چیزیں اسے مبتلائے مصیبت کر سکتی ہیں۔فرمایا کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ انصار سے پوچھا کہ تم میں وہ کون سی صفت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں تمھارے بارے میں ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین فرمایا گیا ہے۔انھوں نے جواب دیا ہم لوگ باوضو رہتے ہیں۔

مولانا فرمایا کرتے کہ وضو کر کے جو کام بھی کیا جائے' اس میں برکت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔خود پاکیزگی اختیار کرنا اور دوسرے کو پاکیزہ رہنے کی تلقین کرنا منشاء اسلام ہے۔صوفی اور سالک دربار خداوندی میں اسی لیے زیادہ مقبول ہیں کہ وہ طہارت اور پاکیزگی کا التزام کرتے ہیں۔مجذوب بھی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتا ہے' مگر وہ سالک اور صوفی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔سالک شرع کا مکلّف ہے اور ہر وقت اللہ سے طالب رضا رہتا ہے۔اس کے برعکس مجذوب پر استغراق اور جذب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔سالک تمام درجات سلوک طے کر کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے' لیکن مجذوب جزئیاتِ شرع اور مراتب تصوف سے واقف نہیں ہوتا۔

ارادت مندوں سے کہا کرتے کہ اصل فضیلت اتباع رسول ﷺ سے حاصل ہوتی ہے' جس کو اتباع رسول ﷺ نصیب نہیں' اسے مرتبہ فضیلت نصیب نہیں ہوتا۔ہر قسم کے روحانی فیوض و برکات اور درجات و مراتب کا بنیادی منبع رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

---

❶ سوانح مولوی غلام رسول ص ۱۵۰'۱۵۱۔

ہمیشہ نیچی نظر کر کے چلتے۔ دوسروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے۔ اس کے لیے کتاب وسنت میں جو احکام صادر فرمائے گئے ہیں وہ لوگوں کو سناتے۔ زیادہ باتیں کرنے سے منع کرتے اور زبان کو قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے۔ ہر کام خلوص نیت سے کرنے کی تاکید فرماتے۔ کسی کو ذہنی اور جسمانی تکلیف نہ پہنچاتے۔ مال مشتبہ سے سخت پرہیز کرتے۔ سب کی بات کامل توجہ اور غور سے سنتے۔ لباس اور کھانے پینے میں کسی نوع کا تکلف نہ کرتے۔ سادہ لباس پہنتے اور سادہ کھانا کھاتے۔ چھوٹے پر شفقت فرماتے اور اپنے ہم عمر اور بڑوں کا احترام کرتے۔ بہت سے لوگ ان سے فقہی مسائل پوچھنے آتے اور تحریری فتوے لینے کی غرض سے بھی حاضر خدمت ہوتے' سب کو تسلی بخش جواب دیتے اور قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں فتوے تحریر فرماتے۔ جو لوگ زبانی مسائل دریافت کرتے ان کو بھی نہایت اطمینان سے مسئلے کی نوعت سمجھاتے۔ جب تک وہ مطمئن نہ ہو جاتا اور مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جاتا اسے اٹھنے نہ دیتے۔

ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلفی سے بات کر سکتا اور بے جھجک اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا' ہر شخص کے علم اور ذہن کے مطابق بات کرتے اور اس کے مرتبہ و مقام کو ملحوظ خاطر رکھتے۔

کسی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوتے' جس میں ریا اور سمعہ کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا' اپنے ذاتی مفاد کو ہرگز پیش نظر نہ رکھتے۔ اگر انھیں شبہ پڑ جاتا کہ فلاں مقام کے لوگ ان کی کوئی مالی اعانت کرنا چاہتے ہیں تو وہاں بالکل نہ جاتے اور جانے کا پروگرام طے بھی ہو چکا ہوتا تو منسوخ کر دیتے یا اس وقت تک ملتوی کر دیتے جب تک یہ شبہ دور نہ ہو جاتا۔

مزاج کے نرم اور طبیعت کے دھیمے تھے۔ کسی سے سخت کلامی نہ کرتے۔ ہر شخص سے پیار اور محبت سے پیش آتے۔ بحث سے شدید نفرت تھی۔

فقہی مسلک:

فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے اور اتباع سنت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اہل حدیث کے مسائل مشہورہ آمین اور رفع یدین وغیرہ پر عامل تھے۔ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ دیگر مسائل میں بھی اسی مسلک کو ترجیح دیتے اور فتوے میں کتاب وسنت کو پیش نگاہ رکھتے۔

وعظ میں بدعات اور مروجہ رسوم کی سخت مخالفت کرتے اور خالص کتاب وسنت کے مسائل بیان فرماتے۔ مسئلہ توحید نہایت عمدہ اور مؤثر انداز میں بیان کرتے۔

وصیت:

مولانا نے عازم بیت اللہ ہونے سے قبل اپنے بیٹوں کے لیے حسب ذیل وصیت تحریر فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی رسولہ الذی لانبی بعدہ وعلی آلہ وصحبہ وسائر من بذل فی مرضیات اللہ جھدہ اما بعد۔ امروز دوشنبہ ۵ شوال ۱۲۸۸ ہجری مقدسہ نبویہ علیٰ صاجہا الصلوۃ والتحیۃ فقیر عبداللہ المعروف بغلام رسول بن جناب فضیلت دستگاہ رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن حافظ فاضل کامل بہاء الدین بن جامع کمالات حافظ محمد اکرم بن حافظ فاضل عصمت اللہ بن مصدر کمالات زبدۂ اہل اللہ کامل التحریر جناب عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد بحض فضل الٰہی عازم زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً گردید۔لہٰذا بہ فرزندی عبدالقادر کہ امروز نہ سالہ است وبعد تلاوت قرآن شریف وتحصیل صرف تازراوی بوستان وگلستان می خواند ونور چشمی محمد عبدالعزیز کہ سہ ونیم سالہ است وصیت میکنم کہ از ہمہ امور علم دینی از تفسیر وحدیث وفقہ وسیر وتصوف مقدم دارند۔ وملاک الامر واساس الایمان یقین کنند وبھمگی ہمت باو متوجہ شوند۔خصوصاً صحبت محدثین لازم شارند کہ اہل حدیث اہل اللہ اند وبعد فراغ از علم دینیہ دست بیعت بشیخ کامل مکمل دہند۔ودریں زمان مثل عبداللہ غزنوی در قیاس ما احدے نیست۔ صحبتش اکسیر است۔ وتحقیق آنحضرت کامل مکمل پیر است وعبدالقادر ترجمہ قرآن از ایشاں شروع کنند۔ وبسم اللہ عبدالعزیز از ایشاں شروع کنند کہ درعقیدۂ فقیر مثل جنید ونظیر حضرت بایزید است۔لایدرک الواصف المطری خصائصہ داں یک سابقاً فی کل ما وصفا۔ہمیں بس گرچہ بس کلسد تماشم کہ درسلک خریدار انش باشم دمی باید کہ بملحدین وزنادقہ وکسے کہ سرمومخالف شریعت محمدیہ ﷺ باشد مجلس نکنند وباولیاء اللہ وکمال صوفیہ حسن عقیدہ ثابت نمانند۔امام شعرانی فرمودہ ایاک ولحوم الاولیاء فانہا مسمومتہ وشطحیات آں حضرت برمہما امکن برمحمل نیک فرمودہ۔واوقات خودرا اولاً باداے صلوٰۃ دراوقات مستحبہ واقامت ارکان وواجبات وسنن ومستحبات بتقید جماعت وخشوع تمام معمور کنند وایمان خودرا درست کنند وثانیاً بہ تلاوت قرآن ودرود شریف واذکار نورعلیٰ نور نمانند۔ وپس ۔

گوبما ندیم زندہ برد و زیم دامنے کز فراق چاک شدہ

دربمردیم عذر ماپذیر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

الغرض حضرت مولانا مکہ معظمہ پہنچ گئے اور وہاں انھوں نے ذیل کی غزل کعبہ شریف کے سامنے کھڑے ہوکر کہی۔

۱۲۸۸ھ

زراہ دور بہ بیت الحرام می آیم بصد نیاز و بصد احترام می آیم

گزشت عمر جوانی بحظ نفسانی سفید ریش بباب اسلام می آیم

برائے عفو جرائم بہ توبہ مستغفر بصد ندامت تا ایں مقام می آیم

کرم نماو گزر کن کہ نا سزا کردم طفیل حضرت خیر الانام می آیم

بحضرت تو باستار کعبہ دست زدہ باستغاثہ وطلب مرام می آیم

زلالِ رحمت خود دہ کہ تا شوم سیراب ۔۔۔ بسا کہ تشنہ لب و تلخ کام می آیم
وقوف موقف عرفات رانیم لائق ۔۔۔ چو خواندۂ تو برحمت بکام می آیم
گرتختم زجرائم بسعی در میلین ۔۔۔ پس از طواف بسوئے مقام می آیم
برائے رمی شیاطین رسیدہ بر جمرہ ۔۔۔ بہ طواف بمسجد حرام می آیم
نمودہ حلق ز اخلاق بد بفضل خدا ۔۔۔ بطلب رحمت رحماں مدام می آیم
مگر کہ کیش منی درمنا شود قرباں ۔۔۔ امید وار عنایت غلام می آیم

یہ وصیت مسطورہ بالا جو مولانا ممدوح نے اپنے بیٹوں (عبدالقادر اور عبدالعزیز) کے لیے تحریر فرمائی، فارسی زبان میں ہے اس کے معنی یہ ہیں۔

امابعد۔ آج بروز پیر ۵ شوال ۱۲۸۸ھ کو یہ فقیر عبداللہ جو غلام رسول کے نام سے مشہور ہے، محض فضل خداوندی سے حرمین شریفین کی زیارت کا عزم کر رہا ہے۔ میرا بیٹا عبدالقادر جو کہ آج نو برس کا ہو چکا ہے اور قرآن شریف پڑھنے کے بعد علم صرف میں زرادی تک کتابیں پڑھ چکا ہے اور فارسی کی بوستان اور گلستان پڑھ رہا ہے، نور چشمی محمد عبدالعزیز جو کہ ساڑھے تین برس کا ہو گیا ہے، میں انھیں وصیت کرتا ہوں کہ علم دینی یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تصوف کے حصول کو تمام معاملات پر مقدم قرار دیں۔ اسی کو بنیادی کام اور اساس ایمان ٹھہرائیں اور ہر اعتبار سے اسی کو مرکز توجہ بنائیں، بالخصوص صحبت محدثین کو اپنے لیے لازم قرار دیں اور یقین رکھیں کہ اہل حدیث ہی اہل اللہ کا گروہ ہے۔ علم دین سے فراغت کے بعد کسی شیخ کامل و مکمل کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میرے خیال میں مولانا عبداللہ غزنوی کے مرتبے کا اس زمانے میں کوئی اور شخص نہیں ہے۔ ان کی صحبت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عبداللہ غزنوی پیر کامل و مکمل ہیں۔ عبدالقادر درس قرآن مجید کے ترجمے کا آغاز اور عبدالعزیز اپنی تعلیم کا آغاز یعنی بسم اللہ انہی سے کریں، اس لیے کہ یہ فقیر یقین رکھتا ہے کہ وہ اس عہد میں مثلِ جنید اور نظیرِ حضرت بایزید ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی صفت کرنے والا ان کے اوصاف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہر وصف میں سلف صالح کا نمونہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خود ان کے حلقۂ دامن سے وابستہ ہوں۔

ہمیں بس گرچہ کلسد قماشم ۔۔۔ کہ درسلک خریداراںش باشم

اپنے بیٹوں کو وصیت کرتا ہوں کہ ملحدوں اور زندیقوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور کسی ایسے شخص کی مجلس اختیار نہ کریں جو شریعت محمدیہ کا کسی صورت میں بھی مخالف ہو۔ اولیاء اللہ اور باکمال صوفیا سے ہمیشہ حسن عقیدت رکھیں۔ اپنے اوقات کو ادائے نماز، اقامت ارکانِ دین، واجبات وسنن اور مستحبات کی بجا آوری میں صرف کریں۔ جماعت کے پابند رہیں اور دلوں کو خشوع وخضوع سے معمور رکھیں۔ دوسری بات جس پر عامل رہنا ضروری ہے یہ کہ قرآن مجید کی تلاوت کو جزو زندگی بنائیں۔ اذکار و وظائف کو اپنا معمول ٹھہرائیں اور درود شریف کثرت سے پڑھا کریں۔ بس میری یہی وصیت ہے۔

گر بما ندیم زندہ برود زیم　　　دامنے کز فراق چاک شدہ
در بمردیم عذر ما بپذیر　　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تصانیف:

مولانا غلام رسول ہر شعبہ علم پر عبور رکھتے تھے۔تفسیر' حدیث' فقہ' منطق وفلسفہ' صرف ونحو' معانی و بیان' ادب وانشا اور علم کلام سے پوری طرح باخبر تھے۔اس دور کی مرجہ زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔پنجابی ان کی مادری زبان تھی۔انھوں نے فارسی اور پنجابی کو ذریعہ تبلیغ بنایا اور ان زبانوں میں متعدد کتابیں تصنیف کیں' جن کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔فتاویٰ مولوی غلام رسول: یہ ان کے فقہی نوعیت کے فتاوے ہیں جو مختلف لوگوں کے مسئولہ مسائل پر مشتمل ہیں۔اس زمانے میں علمی زبان عام طور پر فارسی کو سمجھا جاتا تھا اور فقہی مسائل اور فتوے اسی زبان میں تحریر کیے جاتے تھے۔یہ فتاوے بھی فارسی میں ہیں۔کوشش کے باوجود یہ فتاوے کہیں نہیں مل سکے شنید ہے کوئی صاحب لے گئے۔یہ غیر مطبوعہ فتاوے تھے۔

۲۔رسالہ تراویح: یہ بھی فارسی میں ہے اور نماز تراویح سے متعلق ہے۔

۳۔حلیہ حضرت محمد ﷺ: اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' آنحضرت ﷺ کا حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

۴۔قصہ حضرت بلال ؓ: یہ پنجابی نظم میں ہے اور اس میں مشہور صحابی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واقعات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔قصہ سسی پنوں: یہ بھی پنجابی نظم میں ہے اور اس میں سسی پنوں کے نام سے اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

۶۔سی حرفی: یہ بھی پنجابی نظم میں ہے۔

۷۔مجموعہ نماز: یہ پنجابی میں مترجم نماز ہے۔لیکن مجھے نہیں ملی۔

۸۔تفسیر سورۂ فاتحہ: یہ بھی نہیں ملی۔

۹۔پنج باب: یہ پنجابی نثر میں ہے اور پکی روٹی کے انداز پر اس میں فقہی مسائل ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

۱۰۔پکی روٹی: یہ بھی فقہی مسائل پر مشتمل ہے اور پنجابی نثر میں ہے۔ایک روایت کے مطابق یہ ان کی تصنیف نہیں ہے۔

ان کتابوں میں سے بعض کتابیں ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

شعر وشاعری:

مولانا غلام رسول فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ان کے ولد حافظ نظام الدین خادم کا شمار بھی اپنے

دور میں فارسی کے شعرا میں ہوتا تھا۔ مولانا غلام رسول کے پنجابی اشعار میں بعض اردو کے الفاظ بھی ہیں۔ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو روانگی کے وقت جو شعر کہے' ان میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

بحمد اللہ ہو یا فضل الٰہی فراغت حج بیت اللہ سے پائی
مدینہ کی طرف ہوئی تیاری کیتی حجاج اونٹوں پر سواری
پہلے دن قافلہ ہو جمع سارا کیتو نے فاطمہ دی وادی اتارا
مدینہ طیبہ دی وا جو آئی کلیجے عاشقاں دے ٹھنڈ پائی
وہ روضہ دور سے نظری جو آیا خدا اوہ نور دا جلوہ دکھایا
ادب سے قافلے ہوئے پیادے محبت غیر سے دل صاف سادے
مبارک شہر تھیں واؤں جو چلیاں ہسے دل وکھڑے مانند کلیاں
صلواتاں وانگ بلبل دے پکاراں دلوں محبوب دا حلیہ چتاراں
کیتی اج طالع بیدار یاری اجوکی اس گھڑی پر جان وادی
عجب وہ مسجد نبویؐ منور عجب روضہ رسول اللہ دا انور
نہ جھلن اکھیاں وہ دیکھ انوار ہو ون صدقے رسول اللہ دے دربار
کہا من جی نے کیا سامان کریے پکارے عشق جان قربان کریے
مبارک روضہ مسجد دے کنارے وہ سورج وانگ دوروں لاٹ مارے

غلام ایہہ عین میرا مدعا ہے
شکستہ شیشہ دل کا صدا ہے

گھر سے عازم حرمین شریفین ہونے سے پہلے ان کے دل کی جو کیفیت تھی اور دیار رسول ﷺ کی جو محبت ان کے قلب و روح میں کروٹ لے رہی تھی اس کا اندازہ ان کے مندرجہ تحت پنجابی اشعار سے کیا جا سکتا ہے:۔

چلیں اس دیس نوں وے سار بانا جتھے کیتا حبیبؐ اللہ ٹکانا
چلا شتر ہوواں قربان تیری تیرے راہاں توں گھول جاں میری
ہوئی رات جو رودن نین میرے کلیجے چھیک پاون وین میرے
رسول اللہ دے کر کر یاد آثار اللہے مار بھڑ کے شوقِ دیدار
مدینے میں پہنچا اک وار مینوں حیاتی میں ملا دلدار مینوں
غبار اس راہ دا سرمہ بنا واں ہوواں صدقے اگر اک جھات پاواں
جے پر ہوون تے ماراں اڈاری دیکھاں روضہ جے طالع کرن یاری

صبا روضے رسول اللہ دے جائیں میرا احوال رو رو کے سنائیں
کہیں بعد از ہزاراں بار صلوات کروڑیں بار تسلیم و تحیات
جو اے محبوب رحمانی نگاہ کر وچھوڑے سے جان آئی لباں پر
الٹے عشق سے جل بل گیا جی کہو اس دردا دارو کراں کی
خدا جانے جدوں کی جائیاں میں میرے بابل تیرے لڑ لائیاں میں ❶

اس نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں کس قدر درد و سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنی کمزوریوں کا کس موثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

گناہاں نال میں نامہ سیاہ ہوں بسا تقصیر مند و پُر گناہ ہوں

تغافل نال گذری عمر ساری گیاں سیاں' کھڑی رہیاں بچاری
کیا کرساں جو بھلکے کات منکسن آ جلدی جنج بو ہے آن ڈھوسن
جدوں ڈولی کہا راں آن چائی اکیلے چھوڑ جا سن بھین بھائی
بیگانیاں نال ہے پردیس جاناں نہیں پھر نت ایس دیس آناں
غلام ایہ پر گناہ بے سازو ساماں پھڑا محکم رسول اللہ دا داماں

اسی مضمون کے چند فارسی اشعار پڑھیے۔

گویم بتو اے صبا پیامے دروادیٔ عشق چند گامے
از ملک عجم مگر برآئی در ناحیہ عرب درآئی
بادیدۂ زارو دل فگارے در شہر مدینہ کن گزارے
بیں روضہ پاک سرور دیں آں مضجع خاتم النبیینؐ
برد یمنی بہ تن کشیدہ در قبر شریف آرمیدہ

اس نظم کا آخری شعر ہے:

از حد شدہ درد انتظارم بر راہِ تو دیدہ اشکبارم

مکہ معظّمہ پہنچ کر مولانا نے جو فارسی اشعار کہے' ان میں سے چند یہ ہیں:

زراہ دور بہ بیت الحرام می آیم بصد نیاز و بصد احترام می آیم
گزشت عمر جوانی بحظِ نفسانی سفید ریش بباب اسلام می آیم
برائے عفو جرائم بہ توبہ مستغفر بصد ندامت تا ایں مقام می آیم

---

❶ اپنے نام کی طرف اشارہ ہے کہ والدین نے میرا نام ہی غلام رسول رکھا۔ یعنی مجھے وقت پیدائش ہی سے رسول اللہ ﷺ کا غلام بنا دیا گیا ہے۔

مدینہ منورہ جانے کے بعد آپ نے جو فارسی اشعار کہے' وہ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔ ''بمدینہ منورہ برروضہ طیبہ گفتہ شد ۱۲۸۹ھ۔''

شکر خداچہ وقت سعید است و بختیار — غنچہ مراد قلب شگفت از دم بہار
دیدم بچشم عشق مدینہ منورہ — ایں دم سزدکہ گوہر جاں راکنم نثار
یعنی شب و صال رسیداست در حیات — شب قدر ہا فدائی بیک سا عتش ہزار
ذو قش بجز حلاوت ایماں کجا چشید — کذاب مدعی کہ ازیں فیض برکنار
حقا کہ چہ دولتیست کہ شد دستیاب من — وردو زباں کنم چوعنا دل ہزار بار
استادہ باادب بحضور محمدیؐ — صلواہ ذاکیات و تحیات بے شمار
یارب صل علی الذی اخترته واجتبيته — وعلى تمامة آله وعلى صحابته الكبار
وهو النبي شفيعنا خير البشر خير الرسل — هو رحمة للعالمين كالشمس في وسط النهار
اے سرور دو عالم سلطان مرسلین — بس مجرم شفاعت خود کن رفیق دیار
از جان و دل غلام رسولم مراچہ غم — یک نیمہ نگاہ ترا ام امید وار

مولانا غلام رسول اپنے دور کے جید عالم' نامور فقیہ' بہت بڑے صوفی' نہایت متقی اور پرہیز گار' مستجاب الدعوات اور ممتاز شاعر تھے۔ انھوں نے اگرچہ فارسی میں بھی شعر کہے' لیکن ان کا زیادہ کلام پنجابی میں ہے۔ نظم اور نثر میں انھوں نے پنجابی زبان کی بہت خدمت کی اور اپنے ماحول کے مطابق زیادہ تر اسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ فارسی میں انھوں نے فتوے تحریر فرمائے اور اس زمانے میں یہی رواج تھا۔ جو لوگ فقہی نوعیت کے مسائل دریافت کرتے تھے' ان کو فارسی میں جواب دیا جاتا تھا اور فارسی میں عربی عبارتیں بہ کثرت درج کی جاتی تھیں۔ مولانا کے فتاوے بھی اسی نوعیت کے تھے۔

ان کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ تینوں زبانوں کے ماہر تھے۔ عربی کے بھی' فارسی کے بھی اور پنجابی کے بھی۔۔۔!

گزشتہ صفحات میں ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی ایک کتاب کا نام ''قصہ سسی پنوں'' ہے۔ اس کتاب کا ایک شعر یہ ہے:

بلوچا ظالماں سن وین میرے
کجاوا یار دا دو نین میرے

بہت عمدہ شعر ہے۔

وفات:

قلعہ میہاں سنگھ میں مولانا غلام رسول کی مسجد میں ایک حافظ صاحب رہتے تھے، جو گاؤں کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے اور مسجد کے مؤذن تھے۔ایک روز مولانا غلام رسول خلاف معمول ان کے حجرے میں تشریف لے گئے۔اس دن مولانا کی عمر کے ۶۳ سال پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا۔حافظ صاحب بہت متدین اور پرہیز گار تھے۔مولانا نے ان سے فرمایا: حافظ صاحب! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھ پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ مجھ سے کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہیں ہوا جو خلاف سنت ہو اور کوئی ایسا عمل ترک نہیں ہوا جو مسنون ہو۔اب آخری سنت باقی رہ گئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ وہ بھی نصیب فرمادے تو زہے قسمت۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک پورے ۶۳ سال ہوئی ہے اور میری عمر بھی کل ۶۳ سال کی ہو جائے گی۔دیکھیے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

اتفاق سے دوسرے روز ساہیوال سے دو مہمان آ گئے۔مولانا نے نماز ظہر سے قبل اپنے بڑے بیٹے مولوی عبدالقادر سے فرمایا کہ ''قطب الدین درویش کو ساتھ لے کر گھر جاؤ اور وہاں سے دانے اٹھوا کر خراس پر لا رکھو تاکہ آٹا پس جائے۔'' اس کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔آپ نے خود جماعت کرائی۔نماز کے بعد دونوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں تشریف لے گئے۔اس وقت بالکل تندرست تھے، کسی قسم کی کوئی بیماری نہ تھی۔ مہمانوں کو تلقین کرنا شروع کی۔پہلے مولوی فضل الدین صاحب کو کلمے کا ذکر کرایا۔ایک بار کلمے کی ضرب دی۔دوسری بار ضرب دے رہے تھے کہ روح مبارک جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ صورت حال دیکھ کر مہمان گھبرا گئے۔مولوی فضل الدین صاحب جلدی سے باہر آئے اور مولانا کے بھائی حکیم غلام محمد سے کہا کہ مولوی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔وہ طبیب حاذق تھے۔انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا ''مولوی صاحب وفات پا گئے ہیں''۔یہ خبر پہلے قلعہ میہاں سنگھ میں پھیلی۔اس کے بعد آناً فاناً گرد و نواح کے دیہات میں پہنچ گئی۔بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔متعدد طبیب بھی آ گئے۔اطبا نے کہا کہ مولانا کی موت واقع نہیں ہوئی، ان کو سکتہ ہو گیا ہے۔انھوں نے آپ رحمہ اللہ کی رگ لگائی، لیکن حکیم غلام محمد بار بار یہی کہتے رہے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

حکیم غلام محمد مرحوم نے تمام اطبا اور باقی لوگوں سے کہا کہ ہمارے خاندان میں یہی معاملہ چلا آ رہا ہے۔ان کے والد مولوی رحیم بخش نے بحالت تندرستی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جان دی۔دادا صاحب حافظ نظام الدین خادم نے حالت رکوع میں وفات پائی۔یہی معاملہ مولوی صاحب کو پیش آنا تھا جو آ گیا۔

مولانا غلام رسول جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان فوت ہوئے اور جمعہ کے دن انھیں دفن کیا گیا۔جنازے میں بے لاتعداد لوگ جمع تھے۔حادثہ قمری حساب سے ۱۵/ محرم ۱۲۹۱ھ اور عیسوی حساب سے ۴/

مارچ ۱۸۴۲ء کو پیش آیا۔ قمری حساب سے ٹھیک ۶۲ سال عمر پائی۔ اللھم اغفر له وارحمه۔

اللہ! اللہ! کتنے پاک باز تھے یہ لوگ، والد مکرم نے بارگاہِ الٰہی میں زمین پر پیشانی رکھ کر حالت سجدہ میں اللہ کے حضور حاضری دی جد امجد نے اللہ کے دربار میں جھکتے ہوئے رکوع کی حالت میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور بیٹے اور پوتے نے کلمہ طیبہ پڑھتے اور اس کی تلقین کرتے ہوئے وفات پائی، اور ان کی یہ دعا اور تمنا پوری ہوئی کہ ٹھیک ۶۳ سال میں یعنی عمر نبوت کو پہنچ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ اللہ نے ان کو ہمیشہ اپنے سایہ عاطفت میں رکھا اور جو دعا انھوں نے کی اسے شرف قبول حاصل ہوا۔ ان کی یہ آخری دعا بھی قبول ہوئی اور انھوں نے ٹھیک ۶۳ سال عمر پائی۔ اللہ ان کو اور ان کے آباو اجداد کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم وادخلھم فی جنت الفردوس۔

اولاد و احفاد:

مولانا غلام رسول کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولوی عبدالقادر اور ان سے چھوٹے مولوی عبدالعزیز۔
مولوی عبدالقادر کے چار بیٹے تھے۔ عبدالمالک، عبدالرشید، محمد صادق اور عبدالوکیل۔
مولوی عبدالعزیز کے بھی چار بیٹے تھے۔ عبدالواحد، محمد شفیع، محمد اشرف اور عبدالرحمٰن۔
ان سے آگے ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہے۔

۶۔ خلیفہ غلام رسول لاہوری

لاہور کو ہمیشہ مرکز علما اور مجمع فضلا کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن عظیم شخصیتوں نے اس شہر میں جنم لیا، ان میں مولانا غلام رسول بن مولانا غلام فرید لاہوری کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ مولانا غلام رسول اپنے فضل و کمال اور نامور باپ مولانا غلام فرید کے مسند نشین ہونے کی بنا پر لوگوں میں خلیفہ غلام رسول کے نام سے معروف تھے۔ فقہ و اصول اور دیگر علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور کی ''مسجد موراں'' جو پاپڑ منڈی میں واقع ہے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس میں بہت سے طلبا حصول علم کرتے تھے۔ اس مدرسے کی مسند تدریس پر یہی مولانا غلام رسول لاہوری متمکن تھے اور ان کے برادر صغیر مولانا غلام اللہ اس کار خیر میں ان کے معاون تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں ان دونوں بھائیوں کا ذکر عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''لاہور میں سکھی عہد میں مولوی خلیفہ غلام رسول اور خلیفہ غلام اللہ تھے۔ بڑا مدرسہ ان کا جاری تھا۔ ہزاروں طلبا، درویش دور دور ملکوں سے وہاں آ کر تعلیم پاتے تھے۔ تمام زمانہ ان کا بہ دل و جان ادب کرتا تھا۔ ہنود و اہل

اسلام سب ان کے شاگرد کہلاتے۔"

خلیفہ غلام رسول کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثیر تعداد میں شامل تھے اوران سے مستفیض ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔

خلیفہ غلام رسول نے اپنے والد گرامی مولانا غلام فرید سے استفادہ کیا تھا اور اس عہد کے علوم متداولہ پر عمیق نظر رکھتے تھے۔وہ پنجاب میں سکھوں کا دور حکومت تھا اور اس دور میں خلیفہ صاحب ممدوح نے بڑی علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔وہ جامع علوم نقلیہ وعقلیہ تھے۔

تصوف کے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں وفات پائی ❶۔

۷۔مفتی غلام سبحان بہاری

مفتی غلام سبحان بہاری اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور دیار ہند کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔مولد و منشا ہندوستان کا صوبہ بہار تھا۔مولانا معظم الدین اور دیگر علمائے عصر سے تحصیل علم کی۔فراغت کے بعد اپنی علمی وفقہی قابلیت کی بنا پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مسند تدریس پر فائز کیے گئے۔مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔پھر وہاں کے افتا کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔بعد ازاں کلکتہ اور بنگال کے قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہوئے۔فقہ اور دیگر علوم میں دسترس رکھتے تھے' اور اپنی بوقلموں صلاحیتوں کی بنا پر ارباب حکومت اور اصحاب دولت کی نظروں میں عزت واحترام کے حامل تھے ❷۔

۸۔قاضی غلام علی ہاشمی سورتی

قاضی غلام علی ہاشمی سورتی کے والد ماجد کا نام قاضی جمال الدین اور جد امجد کا اسم گرامی قاضی عبداللہ تھا۔اس خاندان کے تمام ارکان اصحاب تحقیق وکاوش تھے۔صوبہ گجرات کے شہر سورت کی مسند افتا وقضا ان کو ورثے میں ملی تھی اور فقہ وکلام اور دوسرے علوم پر ان سب کو عبور واستحضار تھا۔قاضی عبداللہ ہاشمی سورت کے مفتی اور قاضی تھے اور مختلف مسائل میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔قاضی عبداللہ کے بعد ان کے بیٹے قاضی جمال الدین ہاشمی نے یہ منصب سنبھالا اور سورت کے قاضی اور مفتی ہوئے۔ان کی وفات ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۶ھ/ ۲۹ نومبر ۱۸۳۰ء کو ہوئی۔قاضی جمال الدین کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی غلام علی ہاشمی کو سورت کے منصب قضا وافتا پر متمکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

❶ تاریخ لاہور ص ۴۷۔حدائق الحنفیہ ص ۴۷۲۔تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۴۔نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۴۔خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۹۰۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۴'۳۵۵۔

قاضی غلام علی ہاشمی اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر فقیہ تھے۔ سورت اور اس کے نواح کے قاضی اور مفتی تھے۔

ان کی علمی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ فرائض افتا و قضا کی انجام دہی کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور بہت سے تشنگان علم ان کے چشمہ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ/۴ نومبر ۱۸۷۴ء کو اپنے آبائی شہر سورت میں وفات پائی ❶۔

۹۔ شیخ غلام علی مجددی دہلوی

برصغیر کے تیرھویں صدی ہجری کے علما و فقہا میں جنھوں نے زمرہ صوفیا میں شہرت پائی، مولانا شاہ غلام علی دہلوی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ وہ بجا طور پر شیخ الشیوخ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کا اصل وطن بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کا مشہور شہر ہے۔ مختلف اوقات میں یہ شہر اصحاب علم اور ارباب فضیلت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایک خاندان علوی بزرگوں کا تھا۔ اس خاندان کے اسلاف میں شاہ غلام علی کے والد ماجد شاہ عبداللطیف بٹالوی بہت مشہور تھے جو زہد و عبادت اور تقویٰ و قناعت میں عالی مرتبے پر فائز تھے۔ دنیا اور امور دنیا سے منقطع ہو کر جنگلوں کی تنہائی میں جا کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور کئی کئی مہینے اسی عالم میں گزار دیتے اور عوام و خواص میں بے حد تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ غلام علی نے اس صاحب تقویٰ باپ کے گھر ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۵ء) میں جنم لیا۔ شاہ غلام علی کے عم محترم بھی دین داری اور صالحیت کا پیکر تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں کے بقول ''رسول اللہ ﷺ کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا' لیکن ''غلام علی'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

شاہ غلام علی سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک بٹالہ اور اس کے گرد و نواح میں رہے اور وہیں کے اساتذہ سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے والد شاہ عبداللطیف کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا اور وہ شاہ ناصر الدین قادری سے بیعت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے فرزند دلبند کو بھی انہی کے حلقہ بیعت میں شامل کرا دیں۔ چنانچہ باپ کی خواہش کے مطابق ۱۱۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں انھوں نے دہلی کا قصد کیا۔ لیکن جس دن وہ دہلی پہنچے اسی دن شاہ ناصر الدین قادری کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد والد بزرگ وار نے سعادت مند بیٹے سے کہا کہ اب جس کی چاہیں بیعت کر لیں۔ اس اثنا میں پورے چار سال مختلف بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہوتے رہے۔ اس وقت دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا سلسلہ درس جاری تھا۔ شاہ غلام علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس لیا اور سند فراغت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دوران میں

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۷۔

حضرت شاہ رفیع الدین سے بھی استفادہ کیا۔اب وہ تفسیر' حدیث' فقہ اور دیگر علوم رسمیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں مرزا مظہر جان جاناں کے آستانہ رشد و ہدایت پر پہنچے اور ان کے حلقہ بیعت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔اس وقت عمر کی بائیس منزلیں طے کر چکے تھے اور بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔مرزا صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا۔

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

(سجدۂ عشق کے لیے میں نے ایک آستانہ پا لیا' مجھے تو ایک سرزمین کی ضرورت تھی لیکن میں نے آسمان پا لیا۔)

بیعت کے بعد پندرہ سال مرشد کی مجلس ذکر و شغل میں بسر کیے اور مجاہدہ و ریاضت کی مختلف منزلیں طے کیں' یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے۔انھوں نے بیعت تو سلسلہ قادریہ میں کی تھی' لیکن ذکر و اذکار اور شغل و اشغال طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور تمام طرق تصوف کی اجازت حاصل کی۔اپنے مرشد مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت (۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ ۶ جون ۱۷۸۱ء) کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور تمام صوفیائے عصر پر فوقیت لے گئے۔تادم وفات پورے پینتالیس سال مسند ارشاد پر متمکن رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفیض فرمایا۔

شاہ غلام علی نہایت پابند سنت اور متوکل علی اللہ تھے۔اس دور کے امرا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں اور خانقاہ کو مالی امداد دیں' لیکن شاہ صاحب نے ان کی یہ پیش کش کبھی قبول نہ فرمائی۔ایک دفعہ والی ٹونک نواب امیر محمد خاں نے انتہائی التجا سے ان کے اور خانقاہ کے درویشوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔جواب میں ان کو یہ شعر لکھ بھیجا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

(ہم فقر و قناعت کی آبرو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے' امیر خاں سے کہہ دو کہ روزی اللہ کے ہاں سے مقرر ہے)

ان کی ذات سے بے شمار لوگوں نے فیض پایا اور بہت سے ملکوں کے لاتعداد افراد نے حاضر خدمت ہو کر ان سے بیعت کی۔ہندوستان کے علاوہ ترکی' شام' بغداد' مصر' چین' افغانستان' کردستان اور حبش کے لوگ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور شرف ارادت حاصل کیا۔وہ عوام و خواص کا مرکز عقیدت اور مرجع خلائق تھے۔کہنا چاہیے۔

چو کعبہ قبلہ حاجت شد از دیار بعید
روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

(چونکہ کعبہ مرکز حاجت قرار پایا ہے' اس لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں)

ان کی خانقاہ میں ہر وقت کم و بیش پانچ سو فقیر اور درویش رہتے تھے' جو ان سے فیض حاصل کرتے تھے اور باوجودیکہ امداد کے لیے کہیں سے باقاعدہ ایک حبہ بھی مقرر نہ تھا' لیکن سب کے کھانے پینے اور لباس کا وہ خود ہی انتظام کرتے تھے' اور یہ تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد سے چلتا تھا۔ فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا' جس نے جو مانگا دے دیا۔ جو اچھی اور عمدہ چیز بطور تحفہ کہیں سے آتی' اس کو بیچ کر فقرا پر خرچ کر دیتے۔ جو موٹا کھوٹا لباس خانقاہ کے درویشوں کو میسر ہوتا' وہی خود بھی پہنتے۔ جو کھانا عقیدت مند کھاتے' وہی آپ تناول فرماتے۔

خاک نشینی است سلیمانیم
ننگ بود افسر سلطانیم
ہست بسے سال کہ می پوشمش
کہنہ نہ شد جامۂ عریانیم

(میری سلیمانی خاک نشینی ہے۔ میرے لیے سلطانی کا تاج باعث ننگ ہے۔
بہت مدت سے میں لباس عریانی پہن رہا ہوں' لیکن ابھی تک وہ لباس پرانا نہیں ہوا۔ یعنی حرص وطمع اور فخر و غرور سے میرا دل پاک ہو گیا ہے)

اگر کبھی اسباب مادی اور سامان دنیا کا ذکر آتا تو بیدل کا یہ شعر پڑھتے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
ہر چہ ماداریم زاں ہم اکثرے درکار نیست

(اے بیدل! حرص میں قناعت ہی نہیں ہے' ورنہ ہمارے پاس جو کچھ ہے' اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہماری ضرورت سے زائد ہیں)

ان کے شب و روز کا زیادہ حصہ عالم بیداری میں گزرتا۔ بہت کم سوتے' زیادہ تر مصروف عبادت رہتے۔ نیند غالب آتی تو جانماز پر ہی سو جاتے۔ خانقاہ میں بوریا کا فرش اور بوریا ہی کا مصلی تھا۔ وہیں چمڑے کا ایک تکیہ تھا۔ دن رات اسی مصلے پر نشست رہتی اور تمام وقت عبادت میں بسر ہوتا۔ طالبین ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی شخص فرش کے لیے کہتا تو جواب میں سکندر لودھی کے معاصر جمالی کے یہ شعر پڑھتے۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا نے غم دزدو نے غم کالا
گز کے بوریا و پوستکے دلکے پر ز درد دوستکے
ایں قدر بس بود جمالی را عاشق رند لا ابالی را

(ایک لنگی نیچے اور ایک لنگی اوپر یہی ہمارا الباس ہے' جس کے سبب نہ تو کسی چور کا ڈر ہے اور نہ کسی سامان کا غم)

ایک گز بوریا اور پوستیں اور ایسا دل جو درد اور دوست کی آرزو سے پُر ہے۔

جمالی کے لیے جو ایک عاشق اور رند لا ابالی ہے' یہی بہت ہے)

حضرت شیخ نے احکام شریعت سے کبھی تجاوز نہ کیا۔ ہمیشہ امور سنت کو پیش نظر رکھا۔ مال مشتبہ ہرگز قبول نہ کرتے۔ جو شخص خلاف شرع اور خلاف سنت کوئی حرکت کرتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اس کا اپنے قریب آنا گوارا نہ کرتے۔ اس سے مخاطب ہو کر فرماتے:

یا مرو با یارِ ارزق پیرہن

یا بہ کش بر خانماں انگشت نیل

یا مکن با پلیباناں دوستی

یا بنا کن خانہ درخورِ پیل

(یا تو نیلے لباس والے دوست کے پاس نہ جا' یا پھر خاندان پر نیل کی انگلی پھیر دے۔ یا تو مہاوتوں کے ساتھ دوستی نہ رکھ' یا پھر ہاتھی کے لائق اپنا گھر بنا۔)

مطلب یہ کہ ہمارے شریک مجلس ہونا چاہتے ہو یا ہماری صحبت و رفاقت میں آنے کا ارادہ ہے تو ہمارا رنگ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ احکام شرع کی مخالفت بھی کرو اور ہمارے حلقے میں بھی بیٹھو۔ یہ دو عملی یہاں نہیں چلے گی۔

شاہ غلام علی نے اپنے اوقات شب و روز کا ایک نقشہ بنا رکھا تھا' جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے۔ نماز فجر اول وقت میں ادا کرتے۔ اس کے بعد تلاوت قرآن مجید ہوتی۔ وہ قرآن کے حافظ تھے اور قراءت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اشراق تک حلقہ مریدین میں بیٹھتے اور صوفیا کے طریقے کے مطابق توجہ اور استغراق کا سلسلہ جاری رہتا۔ نماز اشراق سے فارغ ہو کر تفسیر اور حدیث کا درس دیتے۔ پھر تھوڑا سا کھانا کھا کر سنت نبوی ﷺ کے مطابق قیلولہ کرتے۔ بعد ازاں اول وقت نماز ظہر ادا کی جاتی۔ پھر طلبا و مریدین کو تفسیر' حدیث' فقہ اور تصوف کی کتابیں پڑھاتے۔ فقہی مسائل کی بھی وضاحت فرماتے۔ نماز عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عصر کی نماز سے اول وقت میں فراغت کے بعد مریدین کا حلقہ قائم ہوتا۔ عشا کے بعد وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اسی حالت میں نیند آ جاتی۔ پھر تہجد کے لیے اٹھ جاتے۔ عقیدت مندوں کو بھی نماز تہجد کی تاکید فرماتے۔

بلا شبہ شاہ صاحب ممدوح تیرھویں صدی ہجری کے جید عالم' نامور صوفی' عظیم المرتبت فقیہ' عابد و زاہد

اور صاحب فضل و کمال بزرگ تھے۔ان کی وجہ سے دیارِ ہند کی روحانی دنیا میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا اور لوگوں کے قلب و ذہن کی دنیا متغیر ہوئی۔اسی بنا پر ان کے عقیدت مند انھیں تیرھویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ تو بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے ہی، دیگر اسلامی ممالک کے بھی بے شمار حضرات ان سے مستفیض ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دین خالص کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

شاہ غلام علی نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، لیکن دہلی میں ان کی خانقاہِ تصوف شاہ عبدالعزیز صاحب کے حلقہ درس کا مقابلہ کرتی تھی اور ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسعت اختیار کر گیا تھا۔ان میں بہ یک وقت دو مہتم بالشان اوصاف پائے جاتے تھے۔یعنی طریق ولی اللّٰہی کا اعتدال و توازن اور علم و عرفان بھی ان میں بہ درجہ اتم موجود تھا، اور مجدد الف ثانی کے جذبۂ احیائے دین، ذوق تصوف اور ولولہ اتباع سنت سے بھی پوری طرح بہرہ مند تھے۔علومِ عقلی و نقلی کے ماہر اور تبلیغ و اشاعت دین کے دلدادہ تھے۔

سرسید احمد خاں کے والد ماجد سید محمد متقی مرحوم کے شاہ صاحب بہت کرم فرما تھے۔سید احمد کی ولادت کے وقت ان کے والد نے شاہ صاحب کو گھر تشریف لانے کے لیے عرض کیا، وہ آئے اور نومولود کے کان میں اذان دی اور بچے کا نام احمد رکھا۔سید احمد سے شاہ صاحب پوتوں کی طرح پیار کرتے تھے۔سید احمد بھی ان کا انتہائی احترام کرتے اور انھیں ''دادا حضرت'' کہتے تھے۔سرسید نے ''آثار الصنادید'' میں نہایت عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے اندازِ تبلیغ، اتباعِ سنت اور علو مرتبت کی عمدہ طریقے سے وضاحت کی ہے۔ان کے والد ماجد، افراد خاندان اور خود سرسید سے ان کو جو محبت و مودت تھی اور پھر سرسید کا خاندان ان سے جو عقیدت و احترام رکھتا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں۔

> ''میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی، اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے۔کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے
>
> کرم ہائے تو مارا گستاخ کرد
>
> کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غم زن و فرزند سے دور رکھا تھا، لیکن اللہ

تعالیٰ کی مرضی یہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں' خصوصاً صغر سن میں جو چاہتا سو کہتا' جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا' آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔ سالہا سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم منور رہا❶۔

شاہ صاحب کے تلامذہ اور مسترشدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہندوستان کے ہر علاقے اور اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل تھے۔ ان میں سے جن حضرات نے خاص طور سے شہرت پائی، ان میں سید اسماعیل مدنی، شیخ احمد کردی، شیخ خالد رومی، شیخ محمد جان باجوری، شیخ ابوسعید دہلوی، ان کے بیٹے مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا رؤف احمد رام پوری، مولانا بشارت اللہ بہرائچی اور سید ابوالقاسم حسینی واسطی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے بے پناہ دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ خالد رومی نے اپنے وطن ترکی واپس جا کر مرشد کے علم و تصوف کو خوب پھیلایا اور تمام دولت عثمانیہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی۔ وہ ترکی کے بلند پایہ علما میں سے تھے، عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے۔ ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

خبر از من دہید آں شاہ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شد بارِ دگر از ابر نیسانی

(حسینوں کے اس بادشاہ کو میری طرف سے یہ خبر پوشیدہ طور پر پہنچا دو کہ ابر نیسانی کی بدولت دنیا ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے۔)

اس سے آگے چل کر کہتے ہیں:۔

امام اولیا سیاح پیدائے خدا بینی — ندیم کبریا، ملاحِ دریائے خدادانی
مہینِ راہنمایاں، شمعِ اولیائے دیں — دلیل پیشوایاں قبلہ اعیانِ روحانی
چراغ آفرینش، مہر برج دانش و بینش — کلیدِ گنجِ حکمت محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدس عبداللہ شہے کز التفات او — دہد سنگِ سیاہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:۔

---

❶ آثار الصنادید ص ۲۱۱۔

وہ اولیا کا امام اور خدا بینی کا ظاہر سیاح ہے۔ وہ کبریا کا ندیم اور پیشواؤں کے سمندر کا ملاح ہے۔

وہ راہنماؤں کا سردار اور تمام اولیائے دین کی شمع ہے۔ وہ حکمت کا رہبر اور روحانی بزرگوں کا قبلہ ہے۔

وہ خلقت کا چراغ اور دانش و بینش کے برج کا سورج ہے۔ وہ حکمت کے خزانے کی چابی اور اسرار سبحانی کا محرم ہے۔

قدس کا امین یعنی عبداللہ ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی عنایت و توجہ سے سنگِ سیاہ میں لعل بدخشانی کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاہ غلام علی کے زمانے کو سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دورِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن علمی اور روحانی لحاظ سے یہ نہایت عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں لاتعداد علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و سلوک کے حلقے قائم تھے، جن کے اثر و رسوخ اور شہرت و قبولیت کے دائرے برصغیر کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئے تھے اور بہت سے اسلامی ملکوں تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ دہلی کے افق پر اس وقت علم و معرفت کا جو شامیانہ تنا ہوا تھا، اس کے متعلق شیخ خالد رومی کہتے ہیں:

بہ دہلی ظلمتِ کفر است ، گفتند و بہ دل گفتم
بہ ظلمت رو اگر در جستجوئے آب حیوانی

یعنی مجھے بتایا گیا کہ دہلی میں کفر کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ اگر تجھے آب حیات کی ضرورت ہے تو پھر تاریکی ہی کی طرف چل۔

بہر حال شاہ غلام علی دہلوی دنیائے تصوف و طریقت کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ علوم عقلی و نقلی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے ملفوظات ''درالمعارف'' کے نام سے ان کے ایک مرید مولانا رؤف احمد رام پوری نے مرتب کیے جو دینی، تاریخی اور معاشرتی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مروجہ علوم کے ماہر تھے اور ان علوم کا باقاعدہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ تجرد کی زندگی بسر کی، وظائف و اوراد، تعلیم و تدریس اور تلامذہ و مریدین کی ذہنی و روحانی اور علمی تربیت ہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ اس عالم اجل اور ولی کامل نے ۱۲ صفر ۱۲۴۰ھ/ ۶ اکتوبر ۱۸۲۵ء کو دہلی میں وفات پائی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے [1]۔

اللهم برد مضجعه ووسع مدخله۔

---

[1] آثار الصنادید ص ۲۰۷ تا ۲۱۲۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۳ تا ۱۵۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۶ تا ۳۵۸۔ رود کوثر ص ۶۴۹ تا ۶۵۷۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۵۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۶۰۔ خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۶۹۳ تا ۶۹۸۔ گلزار اولیا ص ۴۷ تا ۵۴۔

۱۰۔ مفتی غلام غوث گوپاموی

مفتی غلام غوث محمدی گوپاموی۔ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور علما اور نامور فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ درس نظامیہ کی مشہور کتاب سلم العلوم کے شارح قاضی مبارک گوپاموی کی اولاد سے تھے اور اپنے وسعت علم و مطالعہ کی بنا پر حلقۂ علما میں عزت و احترام کا مقام رکھتے تھے۔ عمر کے ابتدائی دور ہی میں حصول علم کا شوق ان کے دل میں کروٹ لینے لگا تھا، چنانچہ صغرسنی ہی میں مدراس کا عزم کیا اور قاضی ارتضا علی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ قاضی صاحب ممدوح ان کے ہم وطن تھے اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور خوب استفادہ کیا۔ حصول علم سے فراغت کے بعد ان کی شہرتِ علمی مختلف علاقوں میں پہنچی تو انھیں علاقہ مدراس کے ایک شہر "گنتور" کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دی۔ محکمہ قضا کے ساتھ افتا کا منصب بھی ان کے سپرد ہوا، علاوہ ازیں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ گنتور اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔

اسی اثنا میں بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری ان کی زندگی کی آخری بیماری ثابت ہوئی۔ علاج کی غرض سے گنتور سے نکلے اور حیدر آباد (دکن) کو روانہ ہوئے۔ لیکن حیدر آباد سے چار میل کے فاصلے پر انتقال کر گئے۔ یہ ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء کا واقعہ ہے[1]۔

۱۱۔ مولانا غلام فرید لاہوری

مولانا غلام فرید لاہوری فقہ و اصول اور دیگر علوم مروجہ میں درک رکھتے تھے۔ اس دور زوال میں انھوں نے بلدۂ لاہور میں بے حد علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ علوم ظاہری میں تو درجہ کمال پر فائز تھے ہی، علوم باطنی میں بھی اس عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ عابد و زاہد اور ذاکر و شاغل عالم دین تھے۔ عمر بھر مشغول درس و تدریس رہے اور حالت گوشہ گیری میں خدمت علم و فن کو مقصد زندگی قرار دیا۔ ارباب دنیا اور اصحاب عز و جاہ سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ اصل کام طلبا کو تعلیم دینا یا مطالعہ کتب میں مصروف رہنا اور یا پھر عبادتِ خداوندی تھا۔ اس کے علاوہ دوسری کسی چیز کو مرکز توجہ نہ قرار دیتے۔

ان کے دو بیٹے بھی اس سلسلے میں انہی کے نقش قدم پر چلے۔ ایک خلیفہ غلام رسول اور دوسرے خلیفہ غلام اللہ۔! انھوں نے باپ کی روایات علمی و تدریسی کو زندہ رکھا اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی علمی خدمت انجام دیتے رہے۔ جس طرح باپ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے، اسی طرح سعادت مند بیٹوں نے بھی بے شمار لوگوں کو علم کی راہ پر لگایا اور ان کی ذہنی و فکری تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹۔

یہ تمام حضرات لاہور اور اس کے گرد و نواح میں تدین و تقویٰ اور فضل و کمال کی وجہ سے اکرام و اعزاز کے مستحق گردانے جاتے تھے۔

مولانا غلام فرید لاہوری کا انتقال ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء کو لاہور میں ہوا❶۔

۱۲- مولانا غلام قادر گوپاموی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر گوپاموی کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ اس میں متعدد علما و فقہا نے جنم لیا اور بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد فاخر تھے جو اپنے عہد کے ممتاز اصحاب علم میں سے تھے۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحق گوپاموی تھے، جنھیں بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ پھر مولانا عبدالحق کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا غلام قادر گوپاموی تھے جو علوم متداولہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ قاضی ارتضا علی گوپاموی کے شاگرد تھے، جن کا مدراس میں حلقۂ درس قائم تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا غلام قادر نے بھی مدراس کو اپنی تدریسی و تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس علاقے میں ان کی مساعیٔ جمیلہ سے لوگوں نے خوب استفادہ کیا اور کثیر تعداد میں اہل علم نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔

مولانا غلام قادر گوپاموی جہاں درس و تدریس میں ممتاز تھے' وہاں تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی انھوں نے تگ و تاز کی اور فقہ و عقائد کے موضوع پر کئی رسالے لکھے۔ لیکن افسوس ہے ان رسالوں کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ صرف یہی پتا چل سکا ہے کہ فقہی مسائل اور عقاید میں انھوں نے تصنیفی خدمات انجام دیں۔
اس عالم اجل نے ۴ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ/ ۳۰ مارچ ۱۸۷۶ء کو مدراس میں وفات پائی❷۔

۱۳- خلیفہ غلام اللہ لاہوری

خلیفہ غلام اللہ لاہوری اپنے عہد کے لاہور کے فاضل شخص تھے۔ مولانا غلام فرید لاہوری کے فرزند اور خلیفہ غلام رسول لاہوری کے برادر صغیر تھے۔ درس و تدریس کے تمام پہلوؤں میں اپنے والد اور برادر کبیر کا نقش حسین تھے۔ ان کا زمانہ لاہور میں سکھ حکومت کا زمانہ تھا اور ظاہر ہے اس نازک ترین زمانے میں تبلیغ دین اور ترویج اسلام کے لیے میدان عمل میں اترنا نہایت مشکل بلکہ بہ الفاظ واضح اپنے آپ کو گوناگوں خطرات میں ڈالنا تھا، لیکن خلیفہ غلام اللہ نے حسن و خوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کے مدرسے میں مختلف اوقات میں بہت سے تشنگان علوم نے حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو اور منطق و معانی

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۵' ۱۵۶۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹' ۳۶۰۔

وغیرہ علوم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔اس عہد کے پنجاب میں ان تینوں باپ بیٹوں کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کی دھوم تھی اور علما کا شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہوگا جو ان حضرات علما سے تعلق تلمذ اور علاقہ نیازمندی نہ رکھتا ہو۔

خلیفہ غلام اللہ لاہوری ارکان حکومت سے قطعاً روابط نہ رکھتے تھے اور گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر لوگوں کی علمی اور ذہنی تربیت کرتے تھے۔

انھوں نے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں جنت کی راہ لی۔"مرجع الفضلا" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے ❶۔

۱۴-مفتی غلام محمد لاہوری

مفتی غلام محمد لاہوری کا چند پشتوں تک کا سلسلہ نسب یہ ہے: مفتی غلام محمد بن مفتی رحیم اللہ بن مفتی رحمت اللہ بن مفتی محمد نقی ـــــ یہ خاندان علم میں خاص شہرت رکھتا تھا۔اس کا تعلق مشہور بزرگ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی سے تھا۔مفتی غلام محمد کے اسلاف میں ایک بزرگ مخدوم مفتی محمد قریشی تھے جو "میاں کلاں" کے عرف سے معروف ہوئے اور جنھوں نے ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں وفات پائی۔سلطان بہلول لودھی نے ان کو لاہور کا مفتی مقرر کر دیا تھا اور وہ ملتان سے نقل مکانی کر کے لاہور آ گئے تھے۔اپنی سکونت کے لیے انھوں نے موچی دروازے کے اندر ایک حویلی تعمیر کی اور ایک محلہ آباد کیا جو اس دودمان فضل کی وجہ سے "کوٹلی مفتیاں" کے نام سے موسوم ہوا۔

مفتی محمد قریشی عرف میاں کلاں اپنے دور کے عالم و فاضل بزرگ تھے، اسی لیے ہندوستان کے بادشاہ بہلول لودھی نے ان کو لاہور کے منصب افتا پر مامور کیا تھا۔ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد بھی کئی پشتوں تک لاہور میں افتا کا منصب اسی خاندان کے علما کے سپرد رہا اور انھوں نے اس منصب کے وقار کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔اور نیک نام ہوئے۔

مفتی غلام محمد نے اپنے والد مفتی رحیم اللہ سے اخذ فیض کیا اور مولانا غلام رسول لاہوری کے حلقہ درس میں شامل رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

لاہور کے اس عالم دین نے ۹ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ (۶ اکتوبر ۱۸۵۹ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔

"خورشید دین محمد" سے سن وفات نکلتا ہے۔

مفتی غلام محمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔بیٹوں نے علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت پائی۔ ایک بیٹے کا نام سید محمد لاہوری تھا۔یہ عالم باعمل بزرگ تھے۔۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ابھی کوٹ مٹھن پہنچے تھے کہ انتقال کر گئے۔ان کی تصنیفات یہ ہیں۔(۱) خلاصۃ المدارج (۲) فقہ محمدی اور (۳) مخزن الفرائض۔

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶۔تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳۔

دوسرے بیٹے حافظ غلام احمد تھے جو ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں فوت ہوئے۔

تیسرے بیٹے کا اسم گرامی مفتی غلام سرور لاہوری تھا۔ یہ فارسی، اردو اور پنجابی کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں خزینۃ الاصفیا، حدیقۃ الاولیا، مدینۃ الاولیا، بہارستان تاریخ، تاریخ مخزن پنجاب، مخزن حکمت، تحفۃ الابرار اور تحفہ سروری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فارسی، اردو اور پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے نثر اور نظم میں خوب خدمت کی اور بہت نام پایا۔ اپنے دور کے مشہور مؤرخ اور اچھے شاعر تھے۔

مفتی غلام سرور جون ۱۸۹۰ء (۱۳۰۷ھ) میں اپنے برادر زادہ مفتی جلال الدین بن سید محمد کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ہیضے میں مبتلا ہو گئے اور دوران سفر میں ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ (۱۴/ اگست ۱۸۹۰ء) کو وفات پا گئے۔ مولانا غلام دست گیر قصوری ان کے رفیق سفر تھے۔ انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی اور میدان بدر کے قریب بالاحسانی میں دفن کیے گئے۔

۱۵- حافظ غلام محمد قادری لاہوری

حافظ غلام محمد قادری لاہوری ''امام گاموں'' کے نام سے معروف تھے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: حافظ غلام محمد بن حافظ محمد صدیق بن حافظ محمد حنیف بن محمد لطیف۔ یہ خاندان علم و عرفان کے زیور سے آراستہ تھا۔ حافظ غلام محمد کے دادا حافظ محمد حنیف کابل سے ترک وطن کر کے پنجاب آئے تھے اور پھر مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ حافظ محمد حنیف بے شک اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے لیکن اس خاندان کی شہرت کا اصل باعث حافظ محمد صدیق ہوئے جو بلند پایہ مدرس، نامور عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ حافظ صاحب ممدوح کا سال وفات ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء ہے۔ یہ لاہور کی مسجد وزیر خاں کے خطیب اور امام تھے [1]۔

حافظ غلام محمد قادری اپنے عہد کے معروف عالم دین تھے۔ فقہ و اصول اور دوسرے علوم مروجہ پر عبور رکھتے تھے اور مسجد وزیر خاں کی خطابت و امامت ان کے سپرد تھی۔ اس مسجد میں ان کا سلسلہ درس بھی جاری تھا۔ سکھوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سی مسجدوں کو بارود خانے اور گھوڑوں کے اصطبل بنا لیا تھا۔ لیکن حافظ غلام محمد کی حکمت عملی کے باعث مسجد وزیر خاں ان کی دست برد سے محفوظ رہی۔ ان کی نیکی، نرم مزاجی اور علم کی بدولت لاہور کے سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ارکان حکومت بھی ان کی تکریم بجالاتے تھے۔ ان کا طرز زندگی کچھ ایسا تھا کہ سکھ حکمران بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود مہاراجا رنجیت سنگھ ان کو ذاتی طور پر جانتا اور ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا' اور اس دور میں یہ بہت بڑی بات تھی۔

حافظ غلام محمد صوفیا کی مجالس میں حاضری دیتے، اہل اللہ سے مخلصانہ روابط رکھتے اور درویش صفت لوگوں سے الفت کا برتاؤ کرتے تھے۔

---

[1] مولانا حافظ محمد صدیق لاہوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد ۷۔

حافظ صاحب ممدوح بہت اچھے خوش نویس تھے اور اجرت پر کتابت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ اس آمدنی کا بڑا حصہ غربا و مساکین اور مستحقین میں بانٹ دیتے تھے۔

ان کے زمانے میں مسجد وزیر خاں کا مدرسہ مرجع علما و طلبا تھا۔ طلبا کا وہ بہت خیال رکھتے اور ان کی ضروریات خود مہیا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم بیمار پڑ جاتا تو اس کا علاج کراتے اور اگر مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو اس کی پریشانی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔

فارسی کے وہ اچھے شاعر تھے اور پر تاثیر شعر کہتے تھے۔ غریب تخلص کرتے تھے۔ ان کا وعظ بھی مؤثر ہوتا تھا۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصنیف شدہ ایک کتاب کا نام ''شمس التوحید'' اور دوسری کا ''گنج مخفی'' ہے جو فارسی نظم میں ہے۔

لاہور کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء میں وفات پائی اور مسجد وزیر خاں کے باہر دفن کیے گئے ❶۔

۱۶- حافظ غلام محی الدین بگوی

حافظ غلام محی الدین بگوی پنجاب کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ کئی پشتوں سے مرجع خلائق تھا اور اس کے افراد علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے والد کا نام نامی حافظ نور حیات، دادا کا حافظ محمد شفا اور پردادا کا اسم گرامی حافظ نور محمد تھا۔ ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حافظ غلام محی الدین کے اسلاف میں ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن بن صالح تھے، جو آٹھویں صدی ہجری میں وارد پنجاب ہوئے۔ پھر مولانا عبدالرحمٰن کی اولاد میں سے ایک بزرگ مولانا محمد ہاشم نے گیارھویں صدی ہجری میں دریائے جہلم کے کنارے موضع بگہ میں سکونت اختیار کی، جو بھیرہ کے قریب ضلع سرگودھا میں ہے۔

مولانا محمد ہاشم کے دو بیٹے تھے، ایک محمد صالح، دوسرے محمد یوسف۔ دونوں کو اللہ نے علم و عرفان اور زہد و ورع کی نعمت سے نوازا تھا۔ مولانا محمد صالح کی اولاد نے قصبہ جھاوریاں اور شاہ پور کو اپنا مسکن بنایا اور مولانا محمد یوسف کے اخلاف نے اپنے آبائی گاؤں بگہ میں اصلاح و ارشاد اور درس و تدریس کا حلقہ قائم کیا۔ آگے چل کر مولانا محمد یوسف کے جانشین مولانا میر داد بگوی اور مولانا میر داد کے صاحب زادے حافظ نور محمد بگوی اپنے عہد کے ممتاز عالم ہوئے جو مبلغ کتاب و سنت تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کے شدید مخالف! حافظ نور محمد کے مسند نشین حافظ محمد شفا ہوئے جو شہزادہ کے عرف سے معروف تھے اور جنھوں نے ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں وفات پائی۔ حافظ غلام محی الدین انہی حافظ محمد شفا کے پوتے تھے اور والد کا اسم گرامی حافظ نور حیات تھا۔

❶ حدیقۃ الاولیا، ص ۱۴۴۔

حافظ غلام محی الدین بگوی اپنے دور کے جید عالم تھے۔ تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، اصول و معانی اور دیگر علوم متداولہ پر عبور رکھتے تھے اور زہد و اتقا میں بے مثال تھے۔ ماہ محرم ۱۲۱۰ھ (اگست ۱۷۹۵ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ منقول ہے جو ان کے بالکل ابتدائی ایام حیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے راوی ان کے والد ماجد حافظ نور حیات ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن وہ تہجد کے لیے اٹھے تو از راہ محبت اپنے اس بچے غلام محی الدین کو اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے اور دریائے جہلم کے کنارے جا پہنچے۔ کپڑا بچھا کر بچے کو لٹا دیا اور خود وضو کر کے نوافل میں مشغول ہو گئے۔ اندھیری رات تھی اور بچہ قدرے فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر بعد انھیں خیال گزرا کہ ایسا نہ ہو کوئی درندہ آ جائے اور بچے کو اذیت پہنچائے، بچے کو اپنے پاس ہی لٹانا چاہیے۔ اس خیال سے جب وہ بچے کو اٹھانے گئے تو دیکھا کہ ایک مبارک صورت سفید ریش بزرگ بچے کو گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ باپ نے بزرگ سے درخواست کی کہ اس بچے کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ باعمل عالم ہو۔ بزرگ نے جواب دیا کہ یہ ازل ہی سے باعمل عالم ہے اور اس سے لوگوں کو بہت فیض پہنچے گا۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ بزرگ آنکھوں سے غائب ہو گئے۔

غلام محی الدین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بچپن ہی میں عام لڑکوں کے ساتھ نہ کھیل کود میں شریک ہوتے اور نہ ان کی ہنگامہ آرائی میں کوئی حصہ لیتے تھے۔ زیادہ تر خاموش رہتے اور اپنے ہم عمروں کو بھی خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔ اس لب و لہجے سے بات کرتے کہ لڑکے ان سے مرعوب ہو جاتے۔

جب چار برس چار ماہ کے ہوئے تو والد نے ان کو مسجد میں لے جا کر حافظ حسن کے سپرد کر دیا جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ حافظ حسن کی اپنی روایت ہے کہ قرآن شریف پڑھاتے وقت وہ بچوں پر بہت سختی کرتے تھے اور جو بچے سبق یاد نہ کر پاتے یا پڑھنے میں سستی کرتے انھیں سخت سزا دی جاتی۔ لیکن غلام محی الدین نے ان کو اس کا کبھی موقع نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اس بچے کو سبق نہیں آتا ہوگا مگر جب سنا اس نے صحیح صحیح سنا دیا۔ اس طرح انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں قرآن شریف پڑھ لیا۔ عالم طفولیت ہی میں ذہین تھے۔

غلام محی الدین نے قرآن پڑھ تو لیا تھا لیکن حفظ نہیں کیا تھا۔ آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد پہلا رمضان آیا تو لوگوں نے ان کے والد حافظ نور حیات سے کہا کہ غلام محی الدین سے نوافل میں قرآن سننا چاہیے۔ والد نے بیٹے سے پوچھا، تم قرآن شریف سنا سکو گے؟ عرض کیا کہ اگر آپ روزانہ میرے ساتھ ایک پارے کا دور کر لیا کریں تو سنا سکوں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا اور اسی رمضان میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور سنا بھی دیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ ”آپ پورے دن میں ایک پارہ حفظ کرتے تھے؟“ بولے ”نہیں! چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا۔“

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد علوم متداولہ کے حصول کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے

چھوٹے بھائی احمد الدین کو ساتھ لے کر دہلی جانے کا قصد کیا۔ احمد الدین کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی اور وہ قرآن مجید کا دسواں پارہ حفظ کر رہے تھے، مگر دہلی کی تیاری اور وہاں پہنچنے تک انھوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا❶۔

دہلی اس زمانے میں مرکز علم و علما تھا اور بہت سے اصحاب کا سلسلۂ درس وہاں جاری تھا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف حضرات علما سے حصول علم کیا مگر حدیث کا درس حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے لیا اور سند حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل کی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب حافظ غلام محی الدین حدیث کی کتابیں ختم کر چکے تو ان کے استاد محترم حضرت شاہ محمد اسحاق اپنے اس عزیز شاگرد کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں لے گئے اور سند حدیث عطا فرمانے کی درخواست کی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے حدیث اور علم حدیث سے متعلق ان سے متعدد سوالات پوچھے، جن کے انھوں نے صحیح صحیح جواب دیے۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور سند حدیث عنایت فرما کر ان کے لیے دعا فرمائی اور فرمایا۔ ''ان شاء اللہ تعالیٰ آپ سے بڑا فیض ہوگا۔'' اور نصیحت کی کہ جب تم وطن واپس جاؤ تو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تفرقہ پڑے۔

حافظ غلام محی الدین قیام دہلی کے زمانے میں شاہ غلام علی مجددی دہلوی سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت سے استفاضہ کیا۔

علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد اپنے وطن (بگہ) آئے۔ ان کے والد ماجد حافظ نور حیات وفات پا چکے تھے۔ پنجاب میں یہ سکھوں کا دور حکومت تھا۔ مولانا غلام محی الدین کی علمی شہرت گرد و نواح میں پہنچ چکی تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین کو ان کے علمیت کا پتا چلا تو وہ بگہ گئے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں بگہ سے لاہور تشریف لانے پر زور دیا۔ چنانچہ وہ لاہور آ گئے اور بازار حکیماں کی لال مسجد میں مسند درس بچھائی۔ تقریباً تیس سال اس مسجد میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ لاہور ہی میں وہ مرض استرخا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر اپنے گاؤں بگہ تشریف لے گئے۔ قیام بگہ کے زمانے میں تیرہ چودہ سال اس مرض میں مبتلا رہے، مگر حالت مرض میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں پنجاب کے معروف بزرگ مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا غلام محی الدین بگوی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، صرف و نحو، علم کلام، منطق و فلسفہ اور معانی و بیان وغیرہ تمام علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے اور فقہی فتووں کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ نہایت متقی، متحمل مزاج اور کثیر الدرس و کثیر المطالعہ تھے۔ ترویج علم اور اشاعت دین کا

❶ حافظ احمد الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند، جلد ۸

سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی انداز میں اس خاندان میں جاری ہے۔

حافظ غلام محی الدین نے دوشنبہ کی شب ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ (۲۲ جون ۱۸۵۷ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ''خورشید عالم'' کے الفاظ سے سن وفات نکلتا ہے ❶۔

۱۷- مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی

مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی اپنے عصر اور علاقے کے شیخ و فاضل بزرگ تھے اور فنون حکمیہ و علوم عقلیہ پر عبور رکھتے تھے۔ علم فقہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، تکمیل تعلیم کے بعد انھیں شہر ''اٹاوہ'' کا مفتی مقرر کر دیا گیا تھا۔ طویل عرصے تک اس شہر کے منصب افتا پر فائز رہے اور اس باب میں بہت شہرت پائی۔ پھر اٹاوہ سے ان کا تبادلہ ''بیر بھوم'' میں کر دیا گیا جو بنگال میں ہے۔

مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی فارسی کے شاعر بھی تھے۔ فارسی کا ایک دیوان ان سے یادگار ہے ❷۔

۱۸- مولانا غلام ناصر رام پوری

مولانا غلام ناصر کے والد کا نام محمد اکرم اور جد امجد کا اسم گرامی محمد اسلم تھا۔ اصلاً خراسان کے رہنے والے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور یوپی کے شہر رام پور میں اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانے میں رام پور کو ایک مسلمان ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور بہت سے علما و فضلا اس ریاست میں موجود تھے۔

مولانا غلام ناصر کی ولادت اور تربیت رام پور میں ہوئی اور وہاں کے اساتذہ سے شرف شاگردی حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جبل پور کے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ عرصۂ دراز تک اس منصب پر فائز رہے۔

حلیم الطبع، متواضع، خوب رو، عمدہ کلام اور بلند اخلاق تھے۔ شاعر بھی تھے۔ علم فقہ میں تو درک رکھتے ہی تھے، اس کے علاوہ ریاضی میں بھی کامل دست رس تھی۔ دیگر علوم مروجہ پر بھی گہری نظر تھی۔ غرض تیرھویں صدی ہجری کے یہ ہندی عالم و فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور متداولہ اصناف علم سے ان کو گہرا ربط و تعلق تھا۔

اس عالم و فقیہ نے ۹ شعبان ۱۲۵۹ھ/۴ ستمبر ۱۸۴۳ء کو رام پور میں وفات پائی ❸۔

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶ تا ۴۷۸۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۷، ۱۵۸۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۱۔

❸ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۲ بحوالہ یادگار انتخاب۔

۱۹- قاضی غلام یحییٰ بہاری

قاضی غلام یحییٰ بہاری فقہ واصول کے ممتاز علما میں سے تھے اور صاحب فضل وکمال اور شیخ عصر تھے۔ کلکتہ کے منصب قاضی القضاۃ پر متمکن تھے۔ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں فقہ کی کتاب ہدایہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ لارڈ ہسٹنگ کے زمانے میں مولوی تاج الدین بنگالی، میر محمد یسین ایرانی اور مولوی شریعت اللہ سنبھلی کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ پھر اس فارسی ترجمے کے حصۂ معاملات کو کپتان ہملٹن نے انگریزی میں منتقل کیا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، لیکن انگریزی ترجمے میں متعدد مقامات پر بہت سی فاش غلطیاں تھیں۔ ان اغلاط سے اس زمانے کے ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہربرٹ ہارنگٹن کو مطلع کیا گیا تو انھوں نے ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں ترجمے کی نظر ثانی اور تصحیح کے لیے اس عہد کے نامور عالم وفقیہ مولانا محمد راشد بردوانی کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترجمے کی تصحیح اور تنقیح وتہذیب کا فرض انجام دیا[1]۔

• بلاشبہ قاضی غلام یحییٰ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور نامور فقیہ تھے جو ایک طرف کلکتہ کے قاضی القضاۃ تھے تو دوسری طرف انھوں نے ہدایہ کو عربی سے فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

ف

۲۰- مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی

مولانا فضل رسول بدایونی عثمانی مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم تھے۔ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور بعض درسی کتابیں اپنے والد مکرم مولانا عبدالحمید عثمانی بدایونی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نورالحق انصاری لکھنوی کا سلسلہ درس جاری تھا' اس میں شریک ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ درسی کتابوں کی تکمیل کے بعد دھول پور کا قصد کیا۔ وہاں حکیم پیر علی موہانی سے علم طب کی کتابیں پڑھیں۔ دھول پور میں مطب بھی کھولا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر ان کے والد مولانا عبدالحمید نے انھیں بدایوں بلالیا۔ کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد بنارس چلے گئے۔ بنارس میں لوگوں کے علاج معالجے کا سلسلہ شروع کیا۔ مدت مدید تک وہاں یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بدایوں آ گئے اور وہاں اپنے والد گرامی سے اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں حجاز مقدس گئے اور حج وزیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں شیخ عبداللہ سراج مکی اور مولانا محمد عابد سندھی مدنی سے سند حدیث لی۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۴۔

اس کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور عرصے تک اپنے شہر میں رہے۔ بعدازاں پھر قصد حجاز کیا اور حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر بغداد کو روانہ ہوئے۔ وہاں سید علی نقیب اشراف سے اخذ طریقت کیا۔ بغداد سے پھر ہندوستان کی راہ لی۔ حیدر آباد (دکن) اس زمانے میں مرکز علم و علما تھا، وہاں انھیں نہایت قدر ومنزلت حاصل تھی اور اس نواح میں اکثر ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ حیدر آباد کے امرائے دولت ان سے خاص تعلق خاطر رکھتے، اپنی مجالس میں جگہ دیتے اور ان کی مالی خدمت کرتے۔

مولانا فضل رسول بدایونی بہت بڑے فقیہ اور مجادلہ و مناظرہ میں مشہور تھے۔ اپنے مسلک اور نقطۂ نظر میں سخت متعصب تھے۔ علما سے مخاصمت اور بحث و جدل میں بہت تیز تھے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تکفیر کرتے تھے اور انھوں نے بدعات و رسوم کی جو تردید کی ہے اس کو غلط قرار دیتے۔ بعض مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بھی ہدفِ تنقید بناتے اور اس ضمن میں بہت آگے نکل جاتے۔

مولانا فضل رسول بدایونی متعدد کتابوں کے مصنف اور محشی تھے جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

البوارق المحمدیہ، تصحیح المسائل، سیف الجبار، فوز المومنین، تلخیص الحق، المعتقد المنتقد، احقاق الحق، کتاب الصلوۃ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فصوص الحکم کی شرح بھی لکھی۔ علاوہ ازیں فلسفہ و منطق کی بعض درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا فضل رسول بدایونی انگریزی حکومت کی ملازمت بھی کرتے رہے۔ پہلے مفتی عدالت اور پھر کلکٹری میں سررشتہ دار کا منصب عطا ہوا۔ اس زمانے میں ضلع بدایوں کا صدر مقام سہسوان تھا۔ بنارس میں راجا انوپ سنگھ کے ہاں سلسلہ ملازمت میں منسلک رہے۔ کچھ عرصہ بریلی میں مطب کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب بدایوں پر انگریزوں کا نظم ونسق باقی نہ رہا تو چند روز وہاں کا انتظام کیا اور سرکاری عملے کی حفاظت کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہ انگریزوں کے حامی تھے، جب انگریزوں کا بدایوں پر تسلط نہ رہا تو انھوں نے ان کے مال و جان کو بچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

بدایوں میں انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد عجیب افراتفری رہی‘ مگر مولوی فضل رسول بدایونی نے کچھ انتظام برقرار رکھا۔ اور لوگوں کی جان و مال بچانے کی کوشش کی۔ ’’حبیب الاخبار‘‘ بدایوں مورخہ ۲۵ جون ۱۸۵۷ء مطابق ۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ کے حوالے سے ایوب قادری رقم طراز ہیں:

’’چونکہ مقدس عالم اور صوفی مولوی فضل رسول نے اعلیٰ انتظامات کیے، لہٰذا کوئی ناقابل مدافعت خاص واقعہ وقوع پذیر نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر لٹیروں اور غارت گروں کی غارت گری سے لوگوں کو بچانے میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور سرکاری آدمیوں کی حفاظت اور امن کے لیے

پوری کوشش کی❶۔"

اس سے آگے لکھتے ہیں:۔

"سرکاری ملازم بہاری لال سب ڈپٹی انسپکٹر ساکن بدایوں جو اس زمانے میں وہیں تھا' لکھتا ہے: حقیقت میں کھٹک کے ٹھاکروں اور شیر علی نے موضع کھیڑا نوادہ کے مسلمان چودھریوں کو ساتھ ملا کر چاہا کہ شہر بدایوں کے شرفا کو لوٹ لیں اور اپنے خبط کی تسکین کا سامان فراہم کریں' لیکن مولوی فضل رسول کے بہترین انتظام نے بدایوں کو اس مصیبت سے بچا لیا۔ مولوی مذکور ان نیک سیرت اور ولی سیرت لوگوں میں سے ہے جو آج کل نایاب ہیں❷۔"

۱۸۵۷ء میں مولوی فضل رسول بدایونی نے انگریزوں کی برملا حمایت کی مگر بعض لوگ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری تحریر کرتے ہیں:۔

"مولانا فضل رسول بدایونی کے سوانح نگار نے اس واقعہ پر کشف و کرامات کا پردہ ڈالا ہے۔ ورنہ حقیقت ظاہر ہے❸۔"

رد وہابیت میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ان کے والد مولانا عبدالحمید بدایونی عثمانی نے بھی رد وہابیت میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ وہ فقہ اور فلسفہ و حکمت کے نامور علما میں سے تھے۔ دنیا اور دنیا داروں سے خاص طور سے تعلق تھا۔ آخر عمر میں بینائی جواب دے گئی تھی۔ اپنے والد محترم سے خرقہ خلافت پہنا، ان کے سجادہ نشین ہوئے اور سلسلۂ بیعت جاری کیا____ وہ ترکی بھی گئے اور سلطان ترکی کے مہمان ہوئے۔

انگریزوں کی حمایت کے صلے میں انھوں نے مراد آباد کے کمشنر سے اپنی موروثی جائداد کا معافی نامہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ ہے کہ وہ ہمیشہ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور بحث و مناظرہ میں مشغول رہے۔ متعدد علما نے ان سے استفادہ کیا جن میں مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سخاوت علی جون پوری، مفتی اسد اللہ الہ آبادی اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی شامل ہیں۔

ہندوستان کے اس عالم نے ستر (۷۰) برس عمر پائی اور پنج شنبہ کے روز ۳ جمادی الاخری ۱۲۸۹ھ/۸ اگست ۱۸۷۲ء کو فوت ہوئے۔ بدایوں میں دفن کیے گئے❹۔

❶ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۱۴۰۔

❷ ایضاً ص ۱۴۰، ۱۴۱۔ بحوالہ فریڈم سٹرگل' ج ۵ ص ۳۱۸۔

❸ ایضاً ص ۱۴۱۔

❹ تذکرۂ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۶۳، ۱۶۴۔ تذکرۂ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۳۸۰ تا ۳۸۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۷۷، ۳۷۸۔ قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۱۲۷۔

۲۱-مولانا فیاض علی عظیم آبادی

مولانا فیاض علی عظیم آبادی مجاہد علما اور سربکف فقہا میں سے تھے۔ مجاہدین کے اس نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو عظیم آباد (پٹنہ) میں مقیم تھا۔ والد کا نام الٰہی بخش اور جدامجد کا اسم گرامی ہدایت علی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے عم محترم حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی تھے، جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد اور انگریزی حکومت کی مخالفت کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے پہلے مقدمہ بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور رمضان کی آخری تاریخ ۱۲۸۱ھ (۲۷ فروری ۱۸۶۵ء) کو سزا کا حکم صادر ہوا۔ پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا۔ پھر پھانسی کی سزا کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی پہنچے اور وہیں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء) کو وفات پائی۔

مولانا فیاض علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ درسی کتابیں مولانا احمد اللہ سے پڑھیں۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے حاصل کی۔ مولانا ولایت علی بھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور مجاہد تھے۔ مولانا فیاض علی نے حدیث کی سند انھی سے لی۔ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی اور عرصے تک ذکر و اذکار اور تدریس و تذکیر میں مشغول رہے۔ فن سپہ گری بھی سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۴۶ء میں مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد گئے اور جنگ دب کے بعد انھی کے ساتھ واپس آئے۔ جنگ امبیلہ میں بھی شریک تھے۔ مجاہدین میں ان کا نام بصیر الدین تھا۔ تذکیر و موعظت میں مشہور تھے۔ نہایت مؤثر وعظ کہتے تھے۔ بے شمار علما اور عوام نے ان سے فیض حاصل کیا۔ تبلیغ جہاد کے سلسلے میں صوبہ بنگال ان کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔

سرحد سے واپس آکر مولانا فیاض علی نے عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دعوت جہاد بھی دیتے اور سرحد جا کر انگریزی حکومت کے ساتھ جنگ کرنے کی تلقین فرماتے۔ اس سلسلے میں انھیں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے وزیر اور دست راست سمجھا جاتا تھا۔

دوبارہ مستقل طور سے مع اہل و عیال کے ہجرت کر کے سرحد چلے گئے تھے۔ مال و متاع، گھر کے سامان اور مویشی وغیرہ سب چیزوں سے دست بردار ہو گئے تھے۔ شاہ محمد حسین تمنوہیہ کی دوسری صاحب زادی سے نکاح ہوا۔ اولاد سے محروم تھے۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ کے فرزند مولانا اشرف علی کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ علاقہ سرحد میں غالباً گلونو بوڑی میں وفات پائی۔ (1)

(1) نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۰۔ سرگزشت مجاہدین ص ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۷۔

ان کے متبنیٰ مولانا اشرف علی جو مولانا احمد اللہ کے فرزند تھے' ان کے ساتھ ہی سرحد چلے گئے تھے۔ مولانا فیاض علی کی وفات کے بعد وطن واپس آ گئے تھے۔ بعد میں عبدالقدیر نام رکھا اور مختلف علوم و فنون حاصل کیے۔ بنارس کالج میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ مدت بہاول پور میں قیام کیا اور ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ سابقہ سرگرم سیاسی زندگی تمام عمران کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنی رہی۔ خاندان کے باقی افراد کی طرح بہت باہمت اور صاحب عزم و استقلال تھے۔ ۲ شوال ۱۳۲۶ھ (۲۸ اکتوبر ۱۹۰۸ء) کو وفات پائی ❶۔

۲۲- مولانا فرحت حسین عظیم آبادی

مولانا فرحت حسین کے والد کا نام فتح علی اور دادا کا وارث علی تھا۔ خاندانی لحاظ سے ہاشمی زبیری تھے۔ اپنے دور کے عالم، محدث اور فقیہ تھے۔ نیکی اور تقوے میں بہت مشہور تھے۔ ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولانا فتح علی عظیم آبادی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد واعظ اور اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے بھی استفادہ کیا۔ سند حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ اخذ طریقت سید احمد شہید بریلوی سے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جگہ مسند درس پر فائز ہوئے۔ موعظت و تذکیر کا فریضہ بھی خوب انجام دیا۔ اس کے بعد جہاد کے لیے سرحد گئے۔ بے شمار علما و مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اس عالم و فقیہ نے صرف ۴۸ برس عمر پائی۔ ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے۔

ـــــ ق ـــــ

۲۳- مولانا قطب الدین دہلوی

مولانا قطب الدین دہلوی کے والد گرامی کا نام محی الدین تھا۔ شیخ و عالم، محدث و فقیہ اور صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے۔ ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاوی فروع و اصول تھے۔ مسائل فقہی پر گہری نظر تھی اور بڑی بڑی کتابوں کی عبارتوں کی عبارتیں حفظ تھیں۔ ان کے حلقہ درس میں بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور ان کے فتوے کو دلائل کے اعتبار سے خاص اہمیت دی گئی۔ یگانۂ علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ زہد و عبادت

❶ سرگزشت مجاہدین' ص ۳۷۴' ۳۷۵۔

اور عفت و قناعت میں بھی منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ اپنے مسلک فقہی میں تعصب کی حد تک متشدد تھے اور حنفیت سے اختلاف اور تقلید کا انکار کرنے والوں کے شدید مخالف تھے۔ حضرت سید نذیر حسین دہلوی ان کے ہم عصر تھے اور بعض مسائل فقہی میں وہ سید صاحب ممدوح کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین دہلوی کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی فقیر محمد جہلمی حدائق الحنفیہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء میں وہ دہلی میں ان کی زیارت سے تو بہرہ ور ہوئے لیکن افسوس ہے ان سے استفادے کا موقع نہ ملا۔

ان کو ''نواب قطب الدین خان'' کہا جاتا تھا اور ان کا شمار رؤسائے دہلی میں ہوتا تھا' اس لیے کہ اجداد و اکابر کا ہمیشہ مغل حکومت سے تعلق رہا اور وہ سلطنت مغلیہ میں اچھے خاصے مناصب پر فائز رہے۔ اسی بنا پر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر ان کا احترام کرتا اور عزت سے پیش آتا تھا۔ باقی عمال حکومت کے نزدیک بھی انھیں مستحق تکریم سمجھا جاتا تھا۔

مولانا قطب الدین دہلوی وعظ و تذکیر اور تبلیغ دین کا انتہائی جذبہ رکھتے تھے اور ہر چوتھے دن باقاعدہ مجلس وعظ منعقد کرتے تھے۔

وہ مصنف، مترجم اور مفسر بھی تھے۔ انھوں نے زیادہ کتابیں اور رسالے اردو میں تصنیف کیے۔ اس طرح انھوں نے اردو زبان کی خدمت بھی کی اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے ان میں ضروری مسائل بھی بیان کر دیے۔ ان کی تصنیفات و تراجم میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں جو حدیث و فقہ سے متعلق ہیں۔

۱- جامع التفاسیر: یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو اردو زبان میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔

۲- مظاہر حق: یہ مشکوۃ شریف کا اردو ترجمہ ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ عام فہم اور شستہ ترجمہ ہے۔

۳- ظفر الجلیل: یہ اردو میں حصن حصین کا ترجمہ ہے۔

(۴) مظہر جمیل (۵) مجمع الخیر (۶) جامع الحسنات (۷) خلاصہ جامع صغیر (۸) ہادی الناظرین (۹) تحفہ سلطان (۱۰) معدن الجواہر (۱۱) وظیفہ مسنونہ (۱۲) تحفۃ الزوجین (۱۳) احکام الاضحیہ (۱۴) فلاح دارین (۱۵) تنویر الحق (۱۶) توقیر الحق (۱۷) تحفۃ العرب والعجم (۱۸) احکام العیدین (۱۹) رسالہ مناسک (۲۰) خلاصۃ النصائح (۲۱) گلزار جنت (۲۲) تنبیہ النساء (۲۳) حقیقۃ الایمان (۲۴) زاد المعاد (۲۵) تذکرۃ الصیام (۲۶) تذکرۃ الربا (۲۷) آداب الصالحین (۲۸) طب نبوی ﷺ۔

وہ کئی مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور بعض علمائے حجاز سے سند حدیث حاصل کی۔ آخری مرتبہ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء میں سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اسی سال مکہ مکرمہ میں وفات پائی [1]۔

[1] آثار الصنادید ص ۲۷۶ '۲۷۷۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸۔ داستان تاریخ اردو ص ۱۸۱ تا ۱۸۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۷ '۳۸۸۔ مفید المفتی ص ۱۴۴۔

۲۴-سید قطب الہدیٰ بریلوی

سید قطب الہدیٰ بن سید محمد واضح بن سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن سید علم اللہ حسنی حسینی بریلوی۔
ماہرین معقول ومنقول میں سے تھے اور اپنے زمانے میں حدیث وفقہ، علوم عربیہ، انشا پردازی اور حسن خط میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور علما وفضلا کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں اپنے والد سید محمد واضح بریلوی سے استفادہ کیا۔ پھر لکھنؤ گئے۔ وہاں علامہ تفضل حسین کشمیری اور دیگر علما سے حصول علم کیا۔ بعد ازاں عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث وفقہ کی تکمیل کی اور ان کے کتب خانے کی متعدد بہترین کتابوں کی کتابت کی۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے سند لی۔ قرات بھی انہی سے سیکھی۔ شیخ غلام علی دہلوی سے اخذ طریقت کیا اور مدت تک ان سے منسلک رہے اور معارف ولطائف سے بہرۂ وافر حاصل کیا۔ پھر اپنے وطن رائے بریلی آئے اور درس وافادہ میں مشغول ہوگئے۔

قوی حافظہ، متبع کتاب وسنت، قامع شرک وبدعت اور شائق کتابت تھے۔ خط انتہائی عمدہ تھا۔

سید قطب الہدیٰ نے صحیح بخاری، جامع ترمذی، عین العلم اور سفر السعادہ پر تعلیقات وحواشی تحریر کیے۔ نیز ''الجانب الشرقی فی کفر فرعون الغرقی'' کے نام سے کفر فرعون سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا ____ اس عالم وفقیہ نے صرف بیالیس برس عمر پائی اور ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۲۰ھ/ ۱۳ مئی ۱۸۱۱ء میں انتقال کیا[1]۔

۲۵-مفتی قوام الدین کشمیری

خطۂ کشمیر کے مشاہیر علما وفقہا میں مفتی قوام الدین کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ قوام الدین بن سعد الدین بن معز الدین بن امان اللہ ____! یہ تمام حضرات اصحاب علم وفضل تھے اور وادئ کشمیر میں عزت واکرام کے مالک تھے۔ مفتی قوام الدین کی ولادت اس علمی گھرانے میں ۴ شعبان ۱۱۵۲ھ/ ۲۶ اکتوبر ۱۷۳۹ء کو ہوئی اور کشمیر ہی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ہوش سنبھالا تو حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ رحمت اللہ، شیخ عبداللہ، ملا مقیم اور اخوند نور الہدیٰ ٹوپی گر کے حلقہ ہائے درس میں شامل ہوئے۔ صغر سنی ہی میں علوم وفنون سے فارغ ہوگئے تھے اور کشمیر کے ممتاز فقہا میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔

مفتی صاحب ممدوح نے قرات وتجوید بھی سیکھی اور اس کے لیے میر قاری تلمیذ شیخ القرا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اجازہ لیا۔ حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی مدنی کے تلمیذ رشید حاجی عبدالولی طرخانی سے حاصل کی۔ نیز حاجی نعمت اللہ نوشہروی اور مولانا امان اللہ شہید کے شاگرد محمد محسن پلچھری سے بھی استفادہ کیا۔ یہ وہی مولانا امان اللہ شہید ہیں جو صاحب ترجمہ مفتی ممدوح کے پردادا تھے۔

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۹۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید محمد امین اویسی کی خانقاہ میں ہنگامۂ درس جاری کیا اور طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار علما وطلبا نے ان سے کسب علم کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔
رفتہ رفتہ کشمیر کی مسند قضا ان کے سپرد ہوئی اور شیخ الاسلام کا منصب پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے علاقہ کشمیر میں اتقا و تدریس کی قلمرو کے یہ تنہا مالک تھے۔ چوبیس سال تک کشمیر کے قاضی اور مفتی رہے اور عالمانہ اسلوب میں یہ نازک خدمت انجام دی۔

مفتی قوام الدین نے شاہ زین العابدین قادری، میاں زکریا لاہوری، شیخ الاسلام احمد اکدلی اور خواجہ عبدالرحیم پیچکمان سے بھی استفاضہ کیا اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔

ایک کتاب ''صحائف سلطانی'' ان کی تصنیف ہے جو ساٹھ علوم پر محیط ہے۔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے ۹ ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ/ ۹ فروری ۱۸۰۵ء میں وفات پائی [1]۔

___ ک ___

۲۶- مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری

مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کا مختصر شجرنامہ یہ ہے: کرامت علی بن امام بخش بن جاراللہ بن گل محمد بن محمد دائم صدیقی جون پوری! وہ ۷/ محرم ۱۲۱۵ھ (۱۱ جون ۱۸۰۰) کو جون پور کے محلہ ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب پینتیس واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علوم درسیہ کی بعض کتابیں مولانا احمد علی چریا کوٹی سے، بعض مولانا احمد اللہ انامی سے اور بعض مولانا قدرت اللہ ردولوی سے پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے اسلاف جون پور کی اسلامی سلطنت کے دور سے وہاں کی جامع مسجد اور عیدین کے منصب امامت و خطابت پر فائز تھے اور اس نواح میں عزت و احترام کے مالک تھے۔ یہ خاندان جون پور کے محلہ ٹولہ میں آباد تھا۔ اس محلے میں اب بھی اہل علم سکونت پذیر ہیں۔

حصولِ علم کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا کرامت علی کا تعلق امیر المومنین سید احمد شہید سے پیدا ہوا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سید صاحب نے ان کو دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا' اس لیے کہ یہ بہت اچھے واعظ تھے اور مؤثر تقریر کرتے تھے۔ ابتدا میں جون پور اور اس کے گرد و نواح میں اشاعت دین اور رد بدعات کا فریضہ انجام دیتے رہے' اس کے بعد بنگال چلے گئے اور تمام زندگی دعوت و تبلیغ میں بسر کر دی۔ بنگال کے مسلمان اس زمانے میں بہت سی خلافِ اسلام رسوم میں مبتلا تھے، باپردہ لباس نہ عورتیں پہنتی تھیں نہ مرد۔ ان کے نام بھی

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۰۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳، ۴۶۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۱۔

ہندوؤں جیسے تھے، مولانا کرامت علی نے ان سے نہایت محبت وتلطف کا سلوک کیا۔ بہت نرمی اور پیار سے ان کو اپنے قریب کیا اور اس سلسلے میں قریہ قریہ گھومے اور وعظ وتقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ ان سے مانوس ہوگئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آپ کو شریعت کے رنگ میں رنگ لیا۔ پورے بنگال میں ان کی دعوت دین کا غلغلہ بلند ہوا اور دیہات وقصبات اور بلاد وامصار کے لاکھوں افراد بدعات و رسوم کو ترک کر کے احکامِ اسلام کی پابندی کرنے اور توحید خالص کو ماننے لگے۔

مولانا کرامت علی نے پچاس سال سے زائد عرصے تک خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بنگال میں جگہ جگہ درس گاہیں قائم کیں، مسجدیں تعمیر کرائیں اور مبلغین وعلما کی ایک بڑی جماعت ان کی کوششوں سے وہاں پیدا ہوگئی۔ وہ عموماً کشتی پر سفر کرتے اور طلبا وعلما ان کے ساتھ رہتے۔ اثنائے سفر میں درس وتدریس کا کام برابر جاری رہتا۔

بنگال کے لوگ جو ابتدا میں ان سے دور بھاگتے تھے ان کی دعوت حق کی وجہ سے ان کو انتہائی معزز و محترم قرار دینے لگے۔ وہ ان کو اپنے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت گردانتے تھے کیونکہ انھی کی تبلیغ دین اور ترویج اسلام کے باعث انھیں راہِ ہدایت نصیب ہوئی تھی۔

مولانا ممدوح جہاں درس وتدریس، ورع وتقویٰ اور پابندیٔ شرع میں بے مثال تھے، وہاں کثرتِ تصانیف میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اشاعت اسلام، مسائل فقہ اور تصوف وسلوک سے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

(۱) مفتاح الجنۃ (۲) زینۃ المصلی (۳) دعوات مسنونہ (۴) قرۃ العیون (۵) تزکیہ نسواں (۶) زادالتقویٰ (۷) راحت روح (۸) نور علیٰ نور (۹) فیض عام (۱۰) تزکیۃ العقائد (۱۱) مرادالمریدین (۱۲) قوت الایمان (۱۳) نسیم الحرمین (۱۴) احقاق الحق (۱۵) تنویر القلوب (۱۶) حق الیقین (۱۷) قول الحق (۱۸) مراۃ الحق (۱۹) رفیق السالکین (۲۰) عکارۃ المومنین بطرد المعاندین (۲۱) براہین قطعیہ فی مولد خیر البریہ (۲۲) کرامتہ الحرمین فی ازالۃ شبہۃ الفریقین (۲۳) ملخص القول الامین (۲۴) اطمینان القلوب (۲۵) ہدایۃ الرافقین (۲۶) برہان الاخوان (۲۷) مخارج الحروف (۲۸) زینتہ القاری (۲۹) شرح جزری اردو (۳۰) شرح شاطبی (۳۱) ترجمہ اردو مشکوۃ جلد اول (۳۲) ترجمہ شمائل ترمذی (۳۳) فتح باب صبیان (۳۴) کوکب دری (۳۵) نور الہدیٰ (۳۶) حجت قاطعہ (۳۷) مکاشفات رحمت (۳۸) دافع الوسواس (۳۹) مصباح الظلام (۴۰) رسالہ بیعت (۴۱) قامع المبتدعین (۴۲) استقامت (۴۳) ردِ بدعت (۴۴) قوت روح (۴۵) سبیل الرشاد (۴۶) القول الثابت (۴۷) رسالہ محمودیہ۔

ان کتب ورسائل کے علاوہ بھی انھوں نے مختلف مسائل کے بارے میں چند چھوٹے بڑے رسالے تحریر کیے۔

~~وہ قرائت اور تجوید کے ماہر تھے~~۔ قرآن مجید نہایت خوش الحانی سے پڑھتے۔ قرات و تجوید انھوں نے اس وقت پڑھی جب وہ حج کے لیے گئے۔ اس ضمن میں سید ابراہیم مدنی اور سید محمد اسکندرانی کی شاگردی کی۔

صاحب نزہتہ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھتے ہیں کہ وہ فقہ واصول اور قرات و تجوید کے ماہر تو تھے لیکن علم حدیث سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔ وكان قليل الخبرة بالحديث (یعنی حدیث کا کم علم رکھتے تھے۔)

ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ بنگال اور ڈھاکہ وغیرہ میں ان کی تبلیغ سے گھر گھر اسلام پہنچا اور وسیع پیمانے پر دین کی اشاعت ہوئی۔ خط خوب صورت تھا اور خط نسخ و نستعلیق اور طغریٰ میں بے مثال تھے۔ ایک دانہ چاول یا چنے پر پوری سورہ اخلاص لکھ دیتے تھے۔

سخاوت وجود کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے۔ صاحب ہمت اور سیر چشم تھے۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا اصل مرکز بنگال کا علاقہ تھا اور وہیں کے ایک شہر رنگ پور میں انتقال کیا۔ جمعہ کے روز صبح صادق کے وقت ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (۳۱ مئی ۱۸۷۳ء) کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [1]۔

مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کے دو بیٹے تھے۔ ایک مولانا حافظ احمد اور دوسرے مولانا عبدالاول۔ دونوں علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کے بھتیجے کا نام مولوی محمد محسن تھا، وہ بھی وقت کے جید عالم تھے۔

۲۷- مولانا کرامت علی اسرائیلی دہلوی

مولانا کرامت علی کے والد گرامی کا نام مولانا حیات علی تھا۔ یہ حضرات ''اسرائیلی'' کی نسبت سے معروف تھے۔ مسلکاً شافعی تھے اور دہلی کے کبار علما و فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا دہلی ہے۔ اس وقت دہلی میں شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا فضل امام خیر آبادی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مسانید تدریس آراستہ تھیں۔ مولانا کرامت علی نے وقت کے ان تمام سرچشموں سے رجوع کیا اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان کے علاوہ شاہ محمد اسحاق دہلوی سے مستفید ہوئے۔ شاہ رفیع الدین سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مولانا فضل امام خیر آبادی سے منقولات کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا محمد اسماعیل شہید سے کچھ عرصہ حدیث کا درس لیا اور پھر شاہ محمد اسحاق سے سند حدیث لی۔ حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی میں خود سلسلۂ تدریس شروع کیا اور مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنے دور کے ممتاز عالم اور نامور فقیہ تھے۔ استحضار مسائل اور فتویٰ نویسی میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔

ایک وقت آیا کہ دہلی میں ان کی معاشی حالت بہت بگڑ گئی اور وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔ مجبوراً ترک

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۱، ۱۷۲۔ تجلی نور ج ۲ ص ۱۳۵، ۱۳۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۹، ۸۰۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۴، ۳۹۵۔ مفید المفتی ص ۱۴۴، ۱۴۵۔ جماعت مجاہدین ص ۲۹۳۔

وطن کر کے حیدر آباد (دکن) کو روانہ ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر آباد اس زمانے میں اہل علم کی قدر و منزلت کے لیے مشہور تھا اور وہاں کے حکام و امراان سے بہت تکریم سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقامات کے متعدد ارباب علم اور اصحاب فقہ نے اس کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ مولانا کرامت علی بھی دہلی سے کوچ کر کے مع اہل و عیال کے وہاں پہنچے اور عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ حیدر آباد کے عدل و قضا کا محکمہ ان کے سپرد ہوا، اور اس خدمت کے صلے میں ہزار روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ پورے بیس سال اس منصب پر فائز رہے اور نہایت محنت و دیانت سے یہ خدمت انجام دی۔ یہ اہم منصب اس زمانے میں اسی شخص کو تفویض کیا جاتا تھا جو حدیث و فقہ میں مہارت رکھتا ہو، اور مولانا ممدوح بجا طور پر اس صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔

عربی علوم اور زبان پر عبور کا یہ عالم تھا کہ ''السیرۃ الاحمدیہ'' کے نام سے عربی میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس عالم کبیر نے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [1]۔

۲۸۔ مولانا کرم الٰہی لاہوری

بلدۂ لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ اس میں بے شمار علما پیدا ہوئے متعدد شائخ نے اس سرزمین میں جنم لیا، بہت سے محدثین اس کی خاک سے ابھرے اور چار دانگ عالم میں مشہور ہوئے۔ لاتعداد فقہا نے اس میں مسند تدریس بچھائی اور لوگوں کی کثیر تعداد کو فیض پہنچایا۔ لاہور کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس میں برصغیر کے مختلف بلاد و قصبات سے اہل علم تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان کے فیض صحبت اور ملازمت و انسلاک سے ایک دنیا مستفید ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ سعادت بھی اس شہر کو حاصل ہوئی کہ متعدد بزرگانِ دین دیگر ممالک سے رخت سفر باندھ کر اس میں وارد ہوئے اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے لوگوں کے قلب و ذہن کو منور کرتے رہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور اصحاب فقہ نے لاہور میں پرورش پائی، ان میں مولانا کرم الٰہی لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے اکابر فقہا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فقہ کے علاوہ صرف و نحو، معانی و بیان، منطق و فلسفہ اور اصول و کلام کے بھی عالم تھے۔ ان کی تمام زندگی درس و افادہ میں گزری۔ اپنے زمانے میں انھوں نے خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ''حدائق الحنفیہ'' کے مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی بھی شامل ہیں۔ مولوی فقیر محمد نے برصغیر کے مختلف مقامات میں متعدد علما سے حصول علم کیا۔ انھوں نے دہلی میں صدر الصدور مفتی صدر الدین خان سے بھی استفادہ کیا اور ان کے ''درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قراءۃ وسماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا''۔ اس کے بعد ''اواخر ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوفہ میں'' آئے۔ لیکن کچھ

[1] آثار الصنادید ص ۲۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۵، ۳۹۶۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲، ص ۴۱۵۔

عرصے کے بعد لاہور چلے گئے۔ ”جہاں فاضل جلیل القدر، فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الٰہی صاحب متوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔“

بہرحال مولانا کرم الٰہی لاہوری فحول علمائے فقہ میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا❶۔

۲۹۔مولانا کرم اللہ دہلوی

مولانا کرم اللہ دہلوی کے والد کا نام نامی عبداللہ تھا۔ عبداللہ دراصل ہندو تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے متاثر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور عبداللہ نام رکھا گیا۔ عبداللہ کے بیٹے کرم اللہ تھے جنھوں نے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین دہلوی (تینوں بھائیوں) سے کسب علم کیا اور مدت تک ان بزرگوں کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ ان سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی مکمل تعلیم حاصل کی اور اپنے زمانے کے بلند مرتبت علما میں شمار کیے گئے۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد اس دور کے مشہور روحانی بزرگ شیخ غلام علی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلسلۂ نقشبندیہ میں سلوک و طریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس طرح ظاہری اور باطنی علوم میں درجہ کمال کو پہنچے۔

اس کے بعد ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء میں ارضِ حجاز کو روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سورت گئے اور کچھ عرصہ سورت میں رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و مشائخ اور عوام و خاص نے ان سے استفاضہ کیا۔ وہاں سے دہلی آئے اور ایک مدت تک دہلی میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں پھر عازم حرمین ہوئے۔ لیکن جب سورت پہنچے تو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور وہیں رک گئے۔

دہلی کے اس عالم و فقیہ نے ۲۷ شعبان ۱۲۵۲ھ/ ۷ دسمبر ۱۸۳۶ء کو مرض سرطان سے سورت میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن کیے گئے❷۔

۳۰۔مولانا کریم اللہ فاروقی

مولانا کریم اللہ کے والد کا اسم گرامی لطف اللہ تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے۔ دہلی کے علمائے احناف میں خاص عزت و شہرت کے مالک تھے۔ ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو کثرت درس و افادہ میں مشہور تھے۔ وقت کے متعدد علما و محدثین سے استفادہ کیا اور علم و فضل سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۳۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳، ۴۷۴۔ نزہۃ الخواطر [illegible] ص ۱۷۲۔

اساتذہ کرام میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رشیدالدین خاں دہلوی اور مولانا محمد کاظم دہلوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات سے تمام علوم مروجہ ورسمیہ کی تکمیل کی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد سید آل احمد مارہروی عرف اچھے میاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذ طریقت کیا اور ایک عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں دہلی کو مراجعت کی اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار علما و مشائخ نے استفادہ واستفاضہ کیا۔

مولانا کریم اللہ فاروقی عالم وفقیہ، معلم ومدرس، قانع اور عابد وزاہد تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے اور ہر طرف سے منقطع ہوکر درس وتدریس میں مشغول رہتے۔

دہلی کے اس عالم وفقیہ نے (۹۰) سال عمر پا کر ۴ رشوال ۱۲۹۱ھ/ ۱۴ رنومبر ۱۸۷۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا❶۔

ل

۳۱۱۔ مولانا لطف علی راجگیری

مولانا لطف علی بن رجب علی راجگیری، ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر راجگیر کے رہنے والے تھے، وقت کے بڑے عالم اور محدث وفقیہ تھے۔ نہایت نیک اور باعمل بزرگ تھے۔ ۱۲۴۵ھ یا ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء میں ولادت ہوئی۔ کچھ ہوش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ اس کے لیے متعدد علاقوں اور شہروں کا سفر کیا اور اس دور کے جید اساتذہ سے مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔ مثلاً مفتی نعمت اللہ لکھنوی، مفتی واجد علی بنارسی، مولانا نورالحسن کاندھلوی، مفتی صدرالدین خاں دہلوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اس زمانے میں دہلی میں میاں سید نذیر حسین دہلی کا سلسلہ درس حدیث جاری تھا' مولانا لطف علی ان سب علما سے حصول علم کے بعد میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور سند واجازہ سے مفتخر ہوئے۔ اس کے بعد اپنے شہر راجگیر گئے۔ اس وقت وہ پینتیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ راجگیر میں انھوں نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے قرآن مجید بھی حفظ کیا۔

ایک مدت کے بعد انھوں نے پھر تحصیل علم کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا۔ سہارن پور میں اس وقت مولانا احمد علی سہارن پوری درس حدیث دیتے تھے' مولانا لطف علی ان کے ہاں گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور علم حدیث میں ان سے استفادہ کیا۔ پھر عازم مراد آباد ہوئے۔ وہاں سید عالم علی حسینی نگینوی سے اکتساب علم کیا۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۲۔ آثار الصنادید ص ۲۷۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۸، ۳۹۹۔

——اس طرح کئی سال حصولِ علم میں بسر ہوگئے۔ اس کے بعد وہ عظیم آباد (پٹنہ) گئے اور وہاں سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا۔ کافی عرصہ وہاں گزارا۔ پھر حجاز مقدس کو روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس عہد میں مدینہ منورہ میں شیخ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مقیم تھے اور طلبا کو حدیث کا درس دیتے تھے، مولانا لطف علی ان کے حلقہ درس میں شریک ہوگئے۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور ٹونک میں اقامت اختیار کی۔ وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور ایک سال کچھ مہینے وہاں مقیم رہے۔ وہاں سے چلے اور اثنائے سفر میں بنارس پہنچے تو بیماری نے آگھیرا اور وہیں وفات پا گئے۔

مولانا لطف علی راجگیری کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اوائل عمر میں منطق و فلسفہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان علوم میں مہارت پیدا ہوئی تو تدریس میں مشغول ہوگئے اس کے بعد حدیث اور فقہ کو مرکز التفات ٹھہرایا اور ان علوم میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ بہت سے علما و طلبا کو حدیث اور فقہ کا درس دیا اور نہایت محنت سے یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ حلم، نرمی، متانت، صدق و صلاح اور ظاہر و باطن کی صفائی میں بے نظیر تھے۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ ۱۸ شوال ۱۲۹۶ھ/۵ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو دوران سفر بنارس میں وفات پائی ❶۔

۳۲۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی

مولانا لطف اللہ بن عبداللہ لکھنوی اپنے علاقے اور عہد کے فاضل اور نامور شیخ تھے۔ اس زمانے کے مشہور علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اصلاً یوپی کے ایک مقام غازی پور کے نواح میں "زمانیہ" کے رہنے والے تھے۔ مولد و منشا زمانیہ ہی تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے اور لکھنؤ جا پہنچے۔ پھر وہیں سکونت اختیار کر لی اور لکھنوی کی نسبت سے مشہور ہوگئے۔ زیادہ تر کتب درسیہ مولوی ولی اللہ لکھنوی سے اور بعض مرزا حسن علی محدث شافعی سے پڑھیں۔ نہایت ذکی، سریع الادراک اور قوی حافظہ عالم تھے۔ بحث و جدال میں بہت تیز تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی۔ بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔ مناظرانہ انداز کی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ اوتاد الحدید لمنکر الاجتهاد والتقليد: یہ کتاب ایک مقدمہ، چار اوتاد اور خاتمے پر محیط ہے۔ اس میں شیخ عبدالحق نیوتنی بنارسی کی تردید کی گئی ہے۔

۲۔ لمعات الثقلين في اثبات حديث الاقتداء بالشيخين: ایک مقدمہ، ذیل، تین لمعات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۱، ۴۰۲۔ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

۳۔ صولة الاسد علیٰ اعداء التعدد: یہ ایک رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ایک شہر کے مختلف مقامات میں نماز جمعہ پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے مولانا محبوب علی سنبھلی کے ایک رسالے "ہدایۃ الجمعۃ" کے جواب میں لکھا، جس میں مولانا محبوب علی نے تحریر کیا تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھنا چاہیے' مختلف مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔

۴۔ مظہر العجائب: یہ سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں شیعہ کا رد کیا گیا ہے۔

۵۔ القبقاب:

۶۔ طعن السنان:

اس کے علاوہ بعض اور رسائل بھی قلم بند کیے۔

مولانا لطف اللہ لکھنوی نے ماہ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ اپریل ۱۸۸۰ء کو لکھنؤ میں وفات پائی [1]۔

م

۳۴۳۔ سید مجاہد الدین حسینی بالا پوری

ہندوستان کے علاقہ برار میں جن فقہا نے جنم لیا، ان میں مولانا سید مجاہد الدین بن معصوم حسینی بالا پوری قابل ذکر ہیں۔ سید ممدوح کا شمار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا تھا اور تیرھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے ممتاز فقیہ اور شیخ تھے۔ بالا پور میں (جو علاقہ برار میں واقع ہے۔) ۱۱۵۸ھ/ ۱۸۴۵ء کو پیدا ہوئے اور کچھ ہوش سنبھالا تو مولانا شمس الدین بالا پوری کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ مولانا شمس الدین اس علاقے کے نامور عالم تھے۔ مجاہد الدین نے ان سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اورنگ آباد کا رخ کیا اور سید نور الہدیٰ حسینی اورنگ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے' ان سے باقی کتب درسیہ کی تکمیل کی اور کافی عرصہ ان سے منسلک رہے۔ اورنگ آباد ہی کے ایک بزرگ سید نور الہدی حسینی کے والد مکرم سید قمر الدین حسینی کا سلسلہ طریقت جاری تھا' فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس میں شامل ہو گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ عرصے تک ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔

اورنگ آباد میں انھوں نے سید نور الہدی اور سید قمر الدین دونوں باپ بیٹے سے کسب فیض کیا۔ سید نور الہدی سے علوم رسمیہ کی تعلیم حاصل کی اور سید قمر الدین کے حضور تصوف وطریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس کے لیے کئی سال اورنگ آباد میں بسر کیے اور تعلیم وتربیت کے بہت سے مرحلوں کو عبور کیا۔

اس کے بعد اپنے وطن بالا پور واپس آئے اور اپنے والد ماجد سید معصوم حسینی بالا پوری سے جو اس دور کے عالم اور صوفی تھے، اخذ طریقت کیا۔ عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور سلوک وطریقت کے بلند مقام پر

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۲' ۴۰۳۔

فائز ہوئے۔ بالا پور ہی میں درس و افادے کا سلسلہ شروع کیا اور طویل مدت تک وہاں ان کا سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما و طلبا نے علم حاصل کیا۔

بعد ازاں ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں حیدر آباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو حلقۂ علما اور طبقۂ امرا میں عزت و احترام کے مستحق گردانے گئے۔ اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) کا حکمران سکندر جاہ تھا، اس نے ان کی بہت پذیرائی کی اور دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔

سید مجاہد الدین حسینی بالا پوری بلاشبہ جید عالم، ممتاز صوفی اور نامور فقیہ تھے۔ اپنے دور اور علاقے میں بڑی شہرت اور عزت کے مالک تھے۔ جمعرات کے روز ۲۰ رجب ۱۲۳۵ھ/ ۳ مئی ۱۸۲۰ء کو فوت ہوئے۔ بالا پور میں مدفون ہیں ❶۔

۳۴۔ مولانا محبوب علی سنبھلی

ہندوستان کا صوبہ یوپی جو اب ''اتر پردیش'' کے نام سے موسوم ہے ' ہمیشہ علما و فضلا کا مسکن رہا ہے۔ اس کے تمام بلاد و قصبات اور دیہات میں اہل علم کی بہت بڑی جماعت مصروف تدریس و تصنیف بھی رہی اور تصوف و طریقت میں بھی اس نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس میں بے شمار مشائخ پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف مقامات پر سجادہ ہائے مشیخت آراستہ کیے اور خلق کثیر کو روحانی فیض پہنچایا۔ یہاں کے مدرسین نے لاکھوں طلبا کو علم کی دولت سے بہرہ مند کیا اور مصنفین نے ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور تحریر کے ذریعے ہر طبقہ فکر کے ان گنت افراد کو مستفید فرمایا۔ یوپی کے علاقوں میں ایک شہر کا نام ''سنبھل'' ہے، علمی لحاظ سے کسی زمانے میں یہ نہایت زرخیز شہر تھا اور اس کے قرب و جوار میں بہت سے اربابِ فضیلت سکونت پذیر تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر کے ایک عالم مولانا محبوب علی تھے جو فقہائے احناف میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سنبھل سے وہ رام پور گئے اور پھر ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ وہاں چند روز شیخ پیر محمد لکھنوی کے مدرسے میں قیام کیا۔ وعظ و تذکیر ان کا مشغلہ تھا۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی (متوفی جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ اپریل ۱۸۸۰ء) ان کے حریف تھے۔ نماز جمعہ کے بارے میں مولانا لطف اللہ کا موقف یہ تھا کہ ایک شہر میں متعدد مقامات پر نماز جمعہ پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مولانا محبوب علی سنبھلی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی مقام پر جمعہ ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا جس کا نام ''ہدایۃ الجمعہ'' رکھا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ ایک شہر کے متعدد مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں، بلکہ تین مقامات میں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے اور اس میں کراہت تحریمی لازم آتی ہے۔ مولانا لطف اللہ نے اس کے جواب میں ''صولۃ الاسد علی اعداء التعدد'' کے نام سے رسالہ تحریر کیا جس میں انھوں نے مولانا محبوب علی کے نقطہ نظر کی تردید کی۔

مولانا محبوب علی سنبھلی سخت مزاج عالم تھے۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر عزیزی کو

❶ محبوب ذی المنن، ج ۲ ص۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۴۰۴، ۴۰۵۔

بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور "ما اھل لغیر اللہ" کے مسئلے میں شاہ صاحب نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کو غلط قرار دیا۔ وہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کے مندرجات کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔

مولانا محبوب علی اگرچہ اپنے دور کے فقیہ اور عالم تھے، تاہم ان کے عہد کے بہت سے فقہا و علما ان کے افکار و خیالات سے نہ صرف متفق نہ تھے بلکہ ان کی تردید کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا پتا نہیں چل سکا، نہ ان کی علمی سرگرمیوں کا اس سے زیادہ علم ہو سکا ہے [1]۔

۳۵۔ شیخ محسن ترہٹی

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تیمی ترہٹی فُرینی، تیرھویں صدی ہجری کے کبار شیوخ و علما اور نامور محدثین و فقہا میں سے تھے۔ ترہٹ کے قریب ایک مقام فُرینہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم صدر رکن الدین ترہٹی سے حاصل کی۔ پھر شریف عبدالغنی مفتی سارنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ جواد سلہٹی اور فقیہ محمد بکری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں شیخ محمد سعید بن واعظ علی عظیم آبادی سے کسب علم کیا۔ ان سب حضرات سے علم نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر کان پور کا عزم کیا۔ وہاں شیخ سلامت اللہ صدیقی بدایونی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہے۔ ان سے صحیح بخاری کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا فضل امام خیر آبادی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بعض علوم کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مفتی واجد علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بنارسی سے اکتساب علم کیا۔

جب وہ مندرجہ بالا علما سے حصول علم کر چکے تو اللہ نے انھیں توفیق حج مرحمت فرمائی اور ارض حجاز کو روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مشہور محدث و فقیہ شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جو قمری حساب سے ۱۲۷۳ھ میں رونما ہوا تھا، ترک وطن کر کے مدینہ منورہ میں جا بسے تھے اور وہاں سلسلۂ درس حدیث جاری کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہندوستان اور دیگر ممالک کے بے شمار علما و طلبا نے ان سے علم حدیث پڑھا اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ شیخ محسن ترہٹی بھی ان کی خدمت میں گئے اور ان سے علم حدیث پڑھا۔

شیخ محسن ترہٹی نے ایک کتاب "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی" سپرد قلم کی۔ یہ رجال کے سلسلے میں حوالے کی کتاب ہے اور نہایت عمدہ اور شان دار کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے وہ بدھ کے روز، عشاء کے وقت ۱۹ رجب ۱۲۸۰ھ / ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کو فارغ ہوئے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے مدینہ منورہ میں مکمل کی [2]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۷۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۷، ۴۰۸۔

۳۶- قاضی محمد مغربی

قاضی محمد بن ابو محمد انصاری مغربی دراصل تلمسان کے رہنے والے تھے اور مسلکاً مالکی تھے۔ اپنے وطن میں قرآن مجید حفظ کیا اور علم حدیث کی تکمیل کی۔ قرات بھی وہیں پڑھی۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ گئے، وہاں علم فقہ میں عبور حاصل کیا۔ پھر عازم ہند ہوئے اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس عہد میں لکھنؤ میں درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا غلغلۂ درس بلند تھا۔ اس میں شریک ہوئے اور مولانا ممدوح سے فقہ، اصول فقہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں مکمل کیں۔ پھر دہلی کو روانہ ہوئے اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ دہلی سے نجیب آباد کا عزم کیا اور کافی مدت وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ نجیب آباد سے مدراس روانہ ہوئے اور وہاں کی مسند افتاان کے سپرد کی گئی۔

قاضی محمد مغربی جلیل القدر عالم، ممتاز فقیہ اور حافظ حدیث تھے۔ قرات سبعہ پر عبور رکھتے تھے۔ کتب حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ الفاظ اور معانی نوک زباں تھے۔ نہایت ذہین اور عالی دماغ تھے۔ اللہ پر توکل کا یہ حال کہ لوگوں نے ان سے کہا، اپنی اولاد نواب کے حوالے کر دیں۔ فرمایا: واللہ! میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ اپنی اولاد کو صرف اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ: وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون۔

ان کی اولاد علم و فضل اور امارت و ریاست میں بلند مرتبے کو پہنچی اور دیار ہند میں ان کے خاندان کے افراد نے بڑی عزت پائی۔

ارض ہند کے اس مالکی فقیہ و عالم نے ۱۳ محرم ۱۲۰۱ھ/ ۵ نومبر ۱۷۸۶ء کو انتقال کیا❶۔

۳۷- سید محمد سورتی

ارض ہند میں سورت وہ شہر ہے جس کو بے شمار علما و فضلا کے مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جب سے یہ سرزمین اسلام سے آشنا ہوئی ہے، سورت اور گجرات وغیرہ میں بہت سے ارباب فضیلت پیدا ہوئے اور متعدد اصحاب کمال نے مختلف مقامات سے یہاں آکر سکونت اختیار کی۔ اس بلدۂ علم کے علما میں ایک شخص سید محمد بن ابو محمد حسین تھے جو تیرھویں صدی ہجری میں اس نواح کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ سورت اور اس علاقے کے دیگر مقامات میں نہایت شہرت رکھتے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کے زمانے میں اُچ شریف کے ایک عالم سید محمد بن عبدالرزاق حسینی اچی، سورت میں سکونت پذیر تھے، سید محمد حسینی سورتی نے انہی سے اخذ علم کیا اور اپنے شہر اور علاقے کے مشاہیر علما و فقہا میں گردانے

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۹۔

گئے۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کا دور تھا اور انگریزی حکومت کے محکمہ عدلیہ میں باقاعدہ مفتی مقرر تھے جو عدالتوں میں پیش ہونے والے دینی اور شرعی معاملات میں فتوے جاری کرتے تھے اور پھر ان کے فتوے کی روشنی میں فیصلے صادر ہوتے تھے۔ سورت میں بھی محکمۂ افتا قائم تھا۔ صاحب ترجمہ سید محمد حسینی چونکہ فقہ اور دیگر علوم میں دست رس رکھتے تھے، اس لیے ان کو افتا کا منصب تفویض کیا گیا' جس پر یہ طویل عرصے تک متعین رہے۔

افتا کی خدمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا' جس میں بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

سورت کے اس جید عالم و فقیہ نے غرہ ذیقعدہ ۱۲۲۸ھ/ اپریل ۱۸۷۲ء میں وفات پائی ❶۔

۳۸-مولانا محمد حیدر آبادی

گزشتہ دور میں حیدر آباد (دکن) میں علما و فقہا کو بہت بڑی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے حکمران اہل علم کی بے حد تعظیم کرتے اور ان کو انتہائی لائق اکرام قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے نقل مکانی کر کے بہت سے علما حیدر آباد میں جا آباد ہوئے تھے اور امرائے حیدر آباد ان سے بہ درجہ غایت احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔ علما کی خاصی بڑی تعداد ایسی تھی جو علاقہ دکن سے تعلق رکھتی تھی اور وہاں کے حکمران ان کے ساتھ بھی نہایت تکریم سے پیش آتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے مقامی علما میں مولانا محمد بن عزت حیدر آبادی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ وہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھیں ان کے فضل و کمال کی بنا پر ریاست کی طرف سے نواب محی الدولہ محمد یار خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔ وہ دکن کے صدر الصدور اور دولت آصفیہ کے محتسب تھے۔ یہ مناصب ان کی علمی اور فقہی قابلیت کی وجہ سے عطا کیے گئے تھے۔

وہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی اور حاکم دکن کے نزدیک عزت و احترام کے مستحق گردانے گئے۔ امرائے مملکت اور دیگر تمام لوگ ان کی تکریم کرتے تھے۔ علما و مشائخ کے حلقوں میں بھی ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اہل علم کی کثیر جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ وہ اس درجے سخاوت وجودت کا مظاہرہ کرتے کہ علما و مشائخ کو بڑی بڑی رقوم و صلات سے نوازتے۔

خراجی زمین کے متعدد قطعات ان کے پاس تھے جو ان کی اولاد و احفاد کو بھی منتقل ہوئے۔ علم و عمل، غنا و سخاوت اور مال و دولت میں ان کی طرح ان کی اولاد نے بھی بڑی شہرت پائی۔

مولانا محمد حیدر آبادی نے ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ/ ۲ مئی ۱۸۶۷ء کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۱ بحوالہ حدیقۃ سورت۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۲ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

۳۹- مولانا محمد تھانوی

مولانا محمد بن احمد اللہ فاروقی تھانوی، مشہور علما و فقہا میں سے تھے۔ مولد و منشا تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) ہے۔ پہلے مولانا عبدالرحیم تھانوی اور شیخ قلندر بخش جلال آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے متعدد درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر عازم دہلی ہوئے، وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے فلسفہ و منطق کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں دہلی میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کا ہنگامۂ درس حدیث زوروں پر تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث میں عبور حاصل کیا۔

مولانا محمد تھانوی نہایت ذکی' بے حد ذہین اور نرم مزاج و نرم کلام تھے۔ ابتدائے عمر ہی سے اصحاب تقویٰ اور بزرگان دین سے تعلق رکھتے تھے۔ صغر سنی ہی میں سید احمد شہید بریلوی کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے تھے۔ جب جوانی کو پہنچے تو شیخ نور محمد جھنجانوی سے اخذ طریقت کیا۔

بعد ازاں ٹونک گئے اور وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ مدت مدید تک وہاں درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن تھانہ بھون واپس آ گئے اور تمام عمر تذکیر و تلقین اور دعوت و ارشاد میں صرف کر دی۔

مولانا ممدوح متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں: دلائل الاذکار فی اثبات الجہر بالاسرار' القسطاس فی اثر ابن عباس' ارشادِ محمدی' اثبات ذکر بالجہر' مکاتبت محمدیہ' المناظر المحمدیہ' تفصیل الختنین' تعلیقات علیٰ شرح عقائد۔

تھانہ بھون کے اس عالم وفقیہ نے ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا اور چھیاسٹھ برس عمر پائی ❶۔

۴۰- مولانا محمد شاہ جہان پوری

مولانا محمد افغانی شاہ جہان پوری کا اصل نام محمد زمان خان تھا اور انھیں محمد زمان خان شہید کہا جاتا ہے (جیسا کہ آگے بتایا جائے گا) ان کو شہید کر دیا گیا تھا۔ باپ کا نام اکبر تھا۔ ۳۔ ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ/ ۲۹ مئی ۱۸۲۷ء کو شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور کچھ بڑے ہوئے تو وہیں کے علما سے حصولِ علم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر کان پور گئے اور وہاں مولانا سلامت اللہ صدیقی بدایونی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتب درسیہ پڑھیں۔ بعد ازاں حیدر آباد جا کر شیخ کرامت علی دہلوی اسرائیلی سے جو شافعی المسلک عالم تھے' کتب حدیث کا درس لیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حیدر آباد (دکن) ہی میں سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وسعت علم و فضل کی بنا پر تھوڑے ہی عرصے میں حیدر آباد اور اس کے گرد و نواح میں ان کی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۴۱۲، ۴۱۳

شہرت پھیل گئی۔ والیٔ دکن نواب ناصر الدولہ تک ان کے فضل و کمال کا شہرہ پہنچا تو اس نے ان کو طلب کیا اور اپنے بیٹے افضل الدولہ کا معلم مقرر کر دیا۔ افضل الدولہ فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے محبوب علی خاں کے معلم بنا دیے گئے۔ اسی اثنا میں سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ دمشق' شام' بیت المقدس' نجف' طف (کربلا) بغداد اور بعض دیگر اسلامی بلاد و امصار کا سفر کیا۔

عابد و زاہد' ایثار پیشہ' جواد اور متوکل علی اللہ تھے۔ تمام عمر شادی نہیں کی' تجرد کی زندگی بسر کی۔ طلبا کو درس دیتے اور درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ طلبا کے لباس' ان کی سکونت اور اکل و شرب کی خود ہی کفالت کرتے۔ جب طلبا تعلیم سے فارغ ہو جاتے تو امرا و حکام سے سفارش کر کے ان کی ملازمت وغیرہ کا بھی انتظام کرتے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب خیر المواعظ ہے جو دو جلدوں میں ہے اور حدیث کے موضوع پر ہے۔ ایک بستان الجن اور ایک کتاب الرحلہ ہے۔ ایک اور کتاب ہدیۃ المهدویہ ہے جو فرقہ مہدویہ کے سید محمد جون پوری کے متبعین کی تردید میں ہے۔ یہی کتاب ان کی شہادت کا باعث بنی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو حیدر آباد کے فرقہ مہدویہ کے لوگ مشتعل ہو گئے اور ان کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی غضب ناک ہو کر آیا اور ان پر حملہ کر کے انھیں قتل کر دیا۔ یہ حادثہ نمازِ مغرب کے بعد اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے' قاتل نے زور سے خنجر مارا اور ان کے خون کے چھینٹے قرآن کی اس آیت پر جا گرے:۔ "فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ" یہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے: سو دیکھیے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

ان کی شہادت منگل کے روز ۶ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ/۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو حیدر آباد (دکن) میں ہوئی اور اپنے مدرسے کے احاطے میں دفن کیے گئے ❶۔

۴۱۔ سید محمد لکھنوی

دیارِ ہند کے تیرھویں صدی ہجری کے شیعہ علما و فقہا میں سید محمد بن دلدار علی حسینی نقوی کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے۔ شیعہ کے مجتہد تھے۔ ان کے اسلاف نصیر آباد کے رہنے والے تھے اور بعد کو لکھنؤ آ گئے تھے' اس لیے یہ نصیر آبادی بھی کہلائے اور لکھنوی بھی۔!

سید محمد ۱۷۔ صفر ۱۱۹۹ھ/۳۰ دسمبر ۱۷۸۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید دلدار علی کے بڑے بھائی سے حصول علم کیا۔ طویل عرصے تک ان کے حلقۂ شاگردی میں رہے اور تقریباً انیس (۱۹) سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تکمیل سے فارغ ہو گئے۔ پھر خود درس و تدریس کی تیاری شروع کی' جس کی ان کے والد سید دلدار علی نے

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۸ تا ۱۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۳' ۴۱۳' ۴۱۴۔

۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں اجازت دی۔ مسند تدریس پر فائز ہونے کے بعد ان سے ان کے بھائیوں سید حسین، سید علی اور بہت سے علما نے استفادہ کیا۔

سید محمد نقوی لکھنوی کو فقہ و اصول اور کلام میں امتیازی مقام حاصل تھا اور اپنے علم وفضل کی بنا پر بادشاہانِ اودھ کے نزدیک بڑی عزو جاہ کے مالک تھے۔ بالخصوص امجد علی شاہ ان کو نہایت لائق احترام گردانتا تھا۔ اس نے ان کو سلطان العلما کے لقب سے نوازا اور مملکت اودھ کا منصب افتا ان کے سپرد کیا۔ وہ ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرتا، ان کی صحبت میں بیٹھتا، ان سے استفادہ کرتا اور نہایت انکسار سے پیش آتا۔

تمام اہم مسائل کے حل و کشود کے لیے اس دور کے شیعہ حضرات سید محمد نقوی سے رجوع کرتے تھے۔ عوام وخواص شیعہ میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

اصل الاصول: یہ کتاب سید مرتضٰی اخباری کی تردید میں ہے، جنھوں نے ان کے والد سید دلدار علی نقوی کی کتاب اساس الاصول پر نقض وارد کیا۔

سید علی طباطبائی کی شرح الصغیر پر تعلیقات۔

ملا حمد اللہ سندیلوی کی شرح سُلم پر تعلیقات۔

الصمصام القاطع: یہ کتاب مذہب اہل سنت کے ابطال میں اور اس بات کے اثبات میں ہے کہ وہ اہل بیت سے عداوت رکھتے تھے۔

طعن الرماح: یہ فدک اور قرطاس کی بحث سے متعلق ہے۔

ایک کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تحفہ اثنا عشریہ کی اس بحث کے جواب میں ہے جو انھوں نے مسئلہ امامت کے بارے میں کی ہے۔

الضربة الحیدریه فی رد الشوکة العمریه: یہ کتاب مولانا رشید الدین خان دہلوی کی الشوکة العمریه کے رد میں ہے۔

ثمر الخلافة: یہ اس بات کے اثبات میں ہے کہ خلافت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لیے مثمر تھی۔

العجالة النافعه: یہ علم کلام اور اصول دین سے متعلق ہے۔

سم الفار: یہ اہل سنت کے رد میں۔

البرق الخاطف: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں۔

ایک رسالہ نماز جمعہ سے متعلق۔

عاملی کی زبدة الاصول کی شرح جو نامکمل رہی۔

الفوائد النصيريه: زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کے موضوع سے متعلق ہے۔ یہ کتاب انھوں نے محمد علی شاہ کے نام سے موسوم کی جو اس کتاب کی تصنیف کے وقت نصیر الدولہ کے لقب سے ملقب تھا۔

کشف الغطاء: یہ کتاب ایک شیعہ عالم سید یار علی نصیر آبادی کے رد میں ہے، جنھوں نے ان کے والد سید دلدار علی نقوی کی تصنیفات پر اعتراضات وارد کیے تھے۔

گوھر شاھوار: اس میں قرآن مجید اور اہل بیت کے درمیان مفاضلت ثابت کی گئی ہے۔

البیع المثانی: قرأت سے متعلق۔

احیاء الاجتہاد: اصولِ فقہ کے موضوع پر۔

ایک کتاب پاؤں پر مسئلے سے متعلق ہے۔

سید محمد لکھنوی نے ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی ❶۔

۴۲۔مفتی محمد بردوانی

علاقۂ بنگال میں جن علما و فقہا نے شہرت اور ناموری حاصل کی، ان میں مفتی محمد بن ضیاء الدین بردوانی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور سرزمین بنگال کے ایک مقام بردوان کے رہنے والے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور دیگر مدارس میں تعلیم حاصل کی اور علوم و فنون میں ممتاز ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کلکتے کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ میں "مولوی" کے منصب سے سرفراز کیے گئے جو اس زمانے میں عدلیہ کا ایک اونچا منصب تھا اور انھی حضرات کو تفویض کیا جاتا تھا جو فقہ اور دیگر علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس کے بعد کلکتہ کے عہدۂ افتا پر فائز ہوئے اور اس میں کامیاب رہے اور اسی لیے مفتی مشہور ہوئے۔

مفتی محمد بردوانی نے ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء میں فقہ کی انتہائی کتاب ہدایہ کے فارسی ترجمے کی تصحیح کے فرائض انجام دیے اور یہ خدمت انھوں نے ہندوستان کے وائسرائے سر جارج ہلرو بارلو کے زمانے میں ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہربرٹ ہارنگٹن کے حکم سے انجام دی۔ ہدایہ کے جس فارسی ترجمے کی انھوں نے تصحیح کی وہ کلکتے کے سابق قاضی القضاۃ غلام یحییٰ خاں بہاری نے کیا تھا۔

مفتی محمد بردوانی ارض بنگال کے نامور فقیہ اور معروف عالم تھے۔ اپنے علم کی بنا پر ملک کے علمائے دین اور انگریز حکمرانوں کے نزدیک احترام کا مقام رکھتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے اس فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا ❷۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۵، ۴۱۶۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۷۔

۴۳۔مولانا سید محمد غزنوی

مولانا سید محمد غزنوی' حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند تھے۔اپنے دور کے شیخ و عالم اور محدث تھے۔ان کے والد گرامی حضرت عبداللہ غزنوی کے حالات فقہائے ہند کی نویں جلد میں بیان ہو چکے ہیں۔اس ضمن میں کہیں کہیں سید محمد غزنوی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

سید عبداللہ غزنوی کو اعلائے کلمۃ الحق اور اشاعتِ توحید و سنت کی پاداش میں اس زمانے کے والی افغانستان نے اپنے ملک سے نکال کر پشاور کی طرف دھکیل دیا تھا۔اس وقت خاندان کے جو لوگ ان کے ساتھ تھے' ان میں صاحب ترجمہ مولانا سید محمد غزنوی بھی شامل تھے۔اہل حق کا یہ قافلہ مختلف مقامات سے ہوتا ہوا مشرقی پنجاب کے شہر امرت سر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔اس کے تمام افراد صالحیت و تقویٰ میں بے مثال تھے۔

مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی کا تذکرہ سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر کی ساتویں جلد میں' مولانا شمس الحق ڈیانوی کی قلمی کتاب تذکرۃ النبلا کے حوالے سے کیا ہے اور ان کے فضل و کمال' اتقا' زہد و عبادت اور تدین و نجابت کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے ان اوصاف سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے' جس کے دل میں ان کے خلاف بغض و کدورت کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہو۔

سید محمد غزنوی' افغانستان کے شہر غزنہ کے نواح میں ایک قریہ ''صاحب زادگان'' میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تربیت کی منزلیں وہیں طے کیں۔ان کے والد ماجد حضرت عبداللہ غزنوی جو نیکی اور علمی رفعت میں ممتاز تھے' اپنے اس بیٹے سے نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔انھوں نے ان کو مختلف علوم کی درسی کتابیں پڑھائیں۔اس کے بعد یہ لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے واردِ ہند ہوئے اور امرت سر کو اپنا مسکن ٹھہرایا تو مولانا سید محمد غزنوی نے دہلی کا عزم کیا۔وہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کا سلسلۂ درس حدیث جاری تھا' اس میں شامل ہوئے۔ان سے علم حدیث پڑھا اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امرت سر آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مولانا ممدوح کا شمار اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے۔وہ ان حضرات میں سے تھے جو مخالفین کی طرف سے اللہ کی راہ میں تکلیفوں اور اذیتوں میں مبتلا کیے گئے اور احیائے سنت کے سلسلے میں جنھیں ترکِ وطن کرنا پڑا۔سید عبدالحی حسنی ان کا تذکرہ کرتے ہوئے نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:۔

وھو اکبر ان ینبہ علی سیر تہ مثلی۔

(ان کی ذاتِ گرامی اس سے کہیں بلند ہے کہ میرے جیسا کوئی شخص ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرے۔)

انھوں نے تفسیر جامع البیان پر حاشیہ لکھا' جس کی علما نے بے حد تحسین کی۔ بلاشبہ مولانا مرحوم تیرھویں صدی ہجری کے مشہور مفسر' محدث اور فقیہ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ/نومبر ۱۸۷۹ء کو امرت سر میں فوت ہوئے ❶۔

۴۴۔ قاضی محمد خاں رام پوری

ہندوستان کے شہر رام پور کے فقہائے احناف میں قاضی محمد خاں بن عرفان رام پوری اپنے عصر اور علاقے کے نامور فقیہ تھے اور ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے فضلا اور شیوخ میں ہوتا تھا۔ ان کے والد ملا عرفان خراسان کے باشندے تھے' وہاں سے ہندوستان آئے اور بحرالعلوم عبدالعلی انصاری فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد رام پور میں سکونت اختیار کی اور فقہ و اصول میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے بیٹے قاضی محمد خاں کا مولد و منشا رام پور ہے۔ اپنے والد ملا عرفان' مفتی شرف الدین رام پوری' ملا حسن لکھنوی اور بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ حصولِ علم سے فارغ ہوئے تو اپنے شہر رام پور میں مسند درس آراستہ کی۔ اس زمانے میں رام پور کو علما کے مسکن کی حیثیت حاصل تھی۔ قیام رام پور کے زمانے میں بہت سے علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

رام پور سے ٹونک گئے۔ ٹونک میں اس وقت متعدد اہل علم فروکش تھے۔ وہاں ان سے امیر ٹونک نواب وزیرالدولہ نے علم حاصل کیا' اور بھی کئی لوگ مستفید ہوئے۔ نواب وزیرالدولہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں ٹونک کے محکمۂ قضا پر متعین کیا۔ پھر وہیں اقامت گزیں ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری تھے' وہ بھی فقہ و اصول کے عالم تھے' لیکن فقہی نوعیت کے اختلافی مسائل میں متعصب حنفی تھے۔ اس کے برعکس قاضی محمد خاں نرم مزاج تھے۔ اگرچہ مسلکاً یہ بھی حنفی تھے' لیکن مسائل کی وضاحت میں کسی نوع کے تعصب کا اظہار نہ کرتے۔ اپنی بات مثبت انداز میں بیان فرماتے۔ خوش مزاج اور بلند اخلاق عالم تھے۔ کسی کا دل دکھانا اور مخاطب کو ذہنی یا قلبی تکلیف پہنچانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

افسوس ہے تیرھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا ❷۔

۴۵۔ مرزا محمد کشمیری

مرزا محمد بن عنایت احمد کشمیری دہلوی' شیعہ عالم تھے۔ اپنے وقت کے فاضل شخص تھے۔ اصلاً کشمیری تھے' ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ دہلی جا بسے تھے۔ پھر دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولد و منشا دہلی ہے۔ عالم طفولیت ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' دہلی کی

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۷' ۴۱۸ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۸' ۴۱۹۔

مسند تدریس پر متمکن تھے، یہ بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ علم فقہ کے لیے سید رحم علی دہلوی کی خدمت میں گئے، ان سے فقہ کی کتابیں درساً درساً پڑھیں۔ علم طب اس دور کے معروف طبیب حکیم شریف دہلوی سے حاصل کیا اور کافی عرصے تک ان سے استفادہ کرتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بہت سے علما و طلبا کو مستفید کیا۔ علم کلام اور مجادلہ و مناظرہ میں تیز تھے اور اس سلسلے میں سب سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ فن طب میں بھی کامل تھے اور علاج کے لیے دور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ بعض اہم کتابوں کی تلخیص بھی کی۔ ان کی تصنیفات و تلخیصات میں یہ کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ النزھۃ: اس میں اپنے استاد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے پانچ ابواب کی تردید کی گئی ہے۔
۲۔ عاملی کے رسالہ ابوجبیزہ کی شرح۔
۳۔ تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی اختلال رجال اہل الخلاف:۔ اس میں کتب صحاح ستہ کے ان رجال کی نشان دہی کی گئی ہے، جو کذب، وضع، ضعف، خروج، ناصبیت، ارجا اور قدریت سے متہم ہیں۔
۴۔ ایک رسالہ تعصبات اہل سنت کے بارے میں ہے۔
۵۔ سمعانی کی مشہور کتاب ''الانساب'' کا انتخاب۔
۶۔ علی متقی کی کنز العمال کے اس حصے کا انتخاب جو ان کے نزدیک امامت حضرت علی، امامت اولاد علی اور صحابہ کے معاملات پر دلالت کناں ہے۔
۷۔ رویت الٰہی سے متعلق ایک رسالہ۔
۸۔ حافظ ابن حجر کی فتح الباری شرح صحیح بخاری کی تلخیص۔
۹۔ قسطلانی کی ارشاد الساری کی تلخیص۔
۱۰۔ تلخیص الجمع بین الصحیحین، حمیدی۔
۱۱۔ تلخیص جامع الاصول۔
۱۲۔ تلخیص الاستیعاب، ابن عبدالبر۔
۱۳۔ تلخیص حلیۃ الاولیاء ابونعیم۔
۱۴۔ تلخیص مسند امام احمد بن حنبل۔
۱۵۔ تلخیص فتاویٰ عالم گیری۔
۱۶۔ تلخیص تاریخ الرسل والملوک، طبری۔
۱۷۔ تلخیص الخمیس فی احوال النفس النفیس۔

۱۸۔ تلخیص شرح المقاصد، تفتازانی۔

۱۹۔ تلخیص شرح المواقف، جرجانی۔

۲۰۔ تلخیص کتاب السیاسۃ والامامۃ، دینوری۔

۲۱۔ تلخیص شرح المواقف، جرجانی۔

اس کے علاوہ متعدد تصنیفات و تلخیصات ان کی علمی خدمت میں شامل ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں یہ ممتاز شیعہ عالم تھے اور ان کی علمی خدمات کا دائرہ وسیع تھا۔ تصنیف، تلخیص، تدریس، طبابت، خلافیات میں وسعت نظر اور جدل و مناظرہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور ہر میدان میں اپنی مثال آپ تھے۔

ایک روایت کے مطابق اس نامور شیعہ عالم نے ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء کو اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کو وفات پائی ❶۔

۴۶- مولانا محمد کشمیری

وادیٔ کشمیر میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور ارباب فقہ نے برصغیر میں شہرت حاصل کی اور اپنے علم کا لوہا منوایا، ان میں مولانا محمد بن محمود بن رحمت اللہ متقی کشمیری قابل ذکر ہیں۔ یہ سید عبدالسلام اندرانی کی اولاد سے تھے اور بعض حلقوں میں محمد اکبر ہادی کے نام سے معروف تھے۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں پیدا ہوئے اور اپنے جد امجد رحمت اللہ کشمیری سے اخذ علم کیا۔ قرأت و تجوید کے لیے اپنے سسر قاری محمد اسحاق کی خدمت میں حاضری دی اور اس موضوع سے متعلق ان سے خوب استفادہ کیا۔ علوم و فنون میں شیخ محمد اشرف کشمیری کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔

ان کے آبا و اجداد اور خاندان کے تمام افراد اصحاب علم تھے اور سب کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے مسند تدریس کو زینت بخشی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ کشمیر میں بہت سے علما و فضلا نے جنم لیا اور ہر ایک نے اپنی بساط اور قابلیت کے مطابق تبلیغ اسلام اور ترویج علم کی۔ صاحب ترجمہ مولانا محمد کشمیری نے بھی اس ضمن میں بڑی خدمات انجام دیں اور متعدد حضرات نے ان سے اکتساب علم اور اخذ فیض کیا۔

کشمیر کے اس ممتاز عالم و فقیہ نے ۱۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ/ ۸۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۹، ۴۲۰۔

❷ تاریخ کشمیر ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۱۔

۴۷- مولانا محمد رفیق کشمیری

خطۂ کشمیر کے ایک اور عالم اور فقیہ مولانا محمد بن مصطفےٰ بن معین الدین رفیق کشمیری تھے، جن کی کنیت ابوالرضا تھی۔ ۱۱۵۴ھ/ ۱۷۴۱ء میں پیدا ہوئے اور والد کے جد امجد عبداللہ یسوی اور ماموں علامہ نور الہدیٰ ٹوپی گر سے تحصیل علم کی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں کامل تھے۔ علم حدیث اپنے عم بزرگ دار اور والد ماجد سے پڑھا۔ خاندان کے سب لوگ علم سے بہرہ ور تھے اور معقول و منقول میں عبور رکھتے تھے۔ صاحب ترجمہ مولانا محمد رفیق بھی ان اوصاف سے متصف تھے۔ صوفی مشرب فقیہ اور متبع کتاب و سنت تھے۔ ان کے سسر مولانا محمد اشرف بھی عالم دین اور تصوف و سلوک کے دلدادہ تھے، چنانچہ انھوں نے انھی سے اخذ تصوف کیا اور تصوف کی کتاب عوارف المعارف ان سے پڑھی۔ تصوف و طریقت کے موضوع پر چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

ان کا سلسلۂ تدریس بھی جاری تھا، جس سے علاقۂ کشمیر کے متعدد علما و فضلا نے استفادہ کیا۔ جدل و مناظرے سے کنارہ کش رہتے اور متانت اور سنجیدگی سے علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے عوام و خواص ان کا بے حد احترام کرتے اور ان کی خدمات گوناگوں کی توصیف کرتے تھے۔

خطۂ کشمیر کے اس عالم و فقیہ اور صوفی نے چہار شنبہ کے روز ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۲۱۸ھ/ ۳ر اکتوبر ۱۸۰۳ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کا سفر کیا[1]۔

۴۸- سید محمد پھلواروی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا شہر پھلواری کئی سو سال سے علم و عمل اور طریقت و سلوک میں مشہور ہے۔ یہ شہر بے شمار علما کا مسکن، متعدد فقہا کا مولد اور بہت سے صوفیا و مشائخ کا مرجع رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن علما و فقہا نے جنم لیا ان میں سید محمد بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفر پھلواروی کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ اپنے والد کے پانچویں بیٹے تھے۔ ۱۰ صفر ۱۱۹۸ھ/ ۴ جنوری ۱۷۸۴ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علوم ظاہری اور باطنی دونوں سے خاندان کے تمام افراد بہرہ ور تھے۔ سید نعمت اللہ نے اپنے اس بیٹے کی خوب تربیت کی اور جید اساتذہ سے ان کے حصول علم کا اہتمام کیا۔ اس وقت پھلواری میں شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری کا ہنگامۂ درس جاری تھا، ان سے انھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور اپنے والد مکرم سے اخذ طریقت کیا اور عرصۂ دراز تک ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔

ان کے والد سید نعمت اللہ اپنے دور کے معروف صوفی اور عالم تھے، ان کا حلقۂ فیض بہت وسیع تھا۔ لائق بیٹے نے باپ ہی سے اخذ فیض کیا اور تمام علوم مروجہ اور تصوف و طریقت میں عالی مرتبے کو پہنچے۔

[1] حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۷، ۴۶۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۱، ۴۲۲۔

پھلواری کے اس عالم وفقیہ اور صوفی نے ۳ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ/ ۴/ اگست ۱۸۵۶ء کو پھلواری میں وفات پائی اور اپنے بھائی سید ابوالحیات پھلواروی کے قریب دفن ہوئے ❶۔

۴۹- مفتی محمدی عظیم آبادی

ہندوستان کے شہر پٹنہ کو جو صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے، کسی زمانے میں عظیم آباد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس شہر سے برصغیر کی بے شمار علمی، عملی اور سیاسی یادیں وابستہ ہیں۔ انیسویں صدی میں اس کی خاک سے بہت سی جلیل القدر شخصیتوں نے جنم لیا اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ عمل کے ہر میدان میں انھوں نے اپنے جھنڈے گاڑے اور ہر گوشۂ زندگی میں شہرت کے بام عروج کو پہنچے۔ انہی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی محمدی بن معصوم عظیم آبادی تھے، جو تیرھویں صدی ہجری کے معروف شیخ، بہت بڑے عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ انھوں نے اس دور کے مشہور عالم شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری پھلواروی کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا، طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور ہر شعبۂ علم میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ علوم سے فراغت کے بعد مسند افتا پر فائز ہوئے اور یہ خدمت حسن وخوبی سے انجام دی۔ اس کے علاوہ درس وافادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور متعدد حضرات نے ان سے علم حاصل کیا۔

مفتی محمدی عظیم آبادی ۲۷ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ/ ۸ جنوری ۱۸۵۳ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے ❷۔

۵۰- مولانا محمد آفاق دہلوی

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے اخلاف میں تیرھویں صدی ہجری کے بزرگوں میں مولانا محمد آفاق دہلوی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ محمد آفاق بن احسان اللہ بن محمد اظہر بن محمد نقی بن عبدالاحد فاروقی۔! اپنے زمانے کے شیخ، عارف باللہ، عالم، صوفی المشرب فقیہ اور طریقۂ مجددیہ کے امام تھے۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء میں ولادت ہوئی اور شیخ ضیاء اللہ کشمیری سے اخذ طریقت کیا۔ علوم مروجہ کی تحصیل اس عہد کے جید علما سے کی۔ فقیر منش اور متبع سنت رسول ﷺ تھے۔ طبیعت میں مسکنت اور شکستگی کا اس قدر غلبہ تھا کہ خود کو دیوار کے نقش ونگار کی مانند سمجھتے اور فرماتے کہ جس طرح دیوار اور اس کے نقش ونگار کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اسی طرح اس دنیا میں انسان کو بھی پائیداری نصیب نہیں۔ وہ بھی ختم ہونے والا ہے۔ علم کے غرور اور تعلی سے بالکل پاک تھے۔ مسائل فقہ پر عبور تھا۔ بہت سے اکابران کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جن میں مولانا فضل الرحمن مراد آبادی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اپنے مرشد خواجہ ضیاء اللہ کشمیری کی وفات کے بعد

❶ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۲ بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین۔

❷ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۳ بحوالہ تاریخ الکملا۔

ان کے سجادہ نشین ہوئے اور خلق کثیر کو روحانی اور باطنی فیض پہنچایا۔ علما و مشائخ اور عوام و خواص کے حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ایک زمانے میں افغانستان گئے اور وہاں اس درجہ مستحق تکریم قرار پائے کہ وہاں کے حکمران زمان شاہ نے ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ کابل اور دوسرے بلا د و قصبات کے بہت سے لوگ ان سے بیعت ہوئے۔

اس صوفی مزاج فقیہ نے بدھ کے روز ۷ محرم ۱۲۵۱ھ/ ۵ مئی ۱۸۳۵ء کو نماز مغرب کے بعد اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی اور جمعرات کو دہلی کے محلہ مغل پورہ میں دفن کیے گئے۔ ۹۱ سال عمر پائی ❶۔

۵۱-شاہ محمد اسحاق دہلوی

دیارِ ہند کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا اسم گرامی صفحات تاریخ میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ وہ شیخ وقت، امامِ عصر، عالمِ اجل، محدثِ عالی قدر اور فقیہ نام دار تھے۔ زہد و تقویٰ، اتباع سنت اور ورع و عبادت میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور خلیفہ تھے۔ نسباً فاروقی تھے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد اسحاق بن محمد افضل بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن منصور بن احمد بن محمد بن قوام الدین فاروقی دہلوی۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی دو صاحب زادیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی بڑھانوی کے عقد میں آئیں اور ایک مولانا محمد افضل فاروقی دہلوی کے نکاح میں ____ ! مولانا محمد افضل کی زوجۂ محترمہ سے صاحب ترجمہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق ظہور میں آئے جو آگے چل کر علم و عمل اور فضل و کمال میں فرید الدہر قرار پائے۔

مولانا محمد اسحاق کی ولادت ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ/ ۱۳ نومبر ۱۷۸۲ء اور ایک روایت کے مطابق ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ کو دہلی میں ہوئی۔ نشو و نما اور تربیت اپنے عظیم القدر نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی نگرانی میں پائی۔ کتب صرف اور کافیہ تک علم نحو کی کتابیں مولانا عبدالحی بڑھانوی سے پڑھیں۔ باقی درسی کتابوں کی تکمیل شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے حلقۂ درس میں کی۔ علم حدیث کے لیے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ شاہ عبدالعزیز کے سامنے بھی زانوے شاگردی تہ کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حدیث کی سند ان سے لی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے اس نواسے پر انتہائی شفقت فرماتے اور اسے بیٹے کی حیثیت دیتے تھے۔ کتابوں، مسودوں اور متاع علمی کی صورت میں جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، نواسے کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہی ان کی مسند پر بیٹھے اور شائقین علم حدیث کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔ شاہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو تدریس علم حدیث پر مامور فرما دیا تھا، چنانچہ پورے بیس سال انھوں

❶ آثار الصنادید، ص ۲۱۷۔ تذکرہ اولیاے دہلی ص ۱۳۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۴۔

نے شاہ صاحب کے سامنے اور ان کی نگرانی میں یہ اہم خدمت انجام دی۔

اس محدث جلیل نے ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء میں ارض حجاز کا عزم کیا اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ میں شیخ عمر بن عبدالکریم متوفی ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء کا سلسلۂ درس حدیث جاری تھا' ان سے ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء میں سند حدیث لی۔

بعدازاں اپنے وطن ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور پہلے کی طرح دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مسند درس حدیث پر رونق افروز ہوئے۔ حج سے واپسی کے بعد پورے سولہ سال یہ عظیم الشان خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا اور حصول علم حدیث سے مشرف ہوئے۔ پھر ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یعقوب اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ کے لیے رخت سفر باندھا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔

اس زمانے میں مغلوں کا آخری حکمران بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس کی بادشاہت برائے نام تھی' اصل حکومت انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ بہادر شاہ' اس کے امرا و وزرا' دہلی کے علما اور وہاں کے سرکردہ لوگوں نے ان کو ہجرت کرنے سے روکنے کی کوشش کی اور دہلی میں سکونت پذیر رہنے پر زور دیا' لیکن وہ نہیں مانے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور شاہ عبدالعزیز ایک فتوے کے ذریعے اس ملک کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ شعائر اسلام میں بے حد ضعف واقع ہو چکا تھا' بدعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور رسومِ کفر نئی نئی شکلوں میں سامنے آ رہی تھیں۔ ان حالات میں ان کے لیے اس ملک میں سکونت اختیار کیے رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مع اہل وعیال کے دہلی سے کوچ کیا اور مکہ معظمہ جا کر متوطن ہو گئے۔

حضرت ممدوح علمی اعتبار سے ہندوستان کی آبرو اور فضل وکمال میں اپنی مثال آپ تھے۔ نہایت متبع سنت' انتہائی پرہیزگار' فرشتہ سیرت' بلند اخلاق اور عمدہ کردار تھے۔ قامع بدعت اور داعی سنت نبوی ﷺ تھے۔ زبدۃ المحدثین اور فخر علمائے دین تھے۔ دن رات تدریس حدیث اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ نیکی اور تدین کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز نے ان کو اپنا امام جماعت مقرر کر رکھا تھا اور وہ عین سنت کے مطابق نماز پڑھاتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے بلند مرتبت بھتیجے مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور عالی قدر نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق سے بہ درجہ غایت مشفقانہ برتاؤ کرتے اور انھیں دیکھ کر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرماتے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ❶ (ابراہیم:۳۹)

''یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحٰق عطا فرمائے۔''

---

❶ الحیات بعد الممات ۴۶۔

شاہ صاحب نواسے کے زہد و عبادت پر انتہائی خوش ہوتے اور عالم مسرت میں فرمایا کرتے: ’’میری تقریر اسماعیل نے اور تحریر رشید الدین نے لے لی اور تقویٰ اسحاق کے حصے میں آیا[1]۔‘‘

دست سخا اس قدر وسیع تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا‘ مستحقین اور اہل حوائج میں تقسیم فرما دیتے۔ ہندوستان میں بھی یہی حال رہا اور سرزمین حجاز میں بھی غربا و مساکین اور بیوہ عورتوں کی امداد فرماتے رہے۔ ہندوستان سے جانے والے حجاج کی ضرورتیں پوری کرتے اور ان کو اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے۔ نہایت متوکل علی اللہ تھے۔ دنیا کے مال و دولت سے کبھی تعلق نہ رکھا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابل بیان ہے جو ارواح ثلاثہ میں مرقوم ہے اور وہ یہ ہے:۔

تحصیل سکندر آباد میں ایک بہت بڑا گاؤں ’’حسن پور‘‘ تھا۔ کسی زمانے میں یہ گاؤں مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی ملکیت تھا۔ یہ دونوں بھائی انتہا درجے کے سخی اور فراخ حوصلہ تھے اور اسی وجہ سے اکثر تنگ دست رہتے تھے۔ تنگ دستی کی وجہ سے بعض دفعہ ملول و مغموم بھی ہو جاتے تھے۔ واقعہ کے راوی مولانا مظفر حسین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہیں۔ سوچا کہ خوشی کی وجہ پوچھوں‘ لیکن جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر مولانا محمد اسحاق سے پوچھ ہی لیا۔ متعجبانہ لہجے میں فرمایا: ’’تمھیں نہیں معلوم؟‘‘ عرض کیا ’’نہیں‘ مجھے کچھ علم نہیں۔‘‘ فرمایا ’’ہمارا گاؤں حسن پور ضبط ہو گیا ہے‘ یہ خوشی اسی کی ہے۔ جب تک گاؤں ہمارے قبضے میں تھا‘ اللہ پر پورا توکل نہ تھا‘ اب صرف اسی پر توکل اور اسی پر بھروسا ہے[2]۔

شانِ عزیمت اور توکل الٰہی کی یہ بہت بڑی مثال ہے۔ اس مادی دور میں اس قسم کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔

مولانا شاہ محمد اسحاق کوئی مقرر یا خطیب نہ تھے‘ لیکن کلمۂ حق کہنے میں انتہائی جری اور پرُجوش تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک انگریز پادری دلی آیا جو بہت لسان تھا۔ اس نے آتے ہی ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور دلی کے علما کو مناظرے کی دعوت دی۔ اس دور کے جو علما خاندانِ شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے مخالف تھے‘ انھوں نے اس پادری سے کہا کہ مولانا محمد اسحاق کو مناظرے کی دعوت دی جائے۔ مولانا نہ تو مناظرانہ ایچ پیچ جانتے تھے‘ نہ انھیں بحث و مجادلے کی عادت تھی‘ نہ زیادہ باتیں کرتے تھے اور پھر زبان میں کچھ لکنت بھی تھی‘ اس لیے ان کے مخالف علما کا خیال تھا کہ یہ چرب زبان اور لسان پادری ان کو ضرور مات دے گا اور اس طرح ان کی سبکی ہو گی۔

پادری نے ان کو دعوتِ مناظرہ دی تو انھوں نے فوراً قبول فرما لی۔ مولانا فرید الدین مراد آبادی‘ مولانا محمد یعقوب اور نواب رشید الدین خاں نے ان کو مشورہ دیا کہ خود مناظرہ نہ کریں‘ ہم میں سے کسی کو اپنا

[1] الحیات بعد الممات ص ۴۷

[2] ارواح ثلاثہ ص ۱۲۳

نمائندہ یا وکیل مقرر کر لیں جو آپ کی طرف سے مناظرہ کرے۔ فرمایا: پادری نے مجھے دعوتِ مناظرہ دی ہے لہٰذا میں ہی مناظرہ کروں گا‘ کسی کو وکیل یا نمائندہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد مناظرے کی تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا اور دلی کے لال قلعے میں مناظرہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وقت مقررہ پر بے شمار لوگ قلعے میں پہنچ گئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ پادری صاحب سامنے آئے تو حواس باختہ ہو کر کانپنے لگے۔ اسلام یا مولانا کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکے۔ کچھ دیر یہی صورتِ حال رہی اور پادری صاحب نے کوئی بات نہ کی تو مولانا نے پادری سے فرمایا: ”آپ کچھ فرمائیں گے یا میں عرض کروں؟“ اس نے کہا ”آپ ہی فرمایئے۔“ مولانا نے اسلام کی حقانیت پر دلائل دیے اور عیسائیت کی تردید فرمائی۔ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی‘ لیکن پادری خاموش رہا۔ نہ اس نے عیسائیت کا دفاع کیا‘ نہ اسلام کی مخالفت کی اور نہ مولانا کے دلائل کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قوتِ گویائی چھین لی ہے۔ اس کے سکوت سے ان لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی جو مولانا کے خلاف تھے اور ان کو شکست دلانے کے خواہاں تھے۔

تقریر ختم کر کے مولانا نے مخالف اور موافق حاضرین کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے باقاعدہ بائبل پڑھی ہے۔ اگر پادری میدانِ مناظرہ میں اتر آتا اور سلسلۂ کلام آگے بڑھتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے میں ضرور میری مدد فرماتا۔ یہ بھی فرمایا کہ ”اگر پادری کے مقابلے میں اسحاق کو شکست ہو جاتی تو کوئی افسوس ناک بات نہ تھی‘ مجھ کو علم کا دعویٰ ہی کب ہے‘ لیکن اسلام تو سب کا ہے۔ میرا بھی اور میرے مخالفوں کا بھی۔ اگر اس موقعے پر میں شکست کھا جاتا تو یہ تنہا میری شکست نہ ہوتی بلکہ اسے دلی کے تمام مسلمانوں کی شکست سمجھا جاتا۔“ فرمایا ”اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ضرور مدد فرماتا ہے۔ آج بھی اس نے پادری کے مقابلے میں اسلام کی مدد فرمائی۔ پادری کا خاموش رہنا‘ اسلام کی مدد ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی[1]۔

مولانا محمد اسحاق کے تلامذہ کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ دہلی میں بھی ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان اور عرب و عجم کے بہت سے علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل علم حدیث کی۔ قیام حجاز کے دور میں بھی ان کا دائرۂ تدریس وسعت پذیر تھا۔ اس میں افریقہ‘ مصر‘ عرب‘ ترکی‘ ہندوستان اور افغانستان کے علاقوں کے تشنگانِ علم بھی شامل ہوئے اور ان سے فیض حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ علم کا یہ دریا دہلی سے جاری ہوا اور بحر ہند میں جا گرا۔ پھر اس کی موجیں بحر عرب سے ہم آغوش ہو کر مکہ معظمہ تک پہنچیں اور چار سال تک صحرائے عرب کو سیراب کرتی رہیں۔ ہند اور عرب کے جو تشنہ لب اس سے سیراب ہوئے‘ ان کی وسیع فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد یعقوب‘ مولانا محمد عمر بن محمد اسماعیل شہید دہلوی‘ شیخ محمد انصاری‘ مولانا کرامت علی اسرائیلی‘

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۳۲‘ ۱۳۳

مولانا عبدالخالق دہلوی' مولانا عصمت اللہ پانی پتی' مولانا سید نذیر حسین دہلوی' مولانا محمد تھانوی' مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی' مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی' مولانا علی احمد ٹونکی' نواب قطب الدین خاں دہلوی' شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی' مولانا عالم علی مرادآبادی' مفتی عنایت احمد' مولانا محمد حازمی عربی' مولانا سبحان بخش شکارپوری' مولانا عبداللہ سندھی' مولانا مفتی عبدالقیوم بھوپالی' مولانا قاری کرم اللہ دہلوی' حافظ محمد فاضل سورتی' مولانا احمد علی سہارن پوری' قاری عبدالرحمٰن پانی پتی' مولانا نورالحسن کاندھلوی' حافظ محمد جون پوری دہلوی' مولانا رستم علی خاں دہلوی' مولانا بہاءالدین دکھنی۔

یہ چند بزرگوں کے اسمائے گرامی ہیں' سب کا شمار حد امکان سے باہر ہے۔ ان کے تلامذہ نے بھی آگے چل کر اصحاب علم کو خوب مستفید فرمایا اور جگہ جگہ درس و تدریس کے حلقے قائم کیے۔ ان میں دو بزرگ وہ ہیں جو مولانا کے صحیح جانشین ہوئے اور جن کے چشمۂ فیض سے لاتعداد حضرات نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ وہ ہیں مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی ۔۔۔۔! مولانا عبدالغنی تو دہلی سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے۔ لیکن سید نذیر حسین نے دہلی ہی کو اپنا مسکن قرار دے رکھا۔ سید صاحب ممدوح نے اس فتوے پر بھی دستخط کیے' جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کو انگریزوں کے خلاف جہاد قرار دیا گیا تھا۔ پھر اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا حلقۂ درسِ حدیث نہایت وسیع تھا اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔ عرب و عجم اور ہندوستان کے لاتعداد اہل علم نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اسی طرح مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی کے تلامذہ کی تعداد کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کے یوں تو تمام شاگرد اپنی اپنی جگہ ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں' لیکن ان دونوں ۔۔۔ مولانا عبدالغنی مجددی اور سید نذیر حسین دہلوی نے جو خدمات انجام دیں' اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ ان کو اللہ نے اس درجے شرف عطا فرمایا کہ برصغیر کے تمام اہل علم کا سلسلۂ سند ان کی وساطت سے مولانا محمد اسحاق اور پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک منتہی ہوتا ہے۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کی جلالت علم اور حدیث و فقہ میں ان کی دقت نظر کا یہ عالم تھا کہ ان کے استاد شیخ عمر بن عبدالکریم مکی فرمایا کرتے تھے۔

قد حلت فیه برکة جده الشیخ عبدالعزیز الدهلوی❶۔

(ان میں ان کے نانا شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی کی برکت علمی حلول کر گئی ہے۔)

مکہ مکرمہ کے اس دور کے ممتاز عالم شیخ عبداللہ سراج مکی (متوفی ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء) نے ان کو غسل دیا۔ وہ غسل دیتے ہوئے فرماتے تھے:۔

---

❶ الحیات بعدالممات ص ۴۶

واللہ انہ لو عاش وقرأت علیہ الحدیث طول عمری مانلت ماناله❶۔

(بخدا اگر یہ زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان سے حدیث پڑھنے میں صرف کر دیتا تو اس مرتبے کو نہ پہنچ سکتا جس کو یہ پہنچ چکے ہیں۔)

ان کی پوری زندگی علم حدیث کی تدریس میں گزری۔ لکھنے کا موقع بہت کم ملا۔ انھوں نے مختلف سوالوں کے جواب میں فقہی نوعیت کے جو فتوے تحریر کیے' ان کے علاوہ ان کی مندرجہ کتابوں کا پتا چل سکا ہے۔

۱۔ مائۃ مسائل۔ ۲۔ مسائل اربعین۔ ۳۔ تذکرۃ الصوم۔

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی نے ستر برس کی عمر پا کر ماہ رجب ۱۲۶۲ھ/ جولائی ۱۸۴۶ء کو مکہ مکرمہ میں انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کے قریب دفن کیے گئے❷۔

۵۲۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی

مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی علامۂ دہر' عالم کبیر' فقیہ ذی مرتبت اور محدث دوراں تھے۔ شاہ عبدالغنی کے فرزند' شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بھتیجے' شاہ ولی اللہ محدث کے پوتے اور شاہ عبدالرحیم کے پڑپوتے۔ برصغیر پاک و ہند کی اس وسیع و عریض سرزمین میں علم وفضل' وعظ وارشاد' تصنیف و تالیف' درس وتدریس' احیائے اسلام' تجدید دین' اصلاحِ امت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جو بلند ترین اوصاف اس عالی قدر خاندان کے لائق احترام ارکان میں پائے جاتے ہیں' اس میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں ــــــ مولانا شاہ محمد اسماعیل نے اپنے اسلاف کے ان اوصاف اور بزرگوں کی اس میراث کی نہ صرف حفاظت کا فریضہ انجام دیا بلکہ اپنے بے پناہ عمل وسعی سے ان کے حسن وزیبائی میں انتہائی اضافہ بھی کیا۔

مولانا شاہ محمد اسماعیل کی ولادت صحیح اور مستند روایت کے مطابق ۱۲ ربیع الاول ۱۱۹۳ھ (۲۶ اپریل ۱۷۷۹ء) کو دہلی میں ہوئی۔ والدۂ ماجدہ کا نام نامی بی بی فاطمہ تھا۔ اپنے مرشد امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔

تعلیم وتربیت:

شاہ اسماعیل نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ۱۶ رجب ۱۲۰۳ھ (۱۲/ اپریل ۱۷۸۹ء) کو ان کے والد شاہ عبدالغنی کا انتقال ہوا' اس وقت بیٹے کی عمر صرف

---

❶ الحیات بعد الممات ص ۴۶

❷ آثار الصنادید ص ۲۷۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۱' ۵۲۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۴۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۲۸۰ تا ۲۸۴ و ۳۲۷ تا ۳۲۹۔ تراجم علمائے حدیث ہند۔ ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۴۰۔ نیز دیکھیے ارواح ثلاثہ اور الحیات بعد الممات۔

دس برس کی تھی۔ تینوں اعمام کرام (شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر) یتیم بچے کو آغوش محبت میں لینے اور اپنے گھر لے جانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن رسمی طور پر یہ ذمے داری شاہ عبدالقادر نے اٹھائی، جن کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہ اسماعیل نے درسی کتابیں انہی سے پڑھیں اور تمام مروجہ علوم میں وہ درجہ حاصل کر لیا جو ان کے عہد میں تعلیم و تدریس کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند لی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں حصول علم سے فارغ ہو گئے۔

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ وہ ان کی بے پناہ ذہانت اور قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تعلیم کے عہد آغاز میں استغنا کا یہ عالم تھا کہ اس بات کا کوئی خیال نہ رہتا تھا کہ سبق کہاں ختم کیا تھا اور اب کہاں سے شروع ہو گا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اصل مقام سے بعد کی عبارت پڑھنا شروع کر دیتے۔ شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو جواب دیتے کہ پچھلی عبارت کا مطلب آسان تھا، اس لیے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاہ عبدالقادر اس متروکہ حصے سے کچھ پوچھتے تو جواب میں ایسی تقریر فرماتے کہ سب لوگ حیران رہ جاتے۔ کبھی اصل مقام سے پیشتر سبق کا آغاز کر دیتے، شاہ عبدالقادر متنبہ فرماتے تو اسماعیل ایسے شبہات وارد کرتے کہ فاضل استاد کو بھی جواب میں خاص توجہ مبذول کرنا پڑتی۔

دلی کے تمام علمی حلقوں میں ان کی غیر معمولی ذکاوت اور انتہا درجے کی ذہانت کی شہرت تھی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو لوگ امتحان کے طور پر برسر راہ روک کر مشکل سوالات شروع کر دیتے۔ سوال کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ کتاب ان کے پاس نہیں ہے، لہٰذا اطمینان بخش جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن شاہ شہید بے توقف جواب میں تقریر شروع کر دیتے اور مسئلے کی ایسی تشریح فرماتے کہ پوچھنے والے حیران ہو ہو جاتے بلکہ اکثر اوقات اپنی جرأتِ سوال پر ندامت محسوس کرتے[1]۔

بلاشبہ وہ متبحر عالم اور انتہائی ذکی و ذہین تھے۔ تیس ہزار حدیثیں انھیں زبانی یاد تھیں[2]۔

سید احمد شہید کی بیعت:

حصول علم سے فراغت کے بعد شاہ اسماعیل شہید کی فضیلت علمی، ذہانت و ذکاوت اور قابلیت کی شہرت ہر حلقے میں پہنچ گئی تھی، لیکن ابھی کوئی مستقل کام شروع نہیں کیا تھا اور طبیعت میں کچھ بے پروائی سی پائی جاتی تھی۔ یا تو اس کی یہ وجہ ہو گی کہ خاندان میں جو مشاغل رواج پذیر تھے، ان کے نزدیک وہ اصل مقاصد تک پہنچنے کے لیے کافی نہ تھے اور وہ کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے تھے، یا پھر وہ اپنے دل میں ایک لائحہ عمل مرتب کر چکے تھے اور اس کا آغاز کرنے کے لیے رفقا و معاونین کی تلاش میں تھے۔ کئی سال اسی حالت میں گزر گئے۔ اس اثنا میں

[1] آثار الصنادید ص ۷۱، ۷۲، ۷۳۔

[2] مقدمہ بر تقویۃ الایمان (از غلام رسول مہر) ص ۹۔

اگرچہ انھوں نے اپنے اسلاف کے طریق کار کے مطابق تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی اہم شخصیتوں نے ان سے علم حاصل کیا، لیکن یہ کام ان کے کامل اطمینانِ قلب کا باعث نہ تھا۔

ایک عرصے تک یہی حالت رہی، تا آنکہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی نواب امیر خاں والیٔ ٹونک کی رفاقت و ملازمت ترک کر کے راجپوتانہ سے دہلی پہنچے اور اکبر آبادی مسجد میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہ بہت ہی متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ جوں ہی انھوں نے دہلی میں قدم رکھا، لوگوں نے ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی، پھر شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی بڑھانوی اور بعد ازاں شاہ اسماعیل نے ان سے بیعت کی۔ اس وقت سے ان کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا اور ان کے شب و روز پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں کی دعوت و ارشاد میں بسر ہونے لگے۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو بالتزام شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسید رقم طراز ہیں کہ نمازِ جمعہ کے لیے لوگ اس کثرت سے آنے لگے جیسے عیدین کی نمازوں میں آتے تھے۔ سامعین کا شمار نہ ہوتا تھا۔ وعظ کا طریقہ ایسا تھا کہ جو کچھ فرماتے دلوں میں پیوست ہو جاتا، اگر کسی بات پر کوئی خلش پیدا بھی ہوتی تو آگے چل کر بالکل رفع ہو جاتی۔ احیائے سنت اور رد شرک و بدعت ان کے وعظوں کا خاص موضوع ہوتا[1]۔

یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے احیائے دین کا سلسلہ پوری سرگرمی سے شروع کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی تجدیدی تگ و تاز کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام بلاشبہ ہر رنگ میں جامع اور کامل ہے۔

''بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحابِ استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف علامہ و مجدد شہید کے لیے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

می خواست رست خیز ز عالم برآورد
آں باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری کا قول یاد ہے ''من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود باوجود پیرلیش مریدیٔ من می کرد۔'' شاہ صاحب نے مزاجِ وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
سرسبو بکشادند و در فرو بستند

[1] آثار الصنادید ص ۲۷

"دعوت و اصلاحِ امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیے گئے تھے، اب اس سلطانِ وقت اور سکندر عزم کی بدولت شاہ جہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑے بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہو رہی تھیں اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایت کے نقوش و سواد کو صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔"

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

"پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اسی خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو، بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے دوسرے کاموں میں الجھ کر رہ گئے، یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعت عظمت اور شرفِ قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گزرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا[1]۔"

یعنی مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کے سوا اس دور میں کوئی دوسرا راہ جہاد اور جادۂ شہادت کی طرف قدم نہ بڑھا سکا۔

سفرِ حج:

شوال ۱۲۳۶ھ (جولائی ۱۸۲۱ء) میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ اس زمانے میں سمندر کے سفر میں خطرۂ ہلاکت کی وجہ سے بعض علما نے فرضیت حج کے سقوط کا فتویٰ جاری کر دیا تھا، بلکہ کچھ ایسے اصحاب علم بھی تھے جو یہاں تک فرمانے لگے تھے کہ: ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی رو سے عازمِ حج ہونا (معاذ اللہ) معصیت ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا، جس کی روک تھام کی ایک صورت تو یہ تھی کہ تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تردید کی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید بریلوی، مولانا

[1] تذکرہ ص ۲۹۹، ۳۰۰

اسماعیل دہلوی' مولانا عبدالحی بڑھانوی اور دیگر علمائے حق نے نہایت حسن وخوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ایک عملی اقدام کیا جائے اور پورے ملک میں ادائے حج کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ چنانچہ مولانا اسماعیل' مولانا عبدالحی رحمہ اللہ ' سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے نام دار نے اس کے لیے ایک زوردار مہم شروع کی اور ساڑھے سات سو مسلمانوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا قصد کیا۔ اس قافلے میں مولانا اسماعیل کی والدۂ مکرمہ اور ہمشیرہ محترمہ بھی شامل تھیں۔ دس جہاز کرائے پر لیے گئے اور ہر جہاز کی جماعت کے لیے ایک امیر مقرر کیا گیا۔ ایک جہاز کی جماعت کے امیر خود مولانا اسماعیل تھے۔ یہ قافلہ کلکتے سے روانہ ہوا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد شعبان ۱۲۳۹ھ (اپریل ۱۸۲۴ء) کو ہندوستان واپس لوٹا۔

دعوتِ جہاد:

حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد مولانا شہید نے سید احمد شہید کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق اپنے آپ کو دعوتِ جہاد کے لیے وقف کر دیا اور وعظ وتبلیغ میں لوگوں کو جہاد کے لیے کمربستہ ہونے کی تلقین فرمانے لگے۔ اس ضمن میں سرسید لکھتے ہیں:۔

''بموجب ارشاد سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ اس طرح سے تقریر و وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا ومجلا ہو گیا اور وہ اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا' سر اس کا راہِ حق میں فدا اور جان اس کی اعلاء لوائے دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف ہو (1)''

مطلب یہ کہ ان کی تقریر کا موضوع اور وعظ کا مقصد فقط یہ ہوتا کہ مسلمان اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئیں اور جو غیر ملکی طاقت ان پر مسلط ہو گئی ہے' اس کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور ہر جگہ مختلف پیرائے سے یہ بات بیان فرمائی۔

ہجرت:

تقریباً پونے دو سال انھوں نے لوگوں کو دعوتِ جہاد دی اور ملک کے تمام اہم مقامات پر اپنا نقطۂ نظر شریعت کی روشنی میں وضاحت سے بیان کیا۔ جب مختلف شہروں اور قصبوں میں مجاہدین کی جماعتیں قائم ہو گئیں تو کامل سوچ بچار کے بعد سرحد کے علاقے سے آغازِ جہاد کا فیصلہ کیا گیا' کیونکہ اس زمانے میں پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھی۔

اس بنیادی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد کے

(1) آثار الصنادید ص ۲۷۔

آزاد علاقے میں قیام کرنے کا عزم فرمایا۔ چنانچہ وہ ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) کو سید احمد بریلوی کی معیت میں جہاد کے غرض سے مہاجر ہو کر علاقۂ سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت صرف چھ سو کے قریب آدمی ان کے ہمراہ تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مرکز میں پہنچ کر حالات کا پورا جائزہ لیا جائے گا اور پھر مناسب موقع پر مجاہدین کی باقی جماعتوں کو بھی ہندوستان کے مختلف مقامات سے بلا لیا جائے گا۔ اس سلسلے کے تمام تنظیمی اور تبلیغی معاملات مولانا اسماعیل ممدوح کے سپرد تھے۔

مجاہدین و مہاجرین کا یہ قافلہ جو کم و بیش چھ سو افراد پر مشتمل تھا' رائے بریلی سے روانہ ہوا اور بندھیل کھنڈ' گوالیار' ٹونک' اجمیر' صحرائے مارواڑ' عمرکوٹ' حیدرآباد (سندھ) شکار پور' کوئٹہ' قندھار' غزنی اور کابل ہوتا ہوا پشاور پہنچا۔ یہ تقریباً تین ہزار میل کا سفر تھا' جس میں تپتے ہوئے صحرا بھی تھے' جہاں میلوں تک پانی کا ایک قطرہ نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے دریا بھی تھے' دشوار گزار پہاڑ اور برفستان بھی تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے دس مہینوں میں یہ مسافت طے کی۔

جہاد فی سبیل اللہ:

اس کاروانِ حق نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء) کو جہاد بالسیف کی طرح ڈالی۔ آغاز جہاد میں جو خدمات مولانا اسماعیل نے انجام دیں' ان کی نہایت مختصر کیفیت مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ باشندگانِ سرحد نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر امارتِ جہاد کی بیعت انہی کی سعی و کوشش سے کی۔

۲۔ جہاد سے متعلق سرحد کے علما و اکابر سے جتنی دفعہ بھی گفتگو ہوئی مولانا شہید نے کی اور اس ضمن میں انھوں نے جو علمی' دینی اور سیاسی وضاحتیں طلب کیں' ان سب کا جواب مولانا نے ہی دیا۔

۳۔ ضلع ہزارہ میں تنظیم جہاد انہی کی تگ و دو سے ہوئی۔

۴۔ جنگ شنکیاری میں صرف دس گیارہ مجاہدان کے ساتھ تھے' لیکن انھوں نے اس درجے بہادری اور استقامت کا ثبوت دیا کہ سکھوں کے ایک بڑے لشکر کو شکست دی۔ اس جنگ میں مولانا کی قبا دشمن کی گولیوں سے چھلنی ہو گئی اور ایک انگلی پر گولی کا زخم لگا۔ بعد میں اس زخمی انگلی کی طرف اشارہ کر کے مزاحاً کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشت شہادت ہے۔

۵۔ سرحد میں انہی کی کوششوں سے اقامت شریعت کی بیعت لی گئی اور وہاں کے باشندے پہلی مرتبہ صحیح شرعی حکومت کی برکتوں سے فیض یاب ہوئے۔

۶۔ امب' مردان' عشرہ اور مایار کی لڑائیوں میں جو فتوحات حاصل ہوئیں' وہ انہی کی جرأت و بہادری کا نتیجہ تھا۔

۷۔ پشاور کی فتح کے بعد سلطان محمد خاں بارک زئی سے گفتگو کے لیے سید صاحب نے انہی کو نامزد فرمایا تھا۔

مولانا اسماعیل نہایت ذکی انتہائی ذہین اور بے حد معاملہ فہم تھے۔ نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں:

جوہر ذکائے او بہ غایت عالی افتادہ بود...... حکایاتِ ذہانت و فطانت وے ہنوز نقل ہر مجلس و زیب ہر محفل اہل علم است ❶۔

(ان کی ذکاوت کا جوہر بہت بلند تھا...... ان کی ذہانت و فطانت کی تیزی کے قصے اب تک اہل علم کی ہر مجلس کے لیے باعث زینت سمجھے جاتے ہیں۔)

سیرت و کردار:

مولانا شہید بہت بڑے عالم، معقول و منقول کے ماہر، فروع و اصول کے امام اور ہر فن میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ زندگی کا ہر لمحہ اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے سنت رسول ﷺ، جہاد فی سبیل اللہ اور ہدایت خلق اللہ میں گزرا۔ نہایت جری اور شجاع تھے۔ وعظ و تقریر میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، واضح اور مدلل گفتگو کرتے۔ اللہ کے سوا کسی کا ڈر اور خوف ان کے دل میں نہ تھا۔ خطرناک سے خطرناک مواقع پر بلا جھجک تنہا جا کھڑے ہوتے۔ دبلے پتلے اور لاغر اندام تھے، مگر عزیمت و استقامت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح جنگ کی منصوبہ بندی کرتے اور دشمن کے ہر وار کا کامیابی سے دفاع کرتے۔ سادہ مزاج اور سادہ معیشت تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا۔ ملنسار، بلند کردار اور ہمدرد خلائق تھے۔ فن مناظرہ کے ماہر تھے۔ خالص علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو کرتے اور ہر اعتراض کا مسکت جواب دیتے۔

تصانیف:

شاہ اسماعیل جہاں بہت بڑے عالم و مجاہد اور واعظ و مبلغ تھے، وہاں بہترین مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ ردالاشراك: (عربی) یہ ان کا ایک رسالہ ہے جو عربی زبان میں ہے۔ اس میں شرک کی باریک سے باریک اقسام بیان کی گئی ہیں اور غیر شرعی رسوم و عوائد کی تردید فرمائی گئی ہے۔ ہر جگہ آیاتِ قرآن اور احادیث نبوی ﷺ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ رسالہ الگ سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ نواب سید صدیق حسن خاں نے الادراك لتخریج احادیث ردالاشراك کے نام سے شائع کیا تھا۔ شروع میں نواب صاحب کا رسالہ قطف الثمر فی بیان عقیدۃ اھل الاثر ہے۔

۲۔ تقویۃ الایمان: (اردو) شاہ اسماعیل دہلوی کی یہ بہت ہی مشہور کتاب ہے اور اردو زبان میں

❶ اتحاف النبلاء، ص ۴۱۶

ہے۔ بے شمار مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی مجموعی تعداد اشاعت ساٹھ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اردو زبان کی کوئی کتاب اتنی زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ اس کی مقبولیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ سب سے زیادہ ہدف اعتراض بھی یہی کتاب بنی اور اس کے رد میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ شاہ اسماعیل پر کفر کے فتوے بھی اسی کتاب کی وجہ سے لگائے گئے۔ بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب ہو اس میں فرشتے نہیں آتے ❶۔

تقویۃ الایمان درحقیقت شاہ اسماعیل شہید کی عربی کتاب "ردالاشراک" کے پہلے حصے کا ترجمہ ہے جو خود انہی نے کیا تھا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو میر شہامت علی نے کیا تھا۔ تقویۃ الایمان آج سے کم و بیش دو سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں نثری اردو بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ نہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے تھے اور نہ کوئی گرائمر معرض وجود میں آئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کے اعتبار سے اپنے دور کا یہ ایک شاہکار ہے۔ سلاست اور روانی درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اردو کے بعض ادیبوں نے اس کو خوب صورت ترین ادبی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کی زبان قلعۂ معلیٰ کی زبان ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان بالخصوص دہلی کی تمام مروجہ رسوم اس میں بیان کی گئی ہیں اور اس عہد کے مسلمانوں کے عقائد و افکار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اردو کی یہ واحد کتاب ہے جس میں دو سو سال کی ہندی رسوم کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس دور کے دہلی کی تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔ اردو کی خدمت بھی سب سے زیادہ اسی کتاب کی وجہ سے ہوئی کیونکہ اس کی تائید اور تردید میں تمام کتابیں اردو میں لکھی گئیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں اور لوگوں نے دلچسپی سے پڑھیں۔

۳۔ تذکیر الاخوان: (اردو) یہ شاہ شہید کی عربی تصنیف "ردالاشراک" کے دوسرے حصے کا ترجمہ ہے جو مولانا سلطان محمد خاں نے کیا۔

۴۔ منصب امامت: (فارسی) یہ نہایت بلند پایہ اور انتہائی اہم کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین: (عربی) اس میں شاہ صاحب نے نبی ﷺ کی وہ احادیث جمع کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا سنت ہے۔

۶۔ صراط مستقیم: (فارسی) یہ کتاب سید احمد شہید بریلوی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ شاہ اسماعیل شہید نے صرف اس کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی اس کی تدوین میں شریک تھے۔ اس کے چار باب ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

❶ حیات اسمٰعیل شہید، ص ۱۷۹

۷۔ العبقات:۔ (عربی) یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے اور بڑی ادق اور مشکل کتاب ہے۔ ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس میں تصوف کے علاوہ بعض دیگر موضوعات بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے کیا تھا جو حیدر آباد (دکن) سے چھپ چکا ہے۔ ترجمہ بھی بہت مشکل ہے۔

۸۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح: (فارسی) شاہ صاحب کی یہ نہایت معرکہ آرا تصنیف ہے۔ بدعت کیا ہے اور سنت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے' اس موضوع میں یہ منفرد کتاب ہے۔ اردو ترجمے کے ساتھ یہ کتاب دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۹۔ رسالہ در علم منطق: (فارسی) سرسید نے ''آثار الصنادید'' میں شاہ صاحب کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو علم منطق سے متعلق ہے۔ یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عالمانہ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس علم پر بھی انھیں عبور حاصل تھا اور وہ انتہائی قابلیت اور فراست و فطانت کے مالک تھے۔

۱۰۔ اصول فقہ: (عربی) مسائل فقہ سے متعلق یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ اس میں ضمناً حدیث متواترہ اور تقلید و اجتہاد کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اپنے موضوع کا یہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں مجتبائی پریس دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ دائرۃ المعارف لاہور نے بھی اسے شائع کیا۔

۱۱۔ یك روزی: (فارسی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اور اس میں تقویۃ الایمان پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ایک دن شاہ اسماعیل نماز کے لیے مسجد کو جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے ان کو مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک رسالہ دیا' جس میں تقویۃ الایمان پر اعتراضات کیے گئے تھے اور مسئلۂ امکانِ نظیر سے متعلق شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی تردید کی گئی تھی۔ شاہ صاحب نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ گئے اور ایک ہی نشست میں اس کا جواب لکھ دیا۔ اسی لیے یہ رسالہ ''یک روزی'' کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ رسالہ کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ اگرچہ مختصر ہے' تاہم بہت جامع اور مدلل ہے۔ اب تک اس کا کوئی شخص جواب نہیں دے سکا۔

۱۲۔ حقیقت تصوف: (فارسی) یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کا ذکر ''الحیات بعد الممات'' میں کیا گیا ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے تصوف اور اس کی حقیقت بیان کی ہے اور سچے اور صحیح صوفی کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ تصوف کے نام پر جو غلط باتیں کی جاتی ہیں' ان کی مذمت کی ہے۔ اس کتاب سے طبقۂ صوفیا کی اصلاح ہوئی[1]۔

۱۳۔ الاربعین فی احوال المهديين: شاہ شہید کی یہ وہ کتاب ہے' جس کا ذکر ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ صرف ''حیات اسماعیل شہید'' میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ منقول ہے کہ یہ کتاب صرف

[1] الحیات بعد الممات ص ۱۹۹

ایک مرتبہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں مصری گنج کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' امام مہدی کا نزول ہے اور اس میں مصنف شہیر نے وہ احادیث جمع کر دی ہیں' جن سے امام مہدی کے نزول کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور بین السطور میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کا فارسی قصیدہ ہے ❶۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصیدہ کس شخص نے کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔

مکتوبات:

شاہ شہید رحمہ اللہ زندگی کے ہر قدم پر انتہائی سرگرم اور فعال رہے۔ مخالفین اسلام کے ساتھ جہاں ان کی مجاہدانہ تگ و تاز تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہے اور ان کی تصنیفی جدوجہد خاص اہمیت کی حامل ہے' وہاں ان کے مکتوبات کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں' مخالفوں' معاصروں' مختلف علاقوں کے سرداروں اور اہل علم کو بہت سے مکتوبات تحریر کیے۔ فقہی اور علمی مسائل دریافت کرنے والوں کے نام بھی انھوں نے خطوط لکھے' پھر اپنے مرشد امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کی خدمت میں بھی مکتوبات ارسال کیے۔ ان مکتوبات سے اس زمانے کے معاشرتی' دینی اور سیاسی کوائف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ مجاہدین کن حالات سے دوچار تھے اور خدمت اسلام کا جذبہ ان کے اندر کس طرح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پھر صوبہ سرحد کے عوام و خواص کا ان کے بارے میں کیا نقطۂ نظر تھا۔ شاہ شہید کے مکتوبات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے علم و فکر کے حدود کس درجہ وسیع تھے اور ان کی سیاسی بصیرت کتنی گہری تھی۔

شعر و شاعری:

شاہ اسماعیل شہید جہاں بہت بڑے نثر نگار تھے' وہاں ممتاز شاعر بھی تھے۔ نثر کے ساتھ ساتھ ان کی منظومات کو بھی اہل فن کے نزدیک ایک مقام حاصل ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو زبانوں میں طبع آزمائی کی اور اس میں کامیاب رہے۔ ان کے کلام کے حصہ فارسی میں (۱) مثنوی سلک نور (۲) قصیدہ در مدح آنحضرت ﷺ (۳) قصیدہ در مدح سید احمد شہید اور حصۂ اردو میں (۱) مثنوی سلک نور (۲) رسالہ بے نمازاں اور (۳) نسخۂ قوت ایمان شامل ہے۔ جس طرح ان کی نثر زوردار اور مؤثر ہے' اسی طرح ان کی (فارسی اور اردو) منظومات کا پایہ بھی بڑا اونچا ہے۔

شہادت:

اس عالم نبیل' فاضل بے بدل' ماہر علوم معقول و منقول' مجاہد اعظم' مصلح وقت' مجدد دوراں' بہادر

❶ حیات اسماعیل شہید ص ۱۹۲۔

جرنیل اور عظیم مصنف و شاعر نے اپنے متعدد رفقائے عالی قدر کے ساتھ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ کے میدان میں کفار سے جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شاہ محمد عمر:

جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا' شاہ محمد اسماعیل کی تعلیم و تربیت کی منزلیں ان کے چچا شاہ عبدالقادر کی آغوش محبت میں طے ہوئی تھیں۔ شاہ عبدالقادر کی ایک ہی صاحب زادی تھیں' جن کی شادی ان کے بھتیجے مولانا مصطفیٰ سے ہوئی تھی۔ ان کی بھی ایک ہی بیٹی تھیں' جو شاہ اسماعیل کے عقد میں آئیں۔ شاہ اسماعیل کے ہاں بھی ایک ہی لڑکا پیدا ہوا' جس کا نام محمد عمر رکھا۔

شاہ محمد عمر مزاجاً و طبعاً دنیا اور اہل دنیا سے اسی طرح بے نیاز اور مستغنی تھے' جس طرح ان کے جد امجد شاہ عبدالغنی تھے۔ تمام عمر گوشہ نشین اور لوگوں سے الگ تھلگ رہے۔ اپنے خاندانی مدرسے میں تعلیم پائی۔ اساتذہ میں صرف شاہ محمد اسحاق دہلوی کے اسم گرامی کا پتا چل سکا ہے۔ بہت ہی متقی اور خدا رسیدہ عالم تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ کا بیان ہے کہ شاہ محمد عمر کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت کثرت سے ہوتی تھی [1]۔

شاہ محمد عمر اپنے دور کے درویش آدمی تھے اور بعض دفعہ ان پر جذب کا غلبہ ہو جاتا تھا۔

امورِ مشتبہ سے پرہیز کرتے اور ممنوعات سے دامن کشاں رہتے۔ کسی ایسی جگہ نہ جاتے جہاں کسی شکل میں بھی برائی کا ارتکاب ہوتا ہو۔ اس سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کا بیان ہے کہ ہم چند احباب جن میں مرزا غالب بھی تھے' اپنے بالا خانے میں بیٹھے ہوئے تھے اور بلا مزامیر کے گانا ہو رہا تھا۔ اتفاق سے مومن خاں مومن کہیں سے شاہ محمد عمر صاحب کو پکڑ کر وہاں لے آئے۔ وہ برابر یہ کہتے جاتے تھے کہ "مجھے چھوڑ دو' مجھے چھوڑ دو۔" مگر مومن خاں نہیں مانتے تھے۔ آخر ان کو لا کر اس مجلس میں بٹھا دیا۔ گانا برابر ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر میں شاہ محمد عمر صاحب نے جسم کو ایک بہت ہی معمولی سی حرکت دی' اس کے اثر سے سارا مکان ہل گیا۔ اس پر حاضرین مجلس کچھ پریشان سے ہوئے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ شاید شاہ صاحب کی جنبش کا اثر ہو۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ ممکن ہے زلزلے کا جھٹکا ہو۔ مگر سب کی توجہ شاہ محمد عمر کی طرف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے دوبارہ جسم کو حرکت دی جو پہلی حرکت سے زیادہ تھی۔ اس سے پھر مکان ہلا اور پہلے کی نسبت زور سے ہلا۔ اب سب کو یقین ہو گیا کہ یہ

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۷۴۔

سب شاہ محمد عمر کی حرکت کا اثر ہے۔ تھوڑی دیر بعد ذرا اور زور سے جسم کو حرکت دی تو اس سے مکان کو اور زیادہ حرکت ہوئی' یہاں تک کہ کڑیاں بھی بول گئیں اور طاقوں وغیرہ میں جو شیشے اور آلات وغیرہ پڑے تھے وہ کھن کھن کر کے گرنے لگے۔ اس پر کسی نے شاہ محمد عمر سے کہا "یہ کیا؟" فرمایا "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو' مجھے مت بٹھاؤ۔" یہ الفاظ کہے اور اٹھ کر چلے گئے ❶۔

شاہ محمد عمر نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے' میاں سید نذیر حسین دہلوی فرماتے ہیں کہ مولوی محمد عمر کے زہد وعبادت کا یہ حال تھا اور نماز اس طرح اطمینان سے پڑھتے تھے کہ رکوع وسجود اس قدر طویل ہوتے کہ اس اثنا میں عام آدمی سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلی ستائیس اٹھائیس مرتبہ پڑھ لیتا ❷۔

استغنا اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ دہلی کے مغل بادشاہ نے اکثر ان سے ملاقات کی تمنا کی اور ارکانِ دولت کو پیغام ملاقات دے کر ان کی خدمت میں بھیجا' مگر آپ نہیں گئے اور ہمیشہ جواب میں یہی کہا کہ جس باپ کی نسبت سے بادشاہ میری ملاقات کے خواہش مند ہیں' ان کی بزرگی مجھ میں نہیں ہے اور اسی عذر پر کبھی ملاقات نہیں کی ❸۔

شاہ محمد عمر علم وعمل اور تقویٰ وتدین میں اپنے دور کی بے نظیر شخصیت تھے۔ ان کے اوصاف وکمالات کی وجہ سے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ہر حلقے میں ان کو لائق تکریم گردانا جاتا تھا۔ انھوں نے دو مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا' اکبر شاہ ثانی کا اور بہادر شاہ ظفر کا۔ ان دونوں باپ بیٹے کے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ انھوں نے اپنے امرا کی وساطت سے ان کو بارہا اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی' مگر وہ نہیں گئے اور ہر دعوت کے جواب میں نہایت انکسار سے کہلا بھیجا کہ نیکی اور پرہیزگاری میں میرا وہ مقام نہیں ہے جو میرے باپ یا میرے دیگر اسلاف کا تھا۔

شاہ محمد عمر نے ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۶۸ھ/۱۳ اپریل ۱۸۵۲ء کو وفات پائی۔ "مرگ شیخ زمان" سے ان کی تاریخ وفات نکالی گئی۔ شاہ محمد عمر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ اپنے خاندانِ عالی قدر کے آخری فرد تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی دودمانِ ولی اللّٰہی کی صلبی اولاد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ البتہ روحانی اولاد بے حد وحساب ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کا کوئی ایسا عالم دین نہیں جس کی سند ان بزرگوں تک نہ پہنچتی ہو اور جس نے کسی نہ کسی صورت میں ان سے استفادہ اور استفاضہ نہ کیا ہو۔ خود صاحب ترجمہ مولانا اسماعیل شہید کے علم وفضل' عمل و کردار' تصنیف وتالیف اور افکار ونظریات سے مستفید ومتاثر ہونے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ لوگ انھیں ملت اسلامیہ کا محسن عظیم قرار دیتے ہیں اور اپنا رہنما وقائد مانتے ہیں۔ رحمهم الله تعالى۔

❶ ارواح ثلاثہ ۱۷۵۔

❷ الحیات بعد الممات (حاشیہ) ص ۲۰۶

❸ الحیات بعد الممات ص ۲۰۶

۵۳-مفتی محمد اصغر انصاری فرنگی محلی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی علم وفضل اور درس وافتا میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ کسی کو اس میدان میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور کسی کو قدرے کم ___! ورنہ خدماتِ علمی میں مجموعی لحاظ سے کوئی کسی سے پیچھے نہیں ___ ان حضراتِ علما میں ایک بزرگ مفتی محمد اصغر تھے جو مفتی احمد انصاری فرنگی محلی کے لائق فرزند تھے اور اپنے عہد کے فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ان کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے یعنی فرنگی محل کے اسی مہد علم میں تربیت حاصل کی جہاں ان کے آباواجداد نے حاصل کی تھی۔پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا اور پھر اپنے والد ماجد مفتی احمد فرنگی محلی سے علومِ مروجہ کی تحصیل کی۔اس زمانے میں محمد مبین انصاری فرنگی محلی کی مسند تدریس آراستہ تھی، محمد اصغر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلے اور درس وتدریس میں انہی کا طریقہ اپنایا۔اپنے بزرگوں کے مدرسے کو رونق بخشی اور علما وطلبا کی کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہوگئی۔اس کے ساتھ ہی افتا کا سلسلہ شروع فرمایا جو خاندان میں ان کے آباواجداد سے چلا آرہا تھا۔فقہی مسائل میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مفتی محمد اصغر انصاری نے متعدد درسی کتابوں پر تعلیقات وحواشی تحریر کیے جو اہل علم میں مقبول ہوئے۔

اس ہندی عالم وفقیہ نے ہفتے کے دن ۱۳ رجب ۱۲۵۵ھ/۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اپنے شہر لکھنؤ میں وفات پائی[1]۔

۵۴-مفتی محمد افضل پھلواروی

صوبہ بہار کے شہر پھلواری کی علمی تاریخ نہایت شان دار ہے۔کئی صدیوں سے اسے علما وفقہا کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔اس شہر میں صوفیا واتقیا نے بھی جنم لیا اور درس وتدریس کے دلدادہ حضرات نے بھی اس میں بے حد خدمات انجام دیں۔تیرھویں صدی ہجری میں اس مرکز علم وتصوف میں جس بزرگ نے شہرت پائی ان کا اسم گرامی مفتی محمد افضل تھا۔فقہائے حنفیہ میں ان کو عزت وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی خدماتِ بوقلموں کی وجہ سے ان کو یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا۔اپنے دور میں یہ پھلواری کی مسند افتا پر فائز تھے اور اس نواح کے لوگ مسائل فقہ کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

مفتی محمد افضل پھلواروی سلوک وطریقت میں بھی درک رکھتے تھے اور پھلواری ہی کے ایک بزرگ شیخ مجیب اللہ ہاشمی جعفری کے حلقۂ ارادت سے منسلک تھے جو علوم متداولہ کے ماہرین میں سے تھے۔

مفتی محمد افضل پھلواروی نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وفات پائی[2]۔

---

[1] تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۳۹۔تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۰۔احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۱۶۔نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۸،

[2] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۹ بحوالہ تذکرۃ الکملا۔

۵۵- مولانا محمد اکبر کشمیری

وادیٔ کشمیر کی خوش گوار فضاؤں میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحابِ علم اور اربابِ فقہ نے ہوش سنبھالا ان میں مولانا محمد اکبر کشمیری کا ذکر لائق تذکرہ ہے۔ یہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو علمائے عصر کی خدمت میں حاضری دی اور مروّجہ علوم کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد بمبئی کا عزم کیا اور وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں جو جامع مسجد میں واقع تھا' درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ تیس سال یہ خدمت انجام دی اور اس طویل مدت میں بے شمار تشنگانِ علوم نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ مولانا محمد اکبر کشمیری اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا' ان کی وسیع فہرست میں سید عبدالفتاح' سید عماد الدین اور مفتی عبداللطیف کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو اپنے عہد اور علاقوں کے جلیل القدر علما میں شمار ہوئے۔ بمبئی' صوبہ گجرات' دکن اور کوکن وغیرہ کے علاقوں میں ان کے شاگرد وسیع تعداد میں موجود تھے۔

مولانا محمد اکبر کشمیری نے ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء کو بمبئی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں❶۔

۵۶- مولانا محمد اکرم شاہ جہان پوری

ہندوستان کے صوبہ یوپی کا شہر شاہ جہان پور ایک مردم خیز شہر ہے۔ اس شہر کو متعدد اہل فضل کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں اس شہر کی زرخیز مٹی سے جو حضرات ابھر کر سامنے آئے ان میں مولانا محمد اکرم اور ان کے والد مولانا محمد جان کے اسمائے گرامی تاریخ نے خصوصیت سے محفوظ کر لیے ہیں ___ باپ بیٹا دونوں ادراک و عرفان کے اعتبار سے اپنے عہد میں نامور تھے۔

محمد اکرم نے اپنے والد مولانا محمد جان اور بعض دیگر علمائے وقت کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا اور ان علوم میں جو اس عہد میں پڑھائے جاتے تھے' مہارت حاصل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اکرم نے اپنے آبائی شہر شاہ جہان پور میں درس و تدریس کا ہنگامہ بپا کیا اور مسند افتا کو رونق بخشی ___ ان کی تاریخ ولادت وفات کا علم نہیں ہو سکا❷۔

۵۷- مفتی محمد برکت عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا دارالحکومت ''پٹنہ'' ہے۔ اسے کسی زمانے میں ''عظیم آباد'' کہا جاتا تھا۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۸۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۹۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۹ بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

اس شہر کے علما وفضلا کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ یہ حضرات درس وتدریس میں ممتاز درجہ رکھتے تھے' فتویٰ نویسی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا' تدین وتقویٰ میں بھی انھیں شہرت حاصل تھی' جہاد فی سبیل اللہ میں بھی انھوں نے بے پناہ قربانیاں دیں اور تفسیر وحدیث اور فقہ کی ترویج واشاعت میں بھی ان کی تگ وتاز کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پٹنہ کے حضراتِ علما میں ایک بزرگ کا نام نامی مفتی محمد برکت تھا جو اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ انھوں نے میر جمال الدین فاضل سے اخذ علم کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور پھر عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں میں اس دور کے بعض جلیل القدر علما کے نام ملتے ہیں' جن میں ایک عالم مولانا عبدالغنی پھلواروی ہیں۔ لاتعداد علما وطلبا نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور کسب علم کیا۔

مفتی محمد برکت عظیم آبادی نے ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء کو وفات پائی [1]۔

۵۸۔ سید محمد تقی لکھنوی

لکھنؤ کے شیعہ علما وفقہا میں تیرھویں صدی ہجری میں سید محمد تقی مشہور شخصیت تھے جو سید حسین لکھنوی کے بیٹے اور سید دلدار علی حسینی کے پوتے تھے۔ شیعہ امامیہ مذہب میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے انھیں مجتہد کہا جاتا تھا۔

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۴ھ/ ۱۳ مارچ ۱۸۱۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید حسین سے علم حاصل کیا۔ سید دلدار علی لکھنوی سے سند واجازہ کا شرف حاصل ہوا' اور کبار علمائے شیعہ امامیہ میں گردانے گئے۔ لکھنؤ میں یہ نوابانِ اودھ کا دور تھا اور امجد علی شاہ برسر حکومت تھا۔ نواب امجد علی نے ان کو "ممتاز العلما" کا خطاب عطا کیا اور شاہی مدرسے کی مسند درس ان کے سپرد کی۔

سید محمد تقی تصنیفی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ نخبة الدعوات: یہ کتاب ادعیہ ماثورہ سے متعلق ہے۔
۲۔ العباب: یہ علم نحو کے بارے میں ہے۔
۳۔ کتاب الارشاد: یہ ان لوگوں کے رد میں ہے جو تاثیر دعا سے انکار کرتے ہیں۔
۴۔ حدیقة الواعظین:
۵۔ نزهة الواعظين:
۶۔ لمعة الواعظين: یہ تینوں کتابیں (نمبر ۴ تا ۶) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' وعظ ونصیحت کے بارے میں ہیں۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۳۱ بحوالہ تاریخ الکملا۔

۷۔ ایک رسالہ اس موضوع پر ہے کہ اگر کوئی شخص بذاتِ خود فاسق ہو' مگر مومنین کے حق میں عادل ہو تو اس کی امامت جائز ہے۔

۸۔ رسالہ فی فضائل الدعاء و آدابہ: یہ رسالہ دعا کے فضائل و آداب کے موضوع سے متعلق ہے۔

۹۔ ینابیع الانوار فی تفسیر کلام اللہ الجبار: یہ کتاب تفسیر قرآن کے سلسلے میں ہے۔

سید محمد تقی کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور مختلف موضوعات سے متعلق ان کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں موجود تھیں۔

انھوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور امام بارگاہ بھی بنوایا تھا۔ اس امام بارگاہ میں بہت سے شیعہ حضرات آتے جاتے تھے۔ بالخصوص محرم کے عشرہ اول میں وہاں بہت ہجوم رہتا تھا اور مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔

سید محمد تقی نے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔

۵۹- قاضی محمد جمیل برہان پوری

قاضی محمد جمیل بن عبدالغفور برہان پوری جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے ___ متقی علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا برہان پور ہے۔ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا۔ بعد ازاں ابتدائی درسی کتابیں اپنے شہر (برہان پور) کے اساتذہ مولوی قدرت اللہ' مولوی ضیاء الدین عرف اللہ والے اور مولوی عوض علی سے پڑھیں۔ اس کے بعد حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا' لیکن بہت کم عرصہ وہاں مقیم رہے اور مولوی محمد حفیظ سے کچھ استفادہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے حیدر آباد میں ان کا دل نہیں جما۔ اس لیے جلد ہی وہاں سے رخت سفر باندھا اور دہلی آ گئے۔ دہلی میں اس وقت بہت سے جید علما اور عالی مرتبت حضرات اقامت گزیں تھے' جن کے درس و تدریس کے ہنگامے جاری تھے۔ ان میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی' مفتی صدر الدین آزردہ اور سید محمد قندھاری کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد جمیل نے ان سب کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا اور خوب مستفید ہوئے۔ شاہ ابوسعید مجددی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔

دہلی سے لکھنؤ کا قصد کیا۔ لکھنؤ میں ممتاز شافعی المسلک عالم مرزا حسن علی لکھنوی کی مسند تدریس آراستہ تھی' محمد جمیل اس میں شامل ہوئے اور حصولِ علم کیا۔

لکھنؤ سے عازمِ حجازِ مقدس ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔

حجاز سے مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور اپنے وطن برہان پور پہنچے۔ چوں کہ حدیث و فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں عبور رکھتے تھے' لہٰذا برہان پور کے منصب قضا پر فائز کیے گئے اور کافی عرصہ یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔

برہان پور سے پھر حیدر آباد (دکن) گئے۔ اب تمام اصناف علم پر حاوی ہو چکے تھے اور تجربہ بھی وسیع ہو گیا تھا' اس لیے حیدر آباد کے مدرسۂ عالیہ کی مسند تدریس انھیں تفویض کی گئی۔ تا حین حیات اس مسند پر متمکن رہے اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

اس عالم کبیر اور فقیہ نام دار نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۴ھ/ ۹ جنوری ۱۸۵۸ء کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی اور اسی شہر میں آسودۂ لحد میں ہوئے❶۔

۶۰۔ سید محمد حسین حیدر آبادی

ہندوستان کے علاقہ دکن کے علمائے کرام اور فقہائے عظام میں سید محمد حسین حیدر آبادی معروف عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ والد کا اسم گرامی علی نور اور جد امجد کا نام نامی نور محمد تھا۔ تمام علوم میں دسترس رکھتے تھے' لیکن فقہ اور اصول فقہ میں بالخصوص شہرت حاصل تھی۔ درحقیقت ان کا خاندان خراسان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی پیدائش بھی خراسان ہی میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ اوائل عمر (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء) میں ہندوستان آئے اور یہاں کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء میں حیدر آباد (دکن) گئے۔ حیدر آباد میں یہ ناصر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ اس سے ملے تو وہ ان کے کثرت معلومات اور علوم پر مہارت سے بہت متاثر ہوا' اور انھیں اپنے بیٹے افضل الدولہ کا استاد مقرر کر دیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو انھیں حاصل ہوا۔ یہ خدمت انھوں نے نہایت حسن وخوبی سے انجام دی۔ بعد ازاں اپنی قابلیت کی بنا پر محکمۂ قضا میں نائب مقرر ہوئے۔ مدت تک یہ خدمت ان کے سپرد رہی۔ بے حد صالح اور متدین عالم دین تھے۔ گفتار اور کردار میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس کام پر مامور کیے جاتے' اسے عمدگی سے انجام دیتے۔ بلند اخلاق اور نرم مزاج اہل علم تھے۔

سید محمد حسین نے غرۂ رمضان ۱۲۷۴ھ/ مئی ۱۸۵۸ء کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی❷۔

۶۱۔ شیخ محمد حسین انصاری سندھی

دیارِ سندھ کے شیخ محمد حسین بن محمد مراد بن یعقوب بن محمود انصاری خزرجی' اپنے عصر کے فاضل اور عالم کبیر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ علاقۂ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے والد شیخ محمد مراد جلیل القدر عالم تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے علم

---

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۷ص ۴۳۲' ۴۳۳۔ تاریخ برہان پور ص ۱۷۵۔۱۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۵

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۳۴ بحوالہ تزک محبوبی

حاصل کیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ پھر والد کے ساتھ ہی ہجرت کر کے دیارِ عرب کو اپنا مسکن بنا لیا۔ تفسیر و حدیث' صرف و نحو' بیان و معانی میں ممتاز تھے۔ علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ سرزمین عرب میں انھیں بڑی شہرت حاصل تھی اور وہاں کے علما و فضلا ان کے علم و کمال کے معترف تھے۔ اربابِ حکومت میں بھی قدر و منزلت کے مالک تھے۔ ان کے والد محمد مراد بھی طبقۂ علما اور امرا و وزرا میں تعظیم کے حامل تھے۔ حکومت کے ایک وزیر نے شیخ محمد مراد کے لیے ایک رباط' ایک مسجد اور بہت اچھا مکان تعمیر کرا دیا تھا۔ ان کا عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں ❶۔

۶۲۔ مولانا محمد سالم دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا گھرانا علمی اعتبار سے نہایت زرخیز گھرانا تھا۔ ان کی اولاد و احفاد سے متعدد اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے بہترین خدمات انجام دیں۔ تصنیف و تالیف' شروح و حواشی اور درس و تدریس میں ان میں سے بعض حضرات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس خانوادۂ عالی قدر کے ایک بزرگ مولانا محمد سالم تھے جو فضیلت علم اور مشیخت میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کا مولد و منشا دہلی ہے۔ اپنے عصر کے جلیل القدر اساتذہ سے تحصیل علم کی اور پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ مولانا سلام اللہ کے لائق فرزند تھے اور اپنے دور کے جید علما میں گردانے جاتے تھے۔ حج بیت اللہ کے بعد واپس وطن تشریف لائے تو ہندوستان کے شہر دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علما و فضلا کا مرجع قرار پا گئے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ اصول الایمان فی حب النبی والہ من اهل السعادة والایقان: یہ کتاب ایک مقدمے اور چار فصول پر مشتمل ہے۔ مصنف کی زندگی ہی میں ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کو دہلی میں طبع ہوئی۔

۲۔ نور الایمان:

۳۔ لطائف الاسرار: یہ کتاب تعویذات اور دم جھاڑے سے متعلق ہے۔

۴۔ طریق السالم

۵۔ ترجمہ حزب البحر

بعض اور رسائل بھی تصنیف کیے۔

مولانا محمد سالم اپنے دور کے معروف علما و فقہا میں سے تھے۔ ان کے سن ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا❷۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۳۸۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۰' ۴۴۱ بحوالہ مرآۃ الحقائق۔

۶۳- مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی

ہندوستان کے شہر مدراس اور اس کے نواح میں جو اصحاب علم فقہی میدان میں سرگرم عمل ہوئے ان میں مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء کو مدراس میں ان کی ولادت ہوئی اور مختلف علمائے وقت سے حصول علم کے بعد کچھ عرصہ تو درس وافادہ میں مشغول رہے' پھر حکومت مدراس نے ان وظائف وعطیات کی تقسیم پر مامور کر دیا جو اہل حرمین کے لیے مقرر تھے۔ والئ مدراس نے ان کو سراج العلما حافظ محمد اسلم خاں بہادر کے لقب سے سرفراز کیا اور اسی لیے اسلمی کہلائے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حجاز تشریف لے گئے اور مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ طویل مدت تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ قیام مکہ کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ کا عربی میں ترجمہ کیا تاکہ علمائے مکہ اور دیگر عرب اہل علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

مکہ مکرمہ سے اپنے وطن مدراس آئے اور مدراس میں ایک ذاتی مکان بنایا۔ ایک باغ لگایا اور سعید آباد کے نواح میں قبرستان کے لیے بھی ایک جگہ وقف کی۔

مدراس سے حیدر آباد (دکن) گئے۔ پھر اورنگ آباد کا عزم کیا اور ایک عرصے کے بعد دوبارہ مدراس آئے۔

اس عالم دین نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ''سفینۃ النجات'' ہے جو اختلافی مسائل سے متعلق ہے اور ضخیم کتاب ہے۔ آخر عمر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد سعید اسلمی نے ۸ ربیع الاول (ایک روایت کے مطابق ۱۱ محرم) ۱۲۷۱ھ/ ۴/ اکتوبر ۱۸۵۵ء یا ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کو مدراس میں وفات پائی اور وہیں اپنے ذاتی قبرستان (نواح سعید آباد) میں دفن کیے گئے ❶۔

۶۴- مولانا محمد سلیم جون پوری

جون پور (یوپی) کا ایک مشہور شہر ہے جو بے شمار علما وفقہا کا مولد ومرکز رہا ہے اور ان کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں کئی مقامات پر ہو چکا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن بلند پایہ حضرات نے نوع بنوع علمی خدمات انجام دیں، ان میں مولانا محمد سلیم جعفری جون پوری کا اسم گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

محمد سلیم جعفری ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری سے ملتا ہے۔ محمد سلیم نے علوم عربیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے نامور

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۱، ۴۴۲۔

عالم مفتی علی کبیر بن علی محمد جعفری مچھلی شہری سے حاصل کی اور انتہائی کتابوں کا درس قاضی محمد شکور مچھلی شہری سے لیا۔ ملا رحمت اللہ کابلی سے بھی استفادہ کیا۔

محمد سلیم جعفری اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ عربی ادبیات میں انھیں خصوصیت سے درک حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے شاعر تھے اور طبیعت موزوں رکھتے تھے۔ پرہیزگار، بلند اخلاق، بامروت، فہیم اور صاحب فراست عالم تھے۔ گفتار و کردار میں بے نظیر تھے۔ فصاحت و بلاغت میں یکتا اور سخن سنجی اور نکتہ آفرینی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی نظم و نثر میں مشکل ترین مضامین کی عقدہ کشائی میں تیز تھے۔

فقہ میں عبور کی وجہ سے اپنے استاد محترم مفتی علی کبیر مچھلی شہری کی سفارش پر پہلے قاضی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا منصب پایا۔ بعد ازاں صدر الصدور کا عہدہ حاصل کیا۔ اپنے دور کے علمائے ہند میں ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اپنی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر ملک کی انگریزی حکومت میں قدر و منزلت کے حامل تھے۔ تصنیف و تالیف میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں:۔

۱۔ رقیتۃ السلیم: یہ کتاب علم حدیث سے متعلق ہے اور اس میں فقہی مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب عربی میں ہے۔

۲۔ حاشیہ علی شرح چغمینی: علم ہیئت کے بارے میں شرح چغمینی پر عربی حاشیہ۔

۳۔ ھفوات الالحاد: عربی ادبیات کے بارے میں۔

۴۔ رسالہ الجبر والمقابلہ: یہ بھی عربی میں ہے۔

۵۔ میزان الوافی فی علمی العروض و القوافی: عروض و قوافی کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔

۶۔ رسالہ فی تحقیق الشھور: سال کے بارہ مہینوں کے بارے میں۔

۷۔ رسالہ مصطلحات فارسی۔

۸۔ جون پورنامہ: جون پور کی تاریخ سے متعلق۔

۹۔ دیوان فارسی: فارسی اشعار کا مجموعہ۔

۱۰۔ دیوان عربی: عربی اشعار کا مجموعہ۔

اس عالم و فقیہ نے صرف چوالیس سال عمر پائی اور یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۶ھ/۱۵ مارچ ۱۸۵۰ء کو اعظم گڑھ (یوپی) میں فوت ہوئے۔ وہیں دفن کیے گئے ❶۔

❶ تجلی نور ج ۲ ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۷۶، ۳۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۲، ۴۴۳۔

۶۵- سید محمد سیادت امروہوی

امروہہ (یوپی) کے شیعہ علما وفضلا میں سید محمد سیادت بن محمد عبادت حسین امروہوی نے بڑا نام پایا۔ امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان کے والد سید محمد عبادت شیعہ کے معروف علما میں سے تھے، بیٹے نے انہی سے اکتساب علم کیا اور علم فقہ اور دیگر علوم میں عبور حاصل کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں ایک ممتاز شیعہ مجتہد سید محمد بن دلدار علی لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور فقہ، کلام، اصول فقہ اور باقی علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت پیدا کی۔ اب وہ فقہ واصول میں اپنے عصر کے بہت بڑے شیعہ عالم شمار ہونے لگے۔ فارغ التحصیل ہو کر واپس امروہہ گئے تو انھیں اپنے والد گرامی سید محمد عبادت کی جگہ فرض نمازوں کا امام مقرر کر دیا گیا اور تحقیق مسائل میں امروہہ اور اس کے گرد ونواح کے حضرات ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اپنے شہر کا منصب افتا اور عہدہ تدریس بھی ان کے سپرد کیا گیا اور اس سلسلے میں دور دور تک ان کا نام پہنچا۔

امروہہ کے اس شیعہ فقیہ نے ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء کو امروہہ میں وفات پائی [1]۔

۶۶- محمد شاکر سورتی

ہندوستان کے علاقہ گجرات کے شہر سورت میں جو علما وفقہا پیدا ہوئے ان کا ذکر فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں متعدد مقامات پر آ چکا ہے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شاکر تھے جو سورت کے اونچے مرتبے کے فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ ان کے زمانے میں سورت میں لاہور کے ایک عالم وفقیہ سید عبداللہ حسنی لاہوری فروکش تھے، محمد شاکر نے انہی سے اخذ علم اور کسب فیض کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر ہی میں سکونت اختیار کیے رکھی اور تمام عمر درس وافادہ میں مشغول رہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ فقہی مسائل کی تحقیق ودریافت میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

مولانا محمد شاکر سورتی نے ۱۱ر ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ/ ۲۷ جون ۱۸۲۵ء کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [2]۔

۶۷- مولانا محمد شکور ہاشمی مچھلی شہری

صوبہ یوپی کا ''مچھلی شہر'' کسی زمانے میں اہل علم کا گہوارہ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے لائق تذکرہ حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شکور جعفری ہاشمی مچھلی شہری گزرے ہیں، جن کے والد کا نام مولانا

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۳ بحوالہ تاریخ اصغری۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۳، ۲۴۴ بحوالہ حدیقۃ احمدیہ۔

امانت علی جعفری ہاشمی تھا اور وہ اپنے دور کے فاضل شخص تھے۔ ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

محمد شکور کی ولادت ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹۷ء میں مچھلی شہر میں ہوئی اور اپنے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ حصول علم کا آغاز اپنے نانا مولوی علی محمد سے کیا جو علم و عمل اور فضل و کمال میں اونچے مرتبے کے مالک تھے۔ کتب درسیہ کی تکمیل انھی سے کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا رشید الدین خاں، مولانا عبدالحی بکری برہان پوری اور مولانا فضل امام خیر آبادی کے سلسلہ ہائے دروس جاری تھے۔ محمد شکور ان میں شامل ہوئے۔ تین سال دہلی رہے اور ان سب علمائے مشاہیر سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہوئے تو ان کا شمار اپنے دور کے معروف علما میں ہونے لگا اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں ممتاز گردانے گئے۔ حدیث وفقہ میں بالخصوص عبور حاصل تھا۔ ان کی شہرت علمی اس زمانے کے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے سرکردہ ارکان تک پہنچی تو انھیں منصب افتا پر متمکن کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ پھر فتح پور ہسوہ میں صدر الصدور کا عہدۂ جلیلہ ان کے سپرد ہوا۔ پچیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا۔ ان کے معروف شاگردوں میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی شامل ہیں۔ مولوی رحمان علی نے فتح پور ہسوہ میں بھی ان سے تعلیم پائی اور پھر جب وہ ملازمت سے علیحدہ ہو کر اپنے وطن مچھلی شہر چلے گئے تو اس وقت بھی یہ ان کی خدمت میں حاضر تھے اور ان کے عزیز اور لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ مکہ مکرمہ کے دورانِ قیام میں مفتی مکہ سید محمد حسین سے بھی استفادہ کیا۔

مولانا محمد شکور نے ترک ملازمت کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں ملازمت چھوڑی تو گھر میں بیٹھ گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وفات کے وقت تک چالیس سال گھر میں رہے اور اس دوران میں حکومت انگریزی کی طرف سے باقاعدہ پنشن ملتی رہی۔ چالیس سال میں نوے ہزار روپے پنشن کے ملے جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں:

۱۔ شرح مقامات ہندی۔

۲۔ حل ابحاث الفرائد۔

۳۔ شرح کنز الدقائق: فقہ کی مشہور درسی کتاب کنز الدقائق کی شرح۔

۴۔ ترجمہ طوطی نامہ (از نخشبی)

یہ تمام کتابیں عربی میں ہیں۔

اس عالم وفقیہ نے ۲۹/شوال ۱۳۰۰ھ/۲/اگست ۱۸۸۳ء کو مچھلی شہر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے❶۔

۶۸۔سید محمد ظاہر حسنی بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مقامات علم وکمال اور ورع وتقوی میں رائے بریلی کو ایک عرصے سے اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شاہ علم اللہ کے اخلاف میں سے ایک عابدوزاہد بزرگ سید محمد ظاہر حسنی تھے جو سید غلام جیلانی کے فرزند تھے۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں اپنے آبائی وطن رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے عم محترم سید قطب الہدیٰ سے جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ تھے' حصول علم کا آغاز کیا اور طویل مدت تک ان سے مشغول استفادہ رہے۔ علوم مروجہ کی کچھ کتابیں مولانا ذوالفقار علی دیوی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے۔ اور مولانا عبدالجامع سیدن پوری کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علم طب کو مرکز التفات ٹھہرایا اور لکھنؤ کے بعض مشاہیر اطبا سے کتب طب پڑھیں اور اس میں مہارت پیدا کی۔ حصول علم سے فراغت کے بعد اپنے شہر رائے بریلی تشریف لے گئے اور سید احمد شہید بریلوی سے اخذ طریقت کیا۔ پھر حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج کے بعد وطن واپس آئے اور دعوت وارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ ریاست ریواں میں مقیم رہے۔ وہاں ریاست کے دیوان پانڈے دین بندہ بہادر کے بیٹوں کو تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور وہ ان کے علم وفضل اور زہد واتقا سے متاثر ہوئے۔

سید محمد ظاہر بارعب، بلند اخلاق، متواضع، فصیح اللسان، سلیم العقل اور صحیح الفکر اہل علم تھے۔ اللہ نے ان کو حسن صورت، عذوبت زبان اور اخلاقِ حسنہ کی دولت سے نوازا تھا۔ وعظ وخطابت، درس وتدریس، فتوی نویسی اور فصل خصومات ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے اوصاف گوناگوں کی بنا پر سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور وہ سب سے احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اپنے شہر اور قرب وجوار میں انھیں قبولیت عامہ حاصل تھی۔ اردو کے شاعر تھے۔ تصنیف وتالیف کا ملکہ بھی تھا۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:۔

۱۔ تحریم الحرام: یہ قرآن مجید کی آیت ﴿وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر ہے۔

۲۔ قاطع البدعۃ: بدعات ورسوم کی تردید میں۔

۳۔ خیر المسالک: سلوک وتصوف کے بارے میں۔

❶ تجلی نور ج ۲ ص ۱۲۵ تا ۱۲۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ۲۶۹، ۲۷۷۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۹۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۴۔

۴۔ رسالہ در بیان وحدت الوجود و وحدت الشہود: اس میں وحدت الوجود کا رد کیا گیا ہے۔

۵۔ رسالہ در بیان فتوحات شام۔

۶۔ دیوان شعری، اردو۔

اوپر کی پانچوں کتابیں فارسی میں ہیں۔

ان کے شاگردوں میں مولانا محمد صادق غازی پوری، مولانا لطف اللہ لکھنوی اور ان (سید محمد ظاہر) کے بھانجے سید فخر الدین حسنی (صاحب نزہۃ الخواطر کے والد) شامل ہیں۔

سید محمد ظاہر نے ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں رائے بریلی میں بعارضہ فالج وفات پائی ❶۔

۶۹- علامہ محمد عابد سندھی

تیرھویں صدی ہجری کے دیار سندھ کے علمائے مشاہیر میں علامہ محمد عابد بن احمد علی بن محمد مراد بن یعقوب حافظ بن محمود انصاری خزرجی سندھی کا اسم گرامی بہت مشہور ہے۔ وہ اپنے دور کے محدث نامدار اور فقیہ کامل تھے۔ معقول و منقول کے جامع اور فقہ حنفیہ کے ماہر تھے۔ نسباً مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ جیسا کہ شجرہ نسب سے ظاہر ہے، والد کا اسم گرامی شیخ احمد علی اور دادا کا محمد مراد تھا۔

محمد عابد سندھی کی ولادت ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کے لگ بھگ صوبہ سندھ کے ایک مشہور مقام ''سیون'' میں ہوئی۔ ان کے جد امجد شیخ محمد مراد اپنے اہل و عیال کے پورے قافلے کے ساتھ ارض سندھ سے ہجرت کر کے سرزمین عرب میں چلے گئے تھے اور وہیں اقامت اختیار کر لی تھی۔ اصحابِ علم و صلاح میں ان کا شمار ہوتا تھا اور شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب تھے۔

محمد عابد سندھی نے علومِ مروجہ کی اکثر کتابیں علاقہ عرب میں اپنے عم محترم شیخ محمد حسین سے پڑھیں۔ پھر علمائے یمن و حجاز کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں علامہ سید عبدالرحمٰن بن سلیمان اہدل، شیخ یوسف بن محمد زجاجی، شیخ محمد طاہر سنبل، مفتی عبدالملک قلعی اور شیخ صالح بن محمد عمری زیادہ مشہور ہیں اور ان کا شمار اُس عہد کے مشاہیر علمائے عرب میں ہوتا تھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ محمد عابد سندھی نے یمن کے مقام ''زبید'' کو اپنا مسکن قرار دیا اور زیادہ عرصہ وہیں رہے یہاں تک کہ وہیں کے ساکنین میں سے گردانے گئے۔ بعد ازاں ''صنعا'' تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ زندگی کا بہت بڑا حصہ وہیں گزارا، اور وہاں کے امیر کے طبیب مقرر ہو گئے۔ شادی بھی وہاں کے ایک وزیر کی بیٹی سے ہوئی۔ وہاں کے عوام و خواص ان کی بوقلموں علمی صلاحیتوں

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۶، ۱۹۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۵، ۴۴۶۔

سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ امیر صنعا نے ایک مرتبہ ان کو بہت سے ہدایا و تحائف دے کر حاکم مصر کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا۔۔۔۔ دربار مصر میں ان کی یہ سفارت آگے چل کر ان کی عظمت و شہرت کا باعث بنی اور وہ ایک اونچے مقام پر فائز ہوئے۔

مصر میں طابہ کے محلات اور باغات ان کے لیے بالخصوص وجہ کشش تھے اور ان کی خوشبو اور مہک انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی۔ چنانچہ ایک دن وہاں گئے تاکہ اس کے قرب و جوار میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کریں اور وہاں سکونت اختیار کر کے علم و حکمت کے موتی بکھیریں۔

اس نواح میں وہ ایک عرصے تک اقامت گزیں رہے اور درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ذریعے وہاں کے لوگوں کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائے رکھا۔ لیکن وہاں کے لوگ ان کی مخالفت پر اتر آئے اور ان کی تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی کوششوں کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مجبوراً اپنے اس پسندیدہ مقام سے خیمہ اکھاڑنا پڑا۔ اب وہ وہاں سے کوچ کر کے ''حدیدہ'' میں آبسے۔ حدیدہ میں انھیں ایک اور دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا۔

۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء کا واقعہ ہے کہ حسین بن علی حازمی جو کہ زیدی شیعہ تھے، حدیدہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ وہ اہل نجد کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ اذان میں حی علی خیر العمل کے الفاظ بڑھائے جائیں اور وہ الفاظ جو مسلمانوں کو ان کے اخلاف سے ورثے میں ملے ہیں، یعنی الصلوۃ خیر من النوم ترک کر دیے جائیں۔ وہ ان الفاظ کو بدعت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ الفاظ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ایجاد کیے ہیں۔ لیکن لوگوں نے قاضی حسین بن علی حازمی کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔

جب قاضی نے دیکھا کہ لوگ ان کا حکم ماننے کو تیار نہیں اور وہ اس کو غلط قرار دیتے ہیں تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے اور سختی پر اتر آئے۔ انھوں نے چالیس آدمیوں کو جنھیں وہ خطرناک سمجھتے تھے، گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ علامہ محمد عابد سندھی کو بھی ان کے ساتھ حوالہ زندان کر دیا گیا۔ علامہ سندھی اور ان کے ساتھیوں پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق ڈال دیے اور ان کے لیے بیٹھنا اٹھنا اور چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ متواتر چھ دن ان کو اسی حالت میں رکھا گیا۔ پھر سب کو چھوڑ دیا، لیکن علامہ محمد عابد کو نہیں چھوڑا، ان کو قاضی حسین بن علی حازمی کے حکم کے مطابق شدید مارا پیٹا گیا۔ بالآخر انھیں حدیدہ سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے آبائی وطن سندھ آئے اور وہاں کے ایک مقام ''نواری'' میں قیام پذیر ہوئے۔ چند روز وہاں رہے، پھر ذہن میں بلاد عرب کا شوق موجزن ہوا، اور ادھر کے لیے رخت سفر باندھا۔ اب مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کی اور نہایت اکرام و احترام کے ساتھ اس بلدہ طیبہ میں مقیم ہوئے۔ والیٔ مصر کی طرف سے علمائے ملک کی صدارت کے منصب پر فائز کیے گئے اور انتہائی عزت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اللہ کی

عبادت، اتباع سنت، صبر واستقامت، نصح امت، اشاعت دین، لوگوں سے رافت وشفقت کا برتاؤ کرنے اور نشر علوم کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ہر لحہ اسی میں مشغول رہتے اور یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

علامہ محمد عابد سندھی کا تذکرہ البدر الطالع میں قاضی محمد بن علی شوکانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عابد سندھی اپنے چچا کی معیت میں بندرگاہ حدیدہ پہنچے، ان کے چچا علم طب میں بہت مشہور تھے۔ شیخ محمد عابد بھی طبابت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں صرف ونحو، فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل تھی۔ علم طب میں شہرت وناموری کی وجہ سے حاکم وقت امیر منصور نے ان کو حدیدہ سے خاص طور پر بلایا اور بہت سے لوگوں نے ان سے علاج کرایا اور صحت یاب ہوئے۔

قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں محمد عابد حدیدہ سے ان کے پاس صنعا آئے اور ان سے ہدایۃ الابہری اور اس کی شرح میبذی پڑھی۔ باوجود اس کے کہ کتاب کے مباحث بہت مشکل اور دقیق ہیں، جو بڑے بڑے علما کی سمجھ میں بھی نہیں آتے، لیکن وہ ہر بحث کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

پھر کچھ عرصہ بعد شوال ۱۲۱۳ھ میں وہ حدیدہ واپس ہوئے اور امیر حدیدہ نے ان کو نہایت اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ ان کے لیے خاص وظیفہ مقرر کیا اور خلعت عطا کی۔ بہت سے عطیات وتحائف بھی دیے۔ پھر ان کی آمدورفت صنعا میں بھی رہی۔ زمانہ منصور میں بھی وہ کئی دفعہ صنعا آئے۔ متوکل باللہ کے عہد میں بھی ان کا وہاں آنا جانا رہا۔ امیر مہدی کے دور میں بھی وہ متعدد مرتبہ وارد صنعا ہوئے۔

مہدی کے نزدیک تو وہ اس قدر لائق اعتماد تھے کہ ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء میں اس نے ان کو محمد علی پاشا کے دربار میں اپنے خاص نمائندے کی حیثیت سے تحائف دے کر مصر بھیجا۔ جب مصر سے واپس آئے تو کہا کہ مصر میں علم ختم ہو چکا ہے۔ صرف تقلید اور تصوف کی باتیں باقی رہ گئی ہیں، لوگ فکر اور اجتہاد کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

الیانع الجنی میں شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی رقم طراز ہیں کہ عادات واطوار اور اخلاق وکردار کی بلندی میں شیخ محمد عابد اپنے زمانے کے معروف ترین لوگوں میں سے تھے۔ کئی مبسوط اور مختصر کتابیں ان سے یادگار ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ المواهب اللطيفه علىٰ مسند الامام ابی حنيفه: یہ صرف حصکفی کی روایت پر مشتمل ہے۔

۲۔ طوالع الانوار على الدر المختار: یہ اپنے موضوع کی جامع کتاب ہے، جس میں مذہب امام ابوحنیفہ کے فروعی مسائل اور فتوے بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ شرح تيسير الوصول الى احاديث الرسول: یہ ابن الربیع حافظ شیبانی کی کتاب کی شرح ہے جو کتاب الحدود تک ہے۔

۴۔ حصر الشارد فی اسانيد محمد عابد: یہ اسانید کے بارے میں ایک مبسوط ومفصل کتاب

ہے جو بندرگاہ مخا میں، ماہ رجب ۱۲۴۰ھ/ مارچ ۱۸۲۵ء کو مکمل ہوئی۔

۵۔ شرح بلوغ المرام: منقول ہے کہ علامہ سندھی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب ''بلوغ المرام'' کی شرح لکھنی شروع کی تھی، لیکن اسے مکمل نہ کر پائے۔

ان کتابوں کے علاوہ مختلف علوم وفنون سے متعلق انھوں نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔

وہ عربی کے شاعر بھی تھے۔

علامہ محمد عابد سندھی نے پیر کے دن ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ/ ۸ مئی ۱۸۴۱ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں باب عثمان کے سامنے دفن کیے گئے ❶۔

۷۰۔ سید محمد عسکری امروہوی

امروہہ، ہندوستان کے صوبہ یو پی کا وہ شہر ہے جس میں بہت سے شیعہ علما وفقہا پیدا ہوئے اور انھوں نے علم وادراک میں شہرت حاصل کی۔ تیرھویں صدی ہجری کے ان علما میں ایک بزرگ سید محمد عسکری حسینی نقوی تھے جن کے والد کا اسم گرامی سید محمد سیادت اور دادا کا محمد عبادت تھا۔

سید محمد عسکری کی ولادت امروہہ میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان کے والد سید محمد سیادت اس عہد کے نامور علما میں سے تھے۔ محمد عسکری نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی اور شیعی فقہ کا حصول بھی انہی سے کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے شیعہ علما میں سے سید محمد بن دلدار علی مجتہد لکھنوی اور ان کے بڑے بھائی سید حسین کا بہت شہرہ تھا اور ان کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ سید محمد عسکری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں بھائیوں سے خوب استفادہ کیا۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے تو واپس اپنے وطن امروہہ آئے اور والد کی وفات کے بعد وہاں کے شیعہ حضرات کی نماز پنجگانہ کی امامت ان کے سپرد ہوئی۔ تدریس وافتا کی ذمے داریاں بھی انھیں سونپی گئیں۔ چونکہ مروجہ علوم میں دست رس رکھتے تھے اور بالخصوص فقہ شیعہ میں ادراک حاصل تھا' علاوہ ازیں آبا واجداد سے ایک مذہبی منصب پر فائز چلے آرہے تھے، لہٰذا بہت جلد امروہہ اور اس کے قرب ونواح کے شیعہ حضرات کا مرجع قرار پا گئے۔ وہاں کے اصحابِ تشیع کے امام بھی تھے' فتوی نویسی بھی کرتے تھے اور طلبا کو درس بھی دیتے تھے۔ اپنے حلقے میں بڑی تکریم کے حامل تھے اور قدر ومنزلت رکھتے تھے۔

سید محمد عسکری حسینی نقوی نے ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء کو امروہہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

---

❶ البدر الطالع ج ۲ ص ۲۲۷۔ الیانع الجنی۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۶ تا ۴۴۹۔ ابجد العلوم ج ۳ ص ۱۷۰۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۱۔

۱۷۔حافظ محمد عظیم پشاوری

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے پشاور میں حافظ محمد عظیم کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ اپنے عہد اور علاقہ پشاور کے عالم نبیل، فاضل جلیل اور واعظ بے عدیل تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع اور صاحب کشوف و کرامات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر میں بہت غبی اور کند ذہن تھے۔ کوئی چیز یاد نہ رہتی تھی اور مکتب سے بھاگ آتے تھے۔ ایک روز حسب معمول مکتب سے بھاگ کر آئے تو والدین کے خوف عتاب سے گھر میں داخل ہونے کی جرات نہ ہوئی۔ رات بھر مکان کی دیوار کے بیرونی حصے کے پاس کھڑے روتے رہے۔ منقول ہے کہ اسی حالت میں کھڑے تھے کہ حضرت خضر کی زیارت ہوئی اور انھوں نے ان کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد ذہن کھل گیا اور تھوڑی ہی مدت میں علوم نقلیہ وعقلیہ سے فارغ ہو گئے۔

حافظ محمد عظیم اپنے دور کے فقیہ، عالم اور واعظ تھے۔ عربی، فارسی، پشتو اور پنجابی کے ماہر تھے اور ان تمام زبانوں میں مؤثر وعظ کہتے تھے۔ جو شخص ان زبانوں میں سے کوئی زبان بولتا اسی زبان میں اس سے بات کرتے اور مسائل سمجھاتے۔

حافظ محمد عظیم پشاوری بصارت سے محروم تھے، لیکن اللہ نے ان کو بے پناہ بصیرت سے نوازا تھا اور ان کے فہم و فراست اور علم و عرفان کی وجہ سے لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ علمائے وقت میں بھی بے حد قدر و منزلت کے مالک تھے۔

پشاور کے اس ممتاز عالم اور فقیہ نے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں وفات پائی اور بے شمار لوگ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازے میں اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر پشاور کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ اتنے آدمی کہاں سے آئے اور انھیں حافظ محمد عظیم کی وفات کا کیسے علم ہوا۔ جنازے میں ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کی اچھی خاصی نفری وہاں موجود تھی ❶۔

۱۷۲۔مولانا محمد علی بھیروی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں بہت سے دیہات اور قصبات کو علما و فقہا کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان دیہات میں ایک مقام ''بھیرہ'' ہے جو اس نواح میں اچھا خاصا گاؤں تھا۔ بھیرہ میں تیرھویں صدی ہجری میں جو اہل علم نمایاں ہو کر ابھرے، ان میں ایک بزرگ مولانا محمد علی تھے جن کے والد کا اسم گرامی عبدالحکیم اور دادا کا ابوالغوث تھا۔ محمد علی بھیروی اپنے دور کے صوفی اور عبادت گزار عالم تھے۔ فضل وصلاح کے اوصاف سے بہرہ مند تھے اور اعمال اعظم گڑھ کے معروف فقہا میں گردانے جاتے تھے۔

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۸، ۴۷۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۵۱۔

محمد علی نے بھیرہ میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور اپنے گردونواح کے اساتذہ سے تحصیل کی۔ اس زمانے میں مدراس میں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کا غلغلہ درس بلند تھا اور بہت سے علما و طلبا ان سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ محمد علی نے مدراس کا رخ کیا اور بحر العلوم کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا۔

اس کے بعد عازم حرمین شریفین ہوئے اور حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ تین سال مدینہ منورہ میں مقیم رہے اور حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے علم حدیث پڑھا۔ بعد ازاں واپس وطن آئے اور پورے تئیس (۲۳) سال بعد اپنے گاؤں بھیرہ میں داخل ہوئے۔ پھر گھر سے باہر نہیں نکلے اور تمام عمر بھیرہ ہی میں رہے۔ امیر مدراس ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ جب مستقل طور پر بھیرہ میں سکونت اختیار کر لی تو امیر مذکور نے ان کو باقاعدہ ماہانہ وظیفہ دینا شروع کر دیا تھا اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا[1]۔

۳۷۔ مولانا محمد علی صدر پوری

مولانا محمد علی بن رمضان علی صدر پوری اپنے دور کے صالح و متدین عالم تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور اچھے شاعر تھے۔ صدر پور ایک گاؤں ہے جو ملیح آباد سے متصل مضافاتِ لکھنؤ میں واقع ہے، وہیں تیرھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں محمد علی پیدا ہوئے۔ حصول علم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا اس زمانے میں لکھنؤ میں مرزا حسن علی شافعی لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، محمد علی نے ان کے اور دیگر اساتذۂ عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مرزا حسن علی سے کتب حدیث و تفسیر سماعۃً و قراءۃً پڑھیں اور مولانا بشارت اللہ بہرائچی مجددی سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے۔

مولانا محمد علی صدر پوری متقی اور پرہیز گار عالم تھے، علوم فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اشاعت سنت اور ردِ بدعت میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں ٹونک تشریف لے گئے اور اس نواح کے امیر نواب وزیر محمد خاں بہادر نصرت جنگ کے ملازمین ومصاحبین میں شمولیت اختیار کی۔ امیر موصوف نے ان کو اپنے بیٹوں کی مجالست و مصاحبت پر مقرر کر دیا۔ پھر آخر عمر تک وزیر الملک نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ کے حلقہ ملازمت میں رہے۔

اس نامور عالم دین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ آثار محشر: یہ کتاب منظوم ہے اور آثار و احوال قیامت سے متعلق ہے۔

۲۔ وقائع احمدی: سید احمد شہید بریلوی کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

۳۔ ترجمہ حقیقۃ الاسلام: قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب کا ترجمہ۔

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۲، ۴۵۳۔

۴۔ نصاب گوہر: منظوم

۵۔ نصاب ملك گوهر۔

۶۔ مصدر الفیوض۔

۷۔ مفتاح المخازن۔

۸۔ کنز المصادر۔

۹۔ رکاز الهدایت۔ مسائل فقہ پر محیط ہے۔

۱۰۔ مثنوی تحفة الاخیار۔

۱۱۔ مثنوی تحفة الاصحاب۔

۱۲۔ قصائد در حمد و نعت۔

۱۳۔ مثنوی عبرت افزا: یہ ایک دین دار اور نیک بخت بیوی کا قصہ ہے۔

۱۴۔ عناقید الاثمار:

ان رسائل و کتب کے علاوہ بھی کچھ رسائل ان سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد علی صدر پوری نے ۱۵ر رجب ۱۲۸۹ھ/ ۱۷ر ستمبر ۱۸۷۲ء کو نصف شب کے وقت وفات پائی ❶۔

۷۴۔ مفتی محمد عوض بریلوی

رائے بریلی صوبہ یوپی (ہندوستان) کا ایک مشہور شہر ہے جس میں بے شمار اہل کمال پیدا ہوئے' جنھوں نے نہ صرف ہندوستان میں علم و فضل کی روشنی پھیلائی بلکہ اس سے باہر کے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ یہی وہ شہر ہے جس کی خاک سے امیر المجاہدین سید احمد شہید اٹھے اور برصغیر کے لوگوں کے دلوں میں جہاد کی شمع روشن کی۔ ان کا دور تیرھویں صدی ہجری کا ہے۔

تیرھویں صدی ہی میں یہاں ایک بزرگ مفتی محمد عوض بریلوی پیدا ہوئے' جو اپنے دور کے عالم و شیخ اور فقیہ نام دار تھے اور اس عہد کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا ان کے والد مفتی درویش محمد تھے جو اپنے علم و عرفان کی بنا پر رائے بریلی کے منصب افتا پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مفتی محمد عوض نے باپ کی جگہ سنبھالی اور مسند افتا پر فائز ہوئے۔

مفتی محمد عوض زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ میں بھی اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ مسائل میں مرجع خلائق تھے اور دین کو سمجھنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

مفتی صاحب ممدوح نے ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں وفات پائی ❷۔

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۳' ۲۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۷' ۴۵۸۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۵' ۲۰۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۴۵۔ ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۵۹

۷۵۔ مولانا محمد غفران رام پوری

مولانا محمد غفران بن ملا تائب آخون بن حافظ سعد اللہ خاں رام پوری۔ مولانا محمد غفران رام پوری جنھیں ان کے علم وفضل کی وجہ سے ملا محمد غفران کہا جاتا تھا، اپنے دور کے فقیہ اور عالم تھے۔ یو پی (ہندوستان) کے مشہور شہر رام پور میں سکونت پذیر تھے اور نسلی اعتبار سے ''تراہی خیل'' افاغنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کے لگ بھگ رام پور میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے بعض ممتاز علما سے استفادہ کیا۔ ملا فقیر آخون افغانی کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فقہ میں ان کے عبور ومہارت کا یہ عالم تھا کہ پورے ایک سو اجزا میں فقہی فتاوے تحریر کیے۔ یہ فتاوے ''جنگ'' کے نام سے موسوم ہیں اور قلمی صورت میں رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ لفظ ''جنگ'' کا اطلاق ایک بڑی اور مبسوط بیاض پر ہوتا ہے۔

ان کے والد ملا تائب آخون سے متعدد لوگوں نے علم حاصل کیا اور ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے۔ تائب کے معنی توبہ کرنے والا اور آخون کے معنی معلم اور استاد کے ہیں اور واقعتاً ملا تائب آخون اسم بامسمّٰی تھے۔

مولانا محمد غفران رام پوری کا وسیع حلقہ درس تھا۔ بہت سے مشہور اور نامور طلبا وعلما نے ان کے دامن تربیت میں رہنے کی سعادت حاصل کی اور ان سے فیض پایا۔

اس زمانے کا ہندوستان تحقیق وتدقیق اور درس وتدریس کے میدان میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جگہ جگہ علمائے ہند کے مدارس جاری تھے، جن میں دور دور سے آکر لوگ مستفید ہوتے تھے۔ مولانا محمد غفران رام پوری کا اسم گرامی بھی انھی بلند مرتبت اساتذہ ومعلمین میں شامل ہے، جنھوں نے ہر حال میں علم کی شمع جلائے رکھی اور جو فضل وکمال میں یگانۂ دہر ہوئے۔

نواب صدیق حسن خاں نے مولانا محمد غفران رام پوری کا تذکرہ اپنی تصنیف ابجد العلوم میں کیا ہے اور انھیں ''المعروف بروایت کش'' لکھا ہے۔

مولانا محمد غفران نے سو سال کی عمر پائی اور ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں جنت کی راہ لی[1]۔

۷۶۔ مولانا محمد غوث مدراسی

مولانا محمد غوث بن ناصر الدین بن نظام الدین بن عبداللہ مدراسی۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور اپنے دور کے مشہور شیخ اور عالم تھے اور ممتاز فقہائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد غوث مدراسی ۱۷۔ رمضان ۱۱۶۶ھ/ ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۳ء کو علاقہ آرکاٹ کے ایک مقام محمد

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۴۵۔ ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۵۹

پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤاجداد علم و فضل کی دولت سے آراستہ اور زہد و تقویٰ کی نعمت سے مالا مال تھے۔ محمد غوث نے ہوش سنبھالا تو اپنے جد امجد مولانا نظام الدین سے تحصیل علم کا آغاز کیا اور کافی عرصہ ان سے اخذ فیض کرتے رہے۔ حدیث کی سند انہی سے لی۔

مولانا نظام الدین کی وفات کے بعد مولانا امین الدین صدیقی الوری کی خدمت میں گئے اور ان سے اکتساب علم میں مشغول ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں مولانا امین الدین صدیقی محمد پور میں فروکش تھے۔ پھر جب انھوں نے صوبہ مدراس کے ایک اور شہر رام ناتھ کا عزم کیا تو محمد غوث ان کے ساتھ ہی روانہ ہوگئے اور ان سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں۔

پھر جب مولانا امین الدین صدیقی الوری انتقال کر گئے تو محمد غوث مدراس کو روانہ ہوئے۔ مدراس میں ان دنوں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کا سلسلۂ درس جاری تھا اور کثیر تعداد میں طلبا ان سے حصول علم میں مشغول تھے۔ محمد غوث بھی بحر العلوم سے وابستہ ہوگئے اور ان سے اخذ علم کرنے لگے اور پھر انہی سے سند فراغت حاصل کی۔

اسی زمانے میں انھوں نے مدراس کے نواب والا جاہ کے بیٹے امیر الامرا سے تقرب پیدا کیا اور اس کے لڑکے عظیم الدولہ کے استاد مقرر ہوئے۔ امیر الامرا کی وفات کے بعد عدل و قضا کا محکمہ ان کے سپرد ہوا، اور انھیں احکامِ شرعیہ کی تنفیذ پر مامور کیا گیا۔ پھر جب والا جاہ کے بیٹے عمدۃ الامرا کا عہد آیا تو یہ اس خدمت سے معزول ہوگئے اور حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ یہ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء کا واقعہ ہے۔

بعد ازاں جب عظیم الدولہ برسر اقتدار آیا تو مولانا محمد غوث پھر واپس مدراس آگئے اور عظیم الدولہ نے انھیں منصب وزارت پر فائز کیا اور شرف الدولہ، شرف الملک غالب جنگ کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ یہ ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء کا واقعہ ہے۔ ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ اس کے بعد معزول کر دیے گئے۔

مولانا محمد غوث مدراسی شافعی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ نثر المرجان فی رسم نظم القرآن: دو جلدوں میں۔
۲۔ الفوائد الصبغیه فی شرح الفرائض السراجیه۔
۳۔ سواطع الانوار فی معرفة اوقات الصلوة و الاسحار۔
۴۔ بسط الیدین لاکرام الابوین۔
۵۔ ارجوزة فی القاب سید ناعلی رضی اللہ عنہ۔
۶۔ کفایة المبتدی فی الفقه الشافعی: شافعی فقہ سے متعلق۔
۷۔ زواجر الارشاد الی اهل دار الجهاد۔
۸۔ تعلیقات علی مختصر ابی شجاع۔

۹۔ تعليقات على قطر الندى۔
۱۰۔ مسائل فی الفقه الشافعی۔
۱۱۔ النصف الاخر من الكافی: کافیہ کا اختصار۔
۱۲۔ حواشی على القاموس۔
۱۳۔ الشافی شرح الكافی: علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ کی شرح جو نامکمل رہی۔
۱۴۔ النجم الوقاد شرح قصیدۃ بانت سعاد۔
۱۵۔ وسائل البركات شرح دلائل الخيرات۔ نامکمل رہی۔
۱۶۔ نحور الفوائد: میراث کے بارے میں۔

یہ سولہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ اب ذیل میں بارہ کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔

۱۔ انهار المفاخر فی مناقب السيد عبدالقادر۔
۲۔ اليواقيت المنثوره فی الاذكار الماثوره۔
۳۔ بسائم الاذهار فی الصلوة على سيد الابرار۔
۴۔ هداية الغوى الى المنهج السوى: یہ کتاب طب نبوی ﷺ کے موضوع پر ہے۔
۵۔ خواص الحيوان۔
۶۔ رشحات الاعجاز فی تحقيق الحقيقة و المجاز۔
۷۔ رساله در رد خواجه كمال الدين[1]۔
۸۔ آمدن۔
۹۔ برهان الحكمة ترجمه هداية الحكمه۔
۱۰۔ الفتاوى الناصريه فی فقه الحنفيه۔
۱۱۔ خلاصة البيان فی شرح عقيدة عبدالرحمن (عبدالرحمٰن جامی مراد ہیں)
۱۲۔ زبدة العقائد۔

فقہ احناف کے بارے میں ایک رسالہ اردو زبان میں تحریر فرمایا۔ مولانا محمد غوث مدراسی نے جو بہت بڑے شافعی عالم وفقیہ اور مصنف تھے اتوار کے روز ۱۱ر صفر ۱۲۳۸ھ / ۲۸ر اکتوبر ۱۸۲۲ء کو وفات پائی[2]۔

[1] یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس سے کون خواجہ کمال الدین مراد ہیں۔
[2] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۹، ۴۶۰۔

۷۷- مولانا محمد قاسم نانوتوی

تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے اعاظم رجال میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ مروجہ علوم کے تمام گوشوں پر ان کو عبور حاصل تھا اور معقول و منقول میں دست رس رکھتے تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' ادبیات، بیان و معانی' منطق و فلسفہ اور حساب و ریاضی وغیرہ ہر فن پر ان کی گہری نظر تھی۔

ولادت اور ابتدائی حالات:

مولانا ممدوح صوبہ یوپی کے ضلع سہارن پور کے مردم خیز علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے ایک قصبہ ''نانوتہ'' کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ اسد علی اور دادا کا غلام شاہ تھا۔

ماہ شعبان (یا رمضان) ۱۲۴۸ھ/ جنوری ۱۸۳۳ء میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ ان کے والد شیخ اسد علی، مولانا مملوک علی نانوتوی کے ہم عمر تھے اور حصولِ علم کے لیے ان کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر علم سے لگاؤ نہ تھا، اس لیے فارسی کی چند کتابوں کے علاوہ کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ دہلی سے واپس نانوتہ آ گئے اور کاشت کاری میں مشغول ہو گئے۔ علم سے اس بیگانہ شخص کو اللہ تعالیٰ نے محمد قاسم کی صورت میں ایک ایسے گوہر شب چراغ سے نوازا جس کی ضیا پاشیوں سے ایک عالم مستنیر ہوا۔

حصول علم کا دور:

اس بلند بخت عالم دین نے حصول علم کا آغاز اپنے مولد و مسکن نانوتہ میں کیا اور وہیں قرآن مجید پڑھا اور وہیں ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد انھیں دیوبند بھیج دیا گیا۔ دیوبند میں اس زمانے میں دو بزرگوں کی شہرت تھی، ایک مولوی مہتاب علی کی اور دوسرے شیخ نہال احمد کی۔ مولانا محمد قاسم نے ان دونوں حضرات سے حصول علم کیا۔ مولانا ممدوح کے نانا سہارن پور میں مقیم تھے اور وہاں وکالت کرتے تھے۔ مولانا دیوبند سے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز سے عربی کی بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں جب کہ محمد قاسم کی عمر صرف گیارہ بارہ برس تھی، نانا کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھا، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور دیوبند اور سہارن پور کے بعض اساتذہ سے مصروف استفادہ رہے۔

اس زمانے میں مولانا مملوک علی دہلی ❶ کالج کے شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے۔ وہ ۲۔محرم ۱۲۶۰ھ/ ۲۳ جنوری ۱۸۴۴ء کو محمد قاسم اور اپنے بیٹے محمد یعقوب کو دہلی لے گئے۔ اور ۴۔محرم کو مولانا نانوتوی نے علم نحو کی کتاب ''کافیہ'' پڑھنا شروع کی۔ قیام دہلی کے دور میں انھوں نے علوم متداولہ کی تکمیل مولانا مملوک علی اور مفتی صدرالدین سے کی اور علم حدیث کی تحصیل مولانا احمد علی سہارن پوری اور شاہ عبدالغنی مجددی سے کی۔ بعض اساتذہ سے حساب وریاضی اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں۔ غرض علوم مروجہ میں خوب مہارت پیدا کی اور ہر گوشۂ فن سے بہرہ ور ہوئے۔

مطبع احمدی سے تعلق ملازمت:

مولانا احمد علی سہارن پوری ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں حج کے بعد حجاز سے واپس آئے تو دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ مولانا نانوتوی نے طالب علمی کے زمانے میں مطبع احمدی سے تعلق ملازمت اختیار کر لیا تھا اور کتب حدیث کی تصحیح کا کام ان کے سپرد تھا۔ غالباً اسی زمانے میں انھوں نے مولانا احمد علی سے سنن ابو داؤد پڑھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اس زمانے میں مولانا نانوتوی کے ہم درس تھے جو چار سال حصول تعلیم کے لیے دہلی میں مقیم رہے۔ اور ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں فارغ تحصیل ہو کر اپنے وطن گنگوہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ مولانا نانوتوی نے بھی مروجہ تعلیم مکمل کر لی تھی۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطبع احمدی سے مولانا نانوتوی کا تعلق ملازمت کب تک قائم رہا؟ اس کے متعلق یقینی طور سے تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے انقلاب تک یہ مطبع دہلی میں قائم رہا۔ غالب گمان یہ ہے کہ اسی وقت تک مولانا نانوتوی اس سے منسلک رہے۔

دہلی میں سلسلۂ تدریس:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا نانوتوی نے دہلی میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ ان کے استاد تھے اور مدرسہ دارالبقا میں پڑھاتے تھے۔ مولانا نانوتوی کی خدمات انھوں نے اس مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے حاصل کر لی تھیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا ممدوح کا

❶ دہلی کالج دراصل ''مدرسہ غازی الدین'' کا نام ہے۔ یہ مدرسہ نظام الملک آصف جاہ اول کے والد غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۱۲۱۲ھ) ۱۷۹۸ء نے دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر قائم کیا تھا۔ مدرسے کی عمارت کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور قریب ہی مقبرہ بنوایا جہاں وہ خود دفن ہوئے۔ اس مدرسے کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا جسے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی مشہور درس گاہ سمجھا جاتا تھا۔

تعلق تدریس اس مدرسے سے کتنا عرصہ قائم رہا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی مدت ہی مدرسہ دارالبقا میں مدرس رہے۔ اس زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ وہ مطبع احمدی میں بھی کتب حدیث کی تصحیح کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یعنی ایک ہی وقت میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور تصحیح کا بھی۔

صحیح بخاری کا تحشیہ:

مولانا احمد علی سہارن پوری نے دہلی میں جو مطبع احمدی قائم کیا تھا، اس کے ذریعے انھوں نے کتب حدیث کی قابل قدر خدمات انجام دیں❶ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مولانا محمد قاسم نانوتوی مطبع احمدی سے منسلک تھے اور مولانا احمد علی کے لائق تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ استاد محترم کے فرمان کے مطابق وہ کتب حدیث کی تصحیح پر مامور تھے۔ استاد اپنے اس شاگرد کی قابلیت اور حدیث سے متعلق ان کی ژرف نگاہی سے آگاہ تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کی تحشیہ نویسی کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ بعض حضرات علما نے جو مولانا نانوتوی کی صلاحیتوں سے واقف نہ تھے' اس پر اعتراض کیا اور مولانا احمد علی سے کہا کہ ان پانچ پاروں کے بعض مباحث نہایت اہم ہیں اور نوجوان محمد قاسم بطریق احسن اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکیں گے۔ لیکن مولانا احمد علی اپنی رائے پر قائم رہے اور یہ کام اپنے اسی شاگرد سے کرایا۔ جب تحشیہ مکمل ہوگیا تو ان حضرات کو دکھایا گیا اور انھوں نے اس کی تحسین کی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے تحشیہ بخاری میں ابتدا ہی سے مسائل میں مذہب حنفیہ کی تائید کا التزام کیا تھا اور آخری پانچ پاروں میں جو مولانا نانوتوی کے سپرد کیے گئے تھے، اس قسم کے مقامات آتے ہیں، جہاں امام بخاری نے مذہب حنفیہ کے بعض مسائل کو حدیث کی رو سے محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ جو حضرات مولانا نانوتوی کو یہ کام تفویض کرنے پر معترض تھے، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مولانا نانوتوی اس انداز سے یہ فریضہ انجام نہیں دے سکیں گے' جس انداز سے مولانا احمد علی آغاز سے دیتے آئے ہیں۔ لیکن مولانا نانوتوی اس بات میں استاد کے نقش قدم پر چلے اور اسی اسلوب سے تحشیہ لکھا جس اسلوب سے استادِ مکرم شروع سے لکھتے آئے تھے اور بلاشبہ ایک نوجوان اور اس میدان میں بظاہر نووارد کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا جو انھوں نے استادِ محترم کے حسب منشا طے کیا اور اس میں اپنے مسلک کی پوری ترجمانی کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ۱۱ مئی کو شروع ہوئی تھی۔ اس سے تین چار ماہ بعد سہارن پور کے ایک انگریز حاکم مسٹر سپنکی نے سہارن پور اور اس کے نواح میں مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے' جس سے مسلمانوں میں

❶ مولانا احمد علی سہارن پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد ۸۔

اشتعال پیدا ہوگیا۔ اشتعال کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) کے رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم اپنے چند احباب کی معیت میں کسی کام سے سہارن پور گئے تو وہاں کے ایک ہندو نے جو کائستھ تھا، مسٹر سپنکی کے ہاں جا کر کہا کہ یہ لوگ ہاتھی خریدنے کے لیے آئے ہیں۔ ہاتھی خرید کر دہلی جائیں گے اور وہاں انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے۔ مسٹر سپنکی نے ان کو بلایا اور سہارن پور میں ان کی آمد کے بارے میں حقیقت حال معلوم کرنا چاہی۔ لیکن ان لوگوں کے جواب اس کے نزدیک قابل اطمینان نہ تھے۔ اس پر قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس سے تھانہ بھون، دیوبند اور دیگر قصبات و دیہات میں انگریزوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ حضرات نے تھانہ بھون میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد احسن نانوتوی بھی شامل تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کو جہاد نہیں سمجھتے تھے اور انگریزوں کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ اس مجلس کے شرکا میں سے مولانا شیخ محمد تھانوی ❶ نے جہاد کے خلاف اظہار رائے کیا اور فرمایا کہ ''جب عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے اور اس مجلس حاضرین میں سے بھی کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جب کہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے ❷۔

مولانا محمد احسن نے مولانا شیخ محمد تھانوی کی تائید کی۔ اس پر ان کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی نے مولانا احمد احسن کو ڈانٹا۔ آخر فیصلہ جہاد کے حق میں ہوا، مولانا محمد احسن نانوتہ آ گئے ❸۔

تھانہ بھون کی مجلس مشاورت کے بعد ان حضرات نے حاجی امداد اللہ صاحب کو امیر جہاد مقرر کیا اور شاملی (ضلع مظفر نگر) میں انگریزوں کے خلاف میدان جہاد میں اترے۔ حافظ محمد ضامن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی نے خوب داد شجاعت دی۔ حافظ محمد ضامن نے شاملی

---

❶ مولانا محمد تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر، یوپی) میں ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ظہور احسن تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن تھانہ بھون میں پائی۔ قرآن مجید بھی وہیں حفظ کیا۔ اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کی اور سند سے مفتخر ہوئے۔ حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے حلقۂ بیعت میں شمولیت کی۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔ مولانا ممدوح کے مفصل حالات ان کے رسالہ ''تحقیق وحدت الوجود والشھود'' کے ساتھ مولوی ثناء الحق (ایم اے) نے شائع کیے ہیں۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کی تصنیفات میں ارشاد محمدی، بیاض محمدی، انوار محمدی اور دفتر ہفتم مثنوی مولانا روم شامل ہیں۔

❷ وحدت الوجود والشھود (ص۵۱) میں مولانا شیخ محمد تھانوی کا یہ ارشاد منقول ہے۔ ''نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، بظاہر تو اس کو جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔''

❸ ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' (از ڈاکٹر محمد ایوب قادری) صفحہ ۵۴۔

کے میدان جنگ میں مرتبۂ شہادت پایا اور دیگر حضرات شدید مقابلے کے بعد واپس آ گئے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حالات نے انگریزوں کے حق میں پلٹا کھایا تو انھوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ حاجی امداد اللہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) کو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے، مولانا رشید احمد گنگوہی چھ مہینے جیل میں بند رہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی روپوش ہو گئے۔ (میدان جنگ میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کے ٹخنے میں گولی لگی تھی، اور وہ زخمی ہو گئے تھے۔) قاضی عنایت علی پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے۔

روپوشی اور حج بیت اللہ:

یہ زمانہ نہایت خطرناک تھا اور ہر شخص آزمائش و ابتلا کا شکار تھا۔ چنانچہ مولانا نانوتوی نے وارنٹ گرفتاری کے بعد انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ تین دن تو وہ ایک گھر میں بند رہے۔ اس کے بعد مختلف علاقوں اور قصبات و دیہات میں گھومتے رہے، اس لیے کہ دشمن تعاقب میں تھا اور اس کے ذرائع تلاش بہت وسیع تھے۔ کسی ایک جگہ پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنا ہی مولانا نانوتوی نے قرین مصلحت سمجھا۔ بعض مقامات پر خود انگریزی پولیس کے افسروں سے جو مولانا کی تلاش میں تھے، مولانا کی گفتگو بھی ہوئی، بلکہ دیوبند کی مسجد چھتہ میں آ کر تو خود انھوں نے مولانا ہی سے پوچھا کہ ''مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟'' انھوں نے دو قدم آگے بڑھا کر اس جگہ کی طرف جہاں وہ پہلے کھڑے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ابھی یہیں تھے۔ دیکھ لیجیے۔'' یہ ایک حاضر دماغ اور حاضر جواب سیاست دان ہی کا جواب ہو سکتا ہے، ورنہ عام لوگ تو ایسے مواقع پر ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور تلاش کنندگان ان کے چہرے کے آثار ہی سے سمجھ لیتے ہیں کہ اصل شخص یہی ہے اور اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ان کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد انھیں اپنے گاؤں چکوالی لے گئے جو نانوتہ اور دیوبند کے درمیان واقع ہے۔ پولیس کے لوگ ان کی تلاش میں وہاں پہنچے تو ان کے لیے خود ہی چائے تیار کی اور پھر خود ہی مولانا محمد قاسم کی ''تلاش'' میں نکل کھڑے ہوئے اور گرفتاری سے بچ گئے ____ یہ بھی ان کی فراست تھی۔ بروقت کوئی بات سوجھ جانا اور اپنے آپ کو چاروں طرف پھیلے ہوئے خطرے سے بچا لینا، بڑی بات ہے۔ ان کی اس قسم کی باتیں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بھی تحریر فرمائی ہیں [1]۔ مولانا گیلانی مرحوم طویل الذیل عالم تھے اور ان کا انداز نگارش کچھ اور ہی قسم کا ہے۔

مولانا نانوتوی بہر حال انسان تھے اور انسان اپنے کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا نے بھی یہ کوشش کی۔

[1] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۷۶ تا ۱۸۱۔

حضرت مولانا کی گرفتاری سے بچنے کی اس کوشش کو ان کے معتقدین اور سوانح نگار بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں اور اسے ان کی فقاہت سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کی اس فقہی تعبیر سے ہم عام آدمی کے لیے متفق ہونا ممکن نہیں۔ فقہیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ عظمت، عزیمت اور استقامت کے خلاف ہے۔ اسے ہم کتاب الحیل کا ایک باب تو قرار دے سکتے ہیں لیکن فقہ وفراست سے ہم آہنگ نہیں قرار دے سکتے۔ اگر مولانا نے واقعی اس میں جہاد سمجھ کر حصہ لیا تھا تو اس کے نتائج سے اس اسلوب سے بچنے کی کوشش نہ فرمانا چاہیے تھی، جس اسلوب کی نشان دہی ان کے اصحاب عقیدت کرتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاملی کے جہاد کی کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری تقسیم ملک سے قبل دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ بہت عرصہ پیشتر انھوں نے ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے ''۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور علمائے دیوبند'' کے عنوان سے اس جہاد کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اس موضوع پر خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس جہاد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی شامل نہیں ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جب بیسویں صدی میں ہندوستان کی فضا آزادی کے نعروں سے گونج اٹھی اور دارالعلوم کی بعض ممتاز علمی شخصیتوں (مثلاً مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی) نے برطانوی حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک آزادی میں حصہ لیا تو مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد کی مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی خدمات کا بھی کھوج لگایا گیا اور ان کی عظمت کا راز ان کی خاموش دینی خدمات میں نہیں، بلکہ سیاسی کارناموں میں تلاش کیا گیا، چنانچہ سیاسی کارناموں کی تلاش میں تھانہ بھون اور شاملی کے وقتی ہنگاموں کو ''آزادیٔ ہند سے متعلق ایک مربوط پروگرام'' کی کڑیاں قرار دیا گیا چوں کہ یہ سب کچھ جوش عقیدت کا کرشمہ تھا، اس لیے بات بن نہ پائی۔ ہر چند شاملی کی ''داستانِ جہاد'' پُر جوش عقیدت مندوں کے لیے اپنے اندر ایک کشش اور سحر رکھتی ہے، لیکن افسوس کہ تاریخ کا واقعہ نہ بن سکی۔ (دارالعلوم صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴)

یہ کتاب اب دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ لیکن مولانا نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے عقیدت مندوں میں سے کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کو مولانا نانوتوی کم وبیش ساڑھے تین سال روپوش رہے اور یہ ان کے لیے انتہائی آزمائش کا زمانہ تھا جو انھوں نے مختلف مقامات میں گزارا۔ ان مقامات میں بوڑیہ، کھتلہ، لاڈوہ، پنچلاسہ، دیوبند، نانوتہ اور چکوالی وغیرہ مقامات شامل ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ کتنی تکلیفوں سے دوچار ہوئے ہوں گے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھاگ دوڑ میں انھیں کس قدر ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچی ہوگی۔ لیکن یہ سب تکلیفیں اور اذیتیں انھوں نے برداشت کیں۔

روپوشی ہی کے دور میں ۱۵۔ جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء) کو وہ اپنے وطن نانوتہ سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے رفیق سفر تھے۔ نانوتہ سے کراچی تک کا سفر انھوں نے مختلف ذرائع سے طے کیا اور پھر ساحل کراچی سے سرزمین حجاز کو روانہ ہوئے۔ یہ اس عالم دین کا پہلا سفر حج تھا۔

اعلان معافی:

۲ اگست ۱۸۵۸ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کے قبضے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے دو مہینے بعد یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد میں لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کا وہ معافی نامہ پڑھ کر سنایا جس کی رو سے ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' میں حصہ لینے والے ''مجرموں'' کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس ہنگامے میں شریک ہوئے تھے، حکومت انگریزی کی طرف سے ان کی گرفتاری کا اب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن اس میں یہ استثنا بھی تھا کہ ''جو لوگ انگریزی رعایا کے قتل میں شریک ہوئے انھیں رحم کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔''

علاوہ ازیں اس اعلان میں مرقوم تھا کہ:

۱۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

۲۔ یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

۳۔ یا جنھوں نے ترغیب بغاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی نامہ میں یہ الفاظ درج تھے کہ ''ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے' کامل غور کیا جائے گا۔''

بہرحال اس معافی نامہ کے مشتہر ہونے کے دو سال بعد ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو مولانا نانوتوی اپنے وطن نانوتہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔

حج سے واپسی:

۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں مولانا نانوتوی حج بیت اللہ سے واپس وطن تشریف لائے۔ اب حالات کسی حد تک سازگار ہو چکے تھے اور ملک کی سیاسی فضا میں وہ تلخی باقی نہ رہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ قمری حساب سے ۱۵ جمادی الاولی ۱۲۷۷ھ/ ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو وہ حج کے لیے نانوتہ سے روانہ ہوئے تھے اور کراچی کی بندرگاہ سے عزم حجاز کیا تھا۔ تقریباً ایک سال بعد ربیع الاول ۱۲۷۸ھ/

ستمبر ۱۸۶۱ء کے آخر میں واپسی ہوئی اور بمبئی کے ساحل پر جہاز سے اترے اور وہاں سے چل کر جمادی الاخری تک نانوتہ پہنچے۔

حفظ قرآن مجید:

زمانہ روپوشی اور ایام حج میں ایک بہت بڑا کام یہ ہوا کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ روپوشی کا دور نہایت پریشانی کا دور تھا اور مستقل طور سے کسی ایک جگہ پر قیام کرنا ممکن نہیں تھا، حج کے دنوں میں بھی کسی ایک مقام پر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس زمانے میں مولانا کو حفظ قرآن کی نعمت حاصل ہو گئی۔

مطبع مجتبائی میرٹھ کی ملازمت:

حج بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد مولانا نانوتوی نے مطبع مجتبائی میرٹھ میں ملازمت کر لی۔ یہ مطبع منشی ممتاز علی نے قائم کیا تھا جو شیخ امجد علی کے بیٹے تھے اور اپنے عہد کے مشہور خطاط تھے۔ منقول ہے کہ وہ فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے اور ''نزہت رقم'' ان کا لقب تھا۔ مولانا نانوتوی سے ان کے تعلقات پہلے ہی سے قائم تھے اور وہ مولانا کی علمی صلاحیتوں سے آگاہ تھے، اسی لیے ان کو اپنے اس مطبعے میں ملازم رکھا اور کتابوں کی تصحیح وغیرہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اس سے قبل مولانا احمد علی سہارن پوری کے مطبع احمدی میں بھی مولانا نانوتوی یہ خدمت انجام دے چکے تھے اور اس فن کی نزاکتوں کا انھیں علم تھا۔

دوسری مرتبہ حج کو روانگی:

۱۲۷۸ھ سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء تک سات سال مولانا نانوتوی مطبع مجتبائی میرٹھ سے بسلسلہ تصحیح کتب وابستہ رہے۔ اس اثنا میں ان کی تمام تر توجہ اس طرف منتقل رہی اور اہتمام اور ذمے داری سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیئے۔ ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں مولانا نانوتوی اور مطبع مجتبائی کے مالک منشی ممتاز علی حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا نانوتوی کا یہ دوسرا حج تھا۔ منشی ممتاز علی بہ ارادۂ ہجرت ہندوستان سے حجاز گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے مطبع مجتبائی ختم کر دیا تھا۔ لیکن مولانا نانوتوی حج کے بعد واپس وطن آ گئے۔

مطبع ہاشمی میرٹھ سے وابستگی:

تصحیح وغیرہ کے کام میں مولانا نانوتوی نے مہارت پیدا کر لی تھی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مطابع کے مالک ان کے کام سے متاثر تھے۔ لہٰذا دوسرے حج سے واپس آتے ہی میرٹھ پہنچے تو وہاں کے مطبع ہاشمی سے وابستگی اختیار کر لی اور کچھ عرصہ اس میں مصروف عمل رہے۔

علی گڑھ میں قیام :

اسی اثنا میں مولانا عبدالجلیل علی گڑھی (جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف داد شجاعت دیتے ہوئے علی گڑھ میں شہید ہو گئے تھے۔ ❶) کے فرزند گرامی قدر مولانا محمد اسماعیل (متوفی شوال ۱۳۱۱ھ/ مارچ ۱۸۹۶ء کو حدیث پڑھانے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں نو مہینے ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ تراجم علمائے حدیث ہند (صفحہ ۲۲۵) میں مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی لکھتے ہیں: مولانا نانوتوی علی گڑھ تشریف لائے اور مولانا عبدالجلیل کے بیٹے (مولانا محمد اسماعیل) کو نو مہینے میں صحاح ستہ کا دورہ ختم کرا کے واپس چلے گئے۔ اس مدت کی اجرت بجز نان جویں کے کچھ قبول نہ فرمائی۔

پھر مطبع مجتبائی میں:

منشی ممتاز علی (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا) ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں ہجرت کے ارادے سے حجاز گئے تھے، لیکن انھوں نے وہاں اقامت اختیار نہیں کی۔ دوسرے سال ہی ہندوستان واپس آ گئے اور مطبع مجتبائی دہلی میں قائم کر لیا جو ''مطبع مجتبائی دہلی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں تصحیح کتب کے سلسلے میں انھوں نے مولانا نانوتوی کو بھی دہلی بلا لیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے یہ مطبع پانچ سو روپے میں مولوی عبدالاحد کو فروخت کر دیا۔ مولانا نانوتوی کچھ عرصہ اس میں کام کرتے رہے۔ اس مطبع سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شائع ہوئیں اور کاغذ، کتابت، طباعت، صحت وغیرہ کے سلسلے میں ان کتابوں نے بڑی اہمیت حاصل کی۔

حمائل شریف کی اشاعت:

۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی میں ایک حمائل شریف شائع ہوئی جس کی کتابت منشی ممتاز علی نے اور تصحیح مولانا نانوتوی نے کی۔ اس حمائل کے بارے میں مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی لکھتے ہیں۔

''خداوند! آپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ حمائل شریف اب تیسری دفعہ اس مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی۔ ایک دفعہ تو منشی ممتاز علی نزہت رقم مہاجر مکی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھی اور قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی مدرسے دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی۔''

مولانا نانوتوی نے اس حمائل کی طباعت سے متعلق دو قطعات تاریخ رقم کیے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔ پہلا قطعہ فارسی میں ہے۔

حمائل کز شرف دارد شرف بر حاصل کا نہا
کہ ایں جا است بر جاں است صد گونہ بلاز انہا

❶ مولانا عبدالجلیل علی گڑھی شہید کا تذکرہ اس کتاب کی گزشتہ جلد میں ہو چکا ہے۔

نوشت و طبع زد نزہت رقم ممتاز علی قاسم
صحیحش کرداں گر دید تعویذ دل و جا نہا

دوسرا قطعہ تاریخ اردو میں ہے جو یہ ہے:۔

چھاپی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں — بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب چھپی ہے
میں نے بھی کہا مدح میں اور کیونکر نہ کہیے — کہتے ہیں بتکرار عدد خوب چھپی ہے
۶۱۳ — ۶۴۳
ایک راحت دل راحت دل پر ہے مضاعف — کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
۱۲۸۶
کیا کہنے حمائل کے بہت خوب ہی چھاپی — کیا کہنے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے
۱۲۸۶ھ — ۱۲۸۶ھ

مطبع مصطفائی میں:

مطبع مصطفائی منشی ممتاز علی نے حجاز سے واپس آکر دہلی میں قائم کیا تھا اور تصحیح کتب کے لیے انھوں نے مولانا نانوتوی کو بھی دہلی بلا لیا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کتنا عرصہ مطبع مصطفائی میں خدمات انجام دیتے رہے۔

بہرحال مولانا ممدوح نے علی الترتیب مطبع احمدی، مطبع مجتبائی، مطبع ہاشمی اور مطبع مصطفائی میں سالہا سال تک تصحیح کتب کا کام کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔ ''معاشی جدوجہد سے آپ نے بہرحال اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا۔ مختلف قرائن وقیاسات کی بنا پر میرا اندازہ یہی ہے کہ ایک کم پچاس کی عمر گراں مایہ میں سے تقریباً چالیس اکتالیس سال کی عمر تک آپ مذکورہ بالا مختلف مطابع یعنی احمدی، مجتبائی، ہاشمی، مصطفائی میں علی الترتیب تصحیح کی خدمات انجام دیتے رہے۔''[1]

مولانا گیلانی کے اس متن کی تشریح یہ ہے کہ مولانا نانوتوی نے کل انچاس (۴۹) سال عمر پائی اور اس مختصر عمر میں سے چالیس اکتالیس سال مختلف مطابع میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دی۔ اس حساب سے انھوں نے نو دس سال کی عمر میں تصحیح کا کام شروع کر دیا تھا۔

واقعات کی رو سے مولانا گیلانی کا یہ فرمان قرین صحت نہیں۔ مولانا نانوتوی کی ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ محرم ۱۲۶۰ھ/فروری ۱۸۴۴ء کو وہ (بارہ سال کی عمر میں) مولانا مملوک علی کے ساتھ حصول علم کے لیے دہلی گئے اور کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں مولانا احمد علی سہارن پوری حج کے بعد حجاز سے واپس آئے اور دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ اس کے بعد مولانا نانوتوی ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان

[1] سوانح قاسمی، ج ۱ ص ۵۳۵۔

سے سنن ابوداؤد پڑھی۔ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء کے پس وپیش میں وہ فارغ التحصیل ہوئے جب کہ ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اگر طالب علمی کے زمانے ہی میں مطبع احمدی سے تعلق ملازمت اختیار کرلیا ہو اور تصحیح کتب میں مشغول ہوگئے ہوں، جب بھی ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ انھوں نے یہ کام شروع کیا۔ اس حساب سے وہ کم سے کم اس وقت پندرہ یا سولہ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ظاہر ہے ان کی قابلیت وصلاحیت سے متاثر ہوکر ہی مولانا سہارن پوری نے اس اہم ذمہ داری پر انھیں مامور کیا ہوگا۔ نو دس سال کی عمر کے بچے کے سپرد اتنا اہم کام نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نانوتوی بہت ذہین اور صاحب فراست تھے، تاہم جب تک متعلقہ کتابوں کے متون پر پوری نظر نہ ہو اس قسم کے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔

ماہانہ آمدنی:

مذکورہ بالا مطابع سے اس اہم خدمت کی جو ماہانہ آمدنی مولانا نانوتوی کو ہوتی تھی، وہ چار پانچ روپے تھی ❶۔ موجودہ دور کے حساب سے اس کو ''آمدنی'' یا ''تنخواہ'' سے تعبیر کرنا آمدنی اور تنخواہ کا مذاق اڑانا ہے۔ لیکن آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال قبل کے حالات کی رو سے دیکھا جائے تو چار پانچ روپے ماہانہ فی الواقع اپنے اندر ایک وزن رکھتے تھے۔ زندگی سادہ تھی اور زمانہ بہت سستا تھا، پھر علمائے دین کے دلوں میں خلوص کا بے پناہ داعیہ کارفرما تھا اور وہ تھوڑے کو بہت سمجھنے کے عادی تھے۔ وہ کوئی کام پیسے کے لیے نہیں کرتے تھے، نیکی سمجھ کر کرتے تھے اور ان کے قلب پر ہر آن خشیت الٰہی اور للّٰہیت کا جذبہ طاری رہتا تھا۔

دیوبند میں دارالعلوم کا قیام:

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اسلامی مدارس شدید نقصان سے دوچار ہوئے۔ متعدد علمائے دین کو انگریزوں نے پھانسیوں پر لٹکا دیا۔ بعض کو کالے پانی کی سزا دی گئی اور کچھ حضرات ملک سے ہجرت کر کے سرزمین حجاز میں جا بسے۔ ان نازک حالات میں چند علما وزعما نے جن میں مولانا فضل الرحمٰن، مولانا ذوالفقار علی، حاجی عابد حسین، مولوی مہتاب علی اور شیخ نہال احمد شامل تھے، ضلع سہارن پور کے ایک مقام دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۷ء) کو دیوبند کی ''چھتہ والی مسجد'' میں انار کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس مدرسے کا آغاز کیا گیا۔ اس زمانے میں مولانا نانوتوی مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام کرتے تھے۔ اس مدرسے کے سب سے پہلے طالب علم کا نام محمود تھا جنھوں نے بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے شہرت پائی اور اپنے عہد کے اکابر علمائے ہند میں شمار ہوئے اور پہلے مدرس کا نام ملا محمود تھا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ استاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود!

---

❶ سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۵۳۸۔

سب سے پہلے جس شخص نے اس مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے چادر پھیلائی اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا، اس شخصیت کا اسم گرامی حاجی عابد حسین تھا، جو مدرسے کے بانیوں میں سے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے اور یہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

اس سے چار دن بعد ۱۹ محرم کو ایک اشتہار چھپوا کر مدرسے کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ پھر طلبا نے اس مدرسے کی طرف اس کثرت سے رجوع کیا کہ پہلے ہی سال کے اختتام تک ان کی تعداد اٹھتر (۷۸) ہو گئی۔ ان میں بیرون ہند کے طلبا بھی شامل تھے۔ جیسے جیسے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مدرسین کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا تقرر صدر مدرس کی حیثیت سے کیا گیا۔

مدرسے کے قیام پر سات سال گزرے تھے کہ اس میں طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی اور چھتہ والی مسجد میں ان کے لیے قیام و تعلیم کا انتظام ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) کو اسے دیو بند کی جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا۔

نئی جگہ کی خرید اور سنگ بنیاد:

جامع مسجد میں مدرسے کی منتقلی پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ طلبا کی کثرت نے اسے بھی اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب مولانا نانوتوی نے اپنے رفقا کے سامنے مدرسے کے لیے آبادی سے باہر ایک وسیع عمارت تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور زمین کا ایک قطعہ خریدا گیا اور پھر ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ/ ۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو جمعۃ المبارک کے دن اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ علی الترتیب مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی عابد حسین اور مولانا احمد مظہر کاندھلوی نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے مادہ تاریخ ''اشرف عمارات'' سے نکالا، جس سے ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ عمارت کی تعمیر کا آغاز آئندہ سال ہی سے ہوا، لہٰذا ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء صحیح قرار پاتا ہے ___ یہی وہ قطعہ اراضی ہے جہاں آج یہ درس گاہ قائم ہے اور جسے برصغیر کے ایک بہت بڑے دارالعلوم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے بے شمار علما و فضلا فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور متعدد وجوہ سے اس نے تمام عالم اسلام میں شہرت پائی۔

تیسرا حج:

مولانا نانوتوی نے پہلا حج ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء میں کیا تھا، اس سفر حج میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰) کو نانوتہ سے روانہ ہوئے اور کم و بیش ایک سال بعد ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں واپس وطن آئے۔

دوسری مرتبہ ۱۲۸۵ھ/ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو قصد حج بیت اللہ کیا۔ ان دنوں وہ بہ صورت ملازمت مطبع مجتبائی دہلی سے وابستہ تھے اور اس مطبع کے مالک منشی ممتاز علی اس حج میں ان کے رفیق سفر تھے۔ اس زمانے میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہو چکا تھا اور مولانا اس کے نگران تھے۔ حج سے واپس آکر وہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں کام کرنے لگے تھے۔

تیسری دفعہ وہ شوال ۱۲۹۴ھ/ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو عازم حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس حج میں علمائے کرام کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ حج کے بعد جدہ پہنچے تو ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/ مارچ ۱۸۷۸ء کو مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

پادری تارا چند سے مناظرہ:

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی عیسائی مبلغین اور پادری اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ پادری تو وہ تھے جو انگریزوں کے ہم رکاب ہو کر ان کے ملک انگلستان سے یہاں آئے اور کچھ وہ تھے جو ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور انگریز پادریوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش عیسائیت ہوئے تھے اور انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور پھر جب حکومت براہ راست تاج برطانیہ کے قبضے میں آئی تو ان کی تبلیغی تگ وتاز نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ علمائے دین نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، تحریر وکتابت کی صورت میں بھی اور تقریروں اور مناظروں کی شکل میں بھی ــــــ ان حضرات علما کی وسیع فہرست میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا سید امیر حسن حسینی سہسوانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ انہی حضرات میں بانئ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام بھی شامل ہے۔

اس زمانے میں پادری اس قدر بے باک ہو گئے تھے اور ان کی زبان اتنی دراز ہو گئی تھی کہ گلیوں، محلوں، بازاروں اور عام مجمعوں میں جا جا کر اسلام اور نبی آخر الزماں ﷺ کو ہدف اعتراض ٹھہرانے اور ان پر کھلم کھلا تنقید کرنے لگے تھے۔ دوسرے قصبات وبلاد کی طرح دہلی میں بھی یہی صورت حال تھی۔ مولانا نانوتوی اس زمانے میں دہلی کے مطبع مجتبائی میں کام کرتے تھے اور طلبا کو پڑھاتے بھی تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور اصحابِ عقیدت کو حکم دیا کہ وہ بھی بازاروں اور محلوں میں جا کر وعظ وتبلیغ کا سلسلہ شروع کریں، اسلام کی حقانیت بیان کریں اور پادریوں کے افکار وخیالات کی واضح الفاظ میں تردید کریں۔ ان دنوں تارا چند نام کا ایک پادری جگہ جگہ جا کر اسلامی احکام وفرامین کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ مولانا نانوتوی ایک دن وہ خود میدان میں آئے اور اپنا نام ظاہر کیے اور تعارف کرائے بغیر مجمع عام میں اسلام کی حقانیت بیان کرنے اور عیسائیت کا رد کرنے لگے۔ وہیں تارا چند سے ان کا سامنا ہوا اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد مناظرہ شروع ہو گیا۔

مناظرے میں پادری کو شکست ہوئی اور مولانا کامیاب رہے۔

اس عہد کے ایک جلیل القدر عالم مولانا ابو المنصور ناصر الدین دہلوی تھے۔ انھوں نے عیسائیت کی تردید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ بہت بڑے مناظر اور داعی اسلام تھے۔ مولانا نانوتوی کی ملاقات ان سے ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار کیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر انتہائی خوش ہوئے۔ مولانا ناصر الدین نے ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء کو دہلی میں وفات پائی۔

شاہ جہان پور کا میلۂ خداشناسی:

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد انہی کو زیادہ تر مبتلائے مصائب کیا۔ ان کو سیاسی طور پر بھی دبانے کی کوشش کی اور مذہبی اعتبار سے بھی شکست دینے کا عمل شروع کیا۔ ایک طرف ان کے مقابلے میں پادریوں کو لاکھڑا کیا اور دوسری جانب ہندوؤں کو شہ دی کہ وہ مسلمانوں سے مناظرے کریں۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ یوپی کے ایک شہر شاہ جہاں پور کے قریب ایک گاؤں ''چاندا پور'' میں ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلے کا اہتمام کیا گیا، جس کا نام ''میلۂ خداشناسی'' رکھا گیا۔ اس موقع پر مسلمان، عیسائی اور ہندو تینوں مذاہب کے سرکردہ لوگوں کو اشتہارات کے ذریعے دعوت دی گئی کہ وہاں میلے میں شریک ہوں اور اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں، چنانچہ مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الٰہی بخش رنگین کی تحریک پر مولانا محمد قاسم نانوتوی وہاں پہنچے۔ مولانا محمود حسن، مولوی رحیم اللہ بجنوری اور مولانا فخر الحسن ان کے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا ابو المنصور ناصر الدین دہلوی، مرزا موحد جالندھری، مولانا احمد علی دہلوی، میر حیدر دہلوی، مولانا نعمان اور مولانا الٰہی بخش رنگین بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ان تمام علما نے تقریریں کیں اور لوگ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے ابطالِ تثلیث، رد شرک اور اثباتِ توحید کے موضوع پر تقریر کی اور مخالف و موافق حاضرین پر ان تقریروں کا بے حد اثر ہوا، اور اردگرد کے تمام دیہات و قصبات میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ مسلمان جیت گئے اور دوسرے مذہبوں (عیسائیوں اور ہندوؤں) کے مناظر ہار گئے۔

اس سے دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں میلۂ خداشناسی پھر منعقد ہوا اور مولانا نانوتوی اس مرتبہ بھی وہاں پہنچے۔ اس سال مراد آباد کے منشی اندرمن اور آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (وفات ۱۸۸۳ء) بھی وہاں گئے تھے اور انھوں نے سنسکرت آمیز ہندی میں تقریر کی تھی۔ پادری نولس نے جو پہلے سال کے میلے میں بھی شامل تھا، اب کی مرتبہ ایک اور پادری کو بھی بلالیا تھا جس کا نام اسکاٹ تھا اور یہ عیسائیوں کا مشہور پادری تھا۔ اس میلے میں مولانا نانوتوی کے ساتھ چند اور علمائے دین بھی تھے جن میں مولانا حفیظ الرحمٰن خاں، مولوی عبدالغفور اور مولوی محمد علی بچھرایونی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا نانوتوی نے مسئلہ توحید سے متعلق گفتگو کی

——شاہ جہاں پور کا میلۂ خداشناسی دو سال منعقد ہوا۔ پہلا ۸ مئی ۱۸۷۶ء میں اور دوسرا مارچ ۱۸۷۷ء میں۔ مولانا نانوتوی دونوں میں شریک ہوئے اور دونوں مرتبہ اپنے علم وفضل کے جوہر دکھائے۔ ان میلوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم لکھتے ہیں۔

''ایک بات یہاں خاص طور سے غور طلب ہے کہ ''میلۂ خداشناسی شاہ جہان پور'' اعلان واشتہار کے ساتھ دو سال منعقد ہوا اور اس میں ایک طرح سے مذہب اسلام کو چیلنج کیا گیا تھا۔ شاہ جہان پور سے بریلی اور بدایوں بالکل قریب اور متصل اضلاع ہیں، مگر اس میلے میں علمائے بدایوں اور بریلی کی کسی دلچسپی کا کوئی سراغ نہیں ملتا❶۔

رودادِ رڑکی:

شوال ۱۲۹۴ھ/ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو مولانا نانوتوی چند علمائے کرام کی معیت میں حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/ مارچ ۱۸۷۸ء کو واپس آئے۔ جدہ پہنچے تو طبیعت خراب ہوگئی، وطن آکر کچھ افاقہ محسوس ہوا، مگر بیماری کلی طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اس سے تقریباً پانچ مہینے بعد شعبان ۱۲۹۵ھ/ اگست ۱۸۷۸ء کو رڑکی سے اطلاع ملی کہ پنڈت دیانند سرسوتی سے یہاں آئے ہیں اور اسلام کے خلاف تقریریں کر رہے ہیں۔ مولانا نانوتوی کمزوری کے باوجود رڑکی پہنچے۔ بہت کوشش کی کہ پنڈت دیانند مجمع عام میں آئیں اور سب کے سامنے مولانا سے گفتگو کریں، لیکن وہ نہ آئے اور رڑکی سے واپس چلے گئے۔ مولانا کے حکم کے مطابق مولانا فخر الحسن اور مولانا محمود حسن نے عام جلسوں میں تقریریں کیں اور پنڈت جی کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ مولانا نانوتوی نے بھی جلسہ عام میں تقریر کی اور اسلام پر جو اعتراضات پنڈت دیانند سرسوتی نے کیے تھے، ان کے جواب دیے۔

میرٹھ کا واقعہ:

اس سے کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ پنڈت دیانند میرٹھ پہنچے ہوئے ہیں اور وہاں مختلف مقامات پر جلسے منعقد کر کے اسلام پر حملے کر رہے ہیں، چنانچہ میرٹھ کے مسلمانوں کی درخواست پر مولانا نانوتوی وہاں گئے۔ پنڈت جی وہاں بھی ان سے گفتگو کرنے پر تیار نہ ہوئے اور میرٹھ سے چلے گئے۔ مولانا نے وہاں بھی جلسۂ عام میں تقریر کی اور پنڈت دیانند کے اعتراضات کے جواب دیے۔

مہمان کے لیے حقے کا انتظام:

مولانا نانوتوی بہت بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمان کی تمام جائز ضرورتوں کا خیال رکھتے اور اس کو کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے جو سوانح قاسمی کے

❶ ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' ص ۲۲۲۔

مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نے نقل کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نانوتوی کے قیام دہلی کے زمانے میں ایک ایسا شخص ان کے ہاں مہمان کی حیثیت سے آیا جو نہ دینوی اعتبار سے کوئی خاص مقام رکھتا تھا اور نہ علمی اور دینی لحاظ سے کسی اہم مرتبے کا حامل تھا۔ بس ایک عام سا آدمی تھا۔ اسے ریاح کا عارضہ تھا اور حقہ پینے کا عادی تھا۔ حقہ پینے سے اسے افاقہ رہتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا کھایا اور معمول کے مطابق کھانے کے بعد حقہ نہ پی سکا، مولانا کے احترام کے پیش نظر اپنی اس ضرورت کا ان کے سامنے اظہار بھی نہ کر سکا۔ آدھی رات کے بعد اسے نفخ ہو گیا اور سخت تکلیف پیش آئی۔ مولانا کو اس کی بے چینی کا علم ہوا تو فوراً اٹھے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ تکلیف حقہ نہ پینے کی وجہ سے پیش آئی ہے اسی وقت کہیں سے حقہ لے کر آئے۔ خود چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کو پیش کیا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

''آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں۔''

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا کو حقے سے نفرت تھی، لیکن اس کے باوجود مہمان کے لیے آدھی رات کے بعد حقے مہیا کیا اور اسے پلایا❶۔

انداز تبلیغ کی ایک اچھوتی مثال:

مولانا نانوتوی جس زمانے میں منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دیتے تھے' اسی زمانے میں ایک اور صاحب بھی اس مطبع میں کام کرتے تھے جو ''حافظ جی'' کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بالکل آزاد منش تھے۔ رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے جو اُس دور کے شرفا کا لباس نہ تھا۔ داڑھی چڑھا

❶ سوانح قاسمی ج ا ص ۴۶۸ '۴۶۹۔

یہاں مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم (مصنف رحمۃ للعالمین) کا یاد آیا جو ایک مرتبہ ہمارے ایک بزرگ میاں قاسم الدین مرحوم نے سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ اور میرے دادا میاں محمد مرحوم (جو میاں قاسم الدین کے برادر نسبتی تھے) قاضی صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے پٹیالہ گئے۔ یہ دونوں بزرگ حقہ پینے کے عادی تھے۔ قاضی صاحب اس زمانے میں ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ یہ بزرگ جتنے دن پٹیالہ میں قاضی صاحب مرحوم کے ہاں مقیم رہے' قاضی صاحب انھیں خود کھانا کھلاتے اور اپنے ہاتھ سے حقہ بھر کر لاتے رہے۔ قاضی صاحب سے یہ حضرات بار بار کہتے کہ کھانا اور حقہ ملازم لے آئے گا۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ قاضی صاحب ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ آپ ملازم کے رشتے دار یا مہمان نہیں ہیں' میرے رشتے دار اور میرے ہی مہمان ہیں اور مجھ ہی سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں اور آپ کی ضروریات کا اہتمام کروں۔ میرے دادا کا انتقال جولائی ۱۹۳۹ء کو ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) میں ہوا' اور میاں قاسم الدین کی وفات ۱۹۵۰ء کو ہمارے موجودہ گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ب (تحصیل جڑاں والا' ضلع فیصل آباد) میں ہوئی۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ پرانے لوگ عجیب افکار و خیالات کے مالک تھے' سراپا خلوص اور پیکر محبت۔

کر رکھتے تھے اور نماز نہ پڑھتے تھے۔ مطبع میں ملازمت کی وجہ سے مولانا اور حافظ جی کی آپس میں دوستی تھی۔ یہ دوستی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی ''حافظ جی مولانا کو نہلاتے اور کمر ملتے اور مولانا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ مولانا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولانا کو کنگھا کرتے ____ مولانا کو ان کا اس قدر خیال رہتا کہ ''کبھی مٹھائی وغیرہ ان کے پاس آتی تو حافظ جی کا حصہ ضرور رکھتے۔''

سوانح قاسمی میں مرقوم ہے کہ ''مولانا کے مقدس دوست، ان کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے۔ مگر وہ اس کی پروانہ کرتے تھے۔''

ایک دن تنہائی میں مولانا نے حافظ جی سے کہا کہ ''بھئی! ہماری دوستی کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمھاری وضع قطع کچھ اور ہو اور تمھارے دوست کی کچھ اور ____''
فرمایا ''لاؤ میں ہی تمھارا رنگ اختیار کرتا ہوں ____'' یہ الفاظ سن کر حافظ جی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اس کے بعد اپنے دوست (مولانا نانوتوی) کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیز گار مسلمانوں کی وضع قطع اختیار کر لی اور اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے ❶۔

یہ تبلیغ کا ایک اچھوتا اور نفسیاتی انداز تھا جو نہایت موثر ثابت ہوا۔

اس زمانے میں ایک بزرگ مولوی عبدالسمیع تھے جو میلاد کے سختی سے قائل تھے اور اس موضوع پر بعض علمائے دیوبند سے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔ مولانا نانوتوی سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے منقول ہے کہ ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا نانوتوی سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے سوانح قاسمی ج ا ص ۴۶۹۔

اسی نوع کا قاضی سلیمان منصور پوری کا ایک اور واقعہ ذہن میں آیا۔ یہ واقعہ صوفی نذیر حسین مرحوم سے تعلق رکھتا ہے جو امرت سر کے رہنے والے تھے اور قیام پاکستان کے بعد گوجراں والا میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، ۲۷ فروری ۱۹۵۴ء کو فوت ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کسی زمانے میں بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن میں ملازم تھے۔ فقیرانہ لباس اور وہی وضع قطع، بڑی بڑی مونچھیں، اچھی خاصی داڑھی، سر پر لمبے لمبے بال اور پنڈلیوں سے نیچے تک سبز رنگ کا چغہ۔ کلائی میں چھ سات لوہے کے کڑے اور ہاتھ میں ڈنڈا جسے ہتھیلی میں تھام کر ہاتھ کے جھٹکے سے کڑوں پر مارتے تو چھنن چھنن کی آواز گونجنے لگتی۔ صوفی صاحب کہتے ہیں، ایک دن میں اسی شکل و ہیئت میں بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ پر نظر پڑی جو پٹیالہ شاہی عمامہ باندھے ہوئے تھے، خوب صورت داڑھی اور کٹی ہوئی مونچھیں، تنگ موری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ گورا رنگ اور نورانی چہرہ۔ نہایت معزز اور وجیہ آدمی۔ ساتھ ایک ملازم جس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک مصلی اور سلور کا لوٹا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ریلوے سٹیشن کے جو بڑے چھوٹے لوگ ادھر سے گزرتے، ان بزرگ کو نہایت ادب سے سلام کرتے اور وہ مسکراتے ہوئے سب کے سلام کا جواب دیتے۔ مجھے اس بزرگ کی مومنانہ شکل و صورت اور غیر معمولی روحانیت نے اپنی طرف کھینچا اور میں نے آگے بڑھ کر ان کو جھک کے سلام کیا۔ پھر نہایت ادب سے عرض کیا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں) ==

صاحب تو مولود شریف کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے؟''

جواب ملاحظہ ہو، فرمایا ''بھائی! انھیں سرور عالم ﷺ سے زیادہ محبت معلوم ہوتی ہے' مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے۔''

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ یہ جواب کسی طرح مولوی عبدالسمیع تک بھی پہنچ گیا تو کہا، ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے ❶۔''

= ''آپ کہاں رہتے ہیں۔؟''

فرمایا ''یہیں بٹھنڈے میں رہتا ہوں۔''

''یہاں جناب کا کیا شغل ہے؟''

بولے ''سٹیشن سے قریب کی مسجد میں ہر روز نماز مغرب کے بعد قرآن مجید کا درس دیتا ہوں۔''

''اب کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟''

''پٹیالے جارہا ہوں۔''

''واپس کب تشریف لائیں گے؟''

جواب دیا ''ان شاء اللہ پرسوں آجاؤں گا اور معمول کے مطابق نماز مغرب کے بعد درس قرآن دوں گا''۔ پھر بدرجہ غایت شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا''۔ آپ بھی درس میں آیا کریں۔''

صوفی صاحب بتاتے ہیں کہ میں تیسرے دن اپنی مخصوص وضع قطع اور ہیئت کذائی میں ان کے درس میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بہت سے افسر اور ساتھی وہاں موجود ہیں اور انتہائی انہماک سے درس قرآن سن رہے ہیں۔ میں سب سے پیچھے جوتیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے دوران درس میں مجھے دیکھا تو فرمایا'' قریب آجایئے۔'' میں جھجکتا ہوا اٹھا اور حسب حکم ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی اس ہیئت پر شرم محسوس کر رہا تھا۔ میرے افسر اور ساتھی مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ رہے تھے۔ درس کے بعد باہر نکلے تو پتا چلا کہ یہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ہیں جو بہت بڑے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ریاست پٹیالہ کے سیشن جج ہیں اور ریاست کی تمام منڈیوں کے منتظم ہیں اور اس حیثیت سے ''ناظم منڈیات'' ان کا عہدہ ہے اور بٹھنڈہ میں ان کا دفتر ہے۔ اس کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مونچھوں اور داڑھی کو سنت کے مطابق کیا۔ سر کے بال کٹوائے۔ کڑے اتار پھینکے اور ڈنڈا غائب کر دیا۔ چغہ اتار دیا اور لباس بدل لیا۔ دوسرے دن درس میں گیا تو حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا۔ اپنے قریب بٹھایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا ''وہ چغہ' کڑے' ڈنڈا اور سر کے بال کدھر گئے۔''؟ عرض کیا۔ ''اب وہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔'' فرمایا رہنے دیتے' اتنی جلدی کیا پڑی تھی۔ وہ لباس اچھا لگتا تھا اور آپ کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا۔ غور فرمایئے۔ پرانے بزرگوں اور عالموں کا طریق کلام اور نہج تفہیم کس درجے میٹھا اور پیارا تھا۔ ان کی ہر بات دل میں اترتی اور فکر و ذہن کی گہرائیوں میں اثر و رسوخ کے نقوش مرتسم کرتی جاتی تھی۔

---

❶ سوانح قاسمی ج ا ص ۱۷۴'۲۷۴۔

یہ تھا مخالفوں کے بارے میں ان بزرگوں کا انداز کلام اور اسلوب گفتگو۔ اس قسم کی باتیں لوگوں کو متاثر کرتی تھیں اور وہ امور بدعت سے دامن کشاں ہو جاتے تھے۔

بدعتی کی مہمان نوازی:

ایک صاحب ''ٹھسکہ'' کے رہنے والے تھے اور طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ انھیں ''شاہ صاحب'' کہتے تھے۔ علمائے دیوبند جن امور کے بدعت ہونے کا فتوی دیتے تھے' وہ ان میں مبتلا تھے۔ انھوں نے مولانا نانوتوی کی شہرت سنی تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے نہایت احترام کے ساتھ ان کو مہمان بنایا اور طلبا کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے طریقے کے خلاف کسی قسم کی بات نہ کرے، اس لیے کہ مہمان کی دلشکنی نہیں کرنی چاہیے۔ مولانا نانوتوی نے رسمِ مشائخ کی پیروی کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ بلکہ شاہ صاحب کے ساتھ جو بھنگی سائیس تھے' ان کو خود کھانا کھلایا اور ان کی خاطر مدارات کی۔ یہ بات کسی نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو بھی پہنچا دی۔ مولانا گنگوہی نے مولانا نانوتوی کے اس طرز عمل پر ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ بدعتی کا اکرام جائز نہیں۔ مولانا نانوتوی کی طرف سے جواب دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ تو کافر مہمانوں کا بھی اکرام کرتے تھے۔ مولانا گنگوہی کو لوگوں نے مولانا نانوتوی کا یہ جواب سنایا تو فرمایا کہ کافر کے اکرام میں غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں، برخلاف بدعتی کے۔ بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے اور سمجھنے لگے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' اس کو صحیح قرار دے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے لوگ بھی یہی غلط نتیجہ نکال سکتے اور بدعتی کے عمل کو مبنی بر صحت ٹھہرا سکتے ہیں۔

منقول ہے کہ جب مولانا نانوتوی کے سامنے مولانا گنگوہی کا یہ قول بیان کیا گیا تو جو صاحب ان دونوں بزرگوں کی باتیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پہنچا رہے تھے، ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''یہ کیا واہیات ہے، ادھر کی ادھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو۔''

کہا جاتا ہے کہ جب وہ مہمان یعنی شاہ صاحب مولانا نانوتوی کے ہاں سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے مولانا سے کہا: ''فقیر تو آپ ہیں ہم تو صرف نقال ہیں [1]۔

تصنیفات:

مولانا نانوتوی متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور ان کی تمام تصنیفات ان مسائل سے متعلق ہیں جو ان کے عہد میں زیر بحث تھے۔ ان سے مختلف اہل علم نے جو استفسار کیے ان کے انھوں نے مفصل جواب دیے اور پھر وہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان کے مندرجات و مشمولات دقیق اور فلسفیانہ ہیں۔ مولوی منصور علی

[1] سوانح قاسمی ج ۱ ص ۲۷۲'۲۷۴۔

خان مراد آبادی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"میں نے جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی کو خوب دیکھا ہے اور ان کی تقریر بھی سنی ہے اور ان کے خیالات اور اوصاف پر غور کیا ہے۔ ان کا ذہن مصنفین فلسفہ کے ذہن سے بھی عالی تھا۔ وہ ہر مسئلۂ شرعی کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرنے پر اور مسئلہ فلسفی مخالفِ شرع کو دلائلِ عقلیہ سے رد کرنے پر ایسے قادر تھے کہ دوسرے کسی عالم کو میں نے ایسی قوت علمیہ اور قوت بیانیہ والا نہیں دیکھا[1]۔

ان کے مکاتیب و رسائل اور تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ بلاشبہ وہ بہت بڑی قوت علمیہ اور قوت بیانیہ کے مالک تھے اور اللہ نے ان کو ذہانت و فطانت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کے بہت سے مکتوبات کے علاوہ جو انھوں نے مختلف حضرات کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے، ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تحشیہ صحیح بخاری: یہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ ہے جو انھوں نے مولانا احمد علی سہارن پوری کے فرمان کے مطابق لکھا۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ آب حیات: یہ رسول اللہ ﷺ کی روحانی اور جسمانی حیات مبارکہ سے متعلق ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ باغ فدک کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا بھی اس میں جواب دیا گیا ہے۔

۳۔ مصابیح التراویح: یہ تراویح سے متعلق مولانا احمد حسن امروہوی کے ایک استفسار کا جواب ہے۔

۴۔ ھدایۃ الشیعہ: اس میں ان اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں جو شیعہ حضرات کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔

۵۔ الدلیل المحکم علی قرآۃ الفاتحۃ للمؤتم: یہ فاتحہ خلف الامام کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ اس کے آخر میں ایک بزرگ کے نام ایک مکتوب ہے جس میں تقلید اور آٹھ رکعت تراویح کا بیان ہے۔

۶۔ اجوبہ اربعین: اس میں شیعہ حضرات کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۷۔ اسرار قرآنی: یہ ایک رسالہ ہے جو بعض مسائل سے متعلق پانچ مکتوبات کے جوابات پر محیط ہے۔ ان میں پہلے تین مکتوب مولانا محمد صدیق مراد آبادی کے ہیں، چوتھا مولانا احمد حسن امروہوی کا اور پانچواں مرزا عبدالقادر مراد آبادی کا ہے۔

۸۔ تصفیۃ العقائد: سرسید احمد خاں اور مولانا نانوتوی کے درمیان پیر جی محمد عارف انبیٹھوی کی معرفت ایک مرتبہ عقائد اسلام کے موضوع پر خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا محمد حیات میرٹھی نے تصفیۃ العقائد کے نام سے اسے چھاپ دیا تھا۔ پہلا خط پیر جی محمد عارف کے نام اور دوسرا خط سرسید

[1] مولانا محمد احسن نانوتوی، ص۲۲۴۔

احمد خاں کے نام ہے۔سر سید کا خط بنام پیر جی محمد عارف بھی اس میں شامل ہے۔

۹۔ تحذیر الناس: مولانا محمد احسن نانوتوی کے ایک استفسار کا جواب جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۱۰۔ رد قول الفصیح: مولانا عبدالقادر بدایونی کے شاگرد مولوی فصیح الدین بدایونی نے تحذیر الناس کے رد میں ایک رسالہ قول الفصیح لکھا تھا۔مولانا نانوتوی نے اس کے جواب میں رد قول الفصیح لکھا۔

۱۱۔ حجۃ الاسلام: چاندا پور (ضلع شاہ جہان پور) کے میلۂ خدا شناسی میں مولانا نانوتوی نے حقانیت اسلام کے متعلق ایک تقریر کی تھی جو مولوی فخر الحسن گنگوہی نے حجۃ الاسلام کے نام سے شائع کی۔

۱۲۔ گفتگوئے مذہبی (میلۂ خدا شناسی) یہ بھی ایک تقریر ہے جو چاندا پور (ضلع شاہ جہان پور) کے میلۂ خدا شناسی میں کی تھی۔ یہ میلہ ۷/۸ مئی ۱۸۷۶ء کو ہوا تھا۔

۱۳۔ مباحثہ شاہ جہان پور: یہ بھی ایک تقریر ہے جو ۱۹/۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کے میلۂ خدا شناسی میں ہوئی۔

۱۴۔ انتصار الاسلام: یہ وہ تقریر ہے جو رڑکی میں اس وقت جا کر کی جب کہ پنڈت دیانند سرسوتی وہاں گئے تھے اور مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔مولانا نانوتوی مناظرے کے لیے وہاں پہنچے تو دیانند سامنے نہیں آئے تھے اور رڑکی سے کسی دوسری جگہ چلے گئے تھے۔اس تقریر میں شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود ثابت کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں سر سید کے اوہام کی بھی تردید کی گئی ہے۔

۱۵۔ قبلہ نما:۔ پنڈت دیانند سرسوتی (آریہ سماجی) نے استقبال قبلہ کے مسئلے کو ہدف اعتراض ٹھہرایا تھا۔ مولانا نانوتوی نے اس رسالے میں استقبال قبلہ اور بت پرستی کے درمیان جو فرق ہے' اس کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقت قبلہ کیا ہے اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنا کیوں ضروری ہے۔یہ رسالہ ''انتصار الاسلام'' کا حصہ دوم ہے۔

۱۶۔ جواب ترکی بہ ترکی:۔ ایک مرتبہ میرٹھ (یوپی) میں آریہ سماجیوں نے اسلام پر کچھ تحریری اور تقریری اعتراض کیے تھے۔اس رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔مولانا نانوتوی کا یہ رسالہ مولوی عبدالعلی نے مرتب کیا ہے۔

۱۷۔ تقریر دلپذیر: اس میں عقلی اور نقلی دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور اللہ کی توحید اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نیز واضح کیا گیا ہے کہ نجات کا دارومدار صرف اسلام کو ماننے پر ہے۔

۱۸۔ توثیق الکلام در مبحث خلف الامام: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔اس رسالے میں فاتحہ خلف الامام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱۹۔ تحفہ لحمیہ: اس میں گوشت خوری کو عقلی اور نقلی اسلوب میں ثابت کیا گیا ہے۔

۲۰۔ انتباہ المومنین: یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے جو مولوی الٰہی بخش کے ایک خط کے جواب میں لکھا

گیا۔ اس میں شیعہ حضرات کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ رسالے کے آخر میں مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا احمد علی سہارن پوری نے مولانا اسماعیل شہید دہلوی کا عربی زبان کا ایک خط اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔

۲۱۔ فیوض قاسمیہ: اس میں پندرہ علمی مکتوبات کے جواب دیے گئے ہیں۔

۲۲۔ جمال قاسمی: یہ مولانا نانوتوی کے ان دو مکتوبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے محمد جمال الدین دہلوی کو تحریر فرمائے۔ مکتوب الیہ نے یہ مکتوبات ''جمال قاسمی'' کے نام سے مرتب کیے۔

مکتوب اول: ۲ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ/ ۲۸/ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو لکھا گیا جو وحدت الوجود کے بیان میں ہے۔

مکتوب دوم: ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ/ ۲۹/ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو تحریر فرمایا گیا جو سماع موتی کے متعلق ہے۔

۲۳۔ لطائف قاسمیہ: یہ رسالہ نو مکتوبات پر مشتمل ہے جو مولانا نے مختلف مسائل کے جواب میں نو حضرات کے نام تحریر کیے۔

۲۴۔ مکتوبات قاسمیہ: اس مجموعہ مکتوبات میں مولانا کے آٹھ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے خلیفہ بشیر احمد دیوبندی کے نام لکھے۔ یہ خطوط تصوف وسلوک کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ آخر میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے آٹھ خط درج کیے گئے ہیں اور ایک خط مولانا رشید احمد گنگوہی کا ہے۔

۲۵۔ الاجوبة الكاملہ فی الاسولة الخامسہ: یہ رسالہ شیعیت کے رد میں ہے۔

۲۶۔ قصائد قاسمیہ: مولانا ذوق شعری بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کے چند قصاید کا مجموعہ ہے۔ قصیدہ اول رسول اللہ ﷺ کی شان بابرکات میں ہے۔ تین قصیدے ترکی کے سلطان عبدالحمید کی مدح میں ہیں۔ پہلا اردو میں، دوسرا فارسی میں اور تیسرا عربی میں۔ مولانا ذوالفقار علی، مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے عربی قصائد بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جو انھوں نے سلطان عبدالحمید کی مدح میں کہے۔ آخر میں مولانا نانوتوی کا منظوم چشتیہ صابریہ شجرہ درج ہے۔

تلامذہ:

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی خدمات گوناگوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ اگرچہ محدود تھا، لیکن اس میں ہندوستان کے بعض اعاظم رجال شامل تھے جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا محمد یعقوب دہلوی، اور حکیم منصور علی خاں مراد آبادی لائق تذکرہ ہیں۔

انتقال:

مولانا نانوتوی حج بیت اللہ کے لیے تیسری اور آخری مرتبہ شوال ۱۲۹۴ھ/ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو وطن سے روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/ مارچ ۱۸۷۸ء کو واپس تشریف لائے۔ واپسی پر جدہ پہنچے تو ان کی طبیعت

خراب ہوگئی اور پھر مستقل طور پر بیماری کی گرفت میں آ گئے۔ درمیان میں علاج معالجے سے کچھ افاقہ بھی ہوا، مگر مرض کی جڑ نہیں کٹی اور ضیق النفس کی تکلیف نے شدت اختیار کر لی۔ بالآخر ۴ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ (۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء) کو پنجشنبہ کے روز دیوبند میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور نماز مغرب کے بعد اس خزانۂ علم کو اسی سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللھم اغفرله وارحمه و عافه واعف عنه۔

۸۷۔ مفتی محمد قلی کنتوری

مفتی محمد قلی بن محمد حسین بن حامد حسین بن زین العابدین موسوی نیشاپوری کنتوری، اپنے دور کے مشہور شیعہ عالم تھے۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ کے اساتذہ سے حصول علم کیا۔ پھر سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی سے منسلک ہوئے جو معروف شیعہ مجتہد تھے۔ ان سے حدیث و فقہ اور اصول حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیعہ حضرات کی طرف سے میرٹھ (یوپی) میں مسند افتا پر فائز ہوئے۔ عرصے تک اس منصب پر متمکن رہے۔ شیعی اصول وکلام سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

۱۔ السیف الناصری: یہ کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے پہلے باب کے رد میں ہے۔
۲۔ تقلب المکاید: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے دوسرے باب کے رد میں ہے۔
۳۔ برهان السعاده: اس میں تحفہ اثنا عشریہ کے ساتویں باب کا رد کیا گیا ہے۔
۴۔ تشیید المطاعن کشف الظغائن: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے دسویں باب کی تردید پر مشتمل ہے۔
۵۔ مصارع الافهام لقطع الاوهام: اس میں تحفہ اثنا عشریہ کے گیارھویں باب کی تردید کی گئی ہے۔
۶۔ الاجوبة الفاخرة: اس میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی [1] کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے سیف ناصری پر کیے۔
۷۔ الفتوحات الحیدریه: یہ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کی الصراط المستقیم کے رد میں ہے۔
۸۔ الثعلبة الطفریه: یہ مولانا رشید الدین خان دہلوی کی کتاب ''الشوکۃ العمریہ'' کے رد میں ہے۔
۹۔ نفاق الشیخین بحکم احادیث الصحیحین۔
۱۰۔ تطهیر المومنین عن نجابة المشرکین۔
۱۱۔ تقریب الافهام فی تفسیر ایات الاحکام۔

---

[1] مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد ۸۔

ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی رسائل تحریر کیے۔

مفتی محمد قلی کنتوری نے ۹ محرم ۱۲۶۰ھ/ ۳۰ نومبر ۱۸۴۴ء کو ۲۷ سال کی عمر میں وفات پائی ❶۔

۷۹-مولانا محمد لبیب عثمانی

تیرھویں صدی ہجری میں بدایوں میں جو حضرات پیدا ہوئے ان میں مولانا محمد لبیب عثمانی بدایونی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ مولانا محمد سعید بدایونی کے بیٹے تھے جو اس نواح کے اصحاب علم میں بڑے معروف تھے۔

مولانا محمد لبیب بدایوں میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشو ونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ محمد سعید بدایونی سے حصول علم کیا اور مدت تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ علوم متداولہ سے فراغت کے بعد خود سلسلۂ درس جاری کیا اور بہت سے علما وطلبا کو تعلیم دی۔ علم فقہ اور فرائض و وراثت میں مہارت رکھتے تھے اور اس موضوع سے متعلق کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

بدایوں کے اس عالم نے ۴۷ برس عمر پا کر محرم ۱۲۰۵ھ/ ستمبر ۱۷۹۰ء میں سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

۸۰-سید محمد لطیف مچھلی شہری

سید محمد لطیف ہاشمی جعفری مشہور فقیہ تھے۔ علمائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری کی اولاد سے تھے۔ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مفتی علی کبیر سے حصول علم کا آغاز کیا، کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مولانا محمد شکور کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے تکمیل علم کی۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ ادبیات عربی میں بالخصوص کمال حاصل تھا۔ کئی سال درس و تدریس میں مشغول رہے اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ پہلے مفتی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا عہدہ سنبھالا، بعد ازاں صدر الصدور کا منصب پایا۔ مسند قضا پر بھی متمکن رہے۔ تمام مناصب میں اچھی شہرت پائی اور ہر طبقے کے لوگ ان کے کام سے متاثر ہوئے۔

حکایات عربی ان کی ایک تصنیف ہے۔ طوطی نامہ کا ترجمہ شروع کیا تھا' لیکن اسے مولانا عبدالشکور نے مکمل کیا۔

مذکورہ بالا خدمات انجام دینے کے بعد پنشن پائی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آخر عمر میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور سعادت حج حاصل کی۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۷ھ/ ۲۶ جنوری جولائی ۱۸۵۱ء کو مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص ۴۶۰' ۴۶۱ بحوالہ تذکرۃ العلما۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۱۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۳۔

❸ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۲۔

۸۱- مولانا محمد مبین فرنگی محلی

برصغیر کے جن علمی خاندانوں نے بہت زیادہ شہرت پائی۔ ان میں لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی لائق تذکرہ ہیں۔ یہ انصاری خاندان تھا۔ اس کے متعدد اہل علم کا ذکر سلسلۂ فقہائے ہند کے بہت سے مقامات میں ہو چکا ہے۔ اس دودمان عالی قدر کے جد اعلیٰ شیخ قطب الدین شہید سہالوی تھے، جن کی شہادت کے بعد یہ خاندان لکھنؤ کے نواحی قریہ سہالی سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ آیا اور وہاں کے ایک مقام ''فرنگی محل'' میں اقامت گزیں ہونے کی بنا پر اس کے معزز ارکان ''فرنگی محلی'' کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولانا قطب الدین شہید کے فرزند ملا نظام الدین انصاری فرنگی محلی نے عربی اور دینی مدارس کے لیے باقاعدہ ایک نصاب تعلیم مرتب کیا جو ان کے نام کی مناسبت سے ''درسِ نظامیہ'' کہلایا۔ اسی خاندان کے ایک عالم دین مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی تھے۔ ان کا مختصر نسب نامہ یہ ہے: محمد مبین بن محبّ اللہ بن احمد بن محمد سعید بن قطب الدین شہید انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔

مولانا محمد مبین اپنے دور کے عالم کبیر تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی گہوارۂ علم میں نشو ونما پائی۔ معقول و منقول کے عالم ملا حسن فرنگی محلی لکھنوی سے علم حاصل کیا جو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علوم متداولہ میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و افادہ میں مشغول ہوئے اور اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ علاوہ ازیں تصنیف و تالیف میں بھی نام پیدا کیا اور وعظ کے میدان میں بھی شہرت پائی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ قطب الدین کی اولاد میں یہ اولین عالم دین تھے جنھوں نے لکھنؤ کے فرنگی محل کو مرکز بنا کر تذکیر و موعظت کا سلسلہ شروع کیا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات اور شروح وحواشی کا دائرہ کسی ایک ہی فن میں محدود نہیں ہے۔ ہر موضوع پر حاوی تھے اور ہر میدان میں انھوں نے دادِ تحقیق دی، جس کی تفصیل مندرجہ تحت ہے۔

۱- شرح سلم العلوم: یہ علم منطق کی کتاب ہے اور درسیات میں شامل ہے۔ اس کی انھوں نے ایک مبسوط شرح سپرد قلم کی، جسے حلقۂ علما میں تلقی و قبولیت حاصل ہوئی۔

۲- شرح مسلم الثبوت: اصولِ فقہ کی ایک مشہور کتاب مسلم الثبوت ہے اور شامل درس نظامی ہے۔ مولانا محمد مبین فرنگی محلی نے شرح مسلم الثبوت کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

۳- حاشیہ میرزاھد رسالہ۔

۴- حاشیہ میرزاھد ملا جلال۔

۵- حاشیہ میرزاھد شرح المواقف۔

۶- حاشیہ علی شرح ھدایۃ الحکمۃ از شیرازی۔

۷۔ وسیلة النجات: یہ رسالہ اہل بیت نبوی ﷺ کے حالات میں ہے۔

۸۔ ترجمہ حکایات الصالحین۔

۹۔ شرح اسماء حسنی۔

۱۰۔ شرح تبصرہ: یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے۔

۱۱۔ زبدۃ الفوائد: اس میں سحری اور رمضان المبارک کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۲۔ کنز الحسنات فی ایتاء الزکوٰۃ: یہ رسالہ زکوٰۃ کے احکام ومسائل سے متعلق ہے۔

مولانا محمد مبین انصاری فرنگی ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ/ ۲۷ مئی ۱۸۱۰ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے ❶۔

۸۲۔مولانا محمد مرشد سرہندی

سرہند (مشرقی پنجاب) میں تیرھویں صدی ہجری کے جو علما وفقہا امتیاز و ناموری سے مفتخر ہوئے' ان میں مولانا محمد مرشد بن محمد ارشد بن فرخ شاہ کا نام قابل ذکر ہے۔ متقی اور صالح عالم دین تھے۔ ۱۱ صفر ۱۱۱۷ھ/ ۲۴ مئی ۱۷۰۵ء ان کا سال ولادت ہے۔ ان کے والد محمد ارشد سرہندی جید علما میں سے تھے اور ان کا سلسلۂ درس جاری تھا' جس سے بہت سے تشنگان علوم مستفید ہوئے۔ بیٹے نے انہی کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا اور علم ومعرفت میں شہرت پائی۔

علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد عازم رام پور ہوئے۔ وہاں اس زمانے میں نواب فیض اللہ خاں دادِ حکمرانی دیتا تھا اور علم وعلما کا قدر دان تھا، مولانا محمد مرشد سے بھی اس نے تکریم کا برتاؤ کیا اور انھیں نہایت عزت سے ٹھہرایا۔ مولانا ممدوح نے رام پور میں درس وتدریس کی مسند آراستہ کی اور اس نواح کے علما وطلبا کا مرکز قرار پائے۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ان کے فرزند گرامی مولانا سراج احمد بھی شامل ہیں، جنھوں نے جامع ترمذی کی شرح سپرد قلم کی۔

مولانا محمد مرشد سرہندی نے پیر کے روز ۱۹ رجب ۱۲۰۱ھ/ ۷ مئی ۱۷۸۷ء کو رام پور میں وفات پائی ❷۔

۸۳۔مولانا محمد مستعان کاکوروی

کاکوری کسی زمانے میں بے شمار علما وفقہا اور صلحا واتقیا کا مسکن تھا۔ اس کے تیرھویں صدی ہجری کے عالی مرتبت اصحاب میں مولانا محمد مستعان بن عبدالسبحان کا نام تذکرہ ورجال کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ

❶ تذکرۂ علمائے فرنگی محل ص ۱۷۲-۱۷۴۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۱۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۳' ۴۰۴۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۲' ۴۶۳ بحوالہ الہدیۃ الاحمدیہ۔

کاکوری کے شیخ اور عالم کبیر تھے۔وہاں کے فقہائے حنفیہ میں ان کو اونچا مقام حاصل تھا۔ان کا مولد ومنشا کاکوری ہے۔مولانا محمد اعلم بن شاکر اللہ سندیلوی سے علم حاصل کیا اور اپنے عہد کے عظیم لوگوں میں گردانے گئے۔ حصول علم کے بعد خود درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔

علم فقہ، منطق وفلسفہ اور اصول وکلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔زہد وعبادت اور حسن کلام میں مشہور تھے۔ غرۂ رجب ۱۲۲۷ھ/ ۳۰ جولائی ۱۸۱۲ء کو وفات پائی[1]۔

۸۴- قاضی محمد معروف مدراسی

تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے مدراس میں قاضی محمد معروف بن عبداللہ مدراسی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔اپنے زمانے کی مشہور علمی شخصیت تھے اور ممتاز شیوخ میں شمار کیے جاتے تھے۔مدراس اور اس کے قرب وجوار میں ان کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کے والد قاضی عبداللہ مدراسی بھی معروف عالم تھے۔ بیٹے نے علوم متداولہ کی ابتدائی اور متوسط کتابیں والد بزرگ وار سے پڑھیں۔پھر قاضی ارتضا علی گوپاموی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔علم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس وافادہ میں مصروف ہوئے اور ایک مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔پھر منصب افتا پر متمکن کیے گئے اور طویل عرصے تک اس نازک اور اہم منصب پر فائز رہے۔اپنے استاد قاضی ارتضا علی گوپاموی کی وفات کے بعد قاضی القضاۃ بنا دیے گئے۔

ہندوستان کے اس عالم وفقیہ نے ۲۸ر شعبان ۱۲۷۴ھ/ ۱۳ر اپریل ۱۸۵۸ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی[2]۔

۸۵-مولانا محمد معین انصاری لکھنوی

علمائے فرنگی محل میں مولانا محمد معین بن محمد مبین انصاری لکھنوی نے میدان علم کے مختلف پہلوؤں میں شہرت پائی۔وہ اپنے عصر کے نامور فقیہ تھے۔لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔خاندان کے تمام افراد علم کے زیور سے آراستہ تھے۔اپنے بڑے بھائی مولانا حیدر، چچازاد بھائی مولانا ولی اللہ اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے علم حاصل کیا۔سند حدیث مولانا عبدالحفیظ مکی سے لی۔پھر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے اور لوگوں کو مستفید فرمایا۔ان کے والد مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی ہر جمعے کو مجلس وعظ منعقد کرتے تھے۔باپ کی وفات کے بعد لائق بیٹے (محمد معین) نے مسند درس سنبھالی تو انھوں نے سلسلہ وعظ جاری رکھا۔کثیر تعداد میں لوگ ان کی مجلس وعظ وتذکیر میں شامل ہوتے اور نصیحت حاصل کرتے تھے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۴۶۳۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۷ص ۴۷۳ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

مولانا محمد معین انصاری اپنے زمانے کے عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ علم فقہ اور دیگر موضوعات سے متعلق انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ تحت کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ غایۃ البیان فیما یحل و یحرم من الحیوان: یہ کتاب مسائل فقہ پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں ان حیوانات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا کھانا شرعی اعتبار سے حلال یا حرام ہے۔

۲۔ غایۃ الکلام فی القرأۃ خلف الام: یہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ہے۔

۳۔ ابراز الکنوز فی احوال ارباب الرموز: حالاتِ اصحابِ رموز کے بیان میں۔

۴۔ شرح رسالہ امام نووی

۵۔ کتاب حصن حصین: ناتمام رہی۔

۶۔ حاشیہ صدرا:۔ تا بحث ہیولی۔

۷۔ معینیہ: متعہ کی تحریم اور آیات وراثت کی تفسیر میں۔

۸۔ حاشیہ علی ہدایۃ الحکمۃ: شیرازی کی مشہور درسی کتاب ہدایۃ الحکمہ پر حاشیہ۔

علاوہ ازیں بعض درسی کتابوں پر حواشی وتعلیقات ان سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد معین انصاری فرنگی محلی لکھنوی نے ۲ صفر جمادی الاخری ۱۲۵۸ھ/ ۱۱ر جولائی ۱۸۴۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا اور باغ مولانا احمد انوار الحق لکھنؤ میں دفن ہوئے[1]۔

۸۶- مولانا محمد نعیم کشمیری

خطۂ کشمیر علم وعمل کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایک مستقل حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اس میں لاتعداد بوریانشین علما، بے شمار اصحاب درس وتدریس اور ان گنت ارباب فتویٰ وقضا پیدا ہوئے۔ بعض مقامات پر مختلف اوقات میں اور بعض علاقوں میں ایک ہی عہد میں متعدد علما وفقہا نے خدمات انجام دیں اور خلق کثیر نے ان سے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں اس نواح میں جن حضرات نے فیض رسانی کی مسندیں آراستہ کیں، ان میں مولانا محمد نعیم کشمیری کا اسم گرامی کشمیر کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ والد کا نام نامی محمد مقیم تھا۔

محمد نعیم کا مولد ومنشا کشمیر ہے۔ ان کے چچا مولانا محمد اکبر کشمیری تھے جو بمبئی چلے گئے تھے اور جن کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ان کی وفات ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کو بمبئی میں ہوئی اور وہیں ان کا مدفن ہے۔ محمد نعیم نے انھی سے استفادہ کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ایک اور بزرگ شیخ عبدالرحیم کی صحبت ورفاقت اختیار کی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۲۸۔ تذکرۂ علمائے فرنگی محل ص ۴۷، ۱۷۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۴۔

علوم متداولہ کی تحصیل اور تصوف و طریقت کے حصول کے بعد مولانا محمد نعیم نے اپنے عم محترم مولانا محمد اکبر کشمیری کی مسند سنبھالی اور درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں نامور ہوئے۔

مولانا محمد کشمیری نے ۲۷ / رمضان المبارک ۱۲۴۷ھ / ۲۹ فروری ۱۸۳۲ء کو انتقال کیا ❶۔

۸۷۔ محمد وجیہ کلکتوی

بہار اور بنگال کے علاقوں کو بے شمار علما و فقہا کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بالخصوص صوبہ بہار کے بلاد و قصبات اور دیہات میں وسیع پیمانے پر اہل علم نے درس و تدریس کے ہنگامے بپا کیے اور مخلوقِ خدا کو فیض پہنچایا۔ ان حضرات کے تذکرے فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں ہو چکے ہیں، اس جلد میں بھی ان علاقوں کے بہت سے ماہرین فقہ اور مصنفین و مدرسین کا ذکر موجود ہے۔ ان خوش بخت حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد وجیہ تھے جن کے والد کا نام مولا بخش اور دادا کا قاضی اکبر علی صدیقی بہاری تھا۔ یہ خاندان اصلاً صوبہ بہار سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد وجیہ کی ولادت اور نشو و نما بھی بہار ہی کے کسی مقام میں ہوئی۔ اپنے عہد کے ممتاز عالم اور مانے ہوئے فقیہ تھے۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں رئیس المدرسین کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ کلکتہ میں قیام کی وجہ سے ''کلکتوی'' کہلائے۔

ابوداؤد کے شارح صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اپنی ایک قلمی کتاب ''تذکرۃ النبلا'' میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ کتاب نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف سید عبدالحی حسنی کے ذاتی کتب خانے رائے بریلی میں محفوظ ہے۔

مولانا محمد وجیہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ شیخ عبداللہ السراج مکی ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں ہندوستان تشریف لائے تو ان سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، شیخ مکی ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

۸۸۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی

مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی جید عالم، معروف شیخ، ممتاز محدث اور فقیہ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے، مولانا محمد افضل کے بیٹے اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۲ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ / ۶ / اکتوبر ۱۷۸۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے جلیل القدر نانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی گود شفقت میں تربیت پائی۔ تفسیر جلالین اور علمِ نحو کی کتاب شرح جامی کے کچھ حصے ان سے پڑھے۔ باقی کتب درسیہ شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھیں۔ سند علم و طریقت شاہ عبدالعزیز سے حاصل ہوئی۔ ایک عرصے تک دہلی میں

❶ تاریخ کشمیر۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۵۔

درس وافادے کا سلسلہ جاری رکھا اور علما وطلبا کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا، جن میں نواب محمد صدیق حسن خاں بھی شامل ہیں۔

۱۲۵۸ھ/۱۸۴۳ء میں اپنے برادر کبیر حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

یہ حضرات علم وکمال کے اعتبار سے ارض ہند کی شمع فروزاں تھے۔ ان کا وجود باعث برکت اور موجب رحمت تھا۔ ان سے ایک دنیا نے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے اور مرتبۂ عالی پایا۔ ان کی فیض رسانیاں صرف برصغیر تک محدود نہ تھیں، پورا عالم اسلام ان کے فضل وکمال کی فراوانیوں سے سعادت اندوز ہوا۔ آج بالخصوص برصغیر کے مختلف مقامات میں جو قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز صدائیں بلند ہو رہی ہیں، وہ انہی پاک باز حضرات کی سعی مسلسل کا نتیجہ ہے۔ ان کے تعلیم وتربیت کے دائرے بہت وسیع تھے' اس عالم خاکی کی فضاؤں میں ان کے خلوص وللّٰہیت کے جھنڈے ہمیشہ لہراتے رہیں گے اور مخلوق خدا کے علم وادراک میں ہر لحہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

اس عالم کبیر، محدث جلیل اور فقیہ نام دار نے جو مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی کے نام سے موسوم تھے' جمعہ کے روز ۲۷۔ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ/۱۳/اپریل ۱۸۶۶ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

۸۹- مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحم بن مفتی یعقوب بن عبدالعزیز انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔

مفتی محمد یوسف ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۱۸ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والد مکرم مفتی محمد اصغر انصاری سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے بھی استفادہ کیا اور مفتی نور اللہ لکھنوی کے حضور بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان تمام حضرات کو علم فقہ اور دیگر علوم میں دست رس حاصل تھی۔

مفتی محمد یوسف کے والد گرامی مفتی محمد اصغر حکومت اودھ لکھنؤ کی طرف سے وہاں کی عدالت دیوانی میں منصب افتا پر فائز تھے۔ ۱۹ رجب ۱۲۵۵ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۹ء کو ان کا انتقال ہوا تو یہ عہدہ جلیلہ لائق بیٹے کے سپرد کر دیا گیا' اس لیے کہ یہ بھی والد کی طرح علم وآگاہی کی منزلیں طے کر چکے تھے اور اصحاب فضل میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء تک وہ اس منصب پر متمکن رہے۔ پوری ذمے داری سے یہ نازک خدمت انجام دی۔ اسی اثنا میں اودھ کی حکومت ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا' اس سے عہدۂ افتا کا منصب بھی متاثر ہوا۔ اب وہ تمام امور سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تقریباً پانچ سال اسی طرح گزر گئے۔

۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء میں انھیں جون پور کے اصحاب علم نے دعوت دی اور وہ وہاں کے مدرسہ حنفیہ امامیہ

کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء تک وہاں خدمات تدریس انجام دیں۔ اسی اثنا میں حج بیت اللہ کا شوق پیدا ہوا اور سفر حجاز پر روانہ ہو گئے۔ رمضان کے آخری دنوں میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور شوال کے آخر میں مدینہ منورہ کا عزم کیا اور مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی۔

مفتی محمد یوسف انصاری فرنگی محلی اپنے عہد میں دیار ہند کے کبار اساتذہ میں سے تھے اور علما و طلبا نے ان سے خوب استفادہ کیا۔

اللہ نے ان کو تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی نوازا تھا لیکن زیادہ تر انھوں نے درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔

۱۔ حاشیہ شرح سلم، قاضی مبارک گوپاموی۔
۲۔ حاشیہ شرح سلم، ملاحسن۔
۳۔ حاشیہ شمس بازغہ، ملامحمود جون پوری۔
۴۔ تکملہ حاشیہ، شمس بازغہ، ملاحسن۔
۵۔ حاشیہ برطبعیات الشفاء۔
۶۔ حاشیہ شرح وقایہ تا مبحث مسح بالراس۔
۷۔ تعلیقات تفسیر بیضاوی۔
۸۔ تعلیقات صحیح بخاری۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمے میں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''علمائے فرنگی محل میں مفتی محمد یوسف فرنگی محلی نے ہنومان گڑھی کے جہاد کے موقع پر مولوی امیر الدین کی تحریک کو حکومت اودھ کے اشارے پر سخت نقصان پہنچایا۔ مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی کو جہاد سے باز رکھا۔ مجاہدین کی جماعت میں جہاد کے خلاف وعظ کہا اور جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ تذکرہ علمائے فرنگی محلی نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی۔

''مفتی محمد یوسف کے ملاحسن اور میر زاہد پر حواشی کے چند نسخے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں موجود ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء ثبت ہیں۔''

مفتی محمد یوسف حج کے موقعے پر مدینہ منورہ گئے تو وہاں جا کر بیمار ہو گئے اور ۱۹۔ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ/ ۲۰ فروری ۱۸۷۰ء کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی شامل ہیں ❶۔

❶ تذکرۂ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۴۸۵، ۴۸۶۔ تذکرۂ علمائے ہند (فارسی) ص ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۴۵۔ تذکرۂ علمائے فرنگی محل ص ۲۰۶۔ احوال علمائے فرنگی محل ص ۸۲، ۸۳۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۶۔

۹۰- مولانا محمود سورتی

ارض ہند کے جن علاقوں میں مدت مدید تک علم کے جھنڈے گڑے رہے اور جہاں کی فضاؤں میں عرصہ دراز تک اصحابِ فضیلت کے علم لہراتے رہے، ان میں صوبہ گجرات کا شہر سورت بھی شامل ہے۔ اس صوبے کی خاک میں کتنے ہی علم کے خزینے مدفون ہیں اور کتنے ہی فضل وکمال کے حامل افراد اس کی مٹی میں آسودہ ہیں۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک بزرگان دین کا ایک جم غفیر وہاں آباد ہوا، جنھوں نے قدم قدم پر اسلام کی شمعیں روشن کیں اور ایک دنیا کو راہِ حق اور صراطِ مستقیم پر گام زن ہونے کی تلقین کی۔ وہ اپنی اس تلقین اور کوشش میں کامیاب رہے اور ان کی سعی مسلسل اور جذبہ صادق سے اثر پذیر ہو کر بحر ہند کے کنارے بحیرۂ عرب سے ہم آغوش ہو گئے۔

قافلہ صدق کے ان ارکانِ باہمت میں تیرھویں صدی ہجری کے مولانا محمود بن عبدالقادر بن عبدالاحمد سورتی باعکلظہ کا نام بھی صفحات تاریخ میں مرقوم ہے جو شافعی المسلک فقیہ تھے اور اصول اور علوم عربیہ میں درک رکھتے تھے۔ محمود باعکلظہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے عم محترم مولانا ابراہیم بن عبدالاحمد باعکلظہ سے علم حاصل کیا جو وقت کے کبار علمائے سورت میں سے تھے اور جن کا انتقال ۲۷ رجب ۱۲۸۲ھ/ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوا۔

مولانا محمود سورتی کبار علما میں سے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا اور لوگ ان سے بے حد متاثر تھے۔ اس دور کے ہر طبقہ فکر کے لوگ مسائل شرعی میں انھی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

اس فقیہ نام دار نے غرہ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ/ اگست ۱۸۶۵ء کو سورت میں وفات پائی[1]۔

۹۱- مولانا محمود جون پوری

یو پی کے شہر جون پور کو شیراز ہند کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ کسی زمانے میں مجمع علما اور مرکز اہل کمال تھا۔ یہ شہر پورب میں واقع ہے۔ اور علمی اعتبار سے اس کی تاریخ نہایت شان دار ہے۔ ہر دور میں یہ مردم آفریں قطعہ ارض رہا اور اس کی زرخیز مٹی سے بکثرت ارباب فضل پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے باکمال ارکان میں سے مولانا محمود بن کرامت علی بن امام بخش صدیقی جون پوری کا نام کتب تذکرہ ورجال میں مذکور ہے۔

مولانا محمود کی ولادت وتربیت جون پور میں ہوئی۔ ان کے والد گرامی مولانا کرامت علی جون پوری کا شمار اکابر فقہائے ہند میں ہوتا تھا، ان کی وفات ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء کو بنگال کے شہر رنگ پور میں ہوئی۔ لائق بیٹے نے بہت سی درسی کتابیں باپ سے پڑھیں۔ ان کے بھائی احمد بھی جلیل القدر علما کے

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۶ بحوالہ حقیقت سورت۔

زمرے میں گردانے جاتے تھے، کچھ کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ پھر عازم لکھنؤ ہوئے۔ وہاں مفتی یوسف انصاری لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا اور وہ اپنے عہد اور علاقے کے کبار اساتذہ میں سے تھے۔ مولانا محمود جون پوری نے ان سے اکتساب علم کیا، ایک بزرگ شیخ عبداللہ قندھاری تھے، ان سے فنون ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ تصوف وسلوک سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے لیے اپنے والد محترم مولانا کرامت علی سے وابستہ رہے۔

علوم رسمیہ اور فنون متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمود جون پوری نے خود تدریس وتذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور اللہ کی مخلوق کو فیض یاب کرنے کی طرح ڈالی۔ بہت اچھے واعظ تھے اور نماز جمعہ کے بعد بالالتزام جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں جون پور شہر اور قرب و جوار کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ باہمت اور مستقل مزاج عالم دین تھے۔ ابتدائے قرآن سے سلسلہ وعظ شروع کیا تھا جو طویل عرصے تک چلا۔

مولانا ممدوح اپنے وقت کے فقیہ تھے اور علوم میں درک رکھتے تھے۔ زاہد و عابد بھی تھے۔ ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء کی کوئی تاریخ تھی کہ اچانک نماز عشا کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ❶۔

۹۲- مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی

کاندھلہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے، جس کے متعدد علما وفقہا کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بعض مقامات پر ہو چکا ہے۔ یہ شہر دہلی سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں کاندھلہ میں ایک بزرگ مولانا محمود بخش پیدا ہوئے، جن کے والد کا نام شیخ الاسلام، پردادا کا قطب الدین اور پڑدادا کا عبدالقادر تھا۔ نسباً صدیقی تھے۔

مولانا محمود بخش صالح عالم دین تھے۔ علم فقہ اور باقی علوم رسمیہ میں درک رکھتے تھے۔ صاحب تفسیر کبیر امام فخرالدین رازی کی اولاد سے تھے اور اچھی شہرت کے مالک تھے____ کاندھلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے بڑے بھائی اپنے دور کے ذی علم آدمی تھے۔ محمود بخش نے انہی سے تعلیم کا آغاز کیا اور تمام مروجہ علوم کی کتابیں نہایت محنت اور توجہ سے پڑھیں، یہاں تک کہ علم میں پختگی حاصل ہوگئی، فتوی نویسی کے اہل قرار پائے اور تدریس کی ذمے داری سنبھال لی۔

مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی حلیم الطبع، متواضع، منکسر المزاج، تھے۔ درس و تدریس کو مشغلۂ حیات قرار دے لیا تھا، ہمیشہ اسی میں مصروف رہے اور اسی کار خیر میں زندگی بسر کردی۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا جو تبلیغ اسلام اور ترویج علم کا ذریعہ بنے۔

کاندھلہ کے اس عالم وفقیہ نے ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء کو وفات پائی ❷۔

❶ مفید المفتی ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۶۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۷۔

۹۳-مولانا محی الدین عثمانی بدایونی

علمائے بدایوں میں مولانا محی الدین عثمانی بدایونی حلقہ اہل علم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ والد کا نام عبدالقادر اور دادا کا فضل رسول تھا۔ مشاہیر فقہائے احناف میں سے تھے۔ ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاندان کے سب افراد پڑھے لکھے تھے۔ محی الدین نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو والد کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ اپنے مسلک میں نہایت متعصب تھے اور مخالفوں پر شدت سے تنقید کرتے تھے۔ اس ضمن میں کسی قسم کی رواداری یا مداہنت کے قائل نہ تھے۔ تصنیف و تالیف اور فتوی نویسی میں انھوں نے بہت نام پیدا کیا اور مختلف مسائل کی اپنے خاص نقطہ نظر سے وضاحت کی۔ بعض کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ ان کی تعلیقات وحواشی اور تصنیفات میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

۱۔ حاشیہ میر زاہد رسالہ۔

۲۔ حاشیہ کلیات قانون بوعلی سینا۔

۳۔ شمس الایمان: رد وہابیت میں ایک رسالہ۔

مولانا محی الدین بدایونی نے ۶۔ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ/ ۳۱ر جولائی ۱۸۵۴ء کو سہارن پور میں داعی اجل کو لبیک کہا❶۔

۹۴-سید محی الدین دیلوری

جنوبی ہند میں تیرھویں صدی ہجری کے جن علما وفقہا نے خدمات دینی سرانجام دیں' ان میں سید محی الدین دیلوری قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۳ء ان کا سال ولادت ہے۔ عارف باللہ، عالم اجل اور حافظ قرآن تھے۔ تفسیر و حدیث اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن دیلور میں ایک مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ علاقہ مدراس میں علم کی جو روشنی پھیلی، وہ ان کے فیض عام کا پرتو ہے۔ ہمیشہ تعلیم وتدریس کی مسند بچھائے رکھی اور علما وطلبا کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔

سید ممدوح تصنیف وتالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام کتب تذکرہ ورجال میں محفوظ ہیں۔

۱۔جواهر الحقائق۔ ۲۔فصل الخطاب۔ ۳۔جواهر السلوك۔

اس نامور عالم وفقیہ نے ۳ محرم ۱۲۸۹ھ/ ۱۳ر مارچ ۱۸۷۲ء کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولوی رکن الدین باپ کے جانشین ہوئے❷۔

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۲۲۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷ ص' ۴۶۷' ۴۶۸۔ تذکرۃ الواصلین' ص ۲۵۵

❷ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۲۲۔

۹۵- شاہ مخصوص اللہ دہلوی

خاندان ولی اللہی کے ممتاز رکن شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پڑ پوتے، شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے بیٹے شاہ مخصوص اللہ دہلوی بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تدین وتقویٰ، رشد وصلاح، زہد وعبادت اور فقاہت وفراست میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کا اسم گرامی شامل ہے۔

جدل ونزاع سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جو دوسرے کے لیے تکلیف واذیت کا باعث ہو۔ تدریس وتعلیم اور تبلیغ واشاعت کا وہی انداز اختیار کیے رکھا جو آباواجداد کا تھا۔ دہلی میں جب وہابیت اور اصحاب مقابر کے درمیان نزاع پیدا ہوا اور فریقین کے اسلوب کلام میں شدت آئی تو شاہ صاحب ممدوح نے خاموشی کو ترجیح دی اور اپنی توجہ صرف درس وتدریس تک محدود رکھی۔ آخر عمر میں سلسلۂ درس وتدریس سے بھی کنارہ کش ہوگئے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کر کے صرف ذکر الٰہی اور اللہ کی عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی نمونۂ اسلاف تھی، تمام علوم متداولہ پر یکساں عبور تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ قمری حساب سے رمضان ۱۲۷۳ھ میں بپا ہوا تھا، تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق شاہ صاحب نے اسی سال یعنی ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی، مہینے اور تاریخ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن نزہۃ الخواطر میں بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی سے تقریباً دو سال قبل ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ/ ۲۷۔ اگست ۱۸۵۵ء کو راہی ملک بقا ہوئے ❶۔

۹۶- مولانا مراد اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے انصاری خاندان میں ایک بزرگ مولانا مراد اللہ بن نعمت اللہ بن نور اللہ انصاری لکھنوی گزرے ہیں جو علم ومشیخت اور فقاہت میں تیرھویں صدی ہجری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور فقہائے حنفیہ میں مختلف علوم سے متعلق بڑی شہرت کے مالک تھے۔

مراد اللہ کا مولد ومنشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد مفتی نعمت اللہ لکھنوی اپنے عہد کے جید عالم تھے اور علم وفضل کی وجہ سے فیض آباد کے منصب افتا پر متمکن ہوگئے تھے۔ مراد اللہ نے انہی سے علم حاصل کیا اور ایک عرصے تک ان سے منسلک رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور طویل مدت تک یہ خدمت انجام

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۲۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۸، ۴۶۹۔ حیات ولی ص ۶۳۴، ۶۳۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۱۳، ۱۱۴۔

دیتے رہے۔ بہت سے علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

لکھنؤ سے عازم گجرات ہوئے اور بڑودہ میں سلسلۂ درس شروع کیا۔ وہاں بھی کثیر تعداد میں اہل علم ان سے مستفید ہوئے۔ وہیں سے ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء میں حج بیت اللہ کا عزم کیا اور حج وزیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ حجاز سے واپس وطن آ رہے تھے کہ مرضِ اسہال میں مبتلا ہوئے اور اسی عارضے سے اپنے والد (مفتی نعمت اللہ) کی زندگی میں وفات پائی۔ ان کا سن وفات ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء ہے ❶۔

مفتی نعمت اللہ کا انتقال اس سے اٹھارہ سال بعد ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں ہوا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

۹۷-سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی

لکھنؤ ہی کے ایک اور عالم سید مرتضیٰ بن مصطفیٰ بن اسد علی بن عبدالبدیع بن محی الدین حسینی لکھنوی تھے جن کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقہا اور جید علما میں ہوتا تھا۔

سید مرتضیٰ حسینی کی نشوونما لکھنؤ شہر میں ہوئی اور اپنے چچا سید مخدوم حسینی سے جو اس دور کے ممتاز عالم اور مدرس تھے، حصول علم کا آغاز کیا۔ حدیث اور فقہ کی کتابیں انھی کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔ پھر منطق اور فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کے لیے مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی سے رجوع کیا اور ان کی خدمت میں رہ کر ان علوم کی تکمیل کی۔ پھر دل میں علم طب کے حصول کا شوق پیدا ہوا تو اس عہد کے مشہور طبیب حکیم رضی الدین امروہوی کے دروازے پر دستک دی اور ان سے علم طب پڑھا۔

سید مرتضیٰ حسینی علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں انگریزوں کی سفارت میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں کلکتے بھی گئے اور ایک عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے اور اودھ کے نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت میں لکھنؤ کی مسند افتا پر متمکن ہوئے اور وہاں کے مفتی قرار پائے۔

اب سفر حیات نے ایک اور موڑ کاٹا اور غازی الدین حیدر کے ایام حکومت میں امیر المجاہدین سید احمد شہید سے رابطہ قائم ہوا۔ ان کے تدین وتقویٰ سے متاثر ہو کر ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں منصب افتا سے استعفا دے دیا تھا اور تمام علائق سے منقطع ہو کر یاد خدا کو ہمہ وقتی معمول ٹھہرا لیا تھا۔

سید مرتضیٰ حسینی کی ایک قلمی کتاب کا نام ''کشکولا'' ہے جس میں صرف ونحو، لغت و بلاغت اور علوم ادبیہ کے اہم مسائل جمع کیے گئے ہیں۔ سید ممدوح کا خط نہایت عمدہ تھا۔

اس عالم وفقیہ نے جمعہ کے روز ۸۔شوال ۱۲۵۰ھ/۷ فروری ۱۸۳۵ء کو لکھنؤ میں وفات پائی ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۹، ۴۷۰۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۷۰۔

۹۸- سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی

ارض ہند کے جن اصحاب علم وارباب کمال کی شہرت پوری اسلامی دنیا میں پھیلی، ان میں سید مرتضیٰ بن محمد بن قادری بن ضیاء اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و امام، عالم ومحدث اور ماہر فقہ ولغت تھے۔ علم نحو، ادب ومعانی، اصول وکلام اور انساب میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شعر وشاعری میں درک حاصل تھا۔ وہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے علاقہ یمن کے ایک مقام ''زبید'' میں جابسے تھے' اس لیے ''زبیدی'' کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بلگرام کے بہت سے اہل علم کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس شہر میں متعدد علما وفقہا اور ادبا نے جنم لیا اور اپنی بے پناہ خدمات کی بنا پر بے حد شہرت پائی۔

بلگرام فضل وکمال کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز وشاداب رہا ہے۔ یہ ایک مردم خیز شہر تھا۔ نہایت ذہین و فطین لوگ اس میں پیدا ہوئے۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع ہردوئی کا ایک بہت قدیم اور مشہور قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ٹھیٹرے آباد تھے' جن کو قنوج کے راجپوتوں نے حملہ کر کے شہر سے نکال دیا تھا اور اس پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں بلگرام، قنوج سرکار کے ماتحت ایک پرگنہ تھا۔

محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں قاضی محمد یوسف عثمانی گاذرونی نے اس شہر کو فتح کیا اور یہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ غزنوی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو مقامی ہندوؤں نے مسلمان حکمران کو بلگرام سے مار بھگایا اور اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت بلگرام کا حاکم راجا سری کو بنایا گیا تھا، اس نے اس شہر کا نام بدل دیا اور اپنے نام پر اس کا نام ''سری نگر'' رکھا۔

سلطان شمس الدین التتمش کے عہد حکومت میں ابوالفرح واسطی کے ایک جانشین سید محمد صغریٰ نے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں ایک مضبوط اور مسلح شاہی فوج کے ساتھ بلگرام پر حملہ کیا اور وہاں کے راجا کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ مسلمانوں کا اس پر دوبارہ قبضہ تھا۔ اب اس کا نام بدل دیا گیا اور اسے سری نگر کے بجائے پھر ''بلگرام'' کہا جانے لگا۔

۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) کو اس شہر میں مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان زبردست معرکہ ہوا تھا جس میں ہمایوں کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعے اس شہر میں شراب اور دیگر منشیات کی خرید وفروخت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

بلگرام کے سادات جو وہاں کے عثمانی اور فرشوری شیوخ پر ہر میدان میں سبقت لے گئے تھے، تصنیف وتالیف، علم وادراک، شعر وادب اور عمل وتدبیر میں ممتاز ہوئے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات نے

بالخصوص بہت نام پایا۔

۱۔ سید محمد طاہر بلگرامی: متعدد اوصاف علمی کے حامل تھے۔ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو وفات پائی۔

۲۔ میر سید عبدالواحد بلگرامی: کئی کتابوں کے مصنف اور شارح ہیں، شاہدی تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک مشہور کتاب سبع سنابل ہے۔ ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء کو فوت ہوئے۔

۳۔ سید فیروز بلگرامی: ممتاز فقیہ اور عالم تھے۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ/ ۲۵۔ اکتوبر ۱۶۵۵ء کو رحلت فرمائی۔

۴۔ قاضی یوسف بلگرامی: عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بلگرام کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۰۸۴ھ/ یکم فروری ۱۶۷۴ء کو انتقال ہوا۔

۵۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی: علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ۲۵ شعبان ۱۱۰۴ھ/ ۲۱۔ اپریل ۱۶۹۳ء کو عالم آخرت کی راہ لی۔

۶۔ میر سید عبدالواحد بلگرامی: واحد اور ذوقی ان کا تخلص تھا۔ ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۲ محرم ۱۱۳۴ھ/۱۲۔ اکتوبر ۱۷۲۱ء کو قتل ہوئے۔

۷۔ سید عبدالجلیل بلگرامی: علامہ وقت اور شیخ دوراں تھے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۷۲۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا، اور ان کی وصیت کے مطابق ۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ/ ۳۰ دسمبر ۱۷۲۵ء کو ان کی میت بلگرام لے جا کر ان کے والد میر سید احمد بلگرامی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

۸۔ سید طفیل محمد بلگرامی: معقول و منقول کے جامع تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ/ ۲۴ مارچ ۱۷۳۹ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

۹۔ سید طیب بلگرامی: فضلا و شیوخ میں سے تھے۔ ۷ رجب ۱۱۵۲ھ/ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۹ء تاریخ وفات ہے۔

۱۰۔ سید آل محمد بلگرامی: علوم ظاہری و باطنی اور فقہ میں اونچے مرتبے کے مالک تھے۔ ۱۵ رمضان ۱۱۶۴ھ/ ۲۷ جولائی ۱۷۵۱ء کو راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

۱۱۔ میر سید محمد شاعر بلگرامی: جلیل القدر عالم اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ/ ۱۶/ر دسمبر ۱۶۸۹ء کو پیدا ہوئے اور ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء کو انتقال کیا۔

۱۲۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی: دیار ہند کے نہایت مشہور عالم اور بہت بڑے مصنف، مورخ اور شاعر تھے۔ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۷۸۶ء کو وفات پائی۔

۱۳۔ سید علی بلگرامی: مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لبتان کی کتاب کا ''تمدن عرب'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء کو ہردوئی میں فوت ہوئے۔

اسی بلدۂ علم و عرفان کے ایک بزرگ سید مرتضیٰ بلگرامی تھے، جن کے آبا و اجداد عراق کے شہر ''واسط'' کے رہنے والے تھے۔

سید مرتضیٰ ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو اپنے شہر بلگرام کے اساتذہ سے حصول علم کا آغاز کیا۔ پھر وہاں سے نکلے اور یوپی کے ایک شہر ''سندیلہ'' پہنچے۔ سندیلہ کے بعض علما سے استفادہ کرنے کے بعد ''خیر آباد'' کا عزم کیا اور وہاں کے اہل علم سے مستفید ہوئے۔ خیر آباد سے الہ آباد گئے۔ الہ آباد میں اس وقت دیار ہند کے ممتاز عالم مولانا محمد فاخر الہ آبادی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں دہلی کے لیے رخت سفر باندھا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حلقۂ تدریس میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔ پھر ''سورت'' پہنچے، جسے اس زمانے میں اہل کمال کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں مولانا خیر الدین بن زاہد سورتی کے دائرۂ شاگردی میں شمولیت کی اور سال بھر وہاں اقامت گزیں رہے۔ سورت سے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں حجازِ مقدس روانہ ہوئے۔ وہاں سے ''زبید'' کا عزم کیا جو علاقہ یمن میں واقع ہے اور جسے اس عہد میں ''دارالعلم'' کی حیثیت حاصل تھی۔ زبید کے متعدد علما و اساتذہ کے حضور دامن ادب تہہ کیا۔

سید مرتضیٰ کو چاروں مذاہب فقہ کے علما و مشائخ سے سند و اجازہ کا شرف حاصل ہوا اور مختلف بلاد و امصار کے اہل علم سے استفادے کے مواقع میسر آئے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے عصر اور علاقوں میں علمی اعتبار سے اونچے درجے کے مالک تھے۔

سید ممدوح متعدد مرتبہ مکہ مکرمہ گئے اور انھوں نے کئی حج کیے۔ وہاں کے بہت سے اصحاب فضل سے ملاقات کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء کو مکہ مکرمہ گئے تو سید عبدالرحمٰن عیدروس سے ملاقات ہوئی اور ان سے بعض کتابوں کا درس لیا اور پھر ان سے گہرے تعلقات قائم ہوگئے۔

سید عبدالرحمٰن عیدروس وسیع القلب اور عالی فکر عالم تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سید مرتضیٰ کے سامنے مصر کے علما و امرا اور ادبا و شعرا کی اس انداز سے تعریف کی کہ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور حریم دل میں مصر جانے اور وہاں کے اہل علم سے ملاقات کا شوق کروٹ لینے لگا۔ چنانچہ وہ ۹ صفر ۱۱۶۷ھ/۶۔ دسمبر ۱۷۵۳ء کو مصر پہنچے اور وہاں کے ایک مقام ''خان الصاغۃ'' میں اقامت اختیار کی۔ اس وقت مصر میں بہت سے جید علما مصروف استفادہ تھے، سید مرتضیٰ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے فیض حاصل کرنے لگے۔ ان تمام علما و اساتذہ نے ان کو سند و اجازہ سے مفتخر فرمایا اور اس ہندی عالم کے علم و فضل، جودتِ طبع، حفظ و اتقان، فہم و فراستؔ، وسعت نظر اور عمق فکر کا لوہا مانا اور حدیث و فقہ میں ان کے عبور و استحضار کا اعتراف کیا۔ اب مزید تعلیم اور علما سے ملاقات کے لیے انھوں نے علاقہ مصر کے دیگر مقامات کا رخ کیا۔ وہ ''رشید'' اور ''دمیاط'' پہنچے اور وہاں کے اہل علم سے سماع حدیث کیا۔ پھر ''اسیوط'' اور بلاد ''صعید'' کو روانہ ہوئے اور وہاں کے علما سے شرف لقا حاصل کیا۔

کم و بیش تین سو علما سے مستفید ہونے کے بعد انھوں نے شادی کی اور ''عطفۃ الفسال'' میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں ایک ایسی عظیم الشان کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا' جس کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک

پھیل گئی اور عالم اسلام کے اطراف واکناف میں ان کے علو مرتبت اور رسوخ فی العلم کی دھوم مچ گئی۔ یہ کتاب لغت سے متعلق ہے اور اس کا نام ''تاج العروس'' ہے۔ یہ کتاب انھوں نے دس ضخیم جلدوں میں مکمل کی اور اس کی تصنیف پر چودہ سال دو مہینے صرف ہوئے۔ اس کی تصنیف کے بعد مصنف نام دار نے ایک عظیم دعوت کا اہتمام کیا، جس میں بہت سے شیوخ وقت، علمائے عصر اور طلبائے علم شریک ہوئے، جنھوں نے بالاتفاق ان کی فضیلت علمی، وسعت معلومات اور فن لغت میں ان کی مہارت تامہ کی شہادت دی اور ان کے فضل وکمال کو بے حد خراج تحسین پیش کیا۔ ان کے تبحر علمی کی دل کھول کر تعریف کی اور ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا اور انھیں مستحق تعظیم وتکریم گردانا۔

۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء کے اوائل میں وہ قاہرہ (مصر) کے ایک علاقہ ''سویقۃ اللالہ'' میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں کے علما وزعما نے ان سے از حد اکرام وتوقیر کا برتاؤ کیا اور بہت سے ہدایا وتحائف ان کی خدمت میں پیش کیے۔ اس علاقے میں انھوں نے پند وموعظت کا سلسلہ شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس نواح میں ان کی شہرت پھیل گئی اور قرب و جوار سے عوام وخواص کثیر تعداد میں ان کی مجالس علمیہ میں حاضر ہونے لگے۔ وہ چونکہ غیر ملکی تھے اور ان کی وضع قطع علمائے مصر سے ہم آہنگ نہ تھی' پھر وہ فارسی، ترکی اور کرجی زبانوں سے بھی خوب آشنا تھے اور ان میں روانی سے گفتگو کرتے تھے' لہٰذا لوگوں نے ان کی بہت مالی امداد کی اور انھیں مال ودولت سے بے نیاز کر دیا۔

اس علاقے میں علمی اعتبار سے ان کا اس درجے شہرہ ہوا کہ وہاں کے علما وطلبا اچھی خاصی تعداد میں ان سے درسِ حدیث لینے لگے اور اس باب میں چند ہی روز میں وہ مرجع خلائق ہو گئے۔

وہ حاضرین مجلس کو حدیث مسلسل بالاولیۃ سناتے اور اس سماع کی بنا پر انھیں تحریری سند واجازہ مرحمت فرماتے۔ ایک مرتبہ چند علمائے ازہر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازہ کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ''بنیادی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔'' چنانچہ انھوں نے آپ سے تنہائی میں صحیح بخاری پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ صحیح بخاری کا درس شروع ہوا تو بہت سے علما اس میں شریک ہونے لگے، جن میں بعض کتب خانوں کے مہتمم اور مساجد کے متولی بھی تھے۔ اس سے سید مرتضیٰ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، اور اہل علم کے حلقوں میں انھیں پہلے سے کہیں زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حاضرین درس کی تعداد بہت بڑھ گئی اور دور ونزدیک سے علما وطلبا استفادے کی غرض سے شامل درس ہونے لگے۔ صحیح بخاری کے اس درس میں وہ ایسے علمی وفنی اور لغوی وفقہی نکات بیان کرتے جو اس سے قبل مصر کے مدرسین واساتذہ نے کسی سے نہ تھے۔ لوگ اس سے نہایت متاثر بھی ہوتے اور ان کے وسعت معلومات پر اظہارِ تعجب بھی کرتے۔ ان کا اسلوب کلام اور اندازِ بیان ایسا تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گرہیں سامعین کے سامنے کھلتی چلی جاتیں۔

صحیح بخاری کے اس درس کے علاوہ شہر کی ایک بڑی مسجد میں ایک اور درس کا اہتمام کیا گیا۔ اس درس کے

لیے ہفتے میں کچھ دن مقرر تھے، جن دنوں صحیح بخاری کا درس نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں نماز عصر کے بعد سید مرتضیٰ شمائل ترمذی پڑھاتے ۔ اس درس کی وجہ سے ان کی شہرت وعظمت کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ درس کا طریقہ مصری علما کے مروجہ طریقے سے مختلف تھا، اس لیے طلبا وعلما اس میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور بہت دلچسپی لیتے۔

علاقے کے بعض متمول افراد اور اصحاب ثروت نے بھی اپنے گھروں میں ان کے درس و تدریس کا انتظام کیا۔ جب وہ درس کے لیے کسی کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے تو اونچے ذہن وفکر کے کچھ طلبا اور مقری اور کاتب ان کے ساتھ ہوتے۔ درس کے وقت ان کے سامنے عنبر، عود اور لوبان جلایا جاتا اور تمام صحن یا کمرۂ درس خوشبو سے معطر ہو جاتا۔ درس کے اختتام پر سید مرتضیٰ اپنے خاص انداز سے درود شریف پڑھتے اور پھر تمام شرکائے درس کے نام لکھ لیے جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے نام بھی ضبط تحریر میں لائے جاتے۔ دن اور تاریخ بھی لکھی جاتی اور آخر میں سید مرتضیٰ ناموں کی فہرست کے نیچے اپنے دستخط ثبت فرماتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔

۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں عبدالرزاق آفندی جو اپنے علاقے کے بہت بڑے رئیس تھے، روم (ترکی) سے مصر تشریف لائے۔ ان کو سید مرتضیٰ کے درسِ حدیث کا پتا چلا اور اس کی شہرت ان کے کانوں تک پہنچی تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور ان سے مقامات حریری پڑھانے کی درخواست کی، چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوئی اور وہ مقامات حریری پڑھنے لگے۔ سید ممدوح اس طریقے سے انھیں مقامات حریری پڑھاتے کہ الفاظ کے لغوی معنے ان کے ذہن میں پیوست ہوتے چلے جاتے۔

ایک دفعہ محمد پاشا ان کی خدمت میں آیا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی فراوانیٔ علم سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے تبحر علمی کا ہر سو چرچا تھا اور اہل علم پر ان کے فضل وکمال کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ دور دراز کے قبائل کے لوگ ان سے پوری طرح باخبر ہو گئے تھے۔ تمام اسلامی ملکوں کے اساتذہ وعلما ان سے متاثر بلکہ مرعوب تھے اور ہر علاقے میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مختلف ممالک وقبائل کے ارباب علم اور اصحاب حکومت کی طرف سے انھیں خطوط آتے اور تحائف پیش کیے جاتے۔ حجاز، ترکی، ہندوستان، یمن، نجد، شام، بصرہ، عراق، سوڈان، فران اور الجزائر وغیرہ ممالک کے سلاطین وامرا کی طرف سے خطوط اور وفود آتے اور ہر ملک کی جانب سے وہاں کا کوئی خاص تحفہ نہایت عقیدت واحترام سے ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ ایک مرتبہ حاکم فران نے ایک عجیب وغریب شے پیش کی، جس کی شکل بھیڑ کی سی تھی اور سر بچھڑے کا سا۔ یہ تحفہ سید مرتضیٰ نے سلطان ترکی عبدالحمید کی اولاد کو بطور ہدیہ بھیج دیا تھا۔

عرب کے مغربی ممالک کے لوگ تو ان سے انتہائی متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ جو شخص حج کرنے گیا اور مرتضیٰ زبیدی کی زیارت سے محروم رہا تو گویا اس کا حج ادھورا رہا۔ ایام حج میں ان کی قیام گاہ پر لوگوں کا

ہمیشہ ایک ہجوم رہتا اور ہر شخص کے ہاتھ میں سید مرتضیٰ کے نام ایک خط ہوتا۔ جس شخص کو سید ممدوح کی طرف سے اس کے خط کا تحریری جواب مل جاتا، وہ اس کو نہایت متبرک سمجھتا اور بحفاظت اپنے پاس رکھتا اور اسے اپنے سفر حج کی نشانی قرار دیتا۔ وہ یہ بھی یقین رکھتا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ جس شخص کو اس کے خط کا جواب نہ ملتا وہ حسرت وافسوس کا اظہار کرتا اور لوگ اسے لائق ملامت ٹھہراتے۔

سید مرتضیٰ شاعر بھی تھے اور ان کے شعر بہت مشہور ہیں، ان کی اہلیہ نے ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء کو وفات پائی۔ اس سے وہ نہایت مغموم ہوئے۔ اس موقعے پر انھوں نے بعض انتہائی دردناک شعر کہے جن میں سے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

مضت فمضت عني بها كل لذة   تقر بها عيناي فانقطعا معا

لقد شربت كاسا سنشرب كلنا   كما شربت لم يجد عن ذاك مدفعا

فمن مبلغ صحبي بمكة انني   بكيت فلم اترك لحيني مدمعا

یعنی وہ اس دنیا سے چلی گئی اور اس کے جانے کے ساتھ ہی دنیا کی تمام لذتیں ختم ہوگئیں۔

اس نے موت کا پیالہ پی لیا اور عنقریب ہم سب اسے اسی طرح پئیں گے جیسے کہ اس نے پیا، موت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

میرے دوستوں میں سے مکے کون یہ پیغام پہنچائے گا کہ میں اتنا رویا کہ آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ باقی نہ رہا۔

بیوی کی وفات ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس صدمے سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کسی کے تحفے تحائف قبول نہیں کیے۔

سید مرتضیٰ زبیدی کا جسم کمزور اور رنگ سنہری تھا۔ داڑھی معتدل اور باریک تھی۔ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے اور خوش وخرم رہتے، لیکن بیوی کی وفات کے بعد چہرے سے خوشی کے آثار معدوم ہوگئے تھے اور حزن وملال کے نشان ابھر آئے تھے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں اور بہت سی بہ صورت مخطوطات بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اتحاف السادة المتقين بشرح احياء علوم الدين: یہ مطبوعہ ہے۔ مطبع امینیہ قاہرہ نے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء کو بیس ضخیم جلدوں میں شائع کی۔ فاس (مراکش) میں ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۴ھ تک تیرہ جلدوں میں طبع ہوئی۔

۲۔ تاج العروس في شرح القاموس: فن لغت میں نہایت عمدہ تصنیف ہے جو دس ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مصنف شہیر نے یہ کتاب چودہ سال اور دو مہینے میں

مکمل کی۔ اس کتاب کی وجہ سے انھوں نے انتہائی شہرت حاصل کی اور کتاب اہل علم میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی زندگی ہی میں اسے قبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ بادشاہ روم (ترکی) نے کتابت کرا کے اپنے کتب خانے میں محفوظ کیا۔ ایک نسخہ سلطان دارفور نے لکھوایا۔ ایک نسخہ سلطان مغرب نے اپنے لیے کتابت کرایا۔ ایک امیر اللواء محمد بیگ ابوالاہیہ نے طلب کیا اور اپنی مسجد کے اس کتب خانے میں محفوظ کیا جو جامعہ ازہر کے قریب ہے۔ یہ نسخہ اس نے ایک ہزار ریال میں حاصل کیا تھا۔ یہ کتاب اب جدید انداز میں کویت سے شائع ہو رہی ہے۔ کئی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ چوبیس جلدوں میں مکمل ہوگی۔

۳۔ تکملہ القاموس: ان الفاظ کی لغوی تشریح جو تاج العروس میں درج ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں درج کیے گئے۔

تاج العروس پر اس دور کے متعدد اصحاب علم نے نظم و نثر میں تقریظات لکھیں۔

ان میں شیخ عبدالرحمٰن عیدروس (متوفی ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء)، شیخ حسن الجداوی (متوفی ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۸ء) شیخ عطیہ الجہوری (متوفی ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء)، شیخ حسن الہواری (متوفی ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء)، شیخ عیسی البداوی (متوفی ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۷۸ء)، شیخ محمد بن ابراہیم العوفی (متوفی ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء) شیخ حسن الہواری (متوفی ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۶ء) شیخ علی بن صالح الشادری (متوفی ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء)، شیخ محمد الجبیر بتاوی (متوفی ۱۲۰۷ھ/ ۱۷۹۳ء)، شیخ علی صعیدی (متوفی ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء)، شیخ احمد الزردیر (متوفی ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء)، شیخ علی القناوی (متوفی ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء)، اور شیخ محمد بغدادی مشہور بہ السویدی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

۴۔ الجواهر الحنیفه فی اصول ادلة مذهب الامام ابی حنیفه: ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء کو مصر سے شائع ہوئی۔ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب فقہی کی احادیث رسول ﷺ سے تائید کی گئی ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں ایمانیات اور حصہ ثانی میں عبادات کا بیان ہے۔ احناف کے نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۵۔ تنبیه المعارف البصیر علی اسرار حزب الکبیر: مصر میں طبع ہوئی۔ ابوالحسن شاذلی کی حزب الکبیر کی شرح ہے۔

۶۔ نشوة الارتیاح فی بیان حقیقة المیسر و القداح: ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۵۵ء کو لیدن میں چھپی۔

۷۔ بلغة الاریب فی مصطلح آثار الحبیب: ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء کو مصر میں طبع ہوئی۔

۸۔ شرح حدیث ام زرع۔

۹۔ رفع الکمال عن العلل۔

۱۰۔ تخریج حدیث شیبتنی هود۔

۱۱۔ تخریج حدیث نعم الادام الخل۔
۱۲۔ المواھب الجلیه فیما یتعلق بحدیث الاولیه۔
۱۳۔ المرقاۃ العلیه بشرح الحدیث المسلسل بالاولیه۔
۱۴۔ العروس المجلیه فی طرق حدیث الاولیه۔
۱۵۔ حسن المحاضره فی آداب البحث والمناظره۔
۱۶۔ انالةالمنٰی فی سرالکنیٰ۔
۱۷۔ القول المبتوت فی تحقیق لفظ التابوت۔
۱۸۔ رساله فی اصول الحدیث۔
۱۹۔ رساله فی اصول المعمی۔
۲۰۔ کشف المعطی فی الصلواۃ الوسطیٰ۔
۲۱۔ الاحتفال بصوم الست من شوال۔
۲۲۔ ایضاح المدارك عن نسب العواتك۔
۲۳۔ اقرار العین بذکر عن نسب الی الحسن و الحسین۔
۲۴۔ الابتهاج بذکر امرالحاج۔
۲۵۔ انضیوضات العلیه بما فی سورة الرحمٰن من اسرار الصیغة لالهیه۔
۲۶۔ التصریف ضروری علم التعریف۔
۲۷۔ العقد الثمین فی طرق الالباس و التلقین۔
۲۸۔ اتحاف الاصفیاء بسلاسل الاولیاء۔
۲۹۔ اتحاف بنی الزمن فی حکم قهوةالیمن۔
۳۰۔ اتحاف الاخوان فی حکم الدخان۔
۳۱۔ المقاعد العندیه فی شاهد النقشبندیه: یہ ایک سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔
۳۲۔ الدرة المضیه فی الوصیة المرضیه: دو سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔
۳۳۔ ارشاد الاخوان الی الاخلاق الحسان: ایک سو بیس اشعار۔
۳۴۔ الفیة السند: پندرہ سو اشعار اور دس کراسوں پر محتوی۔
۳۵۔ شرح صیغة ابن مشیش۔
۳۶۔ شرح صیغةالبدوی۔
۳۷۔ شرح ثلاث صیغ: ابوالحسن البکری کی ثلاث صیغ کی شرح۔

۳۸۔ شرح سبع صیغ المسمی بدلائل القرب: سید مصطفیٰ البکری کی صیغ کی شرح۔
۳۹۔ الازھار المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ۔
۴۰۔ تحفة العید۔
۴۱۔ تفسیر سورہ یونس علی لسان القوم۔
۴۲۔ لقطة العجلان فی لیس فی الامکان ابدع مما کان۔
۴۳۔ القول الصحیح فی مراتب التعدیل و التجریح۔
۴۴۔ التحبیر فی حدیث المسلسل بالتکبیر۔
۴۵۔ الامالی الحنفیہ: یہ کتاب ایک جلد میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں محفوظ ہے۔
۴۶۔ الامالی الشیخونیہ: دو جلدوں میں ہے اور قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں محفوظ ہے۔
۴۷۔ معارف الابرار فیما للکنی والالقاب من الاسرار۔
۴۸۔ العقد المنظم فی امھات النبی ﷺ۔
۴۹۔ الفوائد الجلیلہ علیٰ مسلسلات ابن عقیلہ۔
۵۰۔ النفخة القدسیہ بواسطة البضعة العیدروسیہ۔
۵۱۔ حکمة الاشراق الی کتاب الافاق: اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں موجود ہے۔
۵۲۔ شرح الصدر فی اسماء اہل البدر۔
۵۳۔ التفتیش فی معنی لفظ الدرویش۔
۵۴۔ رفع نقاب الحفاعمن انتمیٰ الیٰ وفاء وابی وفاء۔
۵۵۔ اعلام الاعلام بمناسك حج بیت الله الحرام۔
۵۶۔ رشف سلاف الرحیق فی نسب حضرة الصدیق۔
۵۷۔ القول المبتوت فی تحقیق لفظة یاقوت۔
۵۸۔ لقط اللالی من الجوھر العالی: یہ استاد حقی کی اسانید ہیں، جس کی اجازت مصنف شہیر کو ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں ملی، جس سال کہ وہ مصر گئے۔
۵۹۔ ھدیة الاخوان فی شجرة الدخان۔
۶۰۔ اتحاف سید الحی بسلاسل بنی طی۔
۶۱۔ ترویج القلوب بذکر ملوك بنی ایوب۔
۶۲۔ کشف اللثام عن آداب الایمان و الاسلام۔

۶۳۔ مختصر العین: لغت سے متعلق ہے۔
۶۴۔ التکملة و الصله: دو جلدوں میں مخطوطہ۔
۶۵۔ عقد الجمال فی بیان شعب الایمان۔
۶۶۔ تحفة اسماعیل:۔ شیخ العرب اسماعیل کی مدح میں۔ یہ مخطوطہ قاہرہ میں موجود ہے۔
۶۷۔ تحقیق الوسائل لمعرفة المکاتبات و الرسائل۔
۶۸۔ جودة الاقتباس فی نسب بنی عباس۔
۶۹۔ الروض المعطار فی نسب السادات ال جعفر الطیار: مخطوطہ قاہرہ میں موجود ہے۔
۷۰۔ سفینة النجات المحتویه علی بضاعة مزجاة من الفوائد المنتقاة۔
۷۱۔ غایة الابتهاج لمقتضی اسانید مسلم بن الحجاج۔
۷۲۔ عقد اللآلی المتناثره فی حفظ الاحادیث المتواتره۔
۷۳۔ العقد المکلل بالجواهر الثمین۔
۷۴۔ زهر الاتمام المنشق عن جیوب الالهام بشرح صیغة سیدی عبدالسلام۔
۷۵۔ رشفة المدام المحتوم للبکری۔
۷۶۔ معجم شیوخه۔
۷۷۔ دفع الشکوی و ترویح القلوب فی ذکر ملوك بنی ایوب۔
۷۸۔ المربی الکابلی فی من روی عن الشمس البابلی: اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں موجود ہے۔
۷۹۔ برنامجه: سید مرتضیٰ نے اسے سید باسط علی قادری بلگرامی کے لیے مصر میں تحریر کیا' اس میں انھوں نے اپنے ان کم و بیش تین سو اساتذہ کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے۔
۸۰۔ اسانید الطرق الثلاثه: قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں محفوظ ہے۔
۸۱۔ تخریج احادیث خیر الانام: قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔
۸۲۔ مناقب اهل الحدیث: محدثین کے مناقب و فضائل سے متعلق۔
۸۳۔ عقد الجواهر الثمین فی تخریج حدیث اطلبوا العلم و لو کان بالصین۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ انھوں نے اور بھی متعدد چھوٹے بڑے رسائل تصنیف کیے۔ ابتدائی سات کتابوں کے علاوہ غالباً اور کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔ بہت سی غیر مطبوعہ کتابوں کے قلمی نسخے قاہرہ، حیدر آباد (دکن) اور دنیا کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں اور بعض کتب و رسائل دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، سید مرتضیٰ شاعر بھی تھے۔ ان کے چند اشعار جو انھوں نے اپنی بیوی کی وفات

پر کہے، گزشتہ سطور میں لکھے جا چکے ہیں، چار شعر اور ملاحظہ ہوں جو پند و نصیحت سے متعلق ہیں۔

توکل علی مولاك و اخش عقابه ۔۔۔ وداوم علی التقوی و حفظ الجوارح

وقدم من البر الذی تستطیعه ۔۔۔ و من عمل یرضاه مولاك صالح

و اقبل علی الفعل الجمیل و بذله ۔۔۔ الی اهله ما استطعت غیر مکالح

ولا تسمع الا قوال من کل جانب

فلا بد من متن علیك و قادح

ترجمہ: اللہ پر توکل کرو اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ ہمیشہ تقویٰ اختیار کیے رکھو اور ارتکاب گناہ سے اعضا و جوارح کی حفاظت کرو۔

جس قدر طاقت ہو، نیکیوں کی طرف دوڑو، ہر وہ عمل جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے، عمل صالح ہے۔

بہترین کاموں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رکھو اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں میں اچھائیاں پھیلاؤ، لیکن اس میں (یہ احتیاط ضروری ہے کہ) کسی سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔

اِدھر اُدھر کی باتیں سننے سے گریز کرو، تمھارے لیے مضبوط عزم و ارادے کے حامل اور اصحاب فہم و تدبیر، ہونا ضروری ہے۔ (تاکہ کوئی غلط کردار اور غلط گفتار آدمی اپنی باتوں سے تمھیں متاثر نہ کرسکے)۔

بلاشبہ سید مرتضیٰ سواد ہند کے جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور نہایت علمی کام کیے۔ ان کی تگ و تاز علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فن لغت میں تو وہ مرتبہ امامت پر فائز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔

انھوں نے جوں ہی شعور کی آنکھیں کھولیں، اپنے ملک ہندوستان کے مشاہیر علما و اساتذہ سے اکتساب فیض میں مشرف ہوگئے اور ہر اس دروازے پر دستک دی جہاں سے انھیں حصول خیر کی توقع ہوسکتی تھی۔ جس ذی علم شخصیت کے حضور اپنا دامن طلب پھیلایا، اللہ نے انھیں کامیاب و کامران فرمایا۔ یہ ایک عظیم سعادت تھی جو ان کے حصے میں آئی۔

ہندوستان کے اساتذہ سے استفادے کے بعد وہ بحر ہند کی موجوں پر سوار ہوئے اور بحیرہ عرب کو عبور کرتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے۔ کئی حج کیے اور وہاں کے ارباب فضیلت سے مستفید ہوئے۔ پھر یمن کے سرسبز و شاداب مقام ''زبید'' کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد دریائے نیل کے ساحل پر اترے اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ اب ان کا مرکز بلدۂ علم و کمال قاہرہ تھا' جہاں علمی احترام کے بام عروج پر پہنچے۔ انھوں نے ہر اعتبار سے بھرپور زندگی گزاری اور جہاں گئے وہاں کے آسمان علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کو اللہ نے انتہائی تکریم سے نوازا اور ان کی عزت و حشمت کا سایہ لحہ بہ لحہ پھیلتا اور دراز ہوتا گیا۔ عمال حکومت' امرائے سلطنت' ارباب منبر و محراب' اصحاب درس و تدریس، غرض ہر شعبہ حیات کے لوگوں نے ان کو مستحق تکریم گردانا

اوران سے حصولِ فیض کو اپنے لیے باعث خیر و برکت قرار دیا۔

بیوی کی وفات کے بعد ان کے گلستانِ طبع پر خزاں چھا گئی تھی اور وہ شگفتگی جو ان کے قلب وضمیر کا خاصہ تھی، باقی نہ رہی تھی۔ امورِ دنیا سے منقطع ہو کر گوشہ گیری اختیار کر لی تھی اور گھر کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ درس و تدریس کے ہنگامے ختم کر دیے تھے۔ لوگوں سے میل جول ترک کر دیا تھا اور ردائے سکوت اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ آفتاب جو ہندوستان سے طلوع ہو کر کئی سال سے یمن اور مصر کی علمی فضاؤں کو منور کر رہا تھا' اب اپنی نورانی کرنیں سمیٹ چکا تھا۔ اس اثنا میں یکایک طاعون کے مہلک مرض نے سر نکالا اور چند ہی روز میں اس نے پورے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جمعۃ المبارک کا روز تھا کہ سید مرتضیٰ اپنے گھر کے سامنے کی مسجد میں گئے جو ''مسجد کردی'' کہلاتی تھی۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ابھی مسجد ہی میں بیٹھے تھے کہ طاعون کا مرض ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ کسی طرح گھر پہنچے اور کواڑ بند کر کے بیٹھ گئے۔ کسی کو کوئی پتا نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ دو دن اور دو راتیں اسی حالت میں کٹیں۔ بالآخر اتوار کو ان کی حیات مستعار کا خاتمہ ہو گیا، عالم تنہائی میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ یہ شعبان کا مہینا اور سن ١٢٠٥ھ/ اپریل ١٧٩١ء تھا۔

ان کی موت کی کسی کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ ان کا وقت اخیر کس طرح گزرا، اس کا کسی کو علم نہیں۔ سب لوگ اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار اور بیماری سے پریشان تھے اور بہ یک وقت کئی کئی میتیں لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر قبرستان کی طرف جا رہی تھیں۔ ایسے نازک حالات میں کسی کو دوسرے کا کیا علم ہو سکتا تھا۔ پیر کے روز باشندگانِ قاہرہ کو پتا چلا تو شہر کے لوگوں نے ان کے گھر کا رخ کیا اور ان کا جنازہ دروازے سے باہر نکالا۔

اس عالم اجل نے اپنی زندگی میں خود ہی سیدہ رقیہ کے مزار کے قریب ایک جگہ منتخب کر لی تھی، وہیں انھیں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی زندگی کا ایک الم انگیز اور دردناک پہلو یہ ہے کہ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی' نہ کوئی بیٹا نہ بیٹی۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ واعف عنہ[1]۔

٩٩- قاضی مصطفیٰ فاروقی گوپاموی

شہر گوپامؤ (یوپی) کے علما و مشائخ اور فقہا و اصولیین میں ایک بزرگ قاضی مصطفیٰ تھے، جن کے والد کا نام خیر الدین اور دادے کا خیر اللہ تھا۔ نسلاً فاروقی تھے۔

---

[1] ابجد العلوم ص ٨٠٧'١٥' ٨٦٥۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ٢٢٤ تا ٢٢٦۔ نزہۃ الخواطر ج ٧ ص ٤٧٠ تا ٤٧٩۔ حدائق الحنفیہ ص ٤٥٨ تا ٤٦١۔ الاعلام ج ٧ ص ٢٩٧۔ تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری حاشیہ عبدالرحمٰن الجبرتی مصر ج ٥ ص ١٠٠۔ اتحاف النبلاص ٤٠٧' ٤٠٨۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ١٩٣' ١٩٤۔

قاضی مصطفیٰ کا مولد و منشا گوپامئو ہے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کی خاک سے متعدد علما و فقہا نے جنم لیا اور حلقہ علم و فضل میں مشہور ہوئے۔ قاضی ممدوح کچھ بڑے ہوئے تو مولانا محمد زمان اور مولانا محمد اکرام سے حصول علم کا آغاز کیا اور پھر انہی سے تکمیل علوم کی۔ یہ دونوں بزرگ قاضی عبدالغنی فاروقی گوپاموی کے شاگرد تھے۔

اس زمانے میں علوم ظاہری سے فراغت کے بعد علم باطنی کی تحصیل لازمی سمجھی جاتی تھی۔ قاضی مصطفیٰ نے بھی علم طریقت و تصوف کے حصول کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور اس کے لیے وہ اس دور کے ایک بزرگ شیخ قدرت علی چشتی کی خدمت میں گئے اور ان سے خرقۂ طریقت حاصل کیا۔

یہ وہ دور تھا جب کہ مدراس میں بہت سے اصحاب کمال اقامت گزیں تھے اور وہاں کے منصب امارت پر قاضی مصطفیٰ کے ایک چچازاد بھائی فائز تھے۔ قاضی ممدوح نے بھی مدراس کا عزم کیا۔ چونکہ نعمت علم سے بہرہ ور تھے' اس لیے انھیں مدراس کی مسند تدریس پر متمکن کر دیا گیا۔ بعد ازاں مدراس کے قاضی مقرر کردیے گئے۔ ان کی صلاحیتیں جب مزید اجاگر ہوئیں تو انھیں مدراس کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ انھیں قاضی مصطفیٰ علی خان بہادر کہا جاتا ہے۔ غالباً ''خان بہادر'' کا لقب انھیں والیٔ مدراس نے دیا تھا۔

ان کی صرف دو تصانیف کا علم ہو سکا ہے۔

ایک فارسی کے دیوان شعری کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبع موزوں رکھتے تھے اور فارسی کے شاعر تھے۔ دوسرے ''تذکرۃ الانساب'' کا۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء کو ''چیناپٹن'' میں لکھی جو جنوبی ہند کا ایک شہر ہے۔

فقہیات پر انھیں عبور حاصل تھا اسی لیے پہلے مدراس کے قاضی اور پھر قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے تھے۔

قاضی مصطفیٰ گوپاموی نے ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء کو وفات پائی ❶۔

۱۰۰- مولانا مصطفیٰ رفیقی کشمیری

وادیٔ کشمیر کے ان مشاہیر علمائے میں جنھوں نے تیرھویں صدی ہجری کے فقہا میں قابل قدر خدمات انجام دیں، مولانا مصطفیٰ رفیقی کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی طیب اور دادا کا احمد تھا۔ مولانا طیب اپنے دور میں کشمیر کے مشہور فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ ۱۰۔ شوال ۱۲۶۶ھ/ ۱۹/ اگست ۱۸۵۰ء کو فوت ہوئے۔

ان کے دادا کا نام نامی احمد رفیقی تھا۔ یہ بھی تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز کشمیری فقہا میں سے تھے۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۱' ۴۸۲۔ بحوالہ مہر جہاں تاب۔

ان کی وفات ۲۲رجب ۱۲۱۹ھ/ ۲۷ر اکتوبر ۱۸۰۴ء کو ہوئی۔

مولانا احمد کے والد کا نام مصطفیٰ تھا۔ یہ بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ غرض یہ تمام خاندان علم وعمل اور فقہ واصول میں خاص شہرت کا حامل تھا۔ مولانا مصطفیٰ رفیقی کی ولادت ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء کو ہوئی اور حدیث وفقہ کی تعلیم اپنے والد مکرم مولانا طیب سے حاصل کی۔ حدیث کی سند بھی انہی سے لی۔ بعض علومِ مروجہ کی تحصیل دیگر علما سے بھی کی اور تشنگان علوم کی زمرے میں بڑی شہرت پائی۔

علم سے فراغت کے بعد درس وافادہ کا وہی سلسلہ شروع کیا جو ان سے قبل ان کے آباواجداد کا شیوہ تھا۔ خلق کثیر نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا اور علوم متداولہ سے بہرہ یاب ہوئی۔ ان کے شاگردوں میں زیادہ تر تعداد کشمیری اہل علم کی ہے جن میں مولانا بہاء الدین، مولانا احمد، مولانا احسن اور مولانا عبدالشکور رفیقی شامل ہیں۔

مولانا مصطفیٰ رفیقی عالم باعمل، بہترین مقرر، عربی وفارسی کے ادیب، اچھے مورخ اور شاعر تھے۔ اس کشمیری عالم نے جمعۃ المبارک کے روز ۱۴ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ/ ۲۹ مارچ ۱۸۷۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا❶۔

۱۰۱- مولانا مظفر حسین کاندھلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ''کاندھلہ'' ایک مشہور شہر ہے جس میں بہت سے علما وفقہا پیدا ہوئے۔ ان میں ایک عالم مولانا مظفر حسین کاندھلوی تھے جو مولانا محمود بخش کاندھلوی (متوفی ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء) کے فرزند گرامی تھے۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے خدمت علم دین میں معروف تھا اور ان میں سے ہر بزرگ اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔

مولانا مظفر حسین اپنے عہد کے فقیہ اور صالح عالم تھے۔ شریعت میں استقامت، کلمہ حق میں عزیمت اور پاک بازی اور تورع میں مشہور تھے۔ تمام عمر لقمہ مشتبہ حلق میں نہیں اتارا۔ اگر بے خبری میں کوئی ایسی چیز منہ میں چلی بھی گئی تو معدے نے اسے قبول نہیں کیا۔ فوراً اگل دیا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام تھا جو انھیں نصیب ہوا۔

مظفر حسین کی ولادت اور نشوونما کاندھلہ میں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور ایک مدت تک ان سے منسلک رہے۔ ۱۵ جمادی الاخری ۱۲۴۵ھ/ ۱۱ر دسمبر ۱۸۲۹ء کو مفتی صاحب ممدوح کا انتقال ہوا تو مظفر حسین نے دہلی کا عزم کیا اور مولانا محمد یعقوب دہلوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی' حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء کو اپنے بڑے بھائی (شاہ محمد اسحاق دہلوی) کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے اور مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ/۱۳ر اپریل ۱۸۶۶ء کو وفات پائی۔

مولانا مظفر حسین نے امیر المجاہدین سید احمد شہید سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا اور ان سے

---

❶ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۲۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۲۶۔

مستفیض ہوئے۔

مولانا ممدوح نے سنت مطہرہ کی حمایت اور بدعت کی تردید کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ ان کے زمانے میں کسی عورت کا شوہر فوت ہو جاتا تو دوسری جگہ اس کا نکاح نہیں کیا جاتا تھا اور وہ تمام عمر گھر میں بیٹھی رہتی اور اسی طرح زندگی گزار دیتی۔ یہ ہندوانہ رسم تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں میں رواج پذیر ہوگئی تھی۔ مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے اس غلط اور غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے رفقائے عالی مقام نے بھی اس کے خلاف جدوجہد کی۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے بھی اس رسم کی شدید مخالفت کی اور بہت سی بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں جاہل اور اسلامی احکام سے ناواقف مسلمانوں کی طرف سے انھیں سخت مصائب ومحن میں مبتلا کیا گیا۔ مگر وہ اس غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کے لیے برابر کوشاں رہے۔

مولانا مظفر حسین نے دو حج کیے۔ پہلے حج کے لیے وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ گئے، پھر حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے اور بخیریت وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد حج ثانی کا قصد کیا۔ مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کے استاد مکرم مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ پڑھی اور تجہیز وتکفین کی۔ اس کے بعد حج کیا اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے، لیکن راستے ہی میں بیمار پڑ گئے۔ حالت مرض میں مدینہ منورہ پہنچے تو اللہ کی آغوشِ رحمت میں چلے گئے۔ یہ جمعرات کی شب ۱۰؍محرم ۱۲۸۳ھ/ ۲۵؍مئی ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے [1]۔

۱۰۲۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادی

عظیم آباد کسی زمانے میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ کا نام تھا۔ وہاں علما وفضلا اور فقہا وصلحا کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہوئی اور ان تمام حضرات نے علم وعمل کے مختلف گوشوں میں نہایت شہرت حاصل کی۔ ان میں سے بعض بزرگوں کا تذکرہ ''فقہائے ہند کی نویں جلد کے مقدمے میں کیا گیا ہے اور بعض کے حالات و کوائف سلسلہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر معرض بیان میں آ چکے ہیں۔

عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک عالم دین مولانا مظہر علی تھے' جو اپنے عہد کے شیخ اور صالح عالم تھے۔ حلقہ احناف سے تعلق رکھتے تھے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں درک وعمق میں مشہور تھے۔ عمر بھر درس وافادہ میں مصروف رہے اور علما وطلبا کی کثیر تعداد نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ''قسطاس البلاغۃ'' کے مصنف شیخ محمد سعید ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں شامل ہیں۔

مولانا مظہر علی عظیم آبادی نے ہفتے کے روز ۶ صفر ۱۲۴۷ھ/ ۱۷؍جولائی ۱۸۳۱ء کو وفات پائی اور ان کے شاگرد شیخ محمد سعید نے یہ تاریخ نکالی۔

آہ شنبہ سادس ماہ صفر یوم الرحیل [2]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۳، ۴۸۴۔

[2] ایضاً ص ۴۸۴۔

۱۰۳-سید معزالدین حسینی کڑوی

سید معزالدین حسینی کڑوی نامور علمائے فقہ میں سے تھے۔ سید خیرات علی حسینی مشہدی کاظمی کڑوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ فقہ واصول کے علمائے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ احمد آباد نارہ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے اساتذہ سے اکتسابِ علوم کیے۔ ذہن ثاقب اور فہم کامل رکھتے تھے۔

سید معزالدین حسینی کڑوی ان اصحاب علم حضرات میں سے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے بدوشعور ہی میں فضل وکمال کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ ان کا اسلوب کلام اور نہج تفہیم نہایت مؤثر تھا، جو بات زبان سے نکالتے سامعین کے ذہن میں پیوست ہوتی چلی جاتی۔ درسیات پر عبور حاصل تھا اور چھوٹی عمر ہی میں ہر گوشۂ علم پر حاوی ہو گئے تھے۔

اس عالم کبیر نے عین عالم جوانی میں ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ اعمال حسنہ اور پاکیزہ کردار کے سوا کوئی شے بہ طور یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کا مرقد احمد آباد نارہ میں ہے جہاں ان کے دیگر بزرگ مدفون ہیں۔ ایک شاعر نے ان کی تاریخ وفات ان اشعار سے نکالی۔

مشفقی مولوی معزالدین کرد رحلت چوزیں جہان بجنان
سال فوتش چنیں رقم کردن آہ او بود بے نظیر جہان ❶

۱۰۴-مولانا معشوق علی جون پوری

مولانا معشوق علی جون پوری اپنے عصر کے جید عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ مولانا غلام حسین جون پوری کے بیٹے تھے جو کہ حساب، ہیئت، ہندسہ وغیرہ فنونِ ریاضی کے نامور عالم تھے۔

مولانا معشوق علی حنفی المسلک تھے اور مولانا فتح علی فاروقی جون پوری کے بھانجے تھے ❷۔ ولادت و تربیت جون پور کے مرکز علم وعلما میں ہوئی اور وہیں کے اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لیے دیار ہند کے ارباب علم کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ احمد یمنی سے جو تیرھویں صدی ہجری میں عربی کے ادیب وعالم تھے، فنون ادبیہ کی تحصیل کی۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۵۔

❷ مولانا فتح علی جون پوری، فاروقی النسل تھے اور صالح اور پرہیز گار عالم دین تھے۔ اعمال جون پور میں ایک گاؤں (منڈیاہو) تھا، وہاں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے شہر جون پور کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ پھر سید احمد شہید بریلوی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ سید صاحب نے ان کا نام فتح علی سے بدل کر عبدالقدوس رکھ دیا تھا۔ علاقہ پنجاب میں وفات پائی۔

نہایت قابل آدمی تھے۔ کتابوں پر گہری نظر تھی اور مختلف علوم وفنون کے بارے میں ماہرانہ رائے رکھتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی مقرر کر دیے گئے تھے۔

محکمہ قضا پر متمکن ہونے کے باوجود زیادہ تر درس وافادہ میں مصروف رہتے اور طلبا کی اچھی خاصی جماعت ان کے حلقۂ درس میں موجود رہتی اور وہ اس کو بہترین شغل قرار دیتے۔

کثیر المطالعہ عالم تھے اور کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کے انتہائی شائق تھے۔ منقول ہے کہ اس زمانے میں پانچ ہزار کتابیں ان کے کتب خانے میں جمع تھیں۔ عربی کے ادیب تھے۔ تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔

۱۔ ایک بڑی اچھی کتاب اخلاق کے بارے میں تصنیف کی۔

۲۔ ایک کتاب ''الفرائض الاسلامیہ'' کے نام سے لکھی جو وراثت سے متعلق ہے۔

۳۔ دیوان متنبی کے چند اجزا کی شرح سپرد قلم کی۔

اس عالم وفقیہ نے ۶ رمضان ۱۲۶۸ھ/۲۴ جون ۱۸۵۲ء کو وفات پائی ❶۔

۱۰۵- مولانا معین الدین انصاری سہسوانی

صوبہ یوپی کے مشہور شہر ''سہسوان'' کے بہت سے علما وفقہا کا ذکر ''فقہائے ہند'' کی مختلف جلدوں میں ہو چکا ہے۔ اس شہر کے ایک ممتاز عالم وفقیہ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی تھے۔ ان کے اسلاف مغل بادشاہ جہاں گیر کے عہد سے وہاں کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے آ رہے تھے اور علم ومعرفت اور ورع وتقویٰ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سہسوان اور اس کے قرب وجوار میں انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی ہجری میں اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا معین الدین انصاری گزرے ہیں جنھیں تفسیر وحدیث، فقہ واصول اور دیگر علوم مروجہ میں درک حاصل تھا۔ وعظ وتذکیر، تبلیغ دین، اشاعت سنت اور ترویج اسلام میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بدعات اور غیر شرعی رسوم ورواج سے انھیں شدید نفرت تھی اور اس کا برسر عام رد کرتے تھے۔ کلمہ حق کہنے میں بے باک تھے اور اس سلسلے میں کسی بڑے چھوٹے کی پروانہ کرتے۔ جس بات کو کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے اور جو غلط ہوتی، اس کی سب کے سامنے نکیر فرماتے۔

ان کے بعض واقعات ''حیات العلماء سہسوان'' (صفحہ ۳۵ تا ۳۷) میں مولانا سید عبدالباقی سہسوانی نے بیان کیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ احقاق حق اور ابطال باطل میں کس درجے جری تھے۔ لیکن اس سے

---

❶ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۲۷، ۶۳۷، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۵۔

قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر سہسوان ہی میں نشو و نما پائی۔ متداولہ علوم وفنون کی تحصیل کے لیے پہلے رام پور گئے اور وہاں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ پھر عازم لکھنو ہوئے۔ وہاں کے بعض علما سے اخذ علم کیا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہوئے اور وہاں مولانا اسماعیل شہید دہلوی، مولانا عبدالحی بڑھانوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقہ ہائے درس میں شامل ہوئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ وہ ان بزرگوں کے طریق وعظ وارشاد اور نہج تقریر سے خاص طور پر متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں وعظ وتبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اپنے اساتذہ دہلی کے اسلوب پر شروع کیا۔

علوم سے فراغت کے بعد سہسوان آئے تو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شہر اور قصبات وقریات کے دورے شروع کر دیے اور لوگوں میں خالص کتاب وسنت کی تبلیغ کرنے لگے۔ کسی کے گھر سے کھانا نہ کھاتے، اپنا خرچ ساتھ لے کر جاتے اور خود ہی روٹی پکا کر کھاتے۔ یتیموں، مسکینوں اور بیوہ عورتوں کی بہت مدد کرتے اور جو پیسا ہاتھ آتا ان میں تقسیم کر دیتے۔ شادی بیاہ اور غمی کے مواقع پر جو غیر شرعی رسمیں مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، ان کی شدید مذمت کرتے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ جماعت کی پابندی پر زور دیتے۔ جو لوگ نماز کے وقت گھروں میں بیٹھے رہتے انھیں کھینچ کر مسجد میں لاتے اور جو جماعت میں شامل ہونے میں تساہل سے کام لیتے انھیں سختی کے ساتھ شامل جماعت ہونے کی تاکید کرتے۔ اس سلسلے میں اتنے نازک احساس کے مالک تھے کہ مار پیٹ پر اتر آتے۔ جس نے ذرا ادھر ادھر کی بات کی اور مسجد میں جانے سے گریز کی راہ اختیار کی، اس پر ڈنڈا اٹھا لیا اور اس وقت تک آرام نہ لیا جب تک اسے مسجد میں لے جانے میں کامیاب نہ ہو گئے۔ یہ کام بلاخوف و خطر کرتے اور اس میں امیر غریب یا حاکم ومحکوم کے درمیان کوئی امتیاز روانہ رکھتے۔ اپنے شہر سہسوان میں بھی یہ خدمت دھڑلے سے انجام دیتے رہے اور اس کے قرب وجوار کے قصبات ودیہات میں بھی۔

اشاعت دین کے اس انداز سے متعلق لوگوں کے دلوں پر ان کا رعب طاری ہو گیا تھا اور سخت سے سخت لوگ بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔ جدھر کو نکل جاتے بے عمل اور بے نماز لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی۔

ایک مرتبہ شہر کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ قریب کی مسجد میں جانے لگے تو دیکھا کہ وہاں تحصیل دار کا دفتر ہے اور مسجد سے ملحق ہے اور اذان کی آواز وہاں پہنچ رہی ہے۔ لیکن نماز کے لیے نہ تحصیل دار اٹھا اور نہ اس کے ماتحت مسلمان عملے کے کسی شخص میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ تحصیل دار ویسے ہی ایک بااختیار اور بڑا افسر ہوتا ہے، مگر وہ تحصیل دار بہت سخت مزاج اور مغرور بھی تھا۔ مولانا معین الدین انصاری تحصیل دار کے دفتر جا پہنچے اور السلام علیکم کے بعد اس سے مخاطب ہو کر کہا ''آپ مسلمان ہیں؟'' بولا ''ہاں! مسلمان ہوں''۔ فرمایا ''مسلمان ہو تو چلو مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور اپنے ماتحت مسلمان عملے کو بھی مسجد میں لے کر جاؤ۔'' وہ اس قسم کے اسلوب کلام کو سننے کا عادی نہ تھا۔ انتہائی غصے سے مولانا کو

دیکھا لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے پر اصرار برابر جاری رہا۔ نماز کے فضائل بھی بیان کیے اور نہ پڑھنے کی وعید بھی سنائی۔ بالآخر آگے بڑھے اور اسے کھینچ کر کرسی سے نیچے اتار لیا۔ تمام عملہ خاموش بیٹھا دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ دوسرے لوگوں کو بھی مسجد میں جانے کا حکم دیا۔

نماز ہو چکی تو نماز کی فضیلت، ارکان اسلام کی اہمیت اور دیگر امور شرعیہ سے متعلق نہایت مدلل اور مؤثر تقریر کی اور اس درجے نرمی اور پیار سے احکام دین بیان کیے کہ حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس کے بعد وہ تحصیل دار بھی پکا نمازی ہو گیا اور باجماعت نماز ادا کرنے لگا اور اس کے ماتحت کام کرنے والے مسلمان بھی نماز باجماعت کے پابند ہو گئے۔

سہسوان کے جوار میں ایک گاؤں ''سید پور'' ہے۔ ایک مرتبہ وہاں گئے تو لوگوں کو حسب معمول احکام شرع کی بجا آوری کی تلقین کی۔ غیر اسلامی رسوم و رواج کی مذمت فرمائی اور بدعات و محدثات کا رد کیا۔ ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ تارک نماز ہے۔ مگر یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ اسے کھینچ کر مسجد میں لے جانا چاہا تو وہ ڈر کر بھاگ اٹھا۔ مولانا بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا۔ مولانا بھی درخت پر چڑھ گئے۔ وہ نیچے کود پڑا، مولانا بھی فوراً کود پڑے اور اس کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ بھاگتا ہوا کنوئیں میں گر گیا، مولانا بھی دوڑتے ہوئے بے خبری میں کنوئیں میں گر گئے اور پانی میں غوطے کھانے لگے۔ آس پاس کے لوگ بھاگ کر آئے اور دونوں کو کنوئیں سے نکالا۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں زندہ سلامت رہے۔

حیات العلما کے مصنف سید عبدالباقی لکھتے ہیں کہ وہ مولانا کی وفات سے چوبیس سال بعد ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء میں خود سید پور گئے اور اس شخص سے ملے جس کے پیچھے مولانا بھاگے تھے۔ اس نے اور بعض دوسرے لوگوں نے واقعہ کی تصدیق کی اور بتایا کہ اس دن سے وہ شخص نماز باجماعت کا پوری طرح پابند ہے اور اپنے افراد خاندان اور دوسرے لوگوں کو بھی نماز کی تاکید کرتا ہے۔

مولانا معین الدین انصاری کسی غیر مسلم یا غیر متشرع مسلمان حاکم کی تکریم نہ کرتے۔ جس گاؤں میں وعظ و نصیحت کے لیے جاتے وہاں کے لوگوں کے گھر سے کھانا نہ کھاتے۔ کھانے پینے کا انتظام خود ہی کرتے۔ کسی کو تکلیف دینا اور کسی پر بوجھ بننا ان کی عادت کے خلاف تھا۔ غربا و مستحقین کی خود بھی مالی امداد کرتے اور اصحاب ثروت کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے مواعظ و نصائح سے خلق کثیر کے عقائد کی اصلاح ہوئی اور ان کے عمل کی دنیا بدلی۔

آخر عمر میں زیادہ تر ضلع بلند شہر کے ایک قصبے ''ڈبائی'' میں قیام کرنے لگے تھے۔ ان کا مقصد وہاں کے لوگوں کی اصلاح و تعلیم اور ان کو مسائل دین سے آگاہ کرنا تھا۔ وہیں کے ایک شقی القلب نے ان کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ اس کے اثر سے نماز فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال

کے مہینے کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء کے اوائل میں پیش آیا۔

ڈبائی میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی تو منقول ہے کہ اس قصبے کی کل آبادی سے تین گنا زیادہ لوگ شریک جنازہ تھے اور سب حیران تھے کہ انسانوں کا یہ انبوہ کثیر کہاں سے آیا اور اتنی جلدی ان کی موت کی اطلاع انھیں کیسے ہوئی۔ اس کے بعد میت کو سہسوان لایا گیا اور وہاں جنازہ پڑھا گیا تو اس میں بھی حاضرین کی کثرت کا یہی حال تھا۔

مولانا سید عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں کہ جس رات مولانا کی وفات ہوئی، اسی رات میرے والد مکرم مولانا سید سراج احمد رحمۃ اللہ نے خواب دیکھا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ صبح کو یہ خواب مولانا بزرگ علی ماہروی سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کسی عالم دین اور داعی حق کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی دن شام کو مولانا معین الدین انصاری کی میت سہسوان آ گئی اور اسے سہسوان کی خاک میں دفن کر دیا گیا۔

۱۰۶۔ مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی

صوبہ یوپی کے ضلع سہارن پور میں ایک گاؤں کا نام ''نانوتہ'' ہے۔ یہ گاؤں گنگوہ سے اٹھارہ کلومیٹر مغرب میں، دیوبند سے پچیس کلومیٹر مشرق میں، سہارن پور سے اٹھائیس کلومیٹر شمال میں اور تھانہ بھون سے تیرہ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ علم و عمل کی تاریخ میں یہ گاؤں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کسی زمانے میں یہ ایک مردم آفریں گاؤں تھا۔ اس میں بہت سے علما و فقہا پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف خطہ ہند میں شہرت پائی بلکہ پوری دنیائے اسلام میں نامور ہوئے اور بے شمار لوگوں نے ان کے علم و عرفان کی فراوانیوں سے استفادہ کیا۔ ان میں ایک عالم دین مولانا مملوک علی تھے جو نسلاً صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چھیالیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

نانوتہ میں آمد اور سکونت:

مولانا مملوک علی کا خاندان سمرقند میں آباد تھا اور تدین و تقویٰ کے لحاظ سے سمرقند اور اس کے نواح میں اس خاندان کی اچھی شہرت تھی۔ مولانا ممدوح کے شجرۂ نسب پر نگاہ ڈالیں تو ان کی پندرھویں پشت میں ایک بزرگ قاضی مظہر الدین کا نام آتا ہے۔ ''سیرت یعقوب و مملوک'' کے مصنف پروفیسر محمد انوار الحسن (فیصل آباد) ''مکتوبات یعقوبی'' کے مقدمہ (صفحہ ۳) کے حوالے سے مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی مولانا محمد یعقوب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سلطان سکندر لودھی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم کے اجداد میں سے جناب قاضی مظہر الدین کو جن کا مزار شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ہے، ۸۷۱ھ/۱۴۶۷ء میں سمرقند سے طلب فرما کر

شرف حضوری بخشا ❶۔ علاوہ دیگر اعزازہائے فراواں کے عہدہ قضاءِ جہاں آبادارزانی فرمایا۔ چونکہ مقام نانوتہ قریباً وسط کا ٹھا میں واقع ہے اور یہاں کے اہل ہنود، اقوام راجپوت وگوجر، روڑہ وغیرہم کا بہت جتھا تھا اور یہ لوگ نہایت سرکش وسخت متعصب، بدخواہ مسلمانان تھے۔ پس ان لوگوں کی سرکشی مٹانے کے لیے اور اس علاقے کو مطیع ومنقاد کرنے کی جہت سے جناب قاضی مظہر الدین کے صاحب زادوں میں سے قاضی میراں بڑے صاحب کو واسطے اقامت وسکونت قصبہ نانوتہ کے ارشاد شاہی ہوا' اور علاوہ املاک وجاگیرات کے عہدۂ قضا وہاں کا مرحمت فرمایا ❷۔

ان سطور سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ مولانا مملوک علی کے اسلاف لودھی خاندان کے عہد حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور لودھی حکمران کی دعوت پر آئے۔

۲۔ ان کے اولین بزرگ جووارد ہند ہوئے، قاضی مظہر الدین صدیقی تھے۔

۳۔ قاضی مظہر الدین صدیقی کے بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔

۴۔ قاضی ممدوح کے علم وکمال کی شہرت ہندوستان میں لودھی حکمران تک پہنچ گئی تھی' اسی لیے ان کو یہاں آنے کی دعوت دی۔

۵۔ قاضی مظہر الدین کو بادشاہ نے دہلی کے منصب قضا پر مامور کیا۔

۶۔ ان کے بیٹے قاضی میراں بڑے بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ انھیں نانوتے کا قاضی مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ اس عہد میں محل وقوع کے اعتبار سے اس نواح کا ایک اہم مقام تھا اور وہاں محکمۂ قضا قائم کرنا بادشاہ کے نزدیک ضروری تھا۔

۷۔ قاضی میراں بڑے صاحب کو بادشاہ کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی۔

۸۔ قاضی میراں کو نانوتے میں آباد کرنے کی بڑی وجہ وہاں کے غیر مسلموں کا زور توڑنا اور اس علاقے میں اسلام کی نشر واشاعت کا اہتمام کرنا تھا۔

---

❶ یہاں مکتوبات یعقوبی کے مرتب امیر احمد عشرتی صدیقی کو سہو ہوگیا ہے' اور پروفیسر محمد انوار الحسن نے بھی اس پر غور نہیں فرمایا۔ ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۷ء میں ہندوستان کا بادشاہ سکندر لودھی نہ تھا' بلکہ اس کا باپ بہلول لودھی تھا' جس نے ۸۵۵ھ سے ۸۹۴ھ/ ۱۴۱۵ء سے ۱۴۸۹ء تک اس ملک پر حکومت کی۔ یہ بادشاہ ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت کا بانی تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۹ء میں اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت ہند پر متمکن ہوا' اور اس نے ۱۷ ر ذیقعدہ ۹۲۳ھ/ یکم دسمبر ۱۵۱۷ء کو اس دور کے دارالسلطنت آگرہ میں وفات پائی۔ قاضی مظہر الدین' بہلول لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے ہوں گے۔ اگر سکندر لودھی کے زمانے میں آئے ہیں تو ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۷ء کا سن صحیح نہیں۔

❷ سیرت یعقوب ومملوک ص ۱۹' ۲۰ بحوالہ مکتوبات یعقوبی مقدمہ ص ۳۔

۹۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ اس میں کامیاب رہے اور اس پورے علاقے کو علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔

۱۰۔ لودھی حکمرانوں کے نزدیک ہندوستان میں تبلیغ اسلام اور ترویج دین کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

بہرحال قاضی مظہر الدین اس خاندان کے پہلے آدمی تھے جو ایک لودھی حکمران کی دعوت پر ہندوستان آئے اور جنھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ان کے بیٹے میراں بڑے صاحب کو نانوتے کا عہدۂ قضا تفویض کیا گیا۔ ''میراں بڑے صاحب'' کا اصل نام کیا تھا' اس کا علم نہیں ہوسکا۔ یہ علمی اعتبار سے یا نیکی اور دین داری کی رو سے اس دور کی ''بڑی'' شخصیت ہوں گے' جنھیں ''بڑے صاحب'' کہا جاتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دہلی اور نانوتے کے منصب قضا کے سوا نہ تو ان باپ بیٹے کے حالات کہیں مرقوم ہیں اور نہ ان سے لے کر مولانا مملوک علی تک درمیان کی تیرہ چودہ شخصیتوں کے بارے میں تذکرہ و رجال کی کتابوں میں کسی چیز کا سراغ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی علمی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

ولادت:

مملوک علی ۱۲۰۴ھ (۸۹_۱۷۸۸ء) کو نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام احمد علی، دادا کا غلام شرف اور پردادا کا عبداللہ تھا۔

تعلیم:

ابتدائی درسی کتابیں اپنے گاؤں نانوتہ کے بعض اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے۔ دہلی اس زمانے میں اسلامی اور دینی علوم وفنون کا گہوارہ تھا اور تحصیل علم کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ وہاں جاتے تھے۔ مملوک علی جب دہلی گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی زندہ تھے۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے تبرکاً علم نحو کی کتاب ''ہدایت النحو'' کے چند اسباق پڑھے۔ بعد ازاں شاہ صاحب کے ممتاز و معروف شاگرد مولانا رشید الدین خاں کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے فنونِ مروجہ اور علوم متداولہ کی تکمیل کی۔

سلسلۂ درس و تدریس:

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا مملوک علی کب اور کتنی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس دور کے حالات اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حصول علم سے فراغ کے بعد انھوں نے دہلی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، چونکہ وہ تمام اصناف علم پر عبور رکھتے اور معقول و منقول کے ماہر تھے' لہٰذا بہت جلد طلبا کا اچھا

خاصا حلقہ ان کے گرد قائم ہو گیا تھا۔ ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں دہلی کالج میں مدرس تھے۔ لائق شاگرد نے بھی یکم جون ۱۸۲۵ء کو وہیں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

یہاں دہلی کالج کے بارے میں بھی چند سطور لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا جو ۱۷۹۲ء میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے دہلی میں اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا۔ مدرسے کے ساتھ ایک شان دار مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس مدرسے میں عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ تینتیس سال تک اس مدرسے میں ان علوم کی تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ ۱۸۲۴ء میں مدرسے میں صرف نو طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے اور مولوی عبداللہ انھیں تعلیم دیتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا اور اس کا نام ''دہلی کالج'' رکھا گیا۔ اس کا پرنسپل مسٹر ٹیلر کو بنایا گیا۔ مولوی رشید الدین خاں کو اس میں عربی کا اول مدرس مقرر کیا گیا۔ سو روپے ماہانہ ان کی تنخواہ تھی۔

۱۸۲۸ء میں سر چارلس مٹکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش سے دہلی کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ اسی سال لوکل فنڈ کے تعلیمی بجٹ سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کالج کو دو سو پچاس روپے دینے کی منظوری دی گئی جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔

۱۸۳۰ء میں حکومت اودھ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دہلی کالج میں عربی اور فارسی کی تعلیم و ترقی کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے دینے کی پیش کش کی [1]۔ لیکن ابھی یہ بات چل ہی رہی تھی کہ نواب صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس اثنا میں دہلی کے لوگوں نے ایک الگ کالج کھولنے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر لارڈ بینٹنگ نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے دہلی کالج سے تمام مشرقی علوم کی تعلیم بند کر دی۔ یہ علوم عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر مشتمل تھے۔ اس سے اہل ملک کو شدید ذہنی کوفت ہوئی اور لوگوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ خود کالج کے کچھ انگریز مدرسوں نے اس پر احتجاج کیا۔ چنانچہ بعض نے کالج کی تدریس سے استعفا بھی دے دیا۔ اس کے بعد لارڈ میکالے کا تقرر ہوا۔ یہ انتہائی متعصب شخص تھا۔ اس کی تقرری سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مزید تکلیف پہنچی۔

لارڈ بینٹنگ کی جگہ لارڈ آکلینڈ یو پی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا تو اس نے ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک چٹھی کے ذریعے آرڈر جاری کیا اور کالج میں علوم مشرقی کی دوبارہ تعلیم دی جانے لگی۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد دہلی کالج سے علوم مشرقی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس وقت مختلف زبانوں کی تعلیم کے اعداد و شمار مندرجہ تحت تھے۔

۱۔	انگریزی کے طالب علم	۱۹۹
۲۔	فارسی کے	۵۷

[1] کانفرنس گزٹ، علی گڑھ ۱۵۔ نومبر ۱۸۳۰ء

۳۔ عربی کے ۳۹

۴۔ سنسکرت کے ۲۶

۱۸۷۷ء تک یہ کالج قائم رہا۔ پھر اسی سال بند کر دیا گیا اور اس کا سٹاف گورنمنٹ کالج لاہور میں بھیج دیا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل لائٹنر بھی یہی چاہتا تھا۔

یہ تھا دہلی کالج کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ ___ آیئے اب اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹیں اور مولانا مملوک علی کے حالات وسوانح بیان کرنے کی کوشش کریں۔

دہلی کالج میں تقرر:

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر دہلی کالج میں استاد مقرر ہوئے، اس وقت ان کی عمر بتیس تینتیس برس کی تھی۔ اپنے استاد مولانا رشید الدین خاں کے ساتھ ہی نائب مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ مولانا رشید الدین خان عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے اور ان کی تنخواہ سو روپے ماہانہ تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ایک کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' (صفحہ ۱۸۱) میں لکھا ہے کہ مولانا مملوک علی کا دہلی کالج میں تقرر ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کے بعد ہوا۔ ان کے عربی الفاظ ہیں:۔ نصب مدرسافی دھلی کالج۔ بعد شیخہ یعنی اپنے استاد (مولانا رشید الدین خان) کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیے گئے۔ مولانا سندھی کی یہ بات صحیح نہیں۔ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کی زندگی میں اور ان کے ساتھ ہی دہلی کالج میں عربی کے نائب مدرس بنایا گیا تھا۔

مولانا مملوک علی کے ساتھ ہی عربی کے دوسرے نائب مدرس مولوی سید محمد کو بنایا گیا تھا۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد ۳۰ / اکتوبر ۱۸۳۰ء کو شعبہ عربی میں مولانا سدید الدین بن مولانا رشید الدین کا اور پھر چار سال بعد ۵ / اکتوبر ۱۸۳۴ء کو مولانا سبحان بخش شکار پوری کا تقرر ہوا[1]۔

تنخواہ میں اضافہ:

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو دہلی کالج میں ملازم ہوئے تھے۔ نومبر ۱۸۴۱ء (یعنی سولہ سال) تک ان کا مشاہرہ پچاس روپے رہا۔ ۸ / نومبر ۱۸۴۱ء کو مسٹر ٹامسن وزیٹر دہلی کالج نے ایک رپورٹ لکھی، جس میں ان کی تنخواہ میں اضافے کی سفارش کی اور لکھا کہ ان کی تنخواہ اسی (۸۰) روپے ماہانہ کر دی جائے۔ اس سفارش پر پورا عمل تو نہ ہوا۔ البتہ دس روپے بڑھا دیے گئے اور انھیں ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' (ص ۱۷۳) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۴۳-۱۸۴۲ء

[2] دیکھیے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی کتاب ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' (ص ۱۷۳) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی ۸ / نومبر ۱۸۴۱ء

اسی اثنا میں نواب حامد علی خاں (متولی) نے مولوی جعفر علی کو (جو مسلکاً شیعہ تھے اور جن کی ولادت ۲ صفر ۱۲۲۷ھ/ ۱۶ فروری ۱۸۱۲ء کو اور وفات ۸ صفر ۱۳۱۴ھ/ ۱۹ جولائی ۱۸۹۶ء کو ہوئی،) دہلی کالج میں سو روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ نواب حامد علی خاں چاہتے تھے کہ مولوی جعفر علی کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس سے مولانا مملوک علی کی حق تلفی ہوتی تھی جو کم و بیش سولہ سال سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ کالج کے اربابِ انتظام نے اس سلسلے میں مفتی صدرالدین آزردہ سے رائے طلب کی تو انھوں نے مولانا مملوک علی کے علم و فضل کو سراہا اور صدر مدرسی کے لیے ان کی سفارش کی۔ لیکن مجلس انتظامیہ نے نواب حامد علی خاں (متولی) کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو ان کے منصب سے علیحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مولانا مملوک علی کی صدر مدرسی کا معاملہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ بالآخر نومبر ۱۸۴۱ء ہی میں مولانا مملوک علی کو صدر مدرس بنا دیا گیا اور سو روپے ان کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۴۳ء کو مولوی جعفر علی دہلی کالج کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔

مسٹر ٹامسن نے مولانا مملوک علی کے علم و فضل کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے انگریزی الفاظ جنرل کمیٹی کی رپورٹ (مورخہ ۳ نومبر ۱۸۴۱ء) میں مرقوم ہیں۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:۔ ''مولانا مملوک علی عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں اور دہلی شہر میں ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔''

دہلی کالج میں تدریسی مساعی کے نتائج:

دہلی کالج میں مولانا مملوک علی اور دیگر علمائے دین نے جو تدریسی خدمات انجام دیں، ان کے نہایت اچھے نتائج نکلے اور ایسے اصحابِ علم میدان عمل میں آئے جن کی مساعی سے پورا ہندوستان متاثر ہوا۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں:۔

۱۔ مولانا محمد مظہر نانوتوی: تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد بریلی کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء کو سہارن پور میں لاولد فوت ہوئے۔

۲۔ مولانا محمد منیر نانوتوی: مئی ۱۸۶۱ء کو بریلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

۳۔ مولانا محمد احسن: پہلے بنارس، پھر بریلی کالج میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔

۴۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی: شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد گرامی تھے۔ بریلی کالج میں پڑھاتے رہے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے اور پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔

۵۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی: بریلی، پیلی بھیت اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔

۶۔ شمس العلما مولوی ضیاء الدین دہلوی: دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

۷۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ: کئی قسم کی تصنیفی و علمی خدمات انجام دیں۔

۸۔ شمس العلما محمد حسین آزاد: متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۹۔ پیرزادہ محمد حسین: (سیشن جج)

۱۰۔ شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد: ان کی بہت سی علمی مساعی کے علاوہ بہت بڑی خدمت قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔

۱۱۔ خواجہ محمد شفیع: جج

۱۲۔ خان بہادر میر ناصر علی۔

۱۳۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔

۱۴۔ مولوی جعفر علی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات ہیں جنھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور ان میں سے اکثر ملک کے تعلیمی نظام سے وابستہ ہوئے۔ انگریزی حکومت کی باقاعدہ ملازمت کی اور جس حسن وخوبی سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیے اس کی خود حکومت نے تحسین کی اور اس کا بہتر صلہ دیا۔

انگریزی حکومت کے ان چودہ ملازمین میں سے صرف ایک اہل حدیث ہیں اور وہ ہیں ڈپٹی نذیر احمد۔

چند تلامذہ کرام:

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی فہرست بہت وسیع ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فضل وکمال کے مختلف گوشوں میں شہرت پائی اور نامور ہوئے۔ ان بزرگانِ عالی قدر میں مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:۔

مولانا احمد حسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب (ابن مولانا مملوک علی) نانوتوی، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، شمس العلما ڈاکٹر ضیاء الدین، منشی جمال الدین مدارالمہام بھوپال، مولانا کریم الدین پانی پتی، مولانا عالم علی مراد آبادی، مولانا سمیع اللہ دہلوی، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا محمد تھانوی اور دیگر بہت سے بزرگ۔!

مولانا عبیداللہ سندھی نے سرسید احمد خاں، منشی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کو بھی مولانا مملوک علی کے شاگردوں میں شامل کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تو مولانا ممدوح سے بے شک استفادہ کیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال وآثار ص ۵۱) لیکن سرسید اور منشی ذکاء اللہ نے ان سے کچھ نہیں پڑھا اور وہ دونوں ان کے شاگردوں میں شامل نہیں ہیں۔

مولانا مملوک علی سے ہندوستان کے بہت سے ان جلیل القدر علما نے علم حاصل کیا جو آگے چل کر درس وتدریس کی مسندوں پر فائز ہوئے۔ اور جن سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا اور پھر اس چشمۂ فیض سے لاتعداد افراد نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ یہ فیض اب تک جاری ہے اور ان کے شاگردوں کے شاگرد متعدد مقامات میں علمی وتدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ کم وبیش ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ اس حیثیت سے مولانا مملوک علی بلاشبہ استاذ العلما تھے اور انھوں نے جو کام شروع کیا' وہ بہ دستور جاری ہے۔

حج بیت اللہ:

مولانا مملوک علی اپنے آبائی وطن ''نانوتہ'' کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر دہلی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور وہاں کے کوچہ چیلاں میں اپنا ذاتی مکان بنا لیا تھا۔ انھوں نے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں حج بیت اللہ کے لیے کالج سے رخصت لی اور اس مبارک سفر پر تشریف لے گئے۔ رجب ۱۲۵۸ھ/ اگست ۱۸۴۲ء کو وطن سے روانہ ہوئے۔ یکم ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ پہنچے اور حج کیا۔ پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ اس طرح ایک سال بعد واپس دہلی آئے۔ اس اثنا میں وہی تنخواہ حکومت کی طرف سے انھیں ملتی رہی۔

عوام اور حکومت کے نزدیک قدر ومنزلت:

مولانا مملوک علی کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عالم ومدرس کی حیثیت سے انھوں نے بہت شہرت پائی۔ اہل علم بھی ان کی بہت تکریم کرتے تھے' عوام میں بھی ان کو عزت کا مقام حاصل تھا اور حکومت کے حلقوں میں بھی ان کو عالی مرتبت سمجھا جاتا تھا اور ان کے کام' محنت اور وفاداری سے متعلقہ حکام بہت خوش اور مطمئن تھے۔

دہلی کالج میں انھوں نے پچیس سال کچھ مہینے خدمت تدریس انجام دی۔ اس اثنا میں تقریباً پندرہ سال عربی کے نائب مدرس رہے اور دس گیارہ سال صدر مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اس پوری مدت میں کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد علیہ رہے۔ کالج کی رپورٹوں سے (جو پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' میں درج کی ہیں) واضح ہوتا ہے کہ مولانا مملوک علی پر کالج کے تمام انگریز پرنسپل بہت اعتماد کرتے تھے، ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی توصیف وتعریف کی جاتی تھی اور ان کے کام کو لائق اطمینان گردانا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو خود ہندوستان کے گورنر جنرل نے انعام سے سرفراز کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۵ اور ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار منعقد کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں سینتیس حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ مولانا مملوک علی مدرس اول کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں

غالب کو خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر اور مفتی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت سہ پارچہ اور ایک گھنٹہ ملا❶۔

اس زمانے میں انگریزی حکومت کی کوشش یہ تھی کہ مغربی علوم اور تعلیم کو ہندوستان کے مسلمانوں میں، بالخصوص دہلی کے مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد میں انگریزی حکومت کامیاب رہی اور مسلمانوں نے جہاں عربی اور فارسی علوم حاصل کیے وہاں انھوں نے انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے حصول کو بھی درخورِ اعتنا قرار دیا۔ بہت سے مسلمان طلبا دہلی کالج اور اس قسم کے دوسرے کالجوں میں داخل ہوئے اور اس کے بہتر نتائج نکلے۔ مولانا مملوک علی اور بعض دیگر علمائے کرام کی کالجوں میں ملازمت اور خدمت تدریس کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں اس کے لیے ایک کشش اور جاذبیت پیدا ہوئی۔

سیاسیات سے بے تعلقی:

مولانا عبیداللہ سندھی کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں جب مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس تشریف لے گئے تو ان کے بعد سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اس کے انتظام کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا تھا جس کے صدر مولانا مملوک علی تھے اور نواب قطب الدین، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی اس بورڈ کے رکن تھے۔ لیکن مولانا سندھی کی یہ بات قرین صحت نہیں۔ اس کی موٹی موٹی تین وجوہ ہیں۔

اول: مولانا مملوک علی نے کبھی سیاسیات میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری۔ سیاسی معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

دوم: مولانا مملوک علی انگریزی حکومت کے باقاعدہ ملازم تھے۔ وہ انگریز کی مخالفت کیونکر کر سکتے تھے۔

سوم: دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپل ان کے مداح تھے جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے۔ ان کی تدریسی اور تعلیمی سرگرمیوں کی بنا پر ان کی ترقی ہوئی، تنخواہ میں اضافہ ہوا، اور یہ سب انگریز منصب داروں کی سفارش سے ہوا۔ خود ہندوستان کے گورنر جنرل (یعنی وائسرائے) نے ان کو انعام و اکرام اور خلعت سہ پارچہ سے نوازا۔ اگر یہ سیاسیات ملکی میں ملوث ہوتے تو انھیں ہرگز اس کا مستحق نہ گردانا جاتا۔

ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ اسی عالم دین کو ''بڑا عالم'' سمجھا جاتا ہے جو انگریزی حکومت کا مخالف رہا ہو۔ اگر مخالفت کا کوئی واضح ثبوت نہ مل سکے تو اس کے معتقدین کھینچ تان کر اس کو انگریز کا مخالف ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسیات کبھی علم اور قابلیت کے حدود کو ماپنے کا پیمانہ نہیں رہی۔ اگر ایک شخص

❶ ''مولانا محمد احسن''، ص ۶۷ا بحوالہ دہلی کا آخری سانس ص ۴۶۔

سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور وہ اپنی ذہنی وفکری صلاحیتوں کا محور ومرکز صرف خدمت علم و دین کو قرار دیتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔؟ ہر شخص کو سیاست کی عینک سے دیکھنا ایک سیاست دان ہی کی سوچ ہو سکتی ہے، کسی محقق اور اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے والے کی سوچ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر مولانا مملوک علی اور اس دور کے بہت سے دیگر علمائے کرام نے اپنے عہد کی سیاست میں حصہ نہیں لیا تو کیا ان کے علم میں کوئی کمی واقع ہو گئی؟ وہ وقتی سیاسی ہنگاموں سے دلچسپی نہ رکھنے اور انگریزی حکومت کی ملازمت کے باوجود جلیل القدر عالم تھے اور ان کی خدماتِ علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ لہٰذا اس ضمن میں نہ کوئی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے، نہ ان کو کھینچ کر سیاسیات کے اکھاڑے میں لانے کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سیاسی ہنگاموں سے دور رکھا اور درس و تدریس میں مشغول رہ کر بڑے بڑے اصحاب علم کو زیور علم سے آراستہ کیا اور ''استاذ العلما'' کا لقب پایا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کسی سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اس کے انتظام کے لیے نہ کوئی بورڈ بنایا گیا تھا اور نہ کوئی اس کا رکن یا صدر تھا اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی بات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

اخلاق و کردار:

مولانا مملوک علی بلند اخلاق اور عالی کردار عالم تھے۔ تواضع، حلم، بردباری اور انکسار کا پیکر تھے۔ علم کے خادم اور علما کے قدردان تھے۔ طلبا سے حسن سلوک سے پیش آتے اور عمدہ انداز سے ان کو پڑھاتے تھے۔ تصنع اور تکلف سے انھیں نفرت تھی، سادہ لباس پہنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے۔ وعظ و تقریر کی بالکل عادت نہ تھی، ان کا اصل کام درس و تدریس تھا اور تمام عمر اسی میں مشغول رہے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) مخلصانہ تعلقات تھے۔ مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی مولانا محمد یعقوب نانوتوی اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''جب مولوی مظفر حسین کاندھلوی صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم (مولانا مملوک علی) کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن (نانوتہ) جاتے، کاندھلہ ہو کر جاتے۔ جب وطن لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا[1]۔

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے، جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی' ص ۱۲۔

گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اول یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے؟ اگر کہا کھا چکے تو کچھ نہیں اور اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا۔ تو مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوادوں؟ چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ رکھا ہوا لا دو۔ اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی، اسی کو لے آئے اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ بس یہی کافی ہے۔ پھر جب رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا❶۔

بلاشبہ یہ حضرات خلوص ودیانت، نرمی وانکسار اور الفت ومودت کا نمونہ تھے اور ان کی حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ ذکر الٰہی اور خدمت علم وعلما میں گزرتا تھا۔ اب دنیا اس قسم کے سراپا عمل لوگوں سے خالی ہوگئی ہے اور ہر طرف مادیت کا دور دورہ ہے۔ اندازہ فرمایے مولانا مملوک علی انگریزی حکومت کے وفادار ملازم تھے اور انھیں جبراً انگیز مخالفت سیاست میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

تراجم:

مولانا مملوک علی کے شب وروز درس وتدریس میں بسر ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے گرد حصول علم کے شائقین کا مجمع رہتا تھا۔ تصنیف وتالیف سے انھیں دلچسپی بھی نہ تھی اور اس کے لیے فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ البتہ دہلی کالج کی طرف سے جن کتابوں کا کسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرایا جاتا تھا، ان میں سے زیادہ تر کی نگرانی ان کے سپرد تھی اور ان پر نظر ثانی بھی وہی کرتے تھے۔ کالج کے زمانے میں انھوں نے جن کتابوں کے خود ترجمے کیے وہ مندرجہ تحت ہیں:۔

۱۔ جامع ترمذی: یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ لہٰذا انھوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ تحریر اقلیدس: دہلی کالج کے ایک انگریز پرنسپل کے کہنے پر ۱۸۴۴ء میں اس کے ابتدائی چار مقالوں اور آخر کے دو مقالوں (گیارھویں اور بارھویں) کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مولوی کریم الدین پانی پتی اس ترجمے کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’ترجمہ اردو زبان میں پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا۔‘‘

یہ کتاب صرف دو مرتبہ چھپی۔ ۱۸۴۹ء میں ایک سو پچاس کاپیاں اور ۱۸۵۱ء میں تین سو کاپیاں طبع ہوئیں۔

۳۔ تاریخ یمینی: یہ کتاب بھی دہلی کالج میں داخل نصاب تھی۔ مولانا ممدوح نے اس کا بھی اردو ترجمہ کیا۔

۴۔ عربی خط (غیر منقوط) مولوی کریم الدین پانی پتی نے ’’فرائد الدھر‘‘ میں ان کا ایک عربی خط نقل کیا ہے جو غیر منقوط ہے اور شہزادہ فیروز شاہ کے نام ہے❷۔

---

❶ حالات مشائخ کاندھلہ ص ۳۴، ۳۵۔

❷ ’’مولانا محمد احسن نانوتوی‘‘ ص ۱۸۸۔

وفات:

دیار ہند کے اس عالم دین پر مرض یرقان کا حملہ ہوگیا تھا۔ گیارہ دن اس مرض میں مبتلا رہے اور ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷/ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو عالم جاودانی کی راہ لی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی قبرستان مہندیوں میں شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پائیں میں دفن ہوئے۔ انھوں نے دہلی میں علم حاصل کیا۔ دہلی میں ہمیشہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور دہلی ہی کی سرزمین میں ابدی نیند سوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دہلی کالج کے پرنسپل نے ۱۳/ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو مولانا کے انتقال کی اطلاع مجلس انتظامیہ کو دی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی:

مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے فرزند گرامی تھے۔ انھوں نے بھی باپ کی طرح بڑی شہرت پائی اور بہت تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ/ ۲ جولائی ۱۸۳۳ء کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ محرم ۱۲۶۰ھ/ فروری ۱۸۴۴ء میں جب کہ ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی ان کو اور مولانا محمد قاسم کو مولانا مملوک علی بغرض تعلیم نانوتہ سے دہلی لے گئے تھے۔ محمد یعقوب دہلی کالج کے طالب علم رہے اور علوم متداولہ اپنے والد (مولانا مملوک علی) سے پڑھے۔ علم حدیث کی تحصیل شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے لی۔ باپ کی وفات کے بعد تقریباً ایک سال اپنے مکان (کوچہ چیلاں، دہلی) میں رہے۔ اس کے بعد چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر گورنمنٹ کالج اجمیر میں معلم ہوگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ پانچ سال وہاں رہے۔ بعد ازاں سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ اس دوران میں وہ اپنے وطن نانوتہ میں مقیم رہے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو دارالعلوم (دیوبند) قائم ہوا تو اس میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے چھاپہ خانہ میں ملازم تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے وہ سب سے پہلے صدر مدرس تھے اور تنخواہ تیس روپے ماہانہ تھی۔ انیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبا نے ان سے حصول علم کیا جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اہل علم میں معروف ہوئے۔

باپ کی طرح مولانا محمد یعقوب بھی زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ تصنیف تالیف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریری صورت میں ان کی صرف تین چیزیں دست یاب ہیں:۔ (۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) مکتوبات مولانا محمد یعقوب (حصہ اول) اور (۳) مکتوبات یعقوبی و بیاض یعقوبی۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب نے ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۱ دسمبر ۱۸۸۴ء) کو ہیضے کی بیماری سے اپنے وطن نانوتہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

تذکرہ نگاروں کا اظہار عقیدت:

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب ''آثار الصنادید'' لکھی' اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے۔ وہ مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''شاگرد رشید مولوی رشید الدین خان صاحب' علم معقول و منقول میں استعداد کامل' اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کی لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطہ تقریر سے افزوں۔ اگرچہ زیّ دنیاداروں کی ہے، لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ...... اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسی اول اس سے عبارت ہے۔ انشاءِ نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے۔ اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا ❶۔

''واقعات دار الحکومت دہلی'' کے مصنف بشیر الدین احمد تحریر کرتے ہیں ''شیخ عبدالعزیز صاحب شکر بار کے پائیں میں آپ کی قبر کچی ہے۔ جب تک کوئی نہ بتائے نہیں مل سکتی۔ ناقدردانیٔ زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اُتنا بھی نہ کیا کہ ایک ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے والے فاتحہ تو پڑھ لیتے۔ آپ کا اصل وطن نانوتہ ضلع سہارن پور ہے مگر جب سے دلی میں مدرس ہوئے آب و دانہ کی کشش نے جانے نہ دیا۔ آپ مولانا رشید الدین خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے ❷۔

نواب صدیق حسن خاں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''از اعیانِ دہلی بودند، تلمذ ایشاں در علومِ درسیہ با مولوی رشید الدین خاں است، و از طرفِ فرنگیاں تدریس درجہ اول مدرسہ دہلی بایشان تعلق داشت ❸۔

یعنی وہ (مولانا مملوک علی) دہلی کے اکابر میں سے تھے اور علوم درسیہ میں مولانا رشید الدین خاں کے شاگرد تھے۔ مدرسہ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جماعت اول (عربی) پڑھانے کے لیے مقرر تھے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی جو مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، استاد کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال

---

❶ آثار الصنادید' ص ۲۹۲۔

❷ واقعات دار الحکومت دہلی' ج ۲' ص ۵۸۴۔

❸ تاریخ قنوج (قلمی) از نواب صدیق حسن ص ۱۰۰ (مرتبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء) مخزونہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ حبیب گنج کلکشن۔

رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے۔ گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے۔ اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو❶۔

مولوی کریم الدین پانی پتی نے اپنی ایک اور کتاب ''تذکرہ فرائد الدہر'' میں بھی مولانا مملوک علی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا تمام وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا اور سیکڑوں طلبا ان سے تعلیم پاتے تھے۔ جو طالب علم بھی حصول علم کے لیے آتا' وہ اس کو مایوس نہ کرتے اور اس کے دل کو رنج نہ پہنچاتے۔ پوری وسعت قلب اور حسن اخلاق سے پیش آتے اور اسے وہ علم پڑھاتے جو وہ پڑھنا چاہتا۔ گھر میں بھی اور مدرسے میں بھی ان کے گرد طلبا کا ہجوم رہتا۔ اس ضمن میں مولوی کریم الدین کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

''گھر اس کا محیط الرجال طلبا' مدرسہ اس کا مجمع علما و فضلا، صدہا شاگرد اس ذاتِ بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے...... سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں...... تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلبا میں نصف شب تک منقسم ہیں ـــــ ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف و جوار میں سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں❷۔

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں مولانا رشید احمد گنگوہی بھی شامل ہیں۔ مولانا گنگوہی کے حالات میں مولانا عاشق علی میرٹھی نے ''تذکرۃ الرشید'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ مولانا مملوک علی کے اسلوب تدریس کے بارے میں مولانا گنگوہی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

''ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے، لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کر لیں۔ گویا استاد نے گھول کر پلا دیا' (مولانا گنگوہی) فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے۔ مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ایک ہمارے استاد مولانا مملوک علی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے❸۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی تھے اور اپنے دور کے جید عالم تھے' اپنے

---

❶ تذکرۂ طبقات الشعرائے ہند' ص ۴۶۳۔

❷ تذکرۂ فوائد الدہر' ص ۴۰۲۔

❸ تذکرۃ الرشید' ج ا ص ۳۰' ۳۱۔

والد مکرم کے اسلوب تدریس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے تھے یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں ❶۔''

سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔

''مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی، شیخ اور عالم کبیر تھے۔ مولانا رشید الدین خان دہلوی کے شاگرد تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے، منطق و فلسفہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ تمام عمر درس و تدریس میں مشغول رہے اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا ❷۔''

مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:

''انھوں (مولانا مملوک علی) نے مولانا رشید الدین سے اخذ علم کیا اور علوم عربیہ، فقہ اور فنون کے حصول میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیے گئے ❸۔''

۱۰۷- ملا مہدی مازندرانی

ہندوستان کے شیعہ علما وفقہا میں ملا مہدی بن محمد شفیع استر آبادی مازندرانی اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا مولد ومنشا ایران کا ایک شہر مازندران ہے۔ سید علی طباطبائی اور بعض دیگر اہل علم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء کو غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں لکھنؤ پہنچے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ یہ لکھنؤ میں شاہان اودھ کا دور تھا اور بہت سے اہل سنت اور شیعہ اصحابِ علم وہاں موجود تھے اور ان کے باہم مباحثے اور مناظرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ملا مہدی نے ان مباحث ومناظرات میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ایک فاضل مجتہد تھے اور سب علائق سے منقطع ہوکر تدریس وتصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ ان کا گھر ہی ان کا مدرسہ تھا اور وہیں طلبا کو مختلف علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے اور گھر ہی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ

❶ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص ۱۸۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۸۷۔

❸ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۸۱۔ مولانا سندھی کا یہ کہنا درست نہیں کہ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خان کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی کو ایک ساتھ ہی یہ منصب تفویض کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مولانا رشید الدین خان کو شعبہ عربی کا صدر مدرس بنایا گیا تھا۔ اور سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ مولانا مملوک علی کا تقرر نائب مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا اور تنخواہ پچاس روپے تھی۔ تاریخ تقرری یکم جون ۱۸۲۵ء ہے۔

جاری تھا۔ عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ کسی کے ہاں آمد و رفت تھی۔

ملا مہدی مازندرانی نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ قاطیس العقول فی قواعد الاصول۔

۲۔ بناریس الفرعیات فی نوا میس الشرعیات۔

۳۔ حاشیہ مطول۔

۴۔ اصول دین سے متعلق ایک رسالہ جو فارسی زبان میں ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بعض رسائل بھی تحریر کیے جو ان کے دور میں کافی مشہور ہوئے اور اہل علم کے مطالعے میں رہے۔

اس شیعہ مصنف وفقیہ نے ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ/ دسمبر ۱۸۴۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور قبرستان حسینیہ مجتہد میں دفن ہوئے ❶۔

۱۰۸- سید مہدی لکھنوی

سید مہدی لکھنوی شیعہ عالم وفقیہ تھے اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: مہدی بن ہادی بن مہدی بن دلدار علی حسینی لکھنوی۔

سید مہدی اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے اور مجتہد کے درجے پر فائز تھے۔ اپنے زمانے کے فاضل شخص تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے آباو اجداد علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ اپنے والد مکرم (سید ہادی) سے حصول علم کیا اور والد کے عم محترم سید محمد بن دلدار علی سے سند لی۔

سید مہدی تقریر و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے صرف دو کتابوں کا پتا چل سکا ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تحفۃ الصائم۔

۲۔ رسالہ فی الاجتھاد والتقلید۔

سید مہدی حسینی لکھنوی نے اپنے والد سید ہادی کی وفات کے دو سال بعد ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء کو لکھنو میں وفات پائی ❷۔

---

❶ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۸۱۔ مولانا سندھی کا یہ کہنا درست نہیں کہ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خان کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی کو ایک ساتھ ہی یہ منصب تفویض کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مولانا رشید الدین خان کو شعبہ عربی کا صدر مدرس بنایا گیا تھا۔ اور سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ مولانا مملوک علی کا تقرر نائب مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا اور تنخواہ پچاس روپے تھی۔ تاریخ تقرری یکم جون ۱۸۲۵ء ہے۔

❷ نجوم السماء ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۹۰، ۴۹۱

ـــ ن ـــ

۱۰۹- سید ناصر حسین جون پوری

صوبہ یو پی کا شہر جون پور کسی زمانے میں اہل علم کا مسکن تھا۔ اس میں جہاں اہل سنت کے علما کثیر تعداد میں فروکش تھے، وہاں شیعہ علما بھی آباد تھے۔ اس شہر کو "شیراز ہند" کہا جاتا ہے' اس لیے کہ مختلف اوقات و ادوار میں بے شمار مصنفین و مؤلفین، متعدد مدرسین و معلمین اور بہت سے فقہا و علما اس میں اقامت گزین رہے۔ ہر مسلک و مذہب کے اصحابِ کمال یہاں جمع ہو گئے تھے۔

تیرھویں صدی ہجری میں جن علما و فقہا نے اس شہر کو رونق بخشی' ان میں ایک عالم و فقیہ سید ناصر حسین تھے جو سید مظفر حسین حسینی جون پوری کے فرزند تھے اور نامور شیعہ عالم تھے۔

سید ناصر حسین حسینی جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر کے ممتاز عالم مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری سے پڑھیں اور بعض کی تکمیل مولانا عبدالعلیم انصاری لکھنوی سے کی۔ پھر جون پور کے ایک ممتاز شیعہ عالم گلشن علی کے درس میں حاضر ہوئے۔ ان سے شیعہ امامیہ کی فقہ اور علم کلام سے متعلق کتابوں کی تکمیل کی۔

اس کے بعد لکھنؤ گئے، وہاں سید محمد تقی کا سلسلۂ درس جاری تھا جو اس دور کے شیعہ مجتہد تھے' ان سے اخذ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور سعادت حج حاصل کی۔ وہاں سے عازم عراق ہوئے اور مختلف مقامات میں گھومے پھرے۔ بعد ازاں ہندوستان آئے۔

سید ناصر حسین نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ علم الادب فی مناهج کلام العرب: یہ عربی محاورات سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔

۲۔ ایک رسالہ عربی ادب کے بارے میں ہے۔

۳۔ رشق النبال:۔ یہ اثبات متعہ اور تحریف قرآن سے متعلق ہے۔

۴۔ ایک رسالہ میلاد النبی ﷺ سے متعلق اردو میں ہے۔

۵۔ ایک رسالہ آیت تطہیر کی تفسیر میں۔ اردو میں

۶۔ ایک رسالہ نجاست مشرکین کے اثبات میں ہے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے۔

۷۔ اہل بیت کے مصائب و آلام کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب اردو میں۔

ان کے علاوہ کچھ اور رسائل بھی تحریر کیے ❶۔

❶ تجلی نور ج ۲ ص ۸۱ تا ۸۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۷، ۳۸، ۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۹۳، ۴۹۴۔

۱۱۰- سید نثار علی ظفر آبادی

سید نثار علی بن محمد صادق حسینی واسطی ظفر آبادی، معروف عالم اور ممتاز محدث تھے۔ ان کی ولادت و تربیت ظفر آباد میں ہوئی جو جون پور کے قریب صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے۔ ابتدائی کتابیں ظفر آباد اور جون پور کے اساتذہ سے پڑھیں، پھر الہ آباد گئے، وہاں شاہ خوب اللہ کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور شاہ صاحب سے استفادہ کیا۔ شاہ برکت اللہ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی گئے۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا زمانہ تھا اور دہلی کو اس عہد میں گہوارۂ علم کی حیثیت حاصل تھی۔ سید نثار علی نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور چار سال ان کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے شاہ صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ تکمیل علم کے بعد اپنے شہر جون پور گئے اور درس وافادہ کی مسند بچھائی۔ بہت سے علما وطلبا ان سے مستفید ہوئے اور ان کی شہرت مختلف مقامات میں پھیل گئی۔

سید نثار علی حدیث وفقہ کے جید عالم تھے اور فلسفہ ومنطق میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ متواضع، حسن اخلاق سے مالا مال، شیریں گفتار اور عالی کردار تھے۔ لوگوں سے نہایت اچھے مراسم رکھتے تھے اور سب سے حسن ظن کا اظہار کرتے تھے۔

اس عالم کبیر نے جمعۃ المبارک کے دن ۲۷ شوال ۱۲۱۵ھ/۱۲/ مارچ ۱۸۰۱ء کو ''میاں پورہ'' میں وفات پائی جو اعمالِ الہ آباد میں ایک گاؤں ہے۔ (۱)

۱۱۱- قاضی نجم الدین علی خاں ثاقب علوی کاکوروی

سلطنت مغلیہ کے دور زوال کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو انھیں ایسے علما وفقہا کی تلاش تھی جو ''مسلم پرسنل لا'' تیار کر کے مسلمانوں کے فقہی مسائل کو ان کے ذہن وفکر کے مطابق نافذ کر سکیں۔ اس عہد کا ہندوستان اپنے علم وفضل میں مشہور تھا۔ خصوصاً صوبہ اودھ کے قصبات و دیہات کو اس ضمن میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ اسی صوبے کے مشہور ومردم خیز قصبہ کاکوری کے ایک عالم دین پر ان کی نظر پڑی اور انھیں قاضی القضاۃ کا منصب عطا کیا گیا۔ ان کا کام قرآن وحدیث اور فقہ کے ائمہ اربعہ کے فتووں کی روشنی میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کے فیصلے کرنا تھا۔ اس عالم وفقیہ کو ''قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاں علوی بہادر اشرف جنگ ثاقب کاکوروی'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

عہد اکبری سے قصبہ کاکوری (ضلع لکھنو) میں علویوں کے دو ممتاز خاندان آباد ہیں جن میں ایک خاندان مخدوم زادگان کا ہے جس کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم نظام الدین القاری المعروف بہ شاہ بھکاری کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ دوسرا خاندان ملک زادوں (مولوی زادوں) کا ہے جس کے نسب کا سلسلہ

(۱) تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۹۷۸، ۹۷۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۹۴۔

ملک بہاء الدین کیقباد بن ملا ابوبکر جامی کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں میں ہر دور میں بڑے بڑے مشاہیر فضلا و علما، فقہا و فقرا، ارباب دولت اور صاحبانِ دل پیدا ہوئے ہیں۔

نام و نسب:

قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ملک زادگان کے اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف جس قدر باعث رشک ہوئے، اسی قدر اس کے اخلاف قابل فخر ہوئے ہیں۔ سلسلۂ نسب تیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے: نجم الدین علی خاں ثاقب (۱) بن ملا حمید الدین محدث رحمہ اللہ (۲) بن ملا غازی الدین شہید (۳) بن ملا محمد غوث (۴) بن ملک ابوالخیر (۵) بن ملک عبدالغفار معروف بہ ملک ابوالمکارم (۶) بن ملک عبدالسلام (۷) بن ملک مٹھے (۸) بن ملک حافظ چاند (۹) بن ملک حسام الدین (۱۰) بن ملک نظام الدین (۱۱) بن ملک بہاء الدین کیقباد (۱۲) بن ملا ابوبکر جامی ❶ (۱۳) بن خواجہ درویش علی محمد (۱۴) بن خواجہ شیخ احمد جام زندہ فیل (۱۵) بن خواجہ شیخ جامی (۱۶) بن خواجہ ابو طالب جامی (۱۷) بن خواجہ محمد شاہ جامی (۱۸) بن خواجہ محمد رضا جامی (۱۹) بن خواجہ موسیٰ جامی (۲۰) بن خواجہ عمران جامی (۲۱) بن خواجہ عثمان (۲۲) بن خواجہ ابوحنیف (۲۳) بن خواجہ اسفند یار (۲۴) بن خواجہ ابوالحسن کوفی (۲۵) بن خواجہ ابوتراب (۲۶) بن خواجہ محمد رضی کوفی (۲۷) بن خواجہ محمد (۲۸) بن حضرت ابوالقاسم (۲۹) بن حضرت محمد ابن الحنفیہ (۳۰) بن حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

ولادت اور تعلیم:

قاضی نجم الدین کی ولادت ۱۵ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ (۱۷ اپریل ۱۷۴۴ء) کو کاکوری میں ہوئی۔ مادہ سال ولادت کسی نے نجم ثاقب نکالا ❷۔

تعلیم اپنے والد ماجد ملا حمید الدین محدث (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء) ملا حسن فرنگی محلی اور مولانا غلام یحییٰ بہاری سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے ذہین و طباع تھے۔ صاحب سفر نامہ لندن رقم طراز ہیں کہ: ''پندرہ برس کی عمر میں معقولات و منقولات کی کتابوں سے فارغ ہوئے ❸۔ علم حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی سے حاصل تھی ❹۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے بارے میں جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے۔

---

❶ ملا ابوبکر جامی کی شادی ملک اسعد الدین سالاری وزیر اعظم سلطان حسین شرقی فرماں روائے سلطنت جون پور کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، جن کے بطن سے بہاء الدین کیقباد پیدا ہوئے۔ اس وقت سے ننہیالی نسب کے لحاظ سے ان کا لقب ملک قرار پایا۔ اسی بنا پر ان کی اولاد ملک زادے کہلائی۔

❷ باقیات الصالحات۔ مولوی ممتاز الدین حیدر (مخطوطہ)

❸ سفر نامہ لندن۔ مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ (مخطوطہ) ۳۶۴۔

❹ تذکرۂ مشاہیر کاکوری۔ حافظ شاہ علی حیدر قلندر۔ ص ۴۳۷۔

’’شیخ و فاضل قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ہندوستان کے مشہور علما میں سے تھے۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۴۴ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر شیخ عبدالرشید جون پوری سے جو لکھنؤ میں مدفون ہیں اور شیخ غلام یحییٰ بن نجم الدین بہاری اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی سے تحصیل علم کی اور شاید فنون ریاضی کا اکتساب علامہ تفضل حسین کشمیری (م ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء) سے کیا تھا[1]۔

علم و فضل:

قاضی نجم الدین یوں تو تمام علوم و فنون میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے لیکن علم جفر و رمل اور ریاضی میں بڑی دست گاہ تھی۔ سفر نامہ مولوی مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ[2] اودھ کے مندرجہ ذیل واقعے سے آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

’’نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ تا ۱۷۷۵ء) کو خود علم جفر کا بڑا شوق تھا۔ نواب مذکور کو اتفاق سے اس فن میں حکیم ماشاء اللہ خاں سے ایک کتاب مل گئی تھی، جسے وہ نہایت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی تصحیح کے لیے فیض آباد اور فیض آباد سے باہر کے علما مقرر ہوئے۔ مگر کسی سے اس کی صحت نہ ہو سکی۔ قاضی القضاۃ نجم الدین صاحب کو بھی اس کی تصحیح کے لیے طلب کیا گیا۔ انھوں نے محض یادداشت پر اس کی تصحیح شروع کر دی اور ساتھ ہی ایک بسیط شرح بھی لکھنی شروع کر دی۔ خود نواب موصوف روزانہ آ کر اس کو دیکھتا اور بہت خوش ہوتا۔ اکثر یہ ہوتا کہ نواب کو آتے دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو جاتے مگر وہ باصرار ان کو بٹھا دیتا اور خود کھڑے ہو کر ان کا کام دیکھتا رہتا۔ نواب نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب کسی کو معافی نہ دی جائے گی، چنانچہ جن جن اشخاص کو معافیاں دی گئی تھیں وہ بھی ضبط کر لی گئیں۔ ملا حمید الدین محدث کاکوروی کو بھی ایک موضع موسومہ ’’دگھیا‘‘ معاف ہوا تھا، وہ بھی ضبط ہو گیا۔ قاضی القضاۃ نجم الدین نے اپنے حسن خدمت اور کارگزاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے معافی کی درخواست دی۔ بظاہر اس موضع کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن نواب نے ان کی ذاتی لیاقت اور حسن عمل کی بنا پر وہ موضع دوبارہ معافی میں دے دیا۔ چنانچہ یہ معافی کا پروانہ لے کر گھر آئے اور حسب دستور سابق درس و تدریس میں مشغول ہو گئے[3]۔

قاضی نجم الدین علی خاں کے علم و کمال کا شہرہ سن کر الماس علی خاں نے ان کو اپنے مدرسے کا منصب مدرسی قبول کرنے کو کہا، جسے انھوں نے قبول کر لیا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۹۷۔

[2] حاجی مسیح الدین خان (بن قاضی علیم الدین خان بن قاضی القضاۃ نجم الدین علی خان) سفیر شاہ اودھ و میر منشی گورنر جنرل بہادر (م ۱۲۹۲ھ) کا یہ سفر نامہ اس عہد کے اودھ کی حالت اور انگریزوں کے مستند و دلچسپ حالات میں ایک نادر و نایاب مخطوطہ ہے۔ چودہ سو صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کے ایک باب میں مولف موصوف نے اپنے اہل خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔

[3] سفر نامہ لندن، ص ۵۔۳۶۴۔

منصب قاضی القضاۃ:

تذکرہ مشاہیر کاکوری میں مرقوم ہے کہ ''آغاز تیرھویں صدی ہجری میں منجانب ایسٹ انڈیا کمپنی جب عہدۂ قاضی القضاۃ پر تقرری کی تجویز کلکتہ میں ہوئی تو اس زمانے میں علامہ تفضّل حسین خان نے (جو آصف الدولہ بہادر ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے وقت میں کلکتہ میں سفیر تھے' ان کے فضائل و کمالات علمی کا تذکرہ گورنر جنرل بہادر سے کیا۔ اس وقت اس عہدے میں تقرر کا مسئلہ سرکار انگریزی میں درپیش تھا۔ بہت سے علما کے نام سامنے تھے، خوش قسمتی سے یہی منتخب ہو کر ممالک محروسہ سرکار کمپنی کے اول قاضی القضاۃ مقرر ہوئے ❶۔

انگریزوں نے ان کی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصب قاضی القضاۃ پر ان کو متعین کیا۔ علامہ تفضّل حسین خان نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں گورنر جنرل بہادر کے حکم سے تقرری کا خط بھیجا لیکن والد ماجد نے لائق بیٹے کو اتنی دور کلکتے نہ جانے دیا۔ مگر جب علامہ موصوف نے بہت اصرار کیا تو اجازت دے دی، چنانچہ آپ کلکتے پہنچے۔ اس زمانے میں سر جان شور گورنر تھا، وہ استقبال کے لیے آیا۔ قاضی صاحب کو خود پالکی سے اتارا اور معانقہ کیا۔ آپ جب تک وہاں رہے بڑی عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ گورنر جنرل عیدین کے مواقع پر خود ان کے پاس آتا اور معانقہ کرتا تھا ❷۔

باوجودیکہ آپ ایسے منصب پر فائز تھے جس سے درس و تدریس کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ لیکن کلکتے کے دوران قیام میں آپ نے یہ مشغلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ صاحب تذکرہ علمائے ہند آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:۔

بمنصب اقضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود، مع ہذا تدریس افادۂ طلبائے علوم بغایت می کوشید ❸۔

(باوجودیکہ کلکتہ کے قاضی القضاۃ کے منصب پر ممتاز تھے، لیکن درس و تدریس اور طالبان علم کے افادہ کے لیے کوشاں رہتے۔)

ہندوستان کے تمام صوبوں مثلاً اودھ، الٰہ آباد، اکبر آباد، اوڑیسہ، بنگال اور بہار اور ڈھاکہ وغیرہ تمام جگہوں پر آپ کے فتوے پر مسلمانوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ پچیس سال عہدۂ قاضی القضاۃ پر متمکن رہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے۔ اس کے بعد بہ سبب کبر سنی اس عہدے سے مستعفی ہوئے ❹۔

فولاہ القضاء الاکبر فاستقل بہ خمسا و عشرین سنۃ ❺۔

---

❶ تذکرۂ مشاہیر کاکوری' ص ۴۳۳۔

❷ سفرنامہ لندن' ص ۳۷۰۔

❸ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۳۳۔

❹ سفرنامہ' ص ۳۷۱۔

❺ نزہۃ الخواطر' ج ۷' ص ۴۹۷۔

(گورنر جنرل نے ان کو قاضی القضاۃ بنایا۔ اس عہدے پر وہ پچیس سال فائز رہے۔)

نواب علی حسن خان سلیم نے تذکرۂ صبح گلشن میں ان کے بارے میں جو کچھ فارسی میں لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

''ثاقب قاضی القضاۃ محمد نجم الدین خاں بہادر لکھنؤ سے دس میل کے فاصلے پر قصبہ کاکوری کے رئیس تھے۔ قرب و جوار کے تمام قصبات سے زیادہ یہاں صاحبان فضل و کمال و مردم خوش رفتار اور نیک کردار سچے لوگ تھے۔ آپ کے والد ملا حمید الدین علوم ظاہری و باطنی میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ دادا ملا محمد غوث صاحب فضل و کمال اور علم حدیث میں شہنشاہ عالم گیر کے استاد تھے اور آپ دنیاوی و دینی اعتبار سے نجم ثاقب تھے۔ اخلاق و کردار، علوم عقلیہ و نقلیہ، موزوں طبعی و سخن سنجی میں ممتاز تھے۔ کلکتے میں کوئی بھی اہل علم آپ کے مرتبۂ قاضی القضاۃ پر نہ پہنچا۔ آخر عمر میں عہدۂ قضا سے مستعفی ہو کر تین سو روپے ماہوار پنشن قبول کر کے قناعت کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلکتے سے وطن روانہ ہوئے۔ راستے میں بنارس کے قریب گویا عالم قدس سے یہ آواز سنی کہ اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف جا۔ ناچار اجل موعود کے تقاضے سے وطن اصلی کی طرف رخ پھیرا۔ یہ واقعہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کا ہے ❶۔

لیاقت اور حسن انتظام کی بنا پر آپ کی وفات کے بعد اعزاز خطاب اور کل تنخواہ بطور پنشن ملی اور پھر آپ کی اہلیہ کو وہ پنشن ملتی رہی ❷۔

گورنر جنرل کا تعزیتی خط:

گورنر جنرل بہادر نے قاضی نجم الدین کی وفات پر ان کی اہلیہ کو تعزیتی خط لکھا۔ اس تعزیتی خط سے آپ کی وہ قدر و منزلت جو ان کے دلوں میں تھی مترشح ہوتی ہے۔

خط یہ ہے: آپ کے شوہر قاضی القضاۃ بہادر کی وفات کا صدمہ سرکار دولت مدار کمپنی کو آپ سے کم نہیں ہوا کہ جس نے ایسے اپنے متمول اور لائق شخص اور فاضل بے بدل کو گم کیا، چونکہ کارخانۂ قضا و قدر میں بجز صبر اور تسلیم کے کوئی چارہ نہیں' لہٰذا یقین ہے کہ آپ بھی صبر جمیل اختیار کریں گی، اگرچہ آپ کے چاروں ❸ بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، آپ کو اپنے بسر اوقات میں احتمال تکلیف کا نہیں۔ مگر سرکار نے براہ قدردانی و نام آوری آپ کے شوہر کے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار آپ کی پنشن تا حین حیات مقرر کی ہے ❹۔

---

❶ تذکرۂ صبح گلشن' نواب علی حسن خاں سلیم' ص ۹۷۔

❷ بیاض ڈپٹی امیر حسن صدیقی کاکوروی (مخطوطہ) ص ۳۸۳۔

❸ چاروں بیٹے یعنی (۱) ممتاز العلما قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر (۲) مفتی حکیم الدین خاں (۳) قاضی علیم الدین خاں (۴) مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ۔

❹ یہ پنشن پابندی سے آپ کی اہلیہ کو ان کی زندگی (۱۲۴۹ھ/۱۸۲۲ء) تک ملتی رہی۔ دیکھیے سفر نامہ لندن' ص ۳۷۲۔

تصانیف:

قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں نے درج ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں:

۱۔ شرح کتاب الجنایات والجرائم فتاوی عالم گیری: یہ بسیط شرح انھوں نے جناب گورنر جنرل کے ایماوفرمائش پر لکھی، تمام انگریزی عدالتوں میں جس قدر فیصلے ہوتے تھے وہ سب اسی شرح کی بنا پر ہوتے تھے۔ یہ شرح سرکار انگریزی کے حکم سے کلکتہ میں فارسی زبان میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ رسالۃ الستۃ الجبریہ فی الجبر و المقابلہ: اس رسالے میں اہم مسائل جبر ومقابلہ کا حل لکھا ہے اور خود ہی اس رسالے کی فارسی شرح بھی لکھی جو مع اصل متن کے کلکتہ سے طبع ہوئی۔

۳۔ رسالہ در بیان تناسب اعضائے انسانی۔

۴۔ رسالہ در بیان سعد ونحس۔

۵۔ شرح اخلاق جلالی۔

۶۔ رسالہ انساب۔

۷۔ کشکول موسومہ بہ بیاض رشک ریاض: یہ غیر مطبوعہ ہے۔ سفرنامہ لندن کے موئف لکھتے ہیں کہ افسوس ہے یہ بیاض چھپ نہ سکی ورنہ بڑی مفید عام تالیف ہوتی۔ کیونکہ اس میں متعدد علوم وفنون کے بہت سے بسیط مضامین ومباحث درج ہیں۔ اس میں ان کے عربی وفارسی اشعار اور قصاید بھی مرقوم ہیں۔ اس بیاض کو پندرہ محافل پر منقسم کیا گیا ہے۔ مثلاً محفل اول علم تفسیر سے متعلق اور محفل دوم علم حدیث سے متعلق ہے۔ ان تصانیف وتالیف کے علاوہ معقولات کی کتابوں پر ان کے حواشی بھی ہیں۔

عربی نثر بے تکلفی سے لکھتے تھے۔ عربی میں ان کا ایک مقالہ جو انھوں نے شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی ❶ کی وفات پر لکھا، نواب رضا حسن خاں علوی کاکوروی (۱۲۴۶ھ تا ۱۲۶۶ھ/۱۸۳۱ء/۱۸۵۰ء) نے مطارح الاذکیاء و ہدایۃ الاحباء (صفحہ ۷۷ تا ۸۰) پر نقل کیا ہے۔ اس مقالے سے جہاں نثر نگاری پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاریخ گوئی میں وہ کتنا ملکہ رکھتے تھے۔ تعمیہ سے تاریخیں ایسی عمدہ تالیف کرتے کہ انتہائی تعجب ہوتا۔ نمونۃً دو درج ذیل کی جاتی ہیں۔

---

❶ شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی، مولانا شاہ محمد فاخر الہ آبادی کے بیٹے اور مولانا شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے پوتے تھے۔ یکم محرم ۱۱۳۸ھ (۲۹۔ اگست ۱۷۲۵ء) کو پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری کی تعلیم مولانا برکت اللہ الہ آبادی سے حاصل کی۔ اپنے والد مکرم مولانا محمد فاخر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مثنوی نان وقلیہ (در جواب نان وحلوہ) اور بستان الحنفیہ نیز ایک فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے کہ عمرہ کر کے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ جب مقام تنعیم پر پہنچے تو ذیقعدہ کی آخری تاریخ ۱۱۸۷ھ/۱۱۔ فروری ۱۷۷۴ء کو وفات پا گئے۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی قبر کے داہنی جانب مدفون ہوئے۔ مولانا نجم الدین نے ان پر عربی میں درد ناک مقالہ لکھا اور ان کی تاریخ وفات بھی نکالی۔

آپ کے شیخ طریقت حضرت کلید عرفان سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی اور ان کی اہلیہ کا انتقال ایک ہی روز اور ایک ہی وقت ہوا۔ مولانا نجم الدین نے فاسکن انت و زوجك الجنة ابدا سے سال وفات ۱۱۹۶ھ نکالا۔ شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی رحمہ اللہ اور ان کی اہلیہ کے مرقد پر یہی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی ان کے برادر طریقت کی وفات ۱۲۲۱ھ میں ہوئی جس پر انھوں نے یہ تعمیہ تاریخ نکالی۔ ھو خالدا فی الجنات۔

شاعری:

قاضی القضاۃ نے اپنے صاحب زادوں اور مسبوق الذکر تالیفات کے علاوہ عربی اور فارسی کلام بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام اپنے اندر شوخی، لطافت، رقت قلب، سلاست، برجستگی لیے ہوئے ہے۔

معاصر علما کے نزدیک ان کا مقام بہت بلند تھا۔

وفات:

کلکتہ سے مستعفی ہو کر وطن آنے کا قصد کیا چنانچہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں بیمار پڑے اور بنارس پہنچ کر یکایک ۳ ماہ ربیع الاول روز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ/۴/اپریل ۱۸۱۴ء کو ۷۳ سال ۱۱ ماہ ۱۹ یوم کی عمر میں وفات پائی۔ چونکہ وصیت تھی کہ میری نعش منتقل نہ ہو لہذا وہیں باغ فاطمان میں دفن ہوئے ❶۔

تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر کے مؤلفین کا ماخذ ''مجمع العلما'' منظور الدین خاں علوی (مخطوطہ) ہے، اسی لیے صاحب نزہتہ الخواطر نے تحریر کیا ہے۔

مات یوم الثلاثاء لثلاث عشرة خلون من ربیع الثانی سنة تسع و عشرین و مائة و الف ❷۔

(۱۳/ربیع الثانی بروز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔)

صاحبِ تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں:۔

بروز شنبہ سیزدہم ربیع الثانی یک ہزار و دوصد و بست و نہ ہجری رحلت فرمود ❸۔

(۱۳/ربیع الثانی بروز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ/۴/اپریل ۱۸۱۴ء کو فوت ہوئے۔)

ڈپٹی امیر حسن صدیقی اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:۔

---

❶ سفر نامہ لندن، ص ۳۰۷۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری، ص ۴۳۷۔

❷ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۹۸۔

❸ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳۵۔

قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر مغفور نہایت زبردست فاضل اور بڑے ادیب، بلیغ اور صاحب تالیفات گزرے ہیں۔ ترجمہ فارسی ہدایہ کا جو بحکم گورنمنٹ کیا گیا تھا' آپ کی مشہور یادگار تالیف ہے۔ جب کلکتہ میں صدر عدالت قائم ہوئی آپ اودھ کے علما میں بذریعہ نواب آصف الدولہ اودھ منتخب ہو کر حسب الطلب گورنر جنرل کلکتہ بھیجے گئے۔ عہدہ قاضی القضاۃ بنگال اور ممالک مغربی و شمالی پر مامور ہوئے اور پچیس برس تک اپنی خدمت کو نہایت اعزاز اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا۔ آخر عمر میں پنشن حاصل فرما کر روانہ ہوئے اور بنارس میں پہنچ کر ۳ر ربیع الاول ۱۲۲۹ھ/ ۲۳ فروری ۱۸۱۴ء کو انتقال فرمایا اور مقام فاطمین میں دفن ہوئے [1]۔

آپ کی وفات پر مختلف لوگوں نے قطعہ ہائے تاریخ کہے' جن میں سے منشی فیض بخش علوی کاکوروی مولف "تاریخ بخش" اور مولوی فتح علی جون پوری کے قطعے شامل ہیں۔

اولاد:

قاضی نجم الدین کے چار صاحب زادے تھے جو سب کے سب آپ کے آئینۂ کمال اور الولد سر لابیہ کی صحیح و بین تصویر تھے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے لکھا ہے کہ آپ کے تین صاحب زادے ہوئے [2]۔ یہ درست نہیں ہے۔

ممتاز العلما قاضی محمد سعید الدین خان بہادر:

۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۶ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد قاضی القضاۃ نجم الدین خاں، ملا عماد الدین لبکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنی سے حاصل کی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد قاضی مقرر ہوئے۔ تمام اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ بغیر آپ کے فتوے کے فوج داری مقدمات کے حکم کا نفاذ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے علم و فضل، معاملہ فہمی' ذکاوت طبع کی بنا پر حکام اعلیٰ کی نظروں میں بڑی وقعت تھی۔ ۱۵ شعبان ۱۲۲۱ھ/ ۲۸ر اکتوبر ۱۸۰۶ء سال یکم جلوس کو ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی نے ممتاز العلما و خان بہادر کا خطاب دیا۔ پھر اپنی قابلیت کی بنا پر انگریزی حکومت کی جانب سے خورد سال نواب فرخ آباد کے ہاں چھ سو روپیہ ماہوار پر نائب مقرر ہوئے۔

شعر و سخن کا ذوق بڑا اعلیٰ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۱ر ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۷ر جولائی ۱۸۴۶ء کو کاکوری میں وفات پائی اور اپنے مکان محلہ قاضی گڑھی کے قریب دفن ہوئے۔

مفتی حکیم الدین خاں:

آپ قاضی القضاۃ کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔

---

[1] بیاض' ص ۳۸۳۔

[2] تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۳۵۔

جملہ علوم کی تکمیل اپنے والد اور ملا عماد الدین لبکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنی سے کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ ججی میں سررشتہ دار ہوئے۔ پھر صدر امینی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد عہدۂ صدر الصدوری سے پنشن لے کر کاکوری میں مستقل قیام کیا۔ مطالعے کا بہت شوق تھا۔ انتقال کے وقت بھی ہدایہ کی شرح فتح القدیر پاس تھی۔ ۱۰/ جمادی الاولی بروز شنبہ ۱۲۶۹ھ (۱۲/ مارچ ۱۸۵۳ء) کو وفات پائی اور اپنی والدہ کے حظیرہ واقع محلہ کھاری کنواں چاند محل کاکوری میں جانب مغرب دفن ہوئے❶۔ آپ کے صاحب زادے محی الدین خاں ذوق نے تاریخ کہی:

الحق آں قبلہ دیں قدوہ خاصان خدا ۔۔۔ زیں جہاں بار سفر بست سوئے دار بقا
۱۸۵۳ھ ۔۔۔ ۱۲۶۰ف

کلک ماسال وفاتش بہ صدا آلام بنشست ۔۔۔ روز شنبہ دہم از شہر جمادی الاولی
سمت ۱۹۰۹ء ۔۔۔ ۱۲۶۹ھ

قاضی علیم الدین خاں:

خلف سوم قاضی القضاۃ نجم الدین، اپنے عہد کے جید عالم تھے، کتب درسیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد اور مولانا عبدالواجد خیر آبادی، مولوی فضل اللہ نیوتنی اور ملا عماد الدین لبکنی سے کی۔ کچھ عرصہ عدالت میں مفتی رہے۔ پھر قاضی مقرر ہو گئے، جس وقت قضا کا محکمہ تخفیف میں آیا تو دیانت داری، ذہانت وذکاوت، قوت استعداد کامل اور حسن کارکردگی کے صلے میں صدر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ بیشتر وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ ۱۷/ ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ (۱۲/ جولائی ۱۸۴۲ء) کو کاکوری میں وفات پائی اور اپنے بھائی مفتی حکیم الدین خاں کے پہلو میں دفن ہوئے❷۔

مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ:

یہ قاضی نجم الدین کے چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۳ھ/ (۹-۱۷۸۸ء) کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ بدو شعور ہی سے بہت ذہین وطباع تھے۔ کچھ درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے اور متوسطات اور انتہائی کتابیں مولوی روشن علی جون پوری سے پڑھیں۔ اپنے والد کے ہمراہ کلکتے بھی رہے۔

قاضی نجم الدین نے فتاویٰ عالم گیری کی کتاب الجنایات والجرائم کی شرح گورنر جنرل کی فرمائش پر مرتب کی تو بیٹے (مفتی خلیل الدین خاں) نے ممبر کونسل مسٹر ہاملٹن کی فرمائش پر جو قاضی نجم الدین خاں کا علوم عربیہ میں شاگرد تھا، درمختار کے باب التعزیرات کی شرح فارسی میں لکھی۔ باپ بیٹے کی یہ دونوں شرحیں گورنر جنرل کے حکم سے طبع ہوئیں۔

❶ سفر نامہ لندن، ص ۲-۲۷۳۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری، ص ۱۳۲۔

❷ سفر نامہ لندن، ص ۳-۲۷۳۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری، ص ۹-۲۸۷۔

مفتی خلیل الدین خاں کو عربی کی نثر نگاری میں بڑا ملکہ تھا۔ علوم حکمت و ریاضی اور ہیئت و فلکیات کے ماہر تھے۔ حکام اعلیٰ نے ان کو بطور (ضلع کانپور) میں عہدۂ قضا پر متمکن کر دیا تھا۔ نہایت ذہین اور لائق تھے۔ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) کو اڑتیس سال کی عمر میں غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۷ء) کے عہد میں پانچ ہزار روپے ماہوار پر سلطنت اودھ کے عہدۂ سفارت سے سرفراز ہوئے۔ مفتی ممدوح نے بہت سے رفاہ عامہ کے کام کیے۔ تقویٰ و زہد کی نعمت سے بھی متمتع تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:۔

۱۔ شرح باب التعزیرات در مختار: فارسی

۲۔ رسالہ فی تحقیق مرض ھیضہ: عربی

۳۔ مراۃ الاقالیم: علم ہیئت کے قواعد سے متعلق غازی الدین حیدر کی فرمائش پر فارسی میں تحریر کی۔

۴۔ رسالہ دربیان جغرافیہ طرق و شوارع احاطہ اودہ: فارسی

۵۔ رسالہ طول البلد و عرض البلد و غایۃ النہار۔

مفتی خلیل الدین خاں نے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ (۱۵ر نومبر ۱۸۶۴ء) کو اٹھہتر (۷۸) برس کی عمر میں کاکوری میں وفات پائی اور خانقاہ کاظمیہ کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

تاریخ وفات مولوی محی الدین خاں ذوقؔ نے ان اشعار سے نکالی۔

فغاں کا مروز مولانا خلیل الدین ذوقا ... نہادہ داغ حسرت بردل آں عم جلیل ما

بسال رحلت آں خلد منزل زدرقم کلکم ... بلے کلچیں زانو ارجناں آمد خلیل ما ❶

(۱۲۸۱ء)

۱۱۲- مولانا نصر اللہ مارہروی

مولانا نصر اللہ بن ہدایت اللہ بن محمد مارہروی فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ کنبو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور حنفی المسلک تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے فاضل بزرگ تھے۔

نصر اللہ کی جائے ولادت ''مارہرہ'' (صوبہ یوپی) ہے۔ وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو مولوی محمد باقر اور مولوی محمد نجابت مشرقی سے حصول علم کا آغاز کیا اور درسیات کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید آل محمد حسینی مارہروی سے اخذ طریقت کیا۔ سید ممدوح ۱۷ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ/۳ر جنوری ۱۸۲۰ء کو فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید حمزہ نے باپ کی جگہ تصوف و طریقت کی مسند سنبھالی، یہ بھی تدین و تقویٰ میں شہرت رکھتے تھے۔ مارہرہ اور اس کے قرب و جوار میں باپ بیٹا دونوں

---

❶ تذکرۂ مشاہیر کاکوری' ص ۱۵۱۔

(قاضی القضاۃ نجم الدین خاں علوی کاکوروی کے حیات و سوانح کی ترتیب و تسوید کے سلسلے میں زیادہ استفادہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی کے مضمون سے کیا گیا ہے جو جولائی ۱۹۸۴ء کے ''المعارف'' (لاہور) میں شائع ہوا)

کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ صاحب ترجمہ مولانا نصر اللہ مارہروی نے پہلے تو سید آل محمد مارہروی سے اکتساب فیض کیا۔ پھر ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند سید حمزہ کی صحبت اختیار کی اور عمر بھر ان سے وابستہ رہے۔ درس و افادہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کی مروجہ کتابیں ذوق وشوق سے پڑھاتے تھے اور طلبا ان کے طرز تعلیم سے بہت متاثر تھے۔

مولانا نصر اللہ مارہروی نے ۷/ رجمادی الاخریٰ ۱۲۹۵ھ/ ۸/ رجون ۱۸۷۸ء کو اپنے آبائی شہر ''مارہرہ'' میں داعی اجل کو لبیک کہا❶۔

۱۱۳- مولانا نصر اللہ خورجوی

مولانا نصر اللہ خاں بن محمد عمر خویشگی خورجوی اپنے وقت کے عالم کبیر تھے۔ افاغنہ کے مشہور قبیلے خویشگی سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء کو خورجہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی اور دیگر علمائے عصر سے حصول علم کیا۔ حکیم منصور علی نجیب آبادی سے علم طب پڑھا اور شیخ عبدالعلیم لوہاروی سے اخذ طریقت کیا۔ جب تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے تو انگریزی حکومت سے تقرب پیدا کیا اور ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ کافی عرصہ یہ منصب ان کے سپرد رہا۔

اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں ان کی بے حد پذیرائی ہوئی اور ریاست حیدر آباد کے شمالی علاقوں کے منصب قضا پر متمکن کیے گئے۔ بعد ازاں مغربی علاقوں کے قاضی بھی انھیں مقرر کر دیا گیا۔ ریاست حیدر آباد میں وہ بے حد مراعات سے سرفراز ہوئے۔

مولانا نصر اللہ خاں خورجوی مروجہ علوم وفنون میں ماہر تھے اور سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود درس و افادہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان سے علما و طلبا کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔

تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے جو تحریری خدمت انجام دی، وہ مندرجہ تحت کتابوں کی صورت میں محفوظ ہے:۔

۱۔ ارشاد البلید فی اثبات التقلید۔
۲۔ شرح خلاصہ کیدانی: یہ مسائل فقہ میں ہے اور فارسی میں ہے۔
۳۔ شرح رباعیات یوسفی: یہ علم طب کے بارے میں ہے۔
۴۔ تاریخ دکن

علاوہ ازیں اور بھی کئی کتب و رسائل ان سے یادگار ہیں۔

اس عالم دیں نے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں سفر آخرت اختیار کیا❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷ص ۵۰۰۔
❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۳۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷ص ۵۰۰، ۵۰۱۔

۱۱۴-سید نصیر الدین حسینی برہان پوری

ہندوستان کا شہر برہان پور کسی زمانے میں علم کا گہوارہ اور علما کا مرکز تھا۔ ان کے تراجم فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے برہان پوری علما وفقہا میں ایک بزرگ سید نصیر الدین گزرے ہیں جن کا لقب عبید اللہ تھا۔ یہ سید جلال الدین حسینی برہان پوری کے بیٹے تھے جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور اپنے علاقے کے علمائے اکابر میں گردانے جاتے تھے۔ زاہد و عارف شخص تھے اور ''اللہ والے صاحب'' کے عرف سے معروف تھے۔

سید نصیر الدین حسینی برہان پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والد گرامی سید جلال الدین حسینی کے حلقہ درس میں شمولیت کی اور علوم مروجہ اور فنون متداولہ سے بہرہ مند ہوئے۔ والد کے علاوہ بعض دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا اور فقہ و حدیث اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کی۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور فروعی اختلافی مسائل میں نہایت متشدد تھے۔ اس زمانے میں ''وہابیت'' کا بہت چرچا تھا اور انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ''وہابی'' اور ''باغی'' کو مترادف قرار دے دیا تھا۔ جس کو وہابی کہا جاتا اسے انگریز کا مخالف اور باغی سمجھ لیا جاتا تھا۔ بہت سے علمائے وقت بھی وہابیوں کے مخالف ہو گئے تھے اور ان کے فقہی اور مسلکی رجحانات کو شدت سے ہدف تنقید ٹھہرانے لگے تھے۔ سید نصیر الدین برہان پوری کا شمار بھی انھی علما میں ہوتا تھا جو تحریر و تقریر میں وہابیت کی سخت الفاظ میں مخالفت کرتے تھے۔

سید نصیر الدین تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ ذریعۃ الاستشفاع فی سیر سید المطاع۔

۲۔ الصاعقۃ الرابیہ علی فرقۃ الوہابیۃ الکذابیہ۔

۳۔ روضۃ الریحان فی فضائل رمضان۔

۴۔ مستوفی الحقوق فی ذم العقوق۔

۵۔ ایضاع الارتداد۔

۶۔ ساطع الانوار من کلام سید الابرار۔

۷۔ التیسیر فی مہمات التفسیر۔

۸۔ برہان الہدیٰ فی تفسیر الرحمٰن علی العرش استویٰ۔

۹۔ لباب النقائح فی احکام الذبائح۔

۱۰۔ البراہین الساطعہ فی اثبات مذہب اہل السنۃ اللامعہ۔

۱۱۔ تنبیه الاغنياء فی فضائل سید الاصفیاء۔

۱۲۔ کشف المعضلات فی ذکر نساء المحرمات۔

۱۳۔ ترغيب المجاهدين و ترغیم المعاندين۔

۱۴۔ هل من مزيد فی جواز اللعن علیٰ یزید۔

۱۵۔ الميكيات فی اخبار الشهداء بالطف۔

۱۶۔ لطائف التهذيب۔

۱۷۔ معيار الافراس۔

۱۸۔ شعب الایمان۔

۱۹۔ رساله فی تعداد الآيات و الحروف و السور والسجدات فی القرآن الكريم۔

۲۰۔ رساله غاليه۔

۲۱۔ تكملة منافع المسلين۔

آخر میں حرمین شریفین گئے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو وفات پا گئے۔ یہ ۱۵/محرم ۱۲۹۳ھ/ ۱۱/فروری ۱۸۷۶ء کا واقعہ ہے۔

تذکرہ علمائے ہند میں مرقوم ہے کہ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء کو برہان پور میں انتقال ہوا❶۔

۱۱۵-سید نصیر الدین دہلوی

جو علمائے کرام اور فقہائے عظام امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کی جماعت مجاہدین سے وابستہ ہوئے اور باقاعدہ میدان جہاد میں نکلے ان میں مولانا سید نصیر الدین دہلوی متعدد وجوہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ ددھیال کی طرف سے حضرت سید ناصر الدین حسینی سونی پتی کی اولاد سے تھے اور ننھیال کی جانب سے حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نواسے تھے۔ ان کی ولادت دہلی میں ہوئی اور وہیں پلے بڑھے۔

ابتدا میں تحصیل علم سے بے اعتنائی:

ان کے حالات میں یہ عجیب بات مرقوم ہے کہ دہلی میں اپنے ننھیال میں پرورش پائی اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں، جہاں علم کے دریا بہہ رہے تھے اور فضیلت کے چشمے ابل رہے تھے اور ہندوستان کے طول و عرض سے آ کر لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لیکن نصیر الدین کو اپنی عمر کے دور اول میں اس سے دلچسپی نہ تھی اور

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳۹، ۲۴۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۰۲۔

حصولِ علم کی طرف اعتنا نہ تھا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کا غلغلۂ درس بلند تھا اور بے شمار علما وطلبا ان سے تحصیل علم میں مشغول تھے۔ مگر نصیر الدین اس دولت سے بے بہرہ تھے۔ اسی اثنا میں والدہ نے شاہ محمد اسحاق سے ان کی صاحب زادی کے رشتے کے لیے درخواست کی مگر علوم مروجہ سے عدمِ التفات کی بنا پر درخواست منظور نہ ہوئی۔

حصولِ علم کا شوق:

درخواست کی عدم منظوری نے نصیر الدین کے قلب وضمیر کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ انتہائی ذوق وشوق سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ پھر اس قدر محنت وتوجہ سے پڑھنا شروع کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں حدیث و فقہ اور دیگر علوم وفنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں اور اپنے عہد کے جلیل القدر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

حصولِ علم کی غرض سے وہ پورب کے متعدد شہروں میں گئے اور وہاں کے مشاہیر اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا۔ کلکتے کا عزم بھی کیا اور وہاں کے بعض نامور علما سے تحصیل کی۔ جس زمانے میں سید احمد شہید قصد حج کے لیے کلکتے تشریف لے گئے تھے' سید نصیر الدین اس زمانے میں وہیں تھے اور طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کر لیا تو شاہ محمد اسحاق نے اپنی صاحب زادی کا نکاح ان سے کر دیا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء میں شاہ اسحاق وعظ فرماتے اور جہاد کے لیے چندے کی اپیل کرتے تو سید نصیر الدین مدرسے کے دروازے میں کھڑے ہو کر مجاہدین کے لیے فراہمیٔ زر اعانت کی خدمت انجام دیتے۔ اس کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جہاد کے لیے انھوں نے خود ہی سرحد پار جانے کا عزم کر لیا۔

مجاہدین کی تنظیم:

سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے واقعہ شہادت کے بعد مجاہدین پر کئی عجیب وغریب دور آئے اور ان کے سررشتہ نظم کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن قدرت الٰہی سے پھر ایسے حالات ابھر آتے جن سے خطرات کے بادل چھٹ جاتے اور مایوسی کی فضا ختم ہو جاتی۔ لیکن اب معاملہ بالکل دگرگوں ہو گیا تھا اور اس پرعظمت جماعت کا محض ایک ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ حالات نہایت تکلیف دہ اور انتہائی مایوس کن تھے۔ یاس وقنوط اور چاروں طرف پھیلی ہوئی افسردگی کے اس عالم میں صاحب ترجمہ مولانا سید نصیر الدین دہلوی کا جوش وجذبہ حرکت میں آیا اور انھوں نے کمر ہمت باندھی اور امیر المجاہدین سید احمد شہید کی طرح ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کو اپنے اندازِ خاص سے دعوت جہاد دی اور تھوڑی مدت میں ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس کے تمام ارکان اس بنیادی فرض کی انجام دہی کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہتے۔

اختلاف سے نفرت:

احیائے دین، رد بدعات، دعوتِ اسلام اور اشاعت توحید ان کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل و معاملات کے متعلق مسلمانوں میں جھگڑے اور نزاع کی جو صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے باہمی اختلافات ختم کر دیں اور اسلام کے اصول و اساسیات پر کامل طور سے متحد ہو جائیں۔ ایک مرتبہ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ کسی نے کہا، مذہبی معاملات میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔ صحابہ کے زمانے میں بھی اختلاف موجود تھا۔ سید نصیر الدین نے اس کا نہایت جچا تلا جواب دیا۔ فرمایا ہمیں اکابر کی لغزشوں پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ صحابہ میں بہ تقاضائے بشریت اختلاف کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ہمیں ان کے مکارم و محاسن کی پیروی کرنی چاہیے۔ ان کے اختلافات کو تلاش کرنا اور پھر ان کو بنیاد بنا کر اپنے لیے اختلاف کی گنجائش پیدا کرنا ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے۔

امیر دوست محمد خاں سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ:

سید نصیر الدین عالی ہمت بزرگ تھے۔ وہ بہت بلند مقاصد رکھتے تھے۔ دور رس نگاہ کے مالک، نہایت مستعد اور صاف ذہن۔ طبیعت میں سلجھاؤ اور سوچ بچار کے پیمانوں میں بڑی وسعت تھی۔ پرانے جھگڑوں میں الجھ کر وقت ضائع کرنا اور احوال و ظروف سے چشم پوشی کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ آزاد قبائل کس فطرت کے مالک ہیں اور ان کے کن کن سرداروں نے سید احمد شہید کے زمانے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ وہ پرانی رنجشوں کو بھلا دینا چاہتے تھے اور نئے حالات کی روشنی میں آگے قدم بڑھانے کے خواہاں تھے۔

بعض وجوہ سے والیٔ افغانستان دوست محمد خاں بھی مجاہدین کی حمایت اور ہمدردی سے دست کش ہو گیا تھا۔ لیکن اب وقت نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ سید نصیر الدین اس سے مراسم پیدا کرنے اور تعلقات استوار کرنے کے متمنی تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امیر دوست محمد خاں ایک طرف سکھوں سے برسر پیکار تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا اور یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کی حریف تھیں اور انہی سے ان کا مقابلہ تھا۔ یعنی جو کام دوست محمد خاں کر رہا تھا' وہی مجاہدین کا نقطہ نظر تھا۔ اس لیے سید نصیر الدین کی شدید خواہش تھی کہ موجودہ حالات میں امیر دوست محمد خاں سے حلیفانہ اور دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں تاکہ دونوں کے مشترکہ دشمنوں اور حریفوں کا باہمی تعاون سے مقابلہ کیا جا سکے۔

جب سید نصیر الدین یہ منصوبہ بنا رہے تھے اس زمانے میں وہ دہلی میں تھے اور زیادہ تر دہلی کی اکبری مسجد میں ان کے شب و روز گزرتے تھے۔ یہ وہی مسجد تھی جس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندان گرامی شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے درس و تدریس کے سلسلے جاری رہے تھے۔ امیر المجاہدین سید

احمد شہید نے تنظیم جہاد کا کام اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔

سید نصیر الدین نے بھی اسی مسجد میں بیٹھ کر اپنے رفقائے خاص سے مشورے کیے اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے تمام انتظامات مکمل کر لیے اور ابواحمد علی اور سید ابراہیم سورتی کے نام اس سفارت کے لیے تجویز ہوئے لیکن اچانک بعض ایسے ناخوش گوار واقعات پیش آ گئے کہ اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت نہ بھیجی جا سکی۔ اگرچہ اس وقت سفارت کی تجویز معرضِ عمل میں نہ آ سکی، تاہم یہ واقعہ ہے کہ سید نصیر الدین میدان جہاد میں اتر آنے کے بعد امیر دوست محمد خاں کی دفاعی کوششوں میں ہمیشہ اس کے معاون و مددگار رہے ❶۔

قصد ہجرت:

جیسا کہ پہلے گزر چکا، سید نصیر الدین نہایت باہمت اور عزم و ارادے کے پکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آزاد علاقے میں جانے اور وہاں از سر نو سلسلۂ جہاد شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ ملک کے ان حصوں میں دورے کیے جائیں جہاں زیادہ تبلیغ جہاد نہیں ہو سکی تھی، وہاں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کیا جائے لیکن یہ دقت طلب کام تھا اور اس میں بہت تاخیر کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ جو کام جس قدر جلدی ہو سکتا ہے، کیا جائے اور تاخیر سے بچا جائے۔ پھر یہ بات بھی ان کے پیش نظر تھی کہ پہلے سے جو بعض ممتاز نقیب مختلف علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کی مساعیِ مخلصانہ سے بھی لوگ متاثر ہوں گے اور میدان جہاد میں پہنچیں گے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی حیدر آباد (دکن) میں، مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں، مولانا سید محمد علی رام پوری مدراس میں اور مولانا سید اولاد حسن قنوجی اپنے علاقے میں مشغول دعوت جہاد ہیں اور ان کی کوشش سے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا اور بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ قائم رہا۔

والدہ سے اجازت:

سید نصیر الدین کی والدہ مکرمہ زندہ تھیں، سفر جہاد سے قبل ان سے اجازت لینا ضروری تھا۔ والدہ کی تمنا تھی کہ کسی دن ماہ رمضان میں دہلی کی جامع مسجد (یعنی شاہ جہانی مسجد) میں جا کر نماز ادا کی جائے۔ سعادت مند بیٹے نے رمضان ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) میں ایک رات نماز تراویح کے بعد والدہ کو ساتھ لیا اور جامع مسجد گئے۔ انھوں نے نہایت اطمینان سے نماز پڑھی اور کافی دیر مسجد میں رہیں۔ دعا کی اور بہت خوش ہوئیں۔ اسی دوران بیٹے نے ماں سے عرض کیا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

❶ سرگزشت مجاہدین، ص ۱۳۷۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران:۹۲)

یعنی تم اس وقت تک نیکی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو چیز تمھیں پیاری ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

یہ آیت پڑھ کر عرض کیا کہ آپ کو میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے۔ میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس کارِ خیر کے لیے مجھے اجازت دیں اور ہماری جدائی پر صبر و شکیب سے کام لیں۔ یہ الفاظ سنتے ہی بلند بخت ماں نے نہایت خوشی سے بیٹے کو جہاد پر جانے کی اجازت دے دی اور یہ مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔

لمبا سفر اور انتہائی مختصر سامان:

والدہ کی اجازت کے بعد سید نصیر الدین نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بہت لمبے سفر پر جا رہے تھے، مگر سامان سفر اتنا مختصر کہ اسے طوالت سفر سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا بستر، چند برتن اور ایک کپڑوں کی جوڑی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں:

(۱) قرآن مجید (۲) تفسیر جلالین (۳) سنن ابی داؤد (۴) مشکوٰۃ (۵) حبل المتین اور (۶) حجۃ اللہ البالغہ میں سے کتاب الاحسان ❶۔

یہ تھا اس جید عالم، ممتاز فقیہ، نامور غازی اور مجاہد کا کل سامانِ سفر۔

تاریخ روانگی:

حادثہ بالاکوٹ سے چار سال بعد، مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ وہ ۳/ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۲/ اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر سے نکلے اور دہلی سے چار میل کے فاصلے پر ''عرب سرائے'' میں پہلا پڑاؤ کیا۔ وہاں تین دن اقامت گزیں رہے۔ ۶/ ذی الحجہ کو وہاں سے چلے اور قطب صاحب میں ''حوض شمسی'' کے کنارے ''مسجد اولیا'' کے متصل قیام کیا۔ ۷/ ذی الحجہ کو مسجد اولیا سے روانہ ہوئے اور راستے میں تھوڑا بہت قیام کرتے ہوئے ریواڑی جا پہنچے۔ وہاں ایک باغ میں ٹھہرے اور عید الضحیٰ کی نماز ادا کی۔ ۱۵/ ذی الحجہ کو ریواڑی سے جے پور کا عزم کیا۔ وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ راستے میں ایک مجاہد سید اسحاق وفات پا گئے اور ان کی میت کو جے پور کے قریب واصل خاں کے باغ میں لے جایا گیا۔ تجہیز و تکفین کے بعد نماز جنازہ سید نصیر الدین نے پڑھائی اور اس موقع پر نہایت پر اثر تقریر کی۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور راجپوتانے کا انتہائی تکلیف دہ سفر درپیش تھا۔ وہ اس علاقے کے مختلف

❶ سرگزشت مجاہدین، ص ۱۳۹۔

مقامات ٹونک' اجمیر' جودھ پور اور جیسلمیر سے ہوتے اور قیام کرتے ہوئے سندھ پہنچ گئے۔ راستے کی تفصیلات بہ درجہ غایت عجیب وغریب ہیں، جنھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

پیر کوٹ میں قیام:

سندھ میں انھوں نے جس مقام پر قیام کیا، اس کا نام ''پیر کوٹ'' ہے۔ یہ وہی پیر کوٹ ہے جسے ''پیر جو گوٹھ'' کہا جاتا ہے۔ یہ عرصہ دراز سے راشدی سادات کے اس خاندان کا مرکز ہے جو ''پیر پگاڑو'' کے لقب سے مشہور ہے اور روہڑی سے سولہ سترہ میل جنوب میں اور خیر پور سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔۔ پہلا اور اصل پیر کوٹ دریائے سندھ کی خوف ناک لہروں کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا تھا۔ پھر اس مقام سے پانچ چھ میل دور مشرق میں موجودہ پیر کوٹ آباد کیا گیا۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ کے عہد میں پیر صبغت اللہ شاہ راشدی پیر کوٹ کی مسند رشد و ہدایت پر متمکن تھے جو نہایت متورع اور متقی بزرگ تھے۔ سید احمد شہید ان کے ہاں پہنچے تو انھوں نے سید صاحب سے پورے تعاون کا عہد کیا اور پھر اس عہد کو نبھانے میں ہمیشہ مستعد اور سرگرم رہے۔ سید صاحب کی شہادت سے چار سال بعد ان کا انتقال ہوا۔

حروں کی تحریک:

پیر صبغت اللہ شاہ راشدی نے اپنے ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی از حد کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ وہ متبع سنت بزرگ تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کے شدید مخالف تھے۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ وہ مسند نشیں ہوئے تو ان کے بعض قرابت دار مخالفت پر اتر آئے اور ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اصحاب ارادت نے مرشد کی حفاظت و مدافعت کے لیے ایک تنظیم قائم کی جو ''حروں کی جماعت'' کے نام شہرت پذیر ہوئی۔

پیر صاحب ممدوح نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ حروں کے اس نظام کو اس طرح پھیلایا اور وسیع کیا جائے کہ علاقہ سندھ اجنبی اقتدار اور غیر ملکی طاقت کے تسلط سے قطعی طور پر محفوظ ہو جائے اور پھر اس نواح میں خالص اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کی جائے۔ سید احمد شہید جب جہاد کے لیے سرحد جاتے ہوئے سندھ پہنچے تو پیر صبغت اللہ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور اشتراک مقاصد کی بنا پر پیر صاحب نے سید صاحب سے کامل تعاون کا فیصلہ کر لیا، لیکن قدرت الٰہی کے فیصلے کچھ اور تھے۔

سید احمد شہید اور پیر صبغت اللہ کے درمیان جو گفت و شنید ہوئی' اس سے سید صاحب اس درجے اثر پذیر ہوئے کہ اپنے اہل و عیال کے قیام و سکونت کے لیے پیر کوٹ ہی کا انتخاب فرمایا۔ حالانکہ اس سے قبل والیِٔ

ٹونک نواب امیر خاں اور بعض امیران سندھ بھی اپنے ہاں ان کے قیام کے لیے مناسب انتظام کرنے پر بہ دل و جان آمادہ تھے، لیکن سید صاحب کے قلب و ذہن پر پیر صاحب کے دینی جذبات وعواطف کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ انھوں نے اسی مقام کو ترجیح دی۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد بھی کئی سال ان کے اہل وعیال پیر کوٹ میں مقیم رہے۔ یہی وجہ تھی کہ سید نصیر الدین دہلوی نے سندھ میں پیر کوٹ کو اپنی پہلی منزل قرار دیا۔

پیر کوٹ کا کتب خانہ:

اس زمانے میں پیر کوٹ کا کتب خانہ جو پیر صبغت اللہ شاہ کی تحویل میں تھا، بہت سی نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل تھا۔ افسوس ہے پیر صبغت اللہ ثانی کی گرفتاری اور سزائے موت کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں اس کو شدید نقصان پہنچا۔ سید نصیر الدین دہلوی نے یہ کتب خانہ دیکھا تھا۔ ان کے بقول اس کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک ایسا مترجم نسخہ تھا، جس کے حاشیے پر چار تفسیریں تمام و کمال درج تھیں۔ اول تفسیر نیشاپوری، دوم بیضاوی، سوم مدارک، چہارم کشاف ـــــ!

علاوہ ازیں تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر نیشاپوری، تفسیر مقدسی، تفسیر قرطبی، تفسیر قشیری، درمنثور وغیرہ بہت سی تفسیریں الگ الگ اس کتب خانے کی زینت تھیں۔

کتب حدیث میں صحاح ستہ کے علاوہ مشکوٰۃ، سنن بیہقی، روضۃ الصالحین اس میں محفوظ تھیں۔

شروح حدیث میں سے فتح الباری، قسطلانی، عینی اور کرمانی سے یہ کتب خانہ مزین تھا۔

ذخیرہ فقہ میں سے زیلعی مکمل، بحر الرائق، فتح القدیر، حموی شرح الاشباہ والنظائر موجود تھیں۔

یہ وہ کتابیں تھیں جو صرف مذہبیات سے متعلق تھیں۔ تاریخ وسوانح اور ادب وشعر کی بھی بہت سی کتابیں پائی جاتی تھیں۔ فارسی دیوانوں کے اس میں تقریباً ایک سو مطلا نسخے تھے۔ مختلف تفسیروں کی پینسٹھ جلدیں تھیں۔ ''شاہنامہ'' کے پانچ نسخے نہایت عمدہ تصویروں سے مزین تھے۔ احیاء علوم الدین اور فتوحات مکیہ کے کئی کئی نسخے موجود تھے [1]۔

بعد میں سندھ کا یہ راشدی خاندان اختلاف مسالک کی بنا پر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک کو ''پیر پگاڑو'' کے نام سے موسوم کیا گیا اور ایک کو ''پیر جھنڈا'' کے نام سے۔! پیر آف جھنڈا کے دو کتب خانے سندھ کے بہت بڑے کتب خانوں میں شمار کیے جاتے ہیں ـــــ ایک پیر محب اللہ راشدی کا کتب خانہ اور ایک ان کے چھوٹے بھائی پیر بدیع الدین راشدی کا ـــــ! ان دونوں کتب خانوں میں مخطوطات بھی کثیر تعداد میں ہیں اور مطبوعہ کتابیں بھی۔ یہ دونوں بھائی خود بھی جلیل القدر عالم تھے اور علما کے انتہائی قدردان بھی ـــــ ان کے کتب خانوں میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سطور کا راقم اکتوبر ۱۹۸۱ء میں وہاں گیا تھا۔ فقط ان

[1] سرگزشت مجاہدین۔ ص ۱۶۱۔

حضرات سے ملنا اور ان کے کتب خانے دیکھنا مقصود تھا۔ پہلے نیو سعید آباد گیا جہاں پیر بدیع الدین اقامت گزیں تھے، معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد تشریف لے گئے ہیں، وہاں سے کراچی جائیں گے اور کئی دن بعد واپسی ہوگی۔ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ان کے بڑے بھائی پیر محبّ اللہ صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ بھی موجود نہ تھے اور واپسی کا بھی ایک دو دن میں امکان نہ تھا۔ سخت ذہنی کوفت ہوئی اور میں کسی کو کچھ بتائے اور رکے بغیر واپس لاہور آ گیا۔

سلسلہ دعوت و تبلیغ:

سندھ کے موضع کھڑہ کے پیر بھی اس زمانے میں مشہور تھے، جن میں مخدوم عبدالخالق کو بالخصوص اس نواح میں قدر و منزلت حاصل تھی۔ اسی طرح کھڑہ سے صرف ایک کوس کے فاصلے پر موضع گبٹ تھا۔ وہاں کے سید ابراہیم شاہ کی بڑی شہرت تھی، یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے۔ سید نصیر الدین کے ان دونوں سے مخلصانہ مراسم قائم ہوگئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی بہت تکریم کرتے تھے۔ سید نصیر الدین سلسلہ دعوت و تبلیغ میں ہر وقت سرگرم رہتے اور خلاف سنت کوئی بات برداشت نہ کرتے۔ مخاطب اگر چہ کتنا بڑا آدمی ہوتا اس کی انھیں ذرہ پروا نہ ہوتی اور دلائل شرعیہ سے اپنی بات اس کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات میں دو واقعے ملاحظہ ہوں:

خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ مخدوم عبدالخالق کے ہاں گئے، دیکھا کہ عام لوگوں کی طرح نیز ذکر و شغل میں انہماک کے باعث مخدوم صاحب نماز تاخیر سے پڑھتے ہیں۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور مشکوٰۃ کی احادیث اور فقہ کی درمختار کی روایات ان کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ نماز اول وقت میں پڑھنی چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب نے ان کی بات مان لی اور نماز میں تاخیر ترک کر دی۔

سید ابراہیم شاہ، ختم قادریہ میں ایک تسبیح ''یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ'' کی بھی پڑھتے تھے۔ سید نصیر الدین نے ان کے خلیفوں کو جو اچھے خاصے عالم تھے ایسے دلنشین طریقے سے مسئلہ سمجھایا کہ انھوں نے اس کے ممنوع ہونے کا اقرار کر لیا۔ علاوہ ازیں سید ابراہیم شاہ نماز بھی تاخیر سے پڑھتے تھے، مخدوم عبدالخالق کی طرح انھیں بھی اول وقت میں نماز ادا کرنے کی تاکید کی اور اس کی فضیلت بیان کی۔ وہ یہ بات بھی مان گئے اور اول وقت میں نماز پڑھنے لگے۔

سندھ کے لوگ نیک طینت اور صحیح فطرت تھے۔ قرآن و حدیث کی رو سے کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا تو فوراً مان لیتے اور اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے۔ اس ضمن میں سندھی عوام کی نفسیات اور وہاں کے پیروں کے طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے سید نصیر الدین لکھتے ہیں:۔

مردمان ایں جا بسیار سلیم الطبع اند و ہرگز ہرگز مقابلہ شریعت نمی کنند، گو کسے مخالف طبیعت ایشاں بگوید،

مگر مردان حق گو ایں جانیستند و پیران ایں جارا جز اہتمام گرفتن بیعت مطلبے دیگر نیست۔ بعضے از پیران حمیت اسلامی ہم دارند مگر اہتمام در امر بالمعروف نمی کنند ❶۔

(یہاں کے لوگ بہت سلیم الطبع ہیں، شریعت کی مخالفت قطعاً نہیں کرتے' اگرچہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف بات کہے۔ البتہ یہاں حق گو آدمی نہیں ہیں۔ یہاں کے پیروں کو بیعت لینے کے سوا کوئی غرض نہیں۔ بے شک بعض پیروں میں حمیت اسلامی بھی ہے مگر وہ امر بالمعروف کا اہتمام نہیں کرتے۔)

سید نصیر الدین سندھ کے بہت سے مقامات میں گئے اور وہاں کے مختلف امیروں اور پیروں سے ملے۔ رانی پور، ہالہ، مٹاری، نوشہرو، خیر پور، حیدر آباد وغیرہ متعدد بلاد وقصبات اور دیہات کے چکر لگائے اور وہاں کے بڑے لوگوں سے ملاقات کی۔ وہ دراصل سندھ کے کسی علاقے میں بیٹھ کر سکھوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور وہ آہستہ آہستہ سندھ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ بھی سندھ کے امیروں اور حاکموں نے کچھ معاہدے کر رکھے تھے جو مستقبل میں ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئے۔ سید نصیر الدین کا ارادہ یہ تھا کہ سندھ کے والی، حکمران، پیر اور سرکردہ لوگ ان کے ساتھ تعاون کریں تو مسلمانوں کی مخالف طاقتوں ___ انگریزوں اور سکھوں ___ سے جہاد کیا جائے اور ان کے قدم سندھ کی طرف بڑھنے سے روکے جائیں۔ لیکن سعی بسیار کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مزاریوں کے علاقے میں:

سید نصیر الدین اور ان کے ساتھی فقط جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر گھر سے نکلے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی اور حکمران رنجیت سنگھ تھا جو سندھ پر بھی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ انگریز ہندوستان پر عملاً قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ کچھ معاہدے کر رکھے تھے۔ وہ بھی سندھ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ مزاری قبیلے کے لوگ سکھوں کے بھی مخالف تھے اور انگریزوں کے بھی۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے چونکہ سکھوں سے لڑتے ہوئے درجہ شہادت پایا تھا اور بالا کوٹ میں ان کے اور بھی بہت سے ساتھی شہید ہو چکے تھے' اس لیے قدرتی طور پر مجاہدین کو سکھوں سے نفرت تھی۔ انگریز سکھوں کے حامی تھے۔ اس بنا پر مجاہدین انگریزوں کے بھی دشمن تھے۔ ان حالات میں انھوں نے مزاریوں کی طرف دست تعاون بڑھایا جو کہ ان دونوں کے دشمنوں ___ سکھوں اور انگریزوں کے مخالف تھے ___ مزاریوں نے بھی ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور اشتراک مقاصد نے مزاریوں اور مجاہدین کو اتحاد کی سلک میں پرو دیا۔

مزاریوں کا علاقہ خیر پور (سندھ) کے حدود سے متصل ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصے پر محیط ہے' جہاں سید نصیر الدین اور ان کے رفقا نے قیام کیا۔

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین (مخطوطہ) ص ۱۱۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جایئے۔ سید نصیر الدین دہلوی اور وہ مجاہدین جو دہلی اور ہندوستان کے بعض علاقوں سے ہجرت کر کے بغرض جہاد یہاں آئے تھے وہ پکے موحد اور متبعین کتاب وسنت تھے۔ غیر شرعی رسوم سے انھیں سخت نفرت تھی۔ بدعات ومحدثات کے شدید مخالف تھے اور امور شرکیہ سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ یہ لوگ وہابی مشہور تھے اور ان کی تحریک کو ''تحریک وہابی'' کہا جاتا تھا۔ سید نصیر الدین کو تو معلوم تھا کہ ''مزاری'' ایک قبیلے کا نام ہے لیکن ان کے جن رفقا کو اس کا علم نہ تھا وہ لفظ ''مزاری'' پر بدکے، انھیں شبہ ہوا کہ یہ قبر پرست اور مزاروں کو پوجنے والے لوگ ہیں۔ ان سے رسم وراہ کیوں پیدا کی جائے۔ پھر جب ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والے لوگوں کو پتا چلا کہ سید نصیر الدین نے مزاریوں کے ہاں سکونت اختیار کر لی ہے تو انھیں بھی اس سے پریشانی ہوئی۔ سید نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے رفقا کی غلط فہمی بھی دور کی اور ہندوستان کے حضرات کو بھی خطوط کے ذریعے اصل معاملے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مزاری ایک قوم کا نام ہے۔ مزار پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ زبان کے پکے اور عہد کے سچے ہیں۔ ایک خط میں جو ہندوستان کے ایک شخص کے نام بھیجا۔ لکھتے ہیں کہ کرم خاں مزاری نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں گے اور شریک جہاد ہوں گے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔ اس میں مزاریوں کے عہد و پیمان کے بارے میں سید نصیر الدین لکھتے ہیں:۔

ہر کہ در خانہ ایشاں برود تا جان در تن ایشاں ہست، رفاقت ادمی کنند، وراسخ العہد و صادق المیثاق بودنِ ایشاں مشہور است۔ چنانچہ بعضے اقوام ایشاں درمیاں خود دشمنی دارند و جنگ درمیاں خود می کنند۔ ہر گاہ کہ وعدہ کنند کہ دو سال صلح ہست ہر گز درمیان خود غدر نمی کنند ❶۔

یعنی جو شخص ان کے گھر چلا جائے، جب تک جان بدن میں رہے یہ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا وعدے پر قائم رہنا اور باوفا ہونا مشہور ہے۔ چنانچہ ان کے مختلف گروہوں میں آپس کی دشمنی کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب عہد کر لیتے ہیں کہ (مثلاً) دو سال کے لیے صلح ہے تو اس کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کرتے۔

مزاری دراصل بلوچوں کی ایک مشہور اور بڑی قوم ہے۔ یہ لوگ سترھویں صدی عیسوی کے آخری یا اٹھارھویں صدی کے ابتدائی دور میں اپنے پہلے ٹھکانوں سے اٹھ کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ''ناہر'' قوم کا قبضہ تھا۔ ناہر دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک گروہ کا صدر مقام ''کن'' اور دوسرے کا ''بھاگسر'' تھا۔ مزاریوں نے ایک لڑائی میں ناہر قوم کے ایک گروہ کی مدد کی اور اس کے بدلے میں وہ علاقہ اس سے لے لیا جو ضلع ڈیرہ غازی خاں میں روجھان اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے اور پھر مستقل طور پر اس علاقے میں آباد ہو گئے۔

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۴۰۔

یہاں یہ یاد رہے کہ صوبہ پنجاب کے بعض زمیندار اور جاگیردار جن زمینوں اور جاگیروں پر قابض ہیں وہ انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے کسی نہ کسی ''خدمت'' کے صلے میں ملی ہیں۔ لیکن مزاریوں کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ایک گروہ کی مدد کر کے زورِ بازو سے وہ علاقہ حاصل کیا ہے جو ان کی زمینوں اور جاگیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا پنجاب کی سکھ حکومت سے بھی سلسلہ جنگ جاری رہا اور انگریزوں سے بھی یہ لڑتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کو ''مزاری'' کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے متعلق عام طور پر دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے بڑے کا نام مزار تھا۔ اس کے اخلاف اس کی نسبت سے ''مزاری'' کہلائے۔ دوسری یہ کہ ابتدا میں یہ قوم جس ندی پر آباد تھی اس کا نام ''مزار'' تھا، اس لیے قوم کا نام مزاری پڑ گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں پاکستان کے مشہور سیاسی لیڈر سردار شیر باز خاں مزاری لاہور آئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے مزاری کی وجہ تسمیہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ سب سے پہلے ہمارے اسلاف جس علاقے میں رہتے تھے وہاں شیر کو مزار کہا جاتا تھا۔ ایک معرکے میں ہمارے ایک بزرگ نے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے تو اس سے متاثر ہو کر وہاں کے سردار نے انھیں ''مزار'' کا خطاب دیا، جس کے معنی وہاں کی بولی میں شیر کے ہیں۔ اس کے بعد پوری قوم کو ''مزاری'' کہا جانے لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں یہ قوم بہت بہادر اور جرات مند تھی۔ سید نصیر الدین دہلوی کو میدان جنگ میں بھی اس سے واسطہ رہا اور عام حالات میں بھی۔ انھوں نے اپنے تجربے کی بنا پر ہندوستان میں ایک صاحب کو خط لکھا۔

مزاریاں بہ شجاعت و شہامت ضرب المثل اند، و نیز در اجمیر و جودھ پور بذریعہ اخبار انگریزی معلوم شدہ بود کہ دریں ولایت قوم مذکور بر بعض محروسہ و مقبوضہ سکھ اغارہ کردند و چار پائے ہا بسیار بہ غارت بردند۔ بہ طرفے ایں قوم رغبتے می یافتم ❶۔

یعنی مزاری بہادری اور شجاعت میں ضرب المثل ہیں۔ ان کے بارے میں اجمیر اور جودھ پور میں انگریزوں کے ذریعے سے جو خبریں پہنچائی گئیں ان سے معلوم ہو چکا تھا کہ مزاریوں نے سکھوں کے بعض علاقوں پر حملے کیے اور ان کے بہت سے مویشی لوٹ لیے گئے، لہٰذا اس قوم کے لیے میرے دل میں ایک کشش اور رغبت پیدا ہو گئی ہے۔

سید نصیر الدین یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:۔

چوں میرانِ خیر پور و زیرستان فرنگیاں و آشتی داران سکھاں اند، قرار خود در محروسہ ایشاں مقرون صلاح نمی بینم۔ اگرچہ متوقع چناں است کہ بفضلہ سبحانہ، مسلمانان ایں دیار بسیارے از بسیار ہمراہ خواہند شد۔ بخلاف

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۲۹۔

❷ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۳۰، ۳۱۔

قوم مزاری کہ نہ از سکھاں خوفے دارند، نہ از فرنگیاں ❷۔

یعنی والیانِ خیر پور چونکہ انگریزوں کے زیر اثر ہیں اور سکھوں سے بھی ان کی صلح ہے اس لیے ان کے علاقے میں قیام میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ اس علاقے کے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ والیان خیر پور کے برعکس، مزاریوں کی یہ حالت ہے کہ نہ وہ سکھوں سے ڈرتے ہیں نہ انگریزوں سے۔

سید نصیر الدین دہلوی جس زمانے میں مزاریوں کے علاقے میں گئے، اس زمانے میں ان کا سردار، میر بہرام خاں مزاری تھا جو اپنے باپ میر حمل خاں مزاری کی وفات کے بعد ۱۸۰۱ء میں مزاری قوم کا سردار بنا۔ اس نے سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کی بے حد پذیرائی کی اور ان کے ساتھ مل کر سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔

بہرام خاں کی شخصیت:

بہرام خاں مزاری بہت عقل مند، نہایت مدبر اور فہیم و فریس آدمی تھا۔ ایک شخص موہن لال دہلوی نے انگریزی حکومت کے ملازم کی حیثیت سے مارچ ۱۸۳۶ء میں ان علاقوں کا دورہ کیا تھا جن میں سکھوں اور مزاریوں کے درمیان لڑائیوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ موہن لال نے بہرام خاں سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہ اپنے سفر نامے (ص ۴۲۵، ۴۲۶) میں لکھتا ہے۔

''بہرام خاں دبلا پتلا آدمی ہے اور قد درمیانہ۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص گہرے خیالات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی طبیعت میں وہ شرارت اور پستی نظر نہیں آتی جو عام طور پر اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ وہ سرداروں کا سا لباس پہنتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس کے پاس بہت روپیہ ہے۔''

سکھوں سے لڑائیاں:

مجاہدین اور مزاری متحد ہو چکے تھے اور انھوں نے سکھوں کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا تھا۔ ''روجھان'' اور ''کن'' اس نواح میں فوجی نقطہ نگاہ سے دو اہم مقام تھے۔ مجاہدین نے مزاریوں کے تعاون سے وہاں سکھوں پر شدید حملے کیے اور انھیں شکست دی۔ ''کن'' کے مقام سے سکھ بھاگے تو ان کو کافی نقصان پہنچا اور ان کے بعض بڑے بڑے فوجی مارے گئے۔ ایک شخص ہتو رام نے ''باغ و بہار'' کے نام سے ۱۸۷۱ء میں ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تاریخ شائع کی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کتاب کے صفحہ ۱۷۵ سے ''روجھان'' کی لڑائی کے بارے میں ایک اقتباس درج کیا ہے جو یہ ہے:۔

''مولوی نصیر الدین غازی ہندوستانی، علاقہ قندھار سے پھرتا ہوا، بہ جمعیت ایک ہزار سوار و پیادہ وارد علاقہ سندھ ہوا۔ تمن دار مزاری نے مولوی مذکور کو حامیٔ خود بنا کر علاقہ ''روجھان'' کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ مگر کاردار متعینہ قلعہ روجھان بسبب پناہ اس قلعے کے بچ گیا۔ مردمانِ مزاری علاقہ روجھان کو مار تباہ کر کے واپس چلے گئے [1]۔

سکھوں اور مزاریوں کی صلح:

زمانہ ہمیشہ کروٹ بدلتا رہتا ہے، کبھی کسی کے حق میں اور کبھی کسی کے مخالف۔ اب وقت نے ایسی انگڑائی لی کہ مزاریوں اور سکھوں کے درمیان مصالحت ہوگئی جو اس زمانے کے حالات کی رو سے مزاریوں کے حق میں جاتی تھی اور مجاہدین کے خلاف ____! یہ بات ''اخبار مولوی سید نصیر الدین'' میں بھی مذکور ہے اور ہتورام نے بھی اپنی کتاب ''باغ و بہار'' (صفحہ ۱۷۵) میں ذکر کی ہے۔ ان کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر ''سرگزشت مجاہدین'' (صفحہ ۲۰۰) میں لکھتے ہیں۔

سید نصیر الدین نے لکھا ہے کہ (گورنر ملتان) دیوان ساون مل مجاہدین سے مرعوب ہو کر روجھان، مزاریوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ مستند تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مذکور مزاریوں کی یورشوں سے بہت پریشان ہوگیا تھا جو مجاہدین کی اعانت کے باعث خاص خطرناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا کر کے کش مکش ختم کر دی جائے۔ چنانچہ رحیم خاں لغاری کے ذریعے گفت و شنید ہوئی۔ مزاریوں کے تمام سابقہ حقوق بحال کر دیے گئے اور انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ اپنے آپ کو سکھوں کی رعایا سمجھیں گے۔ میر بہرام خاں مزاری کو پہلے ملتان بلایا گیا اور دیوان ساون مل نے اسے ایک ہزار روپے کا خلعت دیا۔ پھر اسے رنجیت سنگھ نے لاہور بلایا۔ میر بہرام خاں کو طلائی کڑوں کی جوڑی، ایک ہزار روپے نقد اور خلعت، نیز اس کے ساتھ جو پچاس مزاری سوار تھے، انھیں ریشمی کپڑے دیے گئے۔

نئی قیام گاہ:

اب حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ سید نصیر الدین اور ان کے ساتھیوں کے لیے مزاریوں کے ہاں قیام کرنا ممکن نہ رہا اور وہ ''کشمور'' چلے گئے۔ لیکن یہاں یہ معاملہ تھا کہ کشمور، سکھوں کی عمل داری کے بالکل قریب تھا اور اس کا حاکم خفیہ طور پر ملتان کے گورنر ساون مل سے ساز باز رکھتا تھا۔ ساون مل، مجاہدین کا

[1] سرگزشت مجاہدین، ص ۱۹۴۔ سید نصیر الدین کے بارے میں ہتورام کا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ قندھار سے علاقہ سندھ میں وارد ہوئے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، وہ مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی سے سندھ آئے اور پھر مزاریوں کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے سکھوں سے جہاد کیا۔

دشمن تھا اور اس کے فوجی ٹھکانوں پر مجاہدین اور مزاری کئی مرتبہ شب خون مار چکے تھے۔ لہٰذا سید نصیر الدین نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور کسی اور مقام پر چلے گئے۔ اس زمانے میں مجاہدین سے سکھ فوجی نہایت خوف زدہ تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مجاہدین جب کشمور میں مقیم تھے ساون مل نے جو مجاہدین کے قریب ہی فوج لیے بیٹھا تھا ایک روز اپنی فوج کے ایک دستے کو مجاہدین کے ٹھکانے پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ اس کا جواب اس کے خود اپنے فوجیوں کی طرف سے اسے ان صاف الفاظ میں دیا گیا۔

تو پیش ماردی، ماہم ہمراہِ تو می رویم، والا مجال نداریم کہ بر غازیاں شب خون زنیم ❶۔

یعنی تو ہمارے آگے چل، ہم تیرے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ ورنہ ہماری یہ مجال نہیں کہ غازیوں پر شب خون ماریں۔

اس جواب سے پتا چلتا ہے کہ مجاہدین اگرچہ بہت کم تعداد میں تھے اور ہندوستان کے دور دراز علاقے سے آئے تھے لیکن سکھ اپنی طاقت اور حکومت کے باوجود ان سے خائف تھے۔

مجاہدین کی یہ قیام گاہ اگرچہ سندھ کے کسی حاکم کی عمل داری میں تھی، مگر ریاست بہاول پور کی سرحد کے قریب تھی۔ لہٰذا نواب بہاول خاں اس سے گھبرا اٹھا، اور خطرہ محسوس کرنے لگا کہ مجاہدین اس کے علاقے میں دست درازی کریں گے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور مجاہدین کو نواب بہاول خاں سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ تاہم وہ فوج لے کر آیا اور مجاہدین کے ٹھکانے سے صرف تین کوس کے فاصلے پر آ بیٹھا۔ نیز سندھ کے حکمرانوں کے پاس اپنے آدمی بھیجے کہ مجاہدین کو وہاں سے ہٹا لیا جائے اور ادھر نہ آنے دیا جائے۔

نواب بہاول خاں کے پیغام کے بعد سندھ کے حکمرانوں نے سید نصیر الدین کو پیغام بھیجا کہ:

آں صاحب لشکر خود را برداشتہ در ملک مایاں بر مقام روپا کہ ضلعیت یا جائے دیگر بہ آں لب دریائے اباسین یعنی بہ طرف شکار پور ہر جائے کہ پسند خاطر افتد چھاؤنی لشکر خود اندازند ❷۔

(آپ اپنے لشکر کو یہاں سے ہٹا کر ہمارے ملک کے موضع روپا میں آ جائیں، جو دریائے سندھ کے اس طرف یعنی شکار پور کی جانب ہے یا کسی اور مقام پر جو آپ کو پسند ہو قیام کر لیں اور اسے اپنی فوج کی چھاؤنی بنا لیں۔)

چنانچہ سید نصیر الدین وہاں سے اٹھ کر ایک جگہ ''مہرو'' چلے گئے جو شکار پور سے بارہ پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سید صاحب ممدوح فرماتے ہیں، یہ جگہ بڑی عمدہ اور کشادہ ہے، یہاں غلہ بھی مطلوبہ مقدار

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) صفحہ ۱۰۹۔

❷ اخبار مولوی سید نصیر الدین صفحہ ۱۴۳۔ منقول ہے کہ شکار پور کے شمالی حصے اور جیکب آباد کے تھوڑے سے جنوبی حصے کو قدیم زمانے میں ''روپا'' کہتے تھے۔ اب سرکاری طور پر اس کا یہ نام نہیں ہے لیکن بتایا جاتا ہے کہ سندھ کے عوام اس خطے کو اب بھی روپا ہی کہتے ہیں۔

میں میسر ہے۔ پانی بھی عام ہے، گھاس اور لکڑی بھی بہت ہے، گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے یہاں اچھی چراگاہیں بھی ہیں۔ یعنی ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔

سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کا اصل اور بنیادی مقصد جہاد تھا اور اس سلسلے میں وہ وہاں کے رئیسوں' امیروں' حاکموں اور پیروں کا تعاون چاہتے تھے۔ اور یہ بھی چاہتے تھے کہ مجاہدین مقامی مسلمانوں پر بوجھ نہ بنیں، انھیں محنت مزدوری کے مواقع میسر ہوں تاکہ وہ کچھ کما کر گزر اوقات کرسکیں۔ اس ضمن میں بھی وہ وہاں کے مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ اور مہرہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہاں یہ سہولتیں حاصل ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

امیرانِ سندھ در صورت اقامت مایاں دریں ملک و جنگ کردن با کفار سکھاوں فراہم آوردن مسلمانان بہ ہیچ وجہ مانع و مزاحم نیستند' واز سکونت لشکر اسلام خواہ از روئے تجارت باشد یا کسب دیگر، کسے ناخوش نیست' زیرا کہ زمین سندھ صدہا کروہ ویران وغیر آباد افتادہ است۔ ہر قدر آبادی بہ عمل آید، خوشنودئ رئیسان ایں نواح است ❶۔

یعنی سندھ کے امرا و روسا اس علاقے میں مجاہدین کے قیام کرنے، کافر سکھوں سے جنگ کرنے اور وہاں سے جنگ جو مسلمانوں کی فراہمی میں قطعی طور سے مزاحمت نہیں کریں گے۔ ہمارے ساتھی یہاں رہ کر تجارت کریں یا کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کریں یا کوئی اور پیشہ اختیار کرلیں، اس سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ میں سیکڑوں کوس زمین ویران اور غیر آباد پڑی ہے۔ یہاں جتنی آبادی ہوگی' اس علاقے کے رئیسوں کے نزدیک خوشنودی کا باعث سمجھی جائے گی۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سید نصیر الدین اور ان کے ساتھی مجاہدین کتنا عرصہ مہرو میں اقامت گزیں رہے۔

قلات کے وزیر اعظم کا اصرار :

سید نصیر الدین کے قیام سندھ کے زمانے میں اور اس دور میں جب کہ وہ مزاریوں کے پاس مقیم تھے اور سکھوں سے برسر پیکار تھے، قلات کا وزیر اعظم مختار الدولہ محمد حسن بھی انھیں خطوط لکھتا اور قلات تشریف لانے پر اصرار کرتا رہا۔ اپنے خطوط میں وہ ان سے انتہائی عقیدت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ان کا ادنیٰ خادم ہے۔ ایک خط میں جو سید نصیر الدین کو مہرو کے دورانِ قیام میں ملا، لکھتا ہے۔

ایں فدوی خدا می داند کہ خود را غائبانہ یکے از غلامان و دامن گرفتگان خادمان عالی می داند ❷۔

کہ خدا گواہ ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے غلاموں اور متوسلوں میں شمار کرتا ہوں۔

❶ اخباری مولوی سید نصیر الدین' ص ۱۴۳۔

❷ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۱۳۴۔

ایک اور خط میں ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کا پختہ عہد کرتا ہے۔

اصلاً خود را از مویدات ایں امر شریف دین نبوی ﷺ حتی الامکان دریغ نہ خواہد داشت ❶۔

یعنی میں دین نبوی ﷺ کے اس اہم حکم یعنی جہاد کی تائید و حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ لیکن ان خطوط و مواعید کے باوجود کہا جاتا ہے کہ محمد حسن نہایت چالاک اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ سید نصیر الدین ان خطوط سے کہاں تک متاثر ہوئے اور وہ اس کے پاس قلات گئے یا نہیں گئے۔

بلوچستان میں:

جب سید نصیر الدین کو کسی طرف سے کوئی امید نہ رہی اور سندھ یا اس نواح کے کسی اور علاقے میں محاذ قائم کر کے مخالفین اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کا امکان ختم ہو گیا تو بلوچستان کو روانہ ہوئے اور سبی، ڈھارڈ تھل اور چتیالی وغیرہ میں کچھ مدت قیام کیا۔ شادوزئی، غزائی، کاکڑ، استرانی اور بزدار وغیرہ قبائل میں تھوڑا عرصہ سکونت اختیار کی۔ کچھی بھی کچھ دن ٹھہرے۔ لورالائی، ژوب اور کوئٹہ کے کوہستانی علاقوں میں بھی مقیم رہے۔ ان تمام مقامات پر جانے کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ تھا جہاد فی سبیل اللہ۔ سکھوں کے مقبوضات بہت وسیع ہو چکے تھے اور مسلمان ان کے ہاتھوں سخت مصائب میں مبتلا تھے۔ سید ممدوح اور ان کے ساتھی ان سے جہاد کے لیے بے تاب تھے۔ مگر سیاسی حالات میں اس درجے تغیر رونما ہو چکا تھا کہ جہاد کے لیے جم کر بیٹھنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اس طول طویل سفر میں متعدد رفقا وفات پا گئے۔ بعض راستے میں غیر مسلموں سے جھڑپوں میں شہید ہو گئے اور بعض اِدھر اُدھر چلے گئے۔ یہ حضرات پھرتے پھراتے ستھانہ پہنچے جہاں مجاہدین کا پہلا مرکز تھا' اور وہاں بھی اب چند لوگ باقی تھے۔ مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ ان حالات میں انھوں نے از سر نو کام شروع کیا اور مجاہدین کی فراہمی اور تنظیم کو مرکز توجہ ٹھہرایا۔ لوگوں کو دعوت جہاد دی اور اس کے لیے باقاعدہ کام کی طرح ڈالی۔

انگریزوں سے جہاد:

اس اثنا میں ناگہاں حالات میں تبدیلی آئی اور گرد و پیش کی سیاسیات نے انگڑائی لی تو پتا چلا کہ انگریزوں نے افغانستان پر قابض ہونے اور اس کی آزادی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے والیٔ افغانستان امیر دوست محمد خاں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے میدان مقابلہ میں اترنے کا عزم کر لیا۔ سید نصیر الدین اپنے ساتھیوں کی معیت میں وہاں پہنچے اور امیر دوست محمد خان کی کمان میں انگریزوں سے لڑائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے افغانستان کے حکمران خاندان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، جس میں وہ کامیاب رہے اور پھر پورے ملک میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ جس نے

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین ص ۱۳۸۔

ایک ہولناک صورت اختیار کر لی۔ دوست محمد خاں کو مجبوراً انگریزوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

پھر ایک موقع آیا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غزنی کے مقام پر سخت جنگ شروع ہوگئی۔ سید نصیر الدین فوراً اپنے مجاہد رفقا کی معیت میں وہاں پہنچے۔ یہاں انھوں نے خوب دادِ شجاعت دی اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس دوران میں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ امیر دوست محمد خان کا ایک قریبی عزیز انگریزوں سے مل گیا اور اس نے قلعہ غزنی کے تمام اندرونی اور جنگی راز ان کو بتا دیے۔ اس کے بعد انگریزوں نے رات کے اندھیرے میں قلعے کے ایک دروازے پر بارود کے تھیلے رکھے اور انھیں آگ لگا دی۔ اس سے خوف ناک دھماکہ ہوا اور دروازہ اڑ گیا۔ انگریزی فوج فوراً قلعے میں داخل ہوگئی۔ اب دست بہ دست جنگ ہونے لگی، جس میں سید نصیر الدین کے بہت سے ساتھی جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ واقعہ ۲۱ر جولائی ۱۸۳۹ء کو پیش آیا۔

بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ سید نصیر الدین ایک ہزار آدمی لے کر کابل کی طرف بڑھے۔ ڈھاڈر کے مقام سے انھوں نے تین سو مجاہدوں کی جمعیت امیر دوست محمد خان کی امداد کے لیے بھیجی۔ یہ لوگ غزنی کی حفاظت پر متعین ہوئے تھے اور وہیں جاں بحق ہوگئے۔

ستھانہ میں:

اس کے بعد سید صاحب اور ان کے بچے کھچے مجاہد ساتھی سخت مصائب کی منزلیں طے کرتے اور آلام کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے ستھانہ پہنچے، جہاں مولوی نصیر الدین بنگلوری کو مجاہدین نے اپنا امیر مقرر کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی سید نصیر الدین کو مجاہدین نے امیر مقرر کر لیا۔ یہ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل کی بات ہے۔

عادات واطوار:

سید نصیر الدین دہلوی نہایت پسندیدہ عادات واطوار کے مالک تھے۔ انتہائی نرم مزاج، حلیم الطبع اور بلند کردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ ان کی عزت کرتے اور تکریم سے پیش آتے تھے۔ تمام طبقوں میں ہر دلعزیز اور عوام وخواص میں احترام کا مقام رکھتے تھے۔ عالم وفاضل اور عابد وزاہد تھے۔ معقول ومنقول پر گہری نظر تھی اور حدیث وفقہ میں ماہر تھے۔ کثیر الدعا اور کثیر البکا بزرگ تھے۔ دعا کے لیے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھاتے تو اس الحاح وعجز سے دعا کرتے کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ یہ دعا ضرور درجۂ قبولیت حاصل کرے گی۔ ایک مرتبہ سندھ کے کسی مقام پر بہت بڑے مجمعے میں دعا کی، جس کی اثر انگیزی سے حاضرین زار وقطار رونے لگے۔ اکثر لوگوں پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بعض لوگ مجذوبیت کے عالم میں کپڑے پھاڑ کر صحرا کی طرف نکل بھاگے [1]۔

[1] سرگزشت مجاہدین، ص ۲۰۹ بحوالہ وزیر الدولہ ج اول، ص ۲۷۳، ۲۷۴۔

ان کی دعوت و تبلیغ بھی انتہائی پر تاثیر تھی۔ اونچے مرتبے کے حق پرست، کتاب و سنت کے عاشقِ صادق اور خلوص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین فرماتے تو لوگ اثر میں ڈوب جاتے۔

نماز بہت ہی خشوع و خضوع سے پڑھتے اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے۔ تدین و صالحیت میں اپنی مثال آپ تھے۔

فقہی مسائل پر عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ دوران سفر اور دوران قیام میں اس سلسلے میں لوگ انہی سے رجوع کرتے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ واقعہ بالاکوٹ کے بعد جہاد کے سلسلے میں لوگوں پر جو افسردگی طاری ہوگئی تھی، مسلسل محنت و کوشش اور بے حد بھاگ دوڑ سے اسے ختم کیا۔ مجاہدین کی جماعت کو منظم کیا اور جو لوگ مایوسی کا شکار ہوگئے تھے' ان میں از سر نو روح جہاد پیدا کی۔ سر رشتۂ نظم و نسق کو مضبوط کیا اور لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی زوردار الفاظ و اسلوب میں دعوت دی اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

وفات:

سید نصیرالدین دہلوی نے مرکز مجاہدین ستھانہ سے والیٔ امب پائندہ خاں تنولی کو خط لکھا کہ وہ مجاہدین سے تعاون کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی امداد کرے۔ خط پڑھ کر پائندہ خاں نے انھیں اپنے ہاں امب تشریف لانے کی دعوت دی، وہ امب گئے اور کئی دن وہاں مقیم رہے۔ مشہور ہے کہ پائندہ خاں نے انھیں زہر دلوا دیا تھا۔ بعض لوگ اس بات کو صحیح نہیں قرار دیتے۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، پائندہ خان نے انھیں زہر دلوا دیا ہو یا نہ دلوا دیا ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امب ہی میں بیمار ہوئے، حالت بیماری ہی میں ستھانہ آئے اور چند روز بعد وفات پا گئے۔ وفات کے مہینے کا تعین نہیں ہو سکا، البتہ سن وفات ۱۸۴۰ء تھا۔ انھیں ستھانہ میں دفن کیا گیا۔ اس سے اگلے سال ۱۸۴۱ء کو دریائے سندھ میں سیلاب آیا تو ان کی قبر سیلاب میں بہہ گئی۔ اسی سیلاب میں مجاہدین کا مرکز ستھانہ بھی تباہ ہو گیا، جسے سید نصیرالدین نے بڑی محنت سے آباد کیا تھا۔ مجاہدین جو بہت کم تعداد میں باقی رہ گئے تھے، انھوں نے میر اولاد علی کو اپنا امیر مقرر کر لیا جو اس سے قبل مولوی نصیرالدین منگلوری کی شہادت کے بعد تھوڑی سی مدت کے لیے منصب امارت پر متمکن رہ چکے تھے۔

اہل و عیال:

سید مرحوم کی شادی حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی اور ہجرت کے وقت ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہ تھا' دوسرے کا عبدالحکیم ____ جہاد کے لیے گھر سے نکلے تو دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بعض مکاتیب میں ان کی تعلیم کے لیے تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں

اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں:

امید از مالک خود قوی دارند کہ او جل جلالہ ما و شما را در دار دنیا بہ ملاقی ملاقی کنانند و در ہر امر توکل بر خدا باید کرد، و استقامت بر نمازِ مفروضہ و تلاوتِ قرآن باید نمود، و غفلت در زکوٰۃ نہ باید کردہ و در تعلیم عبداللہ و عبدالحکیم باید کوشید، و دل را با ہر دو فرزنداں باید چسپانید، و در وقت نشست و برخاست و قیام و قعود نام خدا باید گرفت ❶۔

''یعنی خدا سے قوی امید رکھیے کہ وہ ہم اور آپ کو اس دنیا میں حسب مراد ملائے گا۔ ہر کام میں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ فرض نماز اور تلاوت قرآن پر استقامت ضروری ہے۔ ادائے زکوٰۃ میں غفلت نہ ہو۔ عبداللہ اور عبدالحکیم کی تعلیم کے لیے کوشش کیجیے۔ دل دونوں بیٹوں میں لگایئے۔ اٹھتے بیٹھتے خدا کا نام لیتے رہیے''۔

یہ ان کے ایک مکتوب کے الفاظ ہیں، لیکن ہجرت سے لے کر وفات تک اس دنیائے فانی میں اپنے اہل وعیال سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی، جس طرح کہ ہجرت کے بعد سید احمد شہید اپنے بال بچوں سے نہیں مل سکے۔ غالب خیال یہ ہے کہ ان کے بیٹے اور بیوی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں کہ مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی نے لکھا ہے کہ مولانا سید نصیر الدین کے اولاد نہ چلی۔ البتہ ان کے بھائی سید ناصر الدین کے ایک فرزند سید معز الدین تھے اور سید معز الدین کے فرزند سید ظہیر الدین احمد تھے جن سے مولانا سید عبدالحی نے ۱۸۹۵ء میں ملاقات کی تھی۔ انہی سید ظہیر الدین احمد نے ولی اللہی خاندان کی بیشتر تصنیفات چھپوائی تھیں، بلکہ اس غرض سے ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔

۱۱۶- مفتی نظام الدین سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر ''سورت'' ہے جسے کئی سو سال مہد علم کی حیثیت حاصل رہی اور بے شمار علما وفقہا نے وہاں جنم لیا اور مسانِد تدریس آراستہ کیں۔ وہ تصنیف وتالیف میں بھی شہرت یاب ہوئے اور تصوف وطریقت کے میدان میں بھی درجہ کمال حاصل کیا۔ غرض وہ تمام اصنافِ فضیلت اور تمام اقسامِ علم میں ممتاز ہوئے اور ہر شعبہ فن میں ان کا جھنڈا بلند رہا۔ ان حضرات عالی مقام کے تذکار سلسلہ فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں بہت سے مقامات میں احاطہ تحریر میں آ چکے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کا سورت بھی علم وعلما اور فقہ وفقہا کے سلسلے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس صدی میں اس سرزمین کے جن اہل علم اور اصحاب فقہ نے نام پیدا کیا، ان میں مفتی نظام الدین سورتی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ یہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اپنے والد محترم مفتی خیر الدین سورتی سے حصولِ علم کیا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔

❶ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۱۵۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سورت کے منصب افتا پر فائز ہوئے۔ فقہی مسائل کے لیے سورت اور اس کے قرب و جوار کے لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کا مطالعہ علم فقہ بہت وسیع تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سورت کے اس عالم وفقیہ نے ۲۸ رجب ۱۲۴۰ھ/ ۱۸ مارچ ۱۸۲۵ء کو سورت میں وفات پائی ❶۔

۱۱۷۔ مفتی نظر محمد سہسوانی

سید مفتی نظر محمد حسینی مودودی سہسوانی علم و فضل اور مشیخیت و صالحیت میں عالی مرتبت لوگوں میں سے تھے، مولانا سید مفتی محمد ہاشم کے فرزند اور مفتی محمد عاقل حسینی سہسوانی کے پوتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۸ء کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے والد مفتی محمد ہاشم سہسوانی کا شمار اپنے دور کے جید علما میں ہوتا تھا، اور سہسوان میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لائق بیٹے نے انہی سے اکتساب علم کیا اور مرتبہ بلند پر فائز ہوئے۔ ولایت و معرفت اور شریعت و طریقت کے رموز سے آگاہ تھے اور اس میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

مفتی نظر محمد نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ اسی اثنا میں والد مکرم مفتی محمد ہاشم نے وفات پائی جو مغلیہ حکومت کی طرف سے سہسوان اور اس کے ارد گرد کے منصب افتا پر متمکن تھے۔ والد کی وفات کے بعد اس اہم منصب پر مفتی نظر محمد کو متعین کیا گیا۔ اگرچہ یہ کم عمر تھے اور منصب افتا بہت ذمہ دارانہ منصب تھا، لیکن مفتی نظر محمد نے اپنے مفوضہ فرائض حسن وخوبی سے انجام دیے۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔

اس دوران میں ان کی زندگی ایک عجیب انقلاب سے دوچار ہوئی اور وہ ذکر و فکر اور مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ ایک دور ایسا آیا کہ آبادی سے نکل بھاگے اور صحرا میں ڈیرہ لگا لیا۔ کافی مدت بعد گھر آئے اور تجرد کی زندگی اختیار کر لی۔ ہر وقت مشغول عبادت رہتے، کسی سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ کچھ طبیعت سنبھلی تو دور و نزدیک سے بے شمار لوگ حصول فیض کے لیے حاضر ہونے لگے۔ فقرا و مساکین اور مہمانوں کا ہر آن جمگھٹا رہتا۔ تمام جائداد غربا و مساکین اور یتامی و مستحقین میں بانٹ دی۔ اعزہ و اقارب کو بھی بہت کچھ عنایت کیا۔ وہ مغل بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ بادشاہ علما و فقہا اور مشائخ و صلحا کا عقیدت مند تھا۔ اس کو مفتی نظر محمد کی کیفیت کا پتا چلا تو اس نے چار زرخیز گاؤں بہ طور جاگیر عطا کیے۔

مفتی محمد نصر سہسوانی جب جذب و حال کی وجہ سے منصب افتا سے علیحدہ ہو گئے تو مغل حکمران نے اس منصب پر ان کے بیٹے سید مفتی نور احمد کو متعین کر دیا۔

مفتی نظر محمد سہسوانی نے جمعے کے دن ۱۴ ذیقعدہ ۱۲۳۶ھ/۱۳۔ اگست ۱۸۲۱ء کو وفات پائی ❷۔

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۰۳۔ بحوالہ حقیقت سوات

❷ حیات العلما، ص ۱۹ تا ۲۱۔

۱۱۸- مفتی نعمت اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی میں مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی کو کبار فقہا اور مشاہیر اساتذہ میں گردانا جاتا تھا۔ ہیئت، ہندسہ، حساب وغیرہ فنون ریاضیہ میں لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

مفتی نعمت اللہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں، تمام گھرانا دولت علم سے مالا مال تھا۔ خود ان کے والد مفتی نور اللہ انصاری کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ ان کے عم محترم مفتی ظہور اللہ انصاری بھی مسند تدریس پر رونق افروز تھے۔ نعمت اللہ نے انہی دونوں سے تعلیم پائی اور مختلف اصناف علم میں ممتاز ہوئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یوپی کے ایک شہر فیض آباد کا عہدہ افتا ان کے سپرد ہوا۔ یہ ایک عہدہ جلیلہ تھا جو حکومت کی طرف سے اسی عالم کو تفویض کیا جاتا تھا جو علم فقہ میں مہارت رکھتا ہو۔ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیے گئے اور ایک مدت تک فیض آباد اور لکھنؤ کی مسند افتا پر مامور رہے۔

بعد ازاں علاقہ گجرات کے رئیس کی دعوت پر ''بڑودہ'' گئے۔ پھر علاقہ بہار کے ایک مقام ''بیا'' تشریف لے گئے۔

مفتی نعمت اللہ ذکاوت و حلاوت، حلم و تواضع اور دیانت و متانت میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ گفتگو میں نہایت نرم۔ طلبا کو درس بھی ٹھہر ٹھہر کر دیتے۔ جو کتاب پڑھانا ہوتی' اس کے متعلق تمام تفصیلات بیان کرتے اور جو مقام پڑھاتے اس کے حواشی و تشریحات وغیرہ اچھی طرح طلبا کے ذہن نشین کراتے۔ نحیف الجثہ بزرگ تھے اور اس قدر آہستہ بات کرتے کہ قریب بیٹھا ہوا شخص بھی مشکل سے سمجھ پاتا۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا جن میں مولانا عبدالحلیم انصاری، ان کے بیٹے مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور خود مفتی نعمت اللہ کے صاحب زادے مولانا فضل اللہ انصاری شامل ہیں۔

مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء کو وفات پائی ❶۔

۱۱۹- مولانا نقی علی خاں بریلوی

مولانا نقی علی خاں بریلوی تیرھویں صدی ہجری میں اپنے نواح کے معروف عالم اور فقیہ تھے۔ پٹھان برداری سے تعلق رکھتے تھے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ نقی علی بن رضا علی کاظم علی بن اعظم شاہ بن

❶ تذکرۂ علمائے فرنگی محل' ص ۱۸۳ تا ۱۸۵۔ احوال علمائے فرنگی محل' ص ۸۷'۹۷۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۴۳۔ نزہۃ الخواطر' ج ۷' ص ۵۰۶۔

سعادت یار ـــــ!

نقی علی غرہ رجب ۱۲۴۶ھ/ جنوری ۱۸۳۱ء کو بانس بریلی میں پیدا ہوئے اور کتب درسیہ اپنے والد ماجد مولانا رضا علی سے پڑھیں۔ سید آل رسول مارہروی سے اخذ طریقت کیا اور ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء کو ان سے سند حدیث لیے ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں حج بیت اللہ کیا اور مکہ مکرمہ میں شیخ احمد زین دحلان سے حدیث کی سند لی۔

اہل حدیث کے شدید مخالف تھے۔ مولانا اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کے رد میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اپنے مخالفین پر سخت تنقید کرتے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:۔

۱۔ الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح۔ سورہ الم نشرح کی تفسیر۔

۲۔ وسیلۃ النجاۃ: یہ کتاب نبی ﷺ کی سیرت طیبہ سے متعلق ہے۔

۳۔ سرور القلوب فی ذکر المحبوب: یہ وسیلۃ النجاۃ کی تلخیص ہے۔

۴۔ جواھر البیان فی اسرار الارکان: نماز روزہ وغیرہ ارکان دین کے بارے میں۔

۵۔ اصول الرشاد فی تصحیح مبانی الفساد: نجدیوں کے ردو ابطال میں۔

۶۔ ھدایۃ البریہ الی الشریعۃ الاحمدیہ: ان متعدد فرقوں کے رد میں جو ان کے نزدیک فساد انگیزی میں مصروف تھے۔

۷۔ ازاقۃ الاثام لمانعی المولد والقیام:

۸۔ ازالۃ الاوھام: نجدیوں کے رد میں۔

۹۔ تزکیۃ الایقان فی رد تقویۃ لایمان: مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی کتاب (تقویۃ الایمان) کی تردید میں۔

۱۰۔ فضل العلم و العلماء:

۱۱۔ الکواکب الزھراء فی فضائل العلم و آداب العلماء:

۱۲۔ الروایۃ الرویہ فی اخلاق النبویہ:

۱۳۔ النقادۃ النقویہ فی الخصائص النبویہ:

۱۴۔ لمعۃ النبراس فی آداب الاکل واللباس۔

۱۵۔ التمکین فی تحقیق مسائل التزئین۔

۱۶۔ احسن الرعاء لآداب الدعاء۔

۱۷۔ خیر المخاطبہ فی المحاسبۃ والمراقبہ۔

۱۸۔ ھدایۃ المشارق الی سیر الانفس والافاق۔

۱۹۔ ارشاد الاحباب الی آداب الاحتساب۔

۲۰۔ اجمل الفکر فی مباحث الذکر۔

۲۱۔ عین المشاهده لحسن المجاهده۔

۲۲۔ تشوق الاواۃ الی طرق محبۃ اللہ۔

۲۳۔ نہایۃ السعادہ فی تحقیق الھمۃ والارادہ۔

۲۴۔ اقوی الذریعہ الی تحقیق الطریقہ۔

۲۵۔ ترویج الارواح فی تفسیر سورۃ الانشراح۔

مولانا نقی علی خاں بریلوی نے ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ/ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو وفات پائی❶۔

۱۲۰-مفتی نور احمد سہسوانی

سہسوان (یوپی) کے تیرھویں صدی ہجری کے علما وفقہا میں ایک بزرگ سید مفتی نور احمد حسینی سہسوانی تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مفتی نظر محمد اور جد امجد کا مفتی ابو محمد تھا۔ مغل دور میں اس خاندان کے علما اپنے شہر سہسوان کے مفتی تھے اور یہ سلسلہ عہد مغلیہ کے آخر تک جاری رہا۔ مفتی نور احمد بھی افتا کے عہدۂ عالی پر متمکن تھے اور اپنے وقت کے عالم اور فقیہ تھے۔ تدین وصالحیت میں بھی شہرت رکھتے تھے۔

نور احمد ۱۱۸۰ھ/ ۱۷۶۷ء کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ چند سال کی عمر کو پہنچے تو حصولِ علم کے لیے مراد آباد، رام پور اور لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہاں کے مختلف علما واساتذہ سے ملے اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں خاص طور سے لائق تذکرہ شخصیت بحر العلوم عبد العلی انصاری فرنگی محلی کی ہے۔

نور احمد سہسوانی کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں کتابوں پر حواشی وتعلیقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے درسیات کی مشکل ترین کتابوں کا انتخاب کیا۔ مثلاً قاضی مبارک کی ''شرح سلم'' پر تعلیقات سپرد قلم کیں، ملا محمود جون پوری کی ''شمس البازغہ'' پر تعلیقات وحواشی تحریر فرمائے۔

تعلیم سے فراغ کے بعد اپنے والد مفتی نظر محمد کی جگہ سہسوان کے مفتی مقرر ہوئے اور چالیس برس تک بے حد محنت سے یہ نازک ترین خدمت انجام دیتے رہے۔

فارسی کے شاعر تھے۔ ایک مثنوی گلشن عشق لکھی جو یوسف زلیخا کی طرز پر ہے۔

مفتی نور احمد دینی اور دنیوی وجاہت کے مالک تھے۔ امارت وثروت سے بہرہ ور اور علم وکمال سے سرفراز تھے۔

مفتی صاحب نے ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۴ء کے قریب سہسوان میں انتقال کیا❷۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۴، ۲۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۸، ۵۰۹۔

❷ حیات العلماء ص ۲۱، ۲۲۔

۱۲۱- مفتی نور اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے فرنگی محلی علما کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آسانی سے اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے بہت سے حضرات کا تذکرہ اس کتاب کے مختلف مقامات میں ہو چکا ہے۔ انھی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی تھے جو مولانا محمد ولی کے فرزند گرامی اور مولانا غلام مصطفے انصاری کے پوتے تھے۔ اپنے دور کے معروف عالم وفقیہ تھے۔

اس نامور عالم کی ولادت اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد مولانا محمد ولی اور مفتی عبدالواجد خیر آبادی سے حصولِ علم کیا۔ حساب وریاضی وغیرہ علوم میں ماہر تھے۔ لکھنؤ کے منصب قضا پر متعین رہے۔ درس و افادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ مختلف کتب درسیہ پر حواشی وتعلیقات ان سے یادگار ہیں۔ جبر ومقابلہ کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔

توضیح مطالب میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ طالب علم اور سائل کے سامنے اس اسلوب سے بات کرتے کہ تمام مطالب اچھی طرح اس کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔

مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں وفات پائی [1]۔

۱۲۲- مولانا نور محمد سوتری

ہندوستان کا ضلع ''حصار'' آزادی سے قبل متحدہ پنجاب میں شامل تھا۔ آزادی کے بعد یہ مشرقی پنجاب میں آیا۔ بعد ازاں حکومت ہند نے اپنی انتظامی اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مشرقی پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک حصہ صوبہ ''ہریانہ'' کے نام سے موسوم ہوا، ایک ''ہماچل پردیش'' کے نام سے اور ایک مشرقی پنجاب کے نام سے ____! اس تقسیم کی رو سے ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ میں شامل کردیا گیا۔

اضلاع پنجاب میں ابتدا ہی سے حصار کا ضلع مال ودولت اور زراعت کے اعتبار سے پس ماندہ ضلع تھا اور عام طور پر قحط کی زد میں رہتا تھا۔ بایں ہمہ اس کے بعض مقامات علمی اعتبار سے پر ثروت تھے اور انھیں علما و فضلا اور صوفیا واتقیا کے مساکن ومراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان مقامات میں حصار، سرسہ، ڈربی، رانیاں، جلال آباد، اور روڑی کے بلاد وقصبات قابل ذکر ہیں۔

ضلع حصار کی تحصیل سرسہ میں ایک ''ندی'' تھی جو خاصی چوڑی اور گہری تھی۔ یہ ندی عام طور پر خشک رہتی تھی۔ بارشوں کے موسم میں اگر کھل کر بارشیں ہوتیں تو ندی خوب بہتی اور کناروں سے اچھل پڑتی۔ وہاں کے لوگ اسے ''نالی'' کہتے تھے۔ دراصل یہ دریائے گھاگرا تھا۔ اس کے ارد گرد کے علاقے کو وہاں کی بولی میں

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۷۔

سوتر کہا جاتا تھا۔ وہیں تحصیل سرسہ میں ایک گاؤں ''رانیاں'' تھا۔

صاحب ترجمہ مولانا نور محمد ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) کو اسی گاؤں ''رانیاں'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا تخلص نور تھا اور انھیں ''نور محمد نور سوتری'' کہا جاتا تھا۔ والد کا نام چودھری جھنڈا تھا، جوئیہ برادری سے تعلق رکھتے تھے جو راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔

چودھری جھنڈا اپنے دور کا مشہور ڈاکو اور راہزن تھا۔ اس کی عادت تھی کہ امیروں کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس لحاظ سے غریب اسے اچھا آدمی سمجھتے اور امیر سخت برا قرار دیتے تھے۔

اس کے بیٹے نور محمد کو بدو شعور ہی سے اس کام سے نفرت تھی اور وہ باپ کے اس کاروبار کو غلط قرار دیتے تھے۔ وہ آٹھ نو سال کے ہوئے تو مسجد میں جانا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ''رانیاں'' کے امام مسجد سے حاصل کی اور باپ ان کی راہ میں نہ صرف یہ کہ مزاحم نہیں ہوا بلکہ اس نے بیٹے حوصلہ افزائی کی۔

نور محمد جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے گئے، حصولِ علم کا شوق افزوں سے افزوں تر ہوتا گیا۔ جب دیکھا کہ گاؤں اور اس کے جوار و نواح میں کوئی شخص اتنی قابلیت کا نہیں کہ انھیں مزید تعلیم دے سکے تو دہلی کا رخ کیا اور وہاں کے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرنے لگے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں دست رس حاصل کی۔ دہلی سے بریلی گئے۔ وہاں کے بعض اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا، لیکن ان دونوں شہروں ـــــ دہلی اور بریلی ـــــ میں کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کن کن طلبا کے ساتھ مل کر پڑھیں؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں کہ وہ معقولات و منقولات میں مہارت رکھتے تھے اور صاحب بصیرت عالم تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب فارغ التحصیل ہوئے اور کن بزرگوں سے سند فراغت لی۔ اگر وہ بیس سال کی عمر میں بھی دہلی گئے ہوں تو ملک کی حکمرانی کے اعتبار سے وہ مغلوں کا دور تھا اور درس و تدریس کی زمامِ حکمرانی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندان گرامی اور ان کے ارشد تلامذہ کے ہاتھ میں تھی۔ کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کو نور محمد نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہوگا۔

علوم سے فراغ کے بعد وہ وطن واپس آئے اور ضلع حصار کے ایک گاؤں ''ہیکڑ'' میں سکونت اختیار کی۔ وہیں سے انھوں نے وعظ و تبلیغ کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسی گاؤں یعنی ہیکڑ ہی کے دوران قیام میں ان کی شادی ہوئی۔

وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور معروف ترین مبلغ تھے۔ اسی زبان کو انھوں نے وعظ و ارشاد اور اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ وہ توحید الٰہی کی نشر و اشاعت میں بالخصوص بہت سخت تھے اور اس میں کسی کی پروا نہ کرتے۔ اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک اساتذہ کا اثر اور دوسرے اپنے علاقے کا ماحول۔

ان کا زیادہ وقت تبلیغ و اشاعت میں گزرتا اور عام طور پر سفر میں رہتے۔ نہایت متوکل علی اللہ تھے اور رضائے الٰہی ان کا شیوہ تھا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کافی عرصے کے بعد گھر لوٹے تو بیوی نے شکایت کی کہ گھر میں کھانے پکانے کے لیے کچھ نہ تھا، اگر بھینس نہ ہوتی تو ہم بھوک سے مرجاتے۔ آپ کی غیر حاضری میں بھینس کے دودھ اور گھی کی فروخت سے گزر بسر ہوتی رہی۔ بیوی کے یہ الفاظ سنتے ہی چھرا پکڑا اور بھینس ذبح کرڈالی۔ فرمایا دینے والا تو اللہ ہے، تم نے بھینس پر بھروسا کیا، لو آج میں نے اسے ختم کردیا۔

حق گوئی اور راست بازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حصار کا نواب ان کے پاس آیا اور کہا: ''آپ لوگوں کو کافر قرار دیتے اور سخت زبان استعمال کرتے ہیں''

فرمایا: ''جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اور شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔''

نواب نے پوچھا: ''ایسا کون شخص ہے؟''

فرمایا: ''تم''

بولا: کیسے؟

فرمایا: ''شریعت اسلامی نے بہ یک وقت چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی، لیکن تمھاری چار سے زیادہ ہیں۔''

نواب خاموش ہوگیا۔ واپس آکر درباری علما سے پوچھا تو انھوں نے مولانا نور محمد کی تصدیق کی اور کہا ''ہم نے آپ کے ڈر سے آپ کو صحیح مسئلہ نہیں بتایا۔''

نواب نے اسی وقت چار بیویوں کے علاوہ باقی سب کو کچھ روپے دے کر آزاد کردیا۔ یہ ان کی حق گوئی اور زبان کی اثر آفرینی کی ایک مثال ہے۔

مولانا نور محمد نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ کلمہ حق بلند کرنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ہر مسئلہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کرتے اور اس ضمن میں کسی بڑے سے بڑے شخص کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔

ان کی ایک عادت یہ تھی کہ کیڑے مکوڑوں کو خوراک مہیا کرتے اور غربا و مساکین کی جہاں تک ممکن ہوتا امداد فرماتے۔

وہ پنجابی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تمام کتابیں مسائل شرعیہ اور احکام فقہیہ پر مشتمل ہیں۔ زبان و اسلوب کے اعتبار سے نہایت عمدہ کتابیں ہیں جن میں ادبیت کی چاشنی بھی ہے اور بے پناہ روانی بھی۔ انھوں نے اٹھارہ کتابیں تصنیف کیں جو پنجابی نظم میں ہیں۔ ہمیں ان کی صرف چھ کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شہباز شریعت:۔ یہ ان کی مشہور کتاب ہے جو سات ہزار سے زائد اشعار پر محیط ہے۔ یہ کتاب انھوں

نے ۱۸۳۵ء میں تکمیل کی۔ کئی دفعہ چھپی۔ اس کے مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پنجاب کے ممتاز مفسر و عالم، نامور فقیہ اور کتب کثیرہ کے مصنف حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ نے اس پر فارسی زبان میں حواشی تحریر کیے۔ حافظ صاحب مرحوم کی تصنیفات میں ابواب الصرف، انواع محمدی، احوال الآخرت اور زینت الاسلام وغیرہ کے علاوہ تفسیر محمدی بھی شامل ہے جو سات ضخیم جلدوں میں ہے اور پنجابی نظم میں ہے۔ پنجابی زبان میں قرآن مجید کی یہ پہلی تفسیر ہے۔

شہباز شریعت کے علاوہ مولانا نور محمد سوتری کی پانچ کتابیں یہ ہیں:

۲۔ آبِ حیات

۳۔ چراغِ شریعت

۴۔ خورشید شریعت

۵۔ مفادِ شریعت

۶۔ خطباتِ عیدین

مولانا نور محمد سوتری کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ عصر کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر اسی (۸۰) برس کی تھی۔ مہینے کا تعین نہیں ہوسکا۔ البتہ سالِ وفات ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۲ء) کے لگ بھگ تھا۔

انھوں نے اٹھارہ کتابیں، چار بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں ❶۔

۱۲۳۔ مفتی واجد علی بنارسی

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے بنارس میں مفتی واجد علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بنارسی اس نواح کے مشہور فاضل اور علامہ تھے۔ منطق و فلسفہ اور فقہ و کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ تھا۔ ان کے والد ابراہیم کا شمار بھی جید علما میں ہوتا تھا، لائق بیٹے نے باپ سے اور دیگر علمائے عصر سے کسب علم کیا اور مرتبۂ عالی پایا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکومت انگریزی کی طرف سے لکھنؤ کے منصب افتا پر فائز کیے گئے۔ یہ اہم خدمت نہایت ذمہ داری سے انجام دی۔ پھر علاقہ بہار کے ایک شہر ''بیتا'' گئے اور اس نواح کے امیر نے ان کے علم و کمال کی وجہ سے ان کو بعض اونچے مناصب پر متعین کیا۔

مفتی واجد علی یوں تو تمام علوم رسمیہ میں اونچا مرتبہ رکھتے تھے، لیکن فلسفہ و منطق میں اپنے اقران و

❶ پنجابی شاعراں دا تذکرہ، ص ۱۵۵، ۱۵۶

امثال سے فائق تر گردانے جاتے تھے۔

درس وتدریس میں بھی اس نواح میں ان کا شہرہ تھا۔الشفاء الافق المبین کی تدریس میں یگانۂ روزگار تھے۔ قدیم و جدید حواشی وتعلیقات پر عمیق نظر تھی اور محنت سے کتابیں پڑھاتے تھے۔عمر بھر مصروف درس رہے اور لاتعداد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

۲۳ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ/۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو جمعۃ المبارک کے دن وفات پائی❶۔

۱۲۴- سید وحید الحق پھلواروی

مولانا سید وحید الحق بن وجیہ الحق بن امان اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی کبار اساتذۂ ہند میں سے تھے۔ صوبہ بہار کے شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔بعض کتب درسیہ اپنے والد گرامی مولانا وجیہ الحق سے پڑھیں اور مطولات کا درس اپنے ماموں شاہ مبین جعفری سے لیا جو پھلواری میں اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے اور ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔

علوم معقول ومنقول کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو خود مسند تدریس بچھائی اور طلبا کی بہت بڑی جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی۔

حسن اخلاق کے مالک، شیریں کلام، عابد وزاہد اور متقی تھے۔مشتبہات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ حکومت انگریزی کے ملازموں اور خدمت گزاروں کے گھر کا کھانا نہ کھاتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پیش پیش رہتے۔محرم کے دنوں میں جو رسوم کی جاتی ہیں اور عاشورا کے موقعے پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے اس سے لوگوں کو سختی سے روکتے۔کسی معاملے میں تصنع اور تکلف کا اظہار نہ کرتے، سادہ زندگی بسر کرتے، فقرا کا سا لباس پہنتے اور چٹائی پر بیٹھتے۔کسی سلسلے میں دوسروں کو تکلیف میں مبتلا نہ کرتے۔

درس وافادہ ان کا مشغلہ تھا، لاتعداد لوگوں نے ان سے تحصیل کی اور خلق کثیر نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔

تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق تھا۔کچھ کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور بعض کتابیں تصنیف کیں۔تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حواشی هداية الفقه۔

۲۔ قرة العاشقين فى حلية سيد المرسلين یعنی شرح شمائل ترمذی۔

۳۔ تعلیقات بر تفسیر بیضاوی۔

۴۔ زاد آلاخرت۔

۵۔ شرح کلمه طیبه۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۱ بحوالہ حیات سابق۔

۶۔ ذکر الصلوٰۃ۔

۷۔ رسالہ تحقیق الایمان۔

علاوہ ازیں بعض مسائل فقہ سے متعلق کچھ رسالے تحریر کیے۔

سید وحید الحق پھلواروی نے ۲۴ر صفر ۱۲۰۱ھ/ ۱۶ر دسمبر ۱۷۸۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا❶۔

۱۲۴- مولانا ولایت علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے محلّہ صادق پور کے اصحابِ علم اور اربابِ فضل نے اشاعت دین، تبلیغ اسلام اور ترویج کتاب وسنت کے سلسلے میں جو تگ وتاز کی وہ تیرھویں صدی ہجری کے خطہ ہند کی تاریخ علما کا ایک درخشندہ باب ہے۔ غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ جنگ و جہاد میں بھی ان کی عزیمت واستقلال کے نقوش صفحاتِ تاریخ میں ابھرے ہوئے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ مجاہدین کے عالی ہمت گروہ کے فرد فرید تھے جو ددھیال اور ننھیال کی طرف سے با اثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے عہد کے شیخ و امام، عالم ومحدث اور فقیہ و متکلم تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا فتح علی، دادا کا وارث علی اور پر دادا کا محمد سعید تھا۔ نسباً ہاشمی تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں ان کے گھرانے کو امارت وریاست کا درجہ حاصل تھا۔

مولانا ولایت علی کے اسلاف میں ایک بزرگ احمد علی تھے جو صوبہ بہار کے ضلع ''گیا'' کے ایک قصبے ''اردل'' کے قاضی تھے۔ اس خدمت کے صلے اور منصب قضا میں حسن کارکردگی کی بنا پر مغل بادشاہ کی طرف سے انھیں ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ ولایت علی کے نانا جن کی آغوشِ شفقت میں ان کی پرورش ہوئی' رفیع الدین حسن خاں تھے جو صوبہ بہار کے دولت مند اور باوجاہت رئیس تھے۔ وہ مغل حکمران کی طرف سے صوبہ بہار کے آخری گورنر تھے۔

ولایت علی اسی ماحول میں ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) کو پیدا ہوئے۔ شعور کی آنکھیں وا ہوئیں تو حصولِ علم کا آغاز اپنے شہر (عظیم آباد) کے اساتذہ سے کیا۔ (عظیم آباد اس زمانے میں پٹنہ کو کہا جاتا تھا جو صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے) جب مقامی اساتذہ سے اخذ علم کر چکے تو مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا جو اس زمانے میں علم کا گہوارہ اور علما کا محور تھا۔ وہاں مولانا محمد اشرف لکھنوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، ولایت علی اس میں شامل ہو گئے۔

ولایت علی چونکہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے' اس لیے ان کا طرزِ زندگی دوسرے طلبا سے مختلف تھا۔ امیرانہ ٹھاٹھ، عمدہ لباس اور تمام شرکائے درس سے ممتاز اسلوبِ حیات۔

سید احمد شہید سے پہلی ملاقات:

ان کے دور طالب علمی میں امیر المجاہدین سید احمد شہید لکھنؤ گئے تو ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی

---

❶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۸۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۲۳۔

اور گفتگو کا سلسلہ چلا تو فوراً ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ چند روز میں ظاہر و باطن کی کیفیت بدل گئی اور اسی قالب میں ڈھل گئے جس میں سید صاحب کے متعلقین و معتقدین ڈھلے ہوئے تھے۔ سید صاحب کے ہم رکاب ہو کر رائے بریلی کا قصد کیا اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ ان سے بعض درسی کتابیں بھی پڑھنا شروع کیں۔ عبادتِ الٰہی اور تعلیم کے بعد جو وقت بچتا وہ ساتھیوں کی خدمت گزاری میں بسر ہونے لگا اور رئیسانہ اندازِ حیات کو ترک کر کے درویشانہ اور فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے لگے۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔

ایک عجیب وغریب واقعہ:

تذکرۂ صادقہ میں جس کا ایک نام ''الدرالمنثور'' ہے' اس سلسلے کا یہ عجیب وغریب واقعہ مرقوم ہے کہ جب مولانا ولایت علی کے والد ماجد مولانا فتح علی کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا سید احمد بریلوی کے ساتھ رائے بریلی چلا گیا ہے تو اس کے لیے ایک ملازم کے ہاتھ چار سو روپے اور کچھ کپڑے بھیجے۔ اس زمانے میں سید صاحب مہمانوں کے لیے ایک مہمان خانہ تعمیر کر رہے تھے۔ تمام عقیدت منداور خود سید صاحب مہمان خانے کی تعمیر میں مصروف تھے اور مختلف کام کر رہے تھے۔ مولانا ولایت علی ان بزرگوں میں شامل تھے جن کے ذمے گارا تیار کرنا تھا۔ ملازم رائے بریلی پہنچا اور سید صاحب کے ہاں گیا تو مولانا ولایت علی نے ایک موٹا سا کالے رنگ کا تہہ بند پہن رکھا تھا اور تمام جسم گارے میں لتھڑا ہوا تھا۔ ملازم نے خود انہی سے پوچھا کہ ''مولانا ولایت علی کہاں ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا ''میں ہی ولایت علی ہوں۔'' وہ انھیں پہچان نہ سکا بلکہ اظہارِ خفگی کیا کہ ایک پردیسی کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ مولانا اس سے باتیں کر رہے ہیں اور اسے یقین دلا رہے ہیں کہ میں ہی ولایت علی ہوں' لیکن وہ نہیں مانا۔ بالآخر انھوں نے کہا کہ اگر میری بات تمھیں صحیح معلوم نہیں ہوتی تو کسی اور سے پوچھ لو کہ میں کون ہوں۔ جب لوگوں نے یقین دلایا کہ عظیم آباد کا رئیس زادہ یہی ہے تو ملازم نادم بھی ہوا اور سخت حیران بھی ____ اس نے مولانا کو گلے لگا لیا۔ معافی مانگی اور ان کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔ باپ کے بھیجے ہوئے روپے اور کپڑے ان کی خدمت میں پیش کیے تو انھوں نے پکڑ کر اسی طرح دونوں چیزیں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں [1]۔

تبلیغ دین اور وعظ وارشاد:

کچھ عرصہ رائے بریلی گزارنے کے بعد مولانا ولایت علی وطن گئے تو اپنے آپ کو تبلیغ دین اور وعظ و ارشاد کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی شب و روز کی کوششوں سے ان کے خاندان کے تمام افراد اور اعزہ واقربا سید

[1] تذکرہ صادقہ' ص ۱۱۲

صاحب کے حلقۂ بیعت وارادت میں داخل ہو گئے، جن میں ان کے والد مولانا فتح علی اور بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین شامل ہیں۔ باقی اعزہ واقربا میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الٰہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ غرض ان کے متعلقین میں سے تمام لوگ سید سے وابستہ ہو گئے اور ان کی عقیدت وارادت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ پھر ان حضرات نے تحریک مجاہدین اور تحریک وہابیت میں جو قربانیاں دیں اور جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس موضوع کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ ان حضرات میں سے بعض کے کارنامے ''فقہائے ہند'' کی آٹھویں جلد میں اور بعض کے ''فقہائے ہند'' کی نویں جلد کے مقدمے میں بیان کیے جا چکے ہیں اور بعض کے زیر مطالعہ کتاب میں مرقوم ہیں۔

خدماتِ دینی کی وسعت:

مولانا ولایت علی کی خدماتِ دینی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ابتدا میں سید احمد شہید کے ساتھ ہجرت کر کے بغرضِ جہاد سرحد گئے، لیکن سید صاحب نے ان کو اس لیے واپس بھیج دیا کہ حیدر آباد (دکن) جا کر دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دیں۔ اس نواح میں وہ تقریباً چار سال رہے اور خوب کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد بالاکوٹ کا واقعہ پیش آیا اور سید صاحب اور ان کے رفقا جام شہادت نوش کر گئے۔ انھی دنوں مولانا ولایت علی کے والد مولانا فتح علی کا انتقال ہو گیا، پھر وہ مختلف مقامات سے ہوتے اور فریضۂ تبلیغ انجام دیتے ہوئے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ کچھ مدت وہاں رہے۔ اس کے بعد بہار، بنگال، اڑیسہ اور الٰہ آباد میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم کیا۔ طریق تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود اور ان کے مقرر کیے ہوئے داعی ایک ایک قریے اور ایک ایک گاؤں میں جاتے، مسلمانوں کو پابند شریعت بناتے، مسجدیں آباد کرتے اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ جاری کر دیتے[1]۔

تذکرۂ صادقہ میں اس ضمن میں بتایا گیا ہے۔

''اشاعت دین میں آپ کی ان تھک کوشش غرب و شرق، شمال و جنوب، کل کو محیط تھی۔ مجمعوں اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بھی بغرض تبلیغ و پند پہنچتے اور نور بافوں کو کرگاہ میں جا کر اور کسانوں کو ان کے کھیتوں پر پہنچ کر اللہ کی اطاعت و بندگی کی ترغیب دیتے اور ان کی بدزبانی اور غیظ و غضب کو شربت کی طرح نوش کر جاتے۔ آپ اپنے دوروں میں قریہ قریہ فروکش ہوتے جاتے اور اللہ کی باتیں پہنچاتے جاتے، اسی لیے اپنی قیام گاہ تک پہنچنے میں مہینوں اور برسوں کی آپ کو دیر لگتی[2]۔''

---

[1] سرگزشتِ مجاہدین ص ۲۲۸۔

[2] تذکرہ صادقہ ص ۱۶۔

تعلیم وتدریس:

قیام وطن کے دوران میں باقاعدہ تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور ظہر سے عصر تک لوگوں کو قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ تذکرہ صادقہ میں مرقوم ہے۔

''مولوی عبداللہ آپ کے خلف اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علما ایک ایک تفسیر ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علما کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی۔ قرآنِ مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے تاکہ لوگ اللہ کی مرضی اور غیر مرضی (یعنی امر ونہی) سے آگاہ ہو جائیں۔ ان پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور دعاؤں کے معانی اور مطالب سے خوب آگاہ ہوتے ❶۔''

یہ بھی منقول ہے کہ جب وطن میں اقامت گزیں ہوتے تو ہر منگل کے دن نمازِ مغرب کے بعد اپنے گھر میں وعظ کہتے۔ ایک جانب پانچ چھ سو عورتیں جمع ہوتیں، دوسری جانب پانچ چھ ہزار مرد ____ وعظ میں بہت تاثیر تھی، جو سنتا اس کی قلبی حالت بدل جاتی۔

وعظ کی اثر انگیزی:

ان کا وعظ نہایت مؤثر اور پرتاثیر ہوتا تھا۔ جو بات کہتے دل کی گہرائیوں میں اترتی جاتی۔ ان کے مواعظ حسنہ سے بے شمار لوگوں نے بدعات ومحدثات سے توبہ کی اور کتاب وسنت پر عامل ہوئے۔ اس عالم باعمل کے مواعظ کی اثر آفرینی کے بارے میں سید نواب صدیق حسن خاں تحریر فرماتے ہیں۔

''مولوی ولایت علی قنوج میں تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدۂ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب ''بلوغ المرام'' ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا ____ جو اثر سریع میں نے وعظ مولوی ولایت علی مرحوم میں پایا، کسی کے وعظ میں دیکھا نہ سنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے بالکل سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہ دل سے اٹھتا تھا❷۔''

کتب دینیہ کی اشاعت کا اہتمام:

مولانا ولایت علی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ ودعوتِ دین میں گزرتا تھا۔ انھوں نے وعظ وتقریر کو بھی اپنا معمول ٹھہرایا اور کتب دینیہ کی طباعت واشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ اس کے لیے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا

❶ تذکرہ صادقہ، ص ۱۶۔

❷ ابقاء المنن، ص ۱۲۔

ترجمۂ قرآن اور شاہ محمد اسحاق دہلوی اور مولانا شاہ اسماعیل کے رسائل منگوائے اور انھیں لکھنؤ کے مطبع حسینی سے چھپوانے کی کوشش۔ وہاں یہ نہ چھپ سکے تو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان بردوانی کو اس اہم اور بنیادی کام کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ مولوی صاحب ممدوح نے دس ہزار روپے میں ٹائپ کا پریس خریدا اور بہت سی دینی کتابیں اس میں چھاپ کر شائع کیں ❶۔

حج بیت اللہ:

مولانا ولایت علی نے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ بنگال کا دورہ کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ پھر بہار میں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شہر سورج گڑھ گئے‘ وہاں وعظ و نصیحت کی‘ جس میں سید نذیر حسین بھی شامل ہوئے اور ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد ازاں اہل و عیال سمیت کلکتے سے بذریعہ جہاز بمبئی پہنچے۔ دو مہینے وہاں قیام رہا۔ پھر حجاز تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ وہاں مشہور محدث شیخ عبداللہ سراج سے سند حدیث حاصل کی۔ شیخ موصوف نے سند دے کر فرمایا‘ مولانا ولایت علی نے حدیث کے الفاظ کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے ان سے حاصل کی۔“

حج کے بعد وہ نجد‘ عمیر اور یمن گئے اور قاضی محمد بن علی شوکانی سے ملے اور ان سے سند حدیث لی۔ اسی اثنا میں حضر موت‘ مخا‘ حدیدہ‘ مسقط اور سوڑان کے شہر سواکن کا سفر کیا۔ پھر بذریعہ جہاز کلکتے آئے اور وارد وطن ہوئے۔

چھوٹے بھائی کا کردار:

مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی تھے۔ وہ بھی سید احمد شہید سے بیعت تھے۔ وعظ و تبلیغ اور اشاعت دین کے بارے میں ان کا کردار بھی بہت اونچا تھا۔ وہ بھی علاقۂ سرحد میں سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے گئے تھے۔ انھیں بھی سید صاحب نے بنگال میں دعوت کے لیے مامور کر دیا تھا۔ ان کا مرکز دعوت ضلع جیسور میں موضع ”حاکم پور“ تھا۔ بہت سے لوگ ان کے معاون و مددگار تھے۔ جیسور‘ ندیا‘ فرید پور‘ راج شاہی‘ مالدہ اور بوگرا کے علاقے ان کی تبلیغی تگ و تاز کے خاص مراکز تھے اور ان علاقوں کے بے شمار لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ پھر وہ اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کی ہدایات کے مطابق یہ خدمت دینی سر انجام دینے لگے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں جاتے‘ پہلے یہ دیکھتے کہ مسجد ہے یا نہیں۔ اگر ہوتی تو کسی مناسب آدمی کو امام مقرر کر دیتے‘ اگر نہ ہوتی تو مسجد تعمیر کرا دیتے۔ اس طرح انھوں نے بہت سی مسجدیں آباد کیں اور تعمیر کرائیں۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ امام مسجد کا کام صرف نمازیں پڑھانا اور دینی کتابیں پڑھانا ہی نہ تھا‘ بلکہ اپنے علاقے کے نزاعی معاملات

❶ تذکرہ صادقہ ص ۱۶

کے فیصلے کرنا بھی اس کے ذمے تھا۔ سید صاحب اور ان کے اصحابِ عقیدت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریزوں کی عدالتوں میں نہیں جانا چاہیے' اس سے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔

سکھوں کی باہمی کش مکش:

مولانا ولایت علی اور عنایت علی بنگال میں سرگرم دعوت و تبلیغ بھی تھے اور ساتھ ہی ان علاقوں سے مجاہدین بھی تیار کر رہے تھے' اس لیے کہ ان کا اصل مقصد سرحد کے مرکز مجاہدین میں جا کر سکھوں سے جہاد کرنا تھا۔ اس ضمن میں وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ جیسے ہی حالات سازگار ہوں' سلسلۂ جہاد شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ وقت نے پلٹا کھایا اور حالات سازگار ہوئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ رنجیت سنگھ نے تقریباً چالیس برس پورے پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں حکومت کی۔ ۱۸۳۹ء میں اس کی موت واقع ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا کھڑک سنگھ تھا جو بالکل نااہل تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ تخت نشین ہوا' لیکن ڈیڑھ سال بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا نونہال سنگھ تھا جو اسی دن ایک حادثے کی نذر ہو گیا' جس دن اس کا باپ کھڑک سنگھ مرا تھا۔ رنجیت سنگھ کے خاندان میں نونہال سنگھ سب سے قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۴۱ء میں رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ نے مسند حکومت سنبھالی۔ یہ ستمبر ۱۸۴۳ء میں اجیت سنگھ سندھاں والیہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے نوعمر بیٹے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سکھوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کو دھڑا دھڑ قتل کر رہے تھے اور سکھ حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ بالآخر ۱۸۴۳ء میں رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا گیا جو اس وقت صرف چھ سال کا بچہ تھا۔ کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی تھی۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود سکھوں کی باہمی کش مکش اور لڑائیوں کا سلسلہ بند نہ ہوا۔۔۔۔ سکھوں کی آپس کی لڑائیوں کو روکنے کے لیے ان کے بعض سرکردہ لوگوں نے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی تا کہ توجہ ادھر مبذول ہو جائے۔ انگریزوں سے انھوں نے پے در پے شکستیں کھائیں اور آخر صلح پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں کو پنجاب کے بہت سے علاقے بھی دیے اور تاوان جنگ بھی ادا کیا۔

اس اثنا میں انگریزوں نے پورا کشمیر اور ہزارے کا بالائی حصہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا' جس نے سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور اسے انگریزوں کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا۔

اس کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی ایک اور جنگ ہوئی' جس کے نتیجے میں سکھوں کے باقی ماندہ علاقوں پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور سکھوں کی عمل داری کے نقوش صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔۔۔۔ ہندوستان کے بعض علاقوں پر یہ سکھوں کی پہلی اور آخری حکومت تھی جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ان کی باہمی خوں ریزیوں کی وجہ سے چند سالوں میں ختم ہو گئی۔

سکھوں کے خلاف ہنگامے:

جب سکھ حکومت کے مرکز پنجاب میں ان کو پے در پے شکست ہونے لگی اور آپس کی لڑائیوں نے ان کو کمزور کر دیا تو سرحدی علاقوں میں بھی ان کے خلاف ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہزارہ اور کاغان میں بالخصوص ان کی مخالفت میں شدت پیدا ہوئی۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں کے باشندوں پر سکھوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان کو مبتلائے اذیت کیے رکھا تھا۔ اب سکھوں کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑی تو انھوں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور سرحد کے مختلف بلاد و قصبات کے رئیس اور بااثر لوگ میدانِ عمل میں نکل آئے۔ اس سلسلے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ مسلمان موقعے کی تلاش میں تھے' جوں ہی انھیں موقع ملا' وہ سکھوں پر چڑھ دوڑے اور ان کے بعض عمال کا مقابلہ کر کے ان علاقوں سے مار بھگایا۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں نے اپنے عامل اور سردار بھی مقرر کر لیے۔ ان آزاد کردہ مقامات کے سرداروں میں سے ایک بزرگ سید اکبر شاہ ستھانوی تھے۔

مولانا ولایت علی کو دعوت:

ان منتخب اور مقرر کردہ رؤسا میں سے کچھ حضرات نے مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور فضا سازگار ہے' آپ تشریف لائیں' جہاں کہیں سکھ موجود ہیں' ان کے خلاف جہاد کریں اور ان کو یہاں سے نکال کر اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔ مولانا ولایت علی اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا تبلیغی اور دعوتی دورہ کر رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی بنگال میں سرگرم دعوت و ارشاد تھے۔ مولانا ولایت علی نے سرحد کے رؤسا کا پیغام سنتے ہی مولانا عنایت علی کو اطلاع بھیجی' انھیں سرحد کی صورتِ حال سے باخبر کیا اور کہلا بھیجا کہ وہ سرحد جائیں اور وہاں جا کر سلسلۂ جہاد کا آغاز کریں۔ وہ بھائی کا پیغام ملتے ہی دو ہزار مجاہدین کے ساتھ اپنے گھر عظیم آباد پہنچے۔ اس سے انگریزی حکومت کے ہندوستانی کارکنوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت مولانا ولایت علی بھی عظیم آباد میں تھے۔ انھوں نے مصلحت و احتیاط کے پیش نظر دو ہزار مجاہدین کی یہ جمعیت منتشر کر دی اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں بنا کر انھیں سرحد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو سرحد روانہ کرنے کا آغاز جمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) سے ہوا' جو کچھ عرصہ جاری رہا۔ یہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں ''پکھلی'' پہنچے جو نواح ہزارہ میں واقع ہے۔ ان کے سرکردہ اور معروف حضرات میں سے مولانا عنایت علی' مولانا ولایت علی کے بیٹے مولانا عبداللہ' میر اولاد علی سورج گڑھی' مولوی مقصود علی' مولوی کرم علی اور مولوی زین العابدین قابل ذکر ہیں۔

بالاکوٹ پر قبضہ:

ان ہندی مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی مقامی لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جو پہلے سے ان کے انتظار میں تھے اور جن کی دعوت پر یہ وہاں پہنچے تھے۔ سب نے مل کر جہاد شروع کر دیا۔ کاغان اور ہزارہ کے مختلف علاقوں کے لوگ ان کے معاون اور رفیق جہاد تھے۔ مجاہدین نے اس قدر شدید حملے کیے کہ شنکیاری' بیرکھنڈ' گڑھی حبیب اللہ خاں اور اگرور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے محافظ دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان فتوحات کا دائرہ یہاں تک پھیلا کہ ذی الحجہ ١٢٦١ھ (دسمبر ١٨٤٥ء) میں مجاہدین بالاکوٹ پر قابض ہو گئے اور اسی مقام پر انھوں نے مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو اپنا باقاعدہ امیر جہاد بنا لیا۔ بالاکوٹ کے آس پاس کے علاقوں کو بھی سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کا عہد کیا اور اس کے لیے زبردست جہاد کا آغاز کر دیا گیا ___ ٦ مئی ١٨٣١ء کو بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی' مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے بہت سے رفقا نے سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی تھی' اس سے ساڑھے چودہ سال بعد اسی میدان میں مجاہدین نے سکھوں کو قتل کیا۔ انھیں شکست دی اور ان کے مقبوضہ علاقے پر قابض ہوئے۔

سکھوں کے علاوہ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا تھا اور اب وہ کئی مسلمان علاقوں پر تسلط جمانے کی فکر میں تھے۔ مجاہدین نے ان سب کا مقابلہ ضروری سمجھا اور سب کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا ___ مسلمانوں نے تمام اہم مقامات پر سکھوں سے جنگ لڑی اور جنگی نوعیت کے ہر علاقے میں انھیں ہزیمت سے دوچار کیا۔ گڑھی حبیب اللہ کو مسخر کیا' مظفر آباد میں یورش کی' فتح گڑھ میں ان سے برسرپیکار ہوئے' غرض ہر جگہ ان پر تلوار اٹھائی اور انھیں اس درجے سراسیمگی اور پریشانی میں مبتلا کر دیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کہیں بھی جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

مسلمانوں کا نظم ونسق:

سکھوں کے جو علاقے مجاہدین نے فتح کیے ان میں خالص اسلامی نوعیت کا نظام قائم کیا' حدود و احتساب کا سلسلہ شروع کیا' انسدادِ جرائم کو اولین حیثیت دی' نماز باجماعت کی پابندی عاید کی۔ جو شخص کسی عذرِ شرعی کے بغیر باجماعت نماز ادا نہ کرتا اس سے جرمانہ وصول کیا جاتا۔ عام لوگوں سے پانچ سیر غلہ اور امیروں سے ایک روپیہ فی کس لیا جاتا ___ نمازِ جمعہ میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے بھی سزائیں مقرر تھیں۔ ڈاکوؤں کو قتل کی سزا دی جاتی' جو لوگ شادی اور غمی کے مواقع پر غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہوتے' ان سے بھی جرمانہ لیا جاتا' جگہ جگہ مفتی مقرر کر دیے گئے تھے ___ بالاکوٹ میں خدمت افتا پر مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی مامور تھے۔ درۂ کنہار میں ملا میر اسد اخوند زادہ کو احتساب اور افتا کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کے ماتحت بہت سے علما مقرر تھے

جو دیہات میں دورے کرتے اور بے نمازوں کو نماز کی تعلیم دیتے۔ محمد حی اخوندزادہ علاقۂ درۂ کنہار کے قاضی تھے۔ محمد حسین اخوندزادہ پکھلی میں وعظ و نصیحت کی خدمت انجام دینے پر مامور تھے ❶۔

غرض اس مفتوحہ علاقے میں مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت قائم کر لی تھی جو کتاب و سنت کے مقرر کیے ہوئے خطوط کے مطابق تھی۔ خراج وغیرہ کا نظام بھی جاری کر دیا گیا تھا۔

مرکز سے تعلقات:

اس حکومت کا مرکز فتح گڑھ تھا جو سکھوں سے جنگ کر کے بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ مولانا عنایت علی جو اس حکومت کے سربراہ تھے، فتح گڑھ میں اقامت گزیں تھے اور اس کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا۔ علاقے کے سرداروں اور خوانین کو مشیر مقرر کیا گیا تھا جن سے جہاد کے متعلق مشورے لیے جاتے تھے۔ کابل سے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد انگریزوں نے علاقۂ کشمیر سکھوں سے چھین کر گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا' اس وقت سکھ حکومت کی طرف سے کشمیر کا گورنر نواب شیخ امام الدین تھا۔ وہ ایسا بہادر اور جرأت مند تھا کہ اس نے ابتدا میں گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔

اس زمانے کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب مولانا غلام رسول مہر کو مولانا مسعود عالم ندوی نے دیا تھا جو انھوں نے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) سے حاصل کیا تھا۔ یہ مکتوب ۹/ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۲۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے۔ اس میں محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) سے شوال ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کے حالاتِ جہاد قلم بند کیے گئے ہیں۔۔۔ یہ مکتوب کسی مجاہد نے ہندوستان کے کسی شخص کو بھیجا تھا۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو کسی کتاب میں درج نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ''سرگزشت مجاہدین'' میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے واقعات و حالات کے ضمن میں اس مکتوب کے متعدد حوالے دیے ہیں۔ مکتوب میں بیان کیا گیا ہے:

صوبہ دار کشمیر شیخ امام الدین بہ کمال تمنا راہِ موافقت پیمودہ برائے ارسال خطوط جوڑی ہر کارہ مقرر نمودہ۔ چنانچہ در ماہ دوسہ خط شیخ موصوف متضمن کلام محبت و دوستی می رسند ❷۔

یعنی کشمیر کے صوبے دار شیخ امام الدین نے اپنی دلی خواہش سے موافقت کا راستہ پیدا کیا اور ارسالِ خطوط کے لیے ہرکاروں کی جوڑی مقرر کر دی۔ چنانچہ ہر مہینے اس کی طرف سے دوستی اور محبت کے دو تین خطوط آ جاتے ہیں۔

❶ سرگزشت مجاہدین ص ۲۴۹

❷ بحوالہ سرگزشت مجاہدین' ص ۲۵۰

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ نواب امام الدین جو کشمیر کا گورنر تھا' مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے انتہائی عقیدت و احترام کا تعلق رکھتا تھا اور اس کا ان سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ بھی مرقوم ہے کہ مجاہدین نے نواں شہر کا قلعہ فتح کیا تو اس پر توپیں سر کی گئیں۔ شیخ نواب امام الدین کے پاس قاصد یہ خبر لے کر گیا تو اس نے قاصد کو بہت سا انعام دیا۔

فرماں روائے کابل امیر دوست محمد خاں اور اس کے بیٹے محمد اکبر خاں غازی سے بھی مولانا عنایت علی اور مجاہدین نے تعلقات قائم کر لیے تھے' بلکہ مذکورہ غیر مطبوعہ مکتوب میں یہاں تک بتایا گیا ہے کہ کابل کے حکمران نے امداد و رفاقت کے عہد نامے لکھ بھیجے تھے۔

مولانا ولایت علی کی آمد:

ان سازگار اور معاون حالات میں ۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ (۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو مولانا ولایت علی اچانک علاقۂ مجاہدین میں تشریف لائے۔ اس غیر مطبوعہ مکتوب میں جس کا حوالہ گزشتہ سطور میں دیا گیا ہے' مولانا ولایت علی کی آمد کے بارے میں لکھا ہے:

مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہ و انوارہ مع تمام اہل قافلہ و آلات و اسباب و خیل و دواب محض از فضل رب الارباب از میانِ ہجومِ اعدا بہ عافیت تمام بہ حکومت اہل اسلام جلوہ افروز شدہ' موجب حیرتِ خویش و بیگانہ و ظہور آیۂ حافظ یگانہ گشتند [1]۔

یعنی ہمارے مرشد اور امیر مولوی ولایت علی صاحب (خدا ان کے برکات و انوار کو دوام بخشے) اہل قافلہ' ہتھیاروں' اسباب' گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ اہل اسلام کے دائرۂ حکومت میں جلوہ افروز ہوئے۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ وہ دشمنوں کے ہجوم سے سلامت گزر آئے۔ اس پر اپنے اور بیگانے ہر ایک کو حیرت ہوئی اور اس واقعے کو حافظ حقیقی کے نشان کا ظہور سمجھا گیا۔

مولانا ولایت علی کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور جہاں گئے ان کے اعزاز میں توپیں اور بندوقیں چلائی گئیں۔ مانسہرہ سے چند میل کے فاصلے پر مقام ''اتر شیشہ'' میں دونوں بھائیوں ___ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ___ کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ہزاروں سپاہی اور مجاہد موجود تھے جو خوشی سے بندوقیں اور قرابینیں چلا رہے تھے۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ دونوں بھائیوں کی ملاقات مشکل ہوگئی۔ آخر بڑی کوشش سے لوگوں کو دور ہٹایا گیا تو بھائیوں کی ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ ملاقات کے موقعے پر دونوں بھائیوں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا ذکر غیر مطبوعہ مکتوب میں اس طرح کیا گیا ہے:

ہر دو برادر از فراغ معانقہ و مصافحہ با خود درمیان ہمیں میدان سر بہ زمین نہادہ تا دیر وظیفۂ شکر و سپاس

[1] سرگزشت مجاہدین' ص ۲۵۲

رب العالمین بجا آوردند وتمامی لشکر بہ سجود رفت وحمد وثنائے آں واہب العطیات بسیار از بسیار گفتند ❶۔

(مصافحے اور معانقے کے بعد دونوں بھائی اسی میدان میں زمین پر پیشانی رکھ کر دیر تک جہانوں کے پروردگار کا فریضۂ شکر ادا کرتے رہے۔تمام لشکر بھی سجدے میں گر گیا اور سب دیر تک خدا کی حمد وثنا کرتے رہے۔)

اتر شیشہ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔اس کے بعد دونوں بھائی اسلامی حکومت کے مرکز اسلام گڑھ پہنچے۔ یہ شام کا وقت اور اتوار کا دن تھا۔تاریخ ۱۹ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۱/اکتوبر ۱۸۴۶ء) تھی۔ یہاں بھی ان کا خوب استقبال ہوا۔

۲۴۔شوال ۱۲۶۲ھ (۱۶۔اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو جمعے کا دن تھا کہ مولانا عنایت علی نے مجاہدین اور اسلامی حکومت کی امارت وسیادت کا تمام کاروبار مولانا ولایت علی کے سپرد کر دیا۔مولانا ولایت علی کو اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کی محنت ومستعدی اور انتظام وانصرام کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔اس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔اس ضمن میں فارسی مکتوب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

درمجلس جمعہ بعد از گرفتن بیعت امارت بہ آواز بلند فرمودند کہ برادرِ خرد را از طرف خود رئیس جملہ مجاہدین نمودم وانتظام کاروبار بہ دستورِ قدیم سپرد برادر خرد ساختم۔

یعنی جمعے کی مجلس میں بیعت کے بعد مولانا ولایت علی نے بلند آواز سے فرمایا کہ میں اپنی طرف سے چھوٹے بھائی کو مجاہدین کا سالار بناتا ہوں اور سب انتظامات سابقہ دستور کے مطابق ان کے حوالے کرتا ہوں۔

بہر حال مولانا ولایت علی کے سرحد پہنچتے ہی مولانا عنایت علی نے جہاد اور مجاہدین کے جملہ انتظامات ان کے حوالے کر دیے۔ معاملات حکومت بھی انہی کے سپرد ہوئے اور مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت امارت کر لی ـــــ یہ حضرات بالاکوٹ بھی گئے۔

کامیابی کے بعد ناکامی:

مولانا ولایت علی کی سرحد آمد پر پورے تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ''درۂ دب'' کی جنگ کا واقعہ پیش آ گیا۔مجاہدین کے لیے اس جنگ کا نتیجہ نہایت الم ناک نکلا۔کئی سال کی بھاگ دوڑ اور جاں فشانی سے جو مرکز بنایا تھا وہ ختم ہو گیا اور قیام وسکونت کے لیے کوئی جگہ ان کے پاس باقی نہ رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی کیوں اچانک ناکامی میں بدلی اور ہزارہ میں انھوں نے اسلامی حکومت کی جو تاسیس کی تھی وہ کس بنا پر آناً فاناً انہدام پذیر ہوئی ـــــ؟

صورتِ حال پر ایک نظر:

اس کو سمجھنے کے لیے صورتِ حال پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

---

❶ سرگزشت مجاہدین ص ۲۵۵

انگریزوں نے سکھوں سے پہلی جنگ کے بعد دوآبہ بست جالندھر لے لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سکھوں کی حکومت پر ڈیڑھ کروڑ روپے تاوانِ جنگ عائد کیا تھا۔ لاہور کے خزانے میں سکھوں کے پاس چونکہ اتنی بڑی رقم نہ تھی، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان کشمیر اور بالائی ہزارہ سمیت جو کوہستانی علاقے ہیں، وہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس علاقے میں جو خطے دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع تھے، وہ پچھتر لاکھ روپے میں گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ ان میں جموں اور کشمیر کا علاقہ بھی شامل تھا اور بالائی ہزارہ کا بھی ____ جب سکھوں کی مرکزی حکومت میں کش مکش اور خلفشار ابھرا اور انگریزوں سے جنگ شروع ہوئی تو اس زمانے میں علاقۂ ہزارہ میں سکھوں سے حصول آزادی کی دو زبردست تحریکیں شروع ہوئیں۔ ایک زیریں ہزارہ میں اور ایک بالائی ہزارہ میں۔ یہ دونوں تحریکیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ زیریں ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے آزاد کرایا گیا تو اس کا حکمران اکبر شاہ ستھانوی کو بنایا گیا، جس نے اس کے نظم و نسق کو بہترین طریقے سے چلانا شروع کیا۔ بالائی ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے چھینا گیا تو اس کے قائد و امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو مقرر کیا گیا۔ اس کی سرحدیں مانگلی سے شروع ہو کر مشرق میں مظفر آباد اور شمال میں کاغان تک چلی گئی تھیں۔ یہ تمام علاقے مقامی خوانین اور مجاہدین کے قبضے میں تھے اور ان کا نظام حکومت نہایت کامیابی سے چل رہا تھا۔

پیچیدگی:

یہاں ایک عجیب و غریب پیچیدگی پیدا ہوئی، جس میں تین فریق ملوث تھے اور وہ تھے:

۱۔ انگریز

۲۔ سکھ ____ اور

۳۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ۔

اس نواح میں سکھوں کے پاس کوئی قابل ذکر علاقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہزارے کا بالائی حصہ (جو انھوں نے ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا اور انگریزوں نے اسے کشمیر سمیت گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا) مجاہدین کے قبضے میں چلا گیا تھا اور اس کا نظم و نسق مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے ہاتھ میں تھا۔ زیریں حصے پر مقامی خوانین قابض ہو چکے تھے اور ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی، جس کا سربراہ سید اکبر شاہ ستھانوی کو بنا لیا گیا تھا۔

گلاب سنگھ ڈوگرہ کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے پچھتر لاکھ روپے ادا کیے۔ لیکن اسے نہ کشمیر کا قبضہ ملا اور نہ بالائی ہزارہ اس کے ہاتھ آیا۔ کشمیر کا قبضہ اسے شیخ نواب امام الدین دینے کو تیار نہ تھا جو سکھوں کی طرف سے کشمیر کا گورنر تھا اور ہزارہ کے بالائی حصے پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا تھا۔

ان اہم معاملات کا تیسرا فریق انگریز تھا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ہاتھ کشمیر فروخت کیا تھا اور انگریزوں نے ہی ہزارے کا بالائی حصہ اسے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کا سکھوں سے معاہدہ بھی تھا کہ سرحد میں ان کے جو باقی مقبوضات ہیں وہ انہی کے پاس رہیں گے۔ لیکن اب معاملہ بالکل الٹ ہو گیا تھا۔

یہ مسئلہ نہایت پیچیدگی اختیار کر گیا تھا اور مذکورہ تینوں فریق اس سے بہت پریشان تھے۔ بالآخر انگریز میدان میں آئے۔ ایک طرف ایبٹ صاحب کو ہزارہ بھیجا گیا کہ وہ کسی طرح زیریں ہزارہ پر قابض خوانین اور ان کے معاونوں کو اس علاقے سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرے ــــــ دوسری طرف ہنری لارنس جو دربارِ لاہور میں ریذیڈنٹ کے عہدے پر متمکن تھا' خود فوج لے کر جموں پہنچا۔ وہاں سے اس نے ہبرٹ ایڈورڈز کو کشمیر کے گورنر نواب شیخ امام الدین کے پاس بھیجا تا کہ براہِ راست گفتگو کر کے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دیا جائے۔ ہربرٹ ایڈورڈز کو معلوم تھا کہ ملک فتح خاں ٹوانہ ایک ایسا شخص ہے جو امام الدین کا جگری دوست ہے۔ چنانچہ اس نے ملک فتح خاں ٹوانہ کو ساتھ لیا اور کشمیر جا کر امام الدین سے گفتگو کی۔ امام الدین اپنے اس دوست کے سامنے جھک گیا اور اس کی کوششوں سے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دے دیا❶۔ امام الدین نے یہ راز بھی فاش کر دیا کہ اس کو لاہور کے سکھ دربار نے ہدایت کی تھی کہ کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس کارروائی کا ذمے دار لال سنگھ وزیر تھا' جس کے خلاف لاہور میں مقدمہ چلا اور اسے وزارت سے علیحدہ کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔

بلاشبہ کشمیر کا گورنر شیخ نواب امام الدین جرأت مند اور جسور آدمی تھا۔ اس نے یوں ہی کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار نہیں کیا ہوگا' کشمیر کی فوج اور عوام و خواص اس کے حامی ہوں گے۔ اس نے انگریزوں کی بات ماننے سے تو انکار کر دیا لیکن اپنے دوست ملک فتح خاں ٹوانہ کے سامنے جھک گیا۔ اگر ملک مذکور بیچ میں نہ پڑتا اور قبضے کے سلسلے میں کوشاں نہ ہوتا تو اغلب ہے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی اور کشمیر کی تاریخ شاید کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیتی ــــــ ملک فتح خاں ٹوانہ پنجاب کے انگریزی عہد کے آخری وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کا دادا تھا۔

ادھر ایبٹ صاحب کی کوششوں سے زیریں ہزارہ کے خوانین نے بھی اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقے سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ جاگیریں اور مراعات لے کر یہ علاقہ سکھوں کے حوالے کر دیا اور وہاں سکھوں کی حکومت بحال ہو گئی۔

• اب مجاہدین تنہا میدان میں رہ گئے تھے جو بالائی ہزارہ پر قابض تھے اور جہاں کے امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی تھے۔ انگریز' سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ تو پہلے سے ان کے مخالف تھے' درپیش حالات میں اس علاقے کے سرکردہ لوگ اور خوانین بھی ظاہر ہے' ان کی زیادہ حمایت کرنے کی حیثیت میں نہ رہے تھے۔ یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کے نتیجے میں مجاہدین شکست کھا گئے۔

---

❶ سرگزشت مجاہدین ص ۲۵۸

درۂ دُب کی جنگ:

درۂ دب ایک مشہور درہ ہے جو گڑھی حبیب اللہ خاں اور مظفر آباد کے درمیان پڑتا ہے۔ اس کی بلندی کم وبیش پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس کے مشرق میں کچھ فاصلے پر پیر چناسی پہاڑ ہے جو دب سے کافی بلند ہے۔ اسی پہاڑ کے جنوب مغربی دامن میں دریائے کشن گنگا کے کنارے مظفر آباد واقع ہے جو آزاد کشمیر کا دارالحکومت ہے۔ دُبّ کے شمال میں کوہِ سری کوٹ ہے، جس کی اونچائی سات ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ پھر بالا کوٹ کے سامنے تک ایک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے۔ موجودہ جغرافیائی لحاظ سے دب صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کی درمیانی حد پر واقع ہے۔

جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس میں انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست اور اس کے نتیجے میں کچھ علاقوں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد دونوں فریقوں میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جو علاقے سکھوں کے پاس ہیں وہ انہی کے قبضے میں رہیں گے۔ انگریز سکھوں کو فوجی تربیت دیں گے اور کسی سے لڑائی کے وقت ان کی مدد کریں گے۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ کی امداد کا وعدہ بھی انگریزوں نے کر لیا تھا اور یہ طے پا گیا تھا کہ ہزارے کا بالائی علاقہ جو مجاہدین کے قبضے میں ہے، اسے فتح کر کے گلاب سنگھ کی تحویل میں دیا جائے گا۔

یہ ذہن میں رہے کہ اس وقت تین طاقتیں مجاہدین کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ انگریز، سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ۔ نواب شیخ امام الدین کو مجبور کرنے پر کشمیر گلاب سنگھ کے تسلط میں آ گیا تھا اور وہاں کی فوج اس کے ہاتھ میں تھی۔

ان حالات میں سکھوں کی ایک فوج جو دس رجمنٹوں پر مشتمل تھی، سری نگر سے مظفر آباد کے راستے بالائی ہزارہ پہنچی تا کہ اس علاقے کو فتح کر لیا جائے۔ اس فوج کا کمان دار دیوان کرم چند تھا۔ انگریزی فوج اور اس کے بڑے بڑے افسر بھی اس کے ساتھ تھے۔ ۶ جنوری ۱۸۴۷ء کو درۂ دب میں اس کا مقابلہ مجاہدین سے ہوا۔ مجاہدین کی تعداد بہت کم تھی اور ادھر گلاب سنگھ ڈوگرہ اور سکھوں اور انگریزوں کا زبردست لشکر ان کے مقابلے میں کھڑا تھا۔ نتیجتاً مجاہدین کو شکست ہوئی اور حریف جیت گیا۔ جھڑپوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن حالات بالکل بدل چکے تھے اور مجاہدین کی کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دشمن ہزارے کی تمام وادیوں پر قابض ہو چکا تھا۔

مولانا ولایت علی اور عنایت علی کے مچلکے:

مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی بھی ان کے ساتھ تھے۔ انگریزی سرکار کی نگرانی میں دونوں بھائیوں کو اس علاقے سے نکال کر ان کے وطن عظیم آباد روانہ کر دیا گیا اور دونوں سے دس دس ہزار روپے کے مچلکے لیے گئے۔ دو سال کے لیے انگریزی حکومت نے انھیں عظیم آباد (پٹنہ) میں پابند کر دیا اور حکم جاری کیا کہ اس مدت کے اختتام سے پہلے وہ شہر سے باہر نہیں نکل سکتے۔

آزادی کے بعد مستقل ہجرت:

دو سال بعد جولائی یا اگست ۱۸۴۹ء میں مچلکوں کی میعاد ختم ہوئی اور انھیں آزادی ملی۔ ۱۳؍شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد روانہ ہو گئے۔ مولانا یحییٰ علی اور چند احباب ان کے ساتھ تھے۔ مولانا عنایت علی ان دنوں بنگال گئے ہوئے تھے' انھیں بھی پیغام بھیجا کہ سرحد پہنچ جائیں۔

دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات:

سرحد جاتے ہوئے مولانا ولایت علی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دہلی آئے تو مسجد فتح پوری کے قریب ایک مکان میں ٹھہرے۔ دہلی میں وعظ و نصیحت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مغلوں کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ اس کی بیگم نواب زینت محل کے استاد مولوی امام علی اور معروف شاعر حکیم مومن خاں مومن ان کے وعظوں میں شریک ہوتے رہے۔ مولوی امام علی نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ انھوں نے بیگم زینت محل اور بادشاہ سے مولانا کی صالحیت و تقویٰ اور وعظ کی اثر آفرینی کا ذکر کیا ___ بیگم اور بادشاہ نے دعوت نامہ بھیج کر مولانا کو قلعہ معلیٰ میں بلایا۔ مولانا پچھتر آدمیوں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لب فرش تک مولانا کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا۔ عطر اور پان سے تواضع کی۔ مولانا نے وعظ شروع کرتے وقت یہ آیت پڑھی جو سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۰ ہے:

اعلموآ انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ و تفاخر......

"یعنی جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا' زینت و آرائش' تمھارے آپس میں فخر و ستائش اور مال و دولت کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب اور خواہش ہے......"

مولانا نے آیت پڑھی تو وزیر اعظم نے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے متعلق بیان کرنے کا دستور نہیں ___ لیکن مولانا نے اس کی پروا نہیں کی اور بے جھجک عذابِ قبر' ہنگامۂ حشر اور دوزخ کا بیان نہایت شد و مد اور موثر طریقے سے بیان کرتے رہے۔ اس سے بادشاہ' شہزادے' زینت محل اور تمام حاضرین مجلس بہ درجۂ غایت متاثر ہوئے اور زار زار رونے لگے۔

وعظ کے بعد مولانا رخصت ہونے لگے تو بادشاہ کے حکم سے جملہ مکاناتِ شاہی اور موتی مسجد وغیرہ کی سیر کرائی گئی ___ قیام گاہ پر پہنچے تو پچاس خوان کھانوں کے مطبخ شاہی سے مولوی امام علی اور حکیم مومن خاں مومن کی معرفت بھیجے گئے[1]۔

---

[1] تذکرہ صادقہ' ص ۱۲۶' ۱۲۷

رمضان کا مہینا قریب آ گیا تھا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی خواہش تھی کہ مولانا یہ مقدس مہینا قلعہ معلیٰ میں گزاریں تاکہ قلعے کے لوگ ان کے ساتھ نمازِ تراویح ادا کریں اور وعظ و نصیحت سنیں۔ لیکن ریذیڈنٹ نے مولانا کے متعلق کچھ ایسے انداز میں سوالات پوچھنا شروع کر دیے کہ رکاوٹ کا اندیشہ لاحق ہو گیا، لہٰذا وہاں زیادہ عرصہ قیام کرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور مولانا معذرت کر کے دہلی سے روانہ ہو گئے ___ جمنا پار پہنچے تو رمضان کا چاند دیکھا❶۔

ستھانہ کو روانگی:

دہلی سے مولانا ستھانہ کو روانہ ہوئے۔ کھنہ یا لدھیانہ میں تھے کہ چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ ۷ محرم ۱۲۶۷ھ (۱۲ نومبر ۱۸۵۰ء) کی بات ہے۔ وہ مولانا ولایت علی کی روانگی سے تقریباً دس مہینے بعد ۸ شعبان ۱۲۶۶ھ (۱۹ جون ۱۸۵۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے۔ اس سے آگے ستھانہ تک کا سفر دونوں بھائیوں نے اکٹھے طے کیا۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

اوکنلے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ستھانہ پہنچ گئے اور ان کے بعض ساتھیوں کو کھبل ❷ میں روکا گیا۔ آدمی نکل گئے، لیکن اونٹ روک لیے گئے، جن پر مال و اسباب لدا تھا اور انھیں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ انھیں بہ حفاظت مالکوں کو لوٹا دیا جائے❸۔

مولانا صاحبان اور ان کے ساتھی ۸ ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۰ فروری ۱۸۵۱ء) کو ستھانہ پہنچے۔

مولانا ولایت علی کے اہل و عیال آٹھ دن بعد ۱۶۔ ربیع الثانی (۱۸ فروری) کو وارد ستھانہ ہوئے۔

ستھانہ پہنچنے کے بعد دونوں بھائیوں ___ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ___ میں طریق کار سے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے مولانا عنایت علی ستھانہ کی سکونت ترک کر کے منگل تھانہ چلے گئے تھے۔

تصنیف و تالیف:

مولانا ولایت علی تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت وعظ و تبلیغ، دعوت و ارشاد

---

❶ تذکرۂ صادقہ، ص ۱۲۶، ۱۲۷۔

❷ کھبل تربیلہ کے سامنے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ ستھانہ سے اس کا فاصلہ پانچ چھ میل ہے۔

❸ سرگزشت مجاہدین، ص ۲۷۳۔

اور تنظیم جہاد میں گزرتا تھا، لیکن ان مشاغل و مصروفیات کے باوجود انھوں نے بعض رسائل بھی لکھے جو عربی، فارسی اور اردو میں ہیں اور جنھیں ان کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم نے مجموعۂ رسائل تسعہ میں شائع کر دیا ہے۔

۱۔ رسالہ اربعین فی المھدیین: عربی

رسالہ رد شرك: فارسی

رسالہ عمل بالحدیث: فارسی

رسالہ تیسیر الصلوۃ: اردو

رسالہ شجرۂ باثمرہ: اردو

رسالہ تبیان الشرك: اردو

رسالۂ دعوت: یہ رسالہ بھی اردو میں ہے۔ مولانا ولایت علی کا یہ عقیدہ تھا کہ سید احمد بریلوی شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ اس رسالے میں یہ عقیدہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ صحیح نہ تھا۔ لیکن ہمیں ان کے محاسن ہی کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ ان کی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

وفات:

مولانا ولایت علی نے سرحد پہنچ کر ستھانہ کو اپنا مرکز بنایا اور انتظامی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ پہلا تمام سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ لوگوں کو جمع کرنے اور مجاہدین کی جمعیت فراہم کرنے کا کام بہت مشکل اور صبر آزما تھا، لیکن مولانا ممدوح اس میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے درسِ قرآن و حدیث کا حلقہ بھی قائم کیا، لوگوں کو مراقبہ و مشاہدہ کی بھی تلقین کرنے لگے اور فن سپاہ گری کی تعلیم بھی ضروری قرار دی۔

ان کو ستھانہ آئے اور اپنا کام شروع کیے بیس مہینے گزرے تھے کہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو خناق کے عارضے سے وفات پا گئے اور اپنے مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے، کل چونسٹھ سال عمر پائی۔

تذکرۂ صادقہ کے مطابق ان کا حلیہ یہ تھا:

میانہ قامت مائل بہ طول، رنگ سانولا، جسم بلغمی اور پر گوشت، ابرو پیوستہ، ڈاڑھی اوسط درجے کی۔

مولانا عنایت علی جو بعض امور میں مولانا ولایت علی سے اختلاف کی بنا پر منگل ستھانہ چلے گئے تھے، بھائی کی وفات کے بعد مجاہدین کے مرکز ستھانہ آئے تو ۴ صفر ۱۲۶۹ھ (۱۷ نومبر ۱۸۵۲ء) کو سب نے متفقہ طور پر ان کو اپنا امیر بنا لیا۔

کشف قبور کے ایک ماہر کا بیان:

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے بارے میں کشف قبور کے ایک ماہر کا واقعہ

بیان کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ مولانا مہر لکھتے ہیں:

مولانا سید عبدالجبار شاہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب صوات کی سلطنت چھن گئی اور میں ستھانہ واپس آیا تو ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، جنھیں کشف قبور میں مہارت حاصل تھی۔ میں انھیں مجاہدین کے قبرستان میں لے گیا اور مولانا ولایت علی کی قبر کے پاس بٹھا کر کہا کہ فرمایئے یہ کون صاحب ہیں اور ان کا حلیہ کیا ہے؟ وہ تقریباً آدھ گھنٹہ مراقب رہے۔ پھر اٹھے تو مجھ سے کہا کہ آؤ چلیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ صاحب قبر نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ راستے میں مجھے بتایا کہ یہ بزرگ سرحد کے نہیں، ہندوستان کے ہیں اور ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ میں نے حلیہ پوچھا تو کہا کہ رنگ سانولا ہے اور ڈاڑھی کے بال رخساروں پر کم ہیں، ٹھوڑی پر زیادہ ـــــ غرض جو حلیہ بتایا، وہ مولانا کے فرزندانِ گرامی مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالکریم سے خاصا مشابہ تھا، لہٰذا یقین ہو گیا کہ صاحب کشف کا بیان درست ہے [1]۔"

۱۲۶- مفتی ولی اللہ فرخ آبادی

فرخ آباد (یوپی) کے اصحابِ علم میں سید مفتی ولی اللہ بن سید احمد علی حسینی اپنے گرد و پیش میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ اعمال فرخ آباد میں ایک گاؤں کا نام "سانڈی" ہے، وہاں جمعے کے دن ۱۰ شوال ۱۱۶۵ھ/ ۱۰ / اگست ۱۷۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں اپنے والد مکرم سید احمد علی کے ساتھ فرخ آباد چلے گئے تھے اور وہاں کے علما سے کسب علم کا آغاز کیا۔ اس کے بعد قنوج گئے۔ قنوج میں مولانا عبدالباسط قنوجی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ کتب درسیہ کی تکمیل انھی سے کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں حرمین شریفین کا عزم کیا اور حج و زیارت سے بہرہ یاب ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ احمد بن محمد سعید، ان کے والد شیخ محمد سعید صقر، مفتی مکہ شیخ عبدالملک اور شیخ ابراہیم شافعی زبیری سے حدیث کا درس لیا اور قرأت و تجوید سیکھی۔ سات سال ارضِ حجاز میں رہے۔ ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان تشریف لائے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔ ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء کو فرخ آباد میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، جس کا نام "فخر المران وربع المفاخر" رکھا۔ اس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے علما و طلبا کو مستفید فرمایا ـــــ ۲۹/ اگست ۱۸۰۵ء کو مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۳/ اکتوبر ۱۸۲۸ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ممتاز مصنف بھی تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

۱۔ شرح ورد التقرب۔

۲۔ حزب التوسل الی سید الانبیاء والرسل۔

---

[1] سرگزشت مجاہدین ص ۲۷۹، ۲۸۰

۳۔ نظم الجواھر۔

۴۔ نضد الفرائد۔

۵۔ قرآن مجید کی تفسیر جو فارسی زبان میں ہے اور تین ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر انھوں نے ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء میں لکھی۔

۶۔ تاریخ فرخ آباد: ایک جلد میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۷۔ المطر الثجاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج: صحیح مسلم کی شرح

سید مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۵ رجب ۱۲۴۹ھ (۱۸ نومبر ۱۸۳۲ء) کو وفات پائی۔ سوموار کا دن تھا[1]۔

۱۲۷-مولانا ولی اللہ فرنگی محلی

مولانا ولی اللہ بن حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی، مشہور اساتذہ میں سے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد ملا حبیب اللہ انصاری اور عم محترم ملا محمد مبین انصاری سے تحصیل علم کی اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر خود سلسلہ درس شروع کیا اور محنت و مستعدی سے پڑھانے لگے۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی ریاست علمیہ کے مالک تھے۔

تصنیف و تالیف اور تشریح و تعلیقات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات اور شروح وحواشی میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ معدن الجواھر: قرآن مجید کی تفسیر۔

۲۔ نفائس الملکوت شرح مسلم الثبوت: اصولِ فقہ سے متعلق۔

۳۔ حاشیہ علیٰ ھدایۃ الفقہ:

۴۔ حاشیہ برعروۃ الوثقیٰ: علم کلام کے بارے میں (از علامہ کمال الدین)

۵۔ حاشیہ برشرح ھدایۃ الحکمت: از شیرازی، حکمت و فلسفہ کے متعلق۔

۶۔ تکملہ شرح سلم: از ملاحسن

۷۔ غایۃ العلوم و معارج الفھوم: اس کتاب کی بسیط شرح قلم بند کی۔

۸۔ حاشیہ برتذکرۃ المیزان۔

۹۔ حاشیہ برمیرزاھد ملا جلال۔

۱۰۔ حاشیہ برمیر زاھد شرح المواقف۔

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۶، ۵۲۷۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۷۱

۱۱۔ رسالہ فی مبحث التشکیک۔

۱۲۔ کشف الاسرار فی خصائص سید الابرار۔

۱۳۔ مرأۃ المؤمنین۔

۱۴۔ تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین۔

۱۵۔ اداب السلاطین۔

۱۶۔ عمدۃ الوسائل۔

۱۷۔ الاغصان الاربعہ۔

فرنگی محل لکھنؤ کے اس عالم وفقیہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کئی اہم کتب درسیہ پر حواشی وتعلیقات قلم بند کیں۔

مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۰ صفر ۱۲۷۰ھ/۱۲ نومبر ۱۸۵۳ء کو اٹھاسی (۸۸) سال کی عمر میں وفات پائی ❶۔

۱۲۸۔ مولانا ولی اللہ سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر ''سورت'' ہے، جس کے علما وصلحا اور فقہا ومتکلمین کا تذکرہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر کیا جا چکا ہے۔ ان میں تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم وفقیہ مولانا ولی اللہ سورتی تھے، جو غلام محمد سورتی کے فرزند تھے اور جن کا شمار اپنے دور کے مشاہیر فضلا میں ہوتا تھا۔

ولی اللہ کی ولادت وتربیت گجرات میں ہوئی۔ پھر جب ان کے والد مولانا غلام محمد گجرات سے برہان پور گئے اور وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے تو بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ لائق بیٹا سات برس تک باپ سے علم حاصل کرتا رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سوئے حرم مقدس روانہ ہوئے اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی درسِ حدیث دیتے تھے اور عرب وعجم کے بے شمار علما وطلبا ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ ولی اللہ سورتی بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور کبار علما اور نامور مشائخ میں گردانے گئے۔ ان کے والد مولانا غلام محمد نے ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں وفات پائی تو بیٹے نے قصد وطن کیا اور سورت میں سکونت اختیار کی۔ پھر تمام عمر سورت ہی میں رہے اور درس وافادہ کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا ولی اللہ سورتی کے شب وروز تدریس میں گزرتے تھے، تصنیف کے لیے وقت نہ ملتا تھا۔ انھوں

❶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۲، ۲۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۷، ۵۲۸۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰۔

نے ایک ہی کتاب تصنیف کی، جس کا نام "التنبیهات النبویه فی سلوك الطریقة النبویه" ہے۔اس کتاب میں زہد و آداب اور اس سے ملتے جلتے ابواب جمع کر دیے ہیں، جن میں مشکوٰۃ، قاضی عیاض کی الشفا اور امام ابن حجر قسطلانی کی المواہب اللدنیہ کا ملخص پیش کیا گیا ہے۔

سورت کے اس عالم وفقیہ اور نامور مدرس نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۷ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۷۹۲ء کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالم جاودانی کی راہ لی۔ انھوں نے سورت میں وفات پائی اور وہیں محلہ سید پور میں دفن کیے گئے ❶۔

۱۲۹- حافظ ولی اللہ لاہوری

پاکستان کا شہر لاہور ہر عہد میں اصحاب علم کا مسکن رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہاں جو حضرات علما پیدا ہوئے، ان میں ایک بزرگ حافظ ولی اللہ لاہوری تھے۔ وہ شیخ و فاضل اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کے اساتذہ میں جو جلیل القدر عالم شامل ہیں، ان میں مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) مولانا نور احمد کوٹلوی اور مولانا نور احمد بگوی کے اسمائے گرامی تذکرہ ورجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

حافظ ولی اللہ لاہوری نہایت ذہین، قوی الحافظہ اور سریع الادراک عالم تھے۔ مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ میں بہت تیز تھے۔ بڑا موثر وعظ کہتے تھے۔ عیسائی پادریوں کو آڑے ہاتھوں لیتے، بہ درجہ غایت شدت سے اسلام کی حمایت کرتے اور مضبوط دلائل سے پادریوں کے حملوں کا جواب دیتے۔ اس سلسلے میں بے حد جری اور غیور تھے۔

متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں:-

۱۔ صيانة الاسلام عن وسوسة الشيطان۔

۲۔ الابحاث الضروريه۔

۳۔ المباحثة الدينيه۔

لاہور اور قرب و جوار کے لوگ مسائل دینیہ میں ان سے رجوع کرتے اور ان کے فتوے کو لائق اعتنا ٹھہراتے تھے۔

لاہور کے اس جید عالم و واعظ اور نامور فقیہ و مفتی نے ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ/ ۱۶ مئی ۱۸۷۹ء کو جمعۃ المبارک کے دن بہ عارضہ اسہال وفات پائی ❷۔

---

❶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۸۔

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۹۔

ی

۱۳۰- مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے متعدد علما و فقہا کے حالات و سوانح ''فقہائے ہند'' کی نویں جلد کے مقدمے میں بیان ہو چکے ہیں۔ زیر تصنیف کتاب کے بھی گزشتہ صفحات میں بعض بزرگوں کے احوال و کوائف معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

ان حضراتِ عالی مقام میں ایک عالم دین مولانا یحییٰ علی تھے' جن کے والد کا نام الٰہی بخش اور دادا کا ہدایت علی جعفری تھا۔ یہ حضرات عظیم آباد کے محلّہ صادق پور میں سکونت پذیر تھے' اس لیے ''صادق پوری'' کی نسبت سے مشہور تھے۔ یہ محلّہ کئی علمی خاندانوں کا مرکز اور اصحاب فضل کا مسکن تھا۔

مولانا یحییٰ علی اسی محلے میں ۱۲۴۷ھ/۱۸۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی اور مولانا ولایت علی سے اکتسابِ علم کیا۔ تصوف و سلوک سے گہرا لگاؤ تھا' یہ فیض بھی مولانا ولایت علی سے حاصل کیا اور انہی سے سند حدیث لی___ پھر بہت بڑے عالم' محدث و فقیہ اور شیخ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں عبور رکھتے تھے' مسائل دینیہ کے استخراج و استنباط میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا' معاملاتِ وراثت کے تمام گوشوں میں مہارت حاصل تھی۔

ان کے استاذ و شیخ مولانا ولایت علی عظیم آبادی جہاد کے لیے سرحد گئے تو یہ عظیم المرتبت عالم ان کے ہم رکاب تھے اور سلسلۂ جہاد میں استاد کے معاون و مددگار۔ اس کے بعد جب سرحد سے وطن واپس آئے تو پھر تدریس و تذکیر میں مشغول ہو گئے اور ایک عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں شوال ۱۲۶۵ھ (ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی جب آخری مرتبہ مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد کو روانہ ہوئے تو بھی مولانا یحییٰ علی ان کے ہم عنان تھے۔ جب ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو مولانا ولایت علی مرکز مجاہدین ستھانہ میں وفات پا گئے تو مولانا یحییٰ علی واپس وطن تشریف لے آئے اور حسب معمول سابق اپنے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طویل عرصے تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔

اس کے بعد برصغیر کے سیاسی حالات نے ایسی کروٹ لی کہ انگریزی حکومت نے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں ملک کے مختلف مقامات سے گیارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا اور ان سب کو انبالہ جیل میں بھیج دیا۔ اسے ''وہابیوں کا پہلا مقدمہ بغاوت'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کی تمام

کارروائی انبالہ جیل میں ہوئی۔ اس مقدمے کی ضروری تفصیلات ''فقہائے ہند'' کی نویں جلد میں بیان کی جا چکی ہیں۔

انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے ان مجرموں میں مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی بھی شامل تھے، جنھیں ۲۶ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵ مارچ ۱۸۶۶ء) کو گرفتار کر کے بذریعہ ریل گاڑی انبالہ بھیجا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بیالیس برس کی تھی اور مجاہدین سرحد کے خادموں اور معاونوں کی فہرست میں ان کا نام ''محی الدین'' تھا۔

جن لوگوں پر مقدمہ بغاوت قائم کیا گیا تھا' وہ سب اپنی اپنی جگہ معزز اور خوش حال لوگ تھے' لیکن انھیں انتہائی اذیت ناک صورتِ حال سے دوچار کیا گیا۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر کے انھیں ہتھکڑیاں اور لوہے کے طوق پہنائے گئے' کھانے کو ایسی روٹیاں دی گئیں جن میں چوتھا حصہ ریت اور مٹی شامل تھی۔ ان میں سے بعض کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت' گواہوں کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی۔ پھر تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا اور سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمے کا آغاز ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوئے تو دورانِ مقدمہ میں نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز کے لیے اجازت طلب کی گئی تو نہ ملی۔ پھر معمول یہ رہا کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو ملزم تیمّم کر کے اور بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں جاری رہی' تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو حوالات میں یک جا کر دیا گیا۔ یہ ماحول بہت حد تک سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے۔ اس لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

مولانا یحییٰ علی انتہائی صابر و ضابط عالم تھے۔ ابتلا و آزمائش کے دنوں میں وہ عام طور پر عربی کی یہ رباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی رضا پر راضی رہتے۔

لَسْتُ اُبَالِی حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا   عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصرَعِیْ

وَذَالِكَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰـهِ وَاِنْ یَّشَأْ   یُبَارِكُ عَلٰی اَوْصَالِ شَلْوٍ مُّمَزَّعٖ

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے' وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے۔

عدالت نے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا۔ مولانا یحییٰ علی کے لیے سزائے موت اور لاش جیل

کے قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ نیز حکم دیا گیا کہ ان کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ بعد میں سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۴۔ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا، جس کی اطلاع انھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ملی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ موت کی سزا تین ملزموں کو سنائی گئی تھی اور وہ تھے: (۱) مولانا یحییٰ علی (۲) مولانا محمد جعفر تھانیسری اور (۳) شیخ محمد شفیع ___! سزا سن کر شیخ محمد شفیع تو بہت مغموم ہوئے، البتہ دوسرے دونوں بزرگ انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولانا محمد جعفر سے خوشی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ شہادت کی امید پر خوش ہیں، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو❶۔

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کر دی گئی کہ ملزم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور ان کو خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ سزا زیادہ تلخ اور اذیت ناک ہو گی۔

جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے حبس دوام کی سزا دی گئی تھی، ان کے سر اور ڈاڑھی مونچھ مونڈ دیے گئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اٹھائے پھرتے اور کہتے:

''افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی❷۔''

بغاوت کے گیارہ ملزموں میں سے چار کو، جن میں مولانا یحییٰ علی شامل تھے، کالا پانی بھیجا گیا۔ مولانا کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرت سر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹری پہنچایا گیا۔ کوٹری سے کراچی اور کراچی سے بادبانی جہاز سے بمبئی پہنچے۔ ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس دن کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) میں اترے۔

مولانا یحییٰ علی کی جائداد نیلام کر دی گئی تھی۔ یہ لاکھوں کی جائداد تھی جو انگریزی حکومت نے کوڑیوں میں فروخت کی۔ غیر منقولہ جائداد صرف دو ہزار ساٹھ روپے چار آنے میں اور منقولہ جائداد چھ سو پینتالیس روپے میں نیلام ہوئی۔

انبالہ وہابی سازش کیس سے تقریباً ایک سال بعد عظیم آباد کا پہلا مقدمۂ بغاوت شروع ہوا۔ اس میں جو حضرات گرفتار ہوئے ان میں مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ بھی شامل تھے۔ ان کا فیصلہ ۲۹ رمضان ۱۲۸۱ھ (۲۷ فروری ۱۸۶۵ء) کو ہوا۔ پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ان کو مولانا یحییٰ علی سے پہلے ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) پہنچا دیا گیا تھا۔ جو لوگ اعانت مجاہدین کے جرم میں ماخوذ تھے، ان میں کالا پانی پہنچنے والے مولانا احمد اللہ اولین بزرگ تھے۔

---

❶ کالا پانی، ص ۶۸۔

❷ ایضاً، ص ۷۳۔

اس زمانے میں انڈمان (کالا پانی) میں ایک شخص سید اکبر زمان اکبر آبادی چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی تھے، جنھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی تھی اور انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ یہ نہایت شریف آدمی تھے اور وہابی مقدمات کے تمام لوگوں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ ہندوستان میں قلعہ آگرہ کے محکمۂ فوج میں میر منشی تھے۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد بھی انھیں میر منشی مقرر کیا گیا۔ قید کی مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آگرہ آئے اور وہیں وفات پائی۔

مولانا احمد اللہ جب کالے پانی پہنچے تو سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے بات کی اور اس کی اجازت سے انھیں اپنے گھر لے گئے جو وہاں کے ایک جزیرے ''روس آئی لینڈ'' میں تھا۔ پھر اپنے قریب ہی ان کے لیے ایک الگ مکان کا انتظام کر دیا اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت لکھنے پڑھنے کا کام ان کو دلا دیا۔

مولانا احمد اللہ کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی انڈمان پہنچے تو سید اکبر زمان نے انھیں بھی اپنے پاس ہی جزیرہ روس آئی لینڈ میں ٹھہرایا۔ اس طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی دونوں بھائی ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ تبلیغ دین، اشاعت اسلام اور اصلاح عوام میں دونوں بھائی کوشاں رہتے۔ فرصت کے اوقات میں لوگوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے۔ دونوں نہایت صابر وشاکر بزرگ تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، سزا کے بعد عظیم آباد میں ان کی تمام جائداد نیلام کر دی گئی تھی، مکانات خالی کرا لیے گئے تھے، عورتوں اور بچوں کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ سب مال واسباب، کتابیں اور مسودے ضبط کر لیے گئے تھے۔ جن مکانوں میں یہ لوگ کئی پشتوں سے سکونت پذیر تھے، انھیں مسمار کر دیا گیا تھا۔ خاندانی قبرستان بھی کھدوا دیا گیا تھا اور مردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر باہر پھینک دی گئی تھیں۔

یہ انتہائی وحشت ناک اذیتیں اور مصیبتیں تھیں جو ان پاک باز حضرات کو پہنچائی گئیں۔ یہ عظیم قربانیاں محض سیاست کے لیے نہ تھیں، یہ تقاضائے فرض تھا اور اس کا مقصد فقط اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی رضا مندی اور خوشنودی تھا۔ کوئی دنیوی مفاد اس میں ہرگز نہ تھا، بلکہ دنیوی نقطۂ نظر سے یہ سراسر نقصان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مصائب وآلام کو انھوں نے نہایت تحمل سے برداشت کیا۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔

مولانا یحییٰ علی کو گھر میں پیش آنے والے حوادث کا علم ہوا تو کالے پانی سے اہلیہ محترمہ کو ایک خط تحریر فرمایا جو لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یحییٰ علی کی طرف سے بخدمت ام حبیبہ، ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ۔

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مدعمرہ کے، حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا، اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ سکونت قدیم سے، خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو اور کاروبارِ فریضہ بہت انجام پائے ہوں، مومنین کو انس ومحبت بطور اہل وعیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو روحِ انور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے

کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے، مالکان کو، خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیات کریمہ کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ O
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ❶

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ❷۔

عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ❸۔

اور فرمایا ان آیات کو ورد زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکاناتِ انبیاء علیہم السلام بخت اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیاً ہو گئے اور یہ اماکن متبرکہ از سر نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی امید رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشق خالق ہر دو جہاں میں ہم
نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
جوگی ہوئے ہیں محرم اسرار کے لیے

---

❶ یہ سورۂ بقرہ کی آیات نمبر ۱۵۵ تا ۱۵۷ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: اور جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، انھیں کامیابی کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (کہ ہم تو مال و اولاد سمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں اور ہم سب دنیا سے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والے ہیں) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں، جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم کی بارش ہوتی رہتی ہے اور وہی اس کی رحمت کے حق دار ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

❷ یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۶ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں صبر کی نعمت سے شاد کام فرما اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اٹھا۔

❸ یہ سورہ قلم کی آیت نمبر ۳۲ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

اے خدائے من فدایت جانِ من
جملہ فرزندان و خادمانِ من ❶

کالے پانی پہنچنے کے تقریباً دو سال بعد مولانا یحییٰ علی بیمار ہوئے اور قانون کے مطابق ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم (جوان کے بھانجے تھے اور انڈمان میں قید تھے) حکام بالا کی اجازت سے کچھ دیر اپنا کام کرتے اور کچھ دیر مولانا کی خدمت میں رہتے۔

بیماری کے دنوں میں مولانا یحییٰ علی کا یہ معمول رہا کہ جو لوگ عیادت کے لیے آتے، انھیں پند و نصیحت فرماتے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہے۔

مرض اگرچہ زیادہ شدید نہ تھا تاہم تکلیف ضرور تھی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ دن میں دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے ہسپتال تشریف لاتے۔ ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو مولانا احمد اللہ کو بھی بلا لیا گیا اور مولانا عبدالرحیم بھی آ گئے۔ زبان پر اللہ کا ذکر جاری تھا اور ہوش بجا تھے کہ اسی دن یعنی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے نجات پائی۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد دو سال ایک مہینا اور نو دن زندہ رہے۔

وفات ہسپتال میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میت کو گھر لے جایا گیا۔ سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ میں شامل ہونا چاہیں، ان کے مکان پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی مقررہ مقام اور متعین وقت پر پہنچ گئے۔ پانچ ہزار کے قریب لوگ اس مردِ مجاہد اور عالم جلیل کی خبر وفات سن کر ان کے گھر پہنچے۔ نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور اس پیکر عزیمت و استقلال کو انڈمان کے جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کر دیا گیا۔

مولوی کبیر احمد پھلواروی نے مندرجہ ذیل اشعار میں تاریخ وفات کہی۔

چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال عالم و زاہد و محدث بود
روحِ پاکش گزاشت مجلس تن راہ ملک وصالِ حق پیمود
گشت راضی خدائے پاک ازو عزتش پیش قدسیاں افزود
ہاتفے سال اوزِ روئے الم رضی اللہ ربہ فرمودہ

۱۲۸۴ھ

❷ اقتباس از مکتوب مولانا یحییٰ علی جو ۲۱ جمادی الاولی ۱۲۸۳ھ کو یک شنبہ کے روز انڈمان سے اپنی اہلیہ محترمہ کے نام ارسال فرمایا (بحوالہ علمائے ہند کا شان دار ماضی، ج ۳، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸)

۱۳۱۔ مفتی یعقوب علی سندیلوی

صوبہ یوپی کے شہر سندیلہ کی سرزمین سے متعدد اہل کمال نے جنم لیا' جن میں ایک لائق احترام شخصیت مولانا یعقوب علی عثمانی گوپاموی کی ہے۔ ان کے والد فضل علی اور دادا رحم علی تھے۔ عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے' لہٰذا یعقوب علی عثمانی کہلائے۔ عابد و زاہد بزرگ تھے۔

مفتی یعقوب علی عثمانی ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ/ اپریل ۱۷۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے علاقے کے اہل علم سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ پھر مدراس گئے' وہاں مولانا تراب علی خیرآبادی' شیخ حسن علی باہلی اور قاضی ارتضا علی گوپاموی سے تحصیل کی۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو جنوبی ہند میں مالابار کے مفتی مقرر کیے گئے۔ فقہ و کلام پر عبور حاصل تھا' اس لیے کچھ مدت بعد مچھلی بندر کے منصب قضا پر فائز ہوئے۔ پھر راجمندری کی صدارت کا عہد پایا۔ یہ تمام خدمات بے حد انہماک سے انجام دیں اور طویل عرصے تک ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے منصب پر متمکن رہے۔

پھر حرمین شریفین کا عزم کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ واپس وطن تشریف لائے تو تمام علائق سے منقطع ہو کر راجمندری میں سکونت اختیار کر لی۔ اب لوگوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور بالکل گوشہ گیر تھے۔ راجمندری ہی میں ۲۰ رمضان ۱۲۸۳ھ/ ۲۵ جنوری ۱۸۶۷ء کو انتقال ہوا' تہتر سال کی عمر پائی [1]۔

۱۳۲۔ مولانا یعقوب دسنوی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک مقام ''دسنہ'' ہے' جس کی خاک سے بہت سے ارباب فضل ابھرے اور آسمان شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جسے چودھویں صدی ہجری کی نامور و ممتاز شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سید صاحب اپنے اوصافِ گوناگوں کی بنا پر نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں مشہور ہوئے اور اپنی بوقلموں خدماتِ علمی کی وجہ سے ہر حلقے میں لائق اعزاز و اکرام قرار پائے۔

تیرھویں صدی ہجری میں ''دسنہ'' کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک عالم مولانا یعقوب کی ولادت ہوئی جن کو اپنے عہد کے ممتاز علما میں شمار کیا گیا اور فقہ و اصول اور علوم ریاضیہ میں جن کی مہارت کا لوہا مانا گیا۔

مولانا یعقوب دسنوی نے مختصرات کی تکمیل اپنے گرد و پیش کے اساتذہ سے کی۔ پھر مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری کی خدمت میں گئے اور ان سے علوم درسیہ کی کتابیں پڑھیں۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷' ص ۵۳۳۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۵۵' ۲۵۶۔

سند فراغ کے بعد صوبہ بہار ہی کے ایک مشہور شہر مونگیر کا قصد کیا اور وہاں درس و افادہ کی مسند بچھائی۔ ایک مدت تک مونگیر میں رہے اور بہت سے علما وطلبا کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ پھر ان کی خدمات شہر بہار کے انگریزی مدرسے کے لیے حاصل کر لی گئیں۔

اس عالم وفقیہ نے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ❶۔

۱۳۳-قاضی یوسف شاہ جہان پوری

قاضی یوسف بن ابو یوسف افغانی شاہ جہان پوری، اپنے عصر کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ شاہ جہان پور (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اس زمانے میں بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی شاہ جہان پور میں قیام پذیر تھے اور وہاں ان کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، قاضی یوسف نے ان کے مدرسے میں داخلہ لیا اور ان سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔

پھر شہر ''بہار'' کا رخ کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تکمیل علم کی۔ شادی بھی اسی علاقے میں ہوئی۔

فراغت کے بعد مدراس گئے، وہاں کچھ عرصہ والیٔ مدراس والا جاہ کے دربار میں رہے۔

پھر حیدر آباد (دکن) کا رخ کیا اور ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۵ء میں حیدر آباد کے عہدۂ قضا پر متمکن ہوئے۔ حیدر آباد میں یہ نظام الملک نظام علی خاں کا دورِ حکومت تھا۔ وہ ان کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوا اور انھیں ''شریعت اللہ خان بہادر'' کے لقب سے مفتخر کیا۔

''قاضی یوسف شاہ جہان پوری کا زیادہ تر وقت درس و افادۂ طلبا میں صرف ہوتا تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔

اس جید عالم اور فقیہ نام دار کی وفات ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں ہوئی ❷۔

۱۳۴-سید یوسف بیجاپوری

سید یوسف بن عبد اللہ بن محمد درویش حسینی بیجاپوری علمائے صالحین میں سے تھے۔ مفتی عبد القوی حیدر آبادی کے شاگرد تھے۔ علوم سے فراغت کے بعد سوئے حرم روانہ ہوئے اور حج و زیارت کے سعادت حاصل کی۔ طویل عرصے تک ارضِ حجاز میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ ہندوستان واپس آئے تو حیدر آباد (دکن) میں اقامت گزیں ہوئے اور وہاں حدیث وفقہ کے درس کا سلسلہ شروع کیا جو عمر بھر جاری رہا۔

اس عالم وفقیہ نے ۳ صفر ۱۲۱۹ھ/۱۴ مئی ۱۸۰۴ء کو حیدر آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۳۴۔

❷ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۳۶۔

❸ محبوب ذی المنن ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۳۷۔

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آثار الاول من علمائے فرنگی محل: عبدالباری فرنگی محلی۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۲۔ آثار الصنادید: سرسید احمد خاں۔ ترتیب وحواشی: ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۶۶ء۔

۳۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مکتبہ قدوسیہ۔ لاہور ۱۹۸۳ء۔

۴۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خان۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۰ء۔

۵۔ احوال علمائے فرنگی محل: شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۶۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما: انتظام اللہ شہابی۔ طبع دہلی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء۔

۷۔ بوستانِ اخیار: سعید احمد مارہروی۔ طبع آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء۔

۸۔ پنجابی ادب دی کہانی: عبدالغفور قریشی۔ طبع لاہور۔

۹۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ: مولا بخش کشتہ۔ پاکستان پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۶۰ء۔

۱۰۔ تاریخ اہل حدیث: مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور ۱۹۵۳ء۔

۱۱۔ تاریخ اولیائے دہلی: احمد سعید دہلوی۔ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔ ۱۹۵۴ء۔

۱۲۔ تاریخ دار العلوم دیو بند جلد اول: سید محبوب رضوی۔ ادارہ اہتمام دار العلوم دیو بند۔ ۱۹۷۷ء/ ۱۳۹۷ھ۔

۱۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال احمد۔ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس۔ جون پور ۱۹۶۳ء۔

۱۴۔ تاریخ لاہور: کنھیا لال۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۷۶ء۔

۱۵۔ تاریخ مشائخ چشت۔ خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء۔

۱۶۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۹۵۳ء۔

۱۷۔ تحقیقات چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی لاہور ۱۹۶۴ء۔

۱۸۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب لاہور۔

۱۹۔ تذکرہ علمائے پنجاب: اختر راہی۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۱ء۔

۲۰۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار سٹیم پریس لاہور ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء۔

۲۱۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل: محمد عنایت اللہ۔ طبع لکھنؤ ۱۹۳۰ء۔

۲۲۔ تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی مطبع نول کشور۔ لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

۲۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری! محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع، لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء۔

۲۴۔ تراجم علمائے حدیث ہند: ابویحییٰ امام خان نوشہروی۔ جید برقی پریس، دہلی ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء۔

۲۵۔ جماعت مجاہدین: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۵۵ء۔

۲۶۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء۔

۲۷۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء۔

۲۸۔ الحیات بعد الممات: مولانا فضل حسین بہاری۔ مکتبہ سعودیہ۔ حدیث منزل کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔

۲۹۔ حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالی۔ اکادمی پنجاب، لاہور۔ ۱۹۵۷ء۔

۳۰۔ حیات العلماء: سید عبدالباقی سہوانی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء۔

۳۱۔ حیات ولی: مولانا رحیم بخش دہلوی۔ مکتبہ سلفیہ لاہور۔ ۱۹۵۵ء۔

۳۲۔ خزینۃ الاصفیاء: مفتی غلام سرور لاہور۔ مطبع نامی گرامی موسوم بہ ثمر ہند لکھنؤ۔ ۱۲۹۰/ ۱۸۷۳ء۔

۳۳۔ روضۃ الابرار: محمد الدین، سراج المطابع، جہلم۔ ۱۳۰۲ھ۔

۳۴۔ سرگزشت مجاہدین: غلام رسول مہر، کتاب منزل۔ لاہور ۱۹۵۴ء۔

۳۵۔ سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی: از مولانا عبدالجبار غزنوی و مولانا غلام رسول طبع۔ لاہور۔

۳۶۔ سوانح مولوی غلام رسول: مولوی عبدالقادر، طبع لاہور۔

۳۷۔ سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی جلد اول۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء۔

۳۸۔ سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی جلد دوم۔ الجمعیت برقی پریس، دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء۔

۳۹۔ سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی جلد سوم۔ الجمعیت برقی پریس، دہلی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء۔

۴۰۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا عبدالحی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۱۹۲۱ء۔

۴۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی: مولانا محمد میاں، مکتبہ محمودیہ لاہور۔

۴۲۔ فقہائے ہند جلد ۸: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۸۲ء۔

۴۳۔ فقہائے ہند جلد ۹: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۲ء۔

۴۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ فیض منبع مفید عام۔ آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء۔

۴۵۔ کمپنی کی حکومت: باری۔ نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور۔ طبع چہارم ۱۹۶۹ء۔

۴۶۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ حماد الکتبی، شیش محل روڈ، لاہور۔

۴۷۔ مکتوباتِ سرسید: مجلس ترقی ادب' لاہور۔ ۱۹۵۹ء۔
۴۸۔ موجِ کوثر: شیخ محمد اکرام: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ طبع دہم ۱۹۷۹ء۔
۴۹۔ مولانا محمد احسن نانوتوی! محمد ایوب قادری۔ مکتبہ عثمانیہ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی ۱۹۶۶ء۔
۵۰۔ نزہتہ الخواطر: جلد ۷۔ سید عبدالحی حسنی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدر آباد (دکن) ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء۔
۵۱۔ واقعات دارالحکومت دہلی: جلد دوم۔ بشیر الدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء۔
۵۲۔ الیانع الجنی: محمد بن یحییٰ ترہتی۔ مطبع صدیقی پریس بریلی۔ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء۔
۵۳۔ التاج المکلل: نواب سید صدیق حسن خان۔ طبع ثانی۔ ناشر: شرف الدین واولادہ' بمبئی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء۔
۵۴۔ تقویۃ الایمان از مولانا اسماعیل شہید دہلوی (مقدمہ غلام رسول مہر) ناشر: اہل حدیث اکادمی۔ لاہور،
۵۵۔ ارواح ثلاثہ: مولانا اشرف علی تھانوی۔ اسلامی اکادمی' اردو بازار' لاہور۔ ۱۹۷۶ء۔
۵۶۔ تذکرہ شہید: محمد خالد سیف۔ مکتبہ غزنویہ۔ شیش محل روڈ۔ لاہور ۱۹۸۳ء۔
۵۷۔ حیات اسماعیل شہید: پیام شاہ جہان پوری۔ ادارۂ تاریخ وتحقیق' چاہ میراں۔ لاہور ۱۹۷۳ء۔
۵۸۔ کلام شاہ اسماعیل شہید: مرتب محمد خالد سیف۔ طارق اکیڈمی۔ فیصل آباد۔
۵۹۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ (واقعات وشخصیات) ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ پاک اکیڈمی' کراچی ۱۹۷۶ء۔
۶۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان: ڈاکٹر ہنٹر۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ اقبال اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۶۶ء۔

شریعت اسلامیہ کی اصل واساس کتاب وسنت یا قرآن وحدیث ہیں۔ زمانی اور مکانی اعتبار سے مسائل میں وسعت پیدا ہوئی نیز تمدنی ارتقا نے مسائل کی نوعیت میں تنوع پیدا کیا تو مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے بعد مراکز علمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جلد ہی عراق، شام، مصر، یمن اور برصغیر کے متعدد شہروں میں فقہی مکاتب پیدا ہوتے چلے گئے۔ خلافت فاروقی میں اسلام کی روشن کرنیں قلات اور مکران کو منور کرنے لگیں۔ برصغیر کے ساحلوں پر اسلامی فکر کے بیڑے تیرنے لگے اور دوسری صدی ہجری میں سندھ اور ہند فقہائے اسلام اور علمائے دین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ قرآن وحدیث کے بعد فقہ علوم اسلامیہ کا گلِ سرسبد قرار پایا۔

لغت عرب میں ''فقہ'' کے معنی فہم وادراک اور بصیرت کے ہیں۔ لیکن شرعی اصطلاح میں یہ وہ علم ہے کہ جس میں کتاب وسنت اور اس پر مبنی قیاس' اجماع اور اجتہاد جیسے مصادر سے احکام ومسائل کا استنباط اور استخراج تفصیلی دلائل سے کیا جائے۔ عملی زندگی میں درپیش مسائل کے حل کے لیے کتاب وسنت کی طرف رجوع ہی فقہ کا اصل موضوع ہے اور ایسی سرگرمیوں میں مشغول اصحابِ علم کو فقہا کہتے ہیں۔ ان علمائے کرام اور فقہائے عظام نے اس علم کے اصول بھی مرتب کیے اور یوں اصل فقہ پر الگ سے کتب بھی لکھی جانے لگیں۔

اصول فقہ سے مراد ایسے قواعد وضوابط کا مجموعہ ہے کہ جن سے کام لے کر ایک فقیہہ احکام مرتب کرتا ہے اور ان کے دلائل کو واضح کرتا ہے۔

مصنف محترم نے یہ سارا کام تاریخی تسلسل اور زمانی ترتیب کے ساتھ انجام دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مراجع اور مصادر کی ان عربی' فارسی اور اُردو کتب کی فہرست بھی فراہم کردی گئی ہے' جس سے اس تحقیقی لوازمے کی علمی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بھٹی صاحب کے قلم نے تذکرہ وسوانح پر بیسیوں کتابیں رقم کی ہیں مگر اپنے منہجِ تحقیق' حصولِ مصادر' موضوعاتی ترتیب اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے پیش نظر تصنیف ان کا شاہکار (Magnum Opus) قرار دی جاسکتی ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

ISBN 978 969 9730 05-4

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، پاکستان
فون: 042-37239884, 37320318
kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی
فون: 2212991-2629724